



تاجدنگہ پتا ہوا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ جانبا بکھرے ہوئے ریت کے ٹیلے اور کانٹوں سے الی جھاڑیاں سوختی
پیش کے اسے اپنا چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”دادی!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نگاہ دور دور تک دوڑائی۔ ”دادی! کہاں ہیں!“
سورج کی تیز گرم جھلسائی ہوئی آگ اسے اپنے پوٹوں پر محسوس ہوئی اور چند لمحوں کے لیے ہر سواندھیرا چھ

”دادی! دادی! کہاں ہیں آپ!“ پیاس کی شدت سے اس کے گلے میں کانٹے اگ رہے تھے۔
”ربیعہ!“ اچانک دادی کی آواز ایک سرگوشی کی صورت میں اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ربیعہ پیاس

”ربیعہ پیاس لگی ہے۔“
”دادی! دادی! کہاں ہیں آپ!“ دھوپ کی شدت نے بالآخر اسے دیکھنے کی صلاحیت سے قطعی طور

محروم کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اندھوں کی طرح دادی کو ڈھونڈنے لگی۔
”دادی! میری دادی!“

”ربیعہ!“ سرگوشی پھر ابھری تھی۔ ”ربیعہ پیاس لگی ہے۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“



وہ زور سے رونے لگی۔ بے بسی کا احساس پوری شدت سے اس کے حواس پر طاری تھا۔ وہ صرف رو سکتی تھی۔

اچانک اس نے اپنی ہچکچوں کی آواز سنی اور پھر خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ چند لمحے اس طرح گزرے تھے جیسے وہ قبر میں لیٹی ہوئی ہو۔ ہر سو چھایا ہوا اندھیرا، تنہائی اور وحشت سے پھٹا دل! ابتر شاید اسی کیفیت کا نام ہے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ مؤذن کی آواز آ رہی تھی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔
”حسبی علی الفلاح۔“

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس آواز نے اسے قبر سے نکال کر دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اسے اپنے چہرے پر پھیلی غمی کا احساس ہوا۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو جسم سے چپکی قیص لے کر اسے احساس دلایا کہ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔ حلق کانٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ زبان اکڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے وہ قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہو۔

بستر سے اتر کر وہ تیز قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ مؤذن کی آواز واضح ہو گئی۔

”اللہ اکبر! اللہ اکبر! اشہد ان لا اله الا اللہ“

وہ صحن میں چلی آئی۔ گھڑوئی پر دھڑے مکے سے پانی نکال کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے گلاس خالی کر دیا اور ایک گلاس بھر کر وہ وہیں بھی جا رہی تھی۔

”گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے نہ غسل اپنے خواب کے متعلق سوچ رہی تھی۔
”صبح کا زب کے وقت دیکھے گئے خواب سچے ہوتے ہیں۔ اور خواب کے بعد آنکھ کھلے اور فجر کی اذان سنو تو سمجھو بالکل سچا خواب ہے۔“ وادی اپنی کہا کرتی تھیں۔ ”بندہ پاک صاف ہو، عشاء پڑھ کر دہائی کروٹ سویا ہوا۔ بس یہی نشانیاں ہیں سچے خوابوں کی۔“

اس کے کانوں میں وادی کی آواز گونج رہی تھی۔ نظروں کے سامنے ان کا چہرہ پھر رہا تھا۔ ابھی دس دن پہلے کی بات تھی۔ جیتی جاگتی چلتی پھرتی وادی جان کا پیار لے کر وہ کالج گئی تھی۔ اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آخری مرتبہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ انہوں نے وہ دبست شفقت آخری مرتبہ اس کے سر پر چھینا ہے۔ اب وہ کبھی انہیں بات کرنا نہ پائے گی۔ اب وہ کبھی اس پر نور مسکراہٹ کو دوبارہ نہ دیکھے گی۔ اسے خبر ہوتی تو وہ گھر سے قدم نہ نکالتی۔ وہ دلہن پر جم کر کھڑی ہو جاتی۔ ملک الموت سے پہلے اس کا سامنا ہوتا۔ وہ اپنی وادی کو کبھی اس کے ساتھ نہ جانے دیتی۔ کبھی نہیں۔

بے بسی کا احساس پھر پوری شدتوں سے اس پر حاوی ہوا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چارپائی پر گر پڑا۔ اس نے رونا چاہا مگر وہ نہ سکی۔ پچھلے دس دن میں وہ اتنا روتی تھی کہ اب آنسو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ چیزوں کے چھمٹانے کی آواز نے زور پکڑا اور ملک اندھیرا اجالوں میں بدلنے لگا تو وہ یوں چونکی جیسے غیند سے اب

بیدار ہوئی ہو۔
”اچھا! ابھی تو سو رہی تھی۔“ وہ بے ہوشی کے ساتھ کہنے لگی۔ اس کی طرف برہمہ گئی۔ ٹھنڈے پانی نے جلتی ہوئی آنکھوں کو نئے جدوجہاب سکون بخشا۔ وضو کے عطا کردہ سکون و اطمینان سے لبریز ہو کر وہ وادی کی چوکی پر آئی۔ وادی جان کی جاء نماز اسی طرح پہنچی ہوئی تھی۔ صاف ستھری بے شکن اس کے کونے پر ان کی نیلی سیج جیسے کسی کی انگلیوں کی منظر تھی۔ جزدان میں لپٹا قرآن پاک رحل پر رکھا ہوا تھا۔

وادی کی بارات کے لیے مخصوص تھا۔ وادی جان رات اور دن کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارا کرتی تھی۔ ہند کمندوں کے مخصوص اوقات میں وہ گھر کا تمام کام نمٹا لیا کرتی تھیں۔ وہ بہت محنتی اور اہل کار تھیں۔ آخری عمر میں بھی وہ گھر کا سب کام جھٹ پٹ کر لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی کوئی کام اچھا نہ ہوا تھا۔ وہ ڈھالی تین بیجے گھر میں داخل ہوتی تو صاف ستھرا چمکتا گھر اس کا استقبال کرتا تھا۔ اسی سے یہاں سے وہاں پرانہ ملا تھا۔ باورچی خانے میں وہ ہلہ دھلائے چمکتے رتن اپنے اپنے خانوں میں چھپ چھپ کر تانہ کی ہوئی ہانڈی دھری ہوئی اور گرم گرم روٹیاں کپڑے میں لپی رکھی ہوتی تھیں۔ وادی کو اس نے ہمیشہ تازہ دم، ہشاش بشاش پایا تھا۔ مصروف گزارے ہوئے وقت کی شکن کا شائبہ تک ان پر نہ تھا۔

لہذا انسانی دونوں وادی پوتی وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتیں۔ وادی کے ساتھ وہاں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ بہت مرغوب تھا۔ اسے اپنا گھر بہت عزیز تھا۔ کمرے کا جو گوشہ اس کے لیے مخصوص تھا وہ اس کے لیے تھا۔ اپنے آگن میں بار سنگھار کے درخت کے نیچے جا بیٹھنا بھی اسے دل و جان سے پسند تھا۔ لیکن مائیک کی بات سب سے جدا تھی۔ وہاں وہ اپنی وادی کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کے قصے چھیڑا کرتی تھی۔ مائیک کی سیلیوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں وہ کرتی رہتی۔ وادی بڑے شوق و انہماک سے سنا کرتی۔ کبھی کبھی لوگ دیتے تھے ان کی نصیحت کو پلو سے باندھ لیا کرتی۔ کبھی اس کی کسی بے عقلی کی بات پر اس میں بڑے شوق سے ان کا چہرہ نکلتا جاتی۔ وہ بس کبھی کبھار ہی ہنستی تھیں۔ زیادہ ہنسا انہیں پسند نہ آتا تھا۔ اہل گھر وہاں بیٹھنے پر ربیعہ کو بھی ٹوک دیا کرتی تھیں۔

”اے وادی! اگر تیری اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، جڑوں میں گد گدی ہونے لگتی۔ لیکن پھر وہ اندر ہی اندر ہنستی۔“

وادی کا کما بے حد عزیز جو تھا۔
”اے وادی! رات کے چوبیس گھنٹوں میں یا تو باورچی خانے میں ملتی تھی یا پھر رات کو بستر پر۔ وہ ان کی ہالی۔ وادی ایک ہاتھ میں کپڑے کے دانے گھما تیں، دوسرا بازو اس کے گرد حائل رکھتیں۔ بستر پر اس لڑکی تھیں۔ لیکن ربیعہ ان کے وجود سے اٹھتی تھیں۔ کبھی کبھار اس کے قدموں پر چھو جاتی تھیں کہ ان کے قدم نہ آتے تھے۔ وادی نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ وہ اپنا بستر الگ کیا کرے۔ وہ رات کو

”اے وادی! لیکن ربیعہ کے خیال سے ان کو جاء نماز چھوڑ کر اس کے پاس آنا پڑتا تھا۔ پھر کبھی تو ایسا نہ ہوا۔ وادی چپکے سے اٹھ کر جاء نماز پر جا بیٹھتی تھیں۔ پھر رات کے چوبیس گھنٹے تک تو اٹھ رہتی رہیں۔“
”اے وادی! اگر یہ سوتے سوتے انہیں خود بھی نیند آ جاتی تھی۔ وہ اسی بات سے گھبرا کر لڑکی تھیں۔“
”اے وادی! لیکن ربیعہ الگ لیٹت تو جاتی پر اسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر وادی کا

”اے وادی! ابھی تو نماز چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھتی تھیں۔“
”اے وادی! کب بڑی ہو گی۔“
”اے وادی! بڑے ہونے کا مطلب آپ سے الگ ہونا ہے تو میں ہمیشہ چھوٹی رہوں۔“

”اے وادی! ابھی تو نماز چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھتی تھیں۔“
”اے وادی! جیسے وادی اندر سے دکھی ہوں۔ جیسے ربیعہ کا بہت

قریب ہونا ان کو دکھ دیتا ہو۔ شاید اس سے دور جانے کا خیال انہیں دکھ دیتا تھا۔

ربیعہ نماز پڑھ کر وہیں پر ہی لیٹ گئی۔ اس میں دادی کے وجود کا احساس بسا ہوا تھا۔ کتنے برس ربیعہ نے ان پابندی و وقت کے ساتھ اس چوکی پر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ کتنی بھلی خاتون تھیں وہ نیک بخت عبادت گزار اور سبوں کے دکھ سکھ کی سانبھی۔ قدم قدم پھونک پھونک کر رکھنے والی۔ ایک ایک اسے حلق میں اگنے والے کانٹے یاد آگئے۔

”ربیعہ ربیعہ پیاس لگی ہے۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“

سرگوشی کہیں آس پاس سے کانوں میں گونجی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیسا خواب تھا یہ؟ کیسا خواب تھا۔ کم و بیش ایسا ہی خواب اس نے چند روز قبل بھی دیکھا تھا۔ کیا تعبیر تھی اس خواب کی؟ کیا اس کی دادی کا روح بے چین تھی؟ کیا انہیں وہ سیرے جہان میں کوئی تکلیف تھی؟ کیا مرتے وقت ان کے دل میں کوئی خواہش پھانس کی مانند اٹکی رہ گئی تھی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی بے چینی سوا ہو گئی تھی۔

”ایسا خواب کیوں دیکھا میں نے۔ وہ پتا ہوا صحرا وہ دیکھتے ہوئے ریت کے ٹیلے وہ کانٹوں سے اٹی جھاڑیاں وہ پیاس کی شدت سے گلے میں اگے ہوئے کانٹے۔ اوس۔ اوس۔ دادی کی آواز تھی میری دادی کو کیا دکھ ہے وہاں۔ کون سی تکلیف۔ کون سا گناہ“ نہیں نہیں۔ میری دادی نے بھلا کیا گناہ کیا تھا۔ میں ان کے بل بل کی سامنے ان کے دن رات کی رفق میں گواہ ہوں ان کی راسبت بازی کی۔ ان کی سچائی کی ان کے ماتھے پر چمکتے ہوئے تھکوں کا دارغ ان کی موت کے بعد کیسا گہرا ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے پر کتنا نور تھا ان کی میت سے کیسی پیاری آواز آرہی تھی۔ بھلا میری دادی نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا۔ بن ماں باپ کی بچی کو پال پوس کر جو ان کیا آسا لیں کہ دنیا کی برائی کا ما کا سا سایا بھی نہ پڑنے دیا اس پر حالات کی دھوپ کو چھو کر گزرنے نہ دیا۔ مرغی کی طرح اپنے پردوں میں سمیٹ کر اسے ایک طویل عرصے تک زمانے کے سرد گرم سے بچائے رکھا۔ صبح صادق کی نرم روشنی سے ہٹان کا چہرہ اپنے اعمال کی گواہی آپ تھا۔ بھلا دادی جان سے ایسی کون سی لغزش ہوئی تھی کسے کسے؟

”ربیعہ۔ پیاس لگی ہے۔“ آواز کی مٹھرائٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”وہ قرآن پاک کھول کر بیٹھ گئی۔ قرآن پڑھ پڑھ کر وہ دادی کی روح کو ایصالِ ثواب کرتی رہی۔

پھر بابائیمینان کی لہرس اس کے اپنے اندر سے اٹھنے لگیں تو اس نے قرآن پاک بند کیا تھا۔

اور ازور سے بچ رہا تھا۔

بہرہ را کر اٹھ بیٹھی خالی خالی نظروں سے اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ قرآن پاک اس کے سر پانے رکھا تھا۔ اس کے نیچے پڑی تھی۔ وہ نجانے کب وہیں پر لیٹے لیٹے سو گئی تھی۔

ساری دنیا اور وہی اب ہر سو بکھری ہوئی تھی۔

وہ رات بھر سو رہا تھا۔

وہ رات بھر سو رہا تھا۔

وہ رات بھر سو رہا تھا۔

وہ رات بھر سو رہا تھا۔

وہ رات بھر سو رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ تمہارے چہرے پر نگاہ پڑتی تو دل یوں کٹتا تھا مانو چھری کے نیچے دبا ہوا ہو۔ اور گھر

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

میں نے اس رات کو یوں سننا چھوڑ کر جانے پر دل راضی نہیں ہوتا میرا۔ جو ان لڑکی ہو ماشاء اللہ آجینے سے

”پئے پئے بیٹی۔“ تکلیف کس بات کی؟ لوتے بھلا بتاؤ!“ وہ جھینپ کر ہنس دیں۔

”دیکھتے دنوں سے آپ ماں بن کر میرا خیال رکھ رہی ہیں۔ میں چاہوں بھی تو آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ میں

بھی میں شکریہ ادا کرنا بھی نہیں چاہتی۔ ماں کے خلوص کو شکریہ کے لفظوں میں تول کر میں آپ کا مان کم کرنا نہیں

چاہتی۔ آپ نے اس مشکل وقت میں مجھے بہت سہارا دیا ہے خالہ جان!“

”پئے پئے بیٹی۔“ بھلا بتاؤ!“ نفیسہ خالہ جی بھڑک کر شرمندہ ہونے لگیں۔

نفیسہ خالہ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھی لایعنی باتیں سوچتی رہی، پھر اس نے جنا سوچے سمجھے کوئے پر

پڑتی جھاڑو اٹھائی اور گھر کی صفائی شروع کر دی۔

گھر ایک کوئیانے سے لے کر دوسرے کوئے تک گندا ہو رہا تھا۔ گریبیوں کی آمد آمد تھی۔ آج کل دھول مٹی اور

اب بہت کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہفتہ بھر سے گھر کی صفائی نہ ہوئی تھی۔

دادی جان کی زندگی میں ایسا ممکن نہ تھا۔ وہ بے حد صفائی پسند خاتون تھیں۔ دھول مٹی سے ان کی طبیعت

گھبراتی بھی۔

”اور کیا؟“ وہ منوں مٹی تلے جاسوئی ہیں۔ نجانے کیسے!“ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر سر جھنڈ

کر دوبارہ صفائی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

دراصل اتنے دنوں سے گھر میں ایسی ایک بات کی تکرار نے اس کا ذہن بری طرح سے تھکا دیا تھا۔

ٹوٹ پھوٹ کا عمل پوری شدت سے جاری تھا سوا اب اس کا جی سچا کر رہا تھا کہ وہ دادی کو یاد نہ کرے۔ وہ کچھ

کے لیے بھول جائے کہ اس کی پیاری دادی اس سے بہت دور جا چکی ہیں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ وہ کچھ دیر

لیے مصروف رہنا چاہتی تھی۔ وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگی رہی۔ جھاڑو لگا کر اس نے صحن کے کور

میں بنی کیاری صاف کی۔ سب پتے جمع کر کے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ پودوں کو پانی دیا۔ باورچی خانے کے سارے

میں جمع شدہ چند برتن نجانے کب سے گندے پڑے تھے انہیں دھو کر جگہوں پر پہنچایا۔ باورچی خانے کا فرش

کرپوٹھے سے خشک کیا پھر وہ کمرے میں چلی آئی۔

اس کی نگاہ بستر پر پڑی۔ اس پر کچھ بھی بلکھی چادر شکلوں سے پر تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں

آخری رات انہوں نے اسی بستر پر گزاری تھی۔ اس کی شکلوں میں ان کے وجود کی گواہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی چلتی بستر تک آئی، پھر اس پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے اسے چھو کر محسوس کرنے لگی۔

مہک تھی، شکلیں تھیں، مگر وہ وجود نہ تھا۔

اس کا، شخص تیز ہوتا گیا۔ ایک بار پھر دادی سے بچھڑنے کا دکھ اس کی رگ رگ میں سکھنے لگا۔

دروازے پر دستک نے اسے واپس حواسوں میں لوٹایا تھا۔ چند لمحے اسے خود پر قابو پانے میں لگے پھر وہ اندر

کمرے سے نکل گئی۔

”خاکم خان!“ باہر سے آواز آئی تھی۔

”ریجہ نے دروازہ کھول دیا۔“

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے،

۱۔ ہم کی سندس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان

۲۔ تمام آپ پر فرض ہے لہذا اسی صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرت و سستی سے غور و فکر کریں۔

۱۱۔ اس لی بیہوش کی سیکھیاں تھیں۔ اپنے دل کی باتیں وہ ہمیشہ ہی سے ایک دوسرے سے شیئر کرنے کی عادی تھیں۔ یہ تھی کہ بات محض سمیٹ کر نہ سمجھ لی جاتی تھی۔ پورا محملہ ہی ہمیشہ سے ایک دوسرے کے لیے تھا۔ اسی لیے ان کے غم کو ہر گھبراہٹ کی طرح محسوس کرتا تھا جیسے یہ اس کا اپنا غم ہو۔

۱۔ مہربان کے گھر چلو ہمارے جلاتھا۔ صبح کا ناشتہ نفسیہ خالہ کے گھر سے آتا تو دوسرے کاکھانا سیکینہ بوا کے اور راع کو رہت آیا خان اٹھائے چلی آئیں۔ یہاں تک کہ لڑکیاں سنبھل گئیں۔ ہنسنے بولنے لگیں۔

۲۔ ان مہربان پرے طریقے سلیقے سے کرنے لگیں۔

۱۰۰ نام اسرار و محبت سے اسے گھناٹا کھلا جاتی تھیں۔ سمیعہ، ثویبہ، گھر کا کام نمٹاتے ہی اس کی دل چوٹی

۱۰۱۰۔ اسی نے اسی دیکھا ہی نہ تھا۔ شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اسے ان رشتوں کا ان کی اہمیت کا
۱۰۱۱۔ لیکن میر معمولی کی اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔
۱۰۱۲۔ اس سال سہرہ جانا اس کے لیے امتنا سہل نہ ہوا اگر دوا دی نے اسے مہربان شکر کا بے سواد عادی

15

”اتنا غم نہ کرو۔ نازک سی جان ہو، کچھ اپنی ذات کا بھی خیال کرو۔ ابھی تو عمر بڑی ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔

”بس۔ بس۔“ وہ اسے پرکاز رہے تھے۔ ”یوں رو رو کر اپنی صحت کا نقصان نہ کرو۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اوسر تالا لگا کر ہمارے گھر چلی آؤ۔ یہاں تنہائی میں بڑی رہو گی، سوچ سوچ کر اپنی جان بچان کر لو گی۔ رو رو کر آنکھیں خراب کر لو گی۔ یوں بھی جوان لڑکی ہو۔ ایسے شہار بنا ہیج نہیں ہے۔ پھر سمجھا، ثویبہ بھی تمہارا دھیان بنائیں گی۔ سہیلیوں سے لڑکیاں یوں بھی جلد بھل جاتی ہیں۔“

”نہ نہ سوچنا بھی مت۔“ حاکم خان کے ماتھے پر ہلی پڑ گئے۔ ”وہاں بدر اور سکندر جیسے بد قماش لڑکے ہیں۔ نفہسہ تو بے وقوف عورت ہے جو اس نے ایسی بات کی تم ہمارے ہاں چلی آؤ۔ وہاں سمیعہ اور ثویبہ تمہارا خیال رکھیں گی۔“

”نہیں چچا جان! اے میری ضد نہ سمجھیں۔ بس میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ دادی سے اور کچھ نہ لیا۔ وضع داری ضرور ملی ہے۔“ وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولی تھی۔

”ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ بھئی! ایسی وضع داری۔۔۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”پگلی کہیں کی۔ اچھا یہ بتاؤ کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں سزا وغیرہ لےنے جا رہا تھا۔“

”شکریہ چچا! وہ اتنیس چھوڑنے دو روازے تک آئی۔“

44

"راہنہ ملی آئی۔" کیسی ہیں نانی ابا؟
 "میں آج کے تمہارے گھر پر کیسے ہوں آج؟" ت
 "میں ہلکتے میں گھر پر ہوں۔" وہ ہنس دی۔ "یونیورسٹی میں داخلے ہوں گے تو فارم جمع کرواؤں گی
 "میں ہلکتے میں۔"
 "عذرا خاتون ہنس دیں۔" بیٹھو اب گھر پر آرام کرو۔"
 "وہ سنجیدہ ہو گئی۔" بچپن کی بات ہے لیکن مجھے یاد ہے اب تک۔ کبھی لاڈ سے پیاسی گود میں جا
 "وہ بلی بات بھی کہتے تھے۔" وہ! میری سب سے ذہین بیٹی ہے اسے میں بہت پرہاؤں گا۔"
 "میں! کوئی تمہیں نہیں روکتا۔" حقیقتہً حیات نے محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنا۔
 "ان لہاں ہے؟" وہ آنکھوں میں آبی نمی کو اندر اتارتے ہوئے پوچھنے لگی۔
 "اب اور اسے کیا کام۔" حقیقتہً حیات بولی تھیں۔ "یہ نیشنل تو چیسے سونے کے لیے بنائی ہے اللہ نے
 "وہ ان کی۔"
 "رات الوداع کا ساتھ دیں گے تو دن بھر بستر ہی توڑیں گے۔" عذرا بیگم بھی خفگی سے بولیں۔
 "رات بھر کیا میٹنگیں ہوتی ہیں ان لڑکوں کی۔ باتوں میں تو اب لڑکیوں کو مات کرتے ہیں۔ بہتر اکثر
 "اب۔"
 "نام تھا بیٹی! حقیقتہً حیات کو خیال آیا۔
 "محمہ۔" سارے لائے تھے اس کے ساتھ جا کر۔ چھٹیاں ذرا مصروف انداز میں گزر جائیں تو اچھا ہے۔"
 "ماہ راہ رہی ہوا غی؟"
 "ان آئی کے لیے جاؤں گا ڈھ رہی ہوں۔"
 "سب گئے نیک بچی ہے اپنی ماں کی۔ کیا کرتی ہیں میا تمہاری۔" وہ دونوں ماں کو پوچھتی نہیں کہنے کو
 "ان! ان لوگ وہ دن سے گھر کے کونوں کھدروں میں جمع کند پھر اصراف کرنے میں لگے ہیں۔ سالانہ
 "اب! ہے ناعلم نہ۔" رائے آپی بھی آئی ہوئی ہیں تو اپنی کا سا زرا وقت بچن میں گزر جاتا ہے۔"
 "ان! یہ ہے؟" وہ پوچھنے لگیں۔
 "کہ لیں۔" خوش باش رائے مسوینہ کو اٹھائے چلی آئی۔ "السلام علیکم۔"
 "اب! جیتی رہو۔" حقیقتہً حیات اور عذرا بیگم دونوں اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔
 "اب! اپنے باپ پر گئی تب۔" عذرا بیگم شوق سے مسوینہ کو دیکھنے لگیں۔ "وہ کھو تو ٹھوڑی میں گڑھا بھی
 "اب! یہ بالوں کو پونچھتا رافع چلا آیا تھا۔
 "اب! وہ کرسی بکچھ کر بیٹھ گیا۔
 "اب! یہ تو نہیں ہو۔" رائے نے اسے گھورا۔ "اس قسم کا سلام تو وہیں سے ہوتا ہے تم نے
 "اب! یہ لرایا جس۔"
 "اب! میں نے لرایا کرنے لگا۔

رہتی ہیں ان غریبوں کے کرنے کو کچھ تو ہو۔"
 "صدقے جاؤ ان۔" علی نے تکیہ کلام دہرایا۔
 "او فوف۔" آپ لڑکوں نے تو دنیا فتح کر لی ہے۔" وہ بولے بنانہ رہ سکی۔
 "کیا کچھ فتح کیا ہوا ہے آپ سے بستر کوئی سمجھ سکتا ہے۔" حمزہ مسکرایا۔
 "آرتے یہاں ہاؤس کے دلوں سے پوچھو۔ وہاں پر ہم لڑکوں کی بلا شرکت غیرے حکومت کے جھنڈے پوری
 "اب! وہ تاب سے لہراتے ہیں۔ لڑکیاں چل رہی ہیں کڑھ رہی ہیں۔" علی کو جوش آگیا تھا۔
 "علی۔ علی!" فردوس بیگم کی آواز قریب آتی چلی گئی۔
 "حاضر میں محفل یکا یک خاموش ہو گئے تھے۔"
 "یہ علی کہاں ہے؟" وہ سخت غصے میں نمودار ہوئی تھیں۔
 "ام۔ ام۔ آئی جی۔" وہ ہلکایا۔ "میں بھول گیا ای جی۔"
 "کرو آتی ہوں تمہارے باپ نے تمہارے داغ کا علاج۔ آئے وہ آج انہیں۔" وہ سخت خفا تھیں۔
 "چچا جان نے بریں سر جری پاس کر لی؟" حمزہ بیغضوعی حیرت سے بڑبڑایا۔
 "ہاں! تم بھی آرتی تھیں کروالو۔" ناعہ سنجیدگی سے بولی۔ "شاید کچھ فرق پڑ جائے۔"
 "چلو فوراً! کھو یا مسین کو سنے آو۔ وہ غریب دیکھنے سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" آخر کو فون کیا کہ ای علی ابھی
 "تک نہیں آیا۔ مجھے کیا خبر تھی حضرت یہاں بیٹھے وقت کا زیاں کر رہے ہیں۔"
 "وہ بڑبڑاتے ہوئے مڑ گئیں۔ وہ کان کھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 "لڑکیاں بدل چکا ہے کوئی بھر کر دانت نکال رہی تھیں۔
 "علی! ناعہ نے آواز دی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔
 "وہ جھنڈا لیتے جانا پیچھے سے کوئی اٹار نہ لے لے جاتا ہے۔"
 "علی نے اسے خیالت سے مکا دکھایا سب ہی ہنس دیے تھے۔
 "اس سال نمائندے ملنے رہے بھی۔" عذرا بیگم حساب کتاب کی ڈائری میں ضروری اندراج کر رہی تھیں۔
 "نافع کلن مارکیٹ سے بڑا خوش خوش لوٹا کہ ای نمائندہ بارہ روپے کلو لایا ہوں۔ اب میں حیرت سے اس کا منہ دیکھوں
 "کہ مذاق کر رہا ہے یا سچ کہتا ہے۔ بتا چلا سبزی والا سولہ روپے دے رہا تھا۔ وہ غریب مارکیٹ جا کر بارہ کے لایا۔"
 "بس دلسن! قیامت سر پر کھڑی منت! ایسا زمانہ ہم نے نہیں دیکھا کہ غریب آدمی تین ہزار ماہوار کھاتا ہے اور
 "دس ہزار کا خرچ کرتا ہے۔ ان حکمرانوں کو اللہ سمجھے۔ عوام کو بھیڑ بکری کی طرح ہانک رہے ہیں۔ مزدور غریب کیا لگا کر
 "وقت سے پہلے بڑھے ہو گئے ہیں۔ عورتیں ہیں تو دن بھر حساب کتاب کے پرچے لیے پھرتی ہیں۔ سچی خوشی قیامت
 "سے پہلی دنیا سے رخصت ہوئی۔"
 "حقیقتہً حیات نے دل سے کہا ہے کہ ہمارے ہر کوئی مفلس جواب دیا۔
 "اب! آج کیا ہے گا اناں!" وہ ڈائری بند کر کے مصروف سے انداز میں پوچھنے لگیں۔ "کل میں نے سبزی تو تقریباً ہر
 "قسم کی منگوائی ہے۔ البتہ گوشت کا ناعہ تھا۔ فریڈ میں صرف قے کے چکات رہ گئے ہیں۔"
 "رکرا شملہ مرغ منگوائی تھی! ہاں! ہوں نے خالی پیالہ سو کو تھمایا۔
 "جی ہاں! وہ کلو شملہ مرغ بھی منگوائی تھی۔
 "اب! یہ لرایا کرنے لگا۔

”میں بتا رہی ہوں ماما!“ ورنہ عذرا بیگم کو اٹھتا دیکھ کر بولی۔ ”کیا بنانا ہے؟“

”ایک اٹھ فرائی کرو دو سلاکس سینک دو ایک کپ چائے“ ورنہ بارہ بیٹھ گئیں۔

”اور رافع! تم ناشتہ کر کے ورنہ کو مار کیٹ تک لے جاؤ۔ اسے کچھ کام ہے۔“

”کوئی نیک بخت دن ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو مار کیٹ سے کام نہ ہو۔“

”بیکو مست۔“ ماں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ”تمہیں کون سے پہاڑ توڑنے ہیں یہاں۔“

”پہاڑ بے شک تر و الیں۔ یہ ہونقوں کی مانند بازار میں کھڑا ہونا بہت مشکل کام ہے۔ خاتون تو کسی دکان میں

جاگھتی ہیں ساتھ جانے والا بندہ بے چارا اس لباس گزرتی لڑکیوں سے کئی کترا تا رہتا ہے۔“

”صدقے جاواں۔“ علی کی آمد عموماً ”یونہی ہوا کرتی تھی۔“ یہ شرافت ہمیں نہ ملی سہائے ہائے۔

”جی آپ تو سرتاپا شرافت ہیں۔“ رافع نے طنز سے اسے دیکھا۔ ”مجسم پار سالی۔“

”آواب عرض کرنا ہوں۔ پہلی بار کسی نے میرا ”Inner“ کھوجا ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری امی کیا کر رہی تھیں؟“ شفیقہ حیات نے اس سے پوچھا۔

”ایکسٹنڈسٹ تیار کر رہی تھیں۔ جوں ہی مینبری نگاہ پڑی گھبرا کر بھاگا یہاں آکر رکا۔“

”شرم نہیں ہے ان لڑکوں کو۔“ عذرا بیگم ہنسنے لگیں۔

”ناشتہ تو کروا دیں چچی! اکل رات کا کھانا کھایا ہوا ہے۔“

”ہم نے کیا فجر کے وقت اٹھ کر کھالیا تھا؟“ رافع نے اسے گھورا۔ ”ہم بھی رات کا ہی کھائے ہوئے ہیں۔“

”ماشاء اللہ! آپ میں صبر بست ہے۔“ اس نے بچن سے آتی ورنہ کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔ ”ابھی کچھ دیر

اور صبر کریں۔“

”میں تو بیٹا جی دوپہر تک صبر کر سکتا ہوں۔“ اس نے اس کی حرکت پر جی بھر کر اطمینان کا اظہار کیا۔ ”تم ذرا یہ

ناشتہ نمٹا کرو ورنہ کو مار کیٹ تک لے جانا اسے کچھ کام ہے۔“

”اس نے پہلے کہ علی عجلت میں لقمہ نگل کے کچھ کتنا وہ میٹر بے غائب ہو چکا تھا۔“

”ہائے اللہ امی۔ یہ اتار دیا کیوں ہے۔“ ماہین نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ”بچوں میں اللہ میاں نے آن آف

کاٹن کیوں نہیں لگایا۔ کم از کم کسی گھڑی تو آف کر کے کسی کو بے میں رخصتیت۔“

”توبہ کرو۔“ فردوس بیگم نے اسے گھرا۔ ”اللہ نے اولاد دی ہے“ اس کا شکر ادا کرو۔ بجائے اس کے الٹی

سیدھی باتیں کیے جاتی ہو۔“

”میں بھی اتار دیتی تھی اتنا ہی تنگ کرتی تھی آپ کو؟“

”نہیں۔“ وہ طنز سے بولیں۔ ”تم تو پیدا ہی اتنی بڑی ہوئی تھیں مجھے کیا کرنا پڑا۔“

”افو۔“ وہ حسام کو تہذیب پر تنقید کر جھلائی۔ ”چپ ہی نہیں ہوتا۔“

فردوس بیگم اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے برادر ہی تھیں۔ ریکٹ ہلاتا حمزہ اندر داخل ہوا تو ماہین کی جان میں جان

فرز آتی ہے۔ ”ختم شدہ میٹر اچھا! سید ذرا اس کیتے کو د گھڑی کے لیے لے آئیں بے جاؤ ورنہ میں اسے مار بیٹھوں گی۔“

”رہز“ کسی کیتے کو سنا کر اس نے حیرانی سے اسے ہزا دھرا دیکھا۔

”اس ریس ریس میں میں کو ہر وقت کاٹا جا۔“

”ختم شدہ میٹر اچھا! سید ذرا اس کیتے کو د گھڑی کے لیے لے آئیں بے جاؤ ورنہ میں اسے مار بیٹھوں گی۔“

”اس ریس ریس میں میں کو ہر وقت کاٹا جا۔“

اس نے حسام کے سر پر چیت لگائی۔ وہ اور زیادہ رونے لگا۔

"افوہ ہمارے بھانجے کی شان میں آپ اس سے زیادہ گستاخی نہیں کر سکتیں۔" اس نے ریکٹ بیڈ پر پھینک کر حسام کو اٹھا لیا۔ وہ فوراً خاموش ہو گیا تھا۔

"یہ آپ کی شکل دیکھ کر روتا ہے ایسا!"

"کیوں؟" وہ مشتعل ہوئی۔ "میری شکل کو کیا ہوا؟"

"آپ کی شکل کو کچھ نہیں ہوا۔ اس کا مزاج اسے باپ پر چلا گیا ہے۔"

"آئے ہائے لڑکے!" فردوس بیگم اسے گھورنے لگیں۔ "کتنا بد لحاظ ہو رہا ہے۔"

"مگر میوں میں تو میرا جی چاہتا ہے سائنس دانوں کو مشورہ دے ڈالوں۔ ہینڈی اسے سی ایجاد کرنے کا۔ بس ہاتھ میں پکڑ کر گھومتے رہوں۔"

عریشہ جیسے بلبلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرخ امتزاج کا لان کا پرنٹ اس کی دیکتی ہوئی رگھت پر خوب بہا روئے رہا تھا۔

"شکر کرو اے سی بیڈروم میں جی بھر کر عیش کر لیتی ہو۔" فردوس بیگم نے اس کی بھی خبر لے ڈالی۔

"نجانے سسرال میں جا کر کیسا کمرہ ملے۔ ہینڈی اسے سی ایجاد کروائیں گی سائنس دانوں سے ملکہ لڑتھ۔"

"افوہ ای! کبھی تو دعا بھی دے دیا کریں۔" وہ جھلائی۔ "جب بولیں گی ہولناک سا نقشہ نگاہوں میں پھر ادیں گی۔"

"ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔" ماہین نے ماں کا ساتھ دیا۔ "تمہارے تو داغ ہی نہیں ملتے۔ ہر جگہ تھوڑی سی خرنے چلتے ہیں۔ لڑکیوں کو تو صبر شکر کا عادی ہونا چاہیے۔"

"ارے ایسا! کیوں بے چاری کو ذرا رہی ہیں۔" حمزہ ہنسنے لگا۔ "صبر شکر ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں باضابطہ ایڈمیشن لے گی تو خود ہی سب کچھ سیکھ جائے گی۔ ابھی سے کیوں اپنی سخت ٹریننگ کا اشارت لے۔"

"یہ کون سا اسکول ہے؟" فردوس بیگم کچھ سمجھی نہ تھیں۔

"سائنس کی آس، شند کی بھڑاس، دیور کی باس اور شوہر کا ستیاناس۔ کچھ اس قسم کی کلاسز ہوتی ہیں وہاں ای جی۔"

ان تینوں کو ہی ہنسی آگئی تھی۔

"توبہ، کتنی بکواس کرتا ہے۔" فردوس بیگم نے خود پر قابو پا کر اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔ "مجال ہے جو کبھی لکھتا پڑھتا نظر آئے۔"

"ارے ای جی! آج کل ٹیبل پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل تو دور ہے حرکت کا۔ ہر شے میں حرکت، کھانا پینا، لکھنا پڑھنا سب حرکت میں رہ کر ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کچھ عرصے بعد سونا بھی حرکت میں نہ ہو۔ آدمی سو بھی رہا ہے اور مزے سے اپنے کام بھی نہ مٹاتا پھر رہا ہے کیوں ایسا!"

"ایسی فضول حرکت تم ہی کر سکتے ہو۔" اس نے ناک چڑھائی۔ "یہ علی کہاں ہوتا ہے آج کل، نظری نہیں آتا۔"

وہ ان کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنے شامت بلوائی سے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ آکر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بیٹوں کا انتہا بھی حق نہیں۔ وہاں پھجھو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس سے آج کل کی تعلقات اچھے ہیں کیا؟" حمزہ نے شوخی سے اسے

بچوں کو میرا بہت بہت پیار دینا، میری طرف سے انہیں بہت سے کھلونے خرید کر دینا اور باہر گھمانے لے کر جانا۔
تمہارا عاشق

وہ چند لمحے خط کا کونا ہونٹوں میں دبا کر ہنسی رہی پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
سیاہ پھول دار پرنت میں شمال رنگت دکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں چند لمحے قبل ملنے والی خوشی کے سینے جل رہے تھے۔ کیلے بالوں سے شفاف قطرے ٹپک رہے تھے۔
پھر ایک نئی آوازی نے اسے آگھرا۔ بہا کی آگ میں جلتے دو سال ہو گئے تھے۔ دو سال پہلے وہ اپنی کمپنی کی طرف سے جاپان گیا تھا۔ موسن جب لاہور کا تھا اور ایمان محض چند ماہ کی اور ان کی شادی کو محض تیار سے تین سال کا عرصہ ہوا تھا۔

بس اتنا ہی وقت اس کے ساتھ گزار سکی تھی وہ اور اتنی مدت میں اس کی محبت اور چاہت کی وہ ایسی عادی ہوئی تھی کہ نشے کی وہ زنجیر اب تک اس کے لبوں میں چبکتی تھی۔
تیار ہو کر کبھی آئینہ دیکھتی تو وہاں اس کی نگاہیں چمکتیں۔ فارغ ہو کر بستر پر جا لیتی تو اس پاپس اس کے لب پر مسکراتے لگتے۔ کھانا پکا کر میز پر رکھتی تو اس کا نام پکارتے پکارتے رہ جاتی۔ وہ بے دلی سے بیس ہزار کے ڈرافٹ کو دیکھتی رہتی۔ ابھی چند روز قبل تو اس نے بینک میں پیاس ہزار ڈالے تھے جو تمام گھریلو اخراجات پورے کر کے بیچ گئے تھے۔ اس نے پھر مزید رقم بھجوادی تھی۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے عاشر!“ وہ زبردست بولی۔ ”میرے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ لوٹ آؤ نا!“
(نیل کی آواز پر وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آئی گھڑی پر نظر پڑی تو اس نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔
”اسلام علیکم! سنئے مومن کو بیک لٹکاؤ دیکھ کر وہ اداسی بھول کر مسکراؤں گی۔
”و علیکم السلام!“ اس نے مشتاقانہ جواب دے کر یکساں کو تھمایا۔
”ایمان کہاں ہے ماما؟“ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ پہلا سوال بس کے متعلق کرتا تھا۔
”شوہر ہی ہے جانو!“ اس نے جھک کر اس کا گل چوما۔ ”آپ یونین فارم چینیج کر لو تو میں کھانا لگاتی ہوں۔ ماما کو بہت بھوک لگی ہے۔“

”کیا پکا ہے ماما؟“
”آپ کافیورٹ آلو گوشت۔ شوربے والا۔“
”ساتھ میں چاول بواگل کیے ہیں؟“
”بالکل کیے ہیں۔“ وہ شوشی سے بولی۔ ”آپ کپڑے تبدیل کر لیں بادشاہ سلاطین! تو پھر ہم کھانا کھائیں۔“

”ماما! ایمان کو جگائیں ماما میں اس کے لیے چاکلیٹ لایا ہوں۔“
”ماما! پیچھے آئی ہوئی آواز پر دونوں نے سرگردی کیا تھا۔
گھنٹوں سے اونچی پنک ٹرکی فریڈ پنے وہ کھڑی منہ بسور رہی تھی۔
”لیجئے ہو گئی خواہش پوری۔“ اس نے زبردستی کو ہنسی کر دیکھا۔ ”اٹھ گئی، ہمارا تمہاری۔“
”اگر ایمان (بچہ) آئے تو ہمیں چاکلیٹ دیں۔“ وہ کھل اٹھا۔
وہ لپک کر کھائی کے لیے لپٹ گئی تھی۔

”اگر ایمان کسے نہ لے آئی!“ وہ زبردستی اپنے ہاتھ لے کر پکڑا لیا تھا۔
”اے نہیں وردہ! بار در ضائع ہو گا بعد میں۔“ رات نامہ اس کا طریقہ کار دیکھ کر پریشان ہوئی۔
”اگر ایمان (بچہ) آئے تو ہمیں چاکلیٹ دیں۔“ وہ کھل اٹھا۔

”اس نے ہٹا کر کتنی قہقہی چلا دی۔“
”جانت کریں آپ! یہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ میں تو اس سے کہہ رہی ہوں ایمان کے میں ایڈیشن میں۔“
”ان لے او بہت چلے گی۔“ ناعمد مزے لے لیتی انہیں دیکھ رہی تھی۔
”نہ میں خاک۔“ وردہ نے خوب ہی برا منایا۔ ”گر بچویشن کر کے میں درزی کی دکان کھول لوں۔“
”نیل میں جائیں گی۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”اور اگر جلی بھی لگیں تو بھی کچھ نہیں ملنے کا۔ کلغٹن پر دکان میں اور ہے۔“
”اس میں کرو ناعمد۔ میں کام کر رہی ہوں نا۔“ وردہ پریشان ہوئی۔
”اللہ۔“ آچانک رات نامہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ ”یہ تم کہاں سے آگئیں گی۔“
”اور ناعمد نے سرگردی کیا اور اپنے منہ پر مسکرا دیں۔
”مولا! ایمان دروازے پر کھڑی تھی۔ ریڈ فرائڈ پرو پونیاں باندھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔
”نوعمد نے لپک کر اسے گود میں بھر لیا۔ ناعمد سے اس کی ہنسی بھی بہت تھی۔
”ہم سہلہ (میں نے) کال (کہاں) ہے؟“
”اماؤ آپ چمبہلہ کو دیکھنے آئی ہیں؟ ہم سے آپ کو کچھ مطلب نہیں۔“ ناعمد خفا ہوئی۔
”ہماری نما کہاں ہیں اور موسن؟“ رات نامہ نے اس سے پوچھا۔
”الہاس۔“
”ہاؤ گلیس۔ ایقان خالہ آئی ہیں۔“ وہ تینوں فنانٹ کام لپیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ ”حقیقہ حیات کے پورشن میں بی بی تھے۔ ایقان ماں سے لگی بیٹھی تھی۔
”ماشرمیاں کب لوٹ رہے ہیں؟“ حقیقہ حیات پوچھ رہی تھیں۔
”ہا نہیں اماں نا!“ وہ بے زار سی ہو گئی۔ ”دو سالوں سے یہی سن رہی ہوں کہ بس آنے والا ہوں، آنے والا ہا نہیں وہ ٹرین کب پہنچے گی؟“
”ان نہیں خالہ جانی! آؤ دیکھیں۔“ رات نامہ نے پیچھے سے اس کے گلے میں بانیں ڈال دی تھیں۔
”اسلام علیکم۔“ تینوں نے کورس میں سلام کیا تھا۔
”ایم علیکم السلام۔“ سب نے ہی جواب دیا۔
”ہاں کہاں ہیں؟“ ایقان نے بسن کی بابت دریافت کیا۔
”ای! مہوینہ کو لے کر ذرا ٹھنڈے نکلی ہیں۔ بس ابھی آجائیں گی۔“ وردہ قریب کھڑے موسن کے بال بکھیرنے لگی۔
”اسم علیکم۔“ بھاری مروانہ آواز پر سب ہی نے نگاہیں اٹھائی تھیں۔
”اے۔“ آؤ اخترمیاں۔ بڑے روز بعد آئے۔“ حقیقہ حیات خوش دلی سے بولیں جبکہ ایقان سن بیٹھی رہ گئی۔
”اس شخص کی وجہ سے وہ میاں کتنا کم آتی تھی لیکن نجائے کیا بات تھی جب بھی آتی سامنا لازمی ہوتا تھا۔
”ہی بڑی آگئیں اس پر بے خوبی سے جمائے ہوئے تھا۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں سی چلنے لگیں۔
”اماں کی رستہ بھی بی الوقت سجھائی نہ دیتا تھا۔
”ہاں یکم! کہنے خوش تو ہیں آپ؟“ وہ اسی سے پوچھنے لگا۔

باقی ایشیاد شبات میں



اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ دادی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ دادی کے انتقال کے بعد پڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً "نفیسہ" خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ دادی کے انتقال کے بعد ربیعہ تو اتر سے ایک خواب دیکھتی ہے کہ دادی کسی صحرائ میں ہیں اور شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی طلب کرتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ دادی سے کیا غلطی ہو رہی ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔ شفیقہ حیات اپنی بہو عذرا بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیٹی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان۔ شوہر عاشق رہا ہر نوکری کرتے ہیں۔ ایقان کو عاشق کی بہت محسوس ہوتی ہے۔

۲
دوسری قسط

”جی نہیں ٹھیک ہوں“ شکر ہے خدا۔ ”اس نے الجھ میں جی بھڑک کر سنجیدگی سموئے ہوئے جواب دیا تھا۔
”شریک حیات تو خوش ہوں گے آپ کے“ کب لوٹ رہے ہیں خیر؟“ وہ عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
ایقان کوئی جواب نہ دے پالی۔ جبریز ہو کر رہ گئی۔

Dua

for OneUrdu.com By HarfeDua



Inclu.

SEARCHED INDEXED
SERIALIZED FILED
MAR 1968
FBI - NEW YORK

(38)

HARRIS

(1) سربراہ کو پہلا جھٹکا لگا ہے۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اب جون جون جھٹکے پر ہیں
 ان میں اضافہ ہوتا جائے گا۔“
 (2) نشان نور پکڑے گا تو اس پاس کی سب پھاڑیوں کے منہ سرخ ہو جائیں گے۔ یہ حزمہ تھا جو
 اس وقت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔
 (3) اب آدھ کاسن کر آرہے تھے۔ وہ کسی کی ہم عمر پھپھو اور کسی کی ہم عمر خالہ تھی۔ سب ہی نے اس کی
 اصل آتش فشاں کون ہے اور اس پاس کی پھاڑیاں کون کون ہیں؟“ وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔
 (4) باپ سے یہ تو نہ بنی پوچھیں پھپھو جانی۔ بھلا ناعمہ کی موجودگی میں کون یہ سچ بولنے کی جرأت
 کرے گا اس پر ہی نہ اندیشہ دے گی یہ؟“
 (5) اس کو اب ”حقیقہ حیات“ نے پہلو بدلا۔ ”یہ چار کیس جمع ہو جائیں تو پانچواں تو کچھ بول ہی نہیں
 اس اپنے دکھ جھکھکھائے۔ کتنے دنوں بعد تو میری بیٹی آئی ہے۔ چلو سب تم سب بھاگو یہاں
 ماما کی لیس کے۔“
 (6) بابا نے۔ اس قدر عزت افزائی سے۔ ”علی نے دانت نکالے۔“ ”صدقے جاواں!“
 (7) ”ناعمہ نے زبان چڑائی۔“ ”چلو صدقے ہی جاؤ!“
 (8) اس بیگم کے ماتھے پر ہلکے سے تھپتھپانے سے پہلے تو لیا کر سدا ہی بکھرتی رہتی ہو۔ ”ان کا لہجہ نہایت درشت تھا۔ سہاس
 ماما کی بغیر ہی وہ اس کی خیر خبر لینے میں مصروف ہو گئیں۔
 (9) ابی۔ ”ابو تراؤ تو ہم سب کا ہی خراب ہے۔“ علی نے فنن کہ بات تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ”کچھ ہی
 آتش فشاں کہہ رہا تھا۔ اور میں زلزلہ پارلی کی سربراہ کا لقب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
 (10) کے ساتھ یہ صریح زیادتی ہے۔“
 (11) کے ساتھ کہہ بہ زیادتی۔“ رافع نے بھی ماحول تبدیل کرنے کی کوشش کی۔
 (12) انہوں نے کی بوجھاڑ ہوئی تو فردوس بیگم بھی ٹھنڈی پڑ کر سانس اور نیند سے ملنے لگیں۔
 (13) ال۔ ”ار کو کی تو سہی؟“
 (14) اس مرتبہ تو رکوں گی۔ مومن کی بھی چھٹیاں ہیں۔“ وہ انہیں بتانے لگی۔
 (15) انہے کر اپنے پورشن میں چلی آئیں۔
 (16) نے مای کاروبار؟“ ناعمہ کے تن بدن میں گویا آگ لگی ہوئی تھی۔ ”ان کے بد تمیز لڑکے خواہ
 ان میں خوار کرتے رہیں۔ دوسرا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور خصوصاً ”مجھ سے تو ان کو اللہ
 (17) کوئی بات نہیں۔ ہماری بڑی ہیں وہ۔ اگر کچھ کہہ بھی دیا تو نظر انداز کرو۔“ وہ روہنے
 (18) انداز کر دیتی ہوں تاکہ۔“ ”دیبا سینت ہے بولی۔“ اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے!“
 (19) مار کاڑھ سیک۔ اب تم بے بات رُسوئے نہ کہنے بہت پیٹھ جانا۔“ رانمہ کو ابھن ہوئی۔

عریشہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ماں کی صلیح والی بات اسے بھی اب تک یاد تھی۔

”چلو بندہ جلدی۔ وہ دھماچو کڑی پچھلے لان میں جمع ہوئے۔ خوب زور زور سے باتیں ہو رہی ہیں۔“

”ارے یا رستہ ہم کل کی بیت بازی کی تیاری کر رہے ہیں۔“ سدرہ جھلائی۔ ”تم لوگوں کو جاسوسیوں کی پڑی

ہے۔“

”اوتے بندھو۔ بڑے مزے مزے کے راز افشا ہو رہے ہیں۔ اور تو اور عباد اور رہبر بھی آئے ہیں۔“

”ہائے اللہ!“ ناعمہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”عباد بھی آیا ہے۔ ہائے میرا دل!“

”ہائے ہائے مری جاؤں میں۔ جو وہ حال دل سے واقف ہو جائے تو۔“ وہ شرمائی۔

سب کی سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

”پھر جماعت دعا کریں اس سے تمہارے نکاح کی؟“ سدرہ شرارت سے بولی تھی۔

”کڑی مروارید!“ ثانیہ نے اسے ایک دھپ لگائی۔ ”اس کا پرہوا دے۔ بڑی بہن نہیں دکھائی دیتی

تجھے؟“ ایک اور قہقہہ لگا۔

”چلو جی۔ یہاں تو سب کی سب اس کی شہید نکلیں!“ ایک طنزیہ آواز سیڑھیوں کے قریب بنے چھتچے کے نیچے

سے ابھری تھی۔

”چند لمحوں کے لیے وہ سب کی سب ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر آواز اور وردہ دونوں کو پہچان کر ان سب کی جان میں

جان آئی تھی۔“

”ہائے اللہ۔ وردہ آپ سی۔ سچی ڈرا کر رکھ دیا!“ سدرہ کے حواس بحال ہوئے۔ ”آپ تکب آئیں؟“

”لاؤ نہیں تو کب سے یہاں بیٹھی تم ست کی کار گزاریاں دیکھ رہی ہوں۔ منہ سب کے کھلے ہوئے ہیں اور آنکھیں

ساروں کی بند ہیں۔“ وہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”اور جو میری جگہ کوئی لڑکا یہاں آجاتا تو کیا کچھ بکواس نہ سنتا؟“

”وہ نہیں آنے والے تھے۔ وہ سب پچھلے لان میں جمع ہیں۔ ابھی تو ہم ان کی موشگافیوں کا روہ چاک کر

تے جا رہے ہیں۔“ عریشہ اطمینان سے بولی۔ ”میں آپ کے کمرے کی کھڑکی کھول کر اور کرائٹ آف کر کے آئی ہوں۔“

”چھتچہ چھتچہ کر دو سروں کی باتیں سننے سے اللہ منع کرتا ہے۔“ وردہ نے انہیں عقل دلانی چاہی۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“ ناعمہ نے عریشہ کو آنکھ ماری۔

”تم محبت کر رہی ہو یا جنگ؟“ وردہ نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔

”ہائے!“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”میرا درود نہ جانے کوئی۔“ سب کی کھی کھی شروع ہو گئی۔

”بچھے لگتا ہے مینوزہ آنٹی سے بات کرنا ہی پڑے گی۔“ وردہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”ہلے عباد سے تو بات کر لیں۔“ عریشہ ہنسی۔ ”وہ تو اسے ناعمہ باجی کہتا ہے۔“

”ٹھہریں بھی تو عریشہ باجی ہی کہتا ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”ہاں تو میں کب اس کے قصیدے پڑھتی ہوں؟ وہ باجی چھوڑ مجھے دادی کہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”ارے وہ تو کیا مولوی ہے۔ وہ تو مجھے بھی باجی کہتا ہے۔ حالانکہ میں تو یقیناً اس سے چند ایک سال چھوڑ

ہوں گی!“ سدرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اچھا مٹی!“ چلو پچھلے لان میں جو کچھ ہاتھ لگتا ہے وہ بھی نکل جائے گا۔“ ثانیہ نے جھلا کر کہا۔

سب کی سب سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

42

راہ نے اس کا ہاتھ دیا۔ "تیری آنکھوں کے نقشے روشن ہونے والے ہیں یا شاید

انہوں نے گہرا کر اسے ڈالنا۔

"ہاں آج اسے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

راہ نے "ایقان چوکی ہے" آجائے تم لوگوں سے کون پرہ کرتا ہے۔

راہ کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی۔

اس کا ہاتھ دبا کر تنبیہ کی۔

اس کے بڑھ آئے۔

اب کب آئیں؟" ہاشم ان لوگوں سے خوش دلی سے پوچھنے لگا۔

اسی "مختصر سا جواب ملا۔

وہ چارو کڑی نے پیغام بھیجوا یا ہے رات کو بیت بازی کا مقابلہ ہے۔ "حیات ولا" کے انہی متضاد

راہ اسے جانے لگا۔

جا "ایقان خوش ہوئی۔ "منہ آئے گا۔"

وقت پر پہنچ جائے گا پچھلے لان میں آپ سب خواتین۔ اس نے حاضرین پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔

مضارب "ماہین اور رائیہ بھی خوش سے بولی تھیں۔

اب بھی شامل ہوں۔ "ہاشم نے ایک مرتبہ پھر انہیں مخاطب کیا۔ "پہنچو آئے کریں گی۔"

اس کے "مسکرا کر کہا گیا۔

وہ اپنا چاندروں پر پلٹ گئے۔

وہ انہیں ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاؤ گی۔ یہ شیطان ایسی ایسی چبھتیاں کہتے ہیں ایک دوسرے پر۔ بڑا

میں لڑتی ایقان ابیہ عمر اپنے روٹین ٹائم پر سونے کا عادی ہے اور ضد کرتا ہے کہ میں ہی اسے کہانی بنا کر

ت سے بیٹے کی پیشانی پر سے بال سینے۔

ماں تو اس کی بالکل نہیں بنتی۔ "انہی نے اس کے چپٹ لگائی تھی۔

نئی لمارت میں اندھیرا تھا۔

حاکم ہاتھ کو ہاتھ بچھائی نہ دے۔ اس ایسا سا تھا کہ ہر شے کے دھندلے دھندلے نقش بچھائی

نہ رہی تھی۔ ایک لمبی راہداری تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اس راہداری کے

میں نہ رہتے وہی سے چلتے ہوئے ایک کرے تک پہنچتی تھی۔

ماں آؤ۔۔۔ ریجسٹریشن میں آؤ۔

نہیں۔ ہاشم کی کہ شاید دادی کی آواز اسی کرتے آئے آری ہے۔ لیکن ہر بار اسے کمرہ خالی

اس نے جلتے جلتے انداز میں تفصیل سے بتایا۔ ماہین اور رائیہ بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

عاشق کے جانے کے بعد میں نے بڑے شوق سے چند ایک روٹین ٹائم کے کیسٹس لیے کہ جدائی کا لطف

وہ دیا ہو جائے گا۔ آجائے! عاشق نہیں تھے تو کیا ہوا۔ ان کی اولاد تو ہے نا۔ مومن صاحب نے سب کیسٹوں

کے ذیل نکال نکال کر پورے گھر میں پھیلا دیے۔

تینوں کھٹکھٹا کر مٹیں۔

مرکزی گیٹ پر کسی کی آمد نے اچانک ہی تینوں کی توجہ اس جانب مبذول کر دی۔

دو خواتین اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ساتھ میں ایک چارپانچ سالہ بچہ بھی تھا۔

"یہ کون ہیں؟" ایقان کو الجھن ہوئی۔

فاصلہ قدرے زیادہ تھا اس لیے انہیں پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

تینوں کے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دینی لگی۔

انہوں نے والیوں سے وہ تینوں ہی بڑی گرجا جوش سے ملیں۔

"شہلا! کتنی خوشی ہو رہی ہے ہمیں دیکھ کر بچا نہیں سکتی۔" ایقان نے اسے ہانپوں میں بھر لیا۔ "اور یہ

انہی! کتنی کیوٹ ہو رہی ہے! تقریباً سال بھر بعد مل رہی ہو گی! تم لوگوں سے ہے ہائے اللہ! یہ کتنا پیارا ہو گیا

ہے کیا نام ہے اس کا۔" عمر نے نا۔

وہ بہت بڑبڑا رہی تھی۔

"بہت تعریفیں بعد مل رہے ہیں تو جناب! اس میں سزا سزا آپ کا اپنا قصور ہے۔ آپ تو جناب عاشق حسین

صاحب کو ایسی پیاری ہوئیں کہ پیچھے نہ جانے والے بھی "پیارے" آپ کے ذہن سے نکلے ہو گئے۔" شہلا نے

مسکراتے ہوئے شکوہ کیا۔

"اور" نہیں! اسم سے ایسی کوئی بات نہیں کہ اس نے زندگی خانم ہی اتنی تیز طرار ہو گئی ہیں کہ کہیں بے بسی سے

بیٹھ کر فراغت نہ ہوتی ہو بلانے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا۔" شہلا نے اسے گھور کر طنز کیا۔

"جیسا کہ اس وقت بھی آپ بہت مصروف نظر آ رہی ہیں۔" شہلا نے اسے گھور کر طنز کیا۔

"چھانا۔ اب جانے بھی دو۔" ایقان نے اس کا ہاتھ دیا۔ "قسم لے لو بہت یاد کرتی ہوں ساری سیلیوں

کو۔ اور سب سے زیادہ تمہیں!"

شہلا مسکرا دی۔

"معاذ نے رات بتایا تھا کہ ایقان آئی آئی ہوئی ہیں۔" انہی نے کہنے لگی۔ "مجھے آئی انتظار میں تھیں کہ شاید

آج آپ کا کوئی پیغام آئے یا آپ خود ہی آجائیں۔ ملنے کے لیے اب اس وقت ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو یہ خودی

چلی آئیں۔" شہلا نے کہا۔

"جھا! عباد آیا تھا رات کو؟ مجھے تو نہیں ملا۔ ورنہ میں ضرور تمہیں پیغام بھیجاتی!" ایقان بولی۔ "میں تو کب

سے تم سے ملنے کو تڑپ رہی ہوں۔"

شہلا اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی رہی۔

نشد والی گھوری جی انہی سے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے یہ سب کچھ سن کر انہی کی طرف سے مستقبل کی مسیحا! کی خوشی سے مسکرائی ان لوگوں کی

سب کچھ بڑھتے ہوئے رات اور ہاشم ٹھک کر رک گئے تھے۔

پھر وہ کتنی دیر اندھیرے میں چلتی رہتی تا وقتیکہ اگلادروازہ آجاتا ہے۔
 دادی کی آواز پھر قریب آجاتی ہے۔ تھراتی ہوئی، کانپتی ہوئی، لرزتی ہوئی آواز ہے۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھتی۔
 کمرے میں جھانکتی مگر کمرہ خالی ہوتا۔
 یونہی چلتے چلتے وہ تھک کر چور ہو گئی۔ اس کے تلووں تلے چھپا ہٹ آگئی۔ اس کے کاندھے ٹوٹنے لگے۔

تب اس نے دیکھا۔ وہ ایک تاریک کمرہ تھا۔ اس میں بالکل روشنی نہ تھی۔ داوی کی آواز شاید راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا۔ وہ ایک تاریک کمرہ تھا۔ اس میں بالکل روشنی نہ تھی۔ داوی کی آواز شاید وہ اس کی آخری امید پر آگے بڑھی۔ وہ ہر صورت اپنی داوی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کب سے ان سے نہیں ملی تھی۔ اس نے کب سے داوی کو نہ دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

”ربیع۔ اور ربیع۔ اور“
 او ازا سے بلائی گئی وہ کھیتی چلی گئی۔
 وہ کمرے کے دروازے پر جارہی۔
 اندر گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ اچانک وہ ٹھٹک کر رہی۔ اسے احساس
 ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ کمرے کے اندھیرے سے مانوس ہو رہی ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کمرے
 میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ لیکن کمرہ تو خالی تھا۔ کمرے میں تو کچھ بھی نہ تھا۔
 پھر وہ ادنیٰ کہانیاں جھپٹیں؟ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”وادی۔! وادی کہاں ہیں آپ؟“
 اچانک ہر منظر واضح ہو گیا۔ کمرہ آپ ہی آپ تیز روشنی سے بھر گیا۔
 تب رجبہ نے دیکھا۔
 خالی کمرے کے ایک کونے میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ
 سکتی تھی۔

رابعہ کو اس تنہا خالی کمرے کی اس واحد ٹمکین سے خوف محسوس ہوا۔
 آخر وہ کون تھی۔
 اس عورت سے نہ آہستہ آہستہ سراٹھایا۔ رابعہ کے لبوں سے چیخ نکلتی گئی۔ اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ اس کے
 آنکھیں سرخ انگارہ آنکھیں اس کی جڑھی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بے بسی تھی۔ التجا تھی۔
 رابعہ! میرے پاس آؤ۔ رابعہ! وہ بولی۔
 ہاں! وہ دوا کی کی آواز تھی۔

رہیجہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی دادی تھیں۔

”رہیجہ!“

”وہ کون ہے؟“

”وہ ایک گریٹنگ ہے۔“

”گريٹنگ؟“

”گریٹنگ! یہاں سے رہیجہ! بہت پیاس لگی ہے۔“

”دادی کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔“

Dua is One Urdu Photo gallery

۱۔ ہاں تھا کہ کانو تو بوند بھر ہونہ نکلے۔ اس کے گل سرخ انگارہ ہو گئے۔ کانوں کی لوہیں گرم ہو گئیں۔
 ۲۔ افسی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سب ہی لوگ دم بخود بیٹھ گئے تھے۔ اختر
 ۳۔ سماتے چلے جا رہے تھے۔
 ۴۔ اس کھڑی دودھ بھر دیکھ رہی تھی۔
 ۵۔ انساں انساں کچھ کھوج رہی تھیں لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔
 ۶۔ اسے کھرچھوڑ گیا تھا۔ اندر جاتے ہی اس نے اپنا بیگ اٹھایا تھا بچوں کو لے کر اور اماں کو تھاکر دیا۔
 ۷۔ اسی نے بغیر اپنے فلیٹ پر آگئی تھی۔
 ۸۔ اس شخص کی موجودگی میں وہ وہاں ہزید رکنا نہ چاہتی تھی۔
 ۹۔ اس پہلے کی بات اس کے حافظے میں اسی طرح محفوظ تھی جیسے کل کی بات ہو۔ الٹے بے فکری سے وہ
 ۱۰۔ اگلے دن کے پورشن سے واپس اپنے پورشن کی طرف آرہی تھی۔
 ۱۱۔ اس نے دیکھا کہ لان بڑا تھا۔ رات کا پہلا پیر تھا۔ اپنے ہی گھر میں ہونے کے محفوظ و مامون احساس میں
 ۱۲۔ وہ بے فکری سے خراٹاں خراٹاں چل رہی تھی۔ جب کسی نے اچانک اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔
 ۱۳۔ اس نے ہراساں ہو کر چیخا چاہا تو چیخنے کا ذریعہ مسدود کر دیا گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ بے بسی میں گھڑی رہی پھر
 ۱۴۔ اٹھا کر اس نے خود کو آزاد کیا اور نادیکھے بھاگے اندر دوڑ لگا دی تھی۔
 ۱۵۔ اب تک اس کے خون میں نفرت اور کراہیت کے لاؤ بھر کا ریا کرتا تھا۔ جب کبھی اسے یہ بات یاد
 ۱۶۔ آتی تو اس کا رونا روناں چیخ اٹھتا۔
 ۱۷۔ "اب ہاں۔ آئی ہیٹ یو۔ قابل نفرت ہو تم۔ زمین کا بوجھ۔" فون کی تیل نے اسے گھڑی سوچ سے
 ۱۸۔ اس کا ردِ حم بگڑا ہوا تھا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے فون اٹھایا۔
 ۱۹۔ "سری جانب اس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔
 ۲۰۔ "اگلی ہو؟" وہ بھری جانب سے پوچھا گیا۔ "لگتا ہے رسی کو کراہی ہو۔ خیر تو ہے جان ہن!"
 ۲۱۔ "ماشر!" وہ آواز پہچان کر قریبی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔
 (باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

H... for
 خانم کا
 دست خوان
 کتاب کی
 کتاب
 ۳۷۱
 ۵۵
 D...
 ۵۵

"ہاں بھی۔ واؤ۔ واؤ۔۔۔" ایقان کہہ رہی تھی۔
تاعسم نے با آواز بلند شعر لڑکوں کو گھورتے ہوئے پڑھا۔
وہ لائے قلم چمپا کر اب اسے لعنت ہے۔
لڑکوں کی صف میں سرا سیمگی پچیل مٹی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تاعسم نے پھر ہرایا ہے
لائے قلم کبھی چمپا کرتن آیا ہے لعنت ہے
لی وی کبھی دروازے کو دیکھتے ہیں
لڑکے خفیف سے ہو گئے اور لڑکیوں نے حسب پروگرام پر یکیش کیا ہوا مخصوص تقیبہ بلند کیا۔
"کھی کھی کھی کھی۔"
تمزہ جوش جذبات میں اٹھ کھڑا ہوا۔
نہ ہوا پر نہ ہوا ان کو کچھ اخلاق نصیب
"اسے جیتا رہ میرا شیریں صدائے جاواں" علی نے نغمہ مارا۔
تمزہ سر کھمانے لگا۔ جذبات میں آکر ہلاک مصراع تو گھڑ لیا تھا۔ اب کچھ بچھائی نہ رہتا تھا۔
"اے لڑکیوں نے شور اٹھایا۔"
لڑکوں نے فائنل سر جوڑے۔ ایقان نے گفتنی شروع کی۔
"ایک۔۔۔"
نہ ہوا پر نہ ہوا ان کو کچھ اخلاق نصیب
بالا خر وہابی شیعرتار ہو گیا۔
بس اک جاسوسیوں کے شوق سے ان کو مارا۔
"واداد! سبحان اللہ۔ بھی کمال کر ڈیا!"
وہ شب خود ہی چیخ چیخ کر داد دینے لگے۔
ثانیہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی۔
ان کو جو چھپڑا تو نکلا ہے پیشانی عق
اس کا مطلب یہ ہے دعا ہمارا سچا ہے
"واحد راقص" اب لڑکیوں نے شور مچایا۔
ایقان سے سب کو چین کرانا مشکل ہو گیا۔ ایسی ہر محفل آخر میں اسی شور کی تیز موج آیا کرتی تھی۔
"ایک شعر ہم سے بھی سنو بھئی۔؟" چاہک ایک بھاری آواز گوئی۔
فضلیہ یکسر خاموشی چھائی۔ اخترمیاں کھڑے ترس رخ آنکھوں سے ایقان کو گھور رہے تھے۔
جس عائد نکلا تو ہم نے وحشت میں
Car کے چوم نہیں کیا
دروازہ کے لئے اس نے اس نے بھری
Sc میں کو چوم نہیں کیا
جو چوم نہیں کیا
جو چوم نہیں کیا

(54)

چاندنی

Urdu.com Scanned By H

Urdu

اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ واوی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ واوی کے انتقال کے بعد پڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً "نفیسہ" خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ واوی کے انتقال کے بعد ربیعہ تو اتر سے ایک خواب دیکھتی ہے۔ واوی کسی صحرائ میں ہیں اور شدید پیاس کے عالم میں اس سے اپنی طلب کرتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ واوی سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔ حقیقت حیات اپنی ہر عذرا بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیٹی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان۔ شوہر عاشر یا ہرنو کری کرتے ہیں۔ ایقان کو عاشر کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ایقان میکے آئی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی بھانجیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں تب ہی وہاں اختر میاں آگئے۔ اختر اور بھانجیوں کے بیگم کے بھائی تھے اور ایقان کو بہت چاہتے تھے لیکن آٹھویں پاس بے روزگار نوجوان کو لڑکی دیتا تھا۔ ایقان کی بیٹی ہے اور رائے اس کی بھانجی ہے۔ ایقان اپنے بھانجوں بھتیجیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی۔ اختر وہاں آجاتے ہیں اور اس کو فضول اشعار سناتے ہیں۔

تیسری قسط

One

com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

شریک بہت فضول باتیں کرتے ہو تم کتابی باتیں کہتے ہو۔
 چلو پھر گانہ کی بات کرتے ہیں "تج کیا تاریخ ہے؟"
 "اس نے کچھ بھر کو سوچا تھا" "بارہ"
 "بارہ اور چار دن بعد کیا تاریخ ہوگی؟"
 "ولہ شہنشاہی" "بارہ"
 "نہیں جان میں بہترہ تمہارا دماغ تو میری جدائی میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ میں سترہ کو پہنچ کر ٹھیک کرنا
 "وہ شوخی سے بولا تھا۔ ایقان کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ کچھ دیر کے لیے اس سے کچھ بولا
 "سکا۔"
 "تج یہ بہانہ کیوں سوچ رہا ہے؟"
 "شریہ" "تج کچھ کہہ رہے ہو تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔"
 "ہماری قسم"
 "میں۔۔۔ ان عاشروں میں کتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں، کیسے کہوں۔"
 "تم نے بھی کون تو کیا ہے؟" "وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ "تمہاری سانسیں کبہ دی ہیں تمہاری آنکھیں کہیں گی اور میں
 "بھوں سے چھلکتی سانس کی خوشی اپنے اندر اتار لوں گا۔ میرے فون کا انتظار کرنا میں تمہیں فلاٹ کفرم
 "یہ ٹائم بتاؤں گا ٹھیک۔"
 "ہول۔" "وہ اتنا ہی کہہ سکی۔"
 "چلے جاتے ہیں چار دن بعد۔" "وہ بھر خوش ہوا تھا۔" "خدا حافظ۔"
 "خدا حافظ۔" "اس لمحے لب آہستہ سے ہلے تھے۔"
 "میری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔"
 "جان ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ وہ جیسے کسی خواب کے عالم میں تھی خوش کن سرور سے بھر آواہ
 "ت کر کے اپنے خواب کو ختم کرنے کا خطرہ مول لیتا نہ چاہتی تھی وہ تو یہی بیت بن کر اس طلسم میں ہے جس
 "کھڑی مسکراتی رہی۔ یہاں تک کہ ایمان کے رونے کی آواز آئی۔ ایقان نے چونک کر ریسیور رکھا اور
 "میں بارتی ہوئی بھاگی۔ ایمان کو بازوؤں میں بھر کر اس نے چٹاٹ اس کے کئی بولے لے ڈالے۔"
 "میری گڑیا کے لایا آ میں گے" میری شہزادی کے لایا آ میں گے" میری لاڈلی اپنے لایا کو دیکھے گی" ان سے باتیں
 "گی ان سے لاڈ کرنے کی یہ میری گڑیا کے لایا۔"
 * * *
 "میری بند کر کے وہ کسی سوچ میں گھری تاہر کھڑی رہی۔ ڈاؤی کے بنوے میں کل دو سو روپے باقی تھے۔ اسے
 "علم نہ تھا کہ اس رقم کے علاوہ بھی داؤی اپنے پیسے کہیں اور چھوڑ کر گئی تھیں یا نہیں۔ داؤی کی چیزیں اب تک
 "نی جگہ پر اسی حالت میں بڑی تھیں جیسا کہ وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھیں۔"
 "پیسہ نے اب تک ان کی کسی شے کو نہ چھوا تھا۔ ان کا لکڑی کا چھوٹا صندوق جو کمرے کے ایک کونے میں پڑا
 "داؤی کا ضروری سامان اس میں رکھا ہوا تھا۔"
 "صندوق میں پڑے تالے کی چابی داؤی اپنے آزار بند کماندہ کر رکھا کرتی تھیں۔ وہ
 "رہیہ نے ان کی تنہا کے موقع پر نجائی کہاں رکھی تھی۔ اسے اب یاد نہ آتا تھا۔ لالہ داؤی میں بھی داؤی کا

عاشق کی آواز سن کر نجائی کیوں اس کا جی بھر آیا تھا۔ چند لمحوں میں موٹے موٹے آنسو اس کے چہرے
 "ایقان۔ ایقان۔ کہاں گم ہو گئی ہو یا را۔"
 "عاشق! اس کے گلے میں پھنسا دے ہے پڑنے لگے۔"
 "انفیس بولو تو سہی۔" "وہ جھنجھلا گیا۔"
 "تم آتے کیوں نہیں؟" "وہ بھی جھلا کر بولی۔ "کب تک تمہاری آواز اور تمہارے پیچھے ہوئے لوٹوں سے
 "تسلیاں دیتی رہوں۔ میرے اندر اب سی بھر کے لگی ہے اب۔"
 "وہ۔" "وہ ہنس دیا۔" "کتنا اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ سنا۔"
 "میں جل رہی ہوں، تمہیں مزہ آرہا ہے۔" "وہ چڑ کر بولی۔"
 "ارے جانم! ایسا شمس ہوتا ہے جیسے سخت سردی میں آتش والی کے قریب بیٹھا ہوں اور تمہارا یہ
 "ادھوس ہو۔ غصہ اٹھاتا ہے گویا تھوڑے میں ہلک کافی بھی ہے۔ تلخ تر پر لطف دار کفر۔" "وہ خاموش ہو
 "جانتی تھی جتنا اے غم کا اظہار کرتی تھی اتنا ہی مزہ آتا۔"
 "بولو خاموش کیوں ہو گئیں؟"
 "نہیں بولتی بس۔"
 "اچھا میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟"
 "سو رہے ہیں۔"
 "اور کیوں؟" "وہ پھر خاموش ہوئی۔" "تج وہ کچھ زیادہ ہی شرارت کے موڈ میں تھا۔ اس کے غم کو خاطر میں نہ
 "لاتا تھا۔"
 "بہت خوش ہو گیا بات ہے؟" "وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔"
 "میرے واہ بیوی ہو تو ایسی دل کے سمندر میں بلا خوف و خطر ڈکی لگا دیتی ہے اندر کی بات دھونڈلاتی ہے۔"
 "واقعی بہت خوش ہوں۔"
 "کیوں کسی جاپانی لڑکی نے زشتہ بھیجا ہے؟" "وہ طنز بولی۔"
 "ہا ہا ہا۔" "وہ ہنس دیا۔" "جی ہم "غزالی" مٹے" کے رسیا ہیں جام پر جام چڑھانے کے قائل۔ چھوٹے چھوٹے
 "گھونٹوں سے ہمارا کام نہیں بنتا۔" "ایقان اس کی بات سمجھ کر سبے ساختہ ہنس دی تھی۔"
 "بس اگلی مسکان کیوں پر۔" "وہ اسے چھیڑنے لگا۔ "یار ایہ تم خواہیں بھی کیا چیز ہوتی ہو۔ ذرا سی تعریف کے
 "چھلکا ثابت ہوتی ہے۔ لمحہ بھر میں پھسل کر چاروں شانے چت۔"
 "جی نہیں ایسی بھی بات نہیں۔ روٹھنے پر آجائیں تو جان بے کر بھی نہ مانیں۔" "وہ بے نیازی سے گویا ہوئی۔"
 "میرے بابک رہے۔ تم تو جاپانی عورتوں سے زیادہ ظالم ہو۔ کبھی لایہ تو یونہی مشہور ہیں۔"
 "اچھا۔" "وہ تعجب سے بولی۔" "کیوں مشہور ہیں کیا ظلم کرتی ہیں؟"
 "خود پر شہی نہیں سمجھتی۔" "تمہاری کون کی کا انتظار کرتی ہیں۔" "وہ مزے سے بولا۔"
 "ہا ہا ہا۔" "مہمانی کیوں کیا بلا ہے؟"
 "ارے منجھ میرے منجھ" "وہ اطمینان سے بولا۔" "ارے منجھ"
 "اچھا۔ تو خلیہ ارے منجھ کی سہی۔ آپ پھل کیجئے نا۔ کیا خبر کہیں سے مثبت جواب آئے۔" "وہ چل ہی گئی۔"
 "نہیں یار! انہیں تو بتا ہے مالدیو میں جن کے قتل کی ہیں۔ پتا ہے نا؟" "اسے پھر ہنس آئی تھی۔"
 "میرے منجھ میرے منجھ" "وہ ہنس کر کہتی تھیں۔" "ارے منجھ"

"شکر یہ چچا جان!"
 تو یہ ٹھنڈے پورے شربت گھول کر لے آئی تھی۔ رنجیتہ اس سے سمیٹنے کے متعلق استفسار کرنے لگی۔
 "بائی حنا کے گھر گئی ہیں جان کے ہاں درس ہوتا ہے ہر جمعرات کو۔"
 رنجیتہ نے چونک کر تو یہ کوڑھ لکھا پھر ہر گھنٹہ کا گھاس خالی کرنے لگی۔ حنا کے گھر جانے کا مطلب وہ بخوبی جانتی تھی۔
 جالی اسے الماری کے سب سے اوپر پر خانے میں بچے اخبار کے ٹکڑے کے ٹکچے سے مل گئی تھی۔ اسے یاد نہ آتا تھا کہ اس نے کس وقت وہ جالی وہاں رکھی تھی۔ اس وقت تو وہ اپنے ہوش و حواس میں ہی نہ تھی نہ بھلائیہ بے وقعت بات ایسے کیسے یاد رہتی۔ صندوق کھولتے ہوئے اس کے جذبات و احساسات عجیب سے ہورہے تھے۔
 دی جان کی زندگی میں اس نے بھی اس صندوق میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی کسی قسم کا تجسس اس کے اندر جاتا تھا۔
 رادی کی تربیت نے عجب بھول پن اور مقصودیت اس کے اندر سموی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام لیتے والی مدھی سادی تھی لڑکی تھی۔ بے وجہ کے تجسس اور تفکر اسے نہ گھیرتے تھے۔
 پھر رادی نے بھی اس کے لئے اسے اس صندوق کو کھولا بھی نہ تھا۔ وہ اگر کبھی اسے کسی مقصد کے تحت کھولتی بھی تھی تو رنجیتہ کی غیر موجودگی میں۔
 صندوق کا بھاری ڈھکن اٹھا کر اس نے دیوار سے ٹکا دیا اور اندر جھانکنے لگی۔ پہلی نگاہ میں اسے سب چیزیں اپنی اور بے مقصد نظر آئیں۔
 ایک کونے میں سفید پتلے کے کپڑے کی پوٹی تھی۔ دوسرے کونے میں کچھ کاغذات تھے۔ تانبے اور پیتل کے ٹوکے جھوٹے برتن اور استعمال کی ٹوکیں، شیشے کی بوتلیں، ایک برانی الیم تھی۔
 رنجیتہ نے سب سے پہلے الیم نکالی۔ یہ واحد شے تھی جس نے اس کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب مبذول کر دئی تھی۔
 الیم کھول کر وہ تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک اینڈ وائٹ تصویر میں شخصیں ایک سب سے بڑے حد پرانی۔ کسی کسی تصویر میں اسے محض رادی کی پہچان ہو سکتی تھی۔ باقی لوگ کون تھے وہ نہ جانتی تھی۔
 بڑی حیرانی سے وہ تصویریں دیکھتی رہی۔ ایک تصویر پر اس کے ہاتھ رک گئے اور نگاہیں ٹھہر گئیں۔ وہ نوعمر لڑکی سے مشابہہ تھی۔ کچھ حیرت بھاری کام کا وہ بڑا اور بڑا ہونٹوں پر شرمیلیں مسکراہٹ لے رہی تھیں جھکائے ہوئے تھی۔ گلے میں کینڈن کے کام کا بھاری گوبند تھا۔
 نظریں چونکے نیچے تھیں اس لیے تصویر کا تاثر مبہم تھا۔ ہست و حاض نہ تھا۔
 اس چہرے میں شرم تھی بے پناہ کشش۔ رنجیتہ اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکی۔ وہ تصویر کو دیکھتی رہی پھر اپنی نگاہیں اس نے تصویر کو چھوا۔ اس کے رخسار اس کی پلکیں اس کی پیشانی اس کے ہونٹ وہ انگلیوں سے اس تصویر کا ہر نقش محسوس کرتی رہی۔
 اچانک اسے کچھ احساس ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ چھو کر دیکھا۔ اس کا وہم درست تھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی رادی کی تصویر کو دیکھ کر کیوں رو رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

ان کی کچھ ذہنی کتابیں ان کا چشمہ، تنگھا، دنداسہ وغیرہ الماری میں کا بونہ بھی تھا جس میں رادی روزمرہ استعمال کی رقم رکھا کرتی تھیں۔ یہ سب اس بونے میں محض دو سو روپے تھے۔
 رنجیتہ رادی کی وفات کے بعد سے اسی بونے سے رقم نکال کر گھر کا خرچ چلا رہی تھی لیکن آج بجلی کا بل آیا تھا۔ بونے میں پڑے پیسوں سے بل بھرنا ممکن نہ تھا۔
 کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا دھنہ پھیلا کر اوڑھا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی آئی۔ باہر میں آکر اس نے دروازے میں کڑا ڈال دیا اور آہستہ روی سے چلتی سمیٹنے لگی۔ گھر تک چلی آئی۔ دستک جواب میں تو یہ دروازے تک آئی تھی۔
 "ارے! (رنجیتہ باجی آپ! آئیں نا اندر۔)"
 "حاکم چچا ہیں گھر پر؟" رنجیتہ نے سوال کیا۔
 "ہاں ہاں آگیا گھر پر ہی ہیں۔ آئیں نا اندر۔"
 رنجیتہ اس کی معیت میں حاکم چچا کے کمرے تک چلی آئی۔
 "اسلام علیکم چچا۔" اس نے دھیرے سے انہیں مخاطب کیا۔
 "ارے! وہ کھیل اٹھتے۔" رنجیتہ آئی ہے، آؤ بھی آؤ۔ بہت مبارک گھڑی ہے بھی ہماری رنجیتہ نے کتنے بعد گھر سے قدم نکالا ہے۔ ہمارے آنگن کی قسمت جاگ اٹھی۔ تو یہ! رنجیتہ کے لئے دروازہ میں شربت ڈال کر دے۔
 "رہنے دیں بچا جس سے میں جاؤں گی۔ ذرا کام سے آئی تھی۔" وہ شرمندہ ہوئی۔
 "کام بھی ہوتے رہیں گے، کامیوں کے لیے عمر بڑی ہے۔ تم اب تک پتیل کھڑی ہوو۔" انہوں نے تو یہ گھور رہے۔ قافٹ باورچی خانے کی سمت چل دی۔
 "دیکھو رنجیتہ! اور دیکھو۔" انہوں نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھکاتے ہوئے ان کے پاس آئی تھی۔
 "چچا جان! وہ کچھ کام تھا۔"
 "ارے بھی اب کہہ بھی دو۔ یہ ہم سے کیا تکلف برت رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے تم ہمیں اپنا ہی سمجھتی ہیں۔"
 "یہ بات نہیں ہے چچا جان! وہ گھبرا کر بولی۔ "آپ کو اپنا نہ سمجھوں تو دنیا میں اور کون ہے میرا۔"
 "اچھا تو پھر کو کیا بات ہے؟"
 "آپ کو بتا رہی ہوں۔ پچھلی گلی کے آخر پر جو دو دکانیں ہیں وہ ہماری ملکیت ہیں۔ ہر ماہ رادی یا تو خود جا کر ان سے روٹی لے آتی تھیں یا پھر وہ لوگ خودی دے جاتے تھے۔"
 "ہاں ہاں یہ کوئی ہی راز کی بات ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے۔"
 "میں چاہ رہی تھی چچا جان! کہ آپ وہاں جا کر دوکانوں کا کرایہ لادیا کریں۔ ڈیڑھ ماہ سے کرایہ نہیں آیا۔ بجلی کا بل بھی آگیا ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے جمع کروانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"
 "اگرچہ چند لمبے اس کی صورت دیکھتے رہے پھر مسکرائے۔
 "ارے! تو بھی ایک تم ملی جمع کرانے کی فکر بھی کیا کرو گی۔ واہ بھی۔" وہ نے لگے "خیر بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ کرایہ بھی لادوں گا اور مل بھی جمع کروادوں گا۔ میں تمہارے گھر کو اپنے گھر سے جدا نہیں سمجھتا۔ یوں سمجھو۔"
 "جی ہاں! گھر ہے۔" وہ نے لگے "خیر بالکل بے فکر ہو جاؤ۔"

پراسے اپنی ماں کی طلب ہو رہی تھی۔ اس کا دل ماں کے بازوؤں میں چلنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر پرسکون کی نیند سونا چاہتی تھی۔

ماں کے حواسے جنم دیتے ہی ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔

”میں کل تمہارے گھر آئی تھی۔“ رات کو اس نے سمیعا کو بتایا۔ ”تو یہ بتا رہی تھی تم خانا کے گھر گئی ہو۔“

سمیعا کے لب مسکرانے لگے۔

”پھر تم کیا سمجھتی تھی؟“

”میں سمجھ گئی تھی کہ تم تمہارے گھر آئی ہو۔“

”یہ تو سنا کر اس کے گھر آئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے کی چاٹ کھلائی اور بول پلائی۔ بندے بھی خرید کر لائے۔ تم آؤ گی تو دکھاؤں گی تمہیں۔“

”تمہیں ڈر نہیں لگتا سمیعا! رجبہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سمیعا نے اپنے اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کی اعظم ہو۔

”ڈر؟“ پھر وہ ہنس دی تھی۔ ”ڈر کا ہے کا تمہیں سے ڈروں۔ مجھے تو صرف اس کی جدائی کے خیال تھے ڈر لگتا ہے۔“

”تمہیں حاکم چاہا ہے ڈر نہیں لگتا۔ اگر ان کو بتا چل جائے یا اگر نفیسہ خالہ کو بتا چل جائے؟“

”تو کیا ہوگا۔ اس سے کچھ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ سب کو بتا چل جائے۔ سب مل کر ہمارا بیکل پر ہوا دیں گے۔“

”وہ بے فکری سے باتیں ہلاتے ہوئے بولی۔

”رجبہ! بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔ منہ کھولے ہو نقول کی مانند اس کی بے فکری اور بے نیازی کو دیکھتی رہی۔

”تمہیں۔“ تمہیں اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا سمیعا! تمہارے ابا کو یہ چل جائے کہ تمہیں ڈر سے ملتی ہو۔ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ تمہارے ابا کیا سوچیں گے سمیعا! ساری زندگی وہ جب بھی تمہارا چہرہ دیکھیں گے انہیں یہی بات یاد آئے گی۔“

”افوہ“ سمیعا اس کی تنقید سے جراسا ہان کر بولی۔ ”کیا قیامت ہو گئی ہے؟“

”میں نے تو بچے بیٹھے ہیں۔ ساری عمر میری ماں جلتی کر رہی ہے! اسے روگ لگا دیے۔ عمر گئی ہے چارویں۔ میں نے تو بچے دل سے محبت کی ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ جس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں، اسی کے ساتھ شادی کروں گی اسی کے گھر میری ڈولی جائے گی، اسی کی سچ سچاؤں گی۔“

رجبہ کے گل تپ گئے، نگاہیں جھک گئیں۔

”جائے بناؤں تمہارے لیے؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”ایک تو رجبہ سے تم بھی نا۔“ سمیعا نے اس کی حالت دیکھ کر اس کی کم عمری پر اسف سے سر ہلایا۔

”پتا ہے تمہیں ابا کیا کہہ رہے تھے؟“

”کیا؟“

”یہ تمہاری شادی کروانا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ تمہاری لڑکی یوں بھلا کب تک خالی گھر میں رہ سکتی ہے؟“

”کی مرد کے شمار ہے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ان کی نظر میں کوئی رشتہ ہے تب ہی وہ اتنے وثوق سے کہہ رہے تھے۔“

انہیں بھڑک کر کے اس نے واپس صندوق میں رکھ دی پھر اس نے کاغذات نکالے۔ ان میں مختلف چیزیں تھیں۔ بینک کے کچھ کاغذات تھے، کچھ پر اسے خطوط تھے۔ ایک فائل تھی، نجانے کس چیز کی۔ رجبہ کو کاغذات سے دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ وہ تو بڑی فراغت کے ساتھ توجہ کے ساتھ دیکھے جانے والی چیزیں تھیں۔ اس نے کاغذات کو بھی واپس رکھ دیے۔

وہ پینکلی بیکے برتن اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہی۔ سرمہ والی لودھ پینے کا پیالہ، ہاون دستہ، لوٹا، چراغ، چند ایک گلاس اور پلیٹیں۔ نجانے وادی نے یہ برتن کیوں رکھے ہوئے تھے۔

وہ کچھ دیر بیٹھی خالی الذہنی کے عالم میں صندوق کے اندر دیکھتی رہی پھر اس نے زمین کی پوٹلی اٹھا کر باہر نکالی۔ اس کے اندر کسی بھاری سی چیز کا احساس ہوا تھا۔

رجبہ نے پوٹلی کھولی، اندر ایک چھوٹا سا ڈبہ اور ایک سرخ جوڑا رکھا تھا۔ اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ وہ سر جوڑا کام سے مڑتی تھا جواب تک کالانہ پڑا تھا۔ اس کی چمک ضرور دھم پڑ گئی تھی۔ پھر رجبہ نے وہ ڈبہ کھولا، اسے دل دھک سے رکھا۔ اس ڈبے میں طلائی زیورات تھے۔

”رجبہ! نے گندن کے کام کا بھاری گونڈ اور جھمکے استھان سے دیکھے۔ گنگنوں کو ہاتھ میں لے کر ان کے بھارے پن اور مالیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر رجبہ نے اس بات پر اس نے گنگن پرین لیے، گونڈ گئے، ڈال کر کسا، جھمکے کانوں میں پہنتے اس کے بعد اس نے سرخ ڈبہ کھولا اور سر جوڑا ڈال کر آئیے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

آچانک اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ابھی ابھی اس نے یہی روپیہ دیکھا تھا بالکل ایسی۔ اس کے ذہن میں جسم کا ہوا۔

کچھ دیر قبل وہ جس تصور کو دیکھ کر بے اختیاری کے عالم میں رو رہی تھی وہ بالکل ایسی ہی تو تھی جیسی رہا۔

”آئیے میں نظر آ رہی تھی بالکل ایسی ہی۔“

رجبہ تادیر اپنا عکس دیکھتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کبچ چیزیں اس کی اپنی تھیں، بالکل اپنی۔ وہ چہرہ کے کسی بہت ”پائیے“ کی تھیں۔ آنسو ایک مرتبہ پھر بڑی روانی سے اس کے چہرے پر پھسلنے لگے۔

چیزوں کو چھو چھو کر محسوس کرتی رہی اور بڑھتی رہی۔

”ماں! کیا ایک اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”ماں! پھر اس نے چیخ ماری تھی۔

”ماں! ماں! ماں! وہ دھچاڑیں مار مار کر رو دی۔

زندگی میں پہلی بار، پہلی بار اسے ”ماں“ کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں یاد آئی تھی، وادی کی شہنائی کا وہ بیڑا دل غائب ہوا تھا تو ماں کی محبت کا چمکتا مانتا ہوا تھا۔

آج اسے وادی کی نہیں اپنی ماں کی یاد آئی تھی۔ آج پہلی مرتبہ وہ اپنی وادی کے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے رو رہی تھی۔

”لو، لو، لو، ماں! سر جیسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

”یاں! جیسے اس نے بھی محسوس نہ کیا تھا۔

”ماں! شہن کی آواز! کبھی ضرور بہت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔

”مگر جس ذات کو چکھانہ ہو، جس کو شہن کو محسوس ہی نہ کیا ہو، جس نے کو کبھی نہ کھائی نہ ہو بھلا اس کی کب ہوتی ہے۔

انہی نے محبت سے اس کا کلابی نرم چہرہ دکھا اور شرارت سے اس کے بال بگاڑ دیے۔
 "میں نہیں بات کرتا آپ سے۔" وہ بولے چکا تھا۔ "آپ میں جیتے ہی والا تھا، آپ نے سب کو نہیں بکھرا
 "جانو! میرا ہاتھ غلطی سے لگ گیا۔ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں آگوشیں بکھیری ہیں۔" اس نے بڑی معصومیت
 سے کہا۔ "اور آپ کو ہمیشہ یہ غلط فہمی کیوں رہتی ہے کہ آپ جیتنے والے تھے؟ کیا پتا آخر میں میں ہی جیت
 جاتی۔"

منیہہ بیگم نے مسکراتے ہوئے خالہ بھانجے کی باتیں سنیں۔
 "کیوں تنگ کرتی ہو انیہہ میرے بچے کو۔" انہوں نے عمر کو بانٹوں میں بھر لیا۔
 "دیکھیں، نانا نوا! ہمیشہ میرے ساتھ میرے ایمانی کرتی ہیں۔" اس نے صحت شکایت لگائی۔
 "آپ تک اپنا مغز کھپاؤں؟ اس کو تو شرف چکا پھینکا آتا ہے۔ سب کی گوشیں بھی میں چلاؤں اور اپنی
 بھی۔ اور آخر میں جیتیں بھی لازماً!" یہ حضرت اور ایک مرتبہ جیت کر تو موصوف کا جی ہی نہیں بھرتا۔ آٹھ دن
 بازار ہی کھلی جائیں۔ اس نے آگیا کر پیر پھیلائے منیہہ بیگم اس کی۔
 "تم میرے ساتھ کھلا کرو۔ میرا بچہ جتنی مرتبہ کہے گا میں اتنی ہی مرتبہ کھیلوں گی۔"
 "نہیں نانا! آپ کے ساتھ صرف سونے میں مرنا آتا ہے، کھیلنے میں تو عباد ماموں اور انیہہ خالہ جانی کے ساتھ
 مرنا آتا ہے۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ منیہہ بیگم مسکرا دیں۔ انیہہ ہنسنے لگی۔
 "وہ کیوں بھی؟" اس نے پتے پتے ہنسنے پوچھا۔
 "نانا کو ہر اک کوئی اچھا لگتا ہے، نانا کو ہر اک بھی اچھا نہیں لگتا۔ صرف آپ کو اور ماموں کو ہر اک مرنا آتا ہے۔"
 انیہہ کی ہنسی رک گئی۔ وہ ہنٹ بھنٹ کر مصنوعی غصے سے اُسے دیکھنے لگی۔ منیہہ بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔
 "نانا! میرا بچہ آپ کی؟" وہ پوچھنے لگا۔
 "بس بیٹا! اُسے والی ہیں تمہاری ماما! پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔"
 "مما کو اپنا اسپتال اچھا لگتا ہے، گھر اچھا نہیں لگتا۔ انہیں ایسے مریض اچھے لگتے ہیں، ہم اچھے نہیں لگتے۔"
 "انہی باتیں نہیں ہے جانو! آپ کی ماما اکثر ہیں اور ڈاکٹر کا کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ تم یہ بھی تو
 سوچو جب تمہاری ماما کی بیمار کو تحیک کرتی ہوں گی تو ان کی دعا میں دیتا ہوں گا اس کے گھر والے کتنا خوش ہوتے
 ہوں گے۔"

انیہہ نے اسے خود سے قریب کر کے سمجھایا۔
 "خالہ جانی! آپ بھی ڈاکٹر بن جائیں گی پھر آپ بھی ہاسپتال میں رہا کریں گی۔" اس نے منہ سورا۔ "عباد
 ماموں تو ویسے بھی کبھی کبھی آتے ہیں۔ جب ان کے کان کی چھٹیاں ہوتی ہیں اور نہ تو دلہا پور میں ہی رہتے ہیں۔
 میں کیا اکیلا ہی رہا کروں گا؟"
 "کیوں بیٹا! میں جو ہوتی ہوں آپ کے ساتھ۔" منیہہ بیگم بولیں۔
 "آپ کے ساتھ میں پور ہوتا ہوں نانا! انیہہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ اندر آتی ہوئی شملانے دلچسپی
 سے کرے کا ماحول دیکھا۔
 "کون سے لطفے سارے ہو اپنی خالہ کو؟" اس نے بیک کار زئیل پر رکھا اور ماں کے قریب بیٹھ گئی۔
 "آپ کا بھرا اپنی علیست کا بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے۔" انیہہ ہنسنے لگی تھی۔ "اور صاف گوئی اپنے عرق چڑھ
 ہے۔ سنانو کی بھرپور محبت کے جواب میں بے پناہ صاف گوئی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔"

رہے تھے کہ ایک ناک کے اندر اندر تمہاری شادی ہو جائے گی۔
 ریحہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔
 "کیوں کیوں؟" وہ ہراساں ہو کر بولی تھی۔
 "یقیناً ایسے ہی خوش ہوں سمیعہ! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مجھے اکیلے ڈر نہیں لگا۔" BY
 "جی۔" سمیعہ نے سر ہلایا۔ "ریحہ بی بی! یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ کوئی ایسی خوفناک بات بھی نہیں کی کہ تم
 خوف کے مارے جان اڑے دو اور پھر اگر تمہیں اکیلے گھر میں ڈر نہیں لگتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ساری
 عمر تم بونہی گزار دو۔ شادی کر کے مزے کے ڈبو بیٹھے پیدا کرو۔" ریحہ خاموش بیٹھی اس کی گفتگو سنتی رہی۔
 "دیکھو نا! ابھی تمہاری ذمہ داری سارے محلے پر غارت ہے، اخلاقی ہی سی۔ تمہاری شادی کسی بھلے مالٹے
 ہو جائے تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیں گے۔ سب ہی کو یہ بوجھ ہلکا محسوس ہوگا۔" اس نے بغور ریحہ کے
 تاثرات کا مشاہدہ کیا۔
 "آخر تم اکیلی رہ کر کیا کرو گی، تمہارے پاس کون سے کام ہیں؟" وہ آگیا کر بولی تھی۔
 ریحہ آفسروہی ہو گئی۔
 "میں تو رہنا چاہتی ہوں سمیعہ! ابھی تو عمر بڑی ہے شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے لیے۔ میرے ذہن
 میں یہ سب کچھ نہیں ہے، میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا اس لیے میرا دماغ ان باتوں کو قبول نہیں کرتا۔
 مجھے اپنا ذہن بنانے میں کچھ وقت لگے گا۔ تب تک میں سکون سے اپنی پرہیزی مکمل کرنا چاہتی ہوں۔"
 "اوہ۔" اس نے ہر جھکا۔ "تمہارے سر میں خشکی نہیں ہوتی، منیہہ بیگم کی کتابیں پڑھ کر، تمہاری یادیں بڑھنے تو
 تمہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا دیا ہے۔ تمہیں کبھی کوئی بھٹک کا کپڑا چھنے دیکھا ہے؟ کبھی کوئی بناؤ سنگھار کا شوق
 ہی نہ کھا۔ ہمیشہ ہی سادی ہی چٹا باندھے کوئی بلکے سے رنگ کا سوٹ پہنے رہتی ہو۔ اشکوں پر پردہ لیا کالج پڑھ لیا۔
 اب آؤ کیا یہ کیا ہے پڑھنے کے لیے؟"
 ریحہ مسکرا دی۔ سمیعہ ہمیشہ اسی طرح اسے تارا کرتی تھی۔ وہ دونوں بچپن کی سنی ساتھی تھیں، اس لیے
 اس نے کبھی سمیعہ کی باتوں کا برا نہ کیا تھا پھر وہ اس کی ذہنی سطح سے بھی آگیا تھی۔ اب پرہیزی لکھائی سے مطلق
 دلچسپی نہ تھی۔ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ کی مثال دیا کرتی تھی۔ جتنا کچھ بھی وہ پڑھ سکتی تھی، ڈانٹ ڈیٹ اور
 سختی سے پڑھتی تھی اور نہ اسے خود محض خط لکھ لینے کا شوق تھا۔ اس سے آگے اس کی سوچ کے پر جلتے تھے۔
 ریحہ اس کی ذہنی دلچسپی اور میلان سے واقف تھی، سمیعہ کی ایسی باتوں کو مسکرا کر نظر انداز کر دیا کرتی
 تھی۔
 "ابا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں شادی کے متعلق تمہاری رائے معلوم کروں۔" اب کے اس نے صاف گوئی
 سے کہا۔ "بلکہ یہ چاہ رہے تھے کہ تم بس ہاں کرو۔ اب تم جانتی کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔" ریحہ پریشان
 ہو گئی۔
 "سمیعہ! تم انہیں منع کر دو، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چند ماہ بعد یونیورسٹی میں اینڈیشن ہوں گے تو میں
 اردو زبان داخلہ لے لوں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 "پھر تم ہمارے ساتھ رہنا شروع کرو، اپنا گھر بند کر دیا کرتے ہو چڑھا۔ یوں اکیلی تو تم نہیں رہ سکتیں۔"
 ریحہ بے چارگی کے عالم میں ہنسنے لگی۔
 "نہیں بیٹا! خالہ جانی! آپ ہر اک مرتبہ یہی کہتی ہیں۔" وہ اگلے منہ سورا کر دیکھنے لگا۔

"باجی! ایک کپ چائے بناؤ"۔
 "باجی! گنیمت آواز پر وہ مری گئیں۔ اختر میاں نے کچن کے دروازے کی چوکت تھامے کھڑے تھے ان کے ہاتھ پر پل بڑھنے لگے۔
 "بیتھو باجر"۔ "قدرت سے توقف سے وہ بولی تھیں۔ "میں آتی ہوں لے کر"۔
 وہ منہ ہی منہ میں گنگنائے ہوئے کچن کے باہر بڑی چھوٹی ڈاکٹنگ ٹبل پر بیٹھ گئے۔
 کچھ دیر بعد فردوس بیگم چائے کا کپ لے کر باہر آئی تھیں۔
 "بیتھو باجر! شاد رہو! آباد رہو۔" انہوں نے بڑی ترنگائی میں یک تھا۔
 "اختر! تم اپنی حرکتوں کے کب باز آؤ گے؟" وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔
 "ہم تو مسلسل بے حس و حرکت خیال کرتے ہیں خود کو باجی! ایک جود ہے زندگی پر طاری جو ٹوٹا ہی نہیں۔
 اب کون سی حرکت کی بات کر رہی ہیں؟" ان پر فردوس بیگم کے غصے کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ بہت اطمینان سے چائے کے گھونٹ پھرتے رہے۔
 "کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے ہی رہا کرو۔" وہ جیسے پھٹ پڑیں۔ "یہ بھی خیال نہیں کہ یہ ہمارے باوا کا محل نہیں، ہمیں کا سرال ہے۔ میں کوئی حاکم وقت نہیں ہوں یہاں جو ہر وقت تمہاری شکایتوں پر کان پلیٹ کرے نیاڑی کی چادر اوڑھے رکھوں۔ جانتے ہو فاروق نے مجھے کئی قدر ذلیل کیا ہے۔ ان کی اماں نے سند یہ کھلوایا تھا کہ اختر کو کتنی کھوٹے سے بازو اور نہیں بندھتا تو نکال کر باہر کر دیتے۔ یہاں ہماری بہن بیٹیاں ہیں۔ ہم ایسے سر پھرے بے شرم، کھٹکھٹے گفتگوں کو کب تلک یالیں۔"
 "ہم نے کیا کیا ہے باجی!" وہ جیسے زچ ہوئے۔ "ہمارا قصور تو بتلائیے؟"
 "اس روز تم بچوں کی محفل میں جا کھٹے اور اس "حسن کی دیوی" کو دیکھ دیکھ کر عجب قسم کے اشعار پڑھے تم نے ذرا شرم نہ آئی؟ نہیں۔ اس نے جا کر ماں سے شکایت کی اور ماں نے فاروق حسن کو بلوا بھیجا۔ کیسا شامابیلا تم نے سارے کھڑے کئے۔"
 "اب حسن کی دیوی کچھ کچھ کہنا باجی! دیوی ہی تو لگتی ہے۔ اور۔ اور اب تو جیسے شراب پرانی ہو کر لڑ آئی ہو جائے۔"
 "ہاں۔" وہ منہ کھول کر کہتی ہی دیر انہیں نکلتی رہیں۔ "یہ ہے میری سرزنش کا جواب۔ اختر میاں! تم خود تو ڈوبو گے مجھے بھی لے ڈوبو گے۔ ارے میں کہتی ہوں اب وہ بیاتنا ڈوبچوں کی ماں ہے۔ اب تو اس کا پیچھا چھوڑ دو۔"
 "ہم اس کا پیچھا کیسے کرتے ہیں باجی!" وہ انفرنگ سے گویا ہوئے۔ "وہ ظالم ہر اب کی مانند خود ہی نظر آتی ہے خود ہی بلاتی ہے خود ہی دور لگاتی ہے۔ یہاں تو بے اختیار ہے۔"
 فردوس بیگم بھائی کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔ ان کا جی کپٹ گیا تھا۔ ایک ہی تو بھائی تھا ان کا۔ ان سے کئی برس پہلے جو انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ ان کی شادی کے وقت وہ آٹھ دس برس کا تھا۔ ماں باپ سر پر نہیں تھے۔ انہیں اپنے ساتھ ہی کسرال لے آئی تھیں۔
 "کیسی فتن کی تھیں میں نے ان کی۔ بر تم بھی تو کسی قابل ہوتے ان کا بھی کیا قصور تھا اپنی لاڈلی بیٹی کیسے دے دیتیں آٹھ جماعت پاس کھٹو کو سنہ کی روزگار لے آئی تھیں بھلا کیا دیکھ کر وہ بیٹی رہیں۔"
 "بھلا زائل کیسے تھیں۔" ان کے لہجے میں درد تھا۔
 "نہل یہاں کون نہ لکھا ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔ "مذرا بیگم کی پر حال بیٹیاں آنکھ لیتے اتریں تو حقیقہ حیات بیگم کو کچھ

شہلا نے غمگناہ بازو پکڑ کر خود سے قریب کر لیا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ پڑھا۔
 "کیسا ہے میرا بیٹا!"
 "ٹھیک ہوں۔ اگر بیمار ہو جاؤں تو اچھا ہوتا۔" وہ بگڑا بگڑا سا بولا۔
 "خدا آئے کرے۔" شہلا دہل کر بولی۔ "ایسی خرابی بات کیوں کی تم نے؟"
 "پھر آپ گھر پر تو زکیں گی تا میرے پاس۔ ڈاکٹر تو بیمار کے پاس ہی ہوتا ہے۔" شہلا نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔
 "کب بات جتاؤں بیٹا آپ کو میں!"
 "جیائیں۔"
 "ایک ڈاکٹر کے گھر والوں کو بہت ایثار کرنا پڑتا ہے دوسرے لوگوں کی خاطر اپنے جیسے کا وقت بھی دوسرے لوگوں کو دینا پڑتا ہے جب یہ گاڑی چلتی ہے تو ایک بے چارہ ڈاکٹر کہاں کہاں کس کس کو پورا پڑے۔"
 "اب کے اچھے کا نام اگر میں کسی اور کو دیتی ہوں تو اس کا دکھ مجھے بھی ہوتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لیے یہ وقت کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے۔ اب کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے اور پھر میں آپ کو اکیلا تو نہیں چھوڑتی نا۔ اب کی نانو ہوتی ہیں خالہ جالی ہوتی ہیں۔ یہی کبھار عباداموں بھی آجاتے ہیں۔"
 "میرے بھائی تو نہیں ہوتے نا۔ سب بچوں کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں ہمارے گھر میں تو بھائی بھی نہیں ہیں۔ ماما بھی چلی جاتی ہیں۔" شہلا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے اس کی رے عمر کو خود سے علیحدہ کیا تھا۔
 "میں پیچ کر کے آتی ہوں پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔"
 سبزہ بیگم مری سانس بھر کر کہتی ہوئی تھیں۔ انہیں نے عمر کے سر پر چیتا لگا کر اس کی ٹانگ ہلا دی تھی۔
 خال جو دال پکانی ہے غذا کیوں نہیں دیتے
 اس آت سے اس آت تک ہیں روڑ لگاتے دیتے
 جو ہوں کو مارنے کی دا کیوں نہیں دیتے
 وہ شیل کی پلیٹ ڈانٹا کھیل پر اوپر ہی کے بجا بجا کر گارہا تھا۔
 فردوس بیگم جھلا کر کچن سے برآمد ہوئیں۔ "تعلی اسد صراؤ تم۔"
 "کہہ دھڑاؤں خال پیٹ۔" وہ مسخرے پن سے بولا۔
 "کہہ جو رہی ہوں پکے رہا ہے کھانا۔"
 "تب تک سنی رہے میرا گانا۔"
 "میرا اللہ!" انہوں نے ہاتھ پٹا چاہا تو ہاتھ میں تھامی کھٹکھٹے پر لگی۔ علی کی ہنسی نکلی گئی۔
 "تعلی! پیچ کر کراروں کی یہی گفتگو۔" انہیں غصہ آگیا۔
 "کیس اور جا آئے کیسے فقیر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شرم سے سر سرکھٹ کر کہنے لگا۔ "جودے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ فقیر سا مل جاتا ہے۔"
 "جائے گا اب جی یا پیچھی کی دلیلیں چھوٹے۔" وہ جھڑپاتے ہوئے کچن میں ٹھس مٹی تھیں۔
 (47)

جھانکی دلتے۔ وہ تو آنکھ بند کر کے ان کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ حرمین بڑی سوہوں پہلا حق میرا بنتا ہے لیکن ہر کام میں فوقیت عذرا کو حاصل ہے۔ ہر مشورہ پہلے اس سے کیا جاتا ہے پھر میری تباہی آتی ہے۔

کیسی نظر تھی میری رافح پر۔ اتنی خاندان کا سب سے قابل اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ پچھوٹا سا تھا تو میں اپنی عریشہ کو اس کے ساتھ ساتھ رکھتی تھی لیکن ہوا گیا کبھی نے مجھ سے مشورہ لینا بھی پسند نہ کیا۔ میں بھی تیسیر کے بیٹھی ہوں اپنے بیویوں لڑکوں کے لیے اس خاندان کی ایک لڑکی نہ لگوں گی۔ باہین اپنے گھر کی ہو گئی۔ اللہ نے چاہا تو عریشہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ آجائے گا۔ شام علی اور حمزہ کے لیے میں غیر خاندان کی لڑکیاں ملاؤں گی اور ایسی لڑکیاں کہ دنیا کی کسی۔ گاؤں سے ملحقہ قید روم میں بیٹی عریشہ کے کانوں تک ماں کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔

ایک فحش سی سانس بھر کر اس نے تکیہ اٹھا کر سینے پر رکھ لیا۔ بچپن سے ماں نے جو خواب آنکھوں کی پتلیوں پر نقش کر دیا تھا، کبھی کبھی وہ چہنچہ لگتا تھا۔ ہر چند کہ وہ خوابوں کے ہمارے جیسے والی لڑکی نہ تھی واضح اور پر یکھیل سوچ رکھتی تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھی۔

”السلام علیکم ماں!“ رابعہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام“ جیتی رہو۔ ”شفیقہ حیات بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ ”بھوتی کہاں ہو تم کئی دن ماں کو سلام کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھیں۔“
 وہ ماں کے قریب بیٹھ کر محبت سے ان کے پیر دبانے لگیں۔
 ”چچی تو ہو؟“ انہوں نے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”جی ماں! اللہ کا احسان ہے۔ بہت آرام ہے ہوں۔“
 ”رابعہ آئی ہے۔“ عذرا بیگم بڑے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ”کیسی ہو رابعہ!“
 ”شکر ہے اللہ بھلا بھی! آپ سنا میں نے کہاں ہیں۔“
 ”رافح اور نافع تو پچھوڑنے میں پانی کی موٹر ٹھیک کر رہے ہیں۔ سدرہ اور ثانیہ کچن میں ہیں۔ کوئی نئی دوش سا کھانا تیار کر کے دکھا دیتے ہیں۔ لڑکیاں اسی وقت بھائیوں کے پیچھے کہ ابھی چیزیں لا کر دو تو ابھی ہم ہائیں۔“ جاؤ ذرا صبح رافح پانچ سو کی چیزیں لایا ہے اور بے گالیاں۔ سوئی سوٹ دوش کھانے کے بعد سب ایک ایک دو دو چھ کھالیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ میں پانچ سو کی بھری میں دس دن نکال لیتی ہوں۔“
 ”ارے تم لوگ اپنے بچوں سے عاجز بھی بہت ہو۔“ شفیقہ حیات بولی تھیں۔ ”یہ بھی آج کل کا فیشن ہوا کہ جو بات بچوں کے منہ سے نکلے اسے پورا کرنا ماں باپ کا فرض ٹھہرتے گویا یہ زیادہ سے زیادہ محبت کی نشانی ہوتی ہے۔ ہم تو اپنے بچوں کو ایک شیر کی نگاہ دیکھتے تھے اور پھر انہیں بات پر اصرار کی طاقت نہ ہوتی تھی۔ آج کل کے بچے بچیاں تو اور بھی کم طوفان مچا دیتے ہیں۔ پانچ سو کی لڑکیاں کل لگے انہیں تم سے بوتلیں پینے کے بنالانے پانچ سو کا خرچہ آج آج کر دیا۔“
 ”ابنہ آپ کی شیر کی نگاہ کیا ہوئی؟“ عذرا بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔
 ”ہمارے بچوں کے لیے تو آپ کی بکری کا سا گھیر رکھتی ہیں۔ میں نہ دلوں پیتے تو آپ سے ہی سفارش کروا لیں۔ سارے اس وقت ان کی اصرار کی طاقت کمزوری میں بدلا کریں۔“
 ”ابنہ آپ کی شیر کی نگاہ کیا ہوئی؟“ عذرا بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔
 ”ہمارے بچوں کے لیے تو آپ کی بکری کا سا گھیر رکھتی ہیں۔ میں نہ دلوں پیتے تو آپ سے ہی سفارش کروا لیں۔ سارے اس وقت ان کی اصرار کی طاقت کمزوری میں بدلا کریں۔“

”ارے ہوا۔ کیا کہتے ہیں اصل سے سو پیارا۔ بالکل سولہ آنے صبح کما جس نے بھی کہا۔ اپنے بچوں کو تو ڈانٹ مار بھی لیتے تھے ان سب کو دیکھ کر مجھے کٹاں سے پیار آتا ہے اور چلاک بھی کیسے ہیں سب کے سب۔“
 ”نئے نیا بیاناہ تراش کر لاتے ہیں۔ میں تو اپنے رکھے ہوئے بھی اٹھا کر دے دیتی ہوں۔“
 رابعہ بھی ہنسنے لگیں۔ ”پھر بھائی کو کیا کہتی ہیں۔“
 ”اے ماں! دھیان آیا۔ عاشر میاں آ رہے ہیں۔“ شفیقہ حیات چونک کر بولی تھیں۔
 ”اچھا۔“ رابعہ بیگم کو بھی مسرت ہوئی۔ ”کب؟“
 ”کل ایجن کا فون آیا تھا۔ خوشی کے مارے باولی ہو رہی تھی۔ صبح طور سے کچھ بتلایا بھی نہیں۔ رافح کا پوچھ رہی تھی۔ اسے اور نورت بیگم کی عاشر میاں کو لینے۔ شام بھی جائے گا۔“
 ”اچھا!“ رابعہ بیگم کا چہرہ بھی چمکنے لگا تھا۔ ”اللہ اس کی خوشیاں سلامت رکھے۔ بہت محنتوں کرتی ہے عاشر کی غیر موجودگی کو۔“ کتنے دنوں کے لیے ارہا ہے؟“
 ”بتا تو رہی ہوں باس دیوانی کو کچھ نہ سوچتا تھا بس اتنا کہا تھا! پر سوں عاشر آ رہے ہیں رافح کہاں ہے اس سے کہنا مجھ سے فوراً بات کر لے۔“ اتنی ہی بات کی۔“
 اسی اثناء میں ثانیہ اور سدرہ دو دو گئے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔
 ”اللہ! پچھو بھی ہیں۔ السلام علیکم پچھو! دیکھیں تو کیسی مگر نفل دوش تیار ہوئی ہے!“ ان کے چہرے چمک رہے تھے۔
 ”وعلیکم السلام۔ ابھی تمہاری بیٹی دوش گھنگو کا موضوع تھی۔ کیا بنایا ہے؟“
 ”بنایا بھی ہے یا بگاڑا ہے۔“ ہنستا ہوا رافح اندر آیا تھا۔
 ”گھنگو کچھ بھائی! انگلیاں چبا جائیں گے۔“ ثانیہ فخریہ بولی۔
 ”بشرطیکہ انگلیاں تمہاری ہوئیں!“ وہ فولڈ کی ہوئی آستینیں سیدھی کرنے لگا۔
 ”میری توجہ چاہیے جب دوش پسند نہ آئے۔ اطالوی دوش ہے اس کا تو نام ہی اتنا مزے دار تھا۔ بھلا کیا نام تھا۔“
 ”کچھ عجیب و غریب سا ہی تھا۔ خیر چھوڑو پیرست۔“
 وہ پالوں میں کسرو ڈھانچا ڈالنے لگی۔
 ”پائن اپیل اس میں مینگو اس میں اناریم اس میں بھلا مزے دار کیون نہ ہو؟“ رافح نے چچ بھر کر منہ میں ڈالا۔ ”یہ سب چیزیں ویسے ہی مکس کر کے کھاؤ تو مزہ دوش کی قہ تمہارا کیا کمال اس میں؟“
 ”جی ہاں۔“ دھنسنے ہم نے کچن میں بھاڑ جھونکا ہے!“ وہ جھلائی۔
 ”دو تو تمہارے بال دیکھ کر ہی لگتا ہے!“ حمزہ برآمد ہوا۔
 ”رافح بھائی! آپ یہاں دعوت شیراز اڑا رہے ہیں وہاں نافع سمجھ رہا ہے آپ چار منہ والا پانچ کس لینے گئے ہیں۔“
 ”ارے یار! میں بھول گیا۔ ذرا یاد دکر دے او۔“
 ”آپ اپنا پیالہ مجھے پڑا دیں ناں۔ میرا تھن میں آپ حصہ لے لیں۔ یوں بھی نافع تھے ہن کی بات نہیں۔“
 ”شیں کو صبح کرنا۔ وہ صرف آپ کو اسٹ کرتا ہے۔“
 ”ارے بھائی! میرا پیالہ یہ مجھے پانچ سو کی قربانی دے کر ملا ہے۔“ چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا۔“
 ”اور وہ آپ کا اسٹھن ہے؟“

Scanned By HarfeDua for Urdu

”وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹی! لیکن مجھے سی بڑھیوں کو تو دوسرے ستاتے ہی ہیں۔ تم ماشاء اللہ جوان ہو بہادر ہو تم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہو جو معصوم اور شگ سے تھک رہی ہو۔ ہم بوڑھے لوگوں کو تو وقت یوں بھی شکی مزاج بنا جاتا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”اور پھر تمہیں بھلا زمانے کی کیا پہچان! یہاں تو شیطان بھی فرشتے کا بہروپ بدل کر آتا ہے۔ شیطان بن کر آئے تو لوگ ماحول بڑھ کر بھگتے دیں!“

”جیسے ان کے پاس بیٹھ گئی۔ آج نفیسہ خالہ کی باتوں میں نلنے کا کچھ زیادہ رنگ ملا ہوا تھا اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب ان کے پاس کرنے کو کوئی اہم بات ہوتی۔ ورنہ زیادہ تر تو وہ نکلے میں گردش کرتی خبروں پر تبصرے سے گفتگو کا آغاز کیا کرتی تھیں۔“

”کیا بات ہے خالہ؟“

”اے لوب بات کیا ہوتی ہے۔ کچھ نہیں بھلا بتاؤ! وہ چپکلی سی ہنس ہنس دیں۔“ پریشان ہو گئیں؟

”نہیں پریشانی کی کیا بات خالہ جان! آپ جیسے بھلے لوگ میسر ہیں۔“

”بھلے مانسوں میں بھی بڑے لوگ پیچھے پیچھے ہوتے ہیں بیٹی! وہ تذبذب سے بولیں۔“ ”یہ بتاؤ! تمہارا دور بار کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں جس کے پاس تم یہ تنہائی کے چند دن گزار لو اور دنیا کی بری نظروں سے بھی بچی نہ ہو۔ کوئی نایا، لانا، چچا، چچا کوئی تو ہو گا؟“

”پتا نہیں خالہ!“ وہ اس ہو گئی۔ ”دادی جان تو کبھی اس موضوع پر بات ہی نہ کرتی تھیں مجھے تو اب ہوش آیا ہے کہ دنیا میں انسان کے اتنے رشتے ناکتے ہوتے ہیں۔ میرے ذہن نے تو حالات و واقعات کتنے خود بخود یہ اخذ کیا ہوا تھا کہ دادی جان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے نہ کسی میں نے بوجھا نہ انہوں نے چھایا۔“

”دادی کے کمران سے تمہیں ایسا کچھ نہ ملا جو تم اندازہ کر لیں اس بات کا؟ کوئی خط کسی کی کوئی چٹھی۔“

”مجھے کدہن میں وہ انصاف پر اور کاغذات گھوم گئے جو دادی کے صندوق میں پڑے تھے۔“

Scanned By HarfeDua for Urdu

”اس نے بھی بلا لود عورت اطالیہ اڑانے کو۔“

”اللہ۔ آپ سارے دن مجھے تو ہماری دوش کا دیوالیہ نکل جائے گا!“ کانیتہ گھبرائی۔

”نکل جائے گا نہیں نکل چکا!“ نافع اور علی بھی چلے آئے۔

”کانیتہ اور سدرہ ٹھنڈی سانس بھر رہی تھیں۔“

”جاؤ کانیتہ! ورنہ اور نافع کو بھی بلا لاؤ۔“ ہاشم کو بھی دیکھو گھبر رہا ہوتا ہے بھی بلا لود۔ سب مل کر کھاؤ۔“ عذرا

”جی آئی!“ اس نے سر ہلایا اور بے بسی سے اٹھ کر چل دی۔

اس نے اپنی سب کتابیں اور نوٹس وغیرہ نکالے ہوئے تھے اور اب بیٹھ کر انہیں تسلی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان سب کی درجہ بندی کر کے ترتیب سے رکھنا چاہتی تھی۔ کئی دنوں سے وہ یہ کام کرنے کا بیڑ کر رہی تھی لیکن ہر مرتبہ سستی آڑے آجایا کرتی۔ آج اس نے یہ کام کرنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔

یوں بھی اب وہ سوچتی تھی کہ فاسر اوقات میں زیادہ سے زیادہ بڑھائی کرے۔ لی۔ اے کا امتحان اس نے تو نہیں معمولی سی تیاری کے ساتھ دے دیا تھا لیکن ایم۔ اے وہ پوزیشن کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے مکمل توجہ کے ساتھ بڑھائی کی ضرورت تھی جو وہ دادی کی اچانک وفات کے بعد سے اب تک نہ کر سکی تھی۔ اس کا ذہن متاثر ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہوئی تھیں۔ سوا ب وہ اطمینان اور تسلی سے بیٹھ کر اسی کئی کو پورا کرنے کا عزم کیے ہوئے تھی۔

دروازہ بجاتا تو اسے کوفت ہوئی۔ کتنے بوڑھے ساتھ وہ کتابیں لے کر بیٹھی تھیں ہر مرتبہ اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ بھلے والے اس کا زیادہ سے زیادہ خیال نہ کیے کے چکر میں اس کے آرام اور سکون میں بھی دخل ہو جایا کرتے تھے۔

اس نے اٹھ کر دروازے کی چٹنی گرائی۔ باہر نفیسہ خالہ کھڑی تھیں۔

”آئیں خالہ!“ اس نے پھرتے پڑے پھر اہٹ سجائی۔

”ٹھیک ہو بیٹی؟“ وہ پیر تھکتی چلی آئیں۔

”جی ہاں شکر ہے خدا کا!“

”بڑھ رہی تھیں ہاں بیویوں نے حالات کا بغور معائنہ کیا۔“

”جی۔“ وہ سننائی۔

”جانتی تھی کہ اب خالہ گھنٹہ بھر سے پہلے نلنے والی نہ تھیں۔ وہ تو جاتے جاتے دروازے پر ہی آؤھا گھنٹہ نشانہ کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ ”خدا حافظ“ کہتیں اور پھر انہیں کوئی نیا خیال چھیر جاتا۔“

”اچھا اچھا۔“ بڑھتے بڑھتے میں تو یوں ہی نگاہ مارنے چلی آئی تھی! ”وہ جائز پائی پر بیٹھ گئیں۔“ ”میلی بچی ہو بار بار یہ دھیان تمہاری طرف جا رہے ہیں تو آجئے سکون کے لیے بیٹی۔ بھلا بتاؤ! چین کی نیند سو سکتی ہوں۔ دھیان تو تم میں انکار کرنا ہے۔“ رابعہ مسکرا دی۔

”کیوں فکر کرتی ہیں خالہ جان زمین نے کتنی مرتبہ سنبھالیا ہے۔ آپ کو۔ میں بالکل اطمینان سے رہتی ہوں۔ نہ کوئی خوف نہ ڈر نہ گھٹکانہ اندیشہ۔“ آپ سب لوگ میرے آس پاس بیٹے ہیں۔ دیوار سے دیوار ملتی ہے۔ پھر بھی میں ہر وقت دروازے کھڑکیاں بند کر کے رہتی ہوں۔ کسی آپ کو درد ان کھلا ملا؟“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ

مختصر خوبصورت و مقبول ناول

☆ میر خوب ریزہ ریزہ مایامک 300% ☆ الامام میل 180% عید احمد

☆ ایک دینا جلائے کھانا مایامک 300% ☆ شہر دل کے دروازے شمار چودھری 250%

چادوں مناول ایک سنگ تھہ ہینگوانے پر ڈاک خرچ فرماتے

☆ خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفٹ میمر

’شباع ہو گئے اہلیں‘

آج ہی قریبی بیکسپتال سے حاصل فرمائیں

57 اردو بازار، کراچی

2216361 فون

مکتب عمران ڈائجسٹ

Scanned By HarfeDua for Urdu

50

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے،

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہذا انہیں صفات پر یہ آیات درج میں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور فرمائیے۔

۱۶. خوبصورت لکھا تھا۔

تسلیک سے آج اس بیڈروم کی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی۔

دیواروں پر بہت ہکا بشتی رنگ ہو چکا تھا۔ فریچر تبدیل ہو گیا تھا۔ فریچر گرین ہلر کا کارپٹ دیوار تا دیوار اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ جیسے پیروں تلے شربت گھاس ہو۔ پردے مونگیا رنگ کے تھے جن پر سنہری پتے دھیرے سے اپنی چمک کبھی کبھی دکھاتے تھے۔ سائیڈ ٹیبلز پر خوبصورت سنہری میسج بچھے تھے۔ فینس لائٹس کی مدد سے، حسین رنگ بشتی میں سنہری ڈاکٹر رنگ ماحول کو بہت ترسوں اور روان انگیز بنا رہے تھے۔

اس نے بے نظر غائر نگاہیں کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر کمرے سے نکل آئی۔

ایمان اور مومن لاؤنج میں بچے کا رپٹا پر بیٹھے "مسلمانی" کے پیکٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ان تک

”میرے پیارے پیارے بچے کیا کر رہے ہیں! اس نے دونوں گونا گونوں میں بھریا۔

”مما سلائی کھائیں!“ موز میں نے اس کے منہ میں ڈالی۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

دو دن سے وہ اسی ”مصروفیت“ کا شکار تھی۔ پورے گھر میں ڈال دیا تھا۔ ہر شے میں اس کی پسند کا خیال رکھتا تھا۔ اپنے لیے بھی وہ ہنگامی بنیادوں پر ایک سبز سوٹ خرید کر لائی تھی۔ ساتھ ہی سفید اور ہرے موتیوں والی خوبصورت پینل لے بھی لی تھی۔ لباس کر کے پیشکش بھی کر دیا تھا۔ یعنی کہ ہر طرح کی تیاری مکمل تھی۔ بس اب اس کی آمد کا پل پل گنتا رہ گیا تھا۔

By Haris

”ہوں۔“ اُن نے گہری سوچ سے باہر آ کر بیٹے کی صورت دیکھی۔
”بھابھ آئیں گے؟“ وہ بھرپور طریقے سے مسکرا دی۔

Handwritten: Data for...

”ہاشم تیز چلاؤ ناگاڑی“ وہ جھلائی تھی ”ایسا لگتا ہے گدھا گاڑی میں بیٹھی ہو“

یہ راجہ جو اگلے بیٹھا ہے۔ "وہ سکر آیا، دمکدھا گاڑی، سی ہے۔"
 "نئے گاڑی آپ بھیج رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض کیے! (زور سے بولا۔

”یہ ذرا مختلف قسم کی گاڑی ہے۔ اس میں گدھا برابر میں بیٹھا ہوتا ہے۔ پھر اس کا اطمینان قابل دید تھا۔
رائف نے سیاہ کا سبز کے عقبتار سے اسے دیکھا۔
”تم تنہا؟“

”میرے ہینڈ سم نظر آنے سے جیٹے ہوئے“

BY HANCOCK & CO. 53

anned
53
Date Due

”ہاں خالہ جان! کچھ خط وغیرہ لے تو ہوں لیکن میں نے ابھی پڑھے نہیں۔“
 ”مجھلا بتاؤ۔“ انہوں نے اس کی کم عقلی پر ماتھا پیٹا۔ ”اے بے یابی! ایسی معصومیت بھی انسان کو نفع نہ دے۔“

تقصان ہی دے۔ بڑھ کر بھول گیا لکھنا ہے ان میں۔

”یہ بات یہ ہے کہ تمہاری سیکینہ بوا کے جو ہنوی ہیں عرفان شوکت صاحب ان کی نظر اب تمہارے
”دیکھو بیٹی! بات یہ ہے کہ تمہاری سیکینہ بوا کے جو ہنوی ہیں عرفان شوکت صاحب ان کی نظر اب تمہارے

چونہوں کا کام کرنا چاہتے ہیں تاکہ محلے کی غریب عورتوں کو شکم اجرت دے کر زیادہ نفع کمایا جائے۔ اب سیکھنے تو اپنا

تھم گئے تھم گئے انہیں غصے کی آگ لگی۔ آج میرے پاس آئی تھی اس پر تو ہنسنی کا جاؤ چل کیا ہے۔

چاہتی ہے کہ تم بھی مکان بیٹھے پر رخصتا منڈو جاؤ۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن خالص جان! میں کیوں اپنا گھر بیچوں؟ اور پھر میں جاؤں گی کہاں۔ یہ گھر تو میری پناہ گاہ ہے۔ میری

”جب ہی تو کہتی ہوں تمہیں کسی عزیز تر شخصہ دار کے گھر جا کر رہو۔ یہاں تالا ڈال دو۔ ورنہ یہ لوگ تمہیں تنگ

کریں گے تو کم بخت پیسے والا آدمی ہے۔ ہے بھی پورا ابد معاش۔ کہیں تو ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔
 راجہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح کے حالات کا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نام و نشان نہ تھا۔

۳ اور سیکندروا ۴ اے یسین نہ آتا تھا۔ ۵ تو بھی ۶ (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰) (۱۰۱) (۱۰۲) (۱۰۳) (۱۰۴) (۱۰۵) (۱۰۶) (۱۰۷) (۱۰۸) (۱۰۹) (۱۱۰) (۱۱۱) (۱۱۲) (۱۱۳) (۱۱۴) (۱۱۵) (۱۱۶) (۱۱۷) (۱۱۸) (۱۱۹) (۱۲۰) (۱۲۱) (۱۲۲) (۱۲۳) (۱۲۴) (۱۲۵) (۱۲۶) (۱۲۷) (۱۲۸) (۱۲۹) (۱۳۰) (۱۳۱) (۱۳۲) (۱۳۳) (۱۳۴) (۱۳۵) (۱۳۶) (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۳۹) (۱۴۰) (۱۴۱) (۱۴۲) (۱۴۳) (۱۴۴) (۱۴۵) (۱۴۶) (۱۴۷) (۱۴۸) (۱۴۹) (۱۵۰) (۱۵۱) (۱۵۲) (۱۵۳) (۱۵۴) (۱۵۵) (۱۵۶) (۱۵۷) (۱۵۸) (۱۵۹) (۱۶۰) (۱۶۱) (۱۶۲) (۱۶۳) (۱۶۴) (۱۶۵) (۱۶۶) (۱۶۷) (۱۶۸) (۱۶۹) (۱۷۰) (۱۷۱) (۱۷۲) (۱۷۳) (۱۷۴) (۱۷۵) (۱۷۶) (۱۷۷) (۱۷۸) (۱۷۹) (۱۸۰) (۱۸۱) (۱۸۲) (۱۸۳) (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰) (۲۰۱) (۲۰۲) (۲۰۳) (۲۰۴) (۲۰۵) (۲۰۶) (۲۰۷) (۲۰۸) (۲۰۹) (۲۱۰) (۲۱۱) (۲۱۲) (۲۱۳) (۲۱۴) (۲۱۵) (۲۱۶) (۲۱۷) (۲۱۸) (۲۱۹) (۲۲۰) (۲۲۱) (۲۲۲) (۲۲۳) (۲۲۴) (۲۲۵) (۲۲۶) (۲۲۷) (۲۲۸) (۲۲۹) (۲۳۰) (۲۳۱) (۲۳۲) (۲۳۳) (۲۳۴) (۲۳۵) (۲۳۶) (۲۳۷) (۲۳۸) (۲۳۹) (۲۴۰) (۲۴۱) (۲۴۲) (۲۴۳) (۲۴۴) (۲۴۵) (۲۴۶) (۲۴۷) (۲۴۸) (۲۴۹) (۲۵۰) (۲۵۱) (۲۵۲) (۲۵۳) (۲۵۴) (۲۵۵) (۲۵۶) (۲۵۷) (۲۵۸) (۲۵۹) (۲۶۰) (۲۶۱) (۲۶۲) (۲۶۳) (۲۶۴) (۲۶۵) (۲۶۶) (۲۶۷) (۲۶۸) (۲۶۹) (۲۷۰) (۲۷۱) (۲۷۲) (۲۷۳) (۲۷۴) (۲۷۵) (۲۷۶) (۲۷۷) (۲۷۸) (۲۷۹) (۲۸۰) (۲۸۱) (۲۸۲) (۲۸۳) (۲۸۴) (۲۸۵) (۲۸۶) (۲۸۷) (۲۸۸) (۲۸۹) (۲۹۰) (۲۹۱) (۲۹۲) (۲۹۳) (۲۹۴) (۲۹۵) (۲۹۶) (۲۹۷) (۲۹۸) (۲۹۹) (۳۰۰) (۳۰۱) (۳۰۲) (۳۰۳) (۳۰۴) (۳۰۵) (۳۰۶) (۳۰۷) (۳۰۸) (۳۰۹) (۳۱۰) (۳۱۱) (۳۱۲) (۳۱۳) (۳۱۴) (۳۱۵) (۳۱۶) (۳۱۷) (۳۱۸) (۳۱۹) (۳۲۰) (۳۲۱) (۳۲۲) (۳۲۳) (۳۲۴) (۳۲۵) (۳۲۶) (۳۲۷) (۳۲۸) (۳۲۹) (۳۳۰) (۳۳۱) (۳۳۲) (۳۳۳) (۳۳۴) (۳۳۵) (۳۳۶) (۳۳۷) (۳۳۸) (۳۳۹) (۳۴۰) (۳۴۱) (۳۴۲) (۳۴۳) (۳۴۴) (۳۴۵) (۳۴۶) (۳۴۷) (۳۴۸) (۳۴۹) (۳۵۰) (۳۵۱) (۳۵۲) (۳۵۳) (۳۵۴) (۳۵۵) (۳۵۶) (۳۵۷) (۳۵۸) (۳۵۹) (۳۶۰) (۳۶۱) (۳۶۲) (۳۶۳) (۳۶۴) (۳۶۵) (۳۶۶) (۳۶۷) (۳۶۸) (۳۶۹) (۳۷۰) (۳۷۱) (۳۷۲) (۳۷۳) (۳۷۴) (۳۷۵) (۳۷۶) (۳۷۷) (۳۷۸) (۳۷۹) (۳۸۰) (۳۸۱) (۳۸۲) (۳۸۳) (۳۸۴) (۳۸۵) (۳۸۶) (۳۸۷) (۳۸۸) (۳۸۹) (۳۹۰) (۳۹۱) (۳۹۲) (۳۹۳) (۳۹۴) (۳۹۵) (۳۹۶) (۳۹۷) (۳۹۸) (۳۹۹) (۴۰۰) (۴۰۱) (۴۰۲) (۴۰۳) (۴۰۴) (۴۰۵) (۴۰۶) (۴۰۷) (۴۰۸) (۴۰۹) (۴۱۰) (۴۱۱) (۴۱۲) (۴۱۳) (۴۱۴) (۴۱۵) (۴۱۶) (۴۱۷) (۴۱۸) (۴۱۹) (۴۲۰) (۴۲۱) (۴۲۲) (۴۲۳) (۴۲۴) (۴۲۵) (۴۲۶) (۴۲۷) (۴۲۸) (۴۲۹) (۴۳۰) (۴۳۱) (۴۳۲) (۴۳۳) (۴۳۴) (۴۳۵) (۴۳۶) (۴۳۷) (۴۳۸) (۴۳۹) (۴۴۰) (۴۴۱) (۴۴۲) (۴۴۳) (۴۴۴) (۴۴۵) (۴۴۶) (۴۴۷) (۴۴۸) (۴۴۹) (۴۵۰) (۴۵۱) (۴۵۲) (۴۵۳) (۴۵۴) (۴۵۵) (۴۵۶) (۴۵۷) (۴۵۸) (۴۵۹) (۴۶۰) (۴۶۱) (۴۶۲) (۴۶۳) (۴۶۴) (۴۶۵) (۴۶۶) (۴۶۷) (۴۶۸) (۴۶۹) (۴۷۰) (۴۷۱) (۴۷۲) (۴۷۳) (۴۷۴) (۴۷۵) (۴۷۶) (۴۷۷) (۴۷۸) (۴۷۹) (۴۸۰) (۴۸۱) (۴۸۲) (۴۸۳) (۴۸۴) (۴۸۵) (۴۸۶) (۴۸۷) (۴۸۸) (۴۸۹) (۴۹۰) (۴۹۱) (۴۹۲) (۴۹۳) (۴۹۴) (۴۹۵) (۴۹۶) (۴۹۷) (۴۹۸) (۴۹۹) (۵۰۰) (۵۰۱) (۵۰۲) (۵۰۳) (۵۰۴) (۵۰۵) (۵۰۶) (۵۰۷) (۵۰۸) (۵۰۹) (۵۱۰) (۵۱۱) (۵۱۲) (۵۱۳) (۵۱۴) (۵۱۵) (۵۱۶) (۵۱۷) (۵۱۸) (۵۱۹) (۵۲۰) (۵۲۱) (۵۲۲) (۵۲۳) (۵۲۴) (۵۲۵) (۵۲۶) (۵۲۷) (۵۲۸) (۵۲۹) (۵۳۰) (۵۳۱) (۵۳۲) (۵۳۳) (۵۳۴) (۵۳۵) (۵۳۶) (۵۳۷) (۵۳۸) (

اگرچہ اس کا توجہ بنوائے گا لیکن میں نہیں لکھ سکتا ہوں کہ اس کی باتوں میں اور پھر اس کا توجہ بنوائے ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت مروت برتے۔ لیکن تم سے اس کا کیا واسطہ۔ تمہیں تو

”میں سوچتی ہوں خالہ جان!“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

برارنگ اے پسند تھا۔ بے حد پسند تھا۔ بقول ابن کے اس نے جب ایقان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ہرے رنگ کا

یوں بھی وہ زندگی کی زد و مرز کی باتوں میں بھی اپنی پسند کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ کوئی چیز خریدتا اپنی پسند کے رنگ کو ضرور ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

یاں گے اور وہ بکھرے رنگ کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ اس کی جیوری میں زانہ کھڑے ہوتی یاں گے ہوتے ہری چوڑیوں سے ڈبے کے ڈبے اٹے رٹے تھے۔ بچوں کے کپڑوں میں بھی اسی رنگ کا تناسب

ایقان کو گلابی رنگ پسند تھا۔ ان کی شاہی ہوئی تو عاشر نے بیڑوم میں گلابی پینٹ کروایا۔ فرخ پیر بھی گلابی اور

52

”خیر اب یوں تو مت کہو۔“ پیچھے بیٹھی ایقان اچھیند رہ سکی۔ ”رافع تو خاندان کا سب سے وجیہ تیرا کا ہے۔“

”یہ تو ذات زیادتی کر گئیں پھپھو!“ ہاشم خفا ہوا۔ ”یعنی آپ نے مجھ سے حسین نوجوان کو نمبر دو کر دیا!“ رافع نے

اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

”ہاں۔ تم بھی گڈ لکنگ ہو۔“ وہ بولتی تھی۔

”ہاں۔ مزید زیادتی، جیسے دل رکھ رہی ہوں۔“ وہ مزید خفا ہوا۔

”جائیں۔ میں تیز گاڑی چلاتا۔ گھنٹہ بھر انتظار کرواؤں گا، آپ کے صاحب کو۔“ اس نے رفتار بالکل نرم کر لی۔

”اللہ ہاشم اچ بولنے کی تو سزا نہیں جوتی ہے سزا تو جھوٹ بولنے کی ہونی چاہیے۔“

”کتنی دور میں جی رہی ہیں ڈیئر پھپھو؟“ وہ ہنسا۔ ”آپ تک پرانی اقدار میں زندہ ہیں۔ ہاں تو بچ بولنے والے کے لیے گولی ہے۔ کٹر درویش نہیں بندوق کی۔“

”بھئی۔ مجھ سے خطرناک باتیں مت کرو۔ میرا موڈ آج بہت اچھا ہے۔“

”وہ تو آپ کی تیاری سے ظاہر ہے۔“ اس نے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا۔ ”بس نیچے ٹیکے کی کرسی ہے۔“ ایقان کو

”رافع! ذرا ایک چیت لگاؤ اس بد تمیز کے۔“ رافع نے جھٹ ایک منگہ اس کے بازو پر رسید کیا۔

”ارے بد تمیز شخص! وہ بلبلایا ہے۔“ ڈیئر پھپھو نے چیت کہا تھا۔ ”میں چیت اور لگے نہیں فرق نہیں پتا۔“

”نہیں!“ اطمینان سے جواب دیا۔

”یہ منگہ اور یہ چیت!“ اس نے گیتر چھوڑ کر اسے دونوں اشیاء سے نوازا۔ رافع نے بلبلایا اسے دیکھا۔ ایقان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”توبہ توبہ ایک سے بڑھ کر ایک ماؤں ہے۔“ حیات ولا“ میں۔

”آپ توبہ بہت خوش ہیں۔“ حیات ولا“ سے جا کر اڑا رافع ہنسا۔

”ہاں۔ خوش تو ہوں۔“ اس کے لبوں پر پھر ولفریب مسکراہٹ برتھاں ہو گئی۔

”وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔“ ایر پورٹ کی عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔

کافزات سناٹے پھیلا کر اس نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ ان میں کئی خطوط تھے۔ اس نے ایک خط منتخب کیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

بیاری امی جان!

السلام علیکم

ربیعہ نے حیرانی سے کاغذ سینے سے لگایا۔

”امی جان! کیا مطلب ہے؟“

”باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ“

(54)

"داؤی! امیری! کیسی قیس؟" ایک قد بڑے سمجھ دار لڑکی سوال کرتی۔
 "داؤی! چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو جاتی ہیں؟"
 "جی ہاں! اچھی تھیں؟ پیاری تھیں؟ جانیں؟"
 "ریحہ! داؤی کی آواز میں اتنی پیہمیہ ہوتی۔
 ریحہ یکدم چپ ہو جاتی۔ پھر وہ یہ سوال کرتا ہی بھول گئی۔
 "داؤی! میرے ابو آپ کے اکلوتے بیٹے تھے؟" کسی رنگ میں اگر وہ پوچھ بیٹھتی۔
 کام کرتی داؤی جان کے ہاتھ رک جاتے۔
 "ان کے علاوہ آپ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی؟"
 داؤی جان کی جانب سے کوئی جواب نہ آتا۔
 "ایک ایسے احساس ہو گیا کہ داؤی جان دور ہی ہیں۔ ان کے چہرے پر خاموش آنسو بہ رہے ہیں۔
 وہ جلدی سے اٹھ کر ان سے پلٹ جاتی۔
 "سوری داؤی! اب نہیں پوچھوں گی۔"
 ایک مہر تھی جو کبھی نہ ٹوٹی۔ ایک نقل تھا، کبھی نہ کھانا۔ ایک راز تھا، سوا ب سو رہا تھا۔ داؤی کے ساتھ ان کی قبریں۔
 ریحہ خط کو سینے سے لگا کر آنکھیں موند کر لٹ گئی۔ فی الحال وہ احمد جہاں زیب کے چند لمحوں کے لیے جی اٹھنے
 کے احساس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔
 "یہ سب کچھ عاشر بھائی! اچھا! اسے زار سون سوں کرتے ذاتوں سے اپنی زبان کو روکنا نہیں سوزا لگے جو آپ
 بھول گئے ہیں۔ مجھے تو آپ کی ہر اکھڑ تک پھکی پھکی لگ رہی ہے۔" حمزہ کہہ رہا تھا۔
 عاشر بھائی نے ہنستے ہوئے سالن کا ڈونگا تھا اور سالن سے کبھی ایقان کو شریر نگاہوں سے دیکھا۔
 "ڈانٹتے کھولا تو نہیں۔ ترس ضرور گیا ہوں۔" اس کے لیے میں بھی شرارت تھی۔
 ایقان جڑ بڑی ہوئی۔ کن آنکھیں سے اس نے حاضرین محفل کے مشکبات نوٹ کیے۔ پھر نظریں بچا کر اسے
 اگلے شریر مسکراہٹ شریر تر ہوئی۔
 ایقان ہاتھ میں تھا، ہوا نوالہ منہ تک لے جانا بھول گئی۔ گہری سیاہ آنکھیں آؤندگی کے احساس سے جھجکتی
 ہوئی سیاہ موچھوں تلے مسکراتے گلابی ہونٹ، خاموشی میں بھی بہت کچھ کہتے ہوئے، لوگوں کی پروا نہ کرتے گرم
 جوش احساسات، شدتوں سے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے جذبے۔
 وہ سب کچھ بھول بھال کر اسے دیکھ گئی۔
 "اے ہوں۔" وہ کھٹکھٹا کر ایک
 ایقان چونک اٹھی۔ چوری سن کر کھانا کھانے لگی۔
 وسیع ہال کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پتھر خان بچھا ہوا تھا۔
 عاشر کو ان پتھر خان سے لے کر وہ لوگ سیدھے "حیات دلا" چلے آئے تھے جہاں شفیقہ حیات بیگم نے ان کے

وہ اپنے بڑے بڑے اور اپنی سہیلیوں (سہیلیاں اور ریحہ) کے والد عالم بھائی کے پتھر خان سے لے کر وہ لوگ سیدھے "حیات دلا" چلے آئے تھے جہاں شفیقہ حیات بیگم نے ان کے
 باہر کے معاملات ان کے پتھر خان کے کمرے پر توجہ دیتی ہے تو اسے کمرے کی ایک پوٹلی ملتی ہے جس میں کچھ کاغذات، تصویریں
 اور زکورات وغیرہ ہوتے ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔
 ڈاکٹر شہلا ابھی ہال میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اپنے باپ کے بائیں میں اکثر سوال کرتا ہے۔
 "اس کا مطلب یہ ہو کہ یہ خط میری پیچھو کا ہے؟"
 نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہونے جا رہا تھا کہ
 اس کے خونی رشتے موجود ہیں۔
 "آپ کا خط بلا اور ایک مرتبہ پھر سیدھا کر کے اس کے سطور پر نگاہ ڈالی، لکھا تھا۔
 "پتہ دیتے ہیں۔ احمد جہاں زیب سے کہیے کہ دنیا میں ایک حسن ہی سب سے بڑی حقیقت نہیں ہے۔ حسن چاروں کا
 قصہ ہے۔ کاش میں آپ کے پاس ہوتی تو معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتی۔ یہاں تو یہ حال اپنے لیے سانس لینے
 کے پہلے منور میاں سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ پھر حال، آپ کی جانب سے احمد جہاں زیب کو کوئی بھڑکوت یا نرمی کا
 رویہ نہ ملے۔ اتنا کہے دیتی ہوں اس کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہے وہ چند روز میں اتر جائے گی۔ آپ خاطر جمع
 رکھیے۔
 تصور اور تمہاری ماں کو سلام لکھواتے ہیں۔ ترانہ اور تمنا کو بھی آپ کی جانب سے جنت پیار دیا تھا۔ ابھی
 بھی کھیل رہی ہیں باقی سب خیریت ہے۔
 آپ کی بیٹی
 بلقیس بانو
 ریحہ حیرت سے خط کو دیکھتی رہی۔ اور کتنی گری۔ احمد جہاں زیب اس کے لیے بے حد پرستش نام تھا۔
 اس خط میں اس کی سمجھ میں آسکے والی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی وہ خط پڑھنا اسے بے حد اچھا لگا تھا اس میں احمد
 جہاں زیب کا ذکر تھا۔ اس خط میں احمد جہاں زیب کے وجود کا احساس بند تھا۔ خط پڑھنے سے وہ احساس چند لمحوں
 کے لیے جی اٹھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے احمد جہاں زیب جی اٹھا تھا۔
 ریحہ احمد جہاں زیب! آج تک وہ محض اپنے نام کے آگے یہ نام لکھتی آئی تھی اور بس وہ اتنا جانتی تھی کہ
 نام کے آگے باپ کا نام لکھا جاتا ہے۔ اسے محض اتنا ہی علم تھا کہ اس کے باپ کا نام احمد جہاں زیب تھا۔
 "داؤی! امیرے امی ابو کتناں آہیں؟" ایک ننھی بچی سوال کرتی۔
 "بہت دور۔ بہت دور۔ بہت دور۔" داؤی نے جواب دیا۔
 "اور کتناں آہیں؟"
 "بہت دور۔ بہت دور۔ بہت دور۔"
 جواب میں انکھیں سرور آتی ہیں۔
 "اور کتناں آہیں؟"
 "بہت دور۔ بہت دور۔ بہت دور۔"
 (38)

شفیقہ حیات نے ہو کو کڑے تیوروں سے دیکھا ضرور پھر باد کی موجودگی کا خیال کر کے خاموش ہو گئیں۔
 "عجب تھے جاواں۔" علی نے ام کی قاشوں سے بھری پیش آتی دیکھیں تو تعجباً بلند کیا۔ "اصل چیز تو اب آتی ہے۔" کہا۔
 "ابا! دیکھو خون کی رونق معدے کی ٹھنڈک۔ کنگ آف فرولس آسے۔" اس کا "آم" مکمل ہونے سے پہلے ہی ناعمد اور ثانیہ اسے منہ چڑاتی آگے بڑھ گئیں۔ ڈش کو تھانے کے لیے
 دیکھا اس کا ہاتھ بھی ہوا میں لہراتا رہ گیا تھا۔ اس نے احتجاج کیا۔
 "یہ لوڈ نہ۔" نافع نے ڈش پکڑ کر اس کی جانب بڑھا دی۔
 "ہاں۔" اسے اطمینان ہوا۔ "یہ لڑکیاں تو میری خوراک دیکھ کر جلتی ہیں۔ خود این ہے تو چوٹی جتنا بھی
 نہیں کھایا جاتا۔"
 "چیوٹی جتنا۔" عاشر نے آنکھیں پھیلانیں۔ "چیوٹی جتنا کون کھا سکتا ہے میرے بھائی؟"
 "آم ہوں تو میں چیوٹی جتنا بھی کھا سکتا ہوں۔" وہ مزے سے قاشیں اڑانے لگا۔ "غضب کی شے بنائی ہے
 میرے مولائے صدمہ تھے جاواں۔"
 "نیاں غ کا گوشہ ہو اور ایک بڑا سا "سندھڑی" ہو اور منہ کے کو کیا چاہیے۔" اس نے مزید گل افشانی کی۔
 "جی ہاں۔" نافع، چل کر بولی۔ "سندھڑی" ختم بھی ہو جائے تو یہ کھلی پر تادیر مانتا آرگن بجاتے ہیں۔
 حاضرین محفل اس لیے سب سے پہلے ہی جانتے تھے وہ آم کا دیوانہ ہے۔
 کھانے کے بعد چائے کافی کا دور چلا جس کی نے گرمی سے گھبرا کر چائے کافی سے کھنڈرت کی۔ اسے
 کو لڈو دینے چھاوی گئی۔
 "ہاں ابھی کچھ اشعار ہمیں بھی سناؤ۔" عاشر نے بنگ گروپ سے فرمائش کی۔ "یقین ایسے ایسے من گھڑت
 شعر سنائیے تم لوگوں کے کہ میں شدت سے تمہاری محفل میں شرکت کا خواہاں تھا۔"
 "راجع! وہ کیا غزل بنائی تھی۔"
 عید الفطر کی رات تھی شب بھر ہوا خرچا زرا۔
 "عاشر بھائی! پوری رات پلک جھپکتے گزر جائے گی آپ کی! اگر یہ موضوع چھیڑا آپ نے۔" ہاشم نے کہا۔
 "رات۔" وہ زرب لب بڑھایا پھر چونک کر اس نے رست و اچ و نہی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔
 "رات تو کسی کے نام ہے بھی۔" وہ بہت دھیرے سے بولا۔
 سوائے اس کے کوئی نہ سن سکا۔ اس کا چہرہ سن ہو گیا تھا۔
 * * *
 سوئی ہوئی ایمان کو اس نے مومن کے برابر لٹایا اور جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔
 "کتنی چھری ہو گئی ہے۔ چھوٹی سی تھی جب گیا تھا میں۔ اس کے منے نے ہاتھ پاؤں یاد آتے تھے تو میرا گل
 اسے پار کرنے کے لیے چل اٹھتا تھا۔ اب تو گل مٹل سی ہو گئی ہے اور گندمی بھی میرے پاس آتی بھی نہیں۔
 بھی اسے بتاؤ میں اس کا لیا ہوں۔"
 اس نے چہرہ گھما کر اس بیٹی ایمان کو دیکھا۔ وہ چپکے سے اسے بچوں کے پاس بیٹھا دیکھ رہی تھی۔
 ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ عاشر نے اس کی شرقی آنکھوں میں ہلکورے لگی محبت کی مٹھاس کو دیکھا۔
 بحر کے اندر اس کا موڈ تبدیل ہو گیا۔

اعزاز میں دعوت کی تھی۔
 اس وقت پورا خاندان ہسٹریوٹ پر جمع تھا۔
 فاروق حسن فردوس بیگم ان کے تینوں بیٹے ہاشم، حمزہ اور علی، ماہین اور اس کا شوہر ہاشم بھی مدعو تھے۔ اس کا
 بیٹا احسان عرشہ کی گود میں بیٹھا کھلکھلا رہا تھا۔
 سلجوق حسن اور ان کی اہلیہ عذرا بیگم نے دعوت کا اصل اہتمام کیا تھا۔ رافع، نافع، ثانیہ اور سدرہ بھی موجود
 تھیں۔
 رابعہ بیگم بھی اپنی تینوں بیٹیوں کے ہمراہ صبح سے وہیں تھیں۔ بلکہ دعوت کا سارا انتظام انہوں نے ہی سنبھالا
 تھا۔ راتمہ کل سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر افتخار بھی اس سے سیدھے وہیں آگئے تھے۔ درود اور ناعمد
 ثانیہ سدرہ کے ہمراہ کھڑی منتظرین کا رول پلے کر رہی تھیں۔
 گویا "حیات ولا" سے تعلق رکھنے والے سب ہی افراد وہاں موجود تھے۔ دسترخوان پر رنگ و شیش لڑکیوں
 کے لیے بناہ شوق کی مہربان منت تھیں۔ سب ہی کے بل چل کر سارا کام انجام دیا تھا۔
 "جتنی کسے ہر چیز اعلا درجے کی بنی ہوئی ہے۔" عاشر نے کھانے کو سراہا۔ "لیکن اس چکن بریانی کا جواب نہیں
 میرا تو اس سے جی نہیں بھر رہا ہے کسی خاص منہ کے کی پکائی ہوئی لگتی ہے۔"
 اس نے "منتظرین" کی جانب دیکھا۔
 "پھر آپ نمبر لے لیں۔" ثانیہ نے درود کو گھورتا دیکھا۔
 وہ مسکراتے ہوئے۔
 "بھئی۔ سب نے چل کر ہی سارا کام کیا ہے۔ مجھے اکیلی کا کیا کام اس میں ہے۔"
 "زیادہ انکساری نہ جاتیں۔" حمزہ نے اسے دیکھا۔ "یہ بریانی اپنی زبان آپ کہہ رہی ہے کیا ہے کس نے پکایا
 ہے۔"
 "ورنہ۔ شوٹاؤس آف یو۔" عاشر نے اسے دیکھا۔
 وہ شرمندہ شرمندہ سی نظر آتے ہوئے۔
 "چکن بروسٹ عرشہ نے بنایا ہے۔" فردوس بیگم بولی تھیں۔ "کھا کر دیکھو عاشر عرشہ بھی بہت ماہر ہے نت
 نے کھا ہے بنائے ہیں۔"
 ماہین قہقہہ مار کر خن ہوئی تھی۔
 "جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی عرشہ کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ خنے کی وال کون سی ہوتی ہے اور ماش کی
 کون سی۔ ماش کی وال پکاتے تو ناک بھونچ چڑھا کر کھتی خنے کی وال کا صرف طوہ اچھا لگتا ہے آپ یہاں کیوں
 بنائیں ہیں اس کا؟"
 سب ہی اس کے بچے تھے۔ عرشہ جھینپ گئی۔ ماہین کی نظریں ماں سے پکڑائیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ اسے
 کڑے تیوروں سے گھور رہی ہیں۔ اسے اپنا قصور تو سمجھ میں نہ آ سکا البتہ کسی انگلی جیسے ہرزد ہو جانے کے
 لیے اسے احساس کی ہو گئی کہ اس سے کتنی کڑی نظر آتی ہے۔
 "خیر! کوئی نظر نہیں آسے۔" تنیم کو خیال آیا۔ "کہاں ہوتے ہیں خالہ جان؟"
 اسے فردوس بیگم خاموشی پریشان کی ہو گئیں۔ سب کی لوگ خاموش ہو گئے تھے۔
 "ہاں۔" اس غریب کو کس نے پوچھا۔ "نہیں ایک ہی جواب ہو جھا۔"
 (40)

”اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارا کون ہوں؟“ وہ اس کے قریب ہوا۔
وہ ہنستے ہوئے قدرے دور ہوئی۔

”میرے ہر جانی ہو۔“

”اچھا چلو پھر۔ تمہیں اپنی آؤفا کا یقین دلاتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نیوں بھی معاملات برداشت سے نکلتے جاتے ہیں۔“

”اٹنی شتابی نہیں لیے۔“ وہ اس کے جارحانہ عزائم کی ہٹھکنپا کر چپکے سے دروازہ کے سمت ہوئی۔

”کیونکہ آج تمہاری تصویر نہیں تم رو رہو۔“ وہ مزے سے مڑا۔

اپنے پیچھے خالی کمرہ دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔

”کیو تر۔“ وہ بڑبڑایا۔

بچوں کے کمرے سے نکل کر اس نے دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھی اس نے بیرونی دروازہ لاک کیا۔ کچن کی

لائٹ آف کی۔ لاؤنج کی ٹیبل کلائش آف کر کے زیرِ پاور کے بلب روشن کیے پھر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا۔

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی تازہ گلابوں کی مٹک کا بھرپور جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

”واؤ۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہی رہ گیا۔ استقبال کا یہ انداز اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

پورا کمرہ سرخ گلابوں سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کا سابقہ نقشہ قطعاً تبدیل شدہ تھا۔ کمرہ اسکیم سے لے کر فرنیچر

کے ڈیزائن اور سیٹنگ تک ہر شے بدل گئی تھی۔

لائٹ گرین اور وڈل گولڈن کا حسین امتزاج ہر کونے میں نمایاں تھا۔ اس پر سرخ گلابوں کی معنی خیز سجاوٹ کسی کا

بھی دل دھڑکا سکتی تھی۔

وہ کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا معطر فضاؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل

تک آ کر وہاں وشنک کارڈز سجے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کارڈ اٹھایا، لکھا تھا۔

کیس بھی گنیا لوٹا تو مرے پاس آیا
ہر جانی

عاشق کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اچانک ہی دوبارہ نہایت نرمی سے اس کے گلے سے آلیٹے تھے۔ اس کی پشت پر گداز و جود کا احساس مہکنے لگا۔

شہا کا شہر نے اس کی گلانی تھامی اور نرمی سے کھینچ کر اسے اپنے مقابل کر لیا۔

شرقی آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے لبوں پر حسین مسکان لیے وہ اسے شبِ اول کی مانند نوخیز اور حسین

نظر آئی۔ روزینک ناٹی میں اس کا ہر مریں وجود غضب ناک حد تک حسین اور خطرناک لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس

کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر کوئی شریر خیال اس کے لبوں پر مسکان بن کر بھرا۔

”ایکٹ کمی رہ گئی۔“ وہ سر ہلا کر تاسف سے بولا۔ ”بانتا کچھ ادھوری ہے۔“

”اے۔“ ایتقان جیسے خواب سے چونکی تھی۔ ”کمی؟ کیا؟“ اس کا چہرہ اتر گیا۔ نجانے اسے کس چیز کی کمی

محسوس ہوئی تھی۔

بہرِ رُخ جھوٹو جانی نہیں۔ وہ سب کی جانب بڑھ گیا۔

ایتقان اپنی جگہ پر ایستادہ سوچ میں گم ہو گئی۔

زر زہن گئے گلابوں سے سجا ہوا کمرہ، ہنسنے والے سرشار حسین بیوی خاموشی کی زبان بولتی تنہائی نجانے اسے

"عاشق! کیا ایک ہی اس کی پٹلیں جھجک گئیں۔ گل سرخ پڑ گئے۔" نہیں بھی! "Dua for One Urdu
 "بلیر ایقان۔" "Dua for One Urdu
 "وہ سب کچھ نہیں کہاں رکھا ہے عاشق! فرمائش نے اسے کھینچا ڈکڑا تھا۔" "Dua for One Urdu
 "یار کرلو۔" اس کا اطمینان قابلِ رد تھا۔ "Dua for One Urdu
 "وہ اسٹور میں پڑا ہے عاشق! اور اسے سلیکٹ کرنا ہمارا سوٹ کیس ہے۔" "Dua for One Urdu
 "پادشاهت آپ کی مزدوری کریں گے میڈم! اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔" "Dua for One Urdu
 "ایقان نے کہنے میں ہو کر اس کی جانب دیکھا۔" "Dua for One Urdu
 "کچھ ہی دیر میں سرخ زرد لہان اس کے ہاتھوں میں تھا۔" "Dua for One Urdu
 "جاؤ جلدی سے بہن کر آؤ۔" "Dua for One Urdu
 "ایقان اس کے ہونے ڈرنے کی جانب بڑھ گئی۔" "Dua for One Urdu
 "وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔" "Dua for One Urdu
 "ایک پیرہلاتے ہوئے کسی گہری سوج میں تھا جب ایقان نے پرہ کھاکر سرا ہر نکالا۔" "Dua for One Urdu
 "عاشق! وہ جیسے کسی مشکل میں تھی۔" "Dua for One Urdu
 "آپ! کہہ چوٹا۔" اوٹا سامنے وہاں جھپ کر کھڑی ہو۔" "Dua for One Urdu
 "میں نہیں آسکتی۔" "Dua for One Urdu
 "کیوں؟" وہ سخت حیران ہوا۔ "Dua for One Urdu
 "میں نہیں آسکتی۔" "Dua for One Urdu
 "میں خود آتا ہوں۔" وہ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے وہاں تک پہنچ گیا۔ "Dua for One Urdu
 "ایقان نے جھجکے میں اس نے پرہ ہٹایا تھا۔" "Dua for One Urdu
 "ایقان سرخ لہان میں شرمندہ شرمندہ کھڑی تھی۔" "Dua for One Urdu
 "وہ چند لمحوں سے دیکھا رہا پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔" "Dua for One Urdu
 "ننگی والی شرٹ اس نے بڑی کو ششوں سے کھینچ کر پہن تو لی تھی لیکن اب عجیب ہی عالم تھا۔" "Dua for One Urdu
 "یار! ایسا لگ رہا ہے کہ چھوٹے سے تھیلے میں ڈھالی من کی پوری چیزیں کر دی ہے۔" اس نے تبصرہ بھی کر ڈالا۔ "Dua for One Urdu
 "ایقان بھی ہنسنے لگی۔" "Dua for One Urdu
 "کروان کی بے ساختہ ہنسی کی پھواریں اٹھنے لگیں جیلا جا رہا تھا۔" "Dua for One Urdu
 "وہ دڑتے دڑتے اس نے خود کو اکیلا پایا تو رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ وہیں کھڑک گیا تھا جہاں اکثر ٹھہرایا کرتا تھا۔" "Dua for One Urdu
 "رافع مڑ کر واپس اس تک آیا۔" "Dua for One Urdu
 "دونوں ہاتھ سینے پر لیٹے وہ سفید جھگڑے کی عمارت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وڑنے کی وجہ سے سانسوں کی آمد و رفت سخت تھی لیکن وہ کسی گہری سوج میں تھا۔" "Dua for One Urdu
 "اے۔" سسرا "رافع کے تپ سے مخاطب کیا ہاشم اسے دیکھنے لگا مگر بولا کچھ نہیں۔" "Dua for One Urdu

"د By HarfeDua for One Urdu
 "س کی کا خیال آیا تھا۔ اپنی جانب سے تو اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔" "Dua for One Urdu
 "سہیلی بوجھ پھیلی۔" اس نے پھر اسے چھیڑا۔ "Dua for One Urdu
 "مجھے نہیں پتا۔" اس نے ہونٹوں پر پیرچہ کر اپنی حلقی کا اظہار کیا۔ کتنے ارادوں کے خود کو سرتاپا سنوار کر اس "Dua for One Urdu
 "کے قریب آئی تھی وہ محبت کا رتی برابر اظہار کیے بنا نہیں ہو گیا تھا۔" "Dua for One Urdu
 "ایقان نے خفا خفا نظروں سے اسے دیکھا۔" "Dua for One Urdu
 "ارے بھائی۔ اور تُو تو آؤ گے؟" "Dua for One Urdu
 "میں نہیں بھائی وائی۔" وہ اور چڑھی۔ "کوئی سرکار شتہ نہیں ہے پکارنے کو۔" "Dua for One Urdu
 "وہ ہو بھی یہ وہ والا "بھائی" نہیں ہے برادر! تُو جذبات والا یہ وہ سرا "بھائی" ہے۔ چلو "من بھائی" اور صبر تو "Dua for One Urdu
 "آؤ اب خوش۔" "Dua for One Urdu
 "اے ہنسی آگئی ہنسنے ہوئے وہ اس تک چلی آئی۔" "Dua for One Urdu
 "فرمائیے ہر حال۔" اس کے قریب پہنچی۔ "Dua for One Urdu
 "وہ نہیں لگتا ایسے پکارتے ہوئے۔" عاشق نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "Dua for One Urdu
 "اویں۔" اس نے تڑپے سے نفی میں سر ہلایا۔ "پابہ زنجیر کیا آؤں گے؟" چھوڑ دیا۔ ہم تو اس تصور کے تحت "Dua for One Urdu
 "مڑے رہتے ہیں۔" "Dua for One Urdu
 "وہ فوج اس قدر بے فکری۔" اس نے سر ہلایا۔ "ایقان نے اس کی سیاہ "Dua for One Urdu
 "بھو اپنا ہونے نہیں نہیں جاتا اور جو چلا جائے وہ اپنا نہیں آجاتا۔ فکر سے کیا حاصل۔" ایقان نے اس کی سیاہ "Dua for One Urdu
 "آنکھوں میں جھانکا۔" "Dua for One Urdu
 "اور پھر تمہاری آنکھیں تو سیاہ ہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کہتے ہیں ہر جانیوں کی آنکھیں براؤں ہوتی "Dua for One Urdu
 "ہیں؟" "Dua for One Urdu
 "تمہاری آنکھیں تو براؤں ہیں۔" وہ بھی مسکرایا۔ "Dua for One Urdu
 "پھر غلط کہتے ہوں گے۔" "Dua for One Urdu
 "یعنی سیاہ بھی ہو سکتی ہیں۔" اس نے مضمونی فکر مندی سے کہا پھر دونوں ہی ہنسنے لگے۔ "Dua for One Urdu
 "کمال ہے یار! اس ریسرچ کے لیے تمہیں ایک ایسی ہی اثرات ملی ہے۔ اتنا خوبصورت کمرہ چلایا ہے اور باتیں "Dua for One Urdu
 "کر رہی ہو ہر جانیوں کی۔" "Dua for One Urdu
 "جناب! ایقان نے اسے کھوڑا۔ "اس جرم کے وارنٹ آپ کے نام نکلنے چاہئیں۔" "Dua for One Urdu
 "میں نے تو ایک کی کا ذکر کیا تھا۔ تم دوسرے چکروں میں پڑ گئیں۔" "Dua for One Urdu
 "بھئی! کیا کی ہے آخر۔" وہ چڑھی۔ "تم مرد بھی نا، کبھی منطقی نہیں ہوتے، ہمیں تعریف نہیں کرتے، بیش "Dua for One Urdu
 "عورت کی خامیاں ہی ڈھونڈتے ہو۔" اچھا! بتاؤ ذرا کیا کی ہے؟ "Dua for One Urdu
 "عاشق نے اس کا بازو تھام کر اسے قریب لایا۔ " "Dua for One Urdu
 "تو کتنے رفاقت کا سا اہتمام کیا ہے۔" وہ اس کی حلق جو خیر لگ رہی ہو اور عروسی لباس کی جگہ یہ ناٹک باتیں "Dua for One Urdu
 "نہیں رہی؟" "Dua for One Urdu
 "راز راز عروسی لباس؟" ایقان حیران ہوئی۔ "Dua for One Urdu
 "ہاں! کہاں ہے تمہارا شادی کا ڈر میں؟" وہ بہن کر آؤنا۔ "Dua for One Urdu
 "وہ عروسی لباس؟" "Dua for One Urdu
 "44" "Dua for One Urdu

منور میاں کو سب قہقہے کا علم ہو چکا ہے وہ سخت طیش میں ہیں۔ یہ دن تو دیکھنا ہی تھا۔ میرے ساتھ کچھ برا ہوا تو
 میری بددعا سے بھی سکھ چیں۔ نہ جینے دے گی مجھے احمد جہاں زیب سے یہ امید نہ تھی۔ انسان کو حقیقت
 بند کی ہے کچھ نیچے کچھ تو واسطہ ہونا چاہیے۔ اس سے مینا کا قصور تو چھ کر مجھے تلوادیں۔ آخر مجھے بھی آگے والوں کو
 مطمئن کرنا ہے۔

خست پریشانی کے عالم میں ہوں، میرے لیے دعا کیجئے۔

آپ کی بیٹی
 بلقیس بانو

ربیعہ نے بے دلی سے خط کو باہر تھہر کیا۔ یہ جو قحطی تھا جو اس نے پڑھا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا
 تھا۔ احمد جہاں زیب سے بلقیس بانو کی کیا ناراضی تھی؟ احمد جہاں زیب نے آخر کیا کیا تھا؟ بلقیس بانو ان سے کیوں
 سخت خفا تھیں؟ اس کا دماغ الجھ الجھ جاتا۔

اتاق سے ضرور اندازہ تھا کہ یہ خطوط اس کی پیدائش سے قبل لکھے گئے تھے یا شاید اس کے ماں باپ کی شادی
 سے بھی قبل اور نہ کسی خط میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔

ایک خط ایسا بھی تھا جس میں بلقیس بانو نے اپنا پتہ بھی تحریر کیا تھا۔ وہ پتہ لاہور شہر کا تھا۔ ربیعہ نے لاہور بھی نہ
 دیکھا تھا۔ اسے لاہور دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے کئی مرتبہ داؤدی جان سے لاہور دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ
 اس کی فرمائش کے جواب میں کچھ نہ کہتیں۔ انہوں نے بھی اپنی بیٹی کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ حالانکہ وہ ربیعہ کی
 فرمائش کے جواب میں اتنا تو بتا ہی سکتی تھیں کہ بلقیس بانو نامی ان کی ایک بیٹی ہے جو لاہور شہر میں رہتی ہے۔
 ایک مہینہ تھا جو ربیعہ سے حل نہ ہوتا تھا۔ داؤدی جان کی وفات سے سوالات سے بھری ایک پٹاری کھل گئی تھی۔
 تھیں۔ اس کے چاروں جانب مختلف سوالات چکرارے تھے۔ سب سے بڑا سب سے تشنہ سوال یہ تھا کہ داؤدی
 جان نے جس سے اس کے دیگر رشتہوں کے متعلق کیوں نہ بتایا تھا؟

ربیعہ نے عذرا بیگم نے سلوک حسن کو چائے کی پیالی تھما دی۔
 ”شکریہ۔“ انہوں نے اخبار ایکٹ جانبدار کھ دیا۔ ”فرز کے کیا کر رہے ہیں؟ پھر میں کہتے ہی نہیں۔“
 ”راج تو اپنے یونیورسٹی کے کام سے ہی گیا ہے تمہارے آئے سنے چند منٹ پہلے ہی نکلا تھا۔ نافع شاید حمزہ
 اور علی کے ساتھ ہے۔ دونوں لینے تو آئے تھے اسے اب کیا خبر کہاں گئے ہیں۔“
 عذرا بیگم کے عجیبے شفیقہ حیات نے جواب دیا تھا۔
 ”اچھے، نیک لڑکے ہیں پرویز و گار نے شکر ادا کیا کرو، بے وجہ وسوسوں میں نہیں پڑا کرتے۔“ انہوں نے
 مزید کہا۔

نوحہ جیسے کارہاں سامیالہ تھامے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھیں۔
 ”ارے نہیں! ان آدھو سے کیسے۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ کئی روز ہو گئے کسی سے تفصیلی بات ہی نہیں
 ہوئی۔“ وہ شائستگی سے بولے۔

”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں کسی قسم کی فکر میں نہیں پالتا۔ جانتا ہوں میری اولاد میری
 نگاہ رکھنے کے لیے میری ماں ہمہ وقت جو کس وہ بشارت رہتی ہے جہاں کوئی کمزوری نظر آئی وہی مجھے مطلع کر دے
 گی۔ بیٹے میری سرحدیں ہیں اور ماں میری محافظ۔ میں اطمینان سے ہوں۔“

”آپ اتنی گوری ہیں ماما!“
 ”میرے بیٹے کو گورا رنگ پسند ہے۔“ وہ دھیان رکھناڑے گا۔
 ”اور۔ اور۔ انوسینٹ بھی ہیں۔“ عمر نے مزید غور کیا۔ ”میکلز انوسینٹ ہوتے ہیں ماما!“
 ”یقیناً ہوتے ہوں گے۔“ اس نے تائید میں سر ہلایا۔
 ”اور آپ کے بال کتنے اچھے ہیں۔“ اس نے قریب آکر ماں کے بال چھوئے۔ ”میکلز کے پروں جیسے۔“
 ”وہ مائی گاڑ۔“ کمپیوٹر کے کٹا مینیجنگ، بیٹھی انیقا، بلبلہ کر مڑی تھی۔ ”آئی، ایہ آپ کا بیٹا ہے یا مستقبل کا شاعر۔“
 کب سے میرا دھیان اس کی باتوں میں لگا ہوا ہے۔ کیا اس کے حسن کی اس قدر سرسائی کر رہا ہے؟ محبوبہ کی تعریف
 میں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دے گا۔ کیوں جناب! خالہ جانی کے لیے بھی ایک آدھ قسیدہ ہے آپ کے غیر
 مطبوعہ دیوان میں یا نہیں۔“
 شہلا بے ساختہ ہنس دی تھی جبکہ وہ منہ نہا کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”ماما جیسی تو ہیں آپ بھی الگ سے کیا بتاؤں۔“
 ”انیقا، کوئی بھی، ہنسی آگئی۔
 ”یعنی ماما کی تعریفوں سے ہی جی تھک کر لوں اپنا۔ آپ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔“
 ”نہیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”آپ تو خیر ماما سے بھی زیادہ پیاری ہیں، لیکن مجھے اپنی ماما زیادہ اچھی
 لگتی ہیں۔“
 ”اور۔“ انیقا نے جوتھ سکڑے۔ ”کیا غضب کی صاف گولی ہے۔ بڑے ناکام قسم کے سیاستدان ہوں گے
 آپ۔“
 ”نہ کون ہوتے ہیں؟“ وہ سنجیدہ ہوا۔
 ”بٹاؤ! شہلا نے پھر سے رسالہ اٹھالیا۔
 ”انیقا، سر کھجانے لگی۔ یہ ایک قسم کا پرومیشن ہے۔ جیسے ڈاکٹر ہوتے ہیں، ڈکیل ہوتے ہیں، قوی اسمبلی کے ممبر
 ہوتے ہیں۔“
 ”چچا۔“ وہ سوچ میں گم ہوا۔ ”میرے کیا کیا تھے؟“
 رسالے کے حقیقت میں شہلا کی پلکیں کانپیں پھر اس نے پورا اچڑا چھپایا۔
 ”تمہیں کوئی آواز آرہی ہے عیر!“ انیقا نے اچانک پوچھا۔ ”والٹر کامیوز کتھے تھے۔“
 ”ہاں۔“ وہ یکدم خوش ہو گیا۔
 ”انچلو پوچھو، میرے لیے کارنیولے لو۔“
 ”چچا خالہ جانی! اس نے بے در لگادی۔
 ”انیقا نے گہری سانس بھری۔ ”میرا بھائی شہلا پوچھا۔“
 ”رہا پیاروی اپنی جان! شہلا پوچھا۔“
 ”السلام علیکم۔“
 ”آپ کا خط ملا، بانی گویاں میرے اونچا ہونے کو ہے۔ احمد جہاں زیب کو اب وقت ہی سمجھائے گا۔“

"جیتے رہو۔" انہوں نے بیٹے پر شفقت بھری نگاہ کی۔ "بوڑھے ماں باپ کو اور کیا چاہیے اولاد سے۔ ذرا سی لگاؤ شکر ذرا سی محبت ذرا سا اظہار۔ مشکل گھڑیاں آسان ہو جاتی ہیں۔"
 انہوں نے گہری ہنسی بھری۔
 "کیسی مشکل اماں!"
 "کوئی مشکل نہیں بیٹے! اللہ کا احسان ہے۔ بس یہ برہنہ پادرات خود ایک مشکل ہے۔ ساری عمر انسان اپنی مشکلات کا سامنا کر کے ان سے جو کبھی لڑ سکتا ہے لیکن بچہ برہنہ آجائے تو اسے آسان بنانے کے لیے دوسروں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ برہنہ ایسی مشکل ہے بیٹا! جسے انسان خود آسان نہیں کر سکتا جب تک دوسرے نہ چاہیں۔"
 "آپ کو کوئی شکایت ہے اماں!" عذرا بیگم نے تباہی کی صورت دیکھی۔
 "جی نہیں آرہی ہوں بیٹیوں جیسی بی رہی ہو ساری عمر شکایت کیسی۔ میں تو یونہی ایک بات کر رہی تھی۔ اللہ کا احسان اس نے دو بیٹے دیے دو بیٹیوں دیں۔ ایک نے دھتکارا تو دوسری نے گل لگالیا۔ کبھی سوچتی ہوں ایک بیٹا ہوتا اور ایک ہی ہوتا تو میں کہاں جاتی۔"
 "ایسا نہ کہیں اماں! یہ تو نصیبوں کے کھیل ہیں۔ کبھی ایک بیٹے کی ماں بھی مسکھی رہتی ہے تو کبھی گیارہ بیٹیوں کی ماں بھی آٹھ آٹھ آنسو روٹی ہے۔" سلجوق حسن نے خالی سیالی بیوی کو تھمائی۔
 "درست کہتے ہو بیٹا! خدا کا شکر ہے اس نے مقدر میں شکھ ہی شکھ لکھا۔" شفیقہ حیات اطمینان سے بولیں۔
 "ہاشم کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں بھابھی جان! اماں اس لیے فکر مند ہیں۔" عذرا بیگم نے شوہر کو تان کی بے سکونی کی اصل وجہ سے آگاہ کیا۔
 "تو اس میں پریشانی کی کیا بات؟" وہ حیران ہوئے۔
 "میں تو یہ کہتی تھی بچے کہ اپنے گھر میں روشنی ہی روشنی ہو تو آدمی پر ایسا چراغ غائب گئے کیوں نکلتے۔ ماشاء اللہ ہاشم لڑکیاں کو دیکھو تو نظرد سے بچاؤ کی دعا یاد آتی ہے۔ میں تو فوراً پڑھ کر دم کرتی ہوں۔ ایسا اچھا ذہین بچہ اپنی بچیوں میں سے کسی کا مقدر کیوں نہ بنے۔"
 "چھوڑیں اماں۔" سلجوق حسن نے سر ہلایا۔ "ان کا بیٹا ان کی عمر بھر کی نکالی ہے ہم کیوں اپنی نیتیں کھوٹی کریں جیسے ان کی خوشی ہو۔ خدا ہماری بچیوں کا مقدر بھی چکائے گا انشاء اللہ۔"
 "بس بیٹا! بوڑھی جان ہوں کوئی اور کام تو ہے نہیں بیٹی یہی سوچتی رہتی ہوں۔" شفیقہ حیات ہنستے ہوئے بولیں۔
 "آپ کے سوچنے سے کیا ہوگا اماں! جو ہونا ہوگا رقم ہو چکا۔" سلجوق حسن بھی ہنس دیے۔ "فکر لا حاصل کیا حاصل۔"
 "انہوں نے تائید کی۔" شاید میرا ایمان ہی کمزور ہے۔"

 دروازہ کھرا تھا اس نے کمر میں ہنسی سے گہری کی جانب دیکھا۔
 "کون ہے؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
 "کیفیت طاری رہا کرتی ہے۔"

بذرا سا جھک کر بڑی رازداری سے گویا ہوئیں۔

"ایک رشتہ بھی لائی ہوں تمہارے لیے۔ جیسا لڑکا ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ سنو گی تو خوشی کے مارے پھوٹی نہ بناؤ گی۔ لیکن وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ مکان کا کام تو ایک طرف ہو جائے۔" ربیحہ خاموش ہو گئی۔ اس کے دل میں ٹائم بم کی ٹیک بٹج رہی تھی۔ خطرے کا الارم سنائی دے رہا تھا۔ عرفان شوکت کی سرد چالاک نظر پر چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس نے ہمارے ہی وہ گھر خرید لیا تھا۔

"تو لو بیٹی! ایک رقم دیں تمہیں؟" "بات دراصل یہ ہے بواب۔" وہ شر کر بولی۔ "یہ گھر میری پھپھو کا ہے۔ ان کے نام سے ہی اس کے کاغذات بنے ہوئے ہیں۔ اور پھپھو لاہور میں رہتی ہیں۔" "لیکن بوا اور عرفان شوکت کو جیسے ایک دھچکا لگا تھا۔ ان کے چہرے اتر گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"پھپھو؟" پھر سیکندہ بوا بولیں۔ "کون پھپھو؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ تمہاری کوئی پھپھو بھی ہیں۔ نہ کبھی اتنے سالوں میں تمہاری دادی نے ہی کوئی ذکر کیا۔ اگر ان کی کوئی بیٹی ہوتی تو کیا ان کے مرنے پر بھی نہ آتی؟ تمہارا سارا اثاثہ؟"

ربیحہ پھر خاموش ہو گئی۔ "اب میں آپ کو کیا بتاؤں بواب؟ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔" "دراصل یہ سب کچھ بہت پرانی چیقلش کا نتیجہ ہے۔ پھپھو بھلا سے دادی جان کی لڑائی تھی بہت زیادہ لڑائی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لڑواؤ دینے تھے۔ اسی لیے پھپھو کبھی یہاں نہیں آئیں مجھے بھی یہ سب باتیں ان کے خطوط سے پتا چلیں۔ لیکن اب میں نے پھپھو کو خط لکھا تو ان کا جواب آیا وہ اور منور پھو بھلا بہت جلد یہاں پہنچ رہے ہیں۔ شاید چھتہ بھر میں۔ میں آپ کو ان سے ملوا دوں گی اور مجھے یقین ہے وہ آپ کی چیقلش پر ضرور غور کریں گے۔ کیا کہا تھا آپ نے؟ ایک ساٹھ ارے ہاں زیادہ آیا۔ پھپھو نے لکھا ہے کہ پھپھو جان ابھی جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ پھر تو سمجھ لیں بات سن رہی تھی۔

عرفان شوکت کھڑا ہو گیا۔ "چھالی بی! ہم پھر آئیں گے اور سہا ہاں تھے؟" "میں نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے سیکندہ بوا کی جانب دیکھا۔ "پہلے پھو بھلا کو دیکھنا ساٹھ کہنا بلکہ تین۔ تین لاکھ۔"

"تین لاکھ؟" ربیحہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ اتنے زیادہ پیسے اس چھوٹے گھر کے؟ "ارے ایک سو بیس گز کا پلاٹ ہے۔" سیکندہ بوا بے ساختگی میں بول گئیں پھر جیسے انہوں نے دانستوں میں زبان ڈبائی تھی۔

"چھالی بی! پھر پھر؟ عرفان شوکت نے سیکندہ بوا سے پوچھا تھا۔ "ہاں! وہ بے ہوش سے کھڑی ہو گئیں۔

"اے بھائی! بھلا بتاؤ۔" نفیسہ خالہ کی حیرت اور صدمے سے آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

دیکھو بوا بی! میں ہوں تمہاری بوا، سیکندہ۔" پان زوہ کبھی میں شہید بھلا ہوا تھا۔ ربیحہ نے چٹنی گرا دی۔ باہر سیکندہ بوا کے ہمراہ کوئی اور بھی تھا۔ سیکندہ بوا کے پیچھے کھڑے اس آدمی کو دیکھ کر وہ بچائے کیوں خوف زدہ ہو گئی۔

"کلفت۔" لگے ہوئے سفید لباس میں بلوس وہ شخص چپچہ زلفی سنا معلوم ہوتا تھا۔ سیاہ خضاب سے اس نے ہر کے بالوں اور مونچھوں کو گہرا سیاہ رنگا ہوا تھا۔ گلے میں سرخ رومال تھا۔ بالوں کو اس نے تیل کی مدد سے نہایت سلیٹے سے جمایا ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں کی چمک نے ربیحہ کو خوفزدہ کر دیا۔ سیکندہ بوا منہ میں پان لیے کہہ رہی تھیں۔ "یہ عرفان میاں ہیں میرے بہنوئی ہیں مگر بھائیوں جیسے ہیں۔ تم سے ذرا ایک کام کے سلسلے میں ملنے آئے ہیں۔ تمہیں ذرا سی فرصت ہوئی بیٹی!"

انہوں نے ربیحہ کو دروازے کے پتھوں پر ایستادہ پا کر پوچھا۔ "جی ہاں آؤں۔" "وہ چوٹی۔" "جی ہاں آؤں۔" بادل خواستہ اس نے ان دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ لیکن اس کے پیچ میں پڑی چارپائی پر وہ دونوں بیٹھ گئے تو ربیحہ اپنے لیے کچن سے اسٹول لے آئی۔

"کیسے سیکندہ بوا! وہ اسٹول پر بٹک گئی۔ "وہ کھڑی ہوئی۔ "اب بات سراسر تمہارے بھلے کی ہے اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا۔" انہوں نے بٹک اور صراہر دیکھ کر نگل ہی لی۔

"ہاں۔" پھر وہ کھنکھاریں۔ "بات کچھ یوں ہے کہ میں نے اپنا گھر انہیں بیچ دیا ہے۔ لاکھ روپیہ انہوں نے نقد دیا ہے بمقیہ پچاس ہزار قسطوں میں دے دیں گے۔" ربیحہ پلکیں جھپکاتے بنا انہیں دیکھتی رہی۔

"ہاں تو سہ بات کچھ یوں ہے کہ یہ میرے گھر کو گرا کر جوڑی کا کارخانہ بنانا چاہتے ہیں۔" سیکندہ بوا کچھ نرمی سے تھیں۔ "تو سہ بات کچھ یوں ہے کہ جگہ نام پر ڈی ہے۔" انہوں نے گردن کھجا کر ان صاحب کی جانب دیکھا تھا۔

"دیکھو بی! وہ بوا کا اشارہ کیا کراچیاں شروع ہوئے۔ "اس جگہ کی مارکیٹ ویلیو کچھ خاص نہیں اس لیے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ لاکھ دے سکتا ہوں۔ لاکھ نقد پچاس ہزار قسطوں میں۔ سیکندہ بوا کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی۔ بلکہ مزید نرمی کی جا سکتی ہے۔ میں تمہیں ایک ساٹھ کروڑوں گا۔"

"میں سمجھ کر بھی انجان بنی تھی۔" "میں سمجھی نہیں انکل!" عرفان شوکت نے ایک نگاہ اس کے بھولے چہرے پر ڈالی۔ "میرا مطلب ہے میں تمہیں ایک لاکھ ساٹھ ہزار دوں گا۔ سیکندہ بوا کو دی گئی رقم سے دس ہزار زیادہ۔" "یہ تمہارا گھر خرید رہے ہیں نا بیٹی۔ اتنے اچھے دام لگ رہے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ فوراً ہاں بھرنو۔ پھر (وہی ذات ہو) زمین تو شہر آلی جانا ہے یا نہ کرنا اچھا ہے تمہارے لیے جینز کی رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔ اور ہاں۔"

اس سیکھنے کو خناس نے دیوانہ کر دیا؟ لا حول ولا قوۃ الا باللہ! ارے یہ نہ سوچا، بے ماں باپ کی بچی بے چھت کی
 بھی ہو گئی تو کہاں جائے گی؟ بھلا بتاؤ تمہارے ذہن میں اگر ایسی چالاکی کی بات نہ آتی تو وہ مواتو تمہیں ٹھکے ہی
 لیتا۔ بار سال ٹنگٹھ کے گھر کی قیمت چار لاکھ لگی تھی لیکن وہ نہ مانی اس کا تو مکان بھی خراب حالت میں تھا۔ تمہارا تو
 اللہ رکھے ایسی اچھی حالت میں ہے کہ پانچ میں چلا جائے، لیکن میرے منہ میں خاک کیوں جائے بھلا بتاؤ۔
 ربیعہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن عجب بھول بھیلوں میں الجھا ہوا تھا ہے
 میں تو کہتی ہوں بیٹی۔ جھوٹ کو سچ کر دو۔ "نفیسہ خالہ کچھ سوچ کر بولیں۔
 "اگر تمہارا دور پر آجے گا کوئی رشتہ دار ہے تو خط لکھ کر اسے بلواؤ ان کمپنیوں کو کچھ تو کان ہوں گے کہ بچی تنہا
 نہیں۔ یہ تو سمجھ رہی ہیں جیسے لوٹ کا مال ہے۔ بھلا بتاؤ۔"
 ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
 "دیکھو کاپتہ ملا تو ہے ایک خط میں۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں اس پتے پر خط بھیج کر دیکھوں کیا جواب
 آتا ہے۔"
 "تب تلک ان مووں کو یونہی الجھائے رکھو۔ ناس پیٹوں کو۔" پھر انہوں نے بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
 "ایک بات کہوں بیٹی! برا تو نہیں مانو گی؟"
 ربیعہ نے مسکرا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔
 "نہیں خالہ۔ برائے والی بات اول تو ہو گی نہیں اگر ہوئی بھی تو میں ہرگز برا نہیں مانوں گی۔"
 "تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ خالہ کے دل میں کوئی لالچ ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات والا حساب ہے۔ میرا بیٹا کسی
 طور تمہارے لائق تو نہیں پھر بھی تمہاری حفاظت کے خیال سے کہتی ہوں۔ اگر تمہاری منتہی بدر سے ہو جائے
 تو۔۔۔" وہ دُڑتے دُڑتے بولی۔ پھر انہوں نے ربیعہ کا تیزی سے سفید پڑتا چہرہ دیکھا۔
 "نہ نہ بیٹی! کوئی زور زبردستی کا سودا نہیں۔ تمہاری اپنی خوشی ہے۔"
 "اچھا چھوڑو بیٹی، رہنے دو میں بھی دیوانی ہوئی بھلا بتاؤ۔" وہ اس کی حالت سے شرمندہ تھیں۔
 "نہ جانے کہاں رکھ دے سب درازیں الٹ پلٹ کر دیکھ چکی ہوں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینک۔ ایک
 میری یہ تختہ کمرے میں بھی لگم بختی کی ماری ہوئی۔ چیزیں رکھ کر بالکل بھول جاتی ہوں۔"
 عیشہ نے بے فکری سے لی۔ دی دیکھتے ہوئے ایک نگاہ بڑبڑ کرتی ماں پر ڈالی پھر دوبارہ لی۔ دی کی جانب متوجہ
 ہو گئی۔
 "ان کو دیکھ لو اللہ کا نور۔ ارے میں کہتی ہوں تمہارے داغ اگر یہی رہے تو سسرال جا کر کیا غضب دھاؤ گی
 ان غریبوں پر منہ بھر بھر مجھے تو سین گے کہ ماں نے یہی تربیت کی ہے۔"
 اس کی بے پروائی دیکھ کر انہیں جلال ہی آگیا۔
 "یہ بیٹے اب مجھ غریب کی شامت آئی۔" وہ چڑ گئی۔ "چیزیں آپ رکھ رکھ بھولیں سسرال میں طعنہ مجھے ملے
 لوئی تک بتی ہے آئی!"
 "ارے ماں سے دو لفظ تسلی کے تو کہہ سکتی ہو۔ پوچھ تو سکتی ہو کہ کیا کھو گیا۔ کتنے لیے گھنٹہ بھر سے ریشمان
 پر ہو رہی ہوں۔ سنا تھو کہ انا تو غریبہ کی بات نہ کہنے کے ہم زبان تو ہلا سکتی ہوں۔ پھر کے بت کی سی بے پروائی ہے۔
 ارے آگے لگے ان بی۔ وی والوں کو۔ لڑکیوں کو بالکل ہی ٹنگا کر چھوڑا ہے۔ بس فیشن کی باتیں کر والو۔ یہ "ان"
 رکھے یہ وہ ہوتے ہیں۔ لیکن کہتی ہوں سسرال میں جا کر خبر ہو گی "ان" ہو یا "اون" ہوں۔"
 54

سیاہ جینز اور رست مگر شرٹ مین اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ گھنے بالوں کی سیاہی چمک بن کر بکھری تھی۔ صاف ستھرا دھلا دھلایا وہ جیسے لائڈری لٹے ٹکڑے کر گیا تھا۔

فردوس بیگم کی نگاہوں نے دروازے تک اس کا تعاقب کیا۔

”ہائے ہائے!“ انہوں نے سر دھڑکھڑی۔

عریشہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اس سر دھڑکھڑی کا مطلب وہ بخوبی جانتی تھی۔

آج اس نے خط لکھنے کا مکمل تہیہ کر لیا تھا۔

راوی جان کے صندوق میں اتنے بھلے خطوط تھے۔ وہ محض چند ایک ہی پڑھ پائی تھی۔ وہ سب خط پیچھو کے نہیں تھے۔ کسی ایک کے متعلق تو سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ خط کس نے بھیجا تھا اور اس کے متن کا کیا مقصد تھا۔

کانڈ قلم لے کر وہ یاد دہانی پر تھی۔ اسے کیا لکھنا تھا اور کیسے لکھنا تھا اس نے کب کسی کو خط لکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار تو وہ خط لکھنے بیٹھی تھی۔

پھر بہت سوچ سوچ کر اس نے لکھنا شروع کیا یا پنا تعارف کرایا۔ راوی کے انتقال کی بابت لکھا اپنے اکیلے بن اور شہابی کا ذکر کیا۔ محلے والوں کی بدعتی کا احوال لکھا۔

”آخر میں اس نے اپنی اندیشہ کا ذکر کیا کہ نہ جانے یہ خط بلقیس بانو تک پہنچا بھی ہے یا نہیں، حالانکہ اس ذکر کی چداں ضرورت نہ تھی کیونکہ خط نہ ملنے کی صورت میں وہ یہ جملہ پڑھ ہی نہیں سکتی تھیں اور خط مل جاتا تو اس جملے کی ضرورت نہ تھی۔

خط مکمل کر کے اس نے لفافے میں رکھا اور بند کر کے کچھ سوچنے لگی۔

جس خط میں اسے پیچھو کا پتہ ملا تھا وہ تو اس نے بے پروائی سے دوبارہ لکڑی کے صندوق میں ڈال دیا تھا۔ اسے پھر سب کچھ از سر نو لکھنا پڑا تھا۔ اس میں تو بہت کاغذات تھے۔

لیکن بہر حال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔

اس نے پھر الماری سے چابی نکال کر صندوق کو کھولا اور سب کاغذات باہر نکال لیے۔ پرانے بلوں، تاروں، بینک کی رسیدوں اور خطوط کا وہ ایک بے ہنگم مجموعہ تھا اس میں سے کچھ دھوڑ کا خاصا مشکل کام تھا۔

وہ تمہ شدہ کاغذ کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک پرانے تار نے نجانے کیوں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔

ربیعہ نے تحریر دیکھی، لکھا تھا۔

”اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کی بیٹی بلقیس بانو چند دن علالت کے بعد انتقال کر گئی ہیں۔ جلدی پہنچیں۔“

آپ کا رانا

منور امین

ربیعہ کی نگاہوں نے اندھیرا چھا گیا۔ امید کی روشن شمع کسی نے پھونکنا کر گڑ گڑی تھی۔ چکراتے میرا در بے قابو ہوتے دل کے ساتھ وہ بڑی مشکل سے بستر تک پہنچی تھی۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ)

Harfel

فیشن سے متعلق چٹا ہوا پروگرام دیکھتی عریشہ کو انہوں نے بالکل جی بے زار کر دیا۔

رموٹ سے ٹی وی آف کر کے اس نے خفگی سے ماں کو دیکھا۔

”سرال نامہ“ نہ جانے کب تک کھیلے گا آپ کا۔ ”پوائنٹس“ ختم ہی نہیں ہوتے۔ لہذا ایک نیا نکتہ سننے کو

”ماں کا جی جلاؤ گی تو یہی کچھ سننے کو ملے گا۔“ وہ اس کے برابر بیٹھ کر اپنی باتیں دہرائے گئیں۔

”کیا کو گیا ہے؟“ اسے تو جھٹکا ہی پڑا۔

”اے تمہارے باپ کے کچھ کاغذات تھے ایک خاکی لفافے میں چند روز قبل مجھے تمہارے ہتھ میں بھول کے نجانے کہاں رکھ بیٹھی تھی سب مل کر نہیں دیتے۔“

”یہ کن میں جو بیگمیں والا کیبنٹ ہے۔ اوپر چھوٹا کیبنٹ اس میں بھی ایک براؤن لفافہ پڑا ہے وہی تو نہیں؟“

فردوس بیگم نے لحظہ بھر سوچا پھر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔

”اے ہاں! وہی تو رکھ دیے تھے اس دن۔“

”آپ کا بھی جواب نہیں اپنی! عریشہ مسکرا دی۔

”کوئی بھلی سی جگہ تو دیکھ لیا کریں، چیز رکھنے سے پہلے کل ہاشم بھائی کے دوست آئے تھے تو میں نے بیگٹ لے کر لے لیے کھولا تھا کیبنٹ اب اگر میں نہ دیکھتی تو دن بھر کی خواہی تھی دھوڑ دھوڑ کر بیزار ہو جاتے سب لوگ۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔“ نہیں اعتراف کرنا پڑا۔

”لاؤں گا ورنہ کھول کر رافع اندر چلا آیا۔

”السلامو علیکم بہت تالی ای ہاشم گھر ہے؟“ وہ کچھ جلدی میں تھا۔

”نہیں ہاشم تو نہیں ہے تم کہاں ہو اے گھوڑے پر سوار ہو تاؤ وہ گھڑی بیٹھو تو؟“ وہ باہل خواستہ اندر تک چلا آیا۔

”اس کے ساتھ حیدر جو کہ تک جاتا تھا ایک دوست سے ملنے میری بابتک مبالغے کیا ہے۔“

”چھانٹو یوں کو ہاشم کی نہیں، موٹر سائیکل کی ضرورت ہے۔“ رافع قدرے جزیروا۔

”عریشہ! جاؤ علی کی دراز سے اس کی موٹر کی چابی نکال لاؤ وہ تو سو رہا ہے اسے گاؤ تین گھنٹے بعد۔“

رافع نے قدرے سکون کا سانس لیا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

عریشہ آٹھ کر علی کے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔ فردوس بیگم ہوتی رہیں۔

”تم لڑکے تو بن گئے ایک تم ہو ایک تمہارا ہوائی گھوڑا ہو اور کتنی شے کی ضرورت نہیں تمہیں جسے دیکھ لو اس کا یہی حال ہے۔ ہمارے والے تو ایسے تھے ہیں الگ الگ موٹریں لے کر دی ہیں باپ سے اور معمولی سا کام تو ہر کسی کو دیکھ لو، بکھوڑے تھے۔“

رافع خاموشی سے بیٹھ کر سننے پر مجبور تھا۔ عریشہ چابی لے کر باہر نکلی تو اس کی صورت دیکھ مسکرا دی۔

”نہیں رافع! یہاں ایک کاغذ ہے جو کہ والا کیبنٹ سے نکلا گیا ہے۔“

”تھینک یو!“ وہ ممنونیت سے گویا ہوا۔

"میں جانے کے خیال سے اداس ہوں؟" وہ بچوں کی طرح پوچھنے لگا۔
 ایتھن کیجی بول نہ پائی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
 "تم بھی اداس ہو ایتھن؟" اس کے لہجے میں محبت کی گرمی جاگنے لگی تھی۔
 "میں تو نہیں ہوں۔" وہ جان بوجھ کر ہنس دی تھی۔ "میں آنے والی جدائی کا سوچ کر قربت کے لمحوں کی خوشی نہیں کرتی۔ اور آنے والے ملن کی گھڑیوں کا سوچ کر وقتی جدائی کا دکھ بھول جاتی ہوں۔ آپ کی طرح قنوطی ہوں کیا؟"
 "اچھا!" وہ بھی ہنسا۔ "اور وہ میرے فون سے مونے مونے آنسو کسی کے نکلنے تھے؟ بس کے لبوں پر ایک گراہٹ لانے کے لیے میں اپنی توانائیاں صرف کرتا تھا؟ میڈم رجائیت پسند!"
 ایتھن شرارت سے ہنسنے لگی۔ وہ شخص اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی۔
 "ارے وہ تو یوں ہی تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کہ تمہاری پیاری بیوی کسی قدر با وفا ہے۔ دن رات تمہاری رائی میں آہیں بھر بھر کر ملک میں گرمی کی شدت کم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔" عاشق کو ہنسی آگئی۔
 "یعنی مجھ کو ملن بھی ہے۔ ٹوان ہون!" اس نے سر ہلایا۔
 پھر چند لمحوں میں وہ بخند ہو گیا۔
 "شاید تمہیں احساس نہیں ہے ایتھن! اپنے ملک میں اپنے بچوں کے ساتھ اپنی چھت کے نیچے رہتی ہوئی رات ان جذبات و احساسات کا اندازہ نہیں لگا سکتی جو ایک رائے دیں میں پرانے لوگوں کے درمیان رہ کر بنوں کی یاد میں دن گننے والے مرد کے ہوتے ہیں۔ بہت مشکل ہے یاد بہت مشکل سخت قسم کی مزدوری کے گھر لوٹنے والے مرد کو بیوی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے محض "وقتی جدائی" کے وہاں میں ڈوبی ہوئی عورت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔"
 وہ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ ایتھن بھاری سے اس کا ہاتھ ہٹانے لگی۔
 "تو پھر لوٹ آؤ۔ ہمیشہ کے لیے۔ یوں بھی تمہارا کانٹریکٹ تو دو سال کا تھا عاشریہ۔"
 عاشریہ سے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایتھن کو اس کی نظریں سمجھ میں نہ آئیں۔
 "کیا بات ہے عاشریہ؟"
 "میرا ایک نئی کمپنی کے ساتھ چار سال کا کانٹریکٹ ہو گیا ہے ایتھن!" اس نے بتایا۔
 ایتھن کو یوں لگا جیسے عاشریہ نے اسے خبر نہ سنائی ہو۔ زور سے دھکا دیا۔ وہ ہنسی ہوئی تھی پھر بھی اس نے خود کو کھڑا ہوا محسوس کیا۔ اس نے آنسو بھری بند کیوں پھر کھولیں۔ پھر بند کر لیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سانس لینے کی کوشش۔
 "ایتھن! عاشریہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 "پلیز عاشریہ! کچھ مدت کہو!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ پلیس کر رہی تھیں۔ جسم لٹھلکا رہا تھا۔
 "ایتھن! میری بات سنو!"
 "کچھ نہیں سننا چھوٹے کچھ بھی نہیں۔" اس نے شدت سے آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے تمہارے بچے جیسے بچے بغیر مجھ سے پوچھے بغیر نیا کانٹریکٹ سائن کر لیا؟ کچھ نہیں سوچا میرے بارے میں؟ کچھ بھی نہیں! کتنی آس سے کتنی امیدوں سے روزیاد رہ گئی ہوں۔ سوچی ہوئی جدائی کا ایک دن گزر گیا۔ پھر ایک

تاریخ خالق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ ایسے ہی گھر بچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا تہنوی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگا تا ہے۔ غالبہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائیں شدید پانی کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ترک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزر رہے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے بلیٹریں بانٹیں اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کتنی تیزی سے ملے ہو جاتی ہے مگر ان کے اشتغال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔
 ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منیرہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔
 پانچویں قسط
 شہری شام اپنے خوبصورت پردوں کو آہستہ آہستہ بند کرتی جا رہی تھی۔ موسم میں خنکی اور ٹھنڈا کا احساس بڑھنے لگا۔
 "چلیں اب؟" ایتھن بے برابر میں بیٹھے ہوئے عاشق کو دیکھا۔
 "اوں ہوں!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 دونوں نے ان سے قدرے فاصلے پر بیٹھے اب تک گھروندے بنارے تھے۔
 "اس قدر حسین شام سے میں اتنی آسانی سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف و مسرت کشید کر کے اپنے اندر بھر لینا چاہتا ہوں۔"
 اس کے لہجے میں اضطراب سا تھا۔ ایتھن کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ دور اٹھتی ہوئی کمریوں پر نگاہ جمائے کھانچا کے لیے کیا سوچ رہا تھا۔
 "عاشریہ! اس نے نرمی سے پکارا۔
 "ہوں!" اس نے نگاہوں کا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔
 "کیا بات ہے۔ اچانک اداس کیوں ہو گئے؟"
 "کتنی کبھی ہر بات جھوٹ کیوں لگنے لگتی ہے ایتھن! وقت خوشی، مسرت، اپنا آپ۔ میں کہیں بیٹھے بیٹھے اچانک خلاؤں میں متعلق ہو جاتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جیسے مجھے کسی شے کی طلب ہو اور اس شے کا نام سمجھ میں نہ آئے جیسے میں کچھ جانتا چاہتا ہوں کچھ ایسا جس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں خوش ہوتے ہوئے اچانک اداس کیوں ہو جاتا ہوں؟ میں ایک ہنسنے والے ہنسنے والے اچانک غائب ہو جاتا ہوں کیوں ایتھن؟ یہ کیسی کنفیوژن ہے؟"
 ایتھن اداس سے مسکراؤں لگی۔
 "اپنی کیفیات کو تم سمجھ نہیں پاتے عاشریہ! ابھی تم میرے ساتھ ہو اپنے بچوں کے ساتھ ہو بھریوں طریقے سے یہ وقت انجوائے کر رہے ہو لیکن تمہارا شعور کم ہونے لگا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اس بھرپور خوبصورت منظر سے غائب ہو کر کہیں اور ظاہر ہونا ہے۔ تمہارا شعور نہیں خوش رہے رہا ہے اور لا شعور اداسی۔ اس کی ساری کنفیوژن ہے۔"
 (38)

جنتابہ کی دوست کی بڑی بہن مایون بیٹھ رہی ہیں اور ایک ہزار ایک مسئلے لکھ بیٹھے ہیں کہ ذرا جلدی سے ان کا حل تلاش ہو۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہے موصوفہ کی لڑکی بیٹھے بیٹھے بٹھائے ہم پوٹیشن کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں اس لیے رسالوں کا ذکر کر لیتے ہیں ان کی مدد کے لیے۔ "وہ کوئی نئی بات؟"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"عرشہ بھنائی۔" مسائل بلکہ مسائل کا انبار کہیے۔ ناخن بڑھتے نہیں پیسے بہت بڑھ گیا ہے۔

حضرت یاد نہیں آتے تو تپ تپائی میں روکیوں پر پڑتی ہیں اور اگر یاد آتے ہیں تو۔

"انفقت" شہلا نے خفگی سے آگے دیکھا۔ "بس بہت ہو گیا۔ ختم کرو یہ فضول ٹاپکلیت میں نے کہا نا مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی گزرے ہوئے وقت کا راز ایسا جاننا ملا دیتا ہے کہ کاش میں نے اپنا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوتا۔ تم کچھ اور نہ بھگا کرو۔ پلیز! "انفقت خاموش ہو گئی۔

"مما۔" سفید شرٹ اور نیکر میں بلبوس عمریکٹ ہلا تاجلا آیا۔

"مما کی جان! شہلا نے آگے ہاتھوں میں بھڑک دیا۔

"وہ بھی میں آج راجہ سے جیت گیا ہوں میں نے اسے ہرا دیا ہے۔ وہ پوائنٹس سے بچا ہے ماما یہ لڑتی ہے ایمانی بھی کرتا ہے پھر بھی ہار گیا۔"

وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا انفقت نے اس کا کان کھینچا۔

"آپ کے خیال میں بے ایمانی کرنے والے جیت جاتے ہیں۔ چہ خوب۔"

"وہ جیتنے والے ایمانی سے جیتتا ہے خالہ جانی!"

"تو وہ جیت ہوتی ہی نہیں! شہلا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا کر جیت تو ہمیشہ سچائی سے مشروط ہوتی ہے میرے چاند!"

"آپ ضرور اس کو بھڑا بنا کر چھوڑیں گی۔ آپ ہنسنا چلی جاتی ہیں اور یہ جنتابہ کی سولی سولی باتیں ہیں فیڈ کرتے ہیں یہ۔"

انفقت ہنس دی اور شہلا کو بھی ہنسی آگئی۔

تینوں مڑخکے زور و شور سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔

عذرا تیگم نے یونہی دروازے سے جھانکا۔

"یہ تم تینوں ایسی کون سی میٹنگ کر رہی ہو باہر ورنہ بیٹھی ہے۔"

"مڑ ورنہ آئی کو بھی اندر بھیج دیں۔" مصوفہ نے انداز میں جواب دیا گیا۔

"تم سازشی کی ستاری مایون بیٹھ گئی ہو کیا؟" انہیں غصہ آیا۔

"ارے امی جی! جس نے مایون بیٹھنا ہے اس کی مشکل کا حل دھونڈ رہے ہیں۔"

"کس کو مشکل؟ آن بڑی بیٹھی؟" مڑ ورنہ نے کوہجے ورنہ اندر چلی آئی تھی۔ "یہ اتنے رسالوں کا ذکر کس لیے جمع کیا ہوا ہے ضرور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔"

"یہ سدرہ کی بیٹی نے روزنت نے مسئلے لے آئے ہیں پھر ہمیں ان کا حل دھونڈنے کے لیے بٹھا رہی ہے۔"

ممانیہ نے دانت کچکچائے۔

"ہوا کیا؟" وہ قہقہہ دینے لگی۔

"جنتابہ کی دوست کی بڑی بہن مایون بیٹھ رہی ہیں اور ایک ہزار ایک مسئلے لکھ بیٹھے ہیں کہ ذرا جلدی سے ان کا حل تلاش ہو۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہے موصوفہ کی لڑکی بیٹھے بیٹھے بٹھائے ہم پوٹیشن کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں اس لیے رسالوں کا ذکر کر لیتے ہیں ان کی مدد کے لیے۔ "وہ کوئی نئی بات؟"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"عرشہ بھنائی۔" مسائل بلکہ مسائل کا انبار کہیے۔ ناخن بڑھتے نہیں پیسے بہت بڑھ گیا ہے۔

حضرت یاد نہیں آتے تو تپ تپائی میں روکیوں پر پڑتی ہیں اور اگر یاد آتے ہیں تو۔

"انفقت" شہلا نے خفگی سے آگے دیکھا۔ "بس بہت ہو گیا۔ ختم کرو یہ فضول ٹاپکلیت میں نے کہا نا مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی گزرے ہوئے وقت کا راز ایسا جاننا ملا دیتا ہے کہ کاش میں نے اپنا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوتا۔ تم کچھ اور نہ بھگا کرو۔ پلیز! "انفقت خاموش ہو گئی۔

"مما۔" سفید شرٹ اور نیکر میں بلبوس عمریکٹ ہلا تاجلا آیا۔

"مما کی جان! شہلا نے آگے ہاتھوں میں بھڑک دیا۔

"وہ بھی میں آج راجہ سے جیت گیا ہوں میں نے اسے ہرا دیا ہے۔ وہ پوائنٹس سے بچا ہے ماما یہ لڑتی ہے ایمانی بھی کرتا ہے پھر بھی ہار گیا۔"

وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا انفقت نے اس کا کان کھینچا۔

"آپ کے خیال میں بے ایمانی کرنے والے جیت جاتے ہیں۔ چہ خوب۔"

"وہ جیتنے والے ایمانی سے جیتتا ہے خالہ جانی!"

"تو وہ جیت ہوتی ہی نہیں! شہلا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا کر جیت تو ہمیشہ سچائی سے مشروط ہوتی ہے میرے چاند!"

"آپ ضرور اس کو بھڑا بنا کر چھوڑیں گی۔ آپ ہنسنا چلی جاتی ہیں اور یہ جنتابہ کی سولی سولی باتیں ہیں فیڈ کرتے ہیں یہ۔"

انفقت ہنس دی اور شہلا کو بھی ہنسی آگئی۔

تینوں مڑخکے زور و شور سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔

عذرا تیگم نے یونہی دروازے سے جھانکا۔

"یہ تم تینوں ایسی کون سی میٹنگ کر رہی ہو باہر ورنہ بیٹھی ہے۔"

"مڑ ورنہ آئی کو بھی اندر بھیج دیں۔" مصوفہ نے انداز میں جواب دیا گیا۔

"تم سازشی کی ستاری مایون بیٹھ گئی ہو کیا؟" انہیں غصہ آیا۔

"ارے امی جی! جس نے مایون بیٹھنا ہے اس کی مشکل کا حل دھونڈ رہے ہیں۔"

"کس کو مشکل؟ آن بڑی بیٹھی؟" مڑ ورنہ نے کوہجے ورنہ اندر چلی آئی تھی۔ "یہ اتنے رسالوں کا ذکر کس لیے جمع کیا ہوا ہے ضرور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔"

"یہ سدرہ کی بیٹی نے روزنت نے مسئلے لے آئے ہیں پھر ہمیں ان کا حل دھونڈنے کے لیے بٹھا رہی ہے۔"

ممانیہ نے دانت کچکچائے۔

"ہوا کیا؟" وہ قہقہہ دینے لگی۔

"جنتابہ کی دوست کی بڑی بہن مایون بیٹھ رہی ہیں اور ایک ہزار ایک مسئلے لکھ بیٹھے ہیں کہ ذرا جلدی سے ان کا حل تلاش ہو۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہے موصوفہ کی لڑکی بیٹھے بیٹھے بٹھائے ہم پوٹیشن کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں اس لیے رسالوں کا ذکر کر لیتے ہیں ان کی مدد کے لیے۔ "وہ کوئی نئی بات؟"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"عرشہ بھنائی۔" مسائل بلکہ مسائل کا انبار کہیے۔ ناخن بڑھتے نہیں پیسے بہت بڑھ گیا ہے۔

حضرت یاد نہیں آتے تو تپ تپائی میں روکیوں پر پڑتی ہیں اور اگر یاد آتے ہیں تو۔

"انفقت" شہلا نے خفگی سے آگے دیکھا۔ "بس بہت ہو گیا۔ ختم کرو یہ فضول ٹاپکلیت میں نے کہا نا مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی گزرے ہوئے وقت کا راز ایسا جاننا ملا دیتا ہے کہ کاش میں نے اپنا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوتا۔ تم کچھ اور نہ بھگا کرو۔ پلیز! "انفقت خاموش ہو گئی۔

"مما۔" سفید شرٹ اور نیکر میں بلبوس عمریکٹ ہلا تاجلا آیا۔

"مما کی جان! شہلا نے آگے ہاتھوں میں بھڑک دیا۔

"وہ بھی میں آج راجہ سے جیت گیا ہوں میں نے اسے ہرا دیا ہے۔ وہ پوائنٹس سے بچا ہے ماما یہ لڑتی ہے ایمانی بھی کرتا ہے پھر بھی ہار گیا۔"

وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا انفقت نے اس کا کان کھینچا۔

"آپ کے خیال میں بے ایمانی کرنے والے جیت جاتے ہیں۔ چہ خوب۔"

"وہ جیتنے والے ایمانی سے جیتتا ہے خالہ جانی!"

"تو وہ جیت ہوتی ہی نہیں! شہلا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا کر جیت تو ہمیشہ سچائی سے مشروط ہوتی ہے میرے چاند!"

"آپ ضرور اس کو بھڑا بنا کر چھوڑیں گی۔ آپ ہنسنا چلی جاتی ہیں اور یہ جنتابہ کی سولی سولی باتیں ہیں فیڈ کرتے ہیں یہ۔"

انفقت ہنس دی اور شہلا کو بھی ہنسی آگئی۔

تینوں مڑخکے زور و شور سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔

عذرا تیگم نے یونہی دروازے سے جھانکا۔

"یہ تم تینوں ایسی کون سی میٹنگ کر رہی ہو باہر ورنہ بیٹھی ہے۔"

"مڑ ورنہ آئی کو بھی اندر بھیج دیں۔" مصوفہ نے انداز میں جواب دیا گیا۔

"تم سازشی کی ستاری مایون بیٹھ گئی ہو کیا؟" انہیں غصہ آیا۔

"ارے امی جی! جس نے مایون بیٹھنا ہے اس کی مشکل کا حل دھونڈ رہے ہیں۔"

"کس کو مشکل؟ آن بڑی بیٹھی؟" مڑ ورنہ نے کوہجے ورنہ اندر چلی آئی تھی۔ "یہ اتنے رسالوں کا ذکر کس لیے جمع کیا ہوا ہے ضرور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔"

"یہ سدرہ کی بیٹی نے روزنت نے مسئلے لے آئے ہیں پھر ہمیں ان کا حل دھونڈنے کے لیے بٹھا رہی ہے۔"

ممانیہ نے دانت کچکچائے۔

"ہوا کیا؟" وہ قہقہہ دینے لگی۔

جنتابہ کی دوست کی بڑی بہن مایون بیٹھ رہی ہیں اور ایک ہزار ایک مسئلے لکھ بیٹھے ہیں کہ ذرا جلدی سے ان کا حل تلاش ہو۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہے موصوفہ کی لڑکی بیٹھے بیٹھے بٹھائے ہم پوٹیشن کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں اس لیے رسالوں کا ذکر کر لیتے ہیں ان کی مدد کے لیے۔ "وہ کوئی نئی بات؟"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"عرشہ بھنائی۔" مسائل بلکہ مسائل کا انبار کہیے۔ ناخن بڑھتے نہیں پیسے بہت بڑھ گیا ہے۔

حضرت یاد نہیں آتے تو تپ تپائی میں روکیوں پر پڑتی ہیں اور اگر یاد آتے ہیں تو۔

"انفقت" شہلا نے خفگی سے آگے دیکھا۔ "بس بہت ہو گیا۔ ختم کرو یہ فضول ٹاپکلیت میں نے کہا نا مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی گزرے ہوئے وقت کا راز ایسا جاننا ملا دیتا ہے کہ کاش میں نے اپنا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوتا۔ تم کچھ اور نہ بھگا کرو۔ پلیز! "انفقت خاموش ہو گئی۔

"مما۔" سفید شرٹ اور نیکر میں بلبوس عمریکٹ ہلا تاجلا آیا۔

"مما کی جان! شہلا نے آگے ہاتھوں میں بھڑک دیا۔

"وہ بھی میں آج راجہ سے جیت گیا ہوں میں نے اسے ہرا دیا ہے۔ وہ پوائنٹس سے بچا ہے ماما یہ لڑتی ہے ایمانی بھی کرتا ہے پھر بھی ہار گیا۔"

وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا انفقت نے اس کا کان کھینچا۔

"آپ کے خیال میں بے ایمانی کرنے والے جیت جاتے ہیں۔ چہ خوب۔"

"وہ جیتنے والے ایمانی سے جیتتا ہے خالہ جانی!"

"تو وہ جیت ہوتی ہی نہیں! شہلا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا کر جیت تو ہمیشہ سچائی سے مشروط ہوتی ہے میرے چاند!"

"آپ ضرور اس کو بھڑا بنا کر چھوڑیں گی۔ آپ ہنسنا چلی جاتی ہیں اور یہ جنتابہ کی سولی سولی باتیں ہیں فیڈ کرتے ہیں یہ۔"

انفقت ہنس دی اور شہلا کو بھی ہنسی آگئی۔

تینوں مڑخکے زور و شور سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔

عذرا تیگم نے یونہی دروازے سے جھانکا۔

"یہ تم تینوں ایسی کون سی میٹنگ کر رہی ہو باہر ورنہ بیٹھی ہے۔"

"مڑ ورنہ آئی کو بھی اندر بھیج دیں۔" مصوفہ نے انداز میں جواب دیا گیا۔

"تم سازشی کی ستاری مایون بیٹھ گئی ہو کیا؟" انہیں غصہ آیا۔

"ارے امی جی! جس نے مایون بیٹھنا ہے اس کی مشکل کا حل دھونڈ رہے ہیں۔"

"کس کو مشکل؟ آن بڑی بیٹھی؟" مڑ ورنہ نے کوہجے ورنہ اندر چلی آئی تھی۔ "یہ اتنے رسالوں کا ذکر کس لیے جمع کیا ہوا ہے ضرور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔"

"یہ سدرہ کی بیٹی نے روزنت نے مسئلے لے آئے ہیں پھر ہمیں ان کا حل دھونڈنے کے لیے بٹھا رہی ہے۔"

ممانیہ نے دانت کچکچائے۔

"ہوا کیا؟" وہ قہقہہ دینے لگی۔

وہ بیٹے سخت خفا تھیں۔
 "اگر وہاں میں شرمندہ پائی۔ بچہ دیکھو نو جوان کے لیے ایک خالی۔ مانگے گھر والی بھلا جاؤ!"
 بدر کو ماں کی بڑی ہمت سے مطلق دیکھی تھی نہ پروا۔ وہ بچہ گنگناہتے ہوئے نشی نظروں سے بار بار ان کی طرف دیکھتا تھا۔
 ربیعہ کو سمجھ سے اس کے تغافل خاص کا علم تھا پھر بھی اسے بدر کے وہاں آکھنے سے کوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ چائے کا خالی گلاس رکھنے کے بہانے وہاں سے اٹھ کر نفیسہ خالہ کے پاس بچن میں چلی آئی۔
 "ارے بیٹی! تم کیوں نہ نہیں۔ چکر نہ آجائے۔ جسم میں ابھی نقاش ہے۔ کچھ خیال کرو۔"
 "کچھ نہیں ہو ناخالہ!" وہ مسکرا دی۔ "دیکھئے، دیکھئے بھی اکٹائی ہوں۔"
 وہاں کے پاس پڑی بیٹری پر بیٹھ کر جوئے میں ابھرتے آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگی۔
 "نقاشہ کرنا بیٹی! یہ چاہئے کہ خراج بھی تمہارے سر پر رہا ہے" وہ چائے بنانے پر شرمندہ تھیں۔
 "ناخالہ!" ربیعہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اسٹے لک جیسے بے لوث خدمت کر رہی ہیں میری۔ مجھ پر آپ کا اتنا بھی حق نہیں۔"
 "میں نے کیا کیا بیٹی۔ بھلا بتاؤ۔"
 وہ شرمندہ سی ہنسی نہں کر چائے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ ربیعہ خیالات کے دھارے کے ساتھ ساتھ بے ہوش ہو گئی۔
 باہر صحن میں بدر، سمیعہ کے قریب جا بیٹھا تھا۔
 "ارے بھئی! رات سے رات سے ارے عذرا! کہاں ہو۔" فردوس بیگم ہانپتی ہانپتی ادھر ادھر دھڑکتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ سارے گھر اہٹ کے انہیں تخت پر بیٹھی بیسیج کرتی ہوئی سانس بھی نظر نہ آئی تھیں۔
 "حقیقتہً حیات نے جلدی جلدی ہتھیائیاں لپڑے پر پھیریں۔"
 "ارے فردوس! کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟"
 اتنی دیر میں عذرا بیگم بھی بوجھلت اندر سے برآمد ہو گئیں۔ رات بھی اتفاق سے اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ تالی کی خبر لائی ہوئی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکل کر بیٹریوں پر آکھڑا ہوا۔
 "کیا ہوا یا بی بی؟"
 "ارے رات سے میرے بچے جلدی آؤ۔ ہاشم کو اسپتال لے کر جانا ہے۔"
 "ہاشم! وہ دھڑ دھڑ میز چلیاں مارتا چلا آیا۔"
 "کیا ہوا، کیسے ہوا؟"
 ہر طرف سے سوالات برسنے لگے تھے۔ فردوس بیگم آنسو پونچھنے لگیں۔
 "سوڑا سٹیل سے گھر کیا، مانتا پھٹ گیا ہے۔ بھل بھل خون بہہ رہا ہے جلدی چلو۔"
 وہ سب کے سب نہایت تیز رفتاری سے باہر کی جانب بڑھے تھے۔ رات سب نے آگے تھا۔ تقریباً دوڑتے ہوئے اس نے دونوں پور شتوں کا درمیانی فاصلہ طے کیا۔ ہاتھ مار کر اس نے مرکزی لاؤنج کا دروازہ کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔
 ماتھے پر برف کی گور کر رہتے ہاشم کو دیکھ کر اس نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔ تھے ہوئے اعصاب یکدم

ہوئے۔ "اگر وہ صدمے جاواں!" اس نے پورے دانتوں کی نمائش کی۔ "کیا ذکر چھیڑا ہے۔ بل خوش کر دیا ہے میری ہونے والی" جسے ہو جائے گی تب تم لوگ جل جل کر راکھ ہونا اور اس راکھ سے پیلے مانجھنا۔ ارے وہ تو ایسی ہوگی۔ ایسی ہوگی۔ کیسی ہوگی؟ پھر وہ رو رہے پونچھنے لگا۔
 "لوگ پس ناؤ ڈیشن ہے۔" جواب کہیں اور سے آیا۔
 "ہو نہ ہو۔ جل جل کر تم لوگ اور کالی ہو جانا۔"
 "چھا بھئی! تم جاؤ یہاں سے۔"
 لڑکیوں نے اسے بہت مشکوں سے بھر نکالا تھا۔ پھر وہ سر جوڑ کر دوبارہ مسائل کا حل لکھنے بیٹھ گئیں۔
 "رات کو سوتے وقت ناخنوں پر لسن کے جوئے ملیں۔" عرشہ لکھنے لگی پھر اس نے بین ایک طرف رکھ دیا۔
 "سارے کام اس بچے چاری کورات کو ہی کرنے ہیں۔ ناخنوں پر وہ لسن مل لے گی چہرے اور گردن پر لکھو گی۔"
 بالائی سے مساج کرتے لگی بالوں میں تیل کی سریر کی مالش کر لے گی۔ تو رزلت کیا نکلے گا؟
 "دو بار دہرے کرے میں سوتے گا۔" نانیہ نے سوچ کر دہرائے جواب دیا۔
 "ہائے ہائے! پھر یہ سب کچھ کرنے کا ناندہ؟"
 وہ بے چارگی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔
 اس کی طبیعت کافی بہتر ہو چلی تھی۔ نفسہ خالہ اور سمیعہ نے اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی تھی اور اس کا بہت خیال رکھا تھا۔
 اس وقت بھی وہ دونوں اس کے پاس موجود تھیں۔ نفسہ خالہ اس کے لیے کچھ بڑی بہاری تھیں جبکہ سمیعہ اپنے اور اس کے لیے چائے بنالائی تھی۔
 "دونوں چائے کے گک تھامے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں جب دروازہ بجا۔"
 "ماں! آجاؤں؟" بدر کی آواز آئی۔ پھر وہ جواب کا انتظار کے بغیر اندر چلا آیا۔
 سمیعہ کے چہرے پر ایک محسوس کی جانے والی تازگی اور شرمیلی مسکراہٹ اچھٹنے لگی۔
 "نفسہ خالہ سوالیہ نظروں سے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔
 "دیکھئے؟ وہاں کو اپنا آپ تو لہا ہوا محسوس کر کے کچھ جھل سا ہوا ہے۔" ماں۔ گھر پر کچھ پکایا نہیں کیا؟ مجھے بھوک لگی ہے۔"
 "تو نے! میں نے یہاں تو تندور لگایا نہیں۔ گھر آ کر ہی پکاؤں گی روٹی۔ ابھی شام کے چھ بجے ہیں اور تجھے بھوک بھی لگ گئی سچ کہتے ہیں فراغت میں لڑکے کو روٹیوں کے خیال ہی آتے ہیں۔" وہ جڑ بڑھاتا۔
 "تقریباً آجھاڑا ماں! یہ تپا کچھ کھانے کو ہے؟" وہ لڑکیوں کے سناہنے درگت بننے پر چڑ گیا۔
 سمیعہ منہ دبانے نہیں دیتی تھی۔ ربیعہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔
 "جیسا کہ کچھ کھانے کو نہیں ہے تو چل کر لے آؤ۔ ابھی آخر اس کی ماں تھیں۔"
 "چھا! میں نے سر کھا کر ادھر ادھر کھا۔ ایک تڑپری نگاہان دونوں پر بھی ڈالی۔
 "پھر ایسا کر پھر چائے ہی پلاؤ۔" وہ گونے میں رہ گئے مگر وہ بچے پر جانا بیٹھا۔
 سمیعہ پھر بھی سے بے حال ہونے لگی جبکہ ربیعہ سنجیدگی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔
 نفسہ خالہ مجبوراً چائے بنانے لگیں۔ لیکن زبردستی بھی جاری تھیں۔ جوان لڑکیوں کے مقابل آ بیٹھنے پر

ڈھیلے ہوئے تھے۔ صورتحال اتنی خطرناک نہیں تھی جتنا کہ اس کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔
 ”کیا ہوا یا ر! ڈرا دیا چچی نے تو۔“
 ”کیا کئی بات نہیں۔۔۔ اپنی روڈ کے کارز پر تھا۔ ایک بچی سامنے آگئی بائیک سلف ہو گئی۔“ رافع قریب
 جا کر اس کا زخم دیکھتے لگا۔ اتنی دیر میں باقی افراد بھی چلے آئے۔
 ہاشم بھی سوالات کے بہاؤ کی زد میں آگیا۔
 رافع نے اس کے ماتھے پر وقفے وقفے سے ابھرتے والے خون کی بوندوں کو دیکھا۔ اس کی کہنی پر بھی اچھا بھلا زخم
 آتا تھا۔ پینٹ کا پانچواں اس نے موڑا ہوا تھا۔ ٹانگ پر پڑی خراشیں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر پیچھے سے اڑا
 اور کسی کی نگاہ میں آئے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 ”داوی جان! میں ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ ہاشم شفیقہ حیات کے تفکرات سے اظہار کے جواب میں
 ”ارے لہجے! نا تھا بیٹ گیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کچھ نہیں ہوا! میں کہتی ہوں اسپتال جاؤ۔ کوئی ایک
 لگواؤ۔ ماتھے کی مرہم پی کر آؤ۔ ان چوٹیوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔“ ہاشم ہنسنے لگا۔
 ”یاری داوی! کیوں فکر کرتی ہیں۔۔۔“
 ”ڈھیک تو کہتی ہیں۔“ فردوس بیگم بھی خفگی سے بولیں۔ ”درد کی کہنی دیکھو اپنی۔ کیسی سو جن ہو رہی ہے۔ رافع
 تم اسے لے کر جاؤ۔“
 وہ مڑیں پھر حیران رہ گئیں۔
 ”وہاں نہیں یہ کہاں رفو چکر ہو گیا۔“ انہیں سخت تاؤ آیا۔ ”وہ لگے بھی رہا ہے بچے کی حالت پھر بھی بنا پوتھے کچھ
 کھسک لیا۔ دیکھو آج کل کے لڑکوں کا احساس ذمہ داری۔“
 ”صبر کرو ہوا اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ کسی کام سے ہی گیا ہو گا۔“ شفیقہ حیات نے انہیں تسلی دے کر ٹھنڈا
 دیا۔
 ”عذر رائیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے جذبات قابو میں کیے۔
 اسی لمحے لاؤنج گاؤ دروازہ کھول کر رافع اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ سبھی اس کا
 جانب متوجہ ہو گئے۔ اس کے پیچھے شہلاہ حسن علی تھی۔ اس نے وہاں آکر پہنا ہوا تھا۔ گلے میں اسٹیکو
 تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ڈیوٹی کیسے لوٹی۔
 ”السلام علیکم۔“ اس نے ہلکے بھلکے انداز میں سب کو سلام کیا۔
 یہ گھر اور اس گھر کے ٹیکین اس کے لیے کبھی بھی اجنبی نہ رہے تھے۔ بچپن سے وہ یہاں آتی جاتی رہی تھی۔
 ایقان سے اس کی دانت کالے کی دوستی رہی تھی۔
 سب ہی نے اس کے سلام کا پر جوش و پر خلوص جواب دیا تھا۔ سوائے فردوس بیگم کے۔ جن کے ماتھے پر
 شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ آنکھوں میں محسوس کیے جانے والا شفق در آہا تھا۔ مارے غصے کے ان کا سانس
 پھولنے لگا۔
 ”کیا ہو گیا آپ کو؟“ شہلاہ ہاشم سے پوچھنے لگی۔
 ”مصرف انداز میں وہ اپنا فرسٹ ایڈ باکس بھی کھولنے لگی۔
 ہاشم خواب کے لیے عالم میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے شہلا کی جانب بھٹکی اس وقت دیکھا تھا جب وہ دروازہ کھول
 (48)

"کل۔ کل آرہی ہیں پھپھو۔" "کل۔ کل۔" یعنی کہ کل۔
 "کل۔ کل۔" وہ پریشان ہوا۔ "یعنی کہ کل۔" "نہیں یہ کانڈ کل۔ آپ کو سائن کروں گی۔ ٹھیک ہے نا اکل۔"
 "کل۔ کل۔" ریحہ قدرے مطمئن ہوئی۔ "نہیں یہ کانڈ کل۔ آپ کو سائن کروں گی۔ ٹھیک ہے نا اکل۔"
 عرفان شوکت سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 "مجھے کل یہ کانڈ چاہیے دستخط کے ساتھ۔"
 "جی ٹھیک ہے۔" وہ موہنا بن کر بولی۔
 "اچھا ہاؤ۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔
 ریحہ کو دردناک ہند کر لینے کا خیال بھی نہ رہا۔ کانڈ دونوں ہاتھوں میں جھپٹے ہوئے پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت بڑے خیال میں پھنس چکی تھی۔
 "شاید۔ شاید مجھے یہ گھر بیچنا ہی ہوگا۔" اس نے سوچا۔
 باتوں اور قہقروں کی ملی جلی آوازوں کے بجائے اس نے ایک نگاہ ایقان پر ڈالی۔
 وہ باتوں میں بہت زیادہ حصہ نہیں لے رہی تھی۔ بات بے بات ہی کی پھوار میں بھینکا اسے پسند تھا۔ کب کب وہ بات بے بات نہ ہو جاتی تھی۔ چائے کا کپ لیے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی سوچ میں گم ہو جایا کرتی۔ عاشر شرمہ کی نگاہوں سے اسے دیکھ کر ہاتھ دبا تھا۔
 "لو بسنتی یون ہاگل۔ نہ جارے نہ جاگے۔" "حزو نے اچانک شرمہ کی آواز میں درویشان تپن لگائی۔ سب خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔
 اس کا "کوئی" غمزدگت سے زیادہ لبا ہونے لگا تو عیشہ نے اسے ایک دھپ لگائی۔
 "کیا مسئلہ ہے؟ اس "دور" کا کیا نام ہے؟" "ناخن نے اسے گھورا۔
 "یہ تو پھپھو سے پوچھو۔ مجھے کیا پتا ہے؟" "ناخن نے اسے گھورا۔
 عاشر شرمہ نے لگاؤ کے لبوں پر بھی شرمندہ شرمندہ سی مسکان آجائی تھی۔ جزو کو گھورنے لگی۔
 "میں تجھے۔ چھوڑ کے۔ کتناں جاؤں گا۔" "اب علی کی باری تھی۔ "میرے بھوئے۔" "میرے سر کی قسم"۔
 جا کے جلدی ہی میں لوٹ آؤں گا۔ بائے بائے بائے بائے بائے۔" اس نے ہاتھ دھکی ہلایا۔
 ایقان ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔
 "تو بے خبر ہے۔" "ہاں۔" "تو بے خبر ہے۔" "ہاں۔" "تو بے خبر ہے۔" "ہاں۔"
 "تھینک یو یار۔" "تھینک یو سوچ۔" "عاشر نے انہیں ممنونیت سے دیکھا۔ "اس جلدی خدا کو بیٹایا تو سی۔"
 "مجھے تو اس کا یہ بوقہار دیکھ کر اپنے جانے کے خیال سے خوف آ رہا تھا۔"
 "لو۔" "پھپھو جان! آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔" "علی! اگلے دن ان میں ہمیشہ صحیح رشتے سے پکارا کرتا تھا۔ اور نہ عمو"۔ "وہ عاشر بھائی یا عاشر اکل سے کام چلا لیا کرتا تھا۔"
 "ہم انہیں ہنسنا کر ہنس کا گول کیا یاد رہے گا۔"
 "وہ تو خیر تم بیٹا ہی تھے۔" "عاشر نے شرارت سے ایقان کو دیکھا۔ "تبی اسٹری سی بیوی چھوڑ کر گیا تھا۔"
 "بائیس اچ کی گز بھی اس کی۔"
 (53)

BY HANNAH
 "حالا نہ میرے علم میں ہے کہ تمہاری پھپھو ابھی تک پہنچ نہیں پائی ہیں۔"
 ریحہ نے اپنے اندر ایک عجیب سی اذیت محسوس کی۔ مار کے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔
 تھے اس نے جلدی سے نظریں جھپکا کر اپنے ہاتھوں پر مرکوز کر دیں۔
 "مجھے اس سلسلے میں قدرے غلط کا سامنا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سورا تمہارے ساتھ ہی طے کر لوں۔ بعد میں تمہاری پھپھو اور پھپھا سے بات چیت ہوتی رہے گی۔ تم تو بس اس کانڈ پر ایک سائن کر لو گے۔"
 اس نے اچانک ہی عجیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کانڈ نکالا تھا۔
 "تم۔ کتنے سال کی ہو؟" "اچانک اسے دھیان آیا۔ "تمہارا شناختی کارڈ تو بن گیا ہے نا؟"
 ریحہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے نفی میں ہر ہلایا۔
 "اوہ۔" "عرفان شوکت کو شاید اس جواب کی امید نہ تھی۔" "بہر حال وہ تو بن جائے گا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
 زرا اس کانڈ پر دستخط کر دی۔
 "اس پر کیا لکھا ہے؟" "ریحہ نے کانڈ تھامتے کی زحمت نہ کی۔
 "اس پر تھن اتنا لکھا ہے کہ تم ہم سے اپن گھر کا سودا کرنے پر تیار ہو۔ میں کہہ رہا ہوں نا باقی کے معاملات تمہارے عزیزوں کے آسے پر ہی طے ہوں گے۔"
 "مگر آپ سے کس نے کہا کہ میں اس گھر کا سودا کرنا چاہتی ہوں؟" "اب اس نے قدرے تندہ سے کہا۔
 "اس گھر سے میری بیماری وادی کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کے چپے چپے پر ان کے قدموں کے نشان ہیں۔ اس کے دروازوں پر ان کے نقش ابھرتے ہیں۔ مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ اور۔۔۔ آپ مجھے میری وادی کی یادوں کے غور غور ایک معمولی رقم کی پیشکش کر رہے ہیں۔ اس امید پر کہ میں یہ پیشکش قبول بھی کر لوں گی؟"
 "اسے بھی۔ اس قدر غصہ نہ۔" "عرفان شوکت بناوٹی طور پر محظوظ ہو کر کچھ دیر تک ہنسا۔ "تبی سی گڑیا اور ہاتھ غصہ اور ہنسا۔"
 ریحہ ہلکے تپوہوں کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس پر عرفان شوکت کی غمی کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ پھر ایک لخت ہی نا خاموش ہوا۔
 "دیکھو بیٹی! تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کانڈ پر خاموشی سے دستخط کر دو۔ مجھے ہر قسم کی زبان بولنا آتی ہے اور تم جسے میں سب سے نرم زبان میں بات کر رہا ہوں۔ مجھے اس علاقے میں اسی لوکیشن کی ضرورت ہے۔ اگر شد ضرورت اور میں اپنی ضرورتوں پر مجھوتہ کر لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ یہ گھر تو میں ہر حال میں لے لی لوں گا۔ بات تمہاری بھلائی کی ہے اور میں فی الحال تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ کیا سمجھیں؟" "ریحہ منٹوں میں خوفزدہ ہو گئی لیکن اس نے یہ خوف اپنے چہرے پر لانے سے حتی الامکان گریز کیا۔ اس نے ہاتھ برسھا کر عرفان شوکت کے ہاتھ سے کانڈ لے لیا۔
 "صل میں اکل نہ ہو۔" "وہ پھر سوچنے لگی تھی۔" "بات کچھ یوں ہے کہ میں تو دستخط کر بھی دوں۔ لیکن پھپھو۔۔۔ بہت برا مانیں گی۔ ان کا گھر ہے ان کی مرضی کا سودا ہونا چاہیے۔"
 عرفان شوکت کے چہرے پر دردناک لڑائی کا رنگ تھا۔ "اگلے دن اس کا قدرے زائل ہوئے۔"
 "میں نے کہا نا ان سے بات کرنا اور ان کو مطمئن کرنا میرا کام ہے۔" "کون سی ٹرین میں سواریں تمہاری؟"
 "پھپھو۔۔۔ دن بار۔۔۔ تو مجھے یہ آرام کتنا ہوتا ہے۔"
 ریحہ گڑبڑاتی تھی۔
 (52)

ایقان نے بے ساختہ انداز میں اسے گھوڑا۔ مبادا وہ اس کا راز فاش کر دے۔
 "خالی کی خبر دیجئے۔" علی نے اپنا کان اس کے قریب کیا۔ ایقان نے اس کا دھڑکاں کھینچ کر اسے اپنی جانب کیا۔
 "حال کے بچے۔۔۔ نہیں گاتے۔ گاتے کا تجتس ہے؟ مجھ سے ڈائریکٹ پوچھ لو۔"
 "ارے آپ آدھے پونے انچ کی ڈنڈی ضرور پاریں گی۔"
 "ڈرائیو سے رائٹ۔۔۔" عاشق بھی ہنسنے لگا تھا۔ "وہیے ایقان کا ارادہ ہے کہ تمہاری برأت میں یہ اپنا ویڈیو ڈنڈی
 ڈریس پہنے گی۔ کیوں ایقان؟"
 "آپ کم ہیں ان مسخوں سے۔ وہ جل کر وہاں سے اٹھ ہی گئی۔"
 "میں ذرا باجی سے مل کر آتی ہوں۔" وہ عاشق کو بتا کر جانے لگی۔
 اس وقت وہ لوگ سلجوق حسن اور عذرا بیگم کے پورشن میں تھے۔ شفیقہ حیات اپنے چھوٹے بیٹے سلجوق حسن
 کے ہمراہ رہتی تھیں۔ بڑی بیوی سے ان کی کچھ خاص نہ بنتی تھی۔
 وہ اپنے دھیان میں درمیانی لان عبور کر رہی تھی۔ سامنے سے آتے اختر میان کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رکی۔ اگرچہ
 اب وہ ایک خود اعتماد عورت تھی پھر بھی برسوں پرانا ایک واقعہ اس کے "اندر" کو چھیڑ گیا۔ وہ نگاہیں اچڑا کر گزرنے
 لگی۔
 "سلام عرض کرتے ہیں آپ کی خدمت میں۔"
 "جیتے رہے۔" وہ طنزاً بولی۔
 "آپ کی بددعا تو نہ دیں ایقان بیگم!"
 وہ ذرا کی ذرا رک کر آگے بڑھنے کو تھی کہ یکدم پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔
 "اپنی ہڈ حرامی کا کریڈٹ کیوں خواجواہ کسی بے قصور کے سر ڈالتے ہیں اختر میان! کسی دھندے سے لگیے۔"
 جب تک سنی ہی رہے ہیں تب تک تو جینے کا عملی ثبوت پیش کیجئے۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔
 خود نمائی تو نہیں۔۔۔ شادی ارباب وفا
 جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں
 کھٹ کھٹ کرتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔
 "ہائے۔۔۔" اختر میان وہیں گھاس پر دھب سے بیٹھ گئے۔ "تجھے کیا خبر ظالم! ہم چراغوں کی طرح شام سے جل
 جاتے ہیں۔۔۔ ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں۔ ہم چراغوں کی طرح۔۔۔ ہم چراغوں کی طرح۔۔۔"
 وہ دیوانوں کی مانند سر ہلاتے جا رہے تھے۔
 ڈبل ڈوبلی نمٹا کر وہ بے حد تھکی ہوئی لوٹی تھی۔
 گاڑی لاک کر کے وہ اندر کی جانب بڑھنے لگی۔ جب اس کی نگاہ لان میں بیٹھی انہیں اور اس کی دوست پر پڑی۔
 وہ اس کے سلام دعا کرنے کی غرض سے لاک میں چلی آئی۔
 "کیسی ہو ارم؟" اختر میان نے پوچھا۔
 "ایک دم فرسٹ کلاس۔ آپ سنا بیٹے تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔"
 (54)

کچن میں رکھے چند ایک گندے برتن دعو کر اس نے جگہوں پر رکھے پھر کچن کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی
 دوپٹے کو کھول کر وہ صحیح طرح سے اوڑھ رہی تھی جب دروازہ بجا۔
 ”اس وقت کون آیا؟“ اسے الجھن ہوئی۔
 ”کون ہے؟“ آگے برہ کر اس نے پوچھا تھا۔
 ”بدر!“ مختصر جواب آیا۔
 ربیعہ نے دروازہ کھول دیا۔ باہر بدر کھڑا چوروں کی مانند اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔
 ”کیا بات ہے؟“ اس نے شکے مانتے پر شکنیں پڑ گئیں۔
 ”وہ۔۔۔ ذرا سی بات کرنا تھی۔ میں اندر آ جاؤں؟“
 ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اکثر اسے بدر کے محبت نامے سمعیہ تک پہنچانے پڑتے تھے۔ یہ کام اسے
 سخت ناپسند تھا پھر بھی وہ بحالت مجبوری از حد کراہیت سے یہ کام کیا کرتی۔ اصل میں اسے بدر ہی ناپسند تھا لیکن
 اپنی بچپن کی دوست کو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے خفا کر دینے کی ہمت اس میں نہ تھی۔
 ”ہاں“ کہو کیا بات ہے۔“ ربیعہ نے اگلے اندر آ جانے کا رستہ تو دے دیا لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد وہاں
 سے چلا جائے۔
 ”وہ۔۔۔ بات کرنا تھی۔“ اس نے دانت نکالے۔
 ”ہاں تو کرو۔ کیا کہنا ہے سمعیہ؟ میں وہیں جا رہی ہوں۔“
 ”نہیں۔۔۔ سمعیہ سے میں بھلا کیا بات کروں گا۔ مجھے تو تم سے بات کرنی ہے۔“ اس کے دانت اندر دھکے جاتے
 ”مجھ سے؟“ ربیعہ کو حیرانی ہوئی۔ ”چھا کہو۔“
 ”وہ۔۔۔ تم ناراض تو نہیں ہوگی؟“
 ”جی“ ربیعہ کو سخت الجھن ہوئی۔ ”دیکھو بدر! مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔“
 ”وہ۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔“
 ”اوہ!“ ربیعہ پر منوں اُونٹن پڑ گئی۔
 نفیسہ خالہ نے اس سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور ربیعہ نے انہیں صاف انکار بھی کر دیا تھا۔
 ”دیکھو بدر! تم پریشان مت ہو۔“ اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ”خالہ نے بات کی تھی مجھ سے اور میں نے انہیں
 منع بھی کر دیا تھا۔ تم اس بات کی فکر مت۔“
 ”لیکن تم نے کیوں منع کیا؟“ اس کی بات اس کے لبوں میں ہی رہ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔
 ”میں کیا تمہیں برا لگتا ہوں ربیعہ؟ تم تو۔۔۔ تم تو۔۔۔ مجھے بہت پیاری لگتی ہو بہت زیادہ۔۔۔ وہ سمعیہ چڑیل تو
 زبردستی میرے گلے پڑ رہی ہے۔ لیکن مانو مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم اماں کو ہاں کہہ دو میں تو تم سے شادی
 کرنا چاہتا ہوں۔“
 ربیعہ آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی بدر تھا جس کے طویل ترین محبت نامے سمعیہ اسے
 زبردستی سنایا کرتی تھی جن میں اپنی محبت کی سچائی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی قسم اٹھانے کو تیار رہا
 رہ کر رہا تھا۔ ”کو تو نارہم ربیعہ! میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“
 ”دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔
 (باقی آئندہ ماہ)

تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرب شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے انیس کوئی گھڑی ہو جس کے پیٹ وا کر کے وہ اپنے اندر کے جس کو کم کر سکے۔
 دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شباب محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہے کہ جلیقں بانو اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔
 ڈاکٹر شہلا اپنی ماں معنیذہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

بھٹی قسطنطنیہ

”سایا بنا گھر سونا... سیاں بنا گھر سونا...“
 مغنیہ کی آواز سی ڈی پلیئر سے نکل کر پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ وہ بیڈ پر آنکھیں میوند کر رہی تھی۔
 گھر واقعی بے حد سونا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ وہاں محض ایک فرش کی کمی ہوئی تھی۔ کل شام کی تلاش سے واپس گیا تھا اور ایقان کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ آیا ہی نہ تھا۔ جیسے اس نے اپنے گھر کو آنکھ لگ جانے پر کوئی خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلنے پر سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ سونا گھر سونا دل خالی گھر خالی آنکھیں۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر درختے میں آکھڑی ہوئی۔ نیچے سڑک پر ٹرنک رواں دواں تھا۔ لوگوں سے بھری ہوئی دیکھیں، بیسیں گاڑیاں۔ رات کی آبر کا اعلان ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ رہے تھے۔ سب ہی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ سب کے گھروں میں ان کی بیوی بچے منتظر تھے۔ وہ وہیں کھڑی بے مقصد ہی سوچنے لگی۔
 کام کاج سے فارغ ہو کر نہائی دھوئی صاف ستھری عورتیں ہر گھوڑی درختے چونک کر گھڑی کی سمت دیکھتی ہوں گی۔ میاں لگے بندھے نام پر گھر لوٹا ہو تو منٹ منٹ کا بھی حساب ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو چھوٹا بچہ ہی پوچھ لیتا ہے۔

PICTO

”پہا ابھی تک نہیں آئے؟“
 مخصوص وقت ہوتے ہی بج اٹھنے والی بیل یا انتظار کے تناؤ کو سمجھتی ہارن کی آواز سننے لگتی ہوئی۔
 ”آنسو یوں نہ بہاؤ۔ یہ موتی نہ لٹاؤ۔“ سی ڈی پلیئر پر مغنیہ کی آواز ابھری تو وہ چونک اٹھی تھی۔
 ”رکتا نہیں ہے وقت کا دھارا اس پل بل بدے جیون پیارا۔“
 اس نے پلیئر آف کر دیا۔
 وقت کا دھارا واقعی نہیں رکتا لیکن کبھی کبھی بہتا ہو اپنی بھی ساکت لگتا ہے۔ بہاؤ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ گھڑی کی سوئیاں چلتی رہتی ہیں مگر وقت جیسے ایک جگہ رکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انتظار کی جان لیوا کیفیت کو وہی جان سکتا ہے جو اس کیفیت سے گزرتا ہے۔
 ”میں نے چار سال کا کاسٹریکٹ کر لیا ہے۔“
 ”چار سال!“ اس کی کنپٹیاں درد کرنے لگیں۔
 ”میں تمہاری طرح قنوطی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

اس وقت وہ شدید ترین قنوطیت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے اندر شدید ترین جس ہو رہا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے کوئی گھڑی ہو جس کے پیٹ وا کر کے وہ اپنے اندر کے جس کو کم کر سکے۔
 سالانہ گزرتے گزرتے انسان چار موسموں سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔
 جلیقں میں بس ایک انتظار کا موسم ہے، مگر ان کی گھڑیاں تو جیسے پل بھر کے لیے آتی ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی موسم۔
 بیات ولا کے سب ہی مکینوں نے کل اس سے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ عاشر کو سی آف کرنے کے بعد ان کو ”حیات ولا“ چلے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اور اپنے گھر چلی آئی تھی۔
 اسی اتنی زیادہ تھی کہ خود کو کسی طور بہلانے کو بھی جی نہیں مانا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی روٹھی ہوئی تھی۔
 ”مومن نے اسے پکارا تھا۔“
 ”بیٹا! وہ چونک اٹھی۔“

آپ کے سر میں درد ہے؟“ وہ اسے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایقان کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔
 ”ہاں!“ اس نے بار بار اس کا گل سہلایا۔
 ”آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“
 ”اے جی رانی ہوئی۔“
 ”جی رانی کی شکل بنا کر؟“ اس نے ماں کی ٹھوڑی چھوئی۔
 ”کو بے سہانگی سے آئی ہو؟“ وہ کچھ دیر ہنسی رہی۔
 ”مما! جب معمول میں جی رانی من کے سر میں درد ہوتا ہے تو وہ ایسی ہی شکل بنا لیتی ہیں۔ سب بچے ڈر کر ہوجاتے۔“
 ”ان سے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔“ ہنسنے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
 ”بچے کچھ بھی نہیں مانا۔“ مومن کو خود کے قریب کر لیا۔ ”بائی دادوے، کبھی آپ نے اپنی مس سے ہنسی نہیں ممانا؟“ اس نے نشی میں سر ہلایا۔
 ”ہاں۔ پوچھنا بھی بہت۔ ہم سب دیکھی عورتوں کے ”سرورد“ ایک سے ہوتے ہیں۔ بس ناموں کا فرق ہوتا ہے۔“ اچانک ہی اس کی کیفیت تبدیل ہو گئی۔
 ”کس کے ناموں کا؟“

”سرتاج“ وہ میرا مطلب ہے ”سرورد“ کے ناموں کا۔ ”وہ شرازت سے مسکرا دی۔
 ”آپ مشکل مشکل باتیں کر رہی ہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“
 ”ہاں بچے۔ آخر سپوت کس کے ہو۔“ اس نے مومن کا سر ہلایا۔ ”یہ باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگیں۔ بری سی شکل نظر آ سکتی ہے۔ جتنا ہوا دل دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں۔“
 ”آپ کا دل جل رہا ہے ممما! وہ فکر مند ہو گیا۔
 اس نے بھولی سی صورت بنا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”مساوون کے اندھے کو ہری ہری سوچنے لگی؟ ویسے میں عشق کرنا بھی چاہوں تو اس کے لیے ایک عدد شخصیت کار ہوگی اور آج کل تو محض ایک ہی شخصیت کے متعلق سوچا جاسکتا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سمعیہ نے از حد اشتیاق سے پوچھا۔

”عرفان شوکت۔“ وہ تلخی سے بولی تھی۔

سمعیہ نے برا سامنہ بنایا۔

”تو میں سبجانے کیا سمجھ بیٹھی۔ اچھا بات تو سنو۔“ وہ اس کے قریب ہوئی تھی۔ ”ایک کام کرو میرا۔“

ربیعہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”دوسرے کو ایک پیغام دینا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اس سے کہنا۔“

”سمعیہ! ربیعہ نے اچانک ہی اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”میں بدر سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

”کیوں؟“ اسے حیرت سے جھٹکا لگا۔ وہ فکر فکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

ربیعہ کو بچاؤ چاہتا تھا۔ سمعیہ اس کی بچپن کی سنگی تھی۔ اس کو دکھ دینے کا خیال ہی تکلیف دہ تھا۔

”کیا ہے ربیعہ تمہیں تم اس طرح سے کیوں کر رہی ہو ناراض ہو مجھ سے؟“

”پلیس! میں تم سے نہیں تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔“

”وہاں! میرا پریشانیوں کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔“

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پریشانیوں نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔ زندگی کے جن پہلوؤں پر غور کرنے کی اسے

کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اس پر اسے سوچنا بھی تھا اور فیصلے بھی کرنا تھے۔

”زندگی! سمعیہ! یہ کب ظالم چیز ہے۔“ ربیعہ سوچوں میں گم تھی۔ ”جنہیں تیرا نہیں آتا“ انہیں اٹھا کر

سندھ میں پھینک دینا ہے۔“ وہ ب جانیں یا لہروں کو شکست دے کر ہر تیراک بن کر ابھریں یہ ان کی ہمت

تھی اور سمعیہ نے اسے اس کے ساتھ جاسی۔

سمعیہ نے اس کے ساتھ جاسی۔

”اس نے پچھلا لیا۔ آسمان پر ستاروں کا جال بچھ گیا۔ ربیعہ صحن میں پنچھی چارپائی پر لیٹی

ہوئی تھی۔ اس کا من سخت اواسی کے عالم میں تھا۔ اس کا دل یہاں بالکل نہیں لگ رہا تھا لیکن عرفان شوکت کی

سرد اور خاموش دھمکیوں سے اس پر ہر حال اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ اب وہ اکیلے گھر میں تنہا رہنے کا خطرہ مول لینا نہ

چاہتی تھی۔ سوا ب وہ کچھ دنوں کے لیے یہاں چلی آئی تھی۔ یہاں ہر چند کہ افراد زیادہ تھے لیکن اسے سخت بورت

محسوس ہوتی تھی۔ اسے اپنا آپ بھی بے مقصد دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن میں بنی کھڑکی سے اندر نام کرتی تو یہ دیکھائی دے رہی تھی۔ ساتھ واٹ کے بلب کی لمبی روشنی میں اس کا

وجود پر مردہ اور بیمار نظر آتا تھا یا شاید اس کی اپنی ذہنی کیفیت ہی پر مردہ ہو رہی تھی۔

سمعیہ اس کی جانب سے اپنی بات کا کوئی خاص رد عمل نہ پا کر خود ہی کسی بہانے سے نفیسہ خالہ کے گھر گئی

ہوئی تھی۔ ان دونوں کا چھوٹا بھائی غیب کرے میں بیٹھا زور زور سے اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔

ربیعہ چارپائی پر تاروں کو شمار کرنے میں مصروف تھی۔ دروازہ بجاتا تو یہ کچن سے نکل آئی۔

”مسام اباب! اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔“

”مجھے گائیے؟“

”سمجھنا بھی برا ہے بچے! اسے جلنے ہی دو۔“ اس نے آہ بھری۔

”میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“ وہ کچن کی جانب دوڑ گیا۔

ایقان مسکرا دی تھی۔ کچھ دیر قبل اس نے وجود کا جس ختم کرنے کے لیے ایک کھڑکی کی ضرورت محسوس

تھی۔ اپنے بیٹے کی بھولی بھالی باتوں سے اسے احساس ہوا تھا جیسے کوئی کھڑکی چپکے سے کھل گئی تھی۔ تازہ ہوا

جھونکوں سے یاسیت کی سیلن زدہ لباس ختم ہو گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کی پشت سے سر نکا دیا۔

”کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگتی ہو خیر تو ہے؟“ چائے کا گھونٹ بھرتی سمعیہ نے غور سے اس کی صورت

دیکھی۔

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی دھرنے خاموش بیٹھی تھی۔ سمعیہ کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے کیا جواب

دیتی؟ اپنی پریشانی کی وجہ سے بتا کر وہ اپنی واحد دوست کو کھونا چاہتی تھی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ بدر

مقابلے میں وہ کبھی ربیعہ کو سچا نہ جانتی۔ ساری بات سن کر وہ اس کے دل میں ربیعہ کو قتل دار ٹھہرائی خواہ زبان

وہ اس کا اظہار کر لی یا نہ کرتی۔

وہ ساری رات جاگتی رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ بدر کی بات نے اسے

صدے سے دوچار کیا تھا۔ حالانکہ یہی بات نفیسہ خالہ نے بھی کی تھی لیکن ان کی بات دوسری تھی۔ سمعیہ

اور سمعیہ کے مابین قائم بے نام رشتے کا علم نہ تھا پھر انہوں نے محض ربیعہ کی ہمدردی میں اور اسے سہارا

کے لیے یہ بات کی تھی لیکن بدر۔

اس کی سوچوں کے تار دکھ سے ٹوٹنے لگتے تھے۔ اس نے سمعیہ کے نام لکھے گئے اس کے سب محبت

پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہ پڑھتی تو سمعیہ زبانی اس کے لکھے ہوئے ڈائری لگ ساتی رہتی۔ پڑھ پڑھ کر اسے وہ

انزب جو ہو جاتے تھے۔ وہ ان دونوں کی ہر خفیہ ملاقات سے واقف تھی۔ سمعیہ کے ٹرنک میں چھپے ہوئے

تھانف کا احوال اسے پتہ تھا کہ وہ کب اور کس موقع پر رہے گی۔

ربیعہ پسند تھی۔ سمعیہ میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دعوائے محبت کے لیے خود اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔

وہ اس سے بیزار ہے۔ ربیعہ کو مرد ذات سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ذات کے اندر دھوکہ بازی چھو

غریب کھونٹ کے سب ہی حساب کتاب غیر محسوس طریقے سے فیڈ ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کھل

تھیں۔ اسے دنیا دکھائی دے رہی تھی۔

”اے۔ کہاں کھو گئی ہے؟“ سمعیہ نے اس کا کانڈھا ہلایا۔ ”میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا پوچھ رہی ہو؟“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”کیا بتاؤں آخر؟“

”تمہیں ہوا کیا ہے؟“

”کچھ ہوا ہو تو بتاؤں خوا خواہی۔“

”ایسی تو نہیں ہو تم! خیر تو ہے؟“ پھر وہ شوخی سے بولی۔ ”کہیں کسی سے عشق و شوق تو نہیں کر بیٹھی؟ ایسی حالت

تو بیا رہی ہوئی ہے بندے کی۔ نہ اپنی خبر نہ دنیا کا ہوش۔“

ربیعہ نے طنز سے اسے دیکھا۔

”والسلام“ کبیرہ آواز آئی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حاکم چچا اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالتے چلے آ رہے تھے۔ ربیعہ نے بھی اٹھ کر اسلام کیا تھا۔

”والسلام۔ والسلام۔“ انہوں نے گرجوٹی سے اس کا سر تھپکا۔ ”بہت خوشی ہوتی ہے تمہیں یہاں ہو کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ تمہارا دل بھی خوب لگتا ہو گا“ آخر کو تمہاری بچپن کی سکھیاں ہیں یہاں۔ کیوں بھی؟“ جی! وہ نظریں جھکا کر رونا زوی میں بولی۔

”کسی بھی بات کی شکایت ہو، مجھ سے کہو۔ کوئی تکلیف ہو، میں بیٹھا ہوں۔ ہم سب ہیں نا تمہارا خیال رکھ لیں۔“

”شکایت کیسی چچا جان! آپ لوگوں کا تو بہت احسان ہے مجھ پر۔“

”ہا ہا ہا۔“ وہ ہنس دیے۔ ”احسان۔ لگی احسان کیا! اپنوں میں بھی کوئی احسان و حسان کا چکر ہوتا ہے؟“

”میں تو بس اپنا بن ہوتا ہے۔“

”آپ کھانا کھالیں چچا جان! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ ہنسی سے بولی۔

حاکم چچا لمبے بھر کو چوٹے۔

”بات۔ کیسی بات؟ اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے، میں روٹی کھانے پر تیار ہوں۔“

وہ آستینیں جڑھاتے ہوئے صحن کے گوشے میں بنے واش روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

ربیعہ اندر کمرے میں چلی آئی۔

اس نے پچھلی چند راتوں میں بہت سوچا تھا، بہت غور و خوض کیا تھا۔ تب ہی ایک واضح اور منطقی فیصلہ تک

سکی تھی پھر اس کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں حاکم چچا کاندھے پر پڑے رومال سے مونچھیں صاف کرتے اندر چلے آئے۔ ”اچھا ہوتا اگر کھانا کھانے سے پہلے ہی بات کر لیتیں۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ”مجھ سے تو پریشانی میں ٹھیک سے کھانا نہ کھایا گیا۔“

”اوہ۔“ ربیعہ شرمندہ ہو گئی۔ ”مجھے خبر ہوتی تو آپ سے پہلے یہ بات کہہ دیتی۔“

”چلو تم بات تو بتاؤ کھانا بیٹا تو ساری عمر ساتھ لگا ہے۔“ وہ بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔

ربیعہ نے انہیں سیکڑے بوا اور عرفان شوکت کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ حاکم چچا بغور سنتے رہے۔

کبھی کبھار اپنی مونچھوں کو تانے بھی دے لیتے تھے۔

”پولیس میں میرے کچھ جاننے والے ہیں۔“ ساری بات سن کر وہ بولے۔ ”میرا خیال ہے میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”پولیس۔؟“ ربیعہ نے نا یوسی سے سر ہلایا۔ ”نہیں چچا جان! وہ شخص بہت بار سوخ نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے اس سے الجھنا درست نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو پہلے تو سیدھی انگلی سے ہی گھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں انگلی ٹیڑھی کرنے میں دیر نہیں لگتی۔“

”تو پھر تم گھر پر تالا ہی پڑا رہے۔ تم یہیں رہو، تالا توڑ کر ناجائز قبضہ کرے گا تو پھر دیکھ لیں گے۔“

”میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔“ ربیعہ بولی۔ ”لیکن پہلی بات تو یہ کہ ایسا آخر کب تک ممکن ہے؟ جلد یا بدیر جانا تو ہو گا پھر یہ کہ جلد ہی اسے علم ہو جائے گا کہ میں یہاں ہوں اور وہ یہاں آنے میں بھی تامل نہ کرے گا۔“

”پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟“

”میرا خیال ہے کہ میں۔۔۔“ ربیعہ خاموش ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بولو۔“

”چچا میاں۔۔۔“ اسے شرم آڑے آ رہی تھی۔ ”میری شادی کر دیں۔“

”اوہ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ”بس اتنی سی بات؟ کوئی مشکل ہی نہیں۔ یوں سمجھو چٹ منگنی پٹ بیاہ! لیکن یہ مکان کا قرضہ تو وہیں رہے گا۔“

”مکان بھی میں بیچ دوں گی۔“ اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی لیکن پھر سر اٹھا کر ایک عزم سے بولی۔

”لیکن عرفان شوکت کو ہرگز نہیں۔ کم از کم وہ مجھ سے اس ایگریمنٹ پر سائن نہیں کروا سکتا۔ میں آپ سے یہی بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن یہ میرے بس کا کام نہیں۔ آپ۔۔۔ اس مکان کے لیے ایک اچھا گاہک ڈھونڈیں اور میرے لیے کوئی نیک شریف لڑکا۔“

”ہا ہا ہا۔“ وہ بے کلی سے ہنستے۔ ”ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میری اپنی نظر میں ایک مناسب رشتہ ہیں۔“

”مجھے کھڑے ہوئے تھے۔“

”تو یہاں آرام سے بے فکر ہو کر رہو، کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ میں اس عرفان شوکت کو بھی دیکھ لوں گا۔“

”سالے کے باب کی جاگیر ہے کیا جو اکڑ رہا ہے۔ بھی ہمارا مکان ہے ہم جس کو مرضی بچیں۔“

وہ ہنسنے کی جانب بڑھے پھر رک گئے۔

”اور وہ تمہاری کوئی شرط وغیرہ ہو۔ میرا مطلب ہے کیسا رشتہ چاہتی ہو، کوئی خاص خوبی؟“ ربیعہ سر جھکا کر دیکھنے لگی۔

”آپ اس طبعیت پر کیا شرط ہو سکتی ہے۔ بس نیکی اور شرافت ہو۔ وہ وقت کی روٹی دے سکے۔ یوں کہ جس سے آپ جیسا نہ سمجھیں اور توبہ کے لیے سوچتے ہیں، یقیناً ویسا ہی میرے لیے بھی سوچیں گے۔“

”وہ۔۔۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”تمہیں جلد ہی اندازہ ہو جائے گا۔“ وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بول رہی تھی۔

”کندھے پر ہاتھ رکھ کر بول رہی تھی۔“

ربیعہ گہرا سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”بہت دن ہوئے یہ فردوس بیگم نے چکر نہیں لگایا۔“ شفیقہ حیات نے ٹانگیں سمیٹ کر سو کو بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

”بس اماں! مرضی کی مالک ہیں۔“ وہ روٹی پکا کر آئی تھیں۔ ماتھے پر پسینے سے چپکے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے پیچھے کرتے ہوئے بولیں۔ ”مرضی ہوگی تو دن بھر میں دو دو چکر لگائیں گی اور نہ ہفتہ بھر صورت نہیں دکھائیں۔“

”چلو ہم ہی چلتے ہیں اس دن کے بعد باشم کی بھی خبر نہ لی ہم نے۔ غریب کتنی چو میں کھا کر آیا تھا اس دن۔“

”ہاں ضرور۔ میں ذرا سالن سے فارغ ہوں، ابھی آؤ ڈالے ہیں، گلے میں کچھ دیر لگے گی۔“

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔

عذرا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

سیرھیوں پر آہٹ سن کر اخبار پر دھتی سنیوہ بیگم نے سر اٹھایا تھا۔

وہ نہاد ہو کر فریٹ ہو گئی تھی۔ اب نیچے آرہی تھی۔

”السلام علیکم امی!“ وہ ان کے سامنے آ بیٹھی۔

”و علیکم السلام۔“ انہوں نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ ”نہند کچھ پوزی ہوئی؟“

”کچھ نہیں بہت کچھ۔“ وہ فسن دی۔ ”بہت کچھ بارہ گھنٹوں سے تو سو رہی ہوں۔ آپ نے جگایا بھی نہیں۔“

”کیوں جگاتی بھی! ہفتہ بھر سے جاگ بھی تو رہی ہو۔ بارہ گھنٹے سو لیں تو کیا ہوا۔ چلو اچھا ہوا“ فریٹ تو ہو گئیں۔

”انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بلکہ گلابی سلک کاشن کے کپڑوں میں اس کا گلابی چہرہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔

تھیلے سیاہ بالوں کے حصار میں وہ اور بھی اجلی اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ سیاہ کمان دار بھنویں اور ٹھوڑی پر

راہو سیاہی اسے مزید دلکش عطا کرتے تھے۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں اس کی نظر اتاری۔

وہ اخبار لے کر دیکھنے لگی تھی پھر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔

”آج کیا ہے یہ عمر ابھی تک نہیں آیا؟“

”کی بھار دس پندرہ منٹ لیٹ ہو جاتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھیں۔

”کیوں لیٹ ہوتا ہے؟“ وہ حد درجہ فکر مند ہو گئی۔ ”آپ نے دس والے سے نہیں پوچھا؟“

”میں تو نہیں پوچھتی۔ میں خود ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں۔ سوڑکی والے سے بھی میں نے پوچھا ہے۔

”اگر آج اتنا ٹھیک کا روٹ کچھ بدلا ہے اس لیے دس منٹ زیادہ لگ جاتے ہیں۔“ ان کی وضاحت سن کر بھی

اس کے چہرے سے غصہ کی آواز نہ ملے تھے۔

”مانیہ نے چمت پر مشین لگائی ہوئی ہے۔ سدرہ شاید ناعمہ کی طرف گئی ہے۔ رزلٹ آنے والا ہے نا ان کا“ اسی کا پتہ کرتی پھر رہی ہیں۔

”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ چھوٹی والی یوں بھی کم دھیان دیتی ہے گھر کے دھندوں میں۔ دیدہ نہیں لگتا اس کا گھر یلو کاموں میں۔ ادھر ادھر پھر گری دن پورا کر لیتی ہے۔“

”بس اماں! کیا کریں۔ جدھر دیکھو لڑکیوں کا یہی حال ہے۔ بھابھی کی چھوٹی والی کو دیکھ لیں۔ اپنی عریضہ وہ بھی کہاں لگتی ہے ماں کے ساتھ یا توئی بوی دیکھتی ہے یا پھر یہاں بیٹھی کپڑوں اور میک اپ کی باتیں کرتی رہتی ہے۔“

”اب لڑکیوں پر کیا الزام دھرتا بیٹی! ان کی تو چھپی تربیت کر دی ویسا پاؤ گی۔ مجھے ہی دیکھ لو۔ رابعہ میری بڑی بیٹی تھی اس پر میں نے شروع سے کڑی نگاہ رکھی کام کاج میں لگائے رکھا، ادھر ادھر کی باتوں میں الجھنے نہ دیا۔ ایقان

سب سے چھوٹی تھی پھر شادی کے طویل عرصے کے بعد ہوئی۔ تین اولادیں تب تک جوان ہو کر اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اس کا میں نے ایسا لاؤ کیا جیسے پہلو تھی کا لڑکا ہو۔ اب دونوں میں فرق دیکھ لو۔ ایقان بھی بھلا بھلا اللہ

سلجھی ہوئی سلیقہ مند بیٹی ہے مگر اس میں رابعہ والی سنجیدگی اور بردباری نہیں ہے۔ ابھی بھی بچوں جیسے باتیں کر جاتی ہے۔ صدر پر اڑ جائے تو یاد شاہ کو خاطر میں نہ لائے۔ رابعہ کا رشتہ میں سے ہے بھانجے سے کرپاؤں کی باتیں

میں اچھا بھلا فرق تھا۔ رنگ کا بھی اللہ بخشے وہ بچہ بڑا کا تھا۔ رابعہ ہماری گھر جتنی دودھ جیتی تھیں بہن نے جھوٹا پیسلائی تو میں انکار نہ کر سکی۔ مجال ہے جو اس بیٹی نے آف کر دیا۔ خود بخود اس کے سر اس کے سنگ چل

دی اور یہ ایقان۔ آخر میاں کا پیغام کیا لائیں فردوس بیگم اس کی قیامت بچاؤ والی۔ ارے میں کون سا کر رہی رہی تھی مگر اس نے تو حشر اٹھا دیا۔ اپنی پسند بتلائی اور وہیں شادی کی۔ تم سے کیا چھپا ہے سب تمہارے سامنے کی

باتیں ہیں مگر میں تو یونہی تربیت کا ذکر کر رہی تھی کہ سگی بہنوں میں بھی اتنا فرق ہو جاتا ہے اگر تربیت میں کچھ کوتاہی رہ جائے تو۔“

”وہی بات اب تک دل سے لگائے بیٹھی ہیں فردوس بھابھی۔ عذرا بیگم نے گہری سانس بھری۔

”حالانکہ یہ تو انیسب کی باتیں ہیں۔ اللہ کی طے کر رہ ہیں۔ اب آپ بھی گواہ ہیں اماں! میری بھلا بھابھی سے کیا چیقلش تھی یا عریضہ میری بیٹیوں جیسی بیٹی ہے اس کے لیے میرے دل میں کیا بعض ہو سکتا تھا؟ رافع سے آپ

نے خود پوچھا تھا اس کے لیے۔ جب لڑکے نے ہی ہامی نہ بھری تو بھلا ماں باپ زبردستی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ باتیں انہوں نے جی کا ناسور بنائی ہیں۔ تب سے ہی آنا جانا کم ہے ان کا۔“

”چلو خوش رہیں۔ ہمیں یاد آئے گی تو ہم خود جا کر پوچھ لیں گے۔ نہیں تو اپنے نیچے عزیز ہیں نا۔ اس دن ہاشم کی خبر سنی تو مانو من من بھر کے ہو گئے پیر۔ جی یوں ہوا جیسے پانی اوہاں تک گرتی پڑتی جیسے پتلی ہوں مجھے ہی خبر ہے۔

”وہ بھی بھابھی جان ہی کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی تھیں۔“ عذرا بیگم نے منہ بنایا۔ ”انہوں نے تو نقشہ ہی ایسا کھینچا تھا کہ دل بہا دیا۔“

”شفیقہ حیات مسکرا دیں۔

”ماں ہے جس نے کوکھ سے جنا ہو اس کو درد بھی زیادہ ہوتا ہے بیٹی! بیٹے کے سر سے بہتا خون دیکھ کر ہر ماں ایسے ہی دیوانی ہو کر بھاگے گی۔“

”خیر یہ تو بیچ کہا آپ نے۔“ انہوں نے سانس کی تائید کی۔

”چلو پھر تم ذرا سالن کی خبر لو میں ظہر پڑھ لوں پھر چلتے ہیں ان کی طرف۔“

URDU PHOTO

4 خوبصورت و مقبول ناول

* میر خواب ریزہ ریزہ ماہانہ 300/- * لاہور * حبیب احمد 180%
* اک ویا جلائے کھنا ماہانہ 300/- * شہر دل کے دروازے شایہ چوہدری 250%
چاروں ناول ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ فری
خوبصورت سرورق • خوبصورت پھیپائی • مضبوط جلد • آفٹ میپر

شائع ہو گئے ہیں
آج ہی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں
مکتب عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی
2216361 فون

اسی لمحے یاروین کا بارن بجا۔
 ”یہ لو! ابھی گیا۔ تم یوں ہی ذرا سی بات دل پر لے لیتی ہو۔“ منیڑہ بیگم ہنس دیں۔
 وہ اچھلتا کودتا چلا آ رہا تھا۔

”مما۔۔۔ ممما۔۔۔“ وہ اگر اس سے لپٹ گیا۔ ”آج آپ گھر پر ہیں، کتنا اچھا دن ہے۔ منڈے بہت اچھا دن ہوتا ہے۔“

شہلا مسکرا دی۔ پیر کو عموما ”اس کا ریسٹ ہی ہوتا تھا۔“
 ”یہ! اگر پہلے ٹانگو کو اور ممما کو سلام کرتے ہیں پھر ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں۔“
 ”السلام علیکم ٹانگو، ممما!“ اس نے فوراً ”عجیل کی۔“
 دونوں نے ہی جواب دے کر اس کا ماتھا چوما تھا۔

”اللہ سلامت رکھے! اپنی ماں کی آنکھوں کا نور ہو۔“ منیڑہ بیگم بولی تھیں۔ ان کی پلکیں نم ہو گئی تھیں، جنہیں انہوں نے مہارت سے چھپا لیا۔
 ”آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں ممما! پنک کٹر کے کپڑے کتنے اچھے ہیں۔“ وہ اس کا بغور جائزہ لے لے لگا۔

”تمہاری خالہ تمہیں مستقبل کا شاعر ٹھیک ہی کہتی ہے۔“ اس نے غور سے سر پر چپٹا لیا۔
 فون کی تیل بج اٹھی تھی۔ شہلا نے چونک کر فون کی جانب دیکھا۔ فون کی آواز میں منیڑہ بیگم کے پھو ہوشیار ہو گئے تھے۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ منیڑہ بیگم اٹھ گئیں۔
 وہ تذبذب کے عالم میں انہیں فون کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جیسے ہی انہوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا،
 وہ چیپترہ رہ سکی۔

”آئی۔ بات سنیں۔“
 ”ہاں! کہو۔“ وہ فون اٹھانے سے قبل اسے دیکھنے لگیں۔
 پھر اس کی جانب سے کچھ جواب نہ پا کر انہوں نے بجتا ہوا فون اٹھایا۔
 ”ہیلو۔ ہال۔۔۔ کہو۔“

وہ غائب دماغی سے انہیں بات کرتا دیکھتی رہی۔ ذہن یکدم خالی ہو گیا۔ منیڑہ بیگم ریسیور پر رکھ کر آہستہ آہستہ
 تو وہ گم حسی بیٹھی تھی۔
 ”انفقا کا تھا۔ کہہ رہی تھی دوست کے گھر جا رہی ہے، مل کر اسائنمنٹ تیار کرنا ہے۔ رات تک، واپسی ہوگی۔“

انہوں نے رک کر اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔
 ”شہلا۔۔۔“ انہوں نے دیکھا۔

”جی! وہ چونکا اٹھی۔“ کیا اُمی نے انفقا کیا کہہ رہی تھی؟
 ”تم کہاں کھوئی ہوئی ہو، بات کیا ہے؟“
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

باب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ انہیں ”اس“ کے فون کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔ دراصل اسے خود ہی اندازہ نہ ہو پایا تھا کہ ”اس“ نے اتفاقاً ہی فون کر لیا تھا یا یہ اس کی کوئی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔

”وہ کہہ رہی تھی، مرم کے گھر جا رہی ہے۔ دیر سے لوٹے گی۔“
 ”جی! اچھا۔“ اس نے چونک کر اپنے آس پاس دیکھا۔ ”یہ عمر کہاں گیا؟“
 ”تمہارے سامنے ہی تو اپنے کمرے میں گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے، تمہیں ڈیوٹیاں بھگتا بھگتا کر تمہارا دماغ کمزور تو نہیں ہو گیا؟“

اس نے ہنس کر سر جھکا لیا۔
 ”میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ باتوں میں دھیان ہی نہ رہا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

چائے چمان کر ناعمہ کیتلی کوئی کوزی سے ڈھک رہی تھی جب ان تینوں کی آمد ہوئی۔ وہ ان کی آمد سے بے خبر آگے بڑھ کر کینٹھ کھولنے لگی۔

علی، خنزہ اور نافع نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کاؤنٹر پر بڑے جی ہوئی رکھی تھی۔ پکوڑے، تلیے ہوئے پاپڑ، بسکٹ اور مٹھائی کی پلیٹیں لمبا لب بھری ہوئی تھیں۔

ناعمہ سب کچھ تیار کر کے اب کینٹھ سے چائے کے مک نکال رہی تھی۔ مک ٹرے میں رکھ کر وہ مصروف تھا۔ انداز میں پتلی پتا سے اچانک کسی کی کا احساس ہوا۔

”جی! اس نے بغور ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہ بری طرح سے چونکا اٹھی۔ کاؤنٹر پر سے لوازمات کی ٹرے غائب تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے کچن کا جائزہ لیا جیسے اسے اپنی بصارت پر کوئی شک ہو پھر کچھ سوچتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔“

ایک نالی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ حقیقہ حیات اور غمراہ بیگم بھی ان لوگوں کے پورشن میں چلی آئی تھیں۔
 نیو اور سید بھی آگے آئے۔ وہ ان ہی سب لوگوں کے لیے شام کی چائے اور امنی کس وغیرہ تیار کرنے کے لیے
 میں ایک کھٹے سے صرف تھی۔

”آئی! اس نے سانس سے آتی درود کو مخاطب کیا۔“ کچن سے بڑے اٹھا کر آپ لے گئی ہیں؟“
 ”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں تو یہی دیکھنے آ رہی تھی کہ تم کہاں تک پہنچی ہو۔ نالی امی کہہ رہی ہیں۔“

”جی! یہ سب چیریں کہاں گئیں؟“
 ”وہیں ہوں لیکن ان کے کیا پیراگ آئیں گے۔“ درود اس کی پریشان صورت دیکھ کر ہنس پڑی۔
 ”میں درود آئی! وہاں نہیں ہیں۔“
 وہ اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آئی۔

”یہ دیکھو یہ تو پڑی ہے۔“ درود نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا جواب دوبارہ کاؤنٹر پر دھری تھی۔
 ”ہائے اللہ! یہ کیا معاملہ ہے؟“ ناعمہ کو حیرت ہوئی۔

پھر وہ چلائی تھی۔ ”لیکن یہ چیزیں تو آدمی ہو چکی ہیں۔ یہ اتنے سے پکوڑے؟ میں نے تو ڈھیر سارے بنائے تھے اور یہ مٹھائی کی پلیٹ سے گلاب جامن کہاں گئے؟ یہ تو صرف لڈو اور بالوشاہی رہ گئی ہیں۔“
 ”لڈو اور بالوشاہی ہم پسند نہیں کرتے لڑکی!“ نہایت بھاری آواز کچن میں گونجی تھی۔

دونوں نے حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر درود کچھ کچھ سمجھ کر کچن سے باہر کھلنے والی کھڑکی کی جانب بڑھی۔

”تو یہ تم ہو شیطانو!“ اس نے باہر جھانک کر کہا۔
 وہ تینوں نیچے گھاس پر براجمان موج اڑانے میں مصروف تھے۔
 ”ناعمنہ سے کہیں چائے پیس دے دے۔“ علی نے اس سے یوں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔
 ”وہ تو ہنسنے لگی تھی لیکن اس کا آدھا خون جل گیا۔“
 ”میں پوری سیتلی تمہارے سروں پر انڈیل دیتی ہوں۔“ اس نے دانت پیسے۔
 ”نور ابلم۔“ حمزہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”ہم سر اٹھا کر منہ کھول لیں گے۔“
 ”بالکل۔“ یہ نافع تھا۔ ”آپ ان کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں محترمہ!“
 ”ابھی تم نے میری صلاحیتیں کہاں دیکھی ہیں۔“ وہ تلملائی تھی۔
 ”کیوں نہیں سب کچا چٹھا کھل گیا ہے۔ یہ پکوڑے بنائے ہیں؟ نمک کم مرچ زیادہ۔ ہزاروں خضیا بہت ڈال دی ہے۔“

”اور یہ پار؟ آدھے جلے آدھے کچے۔“

”مٹھالی اچھی ہے۔“

”ہاں، حلوائی باصلاحیت تھا۔“

”اب چائے پتہ نہیں کیسی ہوگی۔“

”چلو زہر مار کر لو، کچا دل رہ جائے گا۔“

”میں سچ سن رہی ہوں۔“ ناعمنہ غصے سے سرخ ہو گئی۔

”یعنی دو کی ضرورت طے ہوا۔“ انہیں اطمینان ہو گیا۔

پھر انہوں نے بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

”چلو ناعمنہ! وہ دھنستے ہوئے بولی تھی۔“ اندر سے لے چلو جائے، ہنست دیر نہ لگے گی۔“ اس کا بس نہ چلتا تھا ان کا

خون پی جائے۔

دونوں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئیں تو راجہ بیلم نے کمرے سے گھبرا کر

”ڈیرٹھ گھنٹہ ہو گیا ہے ناعمنہ! بہت نیکی لڑکی ہو۔“ وہ خفا میں تھیں۔ ”اب انتظار کر کے بالآخر نماز کے لیے اٹھ

گئی ہیں۔“

”امی جی۔۔۔ دھم۔۔۔“

”چلو اب جلدی سے سب کو چائے دو۔“ انہوں نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ”اور یہ کیا چیزیں بنائی ہیں۔“

ادھوری سدھوری حد بردی تم نے نکتے پن کی۔“ انہیں اس پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔

”امی جی۔۔۔ دھم۔۔۔“ اس کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ بات کرنے سے پہلے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ہائیں اب اس میں سوے بہانے کی کیا بات ہے؟“

”بیجئے۔“ ایقان بولی۔ ”باجی! آپ نے بلا وجہ اسے رُلا دیا ہے۔ اتنا کچھ کر کے لائی ہے بے چاری۔“

”دراصل راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔“ ”وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ قافلہ تو لٹا پٹا آپ تک پہنچا

ہے۔“ اس نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

”اوم۔۔۔ وہ ہنس پڑی۔ ”تو کیا ہوا وہ بھی اپنے ہی ہیں دھماچو کڑی کہیں کے۔ کون کون تھا؟“

”علی، حمزہ اور نافع۔“ ناعمنہ نے ناک رگڑی۔ ”دیکھ لوں گی میں بھی۔ بدلہ نہ لیا تو ناعمنہ علی خان نام نہیں

میرا۔“

”ابتلا غصہ نہیں کرتے۔“ شفیقہ حیات نماز پڑھ کر چلی آئی تھیں۔ ”لڑکیوں کو غصہ پینا آنا چاہیے۔“
 ”جی ہاں۔“ ایقان نے شوخی سے ماں کو دیکھا۔ ”پھر ساری عمر یہی کام تو کرنا پڑتا ہے۔ نا اہلی جان؟“
 ”ارے ہاں جانتی ہوں، جتنا غصہ پیتی ہو تم۔“ انہوں نے بیٹی کو گھورا تھا۔ ”سناؤ نا کہ پردھارا بتا ہے عینک کی طرح۔“

”ہائے اللہ ای! میں کہاں غصہ کرتی ہوں۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”اس قدر صابر و شاکر بیٹی سے بھی شکایت ہے آپ کو؟“
 ”ماں ہوں تمہاری، ایک ایک پل کا حساب کتاب ماؤں کے حافظے میں درج ہوتا ہے۔“ ایقان شرمندہ سی ہو گئی۔

”صابر شاکر تو میری بیہ والی بیٹی ہے۔“ انہوں نے پاس بیٹھی رابعہ بیگم کو گلے لگا لیا۔ ”خدا کے حضور بھی صابر و شاکر رہی ہے۔ ماں باپ کے سامنے بھی کبھی ”اف“ نہیں کی۔ ہر قسم کے حالات دیکھے میری بچی نے لیکن کسی نے اس کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔“
 ”یہ تو بچہ کہاں سے“ عذرا بیگم نے بھی تائید کی۔ ”زائدہ سے کچھ سیکھنا چاہیے، حوصلہ کہہ رہا ہے۔“ تقدیر پر صابر و شاکر کیسے رہتے ہیں۔“
 رابعہ بیگم کی پلکیں جھجک چلی تھیں۔

”میں بھی نماز پڑھ لوں، وقت نکل رہا ہے۔“ وہ آہستگی سے اٹھ کر ان کے درمیان سے نکل گئی تھیں۔
 درود اور ناعہ پڑھ کر جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ دونوں کے چہروں پر سوچوں کے سائے تھے۔

”یہ لو۔“ انہوں نے بھائی کے سامنے کھانا گویا پٹا۔ ”کھاؤ پھر سو جاؤ۔“
 انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر ہن کو دیکھا۔

”اتنے کڑوے نوانے ہمارے حلق سے کیسے اتریں گے باجی!“ وہ مسکرا کر کہے۔ ”کچھ تو مٹھاس سے بولا کرو۔“
 ”کوئی خود سے کڑوایا مٹھا نہیں ہو جاتا، آخر میاں! یہ تو سامنے والے کی مرضی ہے، وہ کڑوا سنا چاہتا ہے یا مٹھا۔ اے ہاں میں کہتی ہوں کپٹیاں سفید ہو گئیں تمہاری، چندیا پر سے بھجے ہو گئے ہیں۔“
 بیچاس برس کے ہو پھر بھی تمہاری سوئی ہوئی عقل نہیں جاگی اور اب جو جانے لگا اٹھا رہی ہیں۔“
 وہ وہیں ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں اور اپنا بازو دبائے لگیں۔

”اب ہم کیا کریں باجی!“ کچھ نہیں کرتے پھر بھی سب ہم سے خفا ہی رہتے ہیں۔“
 ”ارے بھیا تو کرونا کچھ، ہن ہوں تمہاری۔ جی تو دیکھتا ہے تمہیں یوں لاوارثوں کی طرح یہاں پر ادیکھ کر بھائی ہو بھائی تو بہنوں کا میکہ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی عزت ان کا مان ہوتے ہیں۔ یہاں ہم لوگوں سے شرمندہ ہوتے پھرتے ہیں۔“

آخر میاں کا نوالہ منہ کی طرف لے جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔
 ”کیوں شرمندہ ہوتی ہو باجی!“ انہوں نے نوالہ واپس رکھ دیا۔ ”دو ٹھڈے مار کر باہر کرو ہمیں۔“ وہ بے حد غمگین ہو گئے تھے۔ ”یہی سلوک روا ہے ہمیں۔“

”اے بھیا!“ انہوں نے ماتھا پیٹ ڈالا۔ ”تمہارے بھلے کو ہی کہتی ہوں۔ یہ دن بھر کی چار روٹیاں پکا کر جان نہیں نکل جاتی میری مگر جی چاہتا ہے کہ یہ روٹیاں بوئی پکائے جس کا پکانے کا حق ہے۔ ماشاء اللہ جوان جہان ہو کون

کی عمر نکل گئی ہے تمہاری؟ ابھی بھی چاہو تو اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ ذرا سی ہمت پکڑو، گھر سے نکلو، کوئی روزگار سے لگو، چار پیسے لاکر ہاتھ پر دھرو۔ لگے کہ مرد ذات ہو، کہیں رشتہ ڈالتے ہمارا بھی حوصلہ ہو۔ اب کہیں لڑکی مانگنے جائیں تو کیا کہیں؟ کون سے گن جتائیں تمہارے؟ سارا دن کسی کونے میں پڑے اینڈا کرتے ہیں، بھوک ستائے تو منظر عام پر چلے آتے ہیں، کچھ نصیحت کرو تو روٹھ جاتے ہیں، بادشاہ زادے نہ ہوسے۔“

وہ کہتے ہوئے بول رہی تھیں۔ آخر میاں کچھ دیر کو غمگین نظر آکر پھر کھانے کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔
 ”اس گھر میں میری سنا کون ہے؟ خوار خانے کا طوطی ہوں۔“ اب انہوں نے اپنی ٹانگ دیوانی شروع کی۔
 ”جو اپنی بات دوسروں کو سنانا چاہے اسے چاہیے کہ بات میں وزن پیدا کرے۔ نری ہوا ہی نہ ہو۔“ بھاری لب و لہجے میں کہا گیا۔

وہ دونوں چونک اٹھے تھے۔
 فاروق حسن نجانبے کس وقت چلے آئے تھے۔ ٹائی کی گرہ ڈھیل کرتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ گئے۔ فرخوس بیگم ان کی بات پر جل بھن کر اب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھیں۔

”کہاں ہوتے ہیں آخر میاں آپ!“ فاروق حسن ان سے پوچھنے لگے۔ ”کوئی برابر روٹین نہیں ہے آپ کے نظر لانے کا۔ کبھی صبح سویرے نظر آجائیں تو رات گئے تک خبر نہیں ملتی آپ کی۔ کبھی آدھی رات کو بھی باغیچے میں اچلتے نظر آجاتے ہیں، کبھی دو دو دن کے لیے غائب ہوتے ہیں، کبھی سارا سارا دن بیٹھنے کی وی سے شغل کرتے ہیں۔ کیا یہی زندگی گزار رہے ہیں آپ؟“

”ارے بہت کان کھینچے ہیں میں نے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ موٹی طبیعت ہے کہ گینڈے کی کھال۔“
 ”آخر حیاں نے روٹیاں جھٹ پٹ معدے میں اتار لی تھیں۔ پانی سے بھرا گلاس بھی غٹا غٹ خڑھا گئے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔“

”آفس چلا کریں، صبح آٹھ بجے پورج میں کھڑے ہوں آپ۔“ انہوں نے ان کا ارادہ ”کل۔“
 ”کل۔“
 ”کرتیہ ہو کر۔“

”سب آپ کے۔“
 ”سب آپ کے۔“
 ”سب آپ کے۔“

”اب یوں بھی ہماری وجہ سے وہاں دفتر میں آپ کی بھداڑے گی۔“
 ”اڑنے دیجئے۔“ وہ مسکرا دیے تھے۔ ”ہمیں زیادہ اڑان بھرنے والوں کے پر کاٹنے خوب آتے ہیں۔ آپ بھر جاؤ کل صبح ہمیں پورج میں ملیں، ٹھیک آٹھ بجے۔“

”کیا نا، شعر سنائیں گے سب کو۔ اس شعر و شاعری کو آپ کی نوکری بنا دیا جائے تب ہی دل بھرے گا آپ کا۔“
 تب ہی کسی دستک کے کام کو آپ کی توجہ نصیب ہو گئی۔
 ”آخر میاں نے از حد مظلومیت سے ہن کی جانب دیکھا کہ شاید وہاں سے کسی قسم کی کمک دستیاب ہو سکے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھیں انہوں نے قلعاً ”لفٹ نہ کرائی۔“ بالا آخر وہ ٹھکے مارے جواری کی مانند ٹھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ وہاں سے نکل لیے۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کافون ہے۔“ ڈیوٹی نرس نے اسے اطلاع دی تھی۔
”چھ! میں آتی ہوں۔“

اس کاراؤنڈ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر زروم کی جانب چل دی۔
وہ سردوبے کا ٹائم تھا۔ عمر اکثر اسے اسکول سے واپس آ کر فون کیا کرتا تھا۔ اس نے اسی ترنگ میں فون اٹھایا۔
”ہیلو۔“ بہت لمبے میں وہ بولی تھی۔

وہ شری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی رہی۔
”ہیلو، شہلا بول رہی ہوں۔“

”جانتا ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”تم بھی جان لو کہ میں کون ہوں۔“
”شہلا کامل دھک سے رہ گیا۔ فوری رد عمل کے نتیجے میں اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔ ایک سائے کے
عالم میں وہ کھڑی اپنے دل کو ہانپتا ہوا سن رہی تھی۔ جب ہی بیل دوبارہ بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا۔
”ڈاکٹر شہلا! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ البرڈو شیرازوں کی طرح ری ایکٹ مت کرو۔“ وہ دو ٹوک لہجے
میں کہہ رہا تھا۔ ”بات کرو جس طرح نارملی بات کرتے ہیں۔“

”وہ آہستگی سے بولی۔
”جس نے عمر کے کون ریسیور کرنے پر پابندی لگا دی ہے؟“

”ہاں۔“
”کیوں؟ تم کیسے لگا سکتی ہو؟ آئنر آل میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے اس سے بات کرنے کا حق ہے۔“

”تم نے اسے پہچان لیا کہ تم اس کے باپ ہو؟“
وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”میں نے اسے پہچان لیا کہ تم اس کے باپ ہو؟“
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکا نہ

”ارے کیا کرناؤ گے اس نکتے سے؟“ بھائی کے جانے کے بعد انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”ہے کوئی
اس کے کرنے کا کام؟“

”کام کی بھی کبھی کی ہوئی ہے جیگم! ہاتھ چلانے والا ہونا چاہیے۔“ وہ جوتے اتارنے لگے تھے۔
”پھر بھی اسے تو قلم پکڑنا نہیں آتا۔“ وہ فکر مند تھیں۔
”قلم پکڑنا بھی نہیں ہے۔“

”اے ہے کچھ تو کہو۔“
”بیون چھٹی پر گیا ہوا ہے میرا اس کی جگہ بٹھانا ہے۔ چائے کے کپ تو تھما سکتا ہے ناسب کو۔ پانی تو پلا سکتا
ہے؟“

”ہائے اللہ۔“ انہوں نے کلیجہ تھام لیا۔ ”پھر اسی بناؤ گے اسے؟ ارے یہی اوقات رہ گئی ہماری؟ جھاڑو دے گا
پوچھے لگائے گا ارے میری بیٹی!۔“ وہ زار و قطار رونے لگیں۔ ”ارے کیسے تڑپے گی اب مرحوم کی روح۔ فاروق
حسن! تم نے ساری عمر جی دکھایا میرا۔“

”ابا مرحوم کی روح اس حال میں خوش ہے؟“ وہ طنزاً ”نوت لے“ کے اشعار انہیں حال نوا کرتے تھے۔
”جوتے اتار دے؟“ ان کے جھاڑو پونچھا لگانے سے ادب کی دنیا کو کچھ بچکا نہیں تھا۔ ”ابا مرحوم کی روح
دن چار بیسے تنخواہ کے نام پر لینے کے سب سے زیادہ خوش ہے۔“ وہ جواب دیا۔ ”ابا مرحوم کی روح
”کتنی طے کی ہے؟“ وہ نہ نکلنے والے آنسو پوچھتے لگیں۔
انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر چھائی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ شہلا نے بستر پر لیٹی مریضہ سے پوچھا۔
وہ ہلے سے مسکرا دی۔

”اب تو اچھی ہوں ڈاکٹر صاحب!“
”بہت پیاری بیٹی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو۔“ وہ بھی مسکرائی تھی۔

”بس جی اس کی مرضی۔“ وہ کچھ ادا اس ہوئی۔
”بیٹیاں اتنی ارزاں نہیں۔ کج کل کی باتیں تو اپنی ہی جنس کی نافرمانی کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔“ شہلا کو اس کا
روپیہ دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ اس قدر پھلکی مسکراہٹ۔ ”پچھلی مرتبہ بیٹا تھا تو یہاں سے وہاں تک مسکراہٹ پھیلی
ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کی بات ہے۔ میں نئی نئی اپائنٹ ہوئی تھی۔“ مریضہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

”تسے والے لوگ ہی خوش نہیں ہونے دیتے ڈاکٹر صاحب! یوں آتے ہیں جیسے بڑے دینے آئے ہوں۔“
”ہندو ازم سے پیچھا نہیں چھوٹے گا ہمارا۔“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”کسی کو یاد نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ
نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چار بیٹیوں سے ہی نوازا تھا۔ یہ تو زیادہ خوشی منانے کی بات ہے۔ ہم اپنا
آخری وقت یاد کر کے کانپنے لگتے ہیں کہ انہوں نے تو بیاہ کر چلے جانا ہے، بیٹا ہوتا تو سارا تو بنتا۔ ارے بھی! کل
کس نے دیکھی ہے؟“

”بس ڈاکٹر صاحب! بیٹی کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔“
”اتنی فضول بات نہ جانے کس نے کہہ دی ہوگا۔ اسے دہرائے جاتے ہیں۔ اتنا کمزور عقیدہ اتنا متزلزل ایمان؟
جن کے بیٹے ہوتے ہیں انہیں ڈر نہیں لگتا۔ نصیب تو سب کے ساتھ ہے۔“

”میں عمر سے کانٹھیکٹ میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم یا تمہارے گھر سے کوئی بھی معترض ہو نہ روڑے اٹکائے۔“
 ”میں سوچوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں تمہیں سوچنے کا ٹائم نہیں دے رہا ہوں، صرف اطلاع دے رہا ہوں۔“ وہ مذاق اڑانے والے لہجے پر بولا۔ ”تم عاقل، باشعور، سمجھ دار لیڈی ڈاکٹر ہو۔ ایک باپ کے جائز، قانونی حقوق تو سمجھتی ہو گی۔ میری نرمی نا جائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔“ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔
 شہلا کا دل اچھل کر اس کے تالو سے آچپکا۔ اس کی آواز بند ہو گئی، سانس رکنے لگی۔
 ”گھر جا کر اپنی والدہ صاحبہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا، میں جب بھی فون کروں، عمر سے میری بات کرال جائے۔“

”ٹھیک، ٹھیک ہے۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”میں فی الوقت اس سے اپنے رشتے کی وضاحت نہیں کروں گا۔ میں بھی اس کے ننھے ذہن کو پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن آہستہ آہستہ اسے سب سمجھ میں آجائے گا۔“
 شہلا نے مرے مرے انداز میں ریسپورر رکھ دیا تھا۔

وہ مغرب کا وقت تھا یا فجر کا، ایسے صحیح طور پر وقت کی پہچان نہ ہو رہی تھی۔ دھند کا پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یوں جیسے ابھی پو پھٹے کی اور سورج کی جانب سے پھینکی گئی پہلی کرن رات کو شیشے کی مانند کرچی کرچی کر ڈالنے کی یا یوں جیسے سورج اپنی قبا کا پلو پورے طور پر سمیٹ کر آسمان کا دروازہ بند کر لے گا اور ہر سو لگھنگھور اندھیرا چھا جائے گا۔ نجانے وہ کون سا وقت تھا؟

اسے اتنا احساس تھا کہ وہ ادا سی کا وقت تھا وہ وحشت کا وقت تھا وہ جس کے زور پکڑ لینے کا وقت تھا۔ اس لمحے سے اجالے میں صحیح طور پر ہر شے واضح نہ ہوتی تھی۔ ربیعہ گھر میں بیٹھ کر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ وہاں روئی کے گالے اڑتے پھر رہے تھے۔ بھرے بھرے سرسبز باؤں اور سرسبز ادھر بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی بڑی اونچائی پر تھے۔ آسمان پر تیزی سے ہوتی ہوئی یہ حرکت توجہ طلب تھی۔ بادلوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ربیعہ سر اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہی۔

تب اس کے گال پر پانی کا پہلا قطرہ آن کر اٹھنڈا اٹھار قطرہ۔ ربیعہ کے پورے وجود میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔ اسے پہلی بار جس کے ٹھلنے کا احساس ہوا۔ جسم سے سرسراہٹ ہوا کا ایک جھونکا ہولے سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ ربیعہ کو خوشی اور ظمآنیت سی محسوس ہوئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں پھر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ سرسبز باؤں اب سیاہ ہو رہے تھے۔ سب کے سب بڑی تیزی سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے جیسے کسی نے مٹی بھر سیاہی تالاب کے پانی میں پھینک دی ہو۔

ربیعہ کو احساس ہوا کہ بادلوں میں سیاہی پھیلنے کی وجہ سے ماحول میں جو ملگجاسا اجالا تھا وہ غائب ہو رہا تھا۔ ہر سو اندھیرا چھا رہا تھا۔

پھر یکایک ہوائیں چل پڑیں۔ تند و تیز ہوائیں۔ ربیعہ کا پورا گھر ہواؤں سے بھر گیا۔ سب کھڑکیاں، دروازے ہواؤں کی زد میں آکر کھٹاک کھٹاک کھٹکے اور بند ہونے لگے۔ چمن میں لگا ہار سنگھار کا درخت مست شرابی کی مانند جھومنے لگا تھا۔ اس کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ربیعہ کے وجود سے ٹکراتے اور پورے گھر میں بکھر جاتے۔
 شائیں شائیں کرتی ہوائیں، سرسراتے ہوئے پتے اور بجتے ہوئے دروازے اور وہ گھر میں تنہا تھی۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور روایات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جو صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور و فکر کریں۔

سمعہ گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھی۔ اس کے خراثوں کے لے میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ ربیعہ کھڑی ہو گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی اور بنا آواز کیے دروازہ کھول کر صحن میں چلی آئی۔ برابر والے کمرے میں حاکم چچا اور فیب سویا کرتے تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ اسے خالی صحن نے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ غالباً رات کا آخری پہر تھا۔ ربیعہ کو وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ بڑی ہمت سے وہ گھڑی تک آئی اور شکے سے پانی نکال کر پینے لگی۔ پانی پی کر اس نے گلاس جگہ پر رکھا اور مڑی۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے عین پیچھے حاکم چچا کھڑے تھے۔

”ربیعہ! بلا نعمت سے بولے۔“ جاگ رہی ہو؟“

”جی ہاں میں۔“ ڈر گئی تھی۔ ”اس کا سانس کنٹرول میں نہ تھا۔“

”میں سوئے میں۔ میں نے عجیب سا خواب دیکھا چچا جان! میں نے واوی نہ۔“

”خواب؟“ انہوں نے اس کی بات میں محض ایک لفظ پر غور کیا تھا۔ ”اچھا نہیں لگتا۔“ ربیعہ کا خوف بڑھ گیا۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے کھڑے چچا کی آنکھیں بڑی وضاحت سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ چمکدار حلیوں نظروں میں جو بیخام تھا، وہ خاموشی سے اس کے سامنے اسے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

”وہ خاموشی کہ ان کے منہ سے نہ نکلتی تھی۔“

”ربیعہ! تمہیں کیا چاہیے؟“ انہوں نے اس کی بات میں محض ایک لفظ پر غور کیا تھا۔ ”اچھا نہیں لگتا۔“ ربیعہ کا خوف بڑھ گیا۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے کھڑے چچا کی آنکھیں بڑی وضاحت سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ چمکدار حلیوں نظروں میں جو بیخام تھا، وہ خاموشی سے اس کے سامنے اسے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

”سمعہ! تمہیں کیا چاہیے؟“ انہوں نے اس کی بات میں محض ایک لفظ پر غور کیا تھا۔ ”اچھا نہیں لگتا۔“ ربیعہ کا خوف بڑھ گیا۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے کھڑے چچا کی آنکھیں بڑی وضاحت سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ چمکدار حلیوں نظروں میں جو بیخام تھا، وہ خاموشی سے اس کے سامنے اسے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

”ربیعہ! ربیعہ! واوی اسے پکار رہی تھیں۔“

”واوی کہاں ہیں؟“ اس نے پریشانی سے سوچا۔ ”واوی تو گھر میں نہیں تھیں۔ واوی کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔“ آواز بہت دُور سے آرہی تھی۔ ربیعہ اپنے صحن میں کھڑی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ! یہاں سے جاؤ۔“ آواز پھر آئی۔

ربیعہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ آندھی کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ہار سنگھار کا درخت یوں سرخ رہا تھا جیسے ابھی زمیں بوس ہو جائے گا۔

ربیعہ کا صحن خشک پتوں سے بھر چلا تھا۔

”کہاں جاؤں؟“ اسے خیال آیا تھا۔ ”میں کہاں جاؤں؟“

”ربیعہ! ربیعہ!“

پھر وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ہار سنگھار کا درخت جیسے رسیاں تڑوا رہا تھا۔ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ چٹنی چڑھائی تھی۔ اسے لگا جیسے کچھ دیر کے لیے وہ کسی محفوظ جگہ پر آگئی تھی۔

بند دروازے سے پشت لگائے وہ آنکھیں بند کیے کھڑی ہوئی تھی۔ آندھی تھم گئی تھی۔ آوازوں اور ٹوٹ رہا تھا۔ ہوا کی شاخیں شاخیں اور پتوں کی سرسراہٹ بند ہو گئی تھی۔ وہ آوازوں کھڑکیوں کو قراؤہ آیا۔ صرف کھڑکی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”ربیعہ! اسے پھر آواز آئی۔“

”اب کی باریہ آواز قدرے قریب سے آئی تھی۔ ربیعہ نے آنکھیں کھولیں، سامنے دیوار والی کھڑکی میں واوی کھڑی تھیں۔ وہ باہر گلی میں تھیں۔ ربیعہ کو صرف ان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

”واوی! وہ نبھانے کیوں ڈر گئی۔“

”ربیعہ! ربیعہ! واوی نے اسے اشارہ کیا۔“

”کہاں جاؤں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”جاؤ! بس جاؤ۔ میں نے کہا تھا۔“ ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جاؤ۔“ اس کی ہار شدت سے کہا گیا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورے جسم زلزلوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ وہ اپنے جسم کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے کھل جانے کے بعد وہ کچھ دیر سیدھی جیت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ خود کو اسی کمرے میں محسوس کر رہی تھی جس کی کھڑکی میں اس نے واوی کو کھڑا دیکھا تھا۔ اسے شدت سے خوف محسوس ہوا۔ کھڑکی کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی نہیں تھی۔ وہ حاکم چچا کے گھر میں تھی۔

اسے یاد آیا وہ تو پچھلے کئی دنوں سے یہاں آکر سویا کرتی تھی۔ برابر والی چارپائی پر سمعہ لیٹی مدھم سے خراٹے لے رہی تھی۔ اس سے ذرا آگے ٹوپہ تھی۔

ربیعہ کو اپنے حلق میں کانٹے آگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم سینے سے بری طرح سے بھیگا ہوا تھا۔ چارپائی سے پیر لٹکائے وہ کچھ دیر بیٹھی اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا آواز دے کہ سمعہ کو جگا لے۔ اسے اس وقت ایک سامع کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

”سمعہ! اس نے ہولے سے آواز دی۔“

نقص جیت جاتا ہے۔
منیزہ بیگم کے آنسو خاموشی سے ان کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ شہلا کی دکھ میں بھیگی ہوئی آواز ان کا دل چیر رہی تھی۔
”بولیں نا امی!“ شہلا نے ان کے ہاتھوں کو جھنجھوڑا ”یہ کیسے فیصلے ہیں۔ کوئی حساس درو مند دل یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟“
”بیٹی۔ دنیا کے سارے فیصلے بس ایک بار ہی نہیں ہو جاتے۔“ منیزہ بیگم نے اس کا سراپے سینے سے لگایا۔
”سب فیصلے ایک بار پھر ہوں گے۔ وہاں جہاں کسی کے ساتھ رتی برابر ظلم نہ ہو گا۔ جہاں پر کوئی اپنی رتی برابر جی بھی دیکھ لے گا اور رتی برابر ظلم بھی۔“
شہلا خاموش ہو گئی۔

”میں نے ابو کا دل دکھایا تھا نا امی؟“ وہ پوچھنے لگی۔
”نہیں بیٹی۔ ایسے نہیں سوچتے!“ وہ محبت سے اس کا سر تھپکنے لگیں۔ ”آپ کے ابو کی روح آپ کو افسردہ دیکھ کر افسردہ ہوگی۔ بس یہ سوچ کر خوش رہا کرو۔ انہیں ایصالِ ثواب کرتی رہا کرو۔ ویسے ایک بات پوچھوں؟“
”جی ہاں۔“
”شہلا نے اشیات میں سر ہلایا۔“

”میرے ابو کی بات پریشان کر رہی ہے؟ میں کچھ دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں لیکن پوچھا نہیں۔ کیونکہ بسا اوقات انسان محض اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی دوسرے کی ہمدردی کی ناگوار گزری۔“
”میں نے سوچا تھا جب خود سے سب کچھ کہہ سن لوگی تب پوچھوں گی بلکہ تم خود ہی بتا دو گی لیکن آج نہیں اس لیے افسردہ دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پا رہی ہوں۔ پھر تم نے مجھ سے جس طرح کا سوال کیا؟“ اس سے اس کی خوفزدہ ہو گئی۔ ”آخر بات کیا ہے بیٹی؟“
”شہلا سر جھکا کر کسی مجرم کی طرح بیٹھ گئی۔“
”کچھ دنوں سے جبکہ اب ان کا فون آواز میں بول رہا ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

”یا اللہ!“ منیزہ بیگم دسکے سے رہ گئیں۔ ”وہ بھلا کیسی بات کہتی ہے؟“
”شہلا نے حلقے سے سر اٹھایا اور انہیں دیکھا۔ ”آپ۔۔۔ کیا جانتی ہیں؟“
”ہاں۔“ منیزہ بیگم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے فریڈ ہیں۔ میں سوچتی رہ جاتی کہ کون سے انکل ہیں جو اسے ہر دو سرے دن فون کر لیتے ہیں۔ تم سے یوں نہ کہا کہ تم پریشان ہو وکی۔ بس پھر بیکل بجتی تو میں ہی فون اٹھاتی۔ دوسری جانب سے لائن ڈس کنکٹ ہو جاتی۔ مگر یہ تو کوئی دس دن پہلے کی بات ہے۔“

”اس نے ہاسپٹل فون کیا تھا اور وہ ٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ وہ عمر سے کانٹیکٹ میں رہے گا۔“ شہلا نے تھکے لکے الفاظ میں بتایا۔

”پھر تم نے کیا کہا؟“ وہ پریشان نظروں سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔
”میں۔۔۔“ وہ ہولے سے ہنس دی ”میں کیا کہتی؟ میں تو ماں ہوں۔ وہ اس کا باپ ہے۔“
منیزہ بیگم نجائے کہاں کھو گئی تھیں۔

”آج وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کل کو ملنے کی خواہش کرے گا۔“ شہلا ان کی کیفیات سے بے خبر بول رہی تھی۔ ”پرسوں اسے گھمانے پھرانے کی بات کرے گا۔ اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔ شاید قانونی طور پر اسے ساتھ۔“

”خدا“ حق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھبرانے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
”مجھے متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائی شہید بیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شبابہت محسوس ہوئی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوئی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوا ہے کہ بلقیس بانو اس کی بھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔“
”اللہ شہلا اپنی ماں منیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔“

سٹالین قسطلے

وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا اطمینان سے اپنے کھیلوں میں مگن تھا۔ بلا کس کے پاس سے وہ اپنے پسندیدہ رنگوں کے بلا کس جمع کرتے کسی کھلونے کا ماڈل بنانے میں مصروف تھا۔
”شہلا آرام کر سی رہی تھی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ دواؤں سے لگتی کوئی معلوماتی مگن کا میگزین اس کی گود میں اودھ کھلا ہوا تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ میگزین اس کی گود میں لپیٹ کر رکھی تھی۔ وہ اس میں سے ایک لفظ نہیں پڑھ سکی تھی۔ اس کا ذہن پچھلی زندگی کے اوراق گھٹانے میں مصروف تھا۔ منیزہ بیگم نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھی میز پر دھیرے سے رکھا تب وہ چونکی۔“

”ماحق تکلیف کی امی آپ نے۔“ وہ زبردستی مسکرائی ”مجھے کچھ دیر پہلے ہی انیقمہ نے چائے بنائی تھی۔“
”تمہیں کب اس کی بنائی ہوئی چائے پسند آتی ہے۔ میں کیا جانتی تھیں!“ وہ محبت سے بولیں۔
”سارا دن کام میں لگی رہتی ہیں۔“ شہلا نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔ ”تھکتی نہیں ہیں؟“
منیزہ بیگم مسکرائے لگیں۔

”بوڑھی جان ہو سکتا ہے کبھی تھک بھی جاتی ہو ماں نہیں تھکتی۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔
”ایک بات پوچھوں امی آپ سے۔“ شہلا ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔
”ہاں پوچھو اجازت لینے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔“ وہ مسکرائیں۔
”شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تو منیزہ بیگم اس کے چہرے پر اضطراب دیکھ کر فکر مند سی ہوئیں۔
”کیا بات ہے شہلا؟ کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”بچہ ماں کا ہوتا ہے یا باپ کا؟“ اس نے ابھی ابھی نظریں ان کے چہرے پر نکا دیں۔ منیزہ بیگم کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ وہ اس کی بات کا کچھ جواب نہ دے پائیں۔

”بچہ۔۔۔ باپ کا ہوتا ہے۔ کیوں امی؟ جو ماں نو ماہ تک ہر طرح کی تکلیف اکیلی جان پر ہنستے کھیلتے سہہ جاتی ہے اس خوش کن امید پر کہ اس کی گود میں ایک بھول کھل کر اس کے وجود کو گلستان بنا دے گا۔ جو ماں زچگی کا اذیت ناک ٹیسوں کو ایک کلکاری سننے کی خواہش میں آگ کا دریا سمجھ کر بار کر لیتی ہے جو اپنی راتوں کی میٹھی نیند سے بخوشی دستبردار ہو جاتی ہے محض اس خوف سے کہ ساتھ رکھا جھولا اگر رک گیا تو اس کا تخت جگر اپنی معصوم نیند سے چونک کر ڈر کر رونے لگے گا۔ وہ ماں ہار جاتی ہے امی؟ وہ ماں ہار جاتی ہے۔ اس شخص سے۔۔۔ جو محض چند لمحوں کی نشاط آفریں جاو گری سے باپ بننے کی پر غور مسرت حاصل کر لیتا ہے۔ ماں ہار جاتی ہے۔“

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سبک اٹھی۔
”شہلا! میری جان!“ منیوہ بیگم گھبرا گئیں۔

عمر نے ماں کو روکنا ہوا نہ کھاتا تو بلا کس رو نہ ہوا چلا آیا۔

”مما! آپ رو رہی ہیں۔ نانو! آپ نے میری ماما کو ڈانٹا ہے؟“ وہ منیوہ بیگم سے پوچھنے لگا۔

”نہیں بیٹا! میں بھلا اپنی بیٹی کو کیوں ڈانٹوں گی اور ماما رو نہیں رہی ہیں۔ ان کی آنکھ میں کچھ چلا گیا۔ انہوں نے اسے بھلا نا چاہا۔ عمر نے ماں کے ہاتھ پکڑ کر کھینچے۔

”دیکھا! ماما رو رہی ہیں۔ نانو! آپ کو کچھ بتا نہیں چلا۔ آپ ایسے ہی کہتی رہتی ہیں۔ بے چاری ماما! کا چہرہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے صاف کرنے لگا۔ شہلا نے اسے سینے سے لگا لیا۔

♥ ♥ ♥

”میری دور رس نگاہیں کہتی ہیں کہ اگر آپ کے بال کالے ہو جائیں اور آپ کا چہرہ بلا اسٹک سرجری سے فری کر دیا جائے تو ایتقان پھینچو آپ کے سامنے پانی بھریں گی۔“

حزہ شفیقہ حیات کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ علی اور نانا بھی ارد گرد موجود تھے۔ وہ سیب کھانے لگے۔

”جانتی ہوں تمہاری دور رس نگاہوں کو۔“ انہوں نے بیان سے علی کے سر پر چپٹ لگائی۔ ”رزق“

”بتائیں دادی! علی نے بھی اشتیاق کا مظاہرہ کیا؟“ کیا آپ بہت خوب صورت تھیں؟ اصل میں وہی صورت ہوں گی آپ۔“

”ہائیں! یہ اصلی نقلی خوب صورتی کیا ہے؟“ انہوں نے اپنے بھانجے کو دیکھا۔

”آج کل کی جو بیوی ہے نادادی! وہ سب فراڈ ہے۔ اچھا وہی خوب صورتی ہے۔ رات کو گھر میں تقریب لڑکیاں صبح سے چہرے پر مختلف کریمیں مل مل کر اودھ موٹی ہو جاتی ہیں۔ تب کہیں جا کر ہلکی سی چمک نظر آتی ہے۔“

بچن میں کام کرتی ثانیہ اور سدرہ کے کان کھڑے ہوئے۔

”ہماری عریشہ کو دیکھ لیں۔“ سیلی کے گھر رات آٹھ بجے جانا ہے تو صبح آٹھ بجے سے صبح کی تیاری کا جاتا ہے۔ بالوں میں اینڈ امانہ پہ اینٹن یا زوون پر ہلیج کریم۔ گھنٹہ بھر تو ناخن فائل کرنے میں لگاتی ہے۔ مزے سے بھرے کر رہا تھا۔

ثانیہ نے سدرہ کو کہنی ماری۔ دونوں منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔

”یہ نقلی بیوی ہی ہے نا! آپ تو بس نہاد سو کر لمبے بالوں کی سادہ سی چوٹی بناتی ہوں گی۔“ نافع نے بھی کھاتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور دادا ابو۔“ ہائے ہائے۔ کہتے ہوں گے صدقے جاواں!“ علی نے آنکھیں بند کر کے گویا برسوں پر ذہن میں لانے کی کوشش کی۔

شفیقہ حیات کا چہرہ لودے اٹھا تھا۔ لبوں پر بیگی بیگی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ وہ بولیں۔ ”یہ اٹنے سیدھے فیشنوں کا رواج تو اب نکلا ہے۔ مانو کنواری اور بیاہن ہی گیا۔ اسے منہ سے پوچھنا پڑتا ہے کہ اے بی! اللہ رکھے خیر سے شادی شدہ ہو؟ جواب آتا ہے ”نہیں۔ ابھی تو منگنی ہوئی ہے۔“ لڑکے خوب محفوظ ہوئے۔

”دیکھیں نادادی! بھلا کنواری لڑکیاں ناک میں لونگ پینے اچھی لگتی ہیں؟“ حمزہ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ہائے۔ برا جانتے تھے لوگ۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔

”اور۔۔۔ اتنا میک اپ کرنے کی اجازت ملتی تھی آپ کے زمانے میں؟“ نافع نے ٹکڑا لگایا۔

”تمہارے تو دادا ایتنا خفا ہوتے تھے۔ گالوں پر سرخی نہیں لگانے دیتے تھے۔ کہتے تھے بری عورتیں لگاتی ہیں۔

تو بس بیان کھالتی تھی۔ اسی سے ہونٹ سرخ ہو جاتے تھے۔ کرن لگا دوپٹہ اوڑھ لیتے تھے سادے سوٹ پر۔ اللہ خیر صلا۔“

”پھر بھی دادی! پھر بھی آپ اتنی پیاری لگتی ہوں گی کہ کیا یہ آج کل کی فیشن زدہ لڑکیاں لگیا سکیں گی۔ واہ واہ علی ذرا تصور کرو۔ پیاری دادی ہر اسوٹ پہن کر کرن والا دوپٹہ ماتھے تک اوڑھے پان کھا کر جب مسکراتی ہوں۔

کیا دل فریب منظر ہوتا ہو گا۔“ نیچل بیوی۔“

”بچیا! نیچل بیوی۔ اب تو تصور ہی محال ہے۔ ہر چیز جعلی ہے۔“

”والڈ ایوی! کا زمانہ ہے یا ر!“ نافع نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ ”ڈورسنگ ٹیبل پر دس کریمیں تو محض وقتی طور پر رائے نظر آنے کے لیے رکھی ہوئی ملتی ہیں۔ لپ اسٹک کے ڈھیر میں سے سچو لپ اسٹک ڈھونڈنے میں آدھا

لگتا ہے۔ پھر ہاتھ پیروں کی باری آتی ہے تو یہ گزر گزر بھر کے ناخنوں پر دو دو تین تین کوٹ لگتے ہیں ناخن کے مٹھکے میں جا کر مطمئن ہوتی ہیں۔“

”تو بھئی تو یہ کتنی کرتی ہوں ان بچیوں کو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بھٹیڑ خیال بہت بڑھ گئی ہے دنیا میں۔ اب دنیا ستوری کی ہے۔ پھر ہم جیسے سوچتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں بے چاریاں قد امت پسند کہلا کر زنجیکٹ نہ کر دی

نہیں۔ سوچو ڈرامہ ہم بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔“

حیات نے بچن کے لڑکوں کا بھی فیور کیا۔

”اتنی میں مخالفت نہیں کیجئے۔“ بچن کے میدان میں اتر چکی تھی۔ ثانیہ اور سدرہ بچن کے پچھلے دروازے سے

کر دے۔ باغیچہ میں آدھ لڑکے گھومتے تھے۔ دو منٹ کے رستے میں انہوں نے خوب خوب مریج مسالے لگا کر

کی باتیں سنا لیں۔

”السلامو علیکم۔“ انہوں نے اپنے اوارس کو دیکھا۔

شفیقہ حیات نے بچن کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”بچن کی گفتگو کا مزہ کر کر اہوتا نظر آنے لگا تھا۔“

”بچن کی گفتگو کو دیکھ لیں۔“ سیلی کے گھر رات آٹھ بجے جانا ہے تو صبح آٹھ بجے سے صبح کی تیاری کا جاتا ہے۔ بالوں میں اینڈ امانہ پہ اینٹن یا زوون پر ہلیج کریم۔ گھنٹہ بھر تو ناخن فائل کرنے میں لگاتی ہے۔ مزے سے بھرے کر رہا تھا۔

”ہائیں!“ شفیقہ حیات انہیں گھورنے لگیں ”چھلنی بولے سوئی سے تیرے پیٹ میں چھید؟ چلو وہ تو لڑکیاں بالیاں ہیں۔ ان کا تو فطری شوق ٹھہرا بننا سنو رنا تمہارے داغوں میں یہ کیا فتور پلنے لگا؟“

”ارے واؤ جان! کہاں اس لی جمالو کی باتوں میں آرہی ہیں۔“ حمزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں ”یہ تو امی کا کاربن کالی ہے۔ بات کا بنگلہ بنانا کوئی اس سے سیکھے۔“

”اور نافع بھائی! آپ اپنی کہنے!“ ثانیہ مزے سے بولی۔ ”آپ کے دوست کی منگنی تھی جس دن۔۔۔ آپ مجھ سے کیا کروایا تھا؟“

”چپ۔۔۔ خاموش۔ خبردار۔“ وہ گھبرا گیا۔

”بتاؤ۔۔۔ بتاؤ۔“ لڑکیوں نے شور مچا دیا۔

”فیصل کروا رہے تھے مجھ سے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو سب نے قہقہہ لگایا۔ نافع پر منوں پانی پڑ گیا تھا۔ شہ حیات ہنس رہی تھیں۔

”دیکھو ان دیوانوں کو۔ بیٹھے لڑکیوں پر باتیں بنا رہے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ لگالیا۔“

”آپ سے ادھار چاہیے ہو گا تائی امی ان کو۔“ ناعمہ نے منہ بنا کر کہا۔ لڑکوں نے خاموشی سے کھسک لینے ہی عافیت جانی تھی۔

”مما! یہ مجھے ہوم ورک نہیں کرنے دیتی۔“ مومن بگڑا بگڑا سا بچن کے دروازے تک آیا تھا۔ سالن کی پتلی میں بے دلی سے چیخ بھلاتی ہوئی ایقان چونکی تھی۔

”کیوں بیٹا! کیا مسئلہ ہے؟“

”بس کچھ گھسیٹنی تھی۔“ وہ میسرز پیئریس کی میسرز پیئریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی تھی۔ وہ سخت خفا تھا۔ ایقان بچن سے نکل کر بلاؤنج میں چلی آئی۔ لال فراک میں ملبوس چھوٹی سی ایمان چھوٹی سی لڑکی تھی۔

”یہ میلا ہے۔“ اس نے ایقان کو دیکھتے ہی کہا۔

”آپ کا نقشہ ہے؟“ ایقان نے اسے دیکھا۔ وہ بھائی گھبراہٹ سے کہتی تھی۔

”نہیں!“ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”ایمان! تنگ نہیں کرتے بیٹا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”میں نہیں دوں گی۔“ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ ایقان نے جھنجھلا کر اس سے جیومیٹری باکس چھینا اور اسے چپت لگائی۔

”خبردار جو بھائی کو تنگ کیا۔ گندی بچی!“ ایمان روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔ وہ بیزار بیزار سی واپس بچن آئی۔ اس کے اندر عجیب سی کیفیت بیدار ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔ چولہے کے قریب آتے ہی اسے سالن کی مہک سخت ناگوار محسوس ہوئی۔ اس نے فوری طور پر ناک پر ہاتھ لیا۔ اسے ابکائی آگئی تھی۔ چند سیکنڈ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن دوسری مرتبہ ابکائی کے آتے ہی وہ تیزی سے سنک تک آئی تھی۔ مسلسل ابکائیوں کے باعث وہ نڈھال سی ہو گئی تھی۔

مومن اس کی غیر معمولی آوازوں سے گھبرا کر بچن میں چلا آیا تھا اور اب اس کا دامن تھامے سوال پر سوال تھا۔

”مما۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ ماما ایسے کیوں کر رہی ہیں۔۔۔ ماما آپ نے کیا کھا لیا ہے؟“ وہ اسے جواب دینے کے

نہ تھی۔ اندر کمرے سے ایمان کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اس کے رونے سے ایقان کا دل مزید خراب ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر اسے پیار کرنا چاہتی۔ لیکن ابکائیوں کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ در بعد وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ منہ صاف کر کے اس نے چہرہ دھویا اور فریج سے پانی نکال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ مومن اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”مما! آپ تھیک ہیں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ایقان ہولے سے مسکرا دی۔

”ہاں جانو! میں تھیک ہوں۔“ اس نے دھیرے سے اس کا گال چھوا۔ پھر وہ اٹھ کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔

”نہی ایمان فرش پر بیٹھی سنک رہی تھی۔ ماں کی ڈانٹ کو اس نے بہت محسوس کیا تھا۔

ایقان نے اسے بازوؤں میں بھر کر چوما۔ اس کا چہرہ صاف کیا۔

”آپ گندی ماما ہیں؟“ اس نے ناک چڑھائی ”ڈانٹتی ہیں؟“

”سوری!“ وہ معصوم بن گئی۔

”مما! آپ کو کیا ہوا تھا؟“ مومن کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر مسکرا دی۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ رابعہ بیگم خوش ہو کر بولیں ”ماں جان کو کیا؟“

”تب ہی تو آپ سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ دم خم سروں میں بولیں ”آپ بتا دیں نا؟“

”تو تم اب بھی شرمناک؟“ وہ جی بھر کر ہنس ”چھا خیر۔ میں اس کے کہنے دیتی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیوں نہیں آجاتیں؟“

وہ ایقان سے فون پر محو گفتگو تھیں۔ وردہ اور ناعملہ ان کی باتیں سن کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں۔

”یاجی۔ ایک تو مومن کی اسکو لنگ کا مسئلہ ہے۔ وہاں سے اس کا سیکولر دور پڑتا ہے۔ پھر بھالی جان کے منظور نظر مجھے ایک آنکھ نہیں بھالتے۔ انہوں نے تو مجھ سے میرا منہ کھینچا ہوا ہے۔ جب آوان کے دیدار سے فیض یاب ضرور ہونا پڑتا ہے۔“ وہ جل کر بولی۔ رابعہ بیگم کو ہنسی آگئی۔

”اتنی اتنی سی باتوں کو دل پر نہیں لیا کرتے ایقان! زندگی میں تو نجانے کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تم تو بہت نازک مزاج ہو۔“ ماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“

”بیجے! آپ بھی ماں کی ہم خیال ہو گئیں۔“ اس نے دہائی دی۔ ”میں تو بھی خود کو بہت مشکل میں محسوس کرتی ہوں۔“

”دہم ہے تمہارا۔“ وہ مسکرائیں ”چھا خیر یہ تو یونہی مذاق ہوا۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں تم چلی آؤ تو اچھا ہو۔ اس حال میں تمہارا یوں تن نمارنا ٹھیک نہیں ہے۔ دو سہرا ہٹ ضروری ہے۔“

”کچھ نہیں ہوتا یاجی! بہت سی عورتیں رہتی ہیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی ”میں آؤں گی کسی روز!“

”اچھا!“ اس نے تامل تھا۔ ”اللہ تمہارا ہو۔“ وہ سری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

وہ ہمیشہ ہی اپنے گھر کی سڑک کا موڑ یونہی بے پروائی سے کاٹا کرتا تھا۔ موٹر بائیک کو فل اسپید سے دوڑاتے ہوئے اس نے جو بھی موڑ کاٹا، سامنے سے آتے سفید آٹو کے ڈرائیور نے بے حد عجلت میں بریک لگائے تھے۔ ہاشم کو بھی بائیک روکتے روکتے سیکندری دیر ہوئی۔ بائیک گاڑی سے لگ گئی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ

پر سوار ڈاکٹر شہلانے بھنا کر شیشہ نیچے کر کے سر نکالا۔

”بہت جلدی ہے آپ کو؟“ وہ غصے سے بولی۔ پھر ہاشم کو پہچان کر اس کے تاثرات بدل گئے۔ ہاشم بائیک سے اتر کر اس کے قریب چلا آیا۔

”معذرت خواہ ہوں۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔ سن گلاسز میں چھپی ہوئی آنکھوں کا تاثر پوشیدہ تھا لیکن اس کے لبوں کے کنارے دم خم سا رُخا نمودار ہوا۔

”سوری۔ میں نے آپ کو دیر سے پہچانا۔“ وہ بولی ”لیکن غلطی بہر حال آپ کی ہے۔“

”تسلیم! میں پھر معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”آپ بائیک بہت تیز چلاتے ہیں۔ غلط بات ہے۔ اس دن بھی آپ سلب ہو گئے تھے۔ میں بار بار مفت علاج نہیں کرتی۔“ اب کی بار وہ کھل کر مسکرا دی۔

ہاشم کچھ بول نہ سکا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے جی میں خواہش ابھری تھی کہ سن گلاسز کے پیچھے چھپی ہوئی اس کی آنکھیں دیکھ سکے۔

”ہیلٹ پنا کریں۔“ اس نے مشورہ دیتے ہوئے شیشہ چڑھا لیا تھا۔ گویا اشارہ تھا کہ وہ اپنی بائیک سامنے سے لے کر ہاشم سے قدموں سے بائیک کی جانب بڑھ گیا۔

”کی۔ یہ وہ سٹہ مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ صاف کہے دیتی ہوں۔“ دال صاف کرتے ہوئے فردوس بیگم نے ہاشم کی آواز سے بٹی کو دیکھا۔ ”اب اگر ان باتوں سے تمہاری ساس کا مقصد کچھ اور ہے تو انہیں ہماری طرف سے ہرگز ہمندی نہیں ہاں۔“

ماہین کے خفا خفا سے ہاں کو دیکھا۔

”بیجے! اگر ان کے کہنے کی اور آپ نے اس میں برائی دیکھی۔ زمینوں سے پھل آئے تھے، سب رشتہ داروں کو بلانے ہیں۔ لیکن کوئی بھی نہیں آئے گا۔“ کو بیج دی تو کیا اس میں انہوں نے زرین کو بٹھا کر بھیجا ہے؟ نہیں بیجے تو آپ کہتی ہیں اس سے سسرال کو بلانے تو جیسے ہر مرنے والا۔

”بیجے! اگر ان کے کہنے کی اور آپ نے اس میں برائی دیکھی۔ زمینوں سے پھل آئے تھے، سب رشتہ داروں کو بلانے ہیں۔ لیکن کوئی بھی نہیں آئے گا۔“ کو بیج دی تو کیا اس میں انہوں نے زرین کو بٹھا کر بھیجا ہے؟ نہیں بیجے تو آپ کہتی ہیں اس سے سسرال کو بلانے تو جیسے ہر مرنے والا۔

”تو امی! اگر ان کے داغ میں ایسی کوئی بات ہے بھی تو اس پر سوچا تو جاسکتا ہے، زرین اب اتنی گھڑی بھی نہیں ہے۔“ بیجے بھلے رشتے آتے ہیں اس کے۔ وہ تو۔ میرا خیال ہے۔ ہاشم بھائی کو دیکھ کر خود ہی انٹر سٹڈ ہو گئی ہے۔

”اے ہو!“ فردوس بیگم اچھل ہی پڑیں ”خبردار جو اس بارے میں سوچا بھی تو۔ ماشاء اللہ! اللہ نظر بد سے بچائے شہزادوں جیسا میرا بیٹا۔ اس کے لیے وہ چھوٹی آنکھوں والی ہی رہ گئی ہے؟“

ماہین کو سخت آؤ آیا۔

”خدا را امی! اتنا غور بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اچھی گڈ لکنگ لڑکی ہے۔ آپ کو لے دے کر اس کی آنکھیں

”ہی نظر آئیں؟ کتنا فیئر کا پیلکشن ہے اس کا۔۔۔ پڑھی لکھی ہے اور کیا چاہیے۔“
 ”بس لی! تم رہنے ہی دو۔“ انہوں نے بیزاری سے تھاں بچھا۔ ”میں خود دھوؤں لوں گی اپنے بیٹے کے لیے لڑکی۔۔۔
 چار میٹھی باتیں کر کے انہوں نے تمہیں پھسلا لیا۔۔۔ تم کل کی بچی! ان باتوں کو کیا سمجھو۔“

ماہین ہونٹ چباتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔
 حقیقت یہ تھی کہ خود تسنیم نے اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور وہ شوہر کی نظروں میں اپنا قد بلند رکھنا
 چاہتی تھی۔

”ہاشم بھائی سے تو پوچھ کر دیکھ لیں۔“ اس نے ایک رہی سہی کوشش بھی کر ڈالی۔
 فردوس بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرہ غیض و غضب کا شاہکار بن گیا۔
 ”ان سے کیا پوچھوں؟ شہزادہ سلیم سے! انارکلی پسند کی ہے انہوں نے۔۔۔ بلکہ انارکلی کیوں مہر النساء کہوئے
 نور جہاں لقب دیں گے اسے۔۔۔ ہمارے سروں پر لا کر بٹھائیں گے ایک بچے کی ماں کو۔“ ماہین حیران پریشان ان کی
 بے سرو پا گفتگو سننے لگی۔

”بھری دنیا میں انہیں وہی ہٹا لگی نظر آئی۔۔۔ میں سمجھتی تھی فتور لکھ گیا ہو گا داغ سے، مگر اب تو وہی
 ڈھاک کے تین بات۔“

”کیا کہہ رہی ہیں امی!“ وہ کچھ الجھتے ہوئے بولی۔ ”آپ بھائی سے بات کی تھی؟“
 ”نہی تھی! جب ہی تو سلگ رہی ہوں۔“ وہ اپنا بازو دبائے لگیں۔
 ”پھر نہ کیا کہا انہوں نے؟“

”بتا تو رہی ہوں۔۔۔ اسی منحوس کے چکر میں ہے۔“
 ”ہائے اللہ!“ ماہین نے سینے پہ ہاتھ رکھا ”وہ بھولے نہیں اب تک؟“ فردوس بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

”پھر بھی۔ پھر بھی آپ زرین کے رشتے کی مخالفت کر رہی ہیں۔“ ماہین ماں پر غصہ نکالنے لگی۔ ”حالانکہ اس
 مطلقہ ایک بچے کی ماں سے تو زرین ہزار درجے بہتر ہے۔ کنواری تو ہے۔“

”ارے تو دنیا میں وہی ایک کنواری نہ گئی؟“ فردوس بیگم جل کر بولیں ”باقی سب بیاہتا ہوئیں؟ لڑکی! تیرا داغ
 ہے کیا ہے؟“

ماہین خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔ اسی لمحے عریشہ گنگنائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بے فکری اور
 اللہ پر اس کے انگ انگ سے چھلک رہا تھا۔ جو گیارنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں اس کا سراپا بہار دکھلا رہا تھا۔

”آگئیں لی پھر نہ!“ فردوس بیگم نے اسے گھورا ”بھال ہے یہ لڑکی گھر میں ملے۔“ عریشہ نے ماں اور بہن کے
 تیور ملاحظہ کیے تو اس کی بے فکری میں قدرے کمی آئی۔ گنگناہٹ بھی رفو چکر ہوئی۔

”آئی۔۔۔ آپ کب آئیں؟“ وہ خفیف سی ہو گئی۔
 ”تمہیں دعا سلام کی فرصت مل گئی؟“ وہ بھی بگڑی بیٹھی تھی۔ عریشہ نے شرمندہ سی ہو کر حسام کو اٹھالیا اور پیار
 کرنے لگی۔



”میں ہوتی تو محترم کا داغ درست کر دیتی۔ کمال ہے! اتنا بھی کانفیڈنس نہیں ہے آپ میں کہ اس کو کھری کھری
 سناتیں، شرم غیرت یاد دلاتیں۔“ انیقہ بھڑی ہوئی تھی۔ شہلا مسکرا دی۔

”یہ طنز کہاں سے لاؤں؟ ایک ڈری سہی ماں میں بھلا اتنا رعب ہو سکتا ہے؟“
 ”کمال ہے! ہم کیوں ڈریں؟ ہم نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے؟ کسی کی چوری کی ہے؟ اسے کوئی ڈر خوف نہیں۔۔۔
 اپنے کیے پر شرمندگی نہیں، پچھتاوا نہیں۔ اتنے سالوں بعد یاد آیا کہ کوئی بیٹا بھی پیدا کیا تھا، واہ صاحب بہت خوب۔“
 شہلا خاموشی سے سنتی رہی اور بے بسی سے مسکراتی رہی۔

”آئے تو سہی محترم کا فون! سب کس بل نکال دوں گی۔“
 ”پلیز انیقہ۔“ شہلا نے التجا کی ”کچھ مت کہنا۔ اس کی بات عمر سے کروا دنا۔ دیکھو وہ شرافت کی جون میں
 ہے، کیا خبر! کب اس کا داغ الٹ جائے، عمر کی محبت میں نہ سہی، ہماری ضد میں وہ اسے اپنی کسٹڈی میں لینے کا
 دعویٰ دائر کر دے۔۔۔ میں تو مر جاؤں گی انیقہ! عمر کے بغیر۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“

دو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ انیقہ کا سب جوش و خروش ہوا ہو گیا۔ وہ ہاتھ پر بل لیے اسے دیکھنے لگی۔
 ”جانتی ہیں آپ! عورت کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ یہ آنسو۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”پتا نہیں!“ اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں ”میں نے تو انہیں سب سے اچھا دوست پایا ہے۔“
 ”ہونہ!“ وہ طنز سے ہنس دی ”دل کا نقصان، جاں کا زیاں، بینائی کا عدو۔ کیا دوستی کرتے ہیں یہ آپ سے؟“
 ”نہ گھرے گھرے سانس لیے۔“

”دل کا غم!“ انکھوں کے رستے نہ نکلے تو شاید اتنا جس اس قدر بوجھ نہ سہہ پائے یہ غریب۔ دکھ کی شدت سے
 پھٹ جاتی۔ آنکھیں دھل کر صاف ہو جاتی ہیں تو سوچ، ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔“

”ماموں آگئے۔ ماموں آگئے۔“ عمر شور مچاتا اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔ اس کے پیچھے
 ہنستا مسکراتا آیا تھا۔

”اسلام! سلام کیا۔“
 ”و علیکم السلام۔“ دونوں لمحوں میں خوش ہو گئیں۔

”اچانک آگئے! اردو ہونٹ منہ فون نہ کوئی پروگرام۔۔۔؟“
 ”بس چاہا کہ سوچا۔۔۔ اند کو ہر۔۔۔ ذرا دن میں نکل کر دیکھیں۔“ اس نے عمر کو گود میں اٹھالیا۔

”بہت خوب!“ شہلا بھر پوری ”قد نظر بد سے بچائے۔“
 ”بچو! بچو! کتنا کتنا! اس نے گھر کو چوما“ آپ سب سے ملنے کے لیے بھی دل سبے چھین ہو
 رہا تھا۔ خصوصاً امی کی بہت یاد آرہی تھی۔ ”وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔“

”پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“ شہلا نے محبت سے بھائی کا چہرہ دیکھا۔
 ”زبردست! ہمیشہ کی طرح۔“ پھر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”آئی!۔۔۔ آپ رو رہی تھیں؟“
 ”ارے۔۔۔ نہیں یا گل!“ وہ ہنس دی ”میں کیوں رونے لگی۔“

”لگتا ہے۔۔۔ آپ کی آنکھیں۔“ منیہ بیگم چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ عباد کی
 آمد کی خوشی کی داستان کہہ رہا تھا۔

”یہ لمحہ گرم گرم سمو سے کھاؤ۔ میں نے دو دن پہلے ہی بنا کر فریز کیے تھے۔ سوچتی تھی، جانے عباد کب آئے
 گا۔ بہت شوق سے کھاتے ہونا۔“ انہوں نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

”یعنی صرف عباد کے لیے بنے ہیں۔“ انیقہ نے ناک بھوں چڑھائی ”ہم خالی چائے پر پڑھائے جائیں گے؟“
 ”بکھی تم سے کمی کی ہے میں نے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چیت لگائی تھی۔ انیقہ نے لاڈ سے ان

کے گلے میں ہا نہیں ڈال دیں۔
 ”میں جانتی ہوں۔۔۔ تینوں میں آپ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔۔۔ ہیں نا امی؟“ منیوہ بیگم مسکرا دی
 تھیں۔ ان کی پلکوں میں نمی تھی۔



نفیسہ خالہ دم بخود بیٹھی تھیں۔ ربیعہ ان کے پاس ان کی طرح پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان
 خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا تھا۔
 ”بھلا بتاؤ!“ آخر کار خالہ نے ایک آہ بھری۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
 ”میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے نا خالہ جان؟“ وہ متذبذب تھی۔
 نفیسہ خالہ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔
 ”خدا نے مجھے اپنی بہت والی بیٹی دے دی ہوتی۔ ایسے نکھٹو مردار لڑکوں سے تو بیٹیاں بھلی۔۔۔ مجھے منع کرتی
 ہو بیٹی! اس لیے خاموش ہوں اور نہ ایسی کی بیسی کروالوں کھڑے کھڑے۔۔۔ اس مردار کے سر سے عیش کا بھوت
 بھی اتار دوں اور اس بڑھے کے دماغ کی چولیس بھی درست کر دوں۔۔۔ بھلا بتاؤ! اپنی بیٹی جیسے بچی کو شادی کا سامنا
 دے رہا ہے کینہ۔۔۔ پورے محلے میں ذلیل نہ کر دوں تو نفیسہ نہ کہے گی۔ تمہاری شہم سے خاموش ہو چکی
 ہوں۔“

”بس خالہ۔۔۔! میری اور پتھر والا حساب ہے۔“ ربیعہ نے ٹھنڈی سانس لی۔
 ”نہ بیٹی۔۔۔ میری اور پتھر کا تو پتھر بھی کوئی جوڑ بنتا ہو۔۔۔ یہ تو قرب قیامت کی مثال ہوئی۔ بھلا بتاؤ۔“ ان کا پس نہ
 چلتا تھا وہ کچھ نہ کچھ ضرور ہی کروالیں۔

”ایک بات مانیں گی خالہ؟“ ربیعہ ہولے سے بولی۔
 ”وس کو بیٹی۔ اللہ قسم میں نے تمہیں دل سے بیٹی سمجھا ہے، محض زبانی کلامی نہیں۔“ خالہ جذباتی ہو رہی
 تھیں۔

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“ ربیعہ کو کہنے میں تامل تھا۔
 ”کو بیٹی! بتا دو۔“ خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
 ”آپ بدر کے لیے سمیعہ کا رشتہ مانگ لیں۔“
 خالہ خاموش ہو گئی تھیں۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر بڑی آس سے ان کا چہرہ دیکھا۔
 ”کیا بات ہے خالہ! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟ آپ کو بری لگی میری بات؟“
 ”نہ بیٹی۔ بات بری نہیں تو بری کیوں لگے گی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ لڑکی کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو کہیں نہ
 کہیں باپ پر گئی ہوگی اور باپ تو ایسا ہے کہ پتھر مار کر آنکھ نکال دے اس کم بخت کی۔ اب دیکھو نا۔۔۔ اولاد میں ہاں باپ
 کا اثر تو آتا ہے نا۔“

”میں نے تو سنا ہے سمیعہ کی ماں بہت اچھی عورت تھی۔“ ربیعہ کہیں کھوسی گئی ”وادی بتاتی تھیں۔“
 ”آں۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ وہ تو جنتی عورت تھی۔“
 ربیعہ نے اپنے خیال سے نکل کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”خالہ سمیعہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ بچپن سے۔۔۔ ساتھ رہا ہے ہمارا۔ میں اسے جانتی ہوں۔“

وہ بہت پر خلوص اور ہمدرد لڑکی ہے۔ پھر۔۔۔ پھر آپ کے بیٹے نے اسے بہت سے خواب دکھائے ہیں۔ وہ ان
 خوابوں کے سہارے جی رہی ہے۔ بدر اس سے تخلص نہ سہی وہ بدر سے مخلص ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے خالہ کہ
 اس خلوص کی ناقدری نہیں ہونا چاہیے۔“

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ!“ نفیسہ خالہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔
 ”پھر مانیں گی میری بات؟“ وہ آس سے بولی۔
 ”میں تو مان لیتی ہوں بیٹی! وہ بڑھا بھی تو راضی ہو۔“
 ”آپ رشتہ لے جائیے گا خالہ۔۔۔ باقی جوان دونوں کے نصیب میں اللہ نے لکھا ہو۔ ہونا تو وہی ہے۔“
 ”وہی منائے گی اپنے باپ کو۔ ہم کیوں اس کی منتیں کرتے پھریں۔“ خالہ پھر جل گئی تھیں۔ جب سے ربیعہ
 نے انہیں سارا قصہ سنایا تھا وہ حاکم چچا سے بار بار نفرت اور کراہیت کا اظہار کرتی تھیں۔
 ”خالہ! مکان کو تالا ڈال کر اس کی چابی آپ کے حوالے کر جاؤں گی۔“ ربیعہ کو دھیان آیا تھا ”وکانوں کا کرایہ
 بھی آپ رکھ لیا کرتا۔۔۔ میں نے ان لوگوں کو بھی بتا دیا ہے۔“

”تمہاری امانت ہے بیٹی! سب کچھ۔۔۔ جب آؤ گی اپنی امانت پوری پوری پاؤ گی۔“ خالہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔
 ”میں چلتا تو تمہیں کسی طور نہ جانے دیتی۔۔۔ نجائے تمہاری وادی کو اللہ نے اتنی مہلت کیوں نہ دی۔“ ربیعہ
 نے اپنی سانس پھر کھسک کر سانس لیا۔
 ”وادی۔۔۔“ وہ بھی کہنے والی بات ہے۔ بھلا بتاؤ!“
 ربیعہ کی سوج میں گم ہو گئی تھی۔



سنائے نامی مندرجہ لائی ہے ہاشم میاں کے لیے۔ ”شفیقہ حیات نے تسبیح روک کر پر خیال انداز میں
 بسوسہ چھاپا۔ وہ ریل کی شرٹ پہن کر رہی تھیں۔ یکدم مڑی تھیں۔
 ”چھا!“ اسٹریٹ کی ایک کونج پر کھڑے ایک آدمی نے اسے دیکھا۔ ”آپ کو کیسے پتا؟“
 ”عزیز نے کچھ اڑنی اڑنی کہی تھی۔“ وہ ثانیہ کو دیکھ رہی تھی۔ ”میں بھی وہیں قریب ہی بیٹھی تھی۔“
 ”آپ نے کچھ اڑنی اڑنی کہی تھی؟“ وہ نہیں سمجھ رہی تھی۔
 ”نہ بیٹی۔ میں آپچھا نہیں جانتی یوں گھروں کی رپورٹ لینا۔ وہ تو بس یونہی بات کان میں پر دگئی۔ ابھی بیٹھے بیٹھے
 خیال آ گیا تھا۔“

”بھالی جان کا کیا خیال ہے؟“ عذرا بیگم چو کنا تھیں۔
 ”کیا خبر؟ تمہیں بتایا تو ہے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔“
 ”مذہر!“ عذرا بیگم نے گہرا سانس بھر کر کہا ”جہاں جس کا نصیب اللہ نے لکھا ہو۔ ہمارا تو اس بات پر ایمان کامل
 ہے۔“
 وہ پھر جا کر رافع کی شرٹ استری کرنے لگی تھیں۔

”ارے ہو!“ شفیقہ حیات نے پھر تسبیح روکی تھی ”ذرا بات سنو۔ ایک صلاح کروں تم سے؟“ عذرا بیگم پھر
 استری کا پلگ نکال کر چلی آئیں اور ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔
 ”فردوس کینہ پرور تو بہت ہے اللہ معاف کرے لیکن سب ہی جانتے ہیں۔“ انہوں نے بات کا آغاز کیا تھا۔

PHOTO

”رافع والی بات بھولی نہیں ہے وہ۔۔۔“

”جانتی ہوں اس میں کیا راز کی بات۔“

”پھر بھی۔۔۔ اگر ہم کوشش کریں تو معاملات شاید پھر سنبھل سکیں۔۔۔ دیکھو بیٹی! نیک عورتیں ہمیشہ گھر جوڑنے کا ہی سوچتی ہیں کیا سمجھا، کیا سسرال ہر رشتہ نباہنا پڑتا ہے۔“

عذرا بیگم اچھ سی گئیں۔ انہوں نے ساس کا چہرہ دیکھا۔

”بات کیا ہے اماں! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میں کہتی ہوں رافع کے لیے نہ سہی نافع کے لیے مانگ لو عریشہ کو۔“ عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔ شفیقہ حیات ان کو دیکھے گئیں۔

”کیا کہتی ہو؟“

”اماں! وہ اب نہیں مانیں گی۔ بے وجہ ہماری زبان بھی خراب ہوگی اور جتنا بھرم ہے اتنا بھی جائے گا۔ باقی آپ کی مرضی۔“

وہ بے دلی سے بولیں۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں ساس کا مشورہ قطعاً پسند نہ آیا تھا۔

”ارتے بیٹا۔۔۔ مجھ بڑھی کی کیا مرضی! آج سانس ہے کل کو نکل جائے گی۔ میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ خاندان آپس میں جھگڑے رہیں تو اچھا ہے۔ خود اپنا لڑکا باہر بیٹھے کو بھرتی ہیں، تم اپنے بیٹے کا کہیں نہ کہیں تو کرو گی تو کیا ہی اچھا ہو بھائی! بھائی آپس میں ایک دوسرے کا بوجھ بن سکتے ہیں۔“

عذرا بیگم کے سانس کی بات صحیح معنوں میں سمجھ میں آئی تو ان کے چہرے کے زاویے بدلتے۔

”لیکن اماں! ہم نافع کے لیے عریشہ کو مانگ لیں تو کیا ضرور ہے کہ وہ بھی ہارشم کے لیے ہماری لڑکی مانگیں؟“

”سوچیں گی تو ضرور!“ انہیں یقین تھا۔

”اور جو نہ سوچا۔۔۔“

”تو کیا ہوا ان کی سوچ ان کے ساتھ ہمیں کوئی لالچ تو نہیں۔۔۔“

URDU PHOTO

”ای جی! میری شرٹ اس سے سیلائی گائیں دو لالیں۔۔۔“

”وہ بڑی ہے ذرا سی رہتی ہے کرنے کو۔۔۔“

”ہائیں یعنی میٹنگ اہم ہے۔ شرٹ ادھوری چھوڑ دی آپ نے۔۔۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”بائی داوے ہاٹ ٹاپک کیا ہے؟“

وہ دونوں مسکرانے لگی تھیں۔

”اماں کا خیال ہے نافع کے لیے عریشہ کا رشتہ مانگا جائے۔“ انہوں نے بڑے بیٹے سے بھی تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔

”وہ خالصتاً زنانہ موضوع۔“ وہ بے نیازی سے شرٹ پر استری پھیرنے لگا۔

”پھر بھی کچھ رائے تو دو۔۔۔“ شفیقہ حیات نے بھی کہا۔

”میں کیا رائے دوں دادی!“ وہ ہنس دیا تھا۔ ”رائے تو صاحب الرائے سے مانگیے!“ اس کا اشارہ نافع کی طرف تھا۔

”عریشہ اچھی لڑکی ہے نا۔“

”ارے دادی! لڑکیاں سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔۔۔“ وہ شرٹ پنن کرٹن بند کرنے لگا۔

”پھر تم نے انکار کیوں کیا تھا؟“ انہوں نے اسے چھیڑا۔

”لیجئے۔ میرا ذکر کیوں نکال بیٹھیں۔ رات گئی بات گئی امی! میں ذرا طفیل کے گھر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے گی اچھا اللہ حافظ!“ وہ سٹی کی دھن از سر نو تازہ کرنا ہر نکل گیا۔
 ”ان لڑکوں کے لیے تو ان کی دوستیاں اہم ہیں۔ گھریلو معاملات اہم نہیں۔“ شفیقہ حیات خفا ہوئیں۔
 ”ہاشم سے اس کی ایسی بچی دوستی ہے یہ چاہے تو اس سے بات کر سکتا ہے۔“
 ”نہ اماں! کبھی نہیں مانے گا۔ پھر اچھا بھی نہیں لگتا۔“ عذرا بیگم نے فوراً ”ان کا خیال مسترد کر دیا۔
 ”پھر کو تو میں فردوس بیگم کے کان میں بات ڈالوں۔“ انہوں نے بات کا تصفیہ کرنا چاہا۔
 ”کر دیکھیے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھیں۔

شہلا نے اس کالی بی چیک کر کے اپریش بند کیا۔
 ”بہت اولڈ پریشر ہے۔ کیا بات ہے؟ کھانا پینا بند ہے کیا؟“
 ”کچھ حلق سے اترے تو کھاؤں نا۔“ وہ بیزاری سے بولی ”جو کھاتی ہو اس وقت حلق سے پانی آتا ہے!“
 ”بری بات ہے ایقان۔! تم خود کو شش نہیں کرو گی تو آسمان سے فرشتے ہیں انہیں سے من و سلوئی کے تھال لے کر۔“

”میں بھی تو یہی سمجھاتی ہوں۔“ رابعہ خاتون بولیں ”یہ کسی کی کب سنتی ہے۔ پچھلے سفتے سے برابر فون کر کے بلارہی ہوں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہی۔ کل میں علی کو لے کر ملنے چلی گئی۔ دیکھا تو تقریباً بے ہوش پڑی تھی۔ بچوں کی الگ حالت خراب تھی۔ ماں بھیک نہ ہو تو بچوں کو کون پوچھے گا۔ اسے اتنا بھی اچھا نہیں۔“

”ڈانٹ لیجئے آپ بھی!“ وہ ہولے سے مسکرا دی ”میری سائیڈ کون لے گا؟“
 شہلا نے اسے ملٹی بوٹاس کی گولیاں لکھ دی تھیں۔

”میں اب چلتی ہوں۔ مجھے ہاسپٹل بھی جانا ہے۔ تم اپنا خیال رکھو ایقان! تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ جلدی سے ٹھیک ہو کر انہیں توجہ دو۔“ اس نے منہ کی ایمان کا گال پر پھونکنے ہوئے کہا۔
 ”عمر کیسا ہے؟“ ایقان نے پوچھا۔

”ہوں! اچھا ہے۔“ وہ مسکرا دی ”آج کل عباد کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔“

”ماموں کا تو دیوانہ ہے۔“ رابعہ بیگم نے تبصرہ کیا۔
 ”ماموں بھی تو ایسے ہیں۔“ پیچھے بیٹھی ناعملہ گنگائی تھی۔ وردہ کو ہنسی آگئی۔
 ”کس بات پر ہنسا جا رہا ہے؟“ شہلا اپنا پاس لیے ان تک چلی آئی تھی۔
 ”کچھ نہیں شہلا باجی!“ وہ گڑبڑا کر رہ گئیں۔

”پلو نہیں بتانا تو نہ سہی۔“ وہ مسکرائی ”اچھا بھی خدا حافظ۔“

”آئی رہنا شہلا!“ ایقان ہولے سے بولی رابعہ بیگم شہلا کا لکھا ہوا نسخہ دیکھ رہی تھیں۔
 ”میں بھی رافع سے منگوا لیتی ہوں دوایاں۔“ وہ بولیں ”کیا حال کر لیا ہے اس لڑکی نے اپنا۔“
 ایقان نے آنکھیں بند کر کے سر تکیے سے ٹکایا تھا۔ آنکھوں میں کسی کی مسکراتی صورت پھرنے لگی تھی۔
 ”آئی مس یوسنہ آئی مس یو عاشر!“ اس کی بند پلکوں میں پانی بھرنے لگا۔

”نہیں۔ میں تو بہت بریو بوائے ہوں۔ ڈرنا تو نہیں ہوں کسی سے۔“ وہ فون کے تار سے کھیل رہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر نوٹس بناتی انیقہ کے احساسات کے سب تار جھنجھٹا رہے تھے۔ وہ سارے صفحے پر نجانے کیا لکھے جا رہی تھی۔

”خالہ جانی کہتی ہیں، صرف اللہ میاں سے ڈرتے ہیں۔ بھوت اور چڑیلیں تو ہوتے ہی نہیں ہیں۔ سب جھوٹ ہے۔“

منیزہ بیگم بظاہر رسالہ دیکھنے میں مشغول تھیں لیکن ان کا دھیان اس کے لفظ لفظ میں الجھ الجھ کر دکھتا تھا۔
 ”میرے بابا؟ وہ تو ہیں ہی نہیں۔ بتا نہیں کہاں ہیں۔ ماما سے پوچھو تو وہ کہتی ہیں بعد میں بتاؤں گی۔“ انیقہ نے جھجھلا کر قلم بچا اور خفگی سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئیں۔

”سب بچوں کے پپا آتے ہیں پیرٹس میٹنگ میں، میری تو صرف ماما ہوتی ہیں۔ میرا دوست ہے ناککی اس کے پپا نہیں آتے کیونکہ وہ اللہ میاں کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ شاید میرے پپا بھی اللہ میاں کے پاس گئے ہوں۔“
 ”عمر بے باس بیٹا۔ اب انکل کو خدا حافظ کہہ دو۔“ انیقہ نے آہستگی سے کہا۔ اس نے ریسیور کان سے ہٹا کر خالہ کو دکھایا۔

”میں پپا کیوں نہیں لے سکتی نا انکل سے۔“

”آپ کھینچنے نہیں جا رہے راجہ کے ساتھ؟“

”نہیں!“ اس نے بے نیازی سے جواب دے کر پھر ریسیور کان سے لگا لیا۔

”ناں! میری خالہ کجالی ہے۔ یہ ایسے ہی مجھ سے لڑائیاں کرتی رہتی ہیں۔ ماما جیسی؟ نہیں ماما تو لڑائیاں نہیں کرتی۔ آپ سے کہیں گے۔“

”اللہ جی جگہ سے اٹھ کر آؤ۔“ نے عمر سے ریسیور چھپٹ کر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

”بیس منٹ!“ اس نے پچھلے ”کافی سے اتنا۔“

عمر خفگی اور قدرے غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”آپ ناراض کیوں ہو؟“ نے عمر سے خالہ جانی پوچھا۔

”نہیں!“ نے عمر سے خالہ جانی پوچھا۔

”انیقہ!“ منیزہ بیگم نے اسے سرزنش کی۔ ”بچے سے کیوں الجھ رہی ہو؟“

”میں تو باب کا دماغ بھی بھیک کر دوں ماما۔ لیکن شہلا آپ کی وجہ سے چپ ہوں۔“

”وہ بیا شعور سمجھ دار ہے۔ تم ابھی بچی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔“ وہ رسائی سے بولیں۔

”اتنے اچھے انکل ہیں۔ اتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آپ باتیں بھی نہیں کرتیں اور فون بھی نہیں کرنے دیتیں۔ بالکل اچھی خالہ نہیں ہیں آپ!“ وہ منہ بسور رہا تھا۔

”اچھا جی۔“ انیقہ کا غصہ اس کا منہ دیکھ کر فرد ہو گیا۔ ”آپ تو بہت پیارے بھانجے ہو نا میرے۔ آپ اچھی اچھی باتیں کرو اپنی خالہ سے۔“ گندی خالہ سے۔

وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا منہ چومنے لگی۔

”اٹکی مرتبہ جب عباد ماموں آئیں گے نا۔ میں ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا لاہور۔ پھر آپ مجھے یاد کیا کریں گی۔“

”آپ بھی مجھے یاد کریں گے جب میں چلی جاؤں گی۔“ وہ مزے سے بولی۔
 ”آپ؟“ وہ الجھ کر بولا ”آپ کہاں جائیں گی؟“

”سسرال!“ وہ شریا کر بولی۔
 ”بد تمیز!“ منیوہ بیگم کو ہنسی آگئی تھی ”بچے کے ساتھ ایسی باتیں کرتی ہے۔“

”لاہور؟“ سمیعہ کی چیخ نکل گئی تھی ”کیوں۔۔۔ کس کے پاس۔۔۔ وہاں کون ہے تمہارا؟“
 ”میری پچھو کا گھر ہے وہاں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”لیکن تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ شاکدہ تھی ”ایسے اچانک۔۔۔ چوروں کی طرح۔“
 ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

”اے بی! جب چور ڈاکو سینہ تان کر چلنے لگیں، دھڑلے سے پھریں تو شریف لوگ یونہی خاموشی سے روں کی طرح اپنے کام کرتے ہیں۔“

نفیسہ خالہ بھنا کر بولی تھیں۔ سمیعہ کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں گہری سوتی تھی۔

”بچلو بیٹی۔! وقت کم ہے۔“ انہوں نے اس کا ٹرنک سنبھالا۔

ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”ربیعہ۔۔۔ تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔“ سمیعہ کو بے حد گلہ تھا۔ ”اب جاتے جاتے کہہ رہی ہو۔ کس دل سے رخصت کروں تمہیں؟“ ربیعہ اس کے گلے لگ کر رو دی۔

”مجھے معاف کر دینا سمیعہ۔! میری کچھ مجبوریات تھیں۔ یہ بات میں خود سے بھی چھپا رہی تھی۔“

سمیعہ بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ دونوں بہنوں کی طرح تھیں۔

”اب کب ملاقات ہوگی؟“

”اللہ کو علم!“ وہ مختصراً بولی ”وہاں مجھے میرے اپنے مل جائیں۔“

اسی لمحے سکندر اندر داخل ہوا۔

”اماں رکشہ آگیا ہے۔“

ربیعہ سمیعہ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ نفیسہ خالہ نے دروازے کو بالادال لڑچاپی اپنے تئیں میں اڑس لی تھی۔ ربیعہ نے رکشہ میں بیٹھ کر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنا گھر دیکھا۔

”ربیعہ۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔۔ ربیعہ! یہاں سے جاؤ!“

اسے رکشے کے شور میں وادی کی آواز آرہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر روانی سے بہہ رہے تھے۔

ریل کے پہیوں کی چٹکھاڑ اس کے دل میں سوراخ کر رہی تھی۔ وہ اندر سے بے حد خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔

”خالہ! آپ نے اس سے پرتار بھیج دیا تھا نا۔“ اس نے آخری مرتبہ پوچھا۔

”آں ہاں بیٹی۔! بے فکر رہو۔ تار پہنچ گیا ہوگا۔ تم اطمینان سے سفر کرنا۔ میں نے ٹکٹ بھی مہنگے والے ڈبے کا لیا ہے۔ اس میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر اللہ پر بھروسہ کر کے جاؤ۔“

وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ مجھے بہت یاد آئیں گی خالہ۔“

”تو کیا میں نہ یاد کروں گی تمہیں۔۔۔“ وہ گلو گیر لمبے میں بولیں۔ ”بھلا بتاؤ!“

”میرے گھر کا خیال رکھنا خالہ! وہاں وادی کی روح رہتی ہے۔“

”جتنا بس میں ہو سکے گا بیٹی! خدا ان بے حس انسانوں کو رسوا کرے گا۔۔۔ بچی کو اپنے گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا ظالموں نے۔ ایسی اندھیر نگرانی جسے دیکھو وہی دانت گاڑے بیٹھا ہے۔ بھلا بتاؤ۔“ وہ دکھ سے چور چور رہی تھیں۔

”میں خط لکھوں گی آپ کو۔“

”کوئی پریشانی ہو تو لوٹ آنا بیٹی۔۔۔ آخر میں تو ہوں نا یہاں۔۔۔“

”دعا کرنا خالہ! کوئی پریشانی نہ ہو۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹکٹ کو غور سے دیکھا۔

گاڑی کی اسٹیشن پر رکی تھی۔ عباد کی فینڈ ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر رتھ سے نیچے آگیا۔ تھرموس سے پانی نکال کر پینے لگا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”دفعتم!“ اس کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی۔ وہاں پان سی وہ لڑکی سر تا پا سیاہ چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کا سر جھکدار ہنر آہستہ چادر سے باہر تھا۔

اس کے چہرے پر فرشتوں کی ہی معصومیت تھی۔ حجاب آلود سیاہ آنکھیں ایک بار اس کی آنکھوں سے ٹکر آکر بھر جھک گئیں۔

عباد کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹپکتی رہی۔ سفر کی تلاش کی پھر وہ ناکام ہو گئیں۔ بقیہ دو ہم سفر تو کراچی سے ہی اس کے ساتھ تھے۔

وہ لڑکی شاید اسی چھوٹے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔ وہ تنہا تھی۔ اس کے انداز میں نا محسوس سی

اپنا سفر بیگ گود میں رکھے وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

”آپ اکیلی ہیں؟“ وہ بچانے کیوں اسے مخاطب کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”جی!“ اس نے خوف زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا ”جی۔۔۔ جی ہاں!“ عباد نرمی سے مسکرایا۔

”کوئی بات نہیں۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

”لاہور۔“ اس نے تھوک نگلا۔

”میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔“ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ”چلیں سفر خوشگوار ہو گا! میرا نام عباد ہے۔ آپ کا؟“

”ربیعہ!“ وہ دھیرے سے بولی۔

اس کے وجود میں بے پناہ کشش تھی۔ عباد اسے دیکھنے گیا۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

مخ حقائق سے ہٹا کر کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھربچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائ میں شدید بیاس کے عالم میں اس سے پالی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بلتیس بائو اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔
 ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

آٹھویں قسط

آہستگی سے دستک دے کر ہاشم اندر داخل ہوا۔ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے رافع نے ذرا کی ذرا کی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر اپنے کام میں منہ دے کر رہا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ ہاشم اس کے مقابل گداز صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ رافع نے چند لمحوں بعد پھر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ غائب دماغی سے پی۔ سی کے مانیٹر پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور فضا میں محو پرواز ہے۔
 رافع کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 دیکھا کر رہا ہے یا را؟ بڑی دیر بعد ہاشم اپنے خیالوں سے نکلا۔
 ”پرو جیکٹ کھلیٹ کر رہا ہوں۔“ وہ مصروف انداز میں گویا ہوا۔
 ”جس کا نام ہے؟“ جان بکھار رکھی ہے۔
 ”گہری سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ ناقدانہ نگاہوں سے وہ رافع کو دیکھنے لگا۔
 سیاہ ٹراؤزر اور سفید ٹی شرٹ میں وہ خالصتاً اپنے گہریلو حلقے میں تختہ نما عموماً وہ اطمینان سے اسٹڈی کرنے کے لیے اسی ڈریس کا انتخاب کرتا تھا۔ ماتھے پر بڑی سٹیلن اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کا بورادھیان اپنے کام کی جانب تھا۔ مہارت سے چلتی انگلیاں اس کی سوچ کے بھرپور رول ادا کرتی گواہی دیتی تھیں۔ ہاشم کی آمد کو قطعاً لفٹ نہ کرائی تھی۔ ہاشم نے بالا خراکتا کر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔
 ”یار رافع!“
 ”ہوں۔“ کچھ دیر بعد مختصر ترین جواب آیا۔
 ”چائے پلا!“ رافع کی انگلیاں ایک تختہ گئیں سوہ ریو الونگ چیئر کو گھما کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”میں پلاؤں؟“ وہ حلقے سے اسے گھورنے لگا۔
 ”ہاں۔ اور کیا؟“ ہاشم کو حیرت ہوئی۔
 ”یعنی ایک ”فارغ البال“ قسم کا بندہ از حد مصروف شخص سے یہ فرمائش کرتا کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔“
 ”انداز ہی نہیں۔“
 ”یہ بات نہیں ہے۔“ ہاشم نے احتجاج کیا۔ ”ایک بہت پریشان خیال شخص ایک بے حد پرسکون بندے سے یہ فرمائش کر رہا ہے۔ یہ پریشانی شیر کرنے کی استدعا ہے یا را؟“

”پرسکون بندہ؟ اس پرو جیکٹ کو کمپلیٹ کرنے کے خیال نے میری رات کی نیند اور دن کا سکون برباد کر رکھا ہے اور تو کہتا ہے پرسکون بلکہ بے حد پرسکون بندہ۔“
 ”ارے ہم نے بھی کیے ہیں بڑے بڑے پرو جیکٹ۔“ ہاشم نے مکھی اڑائی ”دو دن میں دو مارے تھے۔ پر اس روگ کا کوئی علاج جتنا میرے دوست!“
 ”کسی ڈاکٹر سے رجوع کرو۔“ رافع معنی خیز انداز میں بولا۔
 ”ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر تو اماں ناراض ہے۔“ ہاشم بے چارگی سے بولا۔
 ”اب یا تو روگ کا علاج پوچھ لویا اماں کو منانے کا۔ ایک وقت میں میں ایک علاج تجویز کر سکتا ہوں۔“ رافع نے کرسی ہاشم کی جانب سے مکمل طور پر موڑ لی اور انگلیاں چٹانے لگا۔ گویا ہاشم کی آمد کو شرف مہمانی عطا کر دیا گیا تھا اور اب وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔
 ”سنا ہے ماہین بیگم؟“ تنسیم بھائی کے ہمراہ آنے والی ہیں؟“ ہاشم نے اصل مسئلہ سے اسے آگاہ کیا۔
 ”سویار آئیں ان کا گھر ہے۔“ جیسے کا ہے کے مروڑاٹھ رہے ہیں؟“ رافع نے بھنوس اچکا کر اسے دیکھا۔
 ”مروڑا اصل تنسیم بھائی کی چھوٹی بہن کا نام ہے میرے لیے۔“ ہاشم نے طنزاً کہا۔
 ”اسی؟“ اس نے سر ہلایا۔ ”میری اور کنکروالا معاملہ ہے۔“
 ”کنکر؟“ اینٹ اینٹ میرے بھائی۔ میری تو کنکروٹ جائے گی۔“ اس نے دہائی دی۔
 ”کنکر؟“ اس نے سر ہلایا۔ ”سینک فین پر نگاہ جمائے وہ کچھ دیر مسکراتا رہا۔ ہاشم بری سی صورت بنائے بیٹھا تھا۔
 ”تیری نہیں تیری خود ساختہ عشق کی گھر ضرور ٹوٹے گی۔“ وہ اسے ڈراتے ہوئے بولا۔
 ”ہاشم اسے گھورتا رہا اور رافع کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ہاشم کے گھورنے کا جواب اس نے کھنکھناتے ہوئے دیا۔
 ”کبھی کبھی؟“ ہاشم نے سر ہلایا۔ ”کبھی کبھی؟“
 ”محبت نامی“ شیخ ابتر نے مجھے اسے ”سندباد“ کہا۔ کیوں آخر؟ یہ بلا میرے کاندھوں پر اس بے تکلفی سے کیوں لگتی ہے؟“
 ”نہیں یار۔“
 ”سندباد پر؟“
 ”او فوف۔ الو کی دم۔“ وہ چڑ گیا۔
 ”ڈاکٹر شہلا؟“
 ”ہاں۔“ وہ بے ساختہ بولا۔
 ”رافع نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ ہاشم نے بات سمجھ کر اسے مڑکا دکھایا۔
 ”بچے گا میرے ہاتھ سے۔“
 ”رافع نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی قابو میں کی۔
 ”بچہ پر کبھی کسی رشک آتا ہے۔ اس پر کبھی کبھی سخت قسم کا تاؤ آتا ہے۔ وضاحت کسی بات کی نہیں ہے۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے آخر؟“

”میرا مسئلہ؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ ”یہی تو میرا مسئلہ ہے یا راکہ کبھی کبھی مجھے تم پر رشک اور ڈاکٹر شہلا پر سخت غصہ آتا ہے۔ دس ازرا پوائنٹ۔“

اس کے لب و لہجے میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ رافع بھی سنبھل گیا۔
”وضاحت کرو۔“ پہلی بار اس نے ہاشم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”سوچتا ہوں رافع! کاش میں بھی تمہاری طرح ہوتا۔ زندگی کو میں نے اسی نظر سے دیکھا ہوتا جس نگاہ سے اسے تم دیکھتے ہو۔ چند مخصوص قسم کے مقاصد پر رہنا ہے، اچھی نوکری کرنی ہے، ماں باپ کی پسند سے شادی کر کے بچے پیدا کرنے ہیں، ان کو بڑا کر کے ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ذہن میں دھند نہیں بھرتی، آنکھوں میں خواب نہیں بستے، سوچوں میں تلاطم برپا نہیں ہوتا، جذباتوں میں بھنور نہیں پڑتے سب کچھ صاف، سیدھا غصہ کے بندے ہو یا رافع! مجھے تم پر کبھی کبھی بہت رشک آتا ہے۔“

”یہ کبھی کبھی کی تکرار کہتی ہے کہ بہت کچھ بین السطور بھی ہے۔“ رافع نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔
”ہاں۔ بس کبھی مجھے تمہارا وجود بے مقصد بھی تو لگتا ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔

رافع ہنس دیا۔ ”وضاحت کرو۔“

”یا بس! کوئی فرق ہو تیل میں اور بندے میں آنکھوں پر بی بندھی سے گول گول گھم رہے ہو۔ آدمی اگر جو رسیاں تڑا کر بھاگے۔ چچ! لیکن بس کبھی کبھی محبت مست کرنا اور رافع! کاش کہ محبت انسان اپنی پسند سے کرنا ہے، مقدر اللہ تعالیٰ اپنی پسند سے لکھتا ہے۔ جو بھی Clash ہو جائے تو بڑا نقصان ہوتا ہے بندے کا۔“

رافع گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اپنے دوست کا بکھرا روٹھا اور ٹھاٹھ انداز سے از حد اچھا لگ رہا تھا۔
”اور تم مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو میاں راجھے! کہ میرا بھی جی چاہ رہا ہے کسی کو چاہ دیکھنے کا“ اس نے جی ہی جی میں سوچا۔

”اچھا!“ پھر وہ کھنکھار کر بولا۔ ”اور ڈاکٹر صاحبہ پر کس بات کا غصہ آتا ہے؟“
ہاشم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ رافع نے اس کی آنکھوں میں دھنک سی اترتی دیکھی۔ غالباً ”یہ محبوب کے تصور کا کمال تھا۔“

”ہو لو نا۔ اس پر غصہ کیوں آتا ہے؟“ وہ مسکرا ہٹ دبانے ہوئے بولا۔
”کبھی اس نے دیکھا ہی نہیں میری طرف اتنے اتنے بے بسی سے ہیں میرے لیے۔“

خوردگی سے بولا۔
”محبت کی تو نہیں ہے ہاشم! لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت کبھی بھی قیمت کی محتاج نہیں ہوتی۔ انمول شے کا مول کوئی کیسے دے سکتا ہے؟ چاہو، مگر چاہے جانے کی تمنا مت کرو، یہی اصل بنیاد ہے محبت کی۔ جو دام ہائے وہ کیا عشق؟“

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ہاں صبر، کوئی تمنا پس واماں وفا
مجھ سے پوشیدہ میرے پیش نظر ہوتی ہے

”محبت کرنا الگ بات ہے شادی کر کے گھر سانا الگ معاملہ ہے۔ ان دونوں کو جوڑتے کیوں ہو؟“
”واہ!“ ہاشم نے چمک کر اسے دیکھا۔ ”میاں ابھی گلی نہیں ہے تمہیں دعا کرو نہ لگے۔ وودھ کا وودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ محبت کر کے تو انسان خدا کو پانے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ وہ محبت کیا جو وصل نہ مانگے۔“

”پھر وہ محبت نہیں ہے۔“ رافع اطمینان سے بولا۔

”پھر وہ کیا ہے؟“

”قرب کی خواہش۔“

”کسی سے قرب کی خواہش کیوں بیدار ہوتی ہے؟ کس جذبے کے تحت؟“

”عورت کے قرب کی خواہش مرد کے خمیر میں گند جی ہے اس لیے۔“

”گویا کسی بھی عورت سے کام چل سکتا ہے؟“

”ہاں۔ شادی کر کے دیکھ لو بھول جاؤ گے سب کچھ۔“

ہاشم چند لمحے اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

”تم سنجیدہ ہو؟ یہ خیالات واقعی تمہارے ہیں؟“

”آف کورس ہنڈرڈ پرسینٹ۔“

”محبت خواہ کسی سے ہونے شادی کسی اور سے کر کے آدمی ہر بات بھول سکتا ہے؟“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ رافع نے کانڈھے اچکائے۔ ”بھلا ان دہ باتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟“

”تم اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں خفگی تھی۔“

”اگرچہ رافع! تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“

رافع پھر سے ہنس دیا۔

”ان لمحوں میں تیل نہیں۔“ وہ بولا۔ ”ویسے دعا دینے کا شکریہ!“

”دعا کیوں نہ ہو گی۔“ ویسے اظہاراً عرض ہے کہ میں نے تمہیں دعا نہیں بد دعا دی ہے۔“

”آئی کی؟“ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”میں نے ہر حال تمہیں نیک نیتی سے مشورہ دیا ہے۔“

”اے ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کرلو“

”اور ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو“

”تجینکس!“ وہ مسکراتے ہوئے تیل پر نزل لیا۔

URDU PHOTO

نجانے کتنی دیر بعد اسے بھوک نے ستایا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے نوجوان پر ڈالی۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ نجانے تھک گیا تھا یا سو گیا تھا۔

بڑے میاں برتھ پر سونے کے لیے جا چکے تھے ان کی بیگم تسبیح کرتے ہوئے اونگھ رہی تھیں۔

ربیعہ نے اپنا لٹچ باکس کھولا۔ نفیسہ خالہ نے بڑے اہتمام سے اس کا کھانا تیار کیا تھا۔ تلی ہوئی چھلی، شامی، کباب، آلیٹ اور پرائے۔ ساتھ میں ان کا وہی مزیدار چار تھا جو ربیعہ کو ہمیشہ سے پسند تھا۔ ہر رشتے میں ان کی محبت مہلک رہی تھی۔

ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ نجانے کس کھول کر وہ نجانے کس بیٹے ہوئے لمحے میں جا پہنچی تھی۔

”اے ہم!“ عمار کھنکھار رہا۔

”وہ چونک اٹھی۔ جلدی جلدی اس نے اپنے سیاہ پلو سے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور یوں اپنا کھانا نکالنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔“

”بہت بے مروت ہیں آپ!“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”جی؟“ اس نے حیران نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

”اتنا سارا کھانا باندھ لائی ہیں اور اتنا بھی لحاظ نہیں کہ کسی ہم سفر کو جھوٹے منہ ہی پوچھ لیں۔“

”اوہ!“ اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”وہ اصل میں مجھے۔“ اس سے بات نہ بنائی گئی۔

”بھوک بہت لگی ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کا ادھورا جملہ مکمل کر دیا۔

ربیعہ ہنس دی۔

”نتیجہ ناکچھ۔“ اس نے خالی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بہت کچھ لوں گا۔“ اس نے بے تکلفی سے پلیٹ تھام لی۔ ”لیکن ذرا ٹھہریے۔ غالباً“ میری امی جی

نے بھی کچھ زاد راہ ہمراہ کیا ہے۔“

اس نے اٹھ کر اپنا لفٹ نکالا۔ اندر مزید ارچائیز رائس اور فرائیڈ چکن تھے۔

”واؤ!“ عباد بے اختیار بولا۔ ”جیستی رہے ہاں میری۔ دیکھا آپ نے ربیعہ! ماؤں کو اپنے بچوں کی پسندنا پسند کا

کتنا خیال ہوتا ہے؟ غالباً“ آپ کی امی جی بھی ساری چیزیں آپ کی پسند کے مطابق بناتی ہیں۔ ہے نا؟“

ربیعہ نے نظر اٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا۔

”میری امی کا انتقال ہوا ہے۔ وہ رستائیت سے بولا۔

عباد کی جلتی آنکھوں کی جوت یکا یک مدھم پر گئی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“

ربیعہ نے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالا پھر دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

”کھانا بہت مزیدار ہے۔ کس نے پکا یا ہے؟“ عباد کو کھانا بے حد پسند آیا۔

”میری خالہ نے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ یہ چاول لیں نا۔ اس میں مال کے ہاتھوں کی خوشبو ہے۔“

ربیعہ نے لفٹ تھام لیا۔

چاول واقعی بے حد لذیذ کپے ہوئے تھے۔ ربیعہ نے اس طرح کے کپے ہوئے چاول پہلی مرتبہ کھائے تھے۔ وہ

شوق سے کھاتی گئی۔

”آپ کس کے پاس جا رہی ہیں لاہور؟“ عباد ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اپنی پھپھو کے گھر۔“ وہ حیرت سے سمجھنے لگی۔

”کہاں ہے آپ کی پھپھو کا گھر؟“

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ذہن میں لکھا ہوا پتہ ہرانے کی کوشش کی اور قدرے کامیاب ہوئی۔

”باغبان پورہ۔“

”اچھا! میرا ایک دوست وہیں رہتا ہے۔“ عباد کو خوشی ہوئی۔

”آپ!“ ربیعہ نے نگاہیں اٹھا کر اس کا پر خلوص چہرہ دیکھا۔ ”آپ کس کے پاس جا رہے ہیں؟“

”میں پڑھتا ہوں وہاں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کر رہا ہوں سہائیل میں رہتا ہوں۔“



عذرا بیگم نے مائے کا جوس نکال کر مشین کا پلگ نکالا اور جوس گلاس میں اندیلنے لگیں۔

”بھالی جان! ذرا سائمنک اور کالی مرچ ملا دیں۔“ اسٹول پر بیٹا ریزاری بیٹھی ایتان نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ ملائے دیتی ہوں۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ ”ویسے نمک بہت کھارہی ہوتی ہے۔“

وہ کسمندی سے بیٹھی رہی۔ عذرا بیگم نے جوس میں اس کے حسب خواہش اشیاء ملا کر گلاس اسے تھما دیا۔

”مومن آیا نہیں اب تک؟“

”نہیں۔ شہلا کے بیٹے سے خوب گاڑھی چھتی ہے اس کی۔ پہلے ماہ میں دوستانہ تھا اب اولاد کی قدم

پر چل رہی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

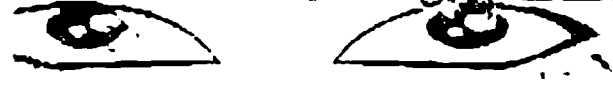
ایتان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ خلی آئی۔

”یاد ہے بھالی جان! یا تو میں شہلا کے گھر میں ہوتی تھی یا شہلا ہاں آسمو خود ہوتی۔ علیحدہ علیحدہ وقت گزارنے کا

تو تصور تک نہ تھا ہمارے پاس۔“

”ہاں تو کیا بھول گئی ہوں؟ امتحان تم لوگوں کے ہوتے تھے شامت میری آجاتی تھی۔ کبھی کمرے میں کھانا

مٹکویا جا رہا ہے کبھی چائے کبھی ٹینڈا ہاں اٹھ اور رافع بھی مل جاتے تھے تم لوگوں کے ساتھ۔“



ایتان ہنس دی۔

”ہاں۔ ہاں۔“ وہ پھر قدرے سنجیدہ ہو گئی۔

”نگاہوں کے سامنے سے کئی منظر کے بعد دیگرے گزر گئے تھے۔“

”یہ ہاشم کے لیے بھالی جان نے کوئی لڑکی پسند نہیں کی اب تک؟“

”اللہ جانے کہاں بیٹا نے کارا رہ رہتی ہیں۔ سنا ہے ماہین اپنی

”وہ جھوٹے برتن سنگ میں جمع کرنے لگیں۔“

”اچھا!“ ایتان کچھ سوچنے لگی۔ ”ہاشم کیا کہتا ہے؟“

”اس کو کیا کہنا ہے غریب نے۔ جہاں ماں کے گے ہوئے گا۔“ وہ سادگی سے بولیں۔

”اتنا بھی غریب نہیں ہے۔ وہ طنزاً بولی۔“

”ارے بڑی زور آور ماں ہے اس کی۔ وہیں کرے گی جہاں اس کے جی میں آئے گا۔“ شفیقہ حیات نے ان کی

”مشتگوسن لی تھی۔ سو وہ بھی وہیں چلی آئیں۔“

”میں تو عذرا سے کہتی ہوں ان کی چھوٹی کو اپنے چھوٹے کے لیے مانگ لو۔ شاید ان کے جی میں بھی نیکی آجائے

تو وہ بھی کچھ پیش قدمی کر لیں۔ مجھے تو ہاشم اتنا بھلا لگتا ہے جی کہتا ہے گھر کا بچہ باہر کیوں جائے۔ آخر گھر کی بچیاں

”بھی تو ہیں۔“

”عزیزہ کو نافع کے لیے؟“ ایتان بولی۔ ”ناٹ آئیڈ آئیڈیا۔“

عذرا بیگم برتر ہو کر ان کی جگہوں پر رکھنے لگیں۔

”بھئی میں تو نافع سے پوچھ کر ہی کوئی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ جوان بچہ ہے۔ آخر اس کی بھی کوئی پسند ناپسند ہوگی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جو بھی کرو اولاد کی رضا مندی سے کرو۔ لیکن عریشہ میں کوئی خرابی تو نہیں جو وہ انکار

کرے۔ خوبصورت ہے کم سن ہے پڑھی لکھی شائستہ بچی ہے۔ آج کل کے لڑکے تو یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ پھر

فردوس بیگم کے گلے شکوے بھی دور ہو جائیں گے۔“

ایتان گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔

اسی لمحے سدرہ دوڑی آئی۔

”پچھو جان! آپ کے میاں جی کا فون ہے۔“

ایتان کا سستی سے بھرپور رویہ یک لحظہ تبدیل ہو گیا۔ وہ جوس کا گلاس وہیں رکھ کر فافٹ دوڑ گئی۔

”آئے ہائے بچی! ذرا سنبھل کر شفیقہ حیات نے اسے ٹوکا۔ ”یوں بھاگ رہی ہے جیسے۔“ یقیقہ جملہ انہوں

نے لبوں میں ہی دبایا۔

”ہیلو۔“ اس نے فون کا ریسور اٹھایا۔ ”السلام و علیکم“

حالت ایسی تھی کہ ذرا سائمنک سے سانس بے قابو ہو رہا تھا۔

”و علیکم السلام۔ خیریت تو ہے۔ آخر میاں کو تو نہیں دیکھ لیا؟“ وہ شرارتاً بولا۔

”ار فوب۔“ وہ جھجھکی تو گئی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوچی آپ کو؟ اتنے دن بعد فون کیا ہے وہ بھی الٹی

”سوچی مادام! سوری۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔ ”بندہ معذرت خواہ ہے آپ کا تصور گھر پرانے پر۔ خیر یہ تو

”بتاؤ بچے کیسے ہیں؟“

”کچھ ہیں۔“ وہ خندہ پیشانی سے بولی۔

”بچوں کی ماں؟“

”بہت اچھی ہے۔“ اس نے مسکراہٹ جھپائی۔

”وہ کون سی ہے؟“ وہ بھی ہنس دیا۔ ”یہ تو ہم روز خواب میں دیکھتے ہیں۔“

”کیا خبر؟“ وہ سناٹا لڑکی سے فون کاٹنے سے کیٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے۔ کہ وہ جو جی میں

”آئے۔“ وہ سناٹا لڑکی سے فون کاٹنے سے کیٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے۔ کہ وہ جو جی میں

”آپ کا کام تو ہم شکل سے بھی بن رہا ہے۔ آپ کو کسی کی کیا پروا۔“ وہ چڑھی۔

”نہیں اب ایسا بھی نہیں۔ کام بن نہیں رہا بس چل رہا ہے۔“ وہ شرارتاً بولا۔

”چلا تے رہیے۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”ویسے روز خوابوں میں اگر مجھے دیکھتے تو کم از کم میرے حال کی خبر تو

”ہوتی۔“

”اوہو۔“ بھئی کیا ہوا حال کو؟ خیر تو ہے؟“ وہ تشویش سے بولا۔ ”آواز سے بھی مرجھائی مرجھائی لگ رہی ہو۔ بخلا

”ہے کیا؟“

”اول ہوں۔“

”پھر کیا ہوا ہے؟“ وہ فکر مند ہوا۔

”اسے ہنسی آگئی۔“

”ابھی تو خیر کچھ نہیں ہوا۔“ وہ معنی خیزی سے بولی۔ اس کے ادھر رے جملے میں بہت کچھ تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اچھل پڑا۔
 ”ریلی ایتان! آریو شیور؟“ اس کی آواز میں خوشی تھی۔
 ”ہیس۔“

”گڈ نیوز جانو! میرا جی چاہ رہا ہے اڑ کر پہنچ جاؤں تم تک۔“
 ایتان خاموش ہو گئی۔ اس کا دل یکایک ہی افسردگی سے بھر گیا۔
 ”میرا تو نجانے کب سے یہی جی چاہ رہا ہے عاشر! لیکن محض جی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔“ دوسری جانب سے وہ پکارنے لگا۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“
 ”سب ٹھیک ہیں خیریت سے ہیں۔“ وہ بولی۔
 ”بچے یاد کرتے ہیں مجھے؟“

ایتان چپ رہی۔ بچے اس کے بنارہنے کے عادی تھے۔ پھر بھی وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر نولی۔
 ”ہاں۔ بہت یاد کرتے ہیں۔“
 ”اور تم؟“

وہ محض ہنس دی۔
 اسی لمحے لائن ڈیس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایتان نے گہری سانس بھر کر ریلوے سٹیشن کی طبیعت پر پھر دی
 سستی غالب آ رہی تھی۔

آنکھوں پر سے سن گلا سزا تار کر اس نے متلاشی نگاہوں سے اسے کھوجا۔ پھر وہ اسے دکھائی دے گیا۔ گراؤنڈ
 میں کھیلے ہوئے بہت سے بچوں میں وہ اسے دور سے ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ بچوں جیسا تھا۔ انہی کا ہم عمر لڑکا کی
 طرح اسکول ڈریس میں ملبوس۔ لیکن شہلا کو وہ سب میں منفرد لگا۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔
 عمر نے سر کر دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑی بال چھینک کر دوڑتا چلا آیا۔
 ”مما۔“ وہ اس سے لپٹ گیا۔
 ”مائی ڈارلنگ!“ اس نے جھک کر اس کا گل چوما۔ ”ہاؤ آریو؟“
 ”فائن ممما۔“ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ”آپ مجھے لینے آئی ہیں؟“

”ہیس۔ آف کورس۔“
 ”میں اپنا ٹیک اور بیج باکس لاتا ہوں۔“ وہ اندر کی جانب دوڑ گیا۔
 چند لمحوں بعد وہ گاڑی میں بیٹھے گہرے گھبراہٹ میں دوڑاں تھے۔
 ”آج دین والا نہیں آیا ممما؟“ اس نے سوال کیا۔
 ”میں نے اسے منع کر دیا تھا۔“ اس نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔ ”آج میرا موڈ تھا اپنے بیٹے کو پک کرنے کا۔“
 ”آج آپ کا ہاف ڈے تھا ممما؟“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔
 ”میرے سب فرینڈز آپ کو دیکھ رہے تھے وہ سب آپ کو لانگ کرتے ہیں۔“

”اچھا!“ وہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔ ”کوئی خاص وجہ؟“
 ”سب کہتے ہیں تمہاری مہارت پاری ہیں۔ یوٹی فل ہیں۔“
 ”اوہ۔“ وہ اتر آئی۔ ”خیر یہ تو ہے۔“
 ”لیکن۔“ وہ کچھ الجھا۔ ”ایک رابلم ہے ممما!“
 ”کیا؟“ اس نے سرک پر سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔
 ”ان سب کے پاس پیہا بھی ہیں۔ میرے پاس صرف ممما ہیں۔“

شہلا نے گہری سانس بھر کر اپنا دھیان ٹریفک کی جانب مرکوز کیا اس نے عمر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ
 کن اکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔
 ”مما!“ اس نے کچھ دیر بعد پکارا۔
 ”ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔
 ”میرے کوئی پیہا بھی تھے؟“

چند درجہ اتنا سوال پر اسے بے طرح ہنسی آئی۔
 ”نہیں تو۔ آپ تو کثیت میں آگے ہوئے تھے۔ میں تو ڈرلائی۔“ ہنسی پر بمشکل قابو پا کر اس نے کہا۔
 ”میرے براہ راست بنا کر اسے دیکھا۔“
 ”اے اسٹوڈنٹ آفسر ممما!“ وہ خفگی سے بولا۔

”لی پریور سلف عمر!“ شہلا نے سنجیدہ ہو کر اسے تنبیہ کی۔
 ”سڈری۔“ لیکن آپ مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ مزید ہوا۔
 ”کیا جانو؟“ وہ ہنسی۔ ”آپ دنیا کے واحد بچے نہیں ہو جس کے پاس صرف ممما ہیں۔ دنیا میں ہزاروں بچے
 بچے ہیں جن کے پاس ممما پیہا دونوں نہیں ہیں۔ وہ بھی تو جی رہے ہیں یا؟ آپ کے پاس تو تانویں خالہ جانی
 ماموں اور ان بچوں کے پاس ان کا اپنا ایک رشتہ بھی نہیں ہے۔ وہ یمیم خانوں میں رہتے ہیں جہاں انہیں
 صرف وقت کی دکان ملتی ہے۔ بہت سا کام کرنا پڑتا ہے۔ نو اسکولنگ، نو گیمز، نو پیہا نہیں۔ کیا وہ بچے نہیں
 ہیں؟ انہیں جی تو کچھ میال ہے۔ کیا اب اسی اللہ نے جس نے آپ کو اتنے رشتے دیے ہیں اتنا پیار دیا ہے
 آپ کو؟“

”لیکن عمر! ایک بات بتاؤں آپ کو۔ اللہ تعالیٰ سے شکایت کرنے کا
 اللہ تعالیٰ نے جس کو جس جگہ پیدا کیا ہے وہاں اسے صبر و شکر کے ساتھ رہنا ہے۔ آپ کے اسکول میں بھی
 بہت سے بچے ایسے ہوں گے جن کے پاس صرف ممما ہوں گی یا صرف پیہا ہوں گے یا ممما پیہا دونوں نہیں ہوں گے۔
 تو کیا وہ بچے نہیں جیتے؟ خوش نہیں ہوتے؟ کسی محرومی کو روگ نہ لانا درست نہیں ہے بیٹا! آپ سمجھ رہے ہیں میں
 کیا کہہ رہی ہوں؟“

وہ باہر دیکھنے لگا۔ شہلا نے بھی گہری سانس بھر کر اسپید برہادی۔
 ”مما!“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔
 ”ہوں۔“
 ”جن بچوں کے پاس ممما یا پیہا ہوں وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں نا۔“
 شہلا خاموش رہی۔ وہ سوال کے غیر معمولی پن کو بھانپ گئی تھی۔
 ”ہوئیں نا ممما!“

”ہاں ہے پھر؟“ اس نے مجبوراً کہا۔

”جن کے ماما پھانسیا میں ہوں وہ تو بچوں سے الگ نہیں رہتے نا؟“

شہلانے نچلا لب راستوں سے ڈالیا۔

”پھر میرے پپا الگ کیوں رہتے ہیں؟“

شہلا کا چہرہ ہلکا اٹھا تھا۔ اس نے سن گلاس اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینکے۔ عمر سہم کر رہ گیا۔ شہلانے غصے سے اسے دیکھا۔

”تمہارے پپا اس لیے الگ رہتے ہیں عمر کہ انہوں نے تمہاری ماما کو طلاق دے دی ہے ڈائی ورس۔ ڈیو

انڈر اسٹینڈ؟ اب وہ کبھی تمہاری ماما کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ تمہارے پپا ضرور ہیں مگر میرے

لیے ایک اجنبی ہیں۔ اگر تم اتنے ہی بڑے ہو گئے ہو تو سن لو کان کھول کر۔ اور آئندہ مجھ سے یہ فضول سوالات

مت کرنا کبھی نہیں۔“

اس نے ماں کا شرارے برساتا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

گاڑی سڑک پر فرارے بھر رہی تھی۔

”ہائے اللہ۔“ عریشہ نے ناعمہ کو شوکا دے کر متوجہ کیا۔

ناعمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ پیر میں سینڈل پہن کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے سوتے کو اس نے بے حد ناپسند

کیا۔

”کیا ہے تمہیں؟ میری پسلیاں چھید رہی ہو مسلسل۔“

سیلز مین مسکرانے لگا۔ عریشہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ دکان کے گلاس ڈور کے باہر کھڑے وہ تینوں صاف

نظر آ رہے تھے۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑی بے فکر اور ذرا غصے سے کھڑے ہنس رہے تھے۔

ناعمہ اور ثانیہ کی پوری توجہ دکان میں جی سینڈلوں کی جانب تھی۔ یوں بھی مارکیٹ میں پہنچ جانے کے بعد ان

کے بقعہ حواس کام کرنا چھوڑ دیتے تھے صرف بھاؤ تاؤ والی حس پھر کتنی رہ جاتی تھی۔

”دیکھو؟“ ناعمہ سفید سینڈل کے متعلق ان دونوں کی رائے جاننا چاہتی تھی۔

”اپنا پیر دیکھو۔“ ثانیہ نے سرگوشی کی۔ ”نی کالا سیاہ کالا لگ رہا ہے سفید چیل ہیں۔ یوں سننے کا بیٹھے ہم نے اس

اور کے پیر لگائے ہوئے ہیں۔“

ناعمہ نے ہنسا کر اسے دیکھا۔

”اور کالے پیر دیکھ کر دیکھنے والے کا دھیان تمہاری طرف ہی جائے گا کہ ہونہ ہو یہ ثانیہ کے پیر ہیں۔“ وہ ترکی

یہ ترکی بولی۔

”یہ بے لاگ تبصرہ تھا۔ اب بھی تم سینڈل خریدنا چاہتی ہو تو ضرور خریدو۔“ اس نے کانڈھے اچکائے۔

”تم تاؤ عریشہ!“ اس نے دکان سے باہر دیکھتی عریشہ کو دیکھا۔

”آل سی۔“ ”وہ چونکی۔“ ”سیج ہے۔“

”کیا سیج ہے؟“ وہ چڑ گئی۔ تم دونوں کے ساتھ آکر بہت بڑی حماقت کی ہے میں نے اچھا بھلا اور وہ آپ کے

ناعمہ کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے بھی دکان سے باہر دیکھا۔

”ہائے اللہ!“ اس کا رد عمل بھی ہو ہنسا ہی تھا۔

”سمجھ میں آئی۔“

ناعمہ نے سینڈل اتار کر پرے کر دی۔

”دے دوں آئی؟“ سیلز مین نے پوچھا۔

”آئی؟“ اس نے چیخ ماری۔

عریشہ اور ثانیہ کی ہنسی نکل گئی۔

”نہیں چاہیے“ وہ جھٹلا کر کھڑی ہوئی۔ ”چلو لڑکیو۔“

”لے لیں باجی!“ سیلز مین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”سیل میں مل رہی ہے۔“

”منت تو نہیں مل رہی نا“ وہ تنگ کر بولی۔

”چلو اب لے لو۔“ عریشہ نے کہا۔ ”یہ کم بخت تو دفعان ہوں جب تک۔“ اس نے اس کے کان میں سرگوشی

کی۔ ناعمہ کا غصہ بھی فرو ہو گیا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ دے دو۔ ہم اور سینڈل پسند کر لیں۔“ اس نے سیلز مین سے کہا۔

”اور کرس باجی!“ اس نے سعادت مندی سے ”باجی“ پر زور دیا۔

وہ سیلز مین کے پاس ٹھٹھنے لگیں۔

”یہ کیا مصیبت گلے پر گئی۔ بیٹھے بیٹھائے“ ناعمہ نے سرگوشی کی۔

”تمہارا اچھوتا آئیڈیا تھا۔“ ثانیہ نے جل کر کہا۔

”یہ کھڑکیوں پر ہے؟“ وہ پریشان تھی۔

”تم کو تو بیٹھنا ہی چاہیے۔“ عریشہ نے اسے گھورا۔

”یہ ڈر لگ رہا ہے۔“ ”جی منبھائی۔“

”کالا سیاہ؟“ ناعمہ کے حوصلے نے جوش مارا۔ ”میں ابھی ایک چمڑے کا جوتا خرید لیتی ہوں۔“ وہ دونوں ہنس

پڑیں۔

”آج تمہیں ہنسنے کی شان ملے گی۔“ ناعمہ نے شان بگڑ کر نام بنا کر گھر سے نکلی تھیں۔ رستے میں ان تینوں میں

بہت جھگڑا ہوا تھا۔ اس میں سوار ہوئے گا کہ وہ ٹیکسی کا کرایہ بچانا چاہتی تھی جبکہ ثانیہ اور عریشہ بھند

تھیں کہ ٹیکسی میں جایا جائے۔

”اری کم بخت۔ اتنے کرائے میں وہ سینڈل آجائیں گی۔“ اس نے انہیں سمجھایا۔

”بس کے اسٹاپ تک وہی سینڈل چھنی بھی پڑیں گی۔“ تنگ ہوئی وہ الگ ”عریشہ اڑ گئی تھی۔ ایسے میں سڑک

کے کنارے کھڑی ہنڈا سوک کو دیکھ کر نجانے ناعمہ کو اچانک کیا ہوا تھا۔

”سنس بھائی۔“ گلف تک چھوڑ دیں گے؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ”نہیں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔“

”آف کورس! تشریف رکھیے۔“

عریشہ اور ثانیہ ہکا بکا تھیں اور وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ مجبوراً وہ دونوں بھی گاڑی میں

بٹھیں۔

”یہ کیا جہالت ہے؟“ ثانیہ بڑبڑائی۔

”خاموش رہو۔ لفت ہی لی ہے نا۔“
 ”کسی نے دیکھ لیا تو جوتے پڑیں گے۔“ عریشہ کو تین عدد جوان بھائیوں کا خوف تھا۔
 ”کوئی نہیں جھانکتا چلتی گاڑی میں۔“ وہ مطمئن تھی۔ ”دوپٹے آگے کرلو۔“
 ”اور جو یہ لفتا کہیں اور لے گیا تو؟“ عریشہ بھنائی۔

ناعمل نے اسے کہنی ماری۔
 ”شش۔ بری بات ہے۔ بے چارہ اکیلا ہے، ہم تین ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔
 ”مجبوراً“ وہ دونوں چپکی ہو رہیں۔

ایک ایک اس نوجوان نے گاڑی ایک جگہ روکی تھی۔ وہاں انتظار کرتے دو لڑکے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئے۔ ان تینوں کی سانس گلے میں اٹک گئی تھی۔
 وہ دونوں حیران ہو کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور مسلسل مسکرا رہا تھا۔
 ”ان کی تعریف؟“ آگے سے سرگوشی آئی۔
 ”کریا مت۔۔۔ پٹ جاؤ گے۔ وہ تین ہیں، ہم اکیلے ہیں۔“ مطمئن انداز میں جواب دیا گیا۔ لڑکیاں تلملا کر رہ گئیں۔

”تیری قسمت کو میں نے جگا دیا ہے؟“ پھر ایک سوال ہوا۔
 ”ارے ہمارے اپنے نصیب کمال ہیں۔“ ٹھنڈی لہجہ بھری گئی۔ ”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے۔“
 ”سینے!“ ناعمل پھر کر بولی۔ ”بس روک دیں یہیں۔ ہمیں یہیں اترنا ہے۔“
 ”منزل تو کچھ اور طے ہوئی تھی؟“

وہ زچ ہوئی۔ ”ٹائپ اور عریشہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔“
 ”میں نے کہا تھا میں یہیں اترنا ہے۔“ گاڑی روکیں۔
 ”یہ آٹومینک گاڑی ہے محترمہ! سیٹلائٹ سے کنٹرول ہوئی ہے۔“ اس نے اشارہ کر چکا ہوں۔ معاملہ ستاروں تک جا پہنچا ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“
 اگلی سیٹ سے ایک دانا بھائی بھائی لڑکیاں حواس باختہ ہو گئیں۔
 ”دیکھیے ہم دروازہ کھول کر کود جائیں گے۔“ عریشہ نے ہمت کر کے کہا۔ ”آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔“
 کھٹاک کی آواز کے ساتھ دروازے لاک ہوئے۔
 ”آپ بندے کو غلط سمجھ رہی ہیں جناب! آرام سے تشریف رکھیے۔ انشاء اللہ بحفاظت منزل پر پہنچیں گی۔“
 وہ مسکرا رہا تھا۔

دروازے لاک ہوتے دیکھ کر ان کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر گری جاری تھیں۔ گاڑی کن پرستوں پر دوڑ رہی تھی انہیں خبر نہ تھی۔
 جب گاڑی واقعی گلف مارکیٹ کے سامنے جا رکی اور آٹومینک لاک سے دروازے کھلے تو تینوں کو ہوش آیا۔
 بڑی تیزی سے وہ دروازے کھول کر نیچے اتریں۔

اپنے اپنے برس سنبھال کر وہ بنا کچھ کہنے آگے بڑھ گئیں تب ہی پیچھے سے پکارا گیا۔
 ”مچی سینے!“

فوری رد عمل کے نتیجے میں تینوں نے ہی مڑ کر دیکھا۔
 ”لفٹ لینے کا شکریہ۔“ وہ تینوں دوانت نکال رہے تھے۔

اور سان بحال ہو چکے تھے اس لیے انہیں ہنسی آگئی۔ بنا جواب دیے وہ آگے بڑھ گئیں۔ لیکن اب شاپنگ کے دوران انہیں اپنا بیچا کرتے دیکھ کر وہ نئے سرے سے پریشان ہو گئیں۔
 ”اب اگر ان مردوں نے کوئی بد تمیزی کی تو بھری مارکیٹ میں بے عزتی کروں گی۔“ ناعمہ بڑبڑائی۔ ”ناعمہ علی خان نام ہے میرا۔“



اے بیٹھے بیٹھے کب غنڈ آگئی تھی اسے خبر نہ تھی۔
 اس کی آنکھ انجمن کی چٹکھاڑ سے کھلی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رک کر اب دوبارہ آگے بڑھی۔ ربیعہ کو جو اس بحال کرنے میں کچھ دیر لگی۔
 لیکن اگلے ہی لمحے اس کے رہے سے اور سان بھی خطا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ کپار ٹمنٹ میں وہ نہایت خطرناک قسم کے آدمی موجود تھے اور ان تینوں کے علاوہ کپار ٹمنٹ میں کوئی نہ تھا۔ بڑی بڑی موچھوں والے کانڈھوں تک لمبے بال لیے وہ دونوں آدمی اپنی سرخ آنکھوں سے اسے ہی گھور رہے تھے۔ ربیعہ کا دل اس کے لیے کانٹا بن گیا۔
 نکالنا تھا پر لمحہ بھر میں پسینہ پٹکنے لگا۔

اسے وہ پر خلوص نوجوان یاد آیا، جس کی موجودگی اس کے لیے نجات تھی۔ بائیس تھیں۔ وہ بوڑھے میاں بیوی بھی اس کے ہم سفر تھے۔ جواب کپار ٹمنٹ میں نہ تھے۔
 وہ جانے کتنی دیر سوئی تھی۔ رستے میں کون کون سے اسٹیشن آکر گزر گئے تھے اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ کون سے ہم سفر کا ساتھ کہاں چھوٹا تھا اسے علم نہ تھا۔
 اور اب جو وہ اشخاص سامنے موجود تھے ان کی نظریں اسے چمیدے ڈال رہی تھیں۔ اس نے اپنی سیاہ چادر کا پلوڑا سا آگے کھینچ کر چہرہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔
 وہ دونوں ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ربیعہ سخت پریشان ہو گئی لیکن وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کی پریشانی اس کے کسی انداز سے عیاں نہ ہو۔ اسے یاد آیا۔ اس کے ہینڈ بیگ میں ایک رسالہ تھا جو اس نے سفر کے دوران وقت گزاری کے خیال سے سمعیہ سے لے کر بیگ میں رکھ لیا۔
 اکیکھاتے ہوئے ہاتھوں کو اس نے چادر کے اندر رکھ کر ان کی کھانسی کو سننے کی کوشش کی۔
 نکال کر بیگ کی زپ کھولنے لگی۔

اس کی نگاہ اٹھی تو اسے احساس ہوا وہ اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ربیعہ نے اپنے ہاتھ دیکھے۔
 سیاہ چادر کے اندر سے سفید کنول جیسے ہاتھ یوں نکلے ہوئے تھے جیسے گھنی رات میں بادلوں میں سے چاند نکل آئے۔ اس نے ٹافٹ رسالہ نکالا اور ہاتھ دوبارہ چادر میں لپیٹ لیے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اپنا چہرہ بھی چادر میں چھپالے لیکن اب ایسا کرنا حماقت کے زمرے میں آتا۔

رسالہ کھول کر اس نے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ اسے الفاظ دکھائی نہ دیے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔
 ”میں اس قدر خوفزدہ کیوں ہو رہی ہوں؟“ اس نے خود کو کیوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

”یہ صرف مجھے دیکھ ہی سکتے ہیں نا۔ نگاہوں سے کوئی کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتا۔“
 ”شاید اس کپار ٹمنٹ کی تنہائی اور باہر پھیلی سیاہی سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں میں کسی جھگڑ میں تو نہیں ہوں نا۔“
 اس نے اپنے آپ کو ڈھیروں تسلیاں دے ڈالیں۔

”کہاں جاؤ گی؟“ یکایک ان میں سے ایک آدمی اپنی بھاری آواز اور کرخت لب و لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔
 ربیعہ نے بد مزگی سے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اسے انداز تھا کہ وہ درجہ برا محسوس ہوا تھا۔ ”جی؟ مجھے کچھ کہا آپ نے؟“
 اسے خود پر حیرت ہوئی۔ خوف کے اس عالم میں بھی وہ اتنے اعتماد سے گفتگو کر سکتی تھی اسے اس سے پیشتر اندازہ نہ تھا۔

”پوچھا ہے کہاں جاؤ گی؟“ اس شخص پر ربیعہ کے رویے کا مطلق اثر نہ ہوا۔
 ربیعہ نے اسے کوئی سخت جواب دینا چاہا پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔
 ”لاہور۔“ وہ مختصراً بولی۔

دونوں نے اس کا جواب سن کر نجانے کیوں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔
 ”اکیلی ہو؟“ اگلا سوال سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گئی۔
 رسالہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑا۔ ربیعہ نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے وہ سوال سنا ہی نہ ہو۔ وہ جھک کر حالہ اٹھانے لگی۔

اکیلی ہو؟ سوال پھر دہرایا گیا۔
 ربیعہ کا دل اس سوال پر سن ہونے لگا۔
 ”جی نہیں میں ہوں ان کے ساتھ“ برتھ سے عباد نے سر نکالا۔
 اسے دونوں نے حیرانی سے اوپر دیکھا اور ان کے چہرے اتر گئے۔ وہ برتھ سے نیچے اتر آیا۔
 ”بقیہ آپ کو ہینڈ بیگ سے کر لیں۔“ ہینڈ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ قدرے ترش لہجے میں بولا۔
 ربیعہ کی جیبوں میں اس کے آنسو بھر آئے۔ اسے دنیا صاف نظر آنے لگی تھی۔
 وہ دونوں کو سارے منہ سے منگوا گیا تھا۔ ان کے چلے انہیں اجڑا اور دیہاتی ظاہر کرتے تھے۔ عباد کے امیرانہ انداز نے ربیعہ کو غصہ کیا۔

”کچھ نہیں سائیں! ہم تو یوں ہی بنی ہوئی ہیں۔“ عباد نے کہا۔
 ”کچھ نہیں سائیں! ہم تو یوں ہی بنی ہوئی ہیں۔“ عباد نے کہا۔
 ”ہاں میں کھڑے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھا۔“
 ”تھینک یو۔“ اس نے منمننا کر کہا۔
 اس سے زیادہ کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔
 ”ویل کم۔“ رسالہ سیدھا کر لیں۔ اس نے سرگوشی کی۔
 ربیعہ نے ہڑبڑا کر رسالہ سیدھا کیا تھا۔



”مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ اس نے دہائی دی۔
 ”کچھ ہو گا تو نظر آئے گا۔“ حمزہ مزے سے بولا۔ ”اپنا رول نمبر انہی کو نظر آتا ہے جن کا رول نمبر چھپتا ہے۔“
 ”خدا کے لیے حمزہ! بری بری باتیں مت کرو۔“ ورنہ وہ ہاسی ہو گئی۔ ”میں نے دن رات ایک کر دیے تھے۔ میں فیل تو نہیں ہو سکتی۔“

”مندرے جاواں ان ہی خوش گمانیوں میں کوئی چیز تو کھلاؤ۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”جب اتنا ہی یقین ہے تو پہلے منہ میٹھا ہو جائے۔“

”تم دیکھو نا علی! پلینز“ ورہ نے اخبار اسے تھمانے کی کوشش کی۔
 ”ورہ آلی! میری قریب کی نظر کمزور ہے۔ میں بے وجہ ہی کہہ دوں گا کہ آپ پاس ہیں۔ بعد میں آپ کا دل ٹوٹے گا۔“

”نئے منہ!“ ناعمہ نے بھنا کر اخبار چھینا۔ ”تم دونوں تو ہو ہی بد شگونے! اچھی بات منہ پہ آہی نہیں سکتی۔“
 ”حقیقت چھپ نہیں سکتی بناؤٹ کے اصولوں سے۔“ اس نے تدبر سے سر ہلایا۔
 ”کہ گھبرایا نہیں کرتے کبھی چند ایک پسلیوں سے۔“ حمزہ نے ٹکڑا لگایا۔

ناعمہ اخبار پر جھکی ہوئی تھی۔
 ”لاؤ ناعمہ! میں دیکھتا ہوں۔“ رافع کے نرم لہجے پر اس نے سر اٹھایا۔
 ”رافع بھائی! وہ خوش ہو گئی۔“ آپ دیکھیں نا۔ یہ ورہ آلی کے تو حواس مٹنے ہو جاتے ہیں رزائیکے کاسن کر۔
 اوپر سے یہ دونوں بد تمیز انہیں اور تنگ کر رہے ہیں۔“

”لیجئے! پورے شہر میں جوار ہو کر تو اخبار لاتے ہیں۔ اس کا یہ صلہ کیا؟“ علی نے آنکھیں پٹیٹائیں۔
 منہ بد تمیز بد شگونے“ علی! اب از نوئی نوڈ۔“ حمزہ نے منہ پر ہاتھ پٹیا۔

”میری ڈاڑھی بڑی اب نوڈیٹ ہے چھوٹے بھائی! نوڈوٹس۔“ اس نے سر ہلایا۔
 ”مبارک ہو!“ رافع نے رول نمبر ڈھونڈ کر اس کے گرد دائرہ کھینچا۔ ”فرسٹ ڈویژن ویل ڈن ورہ!“
 ”ہرے ہرے۔“ ناعمہ کے ساتھ وہ دونوں بھی تالیاں پیٹنے لگے۔

”دیکھا ورہ آلی! بری بری باتوں کے بعد اچھی چیز اور بھی قیمتی لگتی ہے محسوس کیا آپ نے؟“ ورہ نے حمزہ کے سر پر چیت لگائی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

”جتنے والوں کا منہ کالا“ ناعمہ نے منہ چڑایا۔
 ”ارے جلتے ہیں ہمارے دشمن۔ لاؤ مٹھائی کھلاؤ۔“ علی نے آستین چڑھائیں۔ ورہ دوڑی دوڑی گئی اور کمرے سے کلک کاڈیہ اٹھا کر لے آئی۔

”میں نے منگا کر رکھا تھا۔“ وہ جھینپ کر بولی۔
 ”اور جو سہلی آجاتی تو؟ اس کی کریم سے آنسو پونچھتیں آپ؟“
 ”بس نا! بار بار سہلی کا ذکر۔“ اس کی بارود چڑ گئی۔ سب ہی ہنس دیے۔
 رابعہ بیگم بھی کچن سے نکل آئی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کا سر جو م کر مبارک باد دی۔ ناعمہ رانمہ کو فون کرنے بھاگ کھڑی ہوئی۔

کچھ ہی دیر میں پورے ”حیات ولا“ میں اطلاع پھیل چکی تھی۔ ورہ کو مبارک باد دینے کے لیے سبھی چلے آئے تھے۔ شفیقہ حیات نے اسے بہت خوبصورت جوڑا دیا تھا۔ عذرا بیگم اور فردوس بیگم نے پانچ پانچ سو روپے دیے۔ سناٹم نے نازک سی رسٹ داچ دی۔

”رافع بھائی! جیپ ڈھیلی کریں۔“ علی نے سرگوشی کی تھی۔
 ”ناست کئی ہوئی چیز کیسے ڈھیلی ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”کل صدر میں کٹ گئی تھی۔“
 ”کتنی تو وہ ہے جو اڑ رہی ہو۔ ہلکے پن سے اڑ رہی تھی کیا؟“
 سب کو ہنسی آگئی تھی۔

PIOTO

”چلو بجتی وردی۔ تمہارا گفٹ ادھار رہا۔“ رافع کو اعلان کرنا پڑا۔
 ”ادھار؟ یہ تو کسی قسم کی قینچی کا نام ہے یا؟“ حمزہ نے کان کھجایا۔
 ”بد معاشو! نمٹوں گا تم سے۔“ رافع مسکرایا۔



فاروق حسن نے چائے کا کپ سامنے رکھتی عریشہ کو ایک نگاہ دیکھا۔
 ڈارک پریل کپڑوں میں اس کی گلابی رنگت چمک رہی تھی۔ غلابی آنکھوں میں اب تک نیند کا خمار تھا۔ باپ کو چائے دے کر وہ اب اپنے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔

”یونیورسٹی کب سے جاؤ گی؟“ انہوں نے کچھ دیر سوچتے ہوئے پوچھا۔
 ”بس بابا۔ اگلے ماہ سے کلاسز اسٹارٹ ہیں۔ پھر مصروفیت ہی مصروفیت“
 ”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ اپنی ناعمہ بھی تو تمہارے ساتھ ہے؟“
 ”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”نانیہ اور ناعمہ میرے ساتھ ہیں لن کے اور میرے سبھی کلاس بھی جیسے ہیں۔“

اس نے بتانے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر اندر چلی گئی تھی۔ اور تب ہی کچن سے فردوس بیگم برآمد ہوئیں۔
 ”یہ ان کا مخصوص ٹھکانا تھا۔“ وہ ان کے قریب آ بیٹھیں۔

”ارے بجتی کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا کرو یہ جوڑ تو بالکل ہی بے کار ہوئے جاتے ہیں کم بخت۔“ وہ اپنا کاندھا دبانے لگیں۔

فاروق حسن نے جتنے کپ سے انہیں دیکھا۔
 ”تم سے کپ آپ کے والے تمہارا۔ شام کو فارغ ہو تا ہے۔“
 ”عشقیہ! تمہارے کپ میں تو ماں کو پوچھیں۔“ وہ منہ ہی منہ میں بدبوائیں۔

فاروق حسن نے کپ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔
 ”آپ کے ہمارے کپ کیسا غائب ہو گئے ہیں؟ آفس جانے کاسن کر ان کی سٹیگم ہو گئی کیا؟“ انہوں نے

”ارے اسے چھوڑ دو اس کے حال پر وہ نہیں سدھرنے کا۔ جنے کہاں غائب ہے اس دن سے۔ اب کسی وقت فقیروں کا سا حلیہ لیے کھڑا ہو گا میرے سر پر۔“ انہوں نے جل کر کہا۔

”انہیں اس حال تک پہنچانے کا کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے فردوس بیگم!“ انہوں نے اخبار تھمے کیا۔ ”ایک وقت تھا جب آپ ان کے خلاف ایک لفظ کہنے والے کی گردن پکڑ لیتی تھیں۔ آج ان کے ذکر پر آپ کی اپنی گردن جھک جاتی ہے۔ وقت کسی کو معاف نہیں کرتا۔“

”میاں! اٹم میزے قصور معاف کرو۔“ انہوں نے تنک کر ہاتھ جوڑے۔ ”تمہارے قریب آ بیٹھنا تو ایسا ہے جیسے بندہ قبر میں جا لیٹے اور منکر نکیر سرہانے کھڑے ہوں۔ بس ہر وقت (وقت) ہمارا اعمال نامہ ہی تمہارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

فاروق حسن کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ آ گئی۔
 ”آپ کو کبھی احساس نہیں ہوتا کہ اپنے بھائی کے اس بگاڑ میں آپ کس قدر حصہ دار ہیں؟ ایک اچھے بھلے فرد

”آپ کو کبھی احساس نہیں ہوتا کہ اپنے بھائی کے اس بگاڑ میں آپ کس قدر حصہ دار ہیں؟ ایک اچھے بھلے فرد

کو بے جا طرف داریوں اور لاڈ پیار سے آپ نے ناکارہ بنا دیا۔ اب نہ وہ معاشرے کو قبول کرنے پر تیار ہے اور نہ معاشرہ اسے۔ آپ کامل نہیں دکھتا؟“

”میرا ہی قصور نظر آتا ہے تمہیں، وہ وقت بھول گئے جب میرا غریب بھائی چمکوں پہ کھوکھوں روتا تھا۔ سدھرنے کی قسمیں کھاتا تھا۔ ہاتھ جوڑتا پھرتا تھا ایک ایک کے سامنے۔ تب تمہارا جی دکھا تھا یا تمہاری اماں اور بہن کو ترس آیا تھا اس پر؟“

”آپ تو نہ کہیں ایسے۔ مجھے خالہ جانی چڑاتی ہیں شاعر کہہ کر۔“ اس نے برا سا منہ بنایا۔
 ”رہنی؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ”یعنی کچی کچی پوسٹ ملی ہوئی ہے۔ تو یار کن سوچوں میں گم رہتے ہو تم؟“
 ”ہاں۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ ”مومن واپس چلا گیا اپنے گھر؟“ ہانسم کو لگا جیسے اس نے بات بنائی تھی۔
 ”ہاں۔۔۔ مومن اپنے گھر چلا گیا۔“
 ”وی آر گڈ فرینڈز۔“

”وقت نے اجازت دی۔“ وہ برعکس آیا۔ ”وقت کا بتی تو کھیل ہے سارا شہلا جی!“
گرے لباس کی چمک لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور اس کا ہنستا مسکراتا دلکش چہرہ اس کے تصور میں ابھر رہا تھا۔

”بیجے جناب! منزل آپہنچی ہے۔ دس منٹ بعد ہم لاہور اسٹیشن پر کھڑے ہوں گے۔“ عباد نے کہا تو ربیعہ کا دل غیر مانوس انداز میں دھڑک اٹھا۔
”اپنا سامان چیک کر لیں۔ میں آپ کے لیے بھی ایک عدد قلی ہارز کر لیتا ہوں۔“ وہ مذاقاً بولا تو ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔

”کون لینے آئے گا تمہیں؟“ کیا ایک اس نے پوچھا۔

”مجھے۔“ وہ انکی۔ ”مجھے شاید۔ پھیچا جی۔ یا۔ شاید۔ شاید۔“

عباد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا پھر خاموش ہو رہا۔

اسٹیشن پر اتر کر ربیعہ کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا ”قطعا“ خالی۔ عباد نے اس کا سامان قلی سے اٹھایا اور وہ

لوگ وینٹنگ ہال میں پہنچ گئے۔

ربیعہ بار بار اسے دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے جیسی جیسی بددی ماند

تھا۔ وہ اس کے لیے تحفظ کا احساس تھا۔

”تم نے اپنی آمد کی اطلاع کر دی تھی؟“ عباد نے پوچھا۔

”ہاں“ تار بھیجا تھا۔

”تار۔؟“ اسے اچنبھا ہوا۔ ”فون وغیرہ۔ میرا مطلب ہے کوئی بدکلیئر صورت حال؟ کس کو آتا ہے؟“

کب آتا ہے؟ تم پہچانتی تو ہونا نہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور وہ تمہیں؟“

سر دوبارہ نفی میں ہلا تھا۔

”مالی گاڈ!“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ”پچاس برس پرانی دوشیزہ! تم ٹپکی کہاں سے آئی؟“

ربیعہ نے جھٹ مٹھی میں دلی پرچی اسے سمجھادی۔ عباد کاغذ سیدھا کرنے پر پڑھنے لگا پھر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے یہ پتا درست ہے؟“

ربیعہ کا سر پھر نفی میں ہلا تھا۔

عباد نے سر ہٹام لیا۔

دو گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد وہ اصل مکان ڈھونڈ پائے تھے۔ دونوں تھکن سے چور تھے۔ ربیعہ نے بالآخر

اسے اپنی مختصر ترین داستان سنا دی تھی اور عباد اس کی ہمت اور حوصلے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

ربیعہ کے پاس موجود پتہ ایک نہایت خستہ حال پرانے مکان کا تھا۔ جہاں سے علم ہوا تھا کہ پچھلے کمین و مکان

بچ کر محلہ تبدیل کر چکے ہیں۔ عباد کی مستقل مزاجی اور بھرپور کوشش سے آخر کار وہ نیا مکان ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب وہ دونوں ایک درمیانے درجے کے مکان کے گھرے سبز رنگ کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے پر ”منور امین“ کی تختی نصب تھی۔

”یہی گھر ہے۔“ ربیعہ نے تصدیق کی۔ ”منور امین میرے پھیچا کا نام ہے۔“

”پھر بھی۔“ تم اپنا اطمینان کر لو میں کھڑا ہوں۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں موجزن بے پایاں خلوص دیکھا۔

”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھلا پاؤں گی بھائی!“ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”بس بھائی کہا ہے نا پھر احسان کیسا؟“ عباد کی آنکھیں چمکیں۔

پھر اس نے جیب سے کارڈ نکالا۔

”یہ کارڈ رکھ لو اس پر میرا موبائل نمبر ہے اور کراچی میں میرے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی۔ کبھی بھی کسی قسم کی ضرورت پڑے تو جھجھکنا مت۔“

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا اور مڑ کر تیل پر انگلی رکھ دی۔

اس کی شلٹ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

دانش روم میں اپنا حلیہ درست کرنے میں اس نے پندرہ بیس منٹ لگائے تھے پھر اپنی کیپ سر پر جماتے ہوئے

دوبارہ چلا۔ بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی سوچ کسی خاص نقطے پر مرکوز نہ تھی۔ وہ بس یونہی

چھوٹی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ چلا جا رہا تھا۔

پارک میں آگے وہ جیب سے چالی نکالتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اس چھوٹی

سفید گاڑی پر جا پڑی۔

اس کے لیے یہ گاڑی برآمد ہوئی اس کے کوپنی چالی دوبارہ جیب میں ڈال لی اور قدم اٹھا کر اس سفید گاڑی

کی طرف بڑھا۔ سفید جالی کے لباس میں لمبوس و سینٹ سے سرنگائے چہرے کو

بڑے سے سفید ہیٹ سے ڈھانپے بیٹھی تھی۔

یہ شاید نہایت طویل انتظار کا اظہار تھا۔

عاشق نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”ہیلو۔ ویل کم سوٹ ہارٹ۔“ ہیٹ میں سے سریلی آواز برآمد ہوئی تھی۔

”واہ! آ اسٹوڈیو! از دس لڑا؟“ اس نے اس کے چہرے پر سے ہیٹ اتار دیا۔ اس نے اپنی خوبصورت مخمور

نگاہوں سے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”اسٹوڈیو؟“ وہ ہنسی۔ ”اٹ از لومانی ڈار لنگ۔“

عاشق نے بے بسی سے سر ہلادیا۔

سچ تھا تو اس سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھریبچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا ہونا اور شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائی شہید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہے کہ بقیہ با اس کی بچو پھو ہیں اور ان کا ایڈریس یا کردہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط یہ کردہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منبیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔

ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے تنگ آ کر اپنی بچھو کے گھرا ہور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ ربیعہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تنہا سفر کر رہی ہے وہ از خود اس کی بچھو کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ داری لے لیتا ہے۔

عاشرا (یقیناً کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی میں بیٹھی اس کی منتظر تھی۔

نویں قسط

لباس تبدیل کر کے وہ باہر نکلا تو وہ صوفے پر نیم دراز لی وی دیکھ رہی تھی۔ عاشرا سے گہری نظروں سے دیکھ ہوئے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھا۔

لزا نے لی وی کا والیوم دھیمّا کر دیا اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تم کیوں میرے لیے اتنی زحمت کرتی ہو لزا؟“ عاشرا نے مدھم لہجے میں کہا۔

”تمہارے آفس سے میری فیکٹری تک کا روٹ کتنا لمبا ہے پھر ہماری ٹائمنگز میں اچھا بھلا فرق ہے۔ میرے پاس کار ہے میں خود یہاں تک آسکتا ہوں۔ پھر تم یہ زحمت کیسے کرتی ہو؟“ لزا نے اذیت سے منہ منسوب کیا۔

”جو وقت تمہارے بغیر گزرے۔ وہ مجھے فضول ہی لگتا ہے عاشرا! وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ”تمہا کستان گئے تو تم پاگل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ آفس سے مجھے دو مرتبہ وارنگ دی گئی تھی میں اپنا کام صحیح طریقے سے نہیں کرتی۔ مجھے شدید ڈپریشن ہو گیا تھا۔ پھر تم لوٹ آئے سب کچھ ٹھیک ہو گیا بالکل ٹھیک!“

وہ مسکرا دی۔ اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔

”تم غلطی کر رہی ہو لزا! پچھتاؤ گی!“ وہ اپنی آستین کے مٹن بند کرتے ہوئے بولا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر آ بیٹھی اور اس کے گلے میں بائیں حائل کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان کے بالوں پر رکھ لیا۔

”پچھتاؤ وہ ہے عاشرا! جو غلط کو صحیح سمجھ کر کرتا ہے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ اس کا زیادہ سے زیادہ خطرناک سے خطرناک نتیجہ کیا نکلے گا۔ مجھے اندازہ ہے۔ پھر بھلا پچھتاؤ کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔

پچھتاؤ ہے سے پہلے ہی خود کشی کر لوں گی۔“

عاشرا نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا چلو کافی بناؤ میں بہت تھک گیا ہوں۔“ اس نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔

وہ اس کے مزید قریب آنے لگی۔

”الزبتھ!“ عاشرا کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

”عجیب مرد ہوتا ہے۔“ وہ علیحدہ ہو کر پھیکے سے لہجے میں ہنسی ”تمہیں اپنی بیوی سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی فرق نہیں پڑتا؟ شاید تم اپنی بیوی سے بہت زیادہ ڈرتے ہو۔ ذہنی طور پر خوف زدہ ہو۔ ہاں؟“

”ہاں۔ میں اپنی بیوی سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اب جاؤ کافی تیار کر کے لاؤ۔“

وہ برا سامنے بنا کر اٹھ گئی اور ذرا سے فاصلے پر بنے کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جہاں چولہے نصب تھے اور چند کینشس نے وہاں چھوٹے سے کچن کی صورت اختیار کر لی تھی۔

عاشراؤں بھلا کر لیٹ گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسے غیند آرہی تھی۔ لزا کے کافی بنا کر لانے تک وہ سوچکا تھا۔

یہاں تک کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

یار! کیا ملاقات ہے یہ؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”چپ چاپ رہو۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

”یار۔“ عاشرا نے اسے پرے دھکیلا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”میں کرو نکاح پر دھوا ہوا مجھ سے۔ کم سے کم یہ احساس

”کیسے؟“ اس نے حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ عاشرا مسکرا دیا۔

”تم نے مجھ کو کچھ سمجھ کر نہیں سیکھیں۔ اس قسم کے احساس جرم سے تم لوگوں کا واسطہ کم ہی ہوتا ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا تھا۔ الزبتھ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر اس نے ٹاک

”لجھتی ہوئی باتیں نہ کرنا۔“ اس نے آستین سے اشارہ کیا۔

”میرا جی چاہتا ہے میں پاکستان جاؤں۔ وہاں جا کر تم لوگوں کا لائف اسٹائل دیکھوں تمہاری ذہنیت بحیثیت

موم کیا ہے اس کا اندازہ کروں۔ تب کہیں جا کر میں تمہیں مکمل طور پر سمجھ پاؤں گی۔“

عاشرا کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرا دیا۔

”وہاں جانے کا سوچا بھی مت کرو لزا! میرا“

”کیوں؟“ اس نے سر کو استغما میں انداز میں جنبش دی۔

”وہاں گیس تو بچ کر نہ آسکو گی۔ کوئی نہ کوئی پرزد وہیں رہ جائے گا۔“

”سوری؟“ وہ حیران ہوئی۔

عاشرا نے اپنی سوچ پر خود ہی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”وہاں میری بیوی رہتی ہے۔ جو اس قدر خطرناک ہے کہ میں ذہنی طور پر اس سے خوفزدہ رہتا ہوں۔ پھر سوچو کہ وہ کیا کچھ نہ تمہیں ڈھائے گی تم پر؟ تمہاری یہ حسین زلفیں تو ضرور وہیں رہ جائیں گی۔“

”کم آن۔“ اس نے اسے خف سے گھورا۔

اس عورت نے ایک طرف ہو کر اسے رستہ دیا۔ ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک براسرار قسم کے سنائے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وسیع و عریض صحن جامن کے پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ لال رنگ کا فرش ربیعہ کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ وہ اس عورت کی پیروی کرتی اس کے پیچھے چلتی گئی، جو برآمدے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

برآمدے میں اندھیرا تھا۔ ربیعہ کی آنکھوں کو سکون میسر آیا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا سامنے لائن سے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ برآمدے کے ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جو لمبے پر رکھی پٹیلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے نیچے کافی تیز آنچ تھی۔ وہ عورت شاید کچھ رکاتے رکاتے دروازے تک گئی تھی۔ باورچی خانے کے مخالف سمت میں چھوٹا اسٹور تھا۔ جس میں رکھے ہوئے رنگ دکھائی دے رہے تھے۔

”مینا! کون ہے۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ ارے میں کب سے پوچھ رہا ہوں، کون ہے؟۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔“

ربیعہ جھپک اٹھی تھی۔ کونے والے کمرے سے بے تحاشا کھانستے ہوئے کوئی شخص پوچھ رہا تھا۔

”کون ہے؟“ اس نے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔

”میں کیسی بچی ہوں، کچھ خطوط میں اس نام کی عورت کا تذکرہ تھا۔ مینا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”او! نہیں، بالکل بلار ہے ہیں۔“ ان کے انداز میں تشویش تھی۔

ربیعہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہر قدم پر ایک نیا امتحان منتظر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے

کمرے کے دروازے پر ایک جھونکے نے اس کا سر چکرا دیا۔ ایک لمبے کے لیے اس کے قدم

وہ ایک غلطی سے نہایت زیادہ صغ کے پنگ پر پڑ گئی ہوئی میلی کپڑی چادر پر ایک لاغری شخص پڑا تھا

اس کے وجود سے کراہیں محسوس ہوئیں۔ کپڑے کی پٹائی سے بدلو کے پھلے اٹھ رہے تھے۔

ربیعہ نے نہ جانتے ہوئے کپڑے کا پلوٹا کر رکھ لیا۔

”میں نے نہ جانتے ہوئے کپڑے سے چھما۔ ربیعہ کے عمل نے شاید اسے طیش دلایا تھا۔

”پہچانو۔۔۔ وہ خاتون نہیں۔“ انہوں نے اسے دیکھا۔

اس شخص نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”میں۔۔۔ میں ربیعہ ہوں۔ ربیعہ جہاں رہ رہا۔“

”کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔ کھوں۔“ منور امین پر یکایک ہی کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

مینا نے آگے بڑھ کر وہ بالٹی اٹھا لی جو غلاظت کے ڈھیر سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر لے گئیں۔

ربیعہ کو بے حد سکون کا احساس ہوا۔ بدبو کے تھپیڑوں میں بہت کی واقع ہوئی تھی۔

”تم۔۔۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

ابھی وہ خود کو سنبھال ہی رہی تھی کہ منور امین نے ترش لمبے میں پوچھا۔ ربیعہ یکدم ہی گڑبڑا گئی۔

”جی۔۔۔ وہ میں۔۔۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”شاید بڑھیا گزر گئی۔“ اچانک ہی وہ ہنسے۔

ربیعہ ایک سنائے میں رہ گئی۔ ان کا جملہ اسے چیرتے ہوئے گزرا تھا۔ اس پر وہ طنز نہ ہنسی اسے اچانک ہی

”بھئی ہمارے ہاں یہی رواج ہے۔۔۔“ اسے سوچ کر منہ آ رہا تھا۔ ”میاں کی سہیلیوں کے بال خاص طور پر نشان بنائے جاتے ہیں۔“

لڑائے غیر ارادی طور پر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

”ان ہی زنجیروں میں مقید کرتی ہوں تاں لوگ اپنے شکار کو؟“

”یو سلی مین!“ لڑائے اس کا مذاق سمجھتے ہوئے اسے گھورا ”اب تو میں ضرور جاؤں گی پاکستان اور تمہاری بیوی سے تو خاص طور پر ملوں گی۔۔۔ دیکھوں تو تمہارے جیسے ڈیشننگ پر سنائی رکھنے والے مرد نے کس طرح کی عورت کا انتخاب کیا ہے۔“

عاشق کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔

ان آنکھوں میں ایک چاند چہرے کا تصور ابھر رہا تھا۔

دروازے کے ساتھ دیوار پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر کند ان الفاظ نے اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا

جانے کیوں منزل پر پہنچ کر اس کا جی رونے کے لیے چل اٹھا۔ گہرے گہرے سانس بھرنے میں نے خود پر قابو پانے کی

کوشش کرتے ہوئے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ بند کیوں اور بٹن دیا۔ کال بیل شاید بیرونی دیوار سے

ملحقہ صحن میں ہی نصب تھی۔ ”ٹائ!“ کی کرخت آواز نے خود ربیعہ کو ہی سنا دیا۔ جامن کے پیڑ پر بیٹھے

پرندے بھی اڑے تھے۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ربیعہ نے متذبذب ہو کر ذرا سامڑ کر دیکھا۔

بیٹھا عباد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ کو قدرے اطمینان ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بٹن دبایا۔

”کون ہے؟“ یکایک کال بیل سے زیادہ کرخت آواز گیت کے قریب بھر گئی۔

ربیعہ نے جواب دینے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

کسی نے بے حد جارحانہ انداز میں دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ پھر ربیعہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ عورت

شاک سے دوچار ہوئی ہو۔

چالیس پینتالیس کے سن والی وہ عورت سانولی رنگت اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں تھیں۔

سخت تاثر لیے ہوئے تھیں۔ موٹے موٹے لبوں کے گوشوں پر سخت مزاجی سے گہری سلوٹیں بڑ گئی تھیں۔ بال

وسفید کا ایسا امتزاج تھے کہ ان کو نظر بھر کر دیکھ لینے سے جھجھکی سی آتی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک شک مزاج اور

سخت گیر خاتون نظر آتی تھیں۔

ربیعہ کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے یوں تک رہی تھیں گویا پتھر کی ہوں۔

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ عباد ہنوز حالت انتظار میں تھا۔

”مم۔۔۔ میرا نام ربیعہ ہے۔ ربیعہ جہاں رہ رہا۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”جانتی ہوں!“ اس بہت سے یکایک تنفر بھری سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔ ربیعہ چونک اٹھی۔ اس

لیے یہ حیران کن بات تھی۔

”آپ؟۔۔۔ آپ کون ہیں؟“ ربیعہ نے اس کی پتھر آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

”اندرا آجاؤ۔ کون ہے تمہارے ساتھ؟“ اس کی نگاہیں اب ربیعہ کے عقب میں دیکھ رہی تھیں۔

”کک۔۔۔ کوئی نہیں۔“ وہ ہٹکا کر رہ گئی۔

احساس ہوا کہ اس نے وہاں آکر غلطی کی ہے۔
وہ اب تک ہنس رہے تھے۔ رسیہ کے اندر غم وغصے کا طوفان اٹھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس اپنا سامان کہاں رکھا تھا۔ وہ شاید برآمدے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔
وہ مڑ کر دروازے تک پہنچی تو یکایک ان کی ہنسی رک گئی۔
”مینا مینا بچی کے لیے کھانا بناؤ۔ بے چاری تھک گئی ہوگی۔“
وہ پیچھے سے بولے تھے۔

فون کی بیل بہت دیر سے بج رہی تھی۔ جھنجھلائی ہوئی عریشہ ہاتھ روم سے برآمد ہوئی۔ اس کے چلنے سے ہوتا تھا کہ اس نے بے حد عجلت میں کپڑے پہنے تھے۔ کیلے بال اس کی ٹیپس میں پھنسے ہوئے تھے اور کپڑے سے جکے ہوئے تھے۔

”ہیلو! اس نے ریسور اٹھایا۔“

”جی و علیکم ہیلو! دوسری طرف سے چمکتے ہوئے کہا گیا۔“

عریشہ لمحہ بھر کو متعجب ہوئی۔

”جی۔۔۔ کون؟“ وہ محتاط ہوئی۔

”انتظار کی سوئی رہ لگتا جاں باب۔“ سرد آہ بھرتے ہوئے گداز لہجے میں کہا گیا۔

”مجھے تو محلے کے چھبے پر لٹکے فیوزیل معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

”ہا ہا۔۔۔ ویل سیڈ ویل سیڈ۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محترمہ جس مزاج بھی رکھتی ہیں! ادھر سے سراہا گیا۔“

”جی میں خدا کے فضل و کرم سے تین عدد جوان بھائی بھی رکھتی ہوں۔“ ٹکڑے قسم کے جملے بولے۔

”کوئی بات نہیں۔“ بیٹھے لہجے میں فرمایا گیا۔ ”بھائیوں پر چنداں اعتراض نہیں۔ بس اتنا خیال رہے کہ برداشت نہ ہوگا۔ جیسے روساہ کہتے ہیں۔“

عریشہ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔

”اس بد تمیزی کا مقصد کیا ہے آخر؟ آپ ہیں کون؟“ وہ بڑا بولا گیا۔

”در حسن پر صدا دیتا گدا۔“ بھرپور آواز لگائی گئی۔

”گدھا؟“ عریشہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ”جی ہاں جی ہاں۔۔۔ میں نے پہچان لیا۔ آواز ہے۔“

”فرہاد کی آواز قصر شیریں میں محض شیریں ہی پہچان پاتی ہے۔“ وہاں ہنسی قسم کی شرمندگی کا شائبہ سمجھنے

”ورنہ ہم تو ہفتہ بھر سے کالیں ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کے ٹیلیفون کے دربان کی آواز بہت بے سُر کی ہے شیریں۔“

یہ کام آپ سنبھال لیجئے۔“

”اے مسٹر! آپ ذرا اپنی زبان سنبھالیں۔ دو باتیں کیا کر لیں آپ تو منہ کو آنے لگے۔“

”اجی ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“

اس کے کانوں میں وہ لہجہ اور وہ جملہ گونج رہا تھا۔ اسے گلف مارکیٹ تک کا سفر یاد آگیا۔

”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے!“

”ہائے اللہ!“ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سرٹ بھاگی۔

اپنے پورشن سے نکل کر وہ اپنی پیچھے کے پورشن کی طرف آئی تھی۔
”ارے ارے بچی۔ کہاں دوڑی جاتی ہے۔ سائنس تو سمجھ۔“ شفیقہ حیات دروازے پر ہی مل گئیں۔
”السلام علیکم دادی جان!“ وہ دادی کو دیکھ کر ٹھہری۔
”و علیکم السلام۔ جیتی رہو۔ کون سی بلا دیکھ لی؟“ وہ شاید واپس جا رہی تھیں ”میوں ہانپتی کا پتی پھرتی ہو۔“
”وہ۔۔۔ میں تو ناعمہ سے ملنے آئی تھی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”ہاں تو بچی! خدا نے پیر دیے ہیں پر نہیں دے! چلو مگر اڑو مت!“ وہ نکل گئیں۔

دروازے پر ہی کلاس لے لی گئی تھی اس لیے وہ خود کو قابو میں رکھ کر اندر داخل ہوئی۔ لاؤنج میں بیٹھی پیچھو کو

سام کرتی وہ بچن کی جانب بڑھ گئی جہاں دروازے پر کڑھی میں ڈالتی جا رہی تھی۔

”ہائے۔۔۔ کڑھی۔“ عریشہ چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول گئی۔

”تم کب آئیں عریشہ؟“ ورنہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا ”ناعمہ کڑھی لے کر تمہاری طرف آنے والی تھی۔“

”اور اس بچی خوشبو سے میں خود نکھنچی چلی آئی۔“ عریشہ۔ خالی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”ذرا

پیکھا کھا۔“

ورنہ کھنائی ہوئی کڑھی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ عریشہ وہیں بیٹھ کر کڑھی کھانے میں مشغول ہو گئی۔

ناعمہ بچن سے ڈالتی ہوئی تو چونک اٹھی۔

”ہائیں میں تو تم سے ملنے آرہی تھی۔“

”ہاں تو تمہیں تو کڑھی کھا کر جا رہی ہوں۔“ وہ انگلی سے خالی پلیٹ چاٹنے میں مشغول تھی۔

”کڑھی کھا کر آئی تھی۔“ ناعمہ نے اسے گھورا۔

”آں نہیں۔ اصل بات یاد آئی تو وہ سٹپٹا گئی۔“ وہ تو میں تمہیں۔۔۔“

پھر وہ شرمندہ ہو کر رو کر کہنے لگی ”اس نے اپنا راز افاش کرنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھوں ہی آنکھوں

میں اسے اشارے سے کہنے لگی۔“

”یہ کیسے دیدے منکار رہی ہو؟“ ناعمہ نے اسے گھورا۔

”جیسے کہ میں نے کہا۔“ ورنہ نے بھی دیکھ کر اور مسکراتے لگی۔

”کیا بات ہے عریشہ؟“ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟“

”نہیں۔ نہیں تو ورنہ آئی۔ میں میں تو۔“

ناعمہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ورنہ ڈونگے میں کڑھی نکال کر عذر ایگم کو دینے کے خیال سے چل دی۔

عریشہ نے لپک کر ایک دھمک کا ناعمہ کی کمر پر رسید کیا۔

”کیسے؟ اب نہیں بتاؤں گی مجھے۔ مرنی رہنا سہیجہ میں۔ میں جا رہی ہوں۔“

ناعمہ نے کمر کی میس برداشت کرتے ہوئے اس کا بازو تھاما۔

”اچھا تا تم کو بھی غصہ لیکن اسے ہی منہ پر۔“

عریشہ کو ہنسی آگئی۔ دونوں بچن سے نکل کر کمرے میں چلی آئی تھیں۔

”اب بولو کیا بات ہے؟“ ناعمہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

”تیرے اس ڈرا سیور کا فون آیا تھا۔“

”میرا ڈرا سیور؟“ ناعمہ حیرت سے قطعاً ”فراموش کر چکی تھی! لہجہ کر بولی۔“

”وہی سوک والا۔“ وہ جل کر ہوئی۔

”ہائے“ ناعمہ نے دل تھام لیا۔ ”اس نے کیوں فون کیا؟ اور اس کے پاس نمبر کہاں سے آیا؟“

”گھر تک پہنچا جو کیا تھا منحوسوں نے۔ نمبر پر نہ کرنا کیا مشکل ہے اور رہی بات کہ فون کیوں کیا تھا تو اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔“

”تو نے پوچھا ہوتا۔“ ناعمہ نے شوخی سے اسے چھیڑا۔

”اگلی مرتبہ تیرا نمبر دلوں گی۔ پوچھ لینا۔“

”نمبر ضرور دینا لیکن جو تے کا۔“ ناعمہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو چھکے چھڑاؤں گی موصوف کے ناعمہ علی خان نام ہے میرا۔“

”کہتا تھا ہفتہ بھر سے فون کر رہا ہے۔“ عریشہ نے فکر مندی سے کہا۔ ”نبانے اس کی ڈمب کالز کس نے رکھی ہوں گی۔“

”سی ایل آئی پر نمبر تو آیا ہو گا نا؟“ ناعمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ لیکن موبائل نمبر ہے۔“

”گالیاں دیں؟“ اسے انوکھا خیال سوچھا۔

”شی۔ اس نے بھی جواب میں کچھ کہہ دیا تو کیا عزت رہے۔“

”زبان کھینچ کر ہاتھ پر رکھ دوں گی کہنے کی۔“

”اسی فون سے ہاتھ نکال کر وہ بھی تمہاری کھائی مرو رہے گا۔“ عریشہ طنزاً بولی ”باتیں بناتی ہو۔“

ناعمہ سوچ میں پڑ گئی۔

”خیر کیا کر لے گا؟ دو چار کالیں ہی کرے گا نا۔ پھر علی اور حمزہ کی گالیاں سن کر خود ہی ٹھنڈا ہر دھل جائے گا۔“ وہ لڑکے ہیں لڑکے وہ بھی آج کے دور کے۔ اس سے گھر تک پہنچ جائیں گے اور سر پہیٹھ دیں گے۔ اس کا۔“

”تو پھاڑیں نا۔ اچھا ہے مزہ آئے۔“

”اور جو وہ اس سفر کی داستان سنا ڈالے پھر؟“ وہ جل کر ہوئی تھی۔

”تب کی تباہی دیکھیں گے۔“ اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے گویا قصہ ختم کیا۔ ”جلیکڑ من والا۔“

وہ تیزی سے ساوے صفحے پر قلم چلانے میں مصروف تھا جب کمرے میں کسی کی آمد سے سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں۔

فردوس بیگم اور ماہین کو ایک ساتھ اپنے کمرے میں پا کر اس کا ہاتھ ٹھنکا۔ اس نے قلم کو پھر اسی تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

”آہم۔“ فردوس بیگم نے گلا صاف کیا تھا ہاشم کو مجبوراً ”نظر میں اٹھانی پڑیں۔“

”آئیں امی۔ بیٹھیں۔ بیٹھو ماہین!“ اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں بیٹھتے ہیں۔ بیٹھنے ہی آئے ہیں۔“ فردوس بیگم اپنا نیم خیم وجود سنبھالتے ہوئے صوفے کی جانب بڑھیں۔ ”تم تو ایسے اپنے کمرے کے ہوئے مانو نیا نو لیا دو لہا ہو۔ ہم تو باہر سے تمہارا دروازہ ہی دیکھتے ہیں اب کھلے کہ تب کھلے!“

”بس امی۔ آفس کی طرف سے کام کا کچھ دباؤ ہے آج کل۔“ وہ انگلیاں چٹکانے لگا۔

”چھا!“ وہ نہیں۔ ”ہم بھی اسی دباؤ کی بنا پر آئے ہیں اب تم ہی کچھ مدد کرو ہماری۔“ وہ دونوں اس کے مقابل بیٹھیں ہاشم نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ سو وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”کیسا دباؤ؟“

”کس کس کی سناؤں نیچے۔ تمہارے باوا کا دباؤ ہے وہ کہتے ہیں تم جان کر بیٹا نہیں بیاتھیں۔ جی بھر کر عیش کرنا بیاتھتی ہو اس کی کمائی پر۔ پھر تمہاری دادی کا دباؤ وہ ثانیہ کا رشتہ کھلوالی ہیں بہانوں بہانوں سے۔ ادھر اس غریب کی جان مشکل میں چھنسی ہے۔“

انہوں نے ماہین کی جانب اشارہ کیا۔

”اس کی ساس اپنی عاجزادی کا بوجھ ہلکا کرنے کو کوشاں ہیں۔ انہوں نے تسنیم میاں سے کہلوایا ہے اس لیے صاف صاف انکار کا یا را نہیں ہوتا۔ اب ذرا اجاؤ تم۔ کس کو کیا جواب دیں؟“

ہاشم نے نظریں اٹھا کر ماں اور بہن کے متذذب چہرے کو دیکھے۔

”سب کو ایک ہی جواب دیجئے کہ ہاشم اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اگر اس نے شادی کی تو اس کے لیے جس شخص ایک لڑکی ہے۔“

فردوس بیگم نے قدرے طیش میں آ کر بیٹی کو دیکھا اور کچھ کہنے کو لب واکبے۔

”کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ انسانیت کے نام پر کسی برترس کھانا زیادہ مناسب ہے یا پھر اپنے خونی رشتوں اور اپنے ماں جالیوں کو زندگی بھر کی الجھنوں اور طعنوں سے بچا لینا۔“

ہاشم نے بیٹھوئیں اٹھاتے ہوئے بہن کو دیکھا۔

”ایک باپ کی بیٹی طے ہے مجھ لو ماہین! میں نے محبت ضرور کی ہے اور میں کسی حد تک اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ بس بھئی لیکن میں اپنے جذبوں کے ہاتھوں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔ میں ایک واضح اور منطقی سوچ کے تحت اپنی زندگی گزارنے کیلئے تیار ہوں اور کروں گا۔ دوسری بات یہ کہ میں جذباتی بلکہ میلنگ کا شکار ہونے کو بہت بڑی سبوتوں سے روکتا ہوں۔ بس یہ بیٹھوئیں کوئی کوشش مت کرنا۔“

”تو کونسی سبوتوں سے روکتا ہے؟“

”اپنے دل کی سبوتوں سے۔“

اور آخری فیصلہ ہے ہاں!“

”ٹھیک ہے۔“ وہ آسانی سے مان گیا۔

ان دونوں کے چہروں پر قدرے بے بسی آئی۔

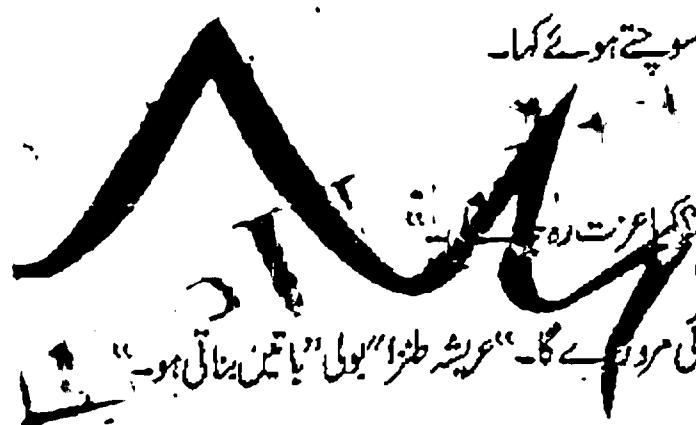
”پھر مجھ سے شادی کرنے کے لیے اصرار مت کیجیے۔“ اس کے اگلے جملے نے دونوں کے منہ لٹکا دیے ”علی اور حمزہ ہاشم اللہ نوجوان ہیں۔ چند ایک سالوں میں شادی کرنے اور گھر سامنے کے قابل ہوں گے۔ شوق سے جہاں چاہیں ان کے رشتے جیتے اور اپنے سب ارمان پورے کریں۔“

”اور تم۔“ بے ساختہ ان کے لبوں سے نکلا۔

”میری خواہش کو اپنی ضد بنا کر مجھ پر زندگی کی خوشیاں حرام کر دیں۔“ وہ اپنے کاغذات کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بے رخی سے بولا۔ ”مجھے اپنی سزا قبول ہے۔“

فردوس بیگم اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دوپٹے کا پلو انہوں نے آنکھوں پر رکھ لیا۔

”ارے کیا کھول کر لیا دیا اس چڑیل نے میرے بچے کو۔“ کلا جاو کر وایا ہے۔ آرسے پونہی تو نہیں رات رات



PHOTO

بھربا غیچہ میں پھرا کرتی تھی 'اری ایتقان! خدا تیرا بھلا کرے۔ میرے بھائی کی زندگی تباہ کی اور اس پچھل پیری گھر کا رستہ دکھا کر میرا پیچہ پاؤلا کر ڈالا۔ ارے میں کہتی ہوں ناروق حسن! آؤ دیکھو اپنے لاڈلے کی گل افشائیاں اس کو پھولوں کا سہرا بیاہ کر لاؤ اس منحوس کو۔'
 'ای۔ ای۔' 'ماہین نے انہیں جھجھوڑا۔' 'خدا کا واسطہ چپ کریں۔' انہوں نے ہڑبڑا کر دوشہ آنکھوں سے ہٹایا۔ ہاتھ کب کا کمرے سے جا چکا تھا۔
 'مستیاناں ہو تیرا جادو کرنی۔' وہ بڑبڑانے لگیں۔



سفید آٹو کو پورچ میں پارک کر کے اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا اپنا سیاہ لیدر بیگ اٹھایا اور گاڑی سے نکل کر اسے لاگ کرنے لگی۔
 آج وہ ہاسپٹل سے مارکیٹ چلی گئی تھی۔ عمر کتنے ہی دن سے ضد کر رہا تھا کہ اسے نئے کلرنگ مارکرز کا سیٹ چاہیے۔ سو آج وہ اس کے لیے مارکرز کا نیا سیٹ لیتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ کھینچ کر اس سے پکارا۔
 'نعم۔ عرصہ دیر آریو مائی چائلڈ!'
 اسے پکارتے ہوئے وہ لاؤنج میں پڑے سیاہ صوفے پر جا بیٹھی۔ اس پر جسم میں دیکھنے کا احساس تھا۔ تنہا سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔
 منیڈر بیگم کچن سے نکل کر آئیں تو وہ صوفے کی پشت سے نکالے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔
 'شہلا! انہوں نے آہستگی سے پکارا۔
 وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ اس کی نگاہ ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی پر گئی۔
 'جیسے میری ماں! وہ خوش ہو گئی۔' 'شدت سے جی چاہ رہا تھا آپ کے ہاتھ کی پیالی چائے پینے کا۔' ان کے لب لہجہ سے تمام لیا۔

'یہ عمر کہاں ہے؟ آواز دینے پر بھی نہیں آیا۔ راجہ کی طرف گیا ہے کیا؟'
 'ہوں! انہوں نے آہستگی سے ہنکارا بھرا۔
 'انیقہ کہاں ہے؟' اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔
 'اپنے کمرے میں ہے۔' وہ آہستگی سے بولیں۔
 یکدم اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے ماں کا چہرہ غور سے دیکھا۔
 'ای۔ ای۔' انہوں نے نگاہیں چرائیں۔
 'ای۔ ای۔' شہلا نے کپ میز پر رکھ دیا۔ 'اوہر دیکھیں میری طرف۔'
 'شہلا! بیٹا دھندلا غور سے میری بات سنو۔' وہ بے بسی سے بالا خر گویا ہوئیں۔
 'ای۔ ای۔' عمر کہاں ہے؟' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
 'بیٹا دھندلا آج دوپہر اس کے اسکول سے پرنسپل کا فون آیا تھا۔'
 شہلا کا چہرہ سننے کی طرح سفید پڑ گیا۔ منیڈر بیگم کے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔
 'نعم۔' اس کے لب کانپے تھے 'کہاں ہے وہ؟'
 'اس کا باپ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی پرنسپل نے یہی کفرم کرنے کے لیے یہاں فون کیا تھا کہ آیا۔'

PHOTO

'وہ۔ وہ۔ اسے لے گیا؟ لے گیا۔ لے گیا۔' اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
 'شہلا! میری بات سن لو۔ ابراہ نے مجھ سے خود بات کی۔ وہ اسے چھوڑ جائے گا۔'
 'وہ لے گیا اسے۔' وہ پانگلوں کی طرح چیخی۔ 'وہ میرا پیچہ لے گیا۔' وہ کٹے ہوئے تنے کی مانند ان کی بانہوں میں گری۔
 'شہلا! شہلا! انیقہ! وہ بے طرح گھبرا کر چیخنے لگیں۔
 انیقہ اپنے کمرے سے نکل کر بھاگی آئی۔
 'آپ نے بتا دیا نا ای! میں نے منع کیا تھا آپ کو۔'
 اس نے شہلا کو صوفے پر لٹایا اور اس کے گال تھپتھپانے لگی۔
 'دیکھا کہتی؟' ان کے آنسو جھرجھریںے لگے۔
 اسی لمحے باہر ایک ٹانوس ہارن بجا۔ ساتھ ہی کال بیل بھی بجی۔ انیقہ نے خوش امید سے ماں کو دیکھا۔
 'میرا خیال ہے عمر آگیا ہے۔' وہ اٹھ کر گیٹ کی جانب بھاگی۔
 اس کا ہندازہ درست تھا۔ عمر گیٹ پر موجود تھا۔ دوڑ جاتی ایک گاڑی کی سرخ بتیاں چمک رہی تھیں۔
 'خالد جانی! وہ چکا۔' وہ میرے بیٹا تھے۔'
 انیقہ اسے بانہوں میں بھر کر اندر چلی آئی۔
 'وہ کون ہے آپ کی ماما کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی ماما کو آواز دے۔ جگاؤ انہیں۔' اس نے عمر کو شہلا کے قریب بٹھا دیا۔

'منہیں! عمر نے ننھے باتوں سے اس کا چہرہ تھما۔' 'ماما! آنکھیں کھولیں نا۔ دیکھیں میں آگیا۔' شہلا نے آہٹیں کھول دیں۔ چند لمحوں کے بعد انیقہ نے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اسے خود سے چمٹا کر زور سے رونے لگی۔
 'امیری جون! وہ چٹا چٹا اس کا چہرہ اور اس کے ہاتھ جو منے لگی۔
 انیقہ نے بوسہ بوسہ کی بجائے چٹائی دی۔ صوفے پر بیٹھی منیڈر بیگم بالکل ساکت تھیں۔ ان کے خالی ہاتھ ان کی گود میں دھرتے تھے۔ ان کی آنکھیں کی آنسوؤں کی قطریں پر مرکوز تھیں۔ آنسو ان کے دل پر گر رہے تھے۔

URDU

اس وقت ان کے دل پر تصویریں بن اور بھر رہی تھیں۔
 وہ ہند آنکھوں کے نیچے آباد ایک جہان سے گزر رہی تھی۔
 کتنی ہی لاتعداد بے شمار تصاویر تھیں۔ متحرک تصاویر مربوط اور غیر مربوط۔
 اس کا چھوٹا سا صحن تھا جس میں ہار سنگھار کا درخت تھا۔ اس کے پھول ربیعہ کے اوپر گر رہے تھے۔ ربیعہ ہنس رہی تھی۔ صحن میں چمچی چارپائی پر وادی اور نفیسہ خالہ بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ربیعہ کی خوشی میں خوش نظر آ رہی تھیں۔
 مجمعہ نے دیوار پر چڑھ کر اسے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ربیعہ اس کے اشارے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یکایک دروازے پر عرفان شوکت نمودار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ حاکم چچا تھے۔ ان دونوں کے چہرے سخت اور آنکھیں لال تھیں۔ ربیعہ کو ان کے ارادے ٹھیک معلوم نہ ہوتے تھے۔ وہ ڈر کر بھاگی تھی۔ ٹرین کے کپے بہت بڑے بڑے تھے۔ ربیعہ کو ان آہنی پنچوں سے خوف محسوس ہوا۔ دانتا ریل گاڑی چٹکھاڑی ربیعہ کی آنکھ یک تخت کھل گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہاتھ پر پسینے کا احساس تھا۔ اسے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ کوئی کمرے

میں دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ ربیعہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں تھی؟ وہ بے حس و حرکت لیٹی ٹائمنوس چھت کو گھورتی رہی جس پر گندہ سا پنگھا لٹکا ہوا تھا۔ سرگوشیوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ چند نفوس اس کے سر ہانے مدھم آوازوں میں جو گفتگو تھے انہیں ربیعہ کے جانے کا علم نہ ہو سکا تھا۔

ربیعہ کو یاد آیا کہ وہ اپنے پیچھا منور امین کے گھر میں تھی۔ وہ سفر سے بے حد تھک گئی تھی اس لیے کھانا کھاتے ہی سو گئی تھی۔ ان دونوں نے اس سے سفر کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔

نجانے وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ اپنی جسمانی کیفیت سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے سوئے ہوئے بہت وقت ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ ذہن مکمل طور پر چوکس تھا اور مزید سونے کی کوئی خواہش محسوس نہ ہو رہی تھی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سرگوشیاں ایک نکتہ معدوم ہو گئیں۔ ربیعہ نے دیکھا اس کے سر ہانے بجھے پلنگ پر تین خواتین موجود تھیں۔ ان میں سے ایک مینا تھیں۔ ایک مینا سے بے حد مشابہ صورت کی بیس سالہ لڑکی تھی جو ان کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ دوسری لڑکی بھی اس کی ہم عمر تھی لیکن اس سے قدرے مختلف۔ وہ تینوں اسے بیدار دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ پھر دوسری لڑکی مسکراتے ہوئے اٹھ کر ربیعہ کی آئی اور اس سے اپٹ گئی۔

”میں ترانہ ہوں۔ تمہاری پیچھو زاد۔“ اس نے کہا تھا۔ اس کے گلے لگ کر ربیعہ کو دواوی کے بعد پہلی مرتبہ کسی خفیہ رشتے کا احساس ہوا تھا۔ اس کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے۔

دوسری لڑکی بھی اٹھ کر اس تک آئی تھی مگر اس نے محض ربیعہ سے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔

”یہ صولت ہے۔ مینا پیچھو کی بیٹی۔“ ترانہ نے بتایا۔ ”مینا پیچھو سے تم مل رہی چکی ہو۔“ ربیعہ نے مسکرا کر صولت کو دیکھا لیکن اس کی آنکھوں سے چپکے سر دھری نے اس کی مسکراہٹ منتشر کر دی۔ صولت اسے عجیب سے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی آنکھوں میں جھانکنے کے بجائے وہ اس کے چہرے کے نقوش کا بغور جائزہ لے رہی تھی جیسے وہ ایک جیتی جاگتی ہستی کو نہیں بلکہ کینوس پر پینٹ کیے گئے کسی چہرے کو دیکھ رہی ہو۔

ربیعہ کنفیوزی ہو گئی۔

”امی کہہ رہی ہیں انہوں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کیونکہ انہوں نے تمہاری ہاں کو ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ تم بالکل اپنی ہاں جیسی ہو۔“

”نہیں۔“ تب ہی کرخت لہجے میں مینا بولیں۔ ”اس کی ہاں اتنی خوب صورت نہیں تھی۔ وہ سافٹی تھی۔ اس نے رنگ اپنے باپ سے لیا ہے۔ ہاں نقوش سب ہاں پر گئے ہیں۔“

”تو نقش بھی تو کتنے پیارے ہیں پیچھو!“ ترانہ نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میری ممانی بہت خوب صورت تھیں۔“

”ہو نہ ہو!“ مینا نہیں۔ ان کی ہنسی میں نفرت اور تضحیک تھی۔ ”حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا بلی! مگر بھی ہونے چاہئیں۔“

ربیعہ ایک مرتبہ پھر چونک اٹھی۔ نجانے کیوں یہاں آکر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی انکشافات اس کے منتظر ہوں۔ وہ بے چین ہو گئی۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔“ اس نے ترانہ سے کہا۔

”پچلو کچن میں چلیں۔ میں چائے بھی بناتی ہوں۔“ ترانہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

اس کے ہاتھ میں خلوص اور محبت کی حدت تھی۔ ربیعہ کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔



”یہاں لوگ جلدی سو جاتے ہیں؟“ ربیعہ نے سوئے ہوئے ماحول کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔ ہم لوگ بھی نوبت تک سنبھو سو ہی جاتے ہیں۔ کبھی کبھار ہی ساڑھے نو دس کی نوبت آتی ہے۔“ وہ دونوں چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ فضا میں جس تھا اور گرمی کا واضح احساس ہو رہا تھا۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”تم دن بھائی اور تصور بھائی دیر سے لوٹے ہیں۔ پھر پیچھو ہی اٹھ کر دروازہ کھولتی ہیں۔“ ترانہ نے مزید کہا تھا۔

”ویسے اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ اچھا ہے تم بھی مل لینا۔“

ربیعہ خاموش رہی۔ اسے اپنی پیچھو کے لگے ہوئے خطوط یاد آ رہے تھے۔

”تم نہیں ہونا؟“ اسے یکایک یاد آیا۔

”میں نہیں۔“ ترانہ اواسی سے بولی۔ ”مجھ سے بڑی بہن تھیں۔ ان کا لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔“

”ربیعہ کو نفوس ہوا۔“

”ان کے بچے کی بھی چیل بسیں۔ ہم لوگ۔۔۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ مینا پیچھو کو طلاق ہو گئی تھی۔ ان کی ایک ہی اولاد ہے صولت۔ یہ ہمارے ساتھ ہی رہا کرتی تھیں۔ امی کے بعد انہوں نے ہی گھر سنبھالا۔ لیکن بس گزرا نہیں۔ پھر ایک ماں اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے وہ بات تو نہ تھی نہ ہے۔ خیر وقت گزر گیا۔ اب گایا ز کر رہا ہے۔“

دونوں نے مل کر منڈیٹ آگئیں۔ دور ننھی ننھی روشنیاں دیوں کی مانند جلتی نظر آ رہی تھیں۔ ربیعہ کو وہ ماحول سخت سوگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”تم اپنی سہیلیاں ایک ایک سے کہہ رہی ہو گی؟“

”ہارٹ ایک۔“ ربیعہ اواسی سے بولی۔ ”میرا اپنا آخری پرچہ دے کر لوٹی تو گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم

نہیں کہنے کے لیے تھے۔ مگر مل سکا۔ مجھے نہیں بتا دادی جان نے مجھے کبھی بھی تم لوگوں کے متعلق کیوں میں نہیں بتایا۔ میں تو ہوا میں اڑتے پتے کی مانند ہو گئی تھا اور لاوارث۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ ترانہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”پھر مجھے ایک صندوق سے پیچھو کے خطوط ملے۔ تمہاری امی کے خطوط تب مجھے علم ہوا کہ میں اتنی بھی لاوارث نہیں۔ میرے بھی خونی رشتے موجود ہیں۔ ماں باپ نہ سہی۔ باپ کی بہن کے اہل خانہ تو ہیں ایک ڈھارس بندھی۔ دل کو سکون ملا۔ پتہ نہیں پتہ نہیں۔ دادی نے ایسا کیوں کیا۔“

”مائی امی اور ابو کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔“ ترانہ نے آہستہ سے انکشاف کیا۔

ربیعہ چونک اٹھی۔

”دونوں نے تا عمر ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ مائی امی نے اپنی قسم پوری کر لی۔“

”لیکن ایسا کیوں ہوا؟“ ربیعہ گم صم سی ہوئی۔

اس کے ذہن میں اپنی شفیق دادی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

PHOTO

”بڑھیا مر گئی۔“ ایک مکروہ ہنسی اس کے کانوں میں گونجی تھی۔
 ”نانی امی نے کبھی تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ ترانہ نے اندھیرے میں اس کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی۔
 ”نہیں، ابھی بھی نہیں۔“

”مینا پھوپھو۔ تمہارے ابو کی منگینتر تھیں۔“ ترانہ نے انکشاف کیا۔ ”امی ابو کی شادی کے ساتھ ہی ان کی منگنی ہو گئی تھی۔“

ربیعہ گم صدمہ سی سننے جا رہی تھی۔
 ”لیکن یہ منگنی اس وقت ختم ہو گئی جب ماموں نے اپنی پسند سے شادی کر لی تمہاری امی سے۔ سو ابو اور نانی امی کے مابین بہت بڑی رنجش پیدا ہو گئی۔“

اندھیرے میں پیدا ہونے والی آواز نے دونوں کا دھیان بنایا۔ سیرھیوں پر کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ جیسے کوئی بیساکھی کے سہارے سیرھیوں پر چڑھ رہا ہو۔

”تہن بھائی آگئے۔“ ترانہ یکا یک بولی۔
 چند لمحوں میں اندھیری سیرھیوں پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ میں اسٹک تھی۔

”ترانہ! ایک بھاری آواز گونجی۔“
 ”جی ہن، آجائیں۔“ ترانہ بولی۔

اسٹک کے سہارے چلتا ہوا سایہ ان تک پہنچا۔ دیوار پر کے چائیس واٹ کے بلب کی ملگجی بیارؤ شیشی بنے اس کا سراپا واضح کرنے کی کوشش کی۔

وہ ایب پر اسرار قسم کا شخص تھا۔ ربیعہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ گھنی بھنوس کے نیچے چمکتی پراسرار نگاہیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

”اسلام علیکم۔“ ربیعہ نے آہستگی سے سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ نوزائے گھور تارہا۔

”بھائی! یہ ربیعہ ہیں۔ جہاں ذہب ماموں کی۔“
 ”معلوم ہے۔“ اس نے بہن کی بات کالی ”مجھے روٹی دو۔“

وہ واپس مڑ گیا۔ اسٹک کی آواز لمحہ بہ لمحہ ہم ہوتی گئی۔ ترانہ شرمیلی ہوئی۔ لیکن تمہیں کوئی کچھ نہیں

”معاف کرنا ربیعہ! یہاں سب لوگ بس ایسے ہی ہیں۔ اکھڑ اور بند مزاج سے۔ لیکن تمہیں کوئی کچھ نہیں
 کہے گا۔ تم فکر مند مت ہونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سمجھو میں تمہاری بڑی بہن ہوں، یہاں کا ماحول تو
 ایسا ہے کہ مجھے خود شدت سے ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔“ وہ اداسی سے بولی۔

”تہن بھائی کو کھانا دے دو۔“ وہ آہستگی سے بولی ”میں نہیں بھوک لگی ہوگی۔“
 ”ہاں۔۔۔“ ترانہ ہنس دی۔ ”میں نہیں بھوک بہت لگتی ہے۔“

”ترانہ اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹیولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی
 ہے۔ ویسے تو صولت ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے تہن
 اور تصور کپڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی یہ کام کرتے تھے لیکن فارغ کے انیک کے بعد وہ تو بس ایک پلنگ
 کے ہی ہو رہے۔ اب انہیں چھوٹے بچوں کی طرح پالنا پوسنا پڑ رہا ہے۔ لڑکوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری آ پڑی

”نہیں نہیں آ رہی تو اپنی خالہ جانی کے کمرے میں چلے جاؤ“ وہ آف موڈ کے ساتھ بولی۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے اور

اس لیے کچھ چیزیں ہو گئے ہیں۔ تصور تو خیر بہتر ہے اپنی پڑھائی بھی کرتا ہے۔ اسی لیے کافی دیر سے لوٹا ہے۔
 لیکن تہن! چلو خیر! روزگار پر لگاؤ کا ہے مزاج کا تیز ہے تو کیا ہوا۔“

انہوں نے رک کر ربیعہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ دھیان کچھ بے دھیانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”اس گھر میں کوئی کسی کو کچھ دینے کا روادار نہیں ہے۔ لڑکے جو کماتے ہیں جیب میں رکھتے ہیں۔ زیادہ سے
 زیادہ گھر میں سوداؤ الودیتے ہیں، مہینے کا بجلی، گیس کا بل دے دیتے ہیں۔ ترانہ کی تنخواہ تو ادھی سے زیادہ باپ کے
 علاج پر اٹھ جاتی ہے۔ پھر آنا جانا، ملنا برتنا، عید تہوار۔۔۔ یہ سب بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ اور صولت بے چاری کی تو
 تنخواہ ہی کتنی ہے۔ کرایوں میں پوری ہو جاتی ہے۔“

ربیعہ کو اب ان کی بات پر مکمل دھیان دینا پڑا۔ ان کا مطلب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے
 چائے کا کپ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

”ترانہ نے بی اے کیا ہے۔ ایک جاننے والے کے توسط سے اسے یہ نوکری مل گئی۔ صولت بے چاری تو
 دسویں سے آگے پڑھ ہی نہ سکی۔ ایسے حالات میں آدمی یا تو پڑھ لے یا کھالے۔ پھر بھی تھوڑا بہت جو بھی ہے اپنا
 کما لیتی۔ تم نے بھی تو بی اے کیا ہے نا؟“

”جی ہاں، میں نے ہاتھ میں زبان کی سی تیزی سے چلتی چھری کو چند لمحوں کے لیے روکا۔ وہ بالک کاٹ رہی تھیں۔
 ”جی! اب یہ رکے ہوں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”ہاں تو تمہیں بھی مل جائے گی نوکری۔ میں ترانہ سے کہوں گی۔ تمہارے لیے بات کرے!“ وہ اس کا جھکا ہوا
 سر دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہاری؟“ نے کیا بھالے تمہیں تمہاری ماں کے متعلق؟“ دفعنا مینا نے سوال کیا۔

”جو تک۔“
 ”نہیں۔۔۔“

وہ چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا۔ ”وہ قدر سے خوفزدہ سی ہو کر گئی۔“
 ”چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا۔“

”جی! اب یہ رکے ہوں سے آہ کی صورت نکلا۔“
 ”جی! اب یہ رکے ہوں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ رکے ہوں سے آہ کی صورت نکلا۔“
 ”جی! اب یہ رکے ہوں سے آہ کی صورت نکلا۔“

وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ نگاہیں خلا میں بھٹک رہی تھیں اور وہ کہیں دور
 پہنچی ہوئی تھی۔

”مما!“ عمر نے پکارا۔ وہ چونک اٹھی۔
 ”تم سوئے نہیں اب تک؟“ وہ حیران ہوئی۔

وہ تو اسے نجانے کب سے سویا ہوا سمجھ رہی تھی۔
 ”نہیں، ممما! مجھے نیند نہیں آ رہی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

شعلا سمجھ گئی تھی کہ اس کے ذہن میں کیا ہے مگر وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
 ”نیند نہیں آ رہی تو اپنی خالہ جانی کے کمرے میں چلے جاؤ“ وہ آف موڈ کے ساتھ بولی۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے اور

یہی مشغلہ نکال کر بیٹھ گئی۔ اس کے ویسے کے سوٹ کا رنگ گرین تھا اور شادی کا جوڑا گلابی رنگ کا، کچھ یادیں دھنک کی طرح اس کی آنکھوں میں بکھر گئی تھیں تو ایک سنہری سکرابٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

”یار ویدنگ ڈریس گرین ہونا چاہیے۔“
”کیا؟ تمہارا گل ہوئے ہو؟ شادی کے دن ہر جوڑا پہن لوں؟ میں طوطا ہوں کیا؟“
”طوطا تو روز پہنتا ہے تم بس شادی کے دن پہنتا۔“ وہ مزے سے بولا۔
”میرا داغ خراب نہیں ہے۔ میں لال جوڑا پہنوں گی۔“

”خبردار! میں کمر سے نکال دوں گا۔“
”میں کمرے میں آؤں گی ہی نہیں، میں تمہارے گھر ہی نہیں آؤں گی۔ بلکہ تم سے شادی ہی نہیں کروں گی۔“
”جو مرضی کو۔ میں گرین ڈریس بھجواؤں گا۔“

”جی! اٹھا کر پھینک دوں گی۔“
”ضرور پھینکنا مگر شرط یہ ہے کہ جوڑے میں تم بھی موجود ہو۔ میں کیچ کر لوں گا۔“
”جی! میں اس کی نگاہ ویسے کی تصویروں پر جمی ہوئی تھی جس میں اس نے عاشق کا بہت چاہتوں سے خرید کر لیا تھا۔ اسے یاد تھا ویسے پر اس کے حسن کی دھوم مچ گئی تھی۔ سبز جوڑے میں اس کے من کی مانیایاں اپنے عروج پر تھیں۔“

”میں نے کی پشت سے سر ہٹا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کا شہ پکاتا، محبت بھرا لہجہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔“
”ویسے، تمہارے لیے تو بتا ہے۔ تمہاری شد جیسی رنگت کے لیے، شریقی آنکھوں کے لیے، احمریں“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

میں سونا چاہتی ہوں۔“

”آپ مجھ سے ناراض ہیں ماما؟“

”نہیں عمو۔ بس میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔

”اچھا۔ نہ کریں بات۔ بس سنتی جائیں۔ مجھے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔
”شہلا نے آنکھیں کھول کر اسے حق سے گھورا۔“

”میرے بیٹے میں اتنا دم نہیں ہے۔“

”ماما! غصے سے کیوں بول رہی ہیں۔“ وہ سہم گیا۔ ”میں نے تو نہیں کہا تھا نا کہ آپ پیپا کو اسکول بھیجیں۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ میرے پیپا ہیں۔“

”شہلا نے بے بسی سے سانس بھری سچے سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا وہ خاموش ہو رہی۔“
”ویسے وہ اچھے ہیں ماما۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”آپ کبھی ملی ہیں ان سے؟“

”شہلا کو بے ساختہ ہسی آگئی۔ اس نے نچلا لب دانٹوں تلے دبا کر ہسی روکی۔“
”آپ اگر کبھی ملیں ان سے تو۔“

”عمرو! شہلا نے اسے گھورا۔ ”پتا نہیں تم کب بڑے ہو گے اور مجھے ان فضول سوالوں سے نجات ملے گی۔“
”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ماما۔ آپ یوں ہی رہتی ہیں جو سب تو میری باتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ کہتے رہے تھے۔ برہنٹ بوائے، برہنٹ بوائے اور آپ کو لکیری بائیل فضول لگتی ہیں۔“

”پیپا کے سگے“ اس کی جان جل کر کباب ہو گئی۔ ”ایک دن باپ نے چوپچلے اٹھائے تو لگا ہے قصیدہ خوانی کرنے پوچھا نہیں اس سے اتنے سال کہاں گم تھا؟“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“
”جی! وہ جوڑے بھی۔“

بتائیں کیا خاطر تو واضح کروں آپ لوگوں کی۔ کھانا بھی تیار ہے۔“

”کھانا ہم کھا کر آئے ہیں پھینچو!“ ماہین جلدی سے بولی۔ ”اور تکلفات رہنے دیں۔ امی بہت ضروری کام ہے آئی ہیں آپ کے پاس۔“

اس نے حسام کو گود سے اتار کر مومن اور ایمان کے حوالے کر دیا جو بے حد اشتیاق سے اس کے پاس کھڑے چھوٹے سے حسام کو دیکھ رہے تھے۔

”اچھا میں چائے بنا لیتی ہوں۔“

”من جاتی ہے چائے بھی“ فردوس بیگم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ”تم ذرا دھڑکی بیٹھو ادھر بڑا وقت نکال کر بہت بائو کر آئے ہیں دو دنہ سہارے گھر کی تو سیڑھیوں کے خیال سے ہی میرا جی ہولتا ہے۔“

”بس لی لی کیا کہیں گے ہمارے تو نصیب ہی برے ہیں۔ جی کو کوئی نہ کوئی روگ لگا ہی رہتا ہے۔ تم ذرا ایک بات بتاؤ مجھے سچ سچ قسم ہے تمہیں جھوٹ نہ بولنا۔“

ایقان حیران نگاہوں سے بھانج کی سمت دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

”یہ جو تمہاری ہم جولی ہے ڈاکٹری اس کا ہاشم میاں کے ساتھ کیا چکر ہے؟“ وہ بغیر ایمان کی طرف دیکھ کر ہی کہتی تھیں۔

ایقان پر حیرت کا پھاڑ ٹوٹ پڑا۔

”کک۔ کیا کہہ رہی ہیں بھالی جان! خدا کا خوف کریں آپ۔ آپ شہلا کی بات کر رہی ہیں نا۔ اس غریب کو تو خبر بھی نہیں ہے ایسی کسی بات کی۔“

”رہنے بھی دو۔“ وہ برامان گئیں۔ ”تم کب اپنی سہیلی کی بات کہو گی ہم سے۔ بھلا ایسے تو نہیں کوئی کسی کا دیوانہ ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی خراب کرنے پر تل جائے۔“

”بات کیا ہوئی؟“ ایقان نے بے بسی سے ماہین کی سمت دیکھا کہ شاید ابھی بات کا کوئی سرا ہاتھ لگے۔

”بھالی! ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ ماہین دھیرے سے بولی۔ ”اور وہ کہتے ہیں کہ اس فیصلے میں کوئی رد بدل ممکن نہیں ہے یا تو شادی کریں گے ہی نہیں یا صرف اور صرف ڈاکٹر شہلا!“

”مالی گاڈ!“ ایقان نے سر تھام لیا ”ہاشم اب تک۔“

”بچلو اس کی شادی سے پہلے کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کا تم سے دوستانہ تھا گھر ای جاتی تھی۔ ہمیں بھی بھلی لگتی تھی۔ پر اس لڑکے کے تو تیور ہی جدا تھے۔ تمہاری تو دانت کاٹنے کی دوستی تھی تم سے کیا پوشیدہ ہے۔“

انہوں نے اشاروں اشاروں میں اسے پچھلی باتیں یاد دلائی۔ ”اب ہم ایک بچے کی ماں کو اپنے سب سے بڑے بیٹے کی دلہن بنالائیں تو کیسی بھداڑے گی پورے خاندان میں کہ لو! تان ٹوٹی تو کہاں ٹوٹی۔ اسی بیٹے پر اترا تو پھرتی تھیں۔ لے آئیں مطلقہ گھنوں کی پوری!“

انہوں نے جیم تصویر سے خود کو ملنے والے طعنے ملاحظہ کیے۔

ایقان کیا کہتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ ہر چند کہ اس کے اپنے دل کو اس خیال سے راحت سی ملی تھی۔ اس کی عزیز از جان دوست کا گھر پھر سے بس جاتا۔ کتنوں کا بھلا ہوتا۔ ایک معصوم بچے کو باپ کے نام کا سائبان مل جاتا۔ لیکن ظالم زمانے کی رسمیں! اس کی عزت مآب بھالی کی بھد نہ اڑ جاتی پورے خاندان میں اس نقصان کا ازالہ بھلا کس طرح ہو پاتا۔

”کس سوچ میں پڑ گئیں تم۔“ فردوس بیگم پریشان ہوئیں۔ ”مسئلے کا کچھ حل بتاؤ۔“

ایقان چونکی۔ جو کچھ سوچا تھا وہ نوک زباں پر لانے کی تاب نہ تھی۔

”بیس کیا کہوں بھالی جان!“ وہ کھنکھارے ہوئے بولی۔ ”جو آپ مناسب سمجھیں!“

”ارے ہمارا کیا مناسب کیا نامناسب۔ ہم تو اس لیے آئے ہیں کہ ہماری خاطر ذرا سا جھوٹ بول دے۔“

”جی؟ میں سمجھی نہیں۔“ وہ الجھی۔

”ہاشم میاں کو کسی بہانے سے بلا کر بات کرو۔ اس سے کہو کہ شہلا نے انکار کر دیا ہے۔ شادی سے۔“

”میں نے میں کہوں؟“ وہ گھبرا گئی۔

”ہاں۔ اور ادھر شہلا کو سمجھا دو کہ ایسا کوئی خیال ہے بھی جی میں تو اسے نکال بھیجے۔ اس کو کہہ دو ہاشم کے گھر والے کبھی بھی اسے اور اس کے بچے کو قبول نہیں کریں گے چاہے زمین و آسمان ایک ہو جائے ہاں۔“

”لیکن بھالی جان۔ میرا یقین کریں شہلا کو ہاشم کے جذبول کا بالکل علم نہیں ہے۔ وہ قطعاً بے خبر ہے۔ ایک بے قصور شخص کو ایسی کڑی بات کیوں کہی جائے بھلا۔“

”اچھا! پھر ہاشم کو سمجھا دے۔ کسی بھی طور کوئی بھی جھوٹ بول کر۔ وہ سر پھرا لڑکا ہمارے بس کا تو نہیں۔“ ایقان بری طرح چھٹکنی لگی تھی۔ جانتی تھی بھانج کے دل میں پہلے ہی اس کی جانب سے کانٹا چمکھا ہوا تھا۔ وہ اس کی جانچ سے بدظن رہتی تھیں۔ اب کوئی اونچ نیچ والی بات اس کے لبوں سے نکلتی تو وہ بالکل ہی اکھڑا تھیں۔

”جی۔ آپ کا یہ سب کو کرنا ہی کرنا ہے۔“ ماہین نے اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر کہا۔ ”بھالی آپ کی بات مان لیں۔“

”ہم بڑی اس لے کر آئے ہیں۔“ فردوس بیگم نے بے حد بیٹھے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”تم بیس ماہین کی بات سننا۔“

ایقان کو اب میں سے ہی بنی ہر چند کہ اس کا اپنا دل اس کام کے لیے ہرگز آمادہ نہ تھا۔

”فردوس بیگم! ماہین! باہر دیر نہ ٹھہریں۔“ ماہین کے شوہر نسیم کو اس کو لے جانے کے لیے آنا تھا اور وہ ان کی باتوں سے بے خبر ہو چکا تھا۔

”بچہ چھوٹا ہے۔“ وہ بولنے لگا۔ ”اس نے ماں کی نظر بجاتے ہوئے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر کہا۔“

ایقان نے اس کی بات سے دل سے سر ہٹا دیا۔

ان دونوں نے اپنے اپنے کمرے کے بعد وہ چائے کے برتن سمیٹ کر کچن میں چلی آئی۔ وہاں سنی بکام اس کے منتظر تھے لیکن وہ منتشران خیالی کا شکار ہو رہی تھی۔

نیل دوبارہ جی توفہ بری طرح چوٹی۔ یہ وقت تو کسی کی آمد کا نہ تھا۔ وہ الجھتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی تھی۔ اور پھر ہر کھڑے ہاشم اور رافع کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بظاہر اس نے بے حد خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ ”واہ بھئی! آج تو بھاگ جاگے ہمارے۔“

”کیسی ہیں پھو پھو جانی! بچہ پارٹی کیسی ہے؟“

”فرسٹ کلاس!“

وہ دونوں آتے ہی بچوں کے ساتھ لگ بگئے تھے۔ ایقان ان کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔ ان کی آمد کا مقصد وہ کچھ کچھ سمجھ ہی گئی تھی۔

رافع وہیں چلا آیا۔

”ہمارے پیچھا میاں کے کیا حال ہیں فون دون کرتے ہیں باقاعدگی سے؟“

”بے قاعدگی سے!“ ایقان نے تصحیح کی۔

”کوئی آیا تھا کیا؟“ اس نے لوازمات سے بھری ہلٹیوں پر نگاہ کی۔ ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر رہ گیا۔

”ہاں۔“ پھر وہ بولی۔ ”یڑوس کی فیملی تھی۔“

”چلیں اچھا ہے۔ فلیٹ سسٹم بڑا کامیاب ہے اسی لیے۔“ وہ بھٹی ہوئی مونگ پھلی کھانے لگا۔

”پچھو کا خیال آگیا یا کسی کام سے آئے ہو؟“ اس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا ”ایسے تو آنے والے نہیں ہوتے لوگ۔“

رافع ہنس دیا۔

”ٹھیک سمجھیں ڈیئر پچھو! بے حد ضروری کام سے آئے ہیں۔“ اب وہ سموسوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔

”لیکن ذرا بیٹھ کر بات کرتے ہیں آرام سے۔“

”او فوہ کسی لڑکی کا چکر ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔

رافع کام نہ تک جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

”فٹا شک! یو آر گرےٹ۔“ وہ تحیر سے بولا۔

ایقان مسکرا دی۔

اپنے اپنے کپ لے کر وہ تینوں ٹیرس پر پڑی کر سیڑی پر بیٹھ گئے۔ جہاں آسمان اور نیچے روشنیوں سے سجا شہر بہت خوب صورت معلوم ہو رہا تھا۔ ایقان نے دیکھا وہ دونوں نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے اشارے کر رہے تھے۔ اس نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی اور سنجیدہ سی صورت بنا کر بیٹھی رہی۔

”اُہم!“ بالاخر رافع کھنکھار ا۔ ”ڈیئر پچھو! ایک گیمبر سامسٹر درپیش ہے جس کے لیے آپ کے رطلوں اور پرزور تعاون کی اشد ضرورت ہے۔“

”اچھا!“ وہ اتنا ہی بولی۔

ان دونوں نے پھر نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

”کیویڈ کے متعلق تو آپ نے سنا ہوگا؟“ رافع پھر بولا۔

ہاشم کو ہنسی آئی۔ ایقان بھی ہنس دی۔

”بد تمیز!“ ہاشم نے اسے گھورا۔ ”ٹھیک طرح بات کرونا۔“

”بھئی میں تمہید باندھ رہا ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کون شکار ہو گیا کیویڈ کے تیر کا؟“ ایقان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت پرانی بات ہے پچھو جانی۔“ رافع نے سرود آہ بھری۔ ”لیکن زخم ہے کہ بھرتا نہیں بریان شاعر۔“

جس کو بھولے وہ سدا یاد آتا

”تم اپنی بات کر رہے ہو یا ہاشم کی؟“ ایقان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”باپ رے باپ!“ رافع نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اپنا تو یہ ڈیئر ٹمنٹ ہی نہیں ہے نا۔ عشق کا دیوتا تو منہ سے بیٹھا ہے۔ یہ آپ کا عزیز از جان بھتیجا۔“

ایقان نے ہاشم کو دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

”اور وہ کون ہے؟“

”میاں راجے! اب پھوٹو بنا کچھ۔“ رافع نے اسے گھرا۔ ”اپنی بارات میں نہیں بیٹھے ہو۔“ ہاشم نے سراٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

”یار پچھو! میں محبت میں ہنڈرڈ پرنسٹ رازداری کا قائل ہوں لیکن اس جذبے کے ہاتھوں ایک مرتبہ بہت سخت تقسیم کا نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اب تک دل تاوان بھرتا ہے اس لیے اس مرتبہ بہت مجبور ہو کر اس کا ہاتھ لے رہا ہوں۔“

”لو۔“ ایقان نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا ”کیا نام ہے؟“

”شہلا!“ وہ بے ساختگی سے یوں بولا تھا جیسے لبوں کے جنبش سے کنول کھلایا ہو۔ اس کی نظروں سے خوشبو پھوٹی تھی۔ چہرے پر سے جیسے کوئی ستارہ گزرا تھا۔ ایقان مبہوت رہ گئی۔

”بہت چاہتے ہو نا اسے؟“ اس نے بے ساختگی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”بہت پچھو!“ وہ بے بس ہو گیا۔

”ایسی؟“

”ٹھیک ہوں پچھو؟“ اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”بہت ڈیئر!“ وہ یقین سے بولی۔

”آپ میرے ساتھ ہیں؟“

”ہنڈرڈ پرنسٹ!“ اس نے ہاشم کے ہاتھ دبائے۔ رافع ہونقوں کی مانند ان دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ وہ تو

کب ملوئے۔ جتنے کاسوں کا آیا تھا مگر یہاں تو لمحہ بھر میں سب معاملات طے ہو گئے تھے۔ ”پھر میں کیا کروں پچھو؟“

”لوں کو لے جاؤں؟“

”ٹھیک ہے!“ اس نے چٹکی بجائی۔

”یار پچھو! آپ کو بڑا دل ہے۔“ رافع کے لمبے میں ستائش تھی۔

”چل بدھو!“ ایقان نے اسے پیچھے سے لٹکایا۔ ”تیرا تو یہ ڈیئر ٹمنٹ ہی نہیں۔“

URDU PHOTO

رات بے حد خوب صورت تھی۔ نور سے سچی ہوئی محبت بھری ہواؤں سے لبریز ہاشم تادیر درپے میں کھڑا رہا۔

ایک بازو کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکائے دو سرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ نچانے کیا کچھ سوچے چلا جا رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا بار بار اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرنے چلی آتی تھی۔

یہاں تک کہ دیوار پر لگے کلاک نے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ ہاشم نے ابھی ابھی سی نظروں سے کلاک کی سمت

دیکھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا فون تک چلا آیا۔ ”تو آج یہ دریا پار کر ہی لو!“ اس نے خود سے کہا اور ریسپور

اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دو سری جانب نیل جا رہی تھی۔ ہاشم کو اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

”ہیلو۔“ چند لمحوں میں نیند سی بھری آواز ریسپور سے ابھری تھی۔ ”ڈاکٹر شہلا بیٹو۔“

”ہیلو۔“ اس نے دوبارہ کہا تھا۔ ہاشم دھیرے دھیرے مسکرا دیا۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

”ملاح تھا اُن سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھریبچے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائی شدید بیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شبابہت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیکس بالواس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکوہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منبیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔ ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے تنگ آکر اپنی پھوپھو کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ نرین میں ربیعہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تنہا سفر کر رہی ہے وہ از خود اس کی پھوپھو کے گھر تنہائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

عاشق (ایقان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

دسویں قسط

”ہیلو....“ پھر آہستگی سے بولا۔ ”میں ہاشم ہات کر رہا ہوں۔“
دوسری جانب چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر اس کی ابھی ابھی آواز آئی۔
”کون ہاشم؟ سوری میں نے پہچانا نہیں۔“
ہاشم نے گہری سانس بھری۔

اجنبی جسے اجنبی سے ملے

کتنا طویل سفر تھا اور کس قدر کڑا! جس کی صورت اس کی آنکھ کی تکی پر نقش تھا وہ اسے نام نہاد کرچھوٹا پائی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ فون بند کر دے۔

محبت کے خوبصورت اور انمول جذبے کا اظہار وہاں ہونا چاہیے جہاں کوئی اپنی سماعتیں یہی سننے کو وقف کیے بیٹھا ہو۔ ایسے میں اظہار اور بھی انمول اور قیمتی ہو جاتا ہے۔

یہ اس کا فلسفہ محبت تھا جس پر وہ گزرے ہوئے کل تک قائم تھا لیکن آج اسے اپنا نظریہ بدلتا رہا تھا بحالت مجبوری یہ مجبوری حالات کی سختی کی عطا کر رہی تھی۔ آج وہ اپنا قیمتی انمول سیپ میں بحفاظت رکھے ہوئے موتی جیسا اظہار ان سماعتوں کی نذر کرنے جا رہا تھا جنہوں نے اس کے نام کو اجنبی جانا تھا۔

”آپ۔۔۔ آپ ہاشم فاروق حسن تو نہیں؟“ یکایک نیند سے جاگی ہوئی شہلا کی کسی سوئی ہوئی جس نے کام کیا تھا۔

”شکر ہے۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ ”وہ نہ میرا دل تو بڑی شدتوں سے آپ کی بے مہری کا گلہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس طرح کہ زباں میں قوت گویائی تک نہ رہی تھی“ شہلا دھیرے سے ہنس دی۔
”سوری ہاشم۔ ویری سوری! دراصل میں کچھ دیر پہلے نیند کی گولی لے کر سوئی تھی۔ میرے حواس پوری طرح

کام نہیں کر رہے تھے۔ لیکن دیکھیں دیر سے ہی سہی میں نے پہچان لیا ہے۔ خیر تو ہے نا گھر میں؟“
”آپ سے رُکوا کر رہتی ہیں؟“ ہاشم نے اس کے سوال کے جواب میں سوال داغا۔ وہ بھی نہایت حیرانی کے ساتھ۔

”کبھی کبھار۔“ وہ مختصراً ”ہوئی۔“ ایقان تو ٹھیک ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہیں آپ بے فکر رہیں۔“ وہ ہنس دیا۔ ”میں نے اس وقت آپ کو بطور ڈاکٹر زحمت نہیں دی ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ وہ بھی ہنس دی۔ ”کیا کروں۔۔۔ بارہ بجے کے بعد تو جو بھی فون آئے وہ میں بطور ڈاکٹر ہی ریسپونڈ کرتی ہوں۔ ذہن میں اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔ کیسے! کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

ہاشم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو رہا کتنے جملے ترتیب دیے تھے درتپے میں کھڑے ہو کر چاند کو تکتے ہوئے اس کی آواز نے برسات کی صورت خیالوں کا سب غبار دھو ڈالا تھا۔ وہ خالی الذہنی سے ریسپونڈ تھا۔

”ہاشم۔۔۔ میں کنفیوژن کا شکار ہو رہی ہوں۔ آخر آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟“ وہ بالآخر الجھ سی گئی۔

”شہلا! میں۔۔۔ میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ بلکہ کر رہا ہوں۔ آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند کرتی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔“ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں گھنٹے میں یوں مصروف ہو گیا جیسے نہ اس نے کسی کو فون کیا اور نہ ہی کچھ کہا۔

دوسری جانب اندھیرے میں کھڑی شہلا کے حواس اچانک پوری طرح جاگے تھے۔ اس کے تھکے تھکے گھول کی شہلا نے فون کے بوجھ سے لدے ہوئے ذہن کو اس کی کسی ہوئی بات سے جھجھوڑ کر ہکا بکا کر چھوڑا تھا۔

”ست دیر۔۔۔“ فون کی طرف اس نے نہ آیا کہ اگلی بات کس کو کہنا ہے اور کیا کہنا ہے۔

”میں۔۔۔“ ”جبران“ ”میں یہ سن کر۔“ آخر کار وہ بولی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے کہا اور کیا کہنا تھا۔“

”میرے دل میں۔۔۔“ ”یہ جتنی پسندیدہ ہے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔“

”میں نے آپ سے۔۔۔“ ”کیوں؟“ ”کیسے؟“ ہماری تو بہت عرصے سے کوئی ملاقات تک

”نہ آپ کہہ سکتی ہیں۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”کیونکہ میں آپ کے لیے ایک شناسا راہ گیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور راہ چلتے شناسا چہرے ہزاروں ملتے ہیں۔ اس لیے آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہماری بہت عرصے سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”آتے جاتے چند لمحوں کے لیے نظر ٹکرا جانے کو ملاقات تو نہیں کہہ سکتے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو جذبوں پر منحصر ہے کہ کس نگاہ کو کتنی شدت عطا کریں۔“ میرا تو سارا دن ان چند لمحوں کے زیر اثر گزرتا ہے۔“

ہاشم کو خود اپنی ہی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔ اسے اپنا آپ اجنبی لگ رہا تھا۔ شاید اس نے اپنا آپ کسی اور کے حوالے کیا تھا اس لیے۔

شہلا دم بخود تھی۔ اظہار نہایت واضح اور دل کو نیچے لے پر دھڑکا دینے والا تھا۔ دھیرے دھیرے مدھم مدھم سڑوں میں اس کی دھڑکن پورے بدن میں گونج رہی تھی۔

تھی۔ دونوں ہم جماعت بھی تھیں۔ وہ اکثر آیا کرتی تھی لیکن آج اس کی زلفوں کی مہک اور ہاتھوں کی نرمی نے اسے ایک نئے بے حد عجیب سے احساس سے دوچار کیا تھا۔ اس نے کبھی اس طرح محسوس نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی کسی چہرے کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا۔ دل نے کبھی پہلے اس طرح کی فرمائش نہ کی تھی۔ وہ باد صبا کی نرمی سے ایک منہ بند کلی کو کھول گئی تھی۔ اس کے اندر خوشبو بکھر رہی تھی۔

اس نے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا بٹن غائب تھا۔ اس کے لبوں پر خوشی مسکراہٹ بن کر چمکی۔ بٹن ٹوٹ جانے سے اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اس حقیقت کا اور اک اس پر جلد ہی ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سیاہ لٹوں میں اس کا بٹن نہیں بلکہ دل باندھ کر لے گئی ہے۔ کسی گم گشتہ ستارے کی مانند وہ اب تک اپنی سیاہیوں میں گہیں پوشیدہ تھا۔

سنا ہے گم شدہ چیزیں جہاں کھولی جاتی ہیں وہیں پر مل بھی جاتی ہیں۔ اس نے اس رات پہلی مرتبہ اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ ایک بے حد معمولی سا واقعہ اپنی ہی باز گشت بن کر اس کی ہستی پر چھا گیا تھا۔

اپنی بدولت کا بالکل نئے فیشن کے مطابق سلا ہوا لباس ماں کو دکھانے کی غیبت میں گہری ایقان اس کی حالت کا احاطہ کر پائی نہ ہی اس کے بن میں اب بھی زلفوں کے ٹوٹنے کا افسوس کرتی شہلا ان لطیف احساسات کو چھو سکی۔

جہاں بڑا ہٹ کی طرح اس کے کوچہ دل میں پہلی بار بر سے تھے۔

نجات کب سے وہ اکیلا ہی ان تمناؤں سے ننھے ننھے نازک نازک پودوں کی طرح دل کے گلستان میں گنجداشت کرتا رہا تھا۔

وہ ایقان کے پاس کیا سن اسٹڈی کے لیے آتی تو وہ بھی چپکے سے اپنی کتابیں لے کر وہاں جا بیٹھتا۔

”اچھا ہوا! آج تم آگے“ ایقان کھل اٹھی۔ ”پڑھ پڑھ کر سر دکھنے لگا ہے۔ ذرا منوں حلوائی کے قیمہ بھرے۔“

”لاؤنا۔“ چپکے سے چائے چلائی۔

”تھپا اور اس کی چائے کی پٹی جذبوں بھری نگاہ لمحہ بھر کے لیے اس پر ڈالتا۔ وہ تیزی سے اپنی نوٹ بک پر قلم چلائی رہی۔“

”تم خود گول گپا بن جاؤ گی ایقان کی بچی۔“ وہ اسے ڈانٹتی۔ ”ڈسٹرب مت کرو خواجوا!“

”میں تو بچی۔“ وہ کتابیں پھیلانے کی بات کر رہی تھی۔

شہلا بے بسی سے اس کی پشت پر جھولتی چوٹیاں دیکھتی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کتاب پر جھک جاتی۔

باشم چپکے سے اس کے گال کو چھوتی لٹ کو دھتارتا۔

محبت کی اس اچھوتی اور مقدس مئے کو دل کے آگینے میں اس نے حفاظت سے یوں رکھا کہ قطرہ بھی چھلکنے نہ پائے۔ نہ نگاہوں سے خمار چھلکنے نہ کوئی جملہ لڑکھائے۔ نشہ بس لبوں کر رگوں میں دوڑتا رہے۔ دھڑکنیں بس ایک ہی نام لاتیں رہیں۔

”شہلا۔۔۔ شہلا۔۔۔ شہلا۔۔۔“

”دوسری بات یہ کہ پسندیدگی اور محبت کا یہ جذبہ آج کی پیدوار نہیں ہے۔ یہ ایک تناور درخت کی مانند اپنی لاتعداد جڑیں میرے دل کی گہرائیوں تک میں پیوست کیے ہوئے ہے۔ خون دل نے برسوں اس کو سینچا ہے۔ تمنا نے سالوں گنجداشت کی ہے۔ دھڑکنوں نے مدتوں حفاظت کی ہے۔ اس طرح کہ سوائے تمہارے تصور کے دل میں اور کچھ اگر ہے تو وہ تمہیں پالنے کی خواہش ہے۔“

وہ خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ وہ شہلا سے کبھی یہ سب کچھ کہہ پائے گا۔ جذبوں کا لاوا ذرا سی راہ پا کر یوں بہہ نکلے گا۔

شہلا میں مزید تاب نہ تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا جسم سینے سینے ہو رہا تھا۔ حلق بالکل خشک تھا اور سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی رہی۔

”مذتوب۔۔۔ برسوں۔۔۔ سالوں۔۔۔ اس کی آنکھیں حیرانی سے کھلی ہوئی تھیں۔

”مجھے کبھی احساس تک نہ ہوا؟ یہ کب کی بات ہے؟ ایسا کب ہوا؟ کیونکر ہوا؟“

”آؤ۔۔۔ آؤنا میں تمہیں اماں سے ملواؤں!“ ایقان اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تقریباً کھینچے ہوئے لیے آ رہی تھی۔

یہ ہائی ہیل سینڈل کی وجہ سے بہت تیز نہیں چل پاری تھی۔ لیکن لاٹلی ایقان کی بات کی پروا نہ تھی۔ ”میں گرجاؤں گی ایقان۔“ وہ روپائی ہوئی۔

دردانہ کھول کر باہر آتا ہستم ان دونوں کو نہایت تیزی سے اپنی جانب آنا دیکھ کر پھرتی سے پرے ہوا۔ ایقان اس کے پاس سے ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئی جبکہ اپنی پینل پر ڈولتی ہوئی شہلا کا سر اس کی شرٹ سے مس ہوتا ہوا تارہ گیا۔ وہ بھی آگے بڑھ گئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے ایک دلہن کی طرح کے ساتھ رک گئی۔ ایقان کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ نکل گیا۔

”پائے میرے بال۔۔۔ اف اللہ!“

ہاشم کی سفید شرٹ کے بٹن نے ان کھلی گھنیری سیاہ زلفوں کے ساتھ یکایک ہی شرارت کر ڈالی تھی۔ دراز لٹ اس کے بٹن میں الجھی ہوئی تھی۔

”اؤف۔۔۔ ہاشم کے سچے۔۔۔ چھوٹا اس کے بال۔“ ایقان غصے میں پھری چیل کی مانند تھی۔

”مم۔۔۔ میں نے نہیں۔ اس بٹن نے۔“ اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے۔

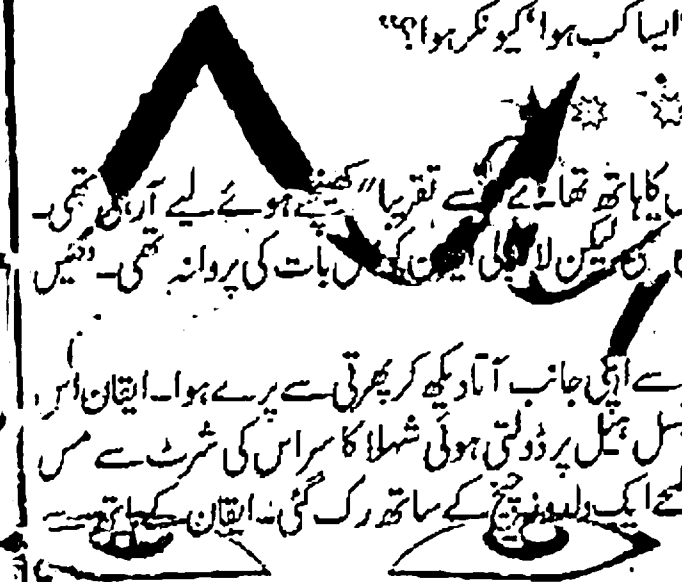
سیاہ زلفوں سے سجا ایک دلکش چہرہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی سانس جہاں تھی وہیں رک گئی۔ شہلا اس کی حالت سے بے خبر اس کے بٹن سے اپنی لٹ آزاد کروانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کے نرم ہاتھوں کی جنبش اسے اپنے سینے پر محسوس ہو رہی تھی۔

”تم بھی تو جو گنوں کی طرح بکھرائے رکھتی ہو یہ زلفیں۔“ ایقان کو پتہ نہیں دیکھ کر مزید تاؤ آیا۔ ”باندھ نہیں سکتیں۔ میری اماں ہوں تو اتنی کس کر چٹیاں بنادیں کہ پورا ہفتہ نہ کھلے۔“

ان دونوں کے پاس کھڑی وہ تقریر میں مصروف تھی۔

ہاشم کا بٹن ٹوٹ گیا لیکن اس کے بالوں سے نہ نکلا۔ زلفوں کو روپائی بہر حال مل گئی۔ ایقان پھر اسے اسی طرح کھینچتے ہوئے آگے لے گئی۔

ہاشم پتھر کے بت کی مانند وہیں کھڑا رہ گیا۔ لمحوں کی فسوں خیزی اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ ایقان کی بچپن کی ہم جولی



PIOTO

رافع اس کا بار غار تھا۔ دونوں میں کوئی بات چھپی نہ تھی۔ لیکن ہاشم نے اپنے جذبات کی ہوا سے بھی نہ لگنے دی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں اور طرح کے لڑکے تھے۔ ان کے درمیان فزکس اور کیمسٹری کے مختلف ٹاپکس پر بحث رہتے یا قدیم شعراء کی غزلیں۔ لڑکیوں کی باتوں سے انہیں سروکار نہ تھا۔ عشق عاشقی کے قصے وہ گفتگو میں نہ لاتے تھے۔

رافع بے حد مختلف تھا۔ اسے آنچلوں کے دھنک رنگ متوجہ کرتے تھے نہ ہی ہنسی کی جھنکار پر وہ کبھی پلٹ کر دیکھتا تھا۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ نرا کورا اور قدرے بے حس تھا۔ ایسے میں اپنے جی کی بات اس سے کہنا ہاشم کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا اور نہ شاید اپنے آپ سے گھبرا کر وہ کبھی اس سے کچھ کہہ سکتا تھا۔

لیکن بہر حال خوشبو کہیں نہ کہیں اپنا سراغ چھوڑ ہی جاتی ہے۔ رافع نے ایک دن اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ ایقان اور شہلا کا رزلٹ آیا تھا۔ دونوں نے بہت اچھے نمبروں سے امتحان پاس کیا تھا اور اب وہ دونوں مل کر سب سہیلیوں کو دعوت دے رہی تھیں۔ بہت دن تک دونوں کے مابین یہ جھگڑا چلتا رہا کہ دعوت ایقان کے گھر ہوگی یا شہلا کے گھر۔ پھر حسب معمول ایقان جیت گئی تھی۔ شہلا بحث میں اس سے ہمیشہ ہار جاتی تھی۔

دعوت کا دن آگیا۔ ان دونوں نے کچھ چیمبر گھبرا کر تیار کیا اور کچھ بازار سے منگوا لیں۔ رنگ برنگے آنچل لان میں لہرائے گئے۔ تقریباً چھ گھنٹے ہر طرف بڑبڑاہے رہے۔ ہاشم اپنے گھر سے بیٹھا ایک پرانا ریڈیو ٹھیک کر رہا تھا جب چیم کر تی ایقان اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے ہنسی آگئی۔ وہ سچی منوری گھڑی تھی گویا کسی شادی میں جا رہی ہو۔ دھماکی رنگ کا جھڑا گھڑی گھڑی سے سجا ہوا تھا۔ پیٹے میں بجا گھڑی وٹے ہوئے تھے۔ گولڈن بالیاں پہنے اور بہت سا میک اپ کیے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہاشم نے ہنسنے پر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاشم کا کان پکڑ لیا۔

URDU PHOTO

”کیوں بھتیجے؟ میں تو توں ہوں۔“ اسے مزید ہنسی آئی۔
 ”میں نہیں صرف لگ رہی ہوں۔“ اسے مزید ہنسی آئی۔
 ”اچھا یہ بات ہے؟ بھائی جان سے کہتی ہوں۔“ وہ خطرناک طور پر لے مڑی تھی۔
 ”ارے پھپھو! میری کیوٹ سی پھپھو! ایسا غضب نہ کریں۔“ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”جو چاہیں سزا سادیں۔ کہیں تو منوں حلوائی کی دکان سے کوئی موسٹ فیورٹ آئٹم لاؤں۔“ ایقان ہنس دی۔
 ”بد تمیز کہیں کے“ آج منوں حلوائی کے سارے موسٹ فیورٹ آئٹم نیچے ٹیبل پر موجود ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ایک عدد فوٹو گرافر درکار ہے جو ہم سہیلیوں کے اچھے اچھے فوٹو بنا دے۔
 ”اوہ نو۔ پلینز پھپھو! یہ اپنے بس کا کام نہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔
 لیکن وہ ایقان ہی کیا جو کسی کی معذرت کو خاطر میں لاتی۔ اسے کھیچتے ہوئے حسیں کے جھر مٹ میں لے گئی جہاں لڑکیوں کو ہنسنے ہنسنے اور صرف ہنسنے کا کام تھا۔

شہلا نے آج پھر اپنی گھٹاؤں کو کسی کے دل پر برسنے کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ میرون، بلیک اور وہائٹ کنٹراسٹ کے امیر اینڈ ڈسٹ میں وہ بے تحاشا لوہے رہی تھی۔ میرون آئی شیڈ سے سچی سیاہ آنکھیں چند ایک بار نہایت بے نیازی سے اس کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں اور ایک شناساسی چمک کے سوا ان میں کچھ نہ تھا۔

ایقان کو مینوں اس حادثے کا غم رہا تھا۔

شہلا کا داخلہ میڈیکل میں ہو گیا تھا۔ ایقان کو سائنس کے خشک سبجیکٹس میں دل چسپی نہ تھی۔ اس نے آرٹس کے مضامین منتخب کر لیے۔ یوں ان دنوں کی راہیں قدرے جدا ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ جب بھی ملتیں اتنے ہی والہانہ پن سے ملا کرتیں۔ ایک دوسرے سے اپنی باتیں شیئر کرتے ہوئے۔ آدھی آدھی رات تک سردی گرمی سے بے نیاز لان میں چل قدمی کرتیں، سرگوشیوں میں باتیں کیے جاتیں۔ ان دنوں ان دنوں کے انداز بے حد رازدارانہ ہو گئے تھے۔ ان کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ شہلا کے گھر سے بار بار فون آتے تب وہ گھر جانے پر رضامند ہوتی تھی یا ایقان اگر اس کے گھر گئی ہوتی تو اسے واپس لانا دشوار ہو جاتا تھا۔ ہاشم سے اکثر بستر اس کا سامنا ہوتا تھا۔ اس کا حسن ان دنوں دو آتشہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے اتنی اچھی اتنی خوبصورت لگتی تھی کہ وہ گھبرا کر سر جھکا لیا کرتا۔

”تم کب تک یونہی بے وقوفوں جیسی محبت کرتے رہو گے؟“ رافع اسے سوچ میں گم دیکھ کر چڑ جاتا۔

”مطلب؟ میں نے کیا بے وقوفی کر دی؟“

”تم اس سے کچھ کیوں نہیں؟“

”کیا؟“ وہ حیران ہوتا۔

”وہی بات جو فلم میں ایرو ہیروئن سے پہلی یا دوسری ملاقات میں ہی کہہ ڈالتا ہے“ رافع ہنسی سے کہتا۔

”شہلا؟“ وہ بے بسی ہوتا۔ ”اپنے آپ کو اس کی نظروں میں ذیل کروں؟“

”پھر اس کو شہلا کا انجام کیا ہو؟“ رافع کے سوال پر ہاشم سوچ میں پڑ جاتا۔

ایک دن شہلا ایک بے وفار مافی انداز میں اس عشق پوشیدہ کا انجام سامنے آیا تھا۔ شہلا نے اپنے کلاس فیلو سے لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔

میڈیکل کے میسرے بھالی میں ہی ایقان نے شہلا کی شادی کر لی تھی۔ ”حیات دلا“ میں جس نے خبر سنی

ہاشم کی معلومات بے غور چاہت کے لیے یہ بھرا یک شدید شاک جیسی تھی۔ اس کے وجود میں زلزلہ آیا تھا۔ اور سب کچھ جیسے لمبا میٹ ہو گیا۔ شدید ڈپریشن کے باعث اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر دینا پڑا۔ یوں ”حیات دلا“ کے

بچوں میں جگے جگے یہ خبر پھیلی تھی کہ ہاشم ایقان کی سہیلی کو بے حد وحساب چاہتا تھا۔

ایقان چپکے چپکے پھرتی تھی۔ اپنے گھر والوں کی نگاہوں سے بچتی پھرتی تھی۔ پھر عاشر کا رشتہ آیا اور وہ دنوں میں بیاہ کر لیا۔

کچھ دنوں میں سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ وقت کی دھیرے دھیرے گرتی پھوار ہریاد کو دھندلا کرتی گئی۔ لوگ بھول بھال گئے۔ شہلا کی لومیرج ایقان کا قصہ، ہاشم کا ڈپریشن، قصہ پارینہ بن گئے۔ ہاشم ایک بے حد سنجیدہ طبع

نوجوان کے روپ میں اپنی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔ تب سال بھر بعد خبر ملی تھی کہ شہلا طلاق لے کر اپنے والدین کے پاس لوٹ آئی ہے۔ وہ ماں بننے والی تھی اور اس نے پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے

وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔ میڈیکل میں اس کا داخلہ یقینی ہو چلا تھا۔ ہاشم نے تصویریں مکمل کر کے کیمرو ایقان کے حوالے کیا اور دل کے فریم میں اس کی مسکراتی تصویر سجا کر چلا آیا۔ چند دن بعد رافع اس کے پاس پہنچا۔

”تم پچھو کی دوست میں انٹرنسٹڈ ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

ہاشم کی شہ گم ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر جلدی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ اس نے حواس باختگی سے پوچھا۔

رافع لب بلیچ کر مسکرا دیا۔

”تمہارے بھوت بنے۔ رات کو میرے پاس آیا تھا۔ شہلا شہلا کرتا ہوا۔“

”بے چپ کر۔“ ہاشم نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کوئی سن لے گا۔“

”اور جو کوئی یہ سب دیکھ لے؟“ اس نے ایک لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”وہ کیا کہے گا؟“

”کیا ہے یہ؟“

”تمہاری خاموش محبت کا منہ بولتا بلکہ حلق پھاڑ کر چیخا ثبوت۔“

ہاشم نے لفافہ جھپٹا اور میز پر الٹ دیا۔ پوری میز پر شہلا کی تصویریں بکھر گئی تھیں۔ وہ سب ہی شہلا کی تصویریں تھیں۔

”پچھو نے مجھے بعد اصرار بھیجا تھا رول دھلوانے کے لیے وہ دعوت کی تصاویر دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دعوت میں سوائے شہلا کے اور کوئی شریک نہیں ہوگا اب تم کہو تو میں یہ تصاویر پچھو کو دے دوں؟“

ہاشم سر تھاٹھے بیٹھا تھا۔ اپنی اس بے اختیار حرکت سے وہ خود لا علم تھا۔ اس روز وہ شہلا کو سنا سنا کر دیکھ کر بے خود ضرور ہوا تھا لیکن اتنا بے خود ہو گیا تھا کہ اسے خبر نہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر اس کی تصاویر بنا ڈالی تھیں۔ اپنی باتوں میں مگن، قہقہے لگاتی، لہزد شیرازوں کو اس حادثے کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ البتہ چند ایک گروپ فوٹوز تھے جو انہوں نے خاص طور پر ساتھ کھڑے ہو کر بنوائے تھے۔

”کیا کہتے ہو؟“ رافع نے اسے گھورا۔

”اب کہنے کو کیا بچا ہے؟“ وہ شرمساری سے بولا۔

”یہ سوچو جو تولوں سے کیسے بچو گے؟“

”تم سوچو۔ دوست ایسے وقت میں ہی کام آتے ہیں۔“

”یہ دوستی اس وقت کہاں تھی جب پیٹ میں واٹر ہی ہال رہے تھے؟“ رافع نے سر جھٹکا۔

”بدستی ہے تو ہے ورنہ تم یہ تصاویر مجھے نہیں پچھو کو دیتے۔“ ہاشم ہنسا۔

رافع نے اسے غصے سے گھورا۔

”شرم تو نام کو نہیں ہے۔“

”شرم ہی تو ہے۔“ ہاشم منمنایا۔

”اب یہ تصویریں رکھو گے یا پھاڑ ڈالو؟“ اس نے اکتا کر پوچھا۔

اس بار ہاشم نے اسے غصے سے گھورا تھا۔

PHOTO

ایقان کو بالآخر اطلاع دی گئی کہ رول خراب تھا۔ چند ایک گروپ فوٹوز ٹھیک آئے ہیں باقی سب تصاویر ضائع ہو گئی ہیں۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ بٹرس پر کھڑی خود سے اور پانچل ہواؤں سے الجھ رہی تھی۔ فضا میں بے حد خنکی تھی۔ اسے سردی لگنے لگی لیکن اس نے توجہ نہ دی۔ یونہی دونوں بازو اپنے گرد لپیٹے وہ گئے دنوں کے اور اتر پلٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک خاموش طبع سنجیدہ سالزکا۔ جسے اس نے کبھی اس بات سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی کہ وہ اسی گھر میں رہتا ہے جس میں اس کی عزیز ترین سہیلی رہتی ہے۔ بس ایک موہوم سا واقعہ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس نے سفید رنگ کا بے حد اسٹائلش سوٹ سلوایا تھا۔ اس کے متناسب جسم پر وہ لباس سج گیا تھا۔ کمر تک لائے سیاہ بال کھولے وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی جب ایتقان چلی آئی۔

شہلا نے اسے شہر کے مشہور ٹیلر کا نام بتایا۔
”دیکھا میں بھی کہتی ہوں یہ تو سارا سلائی کا کمال ہے۔ اف یہ میری اماں بھی نا“ محلے کی درزن کی جان نہیں چھوڑتیں۔ مجھ سے کہتی ہیں تم خود سلائی سیکھو اور اپنے کپڑے سیاہ کر دو۔ پچھلی صدی کی باتیں کہہ رہی ہو۔ آؤ نا شہلا! میں اماں کو تمہارے کپڑے دکھاؤں گی۔ ان سے پوچھوں بھلا ان کی درزن سی سکتی ہے یا نا؟“ لیکن ایتقان میں۔ ”اس کی بات لبوں میں ہی رہ گئی۔“

وہ اس کا ہاتھ تھامے اپنی دھن میں بولتی اسے ”حیات وہاں تک کہ“ شہلا کو بال لپیٹ کر جوڑا تک نہ بنانے دیا تھا۔ تب وہاں کھڑے ہائیم کی شریٹ کے بٹن میں اس نے پال پھنس گئے تھے۔
اف! اسے کس قدر شرمندگی ہوئی تھی۔ بال کھینچنے کے دوران اس کی ٹیٹھیں کا بٹن بھی ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن اس نے بے چارے نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ بے حد سیدھا سا دانا جوان تھا۔ خود میں مگن رہنے والا، نیچی نظروں کے ساتھ مخاطب کرنے والا۔ بعد میں جب بھی اس کا سامنا ہوتا، شہلا کو وہ یاد آ جاتا۔ اس کے لبوں پر ہنسی مسکائی لیکن وہ دنیا ہی سنجیدہ رہتا تھا۔

اور اب اتنے سال بعد وہ کہہ رہا تھا کہ اسے شہلا سے محبت تھی! بھلا کیسی محبت تھی یہ؟ لوگ اس طرح بھی کسی کو چاہ لیتے ہیں کہ بوند بھری نہ برے؟ محبت تو وہ ہے جو ٹوٹ کر برے۔ جل تھل کر ڈالے۔ تن من بھیگ جائے۔ سانس لینے کی سکت نہ رہے۔

وہ محبت جو ابراہیم جیلانی نے اس سے کی۔ وہ محبت جو شہلا نے ابراہیم جیلانی سے کی۔
کالج میں پہلے دن پہلی نگاہ میں اس کا سیر ہونے والا ابراہیم جیلانی بھی ایسا نہ تھا کہ نظر انداز کیا جاتا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ دونوں پورے کالج کی گفتگو کا محور بن گئے تھے۔ پروفیسرز تک ان کی طوفانی محبت سے واقف تھے۔ وہ دونوں ہر جگہ ہر بل ساتھ ہوتے تھے۔

ابراہیم کا تعلق اندرون ملک سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ گھوٹ میں ان کی شاندار حویلی تھی جہاں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ ابراہیم پڑھائی کی غرض سے شہر میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے والد اسے شہر بھیج کر اس سے بے خبر نہ تھے۔ بہت جلد ان کے عشق کی خوشبو شہر بھر میں پھیل گئی تھی۔

”یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ہم خاندان والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟“ ابراہیم کی ماں نے سخت احتجاج کیا تھا۔
”شہلا بیٹی! اپنے رستے اس سے علیحدہ کر لو یہ ایک بوڑھے باپ کی عاجزانہ استدعا ہے۔“ محسن علی صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

ابن دونوں نے بنا سوچے سمجھے کورٹ میرج کر لی تھی۔ محبت کا زہر نس نس میں پھیل چکا تھا۔ اسے رگوں سے

نکال کر پھینک دینے کا بارادونوں میں نہ تھا۔
ابراہیم اسے اپنے فلیٹ پر لے آیا تھا۔ وہ دونوں ساتھ کالج جایا کرتے، ساتھ لڑتے، دونوں جانب کے خاندان والے حالت سکتے کے حالت میں تھے اور وہ ”سکتے“ کی اس حالت کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔
شہلا کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

اس کا چاہنے والا اسے ہر لمحہ سرائے والا اب دن رات اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی جھولتی لٹ کو ہٹا کر اس کے کان میں میرگو شیاں کرتا، وہ اپنی گردن پر اس کے سانسوں کی مہک محسوس کرتی تھی۔ ساری دنیا اس کی ہتھیلی پر سمٹ آئی تھی۔

تب ایک دن ابراہیم کے والد انہیں لینے آ گئے۔ انہیں اپنی ضد مہنگی پڑی تھی اب وہ سستا سودا کرنا چاہتے تھے۔ وہ شہلا کو اپنی بہو کے روپ میں قبول کرنے پر آمادہ تھے۔

ابراہیم نے حد خوش تھا۔ اپنے باپ کے بغیر وہ کچھ بھی نہ تھا اور باپ کے ساتھ بہت کچھ۔
وہ جیلانی ہاؤس چلی آئی۔ دہن کی طرح سج سنور کر۔ سرخ جوڑا پہن کر ”ڈھیر سارا زور پہن کر۔“ ”جیلانی ہاؤس“ میں۔

”یہ سہیلی ہیں۔“ اسے ایک معمر عورت سے اسے ملواتے ہوئے بتایا گیا۔
شہلا نے بولی نظروں کے ساتھ سلام کیا۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر نوٹوں سے بھرا تھال اس پر سے واز کر ملازمہ کو بکرا دیا۔

”اس سے ناؤ۔“ ٹامیک اور عورت اس کے مقابل تھی۔
”خاتون بی بی۔“ ابراہیم پہلی بیوی۔
”کے سر پر ہونٹ۔“ اسے سامعیتوں پر دھوکہ ہوا۔

”اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔“ عورت کو دیکھا جس کے چہرے پر دیرانی تھی۔
”کوئی؟“ اس نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں ہیں یہ؟“

”تمہاری سوت۔“ ابراہیم کی بیوی۔ ”انہوں نے پھر اطمینان سے بتایا تھا۔“ اسے اپنی بڑی بہن کی طرح دیکھا۔
”شہلا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسے پھر کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا رہیں ہوئیں کس نے کیا منہ دکھائی دی اسے علم نہ تھا۔ اسے صرف آنے والی رات کا انتظار تھا۔

ابراہیم جیلانی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اس نے بری طرح سے جھٹک دیے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے حیران ہوا پھر سکر اڑا۔
”یار! پہلے بندے کو کلینر نس کا موقع تو دو۔“
”اتنا بڑا ہو کا اتنی چیٹنگ!“ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں گئیں ”لہجہ بھرا گیا۔“
”کوئی دھوکا نہیں ہوا۔ کوئی چیٹنگ نہیں ہوئی۔ تم میری بات سن لو۔“ وہ مصالحت انداز میں بولا۔
”مجھے کچھ نہیں سنا۔ تم جاؤ یہاں سے!“ وہ چیختی تھی۔
”آہستہ!“ ”تنبیدہ ہوا۔“ ”یہاں یہ برتاؤ نہیں چلے گا۔ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔“
شہلا نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

PIOTO

اور ایسے میں دل کے تالاب میں ایک اور پتھر آگرا تھا۔ دائرے در دائرے اس کے اندر چکرار ہے تھے۔ نیند کو لیاں بھی اس کے پریشان ذہن کو سکون بخشنے سے قاصر تھیں۔



”ربیعہ! گہری دھند میں آہ سے مشابہہ آواز ابھری تھی۔
وہ آواز بے حد دکھی تھی۔ برف کی مانند سرد اور شعلے کی مانند دھواں دیتی ہوئی آواز۔
ربیعہ کا جسم کانپ کر رہ گیا۔ اس آواز نے اس کے دل کو تیز دھار چھری کی طرح اندر تک چیر ڈالا تھا۔
”ربیعہ! پالی دور ربیعہ۔۔۔۔۔ آواز میں حسرت تھی بے چارگی تھی۔
ربیعہ نے پالی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ دور کہیں سے پالی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ کہیں پر کوئی جھرنابہ رہا تھا۔ یا شاید برسات ہو رہی تھی۔ ربیعہ اس دھند میں آگے بڑھی۔۔۔ بڑھتی چلی گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اندھول کی طرح ٹٹوتے ہوئے وہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔
”آہ! ایک سرد آواز اس کا دل ہلا کر رکھ دیا۔
”جلتی، جلتی، تپتی آہ۔۔۔۔۔ جیسے آبلہ پا اپنی تخری امید بھی کھو بیٹھے۔
”ربیعہ! پالی کرسے جلد۔۔۔۔۔ روتے پالی لاؤ۔“
ربیعہ دیوانوں کی طرح دوڑنے لگی۔

پالی کی آواز آگئی۔۔۔۔۔ جھرنابہ جھرنابہ رہا تھا۔ سب شے پائیدیں گر رہی تھیں۔ پالی کہیں بے حد قریب تھا۔ لیکن اس نے چاروں طرف گہری دھند بے بسی بن کر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے بے بسی کا انتہا پر پہنچ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔
اور اس کی آنکھیں کھلی گئیں۔ دیوانوں کی طرح اس نے دوڑنے لگی۔ وہ کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ساتھ والے کمرے سے آتی ہوئی کھانسی کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ کھانسی سے کھانسی کا کمرہ ہے۔
خالی خالی آنکھوں سے وہ کچھ دیر بیٹھی کمرے کی چیزوں کو گھورتی رہی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔
”شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔“ اس نے کوفت سے سوچا۔ ”مجھے ایسے خواب کیوں آتے ہیں۔ ان خوابوں کا پس منظر کیا ہے۔ کوئی الجھن؟ میرے اندر دکھ ضرور ہیں لیکن الجھن کوئی نہیں۔ ان خوابوں کا رشتہ کیا میرے دکھ سے ہے؟ میرے دکھ سے؟ یا یا کسی اور کے دکھ سے؟ کس کا دکھ دادی؟ دادی کا دکھ لیکن کیا؟“
اسے دادی یاد آگئیں۔ گوری چٹی، میدے سے گندھی ہوئی اس کی پیاز کی دادی جان۔ جن کی کوئی نماز قضا ہوتے اس نے نہ دیکھی۔ جو اکثر بیشتر تلاوت کرتیں یا ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتی رہتیں ہاتھ میں اگر تسبیح نہ ہوتی تب بھی ان کے لب ہلا کرتے۔ وہ کیا پڑھتی تھیں؟
ربیعہ اکثر غیر شعوری طور پر ان کی بدبواہٹ پر کان لگا دیا کرتی۔

”استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ معاف کر دے میرے رب۔۔۔ معاف کر دے۔ گنہ گار ہوں، خطا کار ہوں، سیاہ کار ہوں، مجھے معاف کر دے رب العالمین۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ ربی۔۔۔“
وہ اپنی کلمات کا ورد کیے جاتیں۔ ربیعہ کو اس لمحے ان کا چہرہ بہت بھلا معلوم ہوتا۔ سفید نورانی چہرے پر اور ہی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ گالوں پر لہو کی سرخ گہری بھرنے لگتی۔ ہاتھ پر ننھے ننھے قطرے چمکتے۔
ربیعہ بے حد محویت سے ان کا استغراق دیکھتی۔ پھر اس کا دل نماز پڑھنے کو چاہتا۔ اس کا دل بھی اتنے ہی

خوشی سے قبول کیا تھا۔
منہ دھو کر وہ بچن میں چلی آئی۔ ایک پلیٹ میں پراٹھا بنا رکھا تھا۔ دوسری پلیٹ میں رات کا بچا ہوا سالن تھا۔
چولہے پر پڑے سلور کے گندے سے ساس پین میں غالباً "چائے کا پانی کھول کھول کر آدھا ہو چکا تھا۔ ربیعہ کا جی
مٹلایا۔ اسے کبھی بھی ایسی گندگی کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔
دادی کی صفائی پسندی تو خیر محلے بھر میں مشہور تھی، لیکن اس کے آس پڑوس کے گھروں میں بھی گھروں کا عموماً
اور باورچی خانے کا خصوصاً "بے حد وحیان رکھا جاتا تھا۔
ربیعہ نے کھولتا ہوا پانی سنک میں گرا دیا اور ساس پین کو مانجھنے لگی۔ صاف ستھرا ساس پین اس نے چولہے پر
رکھا تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔

وہ پیرھی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔
بینا کچھ دیر بعد پین میں داخل ہوئی تھیں۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ایک نظر انہیں دیکھا۔
"تم ناشتہ کر لو تو ذرا اپنے پھوپھا کا کمرہ صاف کر لو۔" وہ بولیں۔

ربیعہ کے ذہن میں وہ کمرہ اور اس کی اشیاء گھوم گئیں۔ اس کا نوالہ حلق سے اترا نامشکل ہو گیا
"چھا۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"وہ تو میری بڑی سی کام کرتی ہوں۔ لیکن کھانا پکاتے پکاتے وقت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اب تم آہی گئی ہو تو ظاہر
سے گھر کے باقی افراد کی طرح تمہیں بھی کوئی نہ کوئی ذمہ داری سنبھالنا ہوگی۔ تم اپنے پھوپھا کا کام کر دیا کرو۔ باقی کام
تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔ چائے بن گئی ہے۔ چولہا بند کر دوں؟"

"نہیں۔" وہ پھنسی پھنسی کر سر اٹھایا۔ "کرو بجھے۔"
"ان کے کمرے میں جی پڑی ہے اسے روز صاف کیا کرو۔ گندگی باہر گلی میں پڑی بالٹی میں گرا دیا کرو۔ جمعدار
روز بستر کے پاس سے دھو کر صاف کر کے واپس کمرے میں رکھا کرو۔ وہ بے چارے اب اٹھ کر ہاتھ
روم بنا رہے ہیں۔ ان کی پڑی ان پر۔ ورنہ کس کا جی چاہتا ہے ایسے بستر میں ہی فارغ ہونے کا
یوں تو یہ ثواب ہے۔"

انہوں نے رک کر اس کی بات سنا لی۔ لیکن اس کی پلیٹ میں پراٹھا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سالن پر
"ان کے بستر کی چادر ہر دوسرے روز تبدیل کر دیا کرو۔ ان کا ایک جوڑا روز استری کر کے ٹانگ دیا کرو۔ لڑکے
رات کو آتے ہیں خود ہی تبدیل کروائیں گے۔ یہ ہم عورتوں کا کام تو ہے نہیں۔ باقی یہ ہے کہ ٹب میں پانی بھر کر ان
کا ہاتھ منہ دھو کر انہیں تیار کیا۔ ان کی دوائیوں کا حساب کتاب میں تمہیں بتا دوں گی۔ کس وقت کون سی دوائی
مقدار میں دینی ہے ذہن نشین کر لینا۔"

انہوں نے خود ہی چائے چھان کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ربیعہ کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس نے کبھی
اپنے گھر کا ٹوا ٹکٹ نہ دھویا تھا۔ ایسے کاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہیں بھاگ
جائے یا پھر حواں دھار روئے۔ بس وہ کام اسے نہ کرنا پڑیں۔ جن کی فہرست اسے سنائی جا رہی تھی۔
"اور بال۔ منور بھائی کو پیاس کی بیماری ہے۔ انہیں ہر وقت بس پیاس ہی لگی رہتی ہے۔ کورودیا بار بنتا ہے ان
کے کمرے کا۔ خیال رہے، کبھی وہ کور خالی نہ ہونے پائے ورنہ سمجھو تمہاری شامت ہے۔ تم سن بھی رہی ہو نہیں
کیا کہہ رہی ہوں؟" وہ جھلائیں۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلادیا۔ سر اٹھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی

انہماک سے اپنے رب کو پکارنے کے لیے ہمت نہ کر سکتا۔ وہ وضو کرتی۔ اہتمام سے دوپٹہ باندھتی اور جاء نماز پر بیٹھ جاتی
پھر وہ دعا کو ہاتھ اٹھا کر دادی کے سے انداز میں کہتی۔

"معاف کر دے اللہ میاں جی۔ پیارے اللہ میاں جی۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے اچھے اللہ میاں۔"
وہ کہے جاتی لیکن اس کے ماتھے پر قطرے نمودار نہ ہوتے۔ اس کے گالوں پر تیش محسوس نہ ہوتی۔ وہ منہ
ہاتھ پھیر کر جاء نماز سے اٹھ جاتی۔ اس کا جی ذرا سی دیر میں ہی اپنے اللہ سے مطمئن ہو جاتا۔
"دادی! میں سمجھتی ہوں آپ؟" وہ ہلکے ہلکے انداز میں پوچھتی۔

وہ آہستہ سے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتیں۔ وہ دروازے تک پہنچتی تو پیچھے سے ان کی آواز آ جاتی
"ربیعہ۔"

"جی دادی۔" اس کے قدم تھم جاتے۔
"جلدی آ جانا۔ میں روٹیاں پکا رہی ہوں۔"

"جی اچھا دادی جان۔" وہ نماز پڑھ کر بڑی سعادت مند بنی ہوئی ہوتی۔
دروازہ کھول کر مینا اندر آئی تھیں۔ ربیعہ اپنے خالوں سے چوڑھائی لپی۔ ایک گہری نگاہ میں وہ بچہ پروڈال
اور چند لمحے دیکھتی رہیں۔ نجانے وہ ایسا کیوں کرتی تھیں۔ وہ جب ان کی بیچھے بڑے لگاؤ والی چند لمحے اس کے گندے
دھیان سے تکا کرتی تھیں۔ ربیعہ ان کی آنکھوں میں جھلکتی آنکھیں دیکھ کر اندر آ جاتی لیکن وہ پھر نگاہیں اسے اپنے
مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیتیں۔ ان پتھریلی نظروں نے اسے کبھی خود سے گزر جانے کا اذن نہ دیا تھا۔
"میں نے کہا جگا دلوں تمہیں۔ دن کے دس بج رہے ہیں۔ تم گھوڑے بیچ کر سوئی پڑی ہو۔ اپنے گھر میں تم آ جا۔
دیر تک سوتی تھیں؟"

ربیعہ شرمندہ ہو کر ستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر کو تہہ لگانے لگی۔
مینا بانی بستر سینے لگی تھیں۔

"آپ رہنے دیں میں کر لوں گی پھپھو۔"
"پھپھو! وہ بھڑک اٹھیں۔ "میں کس رشتے سے تمہاری پھپھو بن گئی؟ مجھے پھپھو وہ پھو کہہ کر مت
پکارنا۔"

ربیعہ کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ چہرے پر سفیدی چھا گئی۔ وہ بے طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔
"سوری۔ آئی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "وہ ترانہ آپ کو پھپھو کہتی ہے تو میں نے سوچا۔"
"خیر۔ آئندہ خیال رکھنا۔ جلدی سے منہ دھو لو۔ میں نے تمہارے لیے ناشتہ بنا دیا ہے۔" وہ کمرے سے باہر
چلی گئیں۔ ربیعہ نے آنکھیں بند کر کے بے بسی سے سر ہلایا۔ یہ عورت اس کے لیے ایک معتمد ثابت ہو رہی تھی۔

پل میں تولہ پل میں ماشہ والا مزاج سمجھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔
اسے ترانہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا اسے بھی اس گھر میں ایک سہارے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی
تھی۔ ربیعہ نے محسوس کیا تھا مینا اور صولت نے مل کر گھر اور اس کے کیمونوں کو اپنے دباؤ میں اس طرح سے لیا ہوا
تھا کہ کوئی بھی ان کے مشترکہ محاذ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک فوج زدہ شخص اپنے کمری میں پراکھانتا، کھنکھارتا رہتا تھا، کسی کو اس کی اور اسے کسی کی پروا نہ تھی۔
دو دنوں لڑکے پر اسرار شخصیتوں کے مالک تھے۔ کم کم دکھائی دیتے۔ کسی سے کمری مخاطب ہوتے۔ ایسے میں ترانہ
"نو حقیقتاً" ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ وہ گھر کی واحد ہستی تھی جس نے ربیعہ کی آمد کو بے حد

تھیں۔ وہ انہیں اپنے آنسو نہ دکھا سکتی تھی۔ وہ چپ چاپ انہیں حلق سے اتارنے کی کوشش میں مصروف رہی۔
 "میں نے ترانہ سے کہا ہے۔ تمہارے لیے کسی نوکری کا بندوبست کرے۔" وہ پھر گویا ہوئیں۔
 ربیعہ کا دل اچانک مطمئن ہوا۔ گھر سے باہر کی نوکری یقیناً گھر کی اس نوکری سے بہتر ہوتی۔ اسے اپنی عافیت کی ایک راہ نظر آنے لگی۔
 "لیکن میں نے اس سے کہا ہے کہ نوکری شام کی ہونی چاہیے۔" انہوں نے مزید کہا۔ "صبح میں تو مجھے تمہارا ضرورت ہے۔ میں اکیلی اس گھر میں جان کھپا کھپا کر ادھ موٹی ہو چکی ہوں۔"
 وہ اطمینان سے چن سے باہر نکل گئیں۔
 ربیعہ نے سر ڈال دیا۔



وہ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر جانے کے لیے کڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا اور اندر داخل ہو گئی۔
 "کھوں کھوں کھوں۔" بستر پر والا چارو جو دہری طرح کھانسنے رہا۔
 ربیعہ کے اندر ہنر ردی اور خلوص کی لہریں اٹھیں۔ بھان کے قریب پہنچی۔
 "پھوپھا جی۔" وہ ان کے پاس بیٹھنے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ ان کے لعفن زدہ بستر پر بیٹھنا اتنا آسان کام نہ تھا۔ بستر کے نیچے کی ہوئی بالٹی پر کھیاں بھنھنا انہیں تھیں اور اس کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔
 بے درپے ابکائیوں سے ربیعہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر ایک لمحہ سے پیشتر کمرے سے باہر نکل گئی اور دروازے سے ٹیک لگا کر ناپسے لگی۔

"یا اللہ۔" اس کے دل سے دردی کی صورت نکلا تھا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

اسے گالوں پر تیش کا احساس ہوا۔ ہاتھ پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ خدا کو پکارنے پر جواب اگر اتنے قریب سے ملے تو کیا کیفیات ہوتی ہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا۔

اس نے ایک نگاہ پھر کمرے کے اندر ڈالی۔ بستر پر ادا ہوا وہ شخص ایک انسان تھا۔ اس کے اندر بھی حیات کام کرتی تھیں۔ اسے بھی اچھے برے کی تمیز اگر اب نہ رہی تھی تو کبھی ہوگی۔ وہ گویا بالکل خالی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے وہ بالٹی اٹھائی اور تقریباً "بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔ بالٹی کو باہر گلی میں رکھی بڑی بالٹی میں اوندھا کر وہ تیزی سے ٹواٹلٹ میں چلی گئی۔ وہاں بڑے برش سے اس نے اچھی طرح اس گندی بالٹی کو صاف کیا تھا۔

اسے دھو کر اس نے ٹواٹلٹ میں رکھا فائنل چھڑکا اور کچھ دیر کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔ پھر وہ واپس کمرے میں چلی آئی۔

وہ کمرہ کم اور کباڑ خانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ فرش ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے اس پر جھاڑو نہ دی گئی ہو اور جنا بیگم کا دعوا تھا کہ وہ روز اس کمرے کو صاف کیا کرتی تھیں۔

ربیعہ کو وہ سب کچھ صاف ستھرا کرنے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ اس نے دوائیوں سے الٹی ہوئی ٹرے صاف کی جس میں پرانی خالی اور بھری شیشیاں تھیں۔ ایک پاؤں ہو جانے والی دوائیں تھیں۔ ضروری اور غیر ضروری نسخے تھے۔ اس نے بے حد محنت سے وہ ٹرے صاف ستھری کر کے منور امین کے سرہانے رکھی۔ دیواروں سے مٹی اور جالے صاف کیے۔ ڈسٹنگ کر کے دیگر اشیاء کو چمکایا۔ جھاڑو لگا کر کچرا سمیٹا اور رگڑ رگڑ کے پونچھا لگا کر

گندافرش چمکانے کی اپنی سی کوشش کی۔ کور میں رکھا ہوا پانی بدبو دے رہا تھا۔ غالباً "اس کو لڑ کو کبھی دھل کر صاف ہونے کا شرف حاصل نہ ہو یا تھا۔ ربیعہ نے کو لڑ کا پانی پیمینک کر اسے اچھی طرح دھوا نچھ کر صاف کیا اور تازہ پانی میں برف ڈال کر اسے واپس کمرے میں پہنچایا۔
 پھر وہ ٹب میں پانی بھر کر کمرے میں لے گئی تھی۔
 "پھوپھا جی! ہاتھ منہ دھولیں۔"

انہوں نے پیٹی پیٹی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسی ہی پیٹی پیٹی آنکھوں سے وہ اسے پچھلے روز ڈھائی گھنٹے سے جان توڑ محنت کرتا دیکھ رہے تھے۔
 "میں صابن اور تولیہ لاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے گئی تھی۔



رات کو ترانہ اپنے باپ کے لیے پھل لائی تھی۔ اسے غالباً "آج تنخواہ ملی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی سی تھی۔

منور امین کو نسخے کے مطابق گولیاں کھلا رہی تھی۔ ترانہ کمرے میں داخل ہوئی پھر ٹھنک کر رک گئی۔ اس نے کمرے کے کونے میں غلطی کا احساس لکھا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور خود کو یقین دلایا کہ اس سے کچھ نہیں ہوئی تھی۔ وہ واقعی اپنے باپ کے کمرے میں ہی داخل ہوئی تھی۔

خفاف ستھرے بستر پر اس کا باپ صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ روشن معلوم ہو رہا تھا۔ فرش بالکل صاف اور آجڑوں سے پاک تھا۔ کمرے میں شاید اگر بتی جلائی گئی تھی۔ ہلکی ہلکی بھینکی بھینکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

ستہ آہستہ چلی ہوئی تھی۔ آئی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی ثابت تھی۔

ربیعہ نے اشبات میں سر ہلا کر اس کے پاس سے گزرتی ہوئی چمکی تھی۔
 "خدا کا افس کا جھلا کر ہے۔ کھوں کھوں کھوں۔" منور امین نے پانی کا گلاس خالی کر کے اسے دیا۔

ان کا دایاں حصہ کام نہ کرتا تھا لیکن بائیں ہاتھ سے وہ اپنے تقریباً "بھی کام کر لیا کرتے تھے۔ ترانہ کی آنکھوں میں آنسو جھک رہے تھے۔ اس نے پھلوں کا لفافہ باپ کے سرہانے رکھی میز پر رکھ دیا۔
 "تھنک یو ربیعہ!" وہ ممنونیت سے بولی۔

رات کو وہ دونوں چھت پر چلی آئی تھیں۔ صولت صحن میں ماں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ ترانہ نے اسے بھی چھت پر چل قدمی کی پیش کش کی تھی جسے اس نے ناک چڑھا کر رد کر دیا تھا۔
 "میں کھانا کھا کر سوؤں گی۔" وہ رکھائی سے بولی تھی۔

اس کے انداز میں اپنی ماں کا سا اکھٹرس تھا۔
 "میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں ربیعہ۔ میں ان کی بیٹی ہوں لیکن یقین مانو کتنے دنوں سے میں اس کام کے لیے ہمتیں مجتمع کر رہی تھی جو تم نے پلک جھپکاتے میں کر دکھایا۔ ابو کا کمرہ اور انہیں یوں صاف ستھرا دیکھ کر میرے دل سے بے اختیار تمہارے لیے دعا نکلی۔ جس گندگی کو صاف کرنے کی ہمت بیٹی اور بہن میں نہ

تھی۔

”نہیں بھی تو ان کی بیٹی جیسی ہوں ترانہ۔“ ربیعہ خلوص سے بولی۔ ”انہیں یوں مجبور اور لاچار دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ یہ وقت تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ۔“

ربیعہ مسکرا کر رہ گئی۔

”پچھپھو کا بلوک تم سے کیسا ہے؟“ دونوں چھت کی دوسری منڈیر تک چلی آئی تھیں۔

ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو رہی۔ شرکی روشتیاں جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جھینگروں کی آواز سے خاموش ماحول میں اداسی سی پھیل رہی تھی۔

”یہاں بہت جیس رہتا ہے۔“ ربیعہ بولی۔

”ہاں۔“ کچھ دنوں میں زور کی برسات پڑے گی۔ پھر موسم اچھا ہو جائے گا۔ خیر، موسم کا کیا ہے ساری بات من کے موسم کی ہے۔ تمہارے من کا موسم کیسا رہتا ہے ربیعہ؟“ ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔

”شاید ایسا ہی۔“ وہ رک رک کر بولی۔ ”اداس، اداس، جس زور۔“

”کبھی تم نے اپنے اندر پھول کھلتے محسوس کیے ہیں؟“ ترانہ نے پوچھا۔

اس کے لمحے میں خوابوں کی سی بے یقینی تھی۔ ربیعہ نے چونک کر اٹھ کر دیکھا۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے پر رقم کیفیت دیکھ سکتی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ مسکرا کر چہرہ دیکھ رہی ہو اور سمجھتا ہے اس سے بدرجہا باتیں کر رہی ہو۔

”پھول تمہارے اندر کھلے ہوئے ہیں ہیں نا؟“ ربیعہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”شاید! وہ مسکرائی۔“

”لگتا ہے گلستانِ دل میں کوئی ”مالی“ پاشٹ ہو گیا ہے۔“ ربیعہ شہزادہ سے ہنس پڑی تو ترانہ چونک کر بچ پڑی۔ دونوں زور سے ہنس دیں۔

”بے وقوفوں کی طرح مت ہنسو۔“ کوئی ڈپٹ کر بولا۔

وہ دونوں ہی خائف ہو گئیں۔ تمدن سب سے اوپری سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ کب اوپر چلا آیا انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ شاید وہ اپنی باتوں میں کچھ زیادہ ہی گمن ہو گئی تھیں ورنہ اس کی اسٹاک پر آٹا اس کی ہاتھ سے قیل کی اسٹاک کے علاوہ دے دیا کرتی تھی۔

”آواز دوسرے گھروں میں جاتی ہے۔“ پھر مزید بولا۔ ”مجھے روٹی دو۔ بھوک لگی ہے۔“

اپنی بات کہہ کر وہ مڑ گیا تھا۔

”مجھے یہ لفظ ”بھوک“ بہت برا لگتا ہے ربیعہ۔“ ترانہ دھیرے سے بولی۔

”کیوں؟“ اس کا دھیان تمدن کی جانب تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے بولی۔

”بس نفرت ہے مجھے اس لفظ سے۔ اسے استعمال کیے بغیر بھی تو کھانا مانگا جاسکتا ہے، ہے نا؟“

ربیعہ نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

”چلو۔ نیچے چلیں۔“

”خنے کون کم بخت ہے۔“ فردوس بیگم نے تلملا کر ریسور پٹنا۔

اپنے کمرے سے نکلتی عریشہ کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ فون کی گھنٹی کی آواز سن کر باہر آئی رہی تھی جب فردوس بیگم نے ریسور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے ان کی آواز سن کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

”میا مری اس کی۔ ہم اپنے کو مشکل سے سنبھالتے ہیں انہیں مستی سو جھتی ہے۔ دوڑتے بھاگتے ہانڈی چھوڑ کر اس مردار کو سننے آؤ تو دوسری طرف سے ”ٹوں ٹوں ٹوں ٹوں“ ہونے لگتا ہے۔“

عریشہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی جسے ماں سے چھپانے کے لیے وہ پھر کمرے میں چلی آئی۔ وہ کبھی جھکتی واپس لیکن میں جا چکی تھیں۔

عریشہ نے کمرے سے جھانک کر ان کے نہ ہونے کا یقین کیا پھر تیزی سے چلتے ہوئے فون تک آئی۔ سب سے پہلا کام اس نے بیل کی آواز کم کرنے کا کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے پھر ”گھر گھر“ ہوئی۔ اس نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھتے ہوئے فون اٹھالیا۔

”بہت ہی ڈھیٹ شخصیت ہیں آپ۔“ اس نے ریسور اٹھا کر وائٹ کچکھائے۔

”عاشقی کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے جناب! اس وصف کے بنا عاشقی ناممکن۔“ چمک کر کہا گیا۔

”دن گالیاں پڑ گئیں تو عاشقی دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

”آپ بسم اللہ کیجئے۔ گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہونے کی قسم اٹھائی ہے ہم نے۔“

”کام میری والدہ زیادہ اچھا کرتی ہیں۔ کیسے تو فون انہیں دے دوں؟ اس نے شرارت سے لب دبائے۔

”والدہ! اس کے دامن میں خوشیاں بھرے۔ ہم پھر بھی انہیں اور آپ کو یہی دعاویں گے۔“ عریشہ کو بات سمجھ کر ہنسی آگئی تھی۔

”نہیں خدا کی قسم محنت کا پھل مل گیا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”یہ مدھر جھنکار پچھلے گھنٹہ بھر کی محنت کا صلہ لگی ہے۔“

”آپ جانتے ہیں۔“ وہ تار کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔

”کسی دل نہ رہا۔“ اس نے فریادیں کی گئی۔

”کادل۔“ پھر پھر۔ چاروں اور رنگ برنگ ستارے چمکنے لگے۔

”دیس بند ہو۔“ اس نے غصے سے دھمکی دی۔

”کل کس وقت کروں؟“

”وہ بے وقوفوں کی طرح۔“

”وہ بہرہ دہ ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اچھا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”میرا نام فراز ہے۔ آپ کا؟“

”عریشہ۔“

ماں کو بچن سے نکلتا دیکھ کر اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

”نافع۔“ عذرا بیگم نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے نافع کو پکارا۔

”خیر گیا۔“ جی ای۔ کیسے۔“ وہ مڑ کر ان تک آیا۔

”کیسے تیار ہے ہو؟“

”جی ہاں! دوست کی طرف جا رہا ہوں۔ کیسے کوئی سبزی یاد آگئی؟ آؤ، مٹر بھنڈی، کیا لاؤں؟“

”چلو ہٹو میرے منہ پر سبز یوں کے نام لکھے ہیں کیا؟“ وہ برامان کر بولیں۔
 ”جی نہیں میرے منہ پر لکھے ہیں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”مے دیکھتے ہی آپ کو سبزی مارکیٹ یاد آجاتی ہے۔“
 انہیں ہنسی آگئی۔

”اب بھلا بیٹوں سے اپنے کام نہ کہوں گی تو کس سے کہوں گی۔“ انہوں نے دلار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔
 ”بیٹوں کے ابا سے کہہ کر دیکھیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”وہ بھی کبھی انکار نہ کریں گے۔“
 ”شریر کہیں کا۔“ انہوں نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔ ”اب کچھ عقل سیکھ لو۔ بیاہ کر دیں تو سال بھر میں باپ بن جاؤ گے اور باتیں سنو تو نو عمر لڑکوں کی سی۔“
 ”اب بیاہ سے پہلے تو لڑکا ہی رہنے دیں امی!“ وہ ہنسا۔
 ”جی بات کے لیے زور کا تھا تمہیں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آئیں۔ ”مقتنی کر ڈالیں تمہاری؟ کوئی اعتراض تو نہیں نہیں؟۔“

وہ ہٹ پٹا کر رہ گیا۔
 ”آپ سنجیدہ ہو چلیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا اور ابھی تو کافی وقت ہے۔ ان خرافات کے لیے۔“
 خدا را سب سے پہلے مجھے اس خوش قسمت کے نام سے آگاہ کر دیجئے کہ کتنا نام قریبی میں یقیناً داری جس نے نکالا ہے۔ کون ہے وہ؟“

”عمر نشہ۔“
 ”اوہ نشہ۔“ اس نے آنکھیں میچیں۔ ”جس کا ڈر تھا۔“
 ”تو کوئی برائی سے بچ رہی ہیں؟“ انہیں برا لگا۔
 ”سو اے بچنے لگے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”تم میں کم ہو پکچنا تو کہو۔“ انہوں نے طنز سے اسے دیکھا۔
 ”دیکھنے مل کر آپ کو بہت سرائیں گے امی! فیصلے پر نظر ثانی کی اپیل ہے۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا۔
 ”نافع بیٹا! بات سن لو تسلی سے۔“ انہوں نے اسے پکارا۔ ”دیکھو میں صاف صاف بوجھ رہی ہوں تم سے پھر تمہاری وادی بات آگے بڑھائیں گی۔ ابھی اگر دل میں کچھ اور کچھ ہے۔“
 ”نہیں کہوں گا۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 انہیں اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا یہ تم ہی ہو۔“ انہوں نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام کر دیکھا۔ ایتان مسکرا دی۔
 ”تبادلہ گئی ہوں آنٹی؟ اب اتنی بھی موٹی نہیں ہوئی ہوں۔“ وہ شرارت سے بولی۔
 ”بدلی نہیں ہو۔“ وہ کسی ہی پیاری ہو۔ لیکن اس لیے نہیں آتا کہ مدتوں بعد اس گھر میں قدم رکھا ہے تم نے بناو
 رستہ ہی بھول گئیں۔“ منیوہ بیگم پیار سے بولیں۔
 ”رستہ کب بھولتا ہے آنٹی! وہ بھی بچپن کی ہم جولوں کے گھر کا رستہ۔ آپ کو بھی اب تک یاد ہوں گے اپنے

بچپن کے سب رستے۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔
 منیوہ بیگم چلتے چلتے رک سی گئیں۔
 ”شہلا گھر پر نہیں ہے؟“ ایتان نے پوچھا۔
 ”ہاں آنے والی ہے۔ تم بچھو تب تلک ہم باتیں کرتے ہیں۔“
 ایتان ان کے ساتھ لاؤنج میں پڑے صوفوں پر بیٹھ گئی۔
 ”تمہارا بیٹا عمر کا بہت اچھا دوست ہے۔“ وہ خوش ہو کر بتانے لگیں۔
 ”جی ہاں۔“ وہ ہنس دی۔ ”یہاں آتے ہی آپ کے گھر بھاگتا ہے کہ عمر سے مل کر آتا ہوں۔“
 ”چلو اچھا ہے۔ ماؤں نے بچوں کو درسے میں بہ دوستی دی ہے۔ چائے بناؤں تمہارے لیے یا ٹھنڈا پیوگی؟۔“
 ”دیکھنا کتنا اڑ گئی۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”لیکن شہلا کے آنے کے بعد۔“
 شہلا کچھ ہی دیر میں آگئی تھی۔ ایتان کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھی۔
 ”تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے ایتان؟“ وہ اس سے لیٹ کر خوش رہی۔
 ”ہاں سب کچھ یاد آگیا ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی نہ ٹالتی

تھی۔“
 ”بھلا بھلا ہے سنجیدہ ہوئی۔ ایتان کی بات میں گہرائی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ پھر وہ
 ”میں اپنے بدل کر آتی ہوں۔“
 ”نہیں ایتان میں مسکرائی۔“
 شہلا کے لیے کی بڑھ گئی۔ ایتان کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ ہاشم کا فون
 ”تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے ایتان؟“ وہ اس سے لیٹ کر خوش رہی۔
 ”ہاں سب کچھ یاد آگیا ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی نہ ٹالتی

تھی۔“
 ”بھلا بھلا ہے سنجیدہ ہوئی۔ ایتان کی بات میں گہرائی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ پھر وہ
 ”میں اپنے بدل کر آتی ہوں۔“
 ”نہیں ایتان میں مسکرائی۔“
 شہلا کے لیے کی بڑھ گئی۔ ایتان کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ ہاشم کا فون

”تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے ایتان؟“ وہ اس سے لیٹ کر خوش رہی۔
 ”ہاں سب کچھ یاد آگیا ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی نہ ٹالتی

تھی۔“
 ”بھلا بھلا ہے سنجیدہ ہوئی۔ ایتان کی بات میں گہرائی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ پھر وہ
 ”میں اپنے بدل کر آتی ہوں۔“
 ”نہیں ایتان میں مسکرائی۔“
 شہلا کے لیے کی بڑھ گئی۔ ایتان کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ ہاشم کا فون

”تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے ایتان؟“ وہ اس سے لیٹ کر خوش رہی۔
 ”ہاں سب کچھ یاد آگیا ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی نہ ٹالتی

تھی۔“
 ”بھلا بھلا ہے سنجیدہ ہوئی۔ ایتان کی بات میں گہرائی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ پھر وہ
 ”میں اپنے بدل کر آتی ہوں۔“
 ”نہیں ایتان میں مسکرائی۔“
 شہلا کے لیے کی بڑھ گئی۔ ایتان کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ ہاشم کا فون



”کچھ مت کہو ایقان! جو کچھ تم کہہ رہی ہو سچ ہے! لفظ لفظ معتبر ہے کیونکہ مجھے تمہارے رُخِ خلوص ہونے پر رتی برابر بھی شک نہیں ہے۔ لیکن ایقان چہو چاہے جو کچھ آئیں خواہ کچھ بولیں، انسان مجبور محض دل کے ہاتھوں ہوتا ہے اور مدت ہوئی میرے دل نے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ کچھ نہیں کہتا گونگا ہو گیا ہے۔ اس کی خواہشات سوئی نہیں ہیں کہ میں ان کے جاننے کی امید رکھوں۔ ساری خواہشات مرگئی ہیں ایقان! بس ایک تمنا کی جلتی ہوئی لو سے میرے راکھ ہوتے دل میں کچھ روشنی ہے۔ میرا بیٹا! میری ہر امید کا واحد مرکز میری زندگی کی واحد وجہ۔ میرے ہونے کا کلوتا ثبوت۔ میں کسی مرد کی زندگی میں شامل ہو کر اسے کچھ نہ دے پاؤں گی ایقان! کچھ بھی نہیں دے سکتی میں۔ میں اس کے لبوں پر بھی ایک مسکراہٹ تک نہ لاسکوں گی، پھر میں کیوں خود کو اور اسے یہ سزا دے سکتی ہوں؟“

ایقان نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔
”جنھوٹ بولتی ہو تم شہلا! زندگی میں نشیب و فراز سب کے ساتھ ہیں۔ حادثے بہت سوں کا مقدر بنتے ہیں لیکن لوگ ہنسنا بولنا، جینا نہیں چھوڑ دیتے۔“ آئندہ ”تو ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے نگاہیں کیسے چھلکتی ہو تم؟ تمہارا ”آئندہ“ تمہارے بیٹے کا ”آئندہ“ کیا سوچا ہے تم نے اپنے والے کل کے بارے میں سوچا؟ میری بہن بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے گی، تمہارا بھائی اپنی زندگی کی شروعات کرے گا۔ اس گھر میں اس کی زندگی کے لیے کچھ ہے، تم اور تمہارا بچہ ناقابل قبول ہوں گے۔ وہ اپنے بچے پر تمہارے بچے کو نظر انداز نہ بھی کرے، تم کو نہیں نہ کہیں ضرور ایسا محسوس کرو گی۔ اس وقت کیا کرو گی شہلا! جب اس گھر میں تم خود کو مس فٹ تصور کرو گی؟“

شہلا کا چہرہ کرب سے سیاہ پڑنے لگا۔
”مجھے معلوم ہے کہ تم میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔“ ایقان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”تمہارے دل پر غصہ نہیں ایقان! لیکن اپنے ”آئندہ“ کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے ”کل“ کے مفاد کی خاطر کسی شخص کو سزا دینا، مردہ احساسات کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ اگر میرے اندر اس خوشی کو پانے کا جذبہ ابھرنا تو میرے لیے صرف اس لیے کہ مجھے ایک مضبوط ساتھ میسر آجائے اور عمر کو باپ کے نام کا سائباں مل جائے۔ صرف اس لیے نہیں کسی کی نیک پر خلوص تمناؤں کو اپنی مردہ دلی کا تحفہ پیش کرنا۔“

”تم ہاں کر کے نودینو شہلا! ہاشم ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتی ہو۔ وہ کبھی تم سے کوئی جگہ نہ کرے گا۔ تمہاری بے مری جب تک مہربانی میں نہ بدل جائے وہ تب تک اور اس کے بعد بھی ہمیشہ تم سے وفا کرے گا، محبت کرے گا۔“

”اے آزماؤں یا اپنی بے مری کو؟ دوست کی محبت میں تم جتنیجے کے ساتھ کچھ زیادتی نہیں کر رہی ہو ایقان؟ میری مانگ ستاروں سے بھر کر اپنی آرزوؤں کے دیب جلائے کو وہ مجھ سے کچھ نہ چاہے گا؟ میرے اندر جذبوں کے الاؤ سرد اور خاموش ہو چکے ہیں۔ ہلکی سی چنگاری بھی نظر نہیں آتی۔ میں اس کے جذبوں کی گرمی کے جواب میں اسے کیا دے پاؤں گی؟“

ایقان بولنے لگا ”خاموش ہو گئی۔ اس بات کا کوئی جواب اس سے بن نہ پایا۔
”مرد کی محبت نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے ایقان! اتنا دکھ کہ اب میں کبھی بھی ذہنی طور پر کسی مرد کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے مجبور مت کرو پلینز! رہی بات میری اور میرے بیٹے کے مستقبل کی تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک بہتر زندگی عطا کی ہے جو دو سروں کی خدمت میں گزر رہی ہے۔ مجھے اتنا آسرا بہت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اچھا

خیال رکھتے ہیں۔ دود کا نہیں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چچا کو دو کانوں کا کرایہ لانے کی ذمہ داری ہے قدرے فکر، عاشر سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سیکھنے بھی پڑوس ہونے کا حق بھرپور طریقے سے ادا کر رہی ہے ان کی گفتگو میں ربیعہ کو تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اسے وہ اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے رہی خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اسے خیر خواہی میں سے ہیں۔

ربیعہ متواتر ایک جواب دیکھ رہی ہے کہ داوی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی پانی ہیں۔ اسے داوی کے رنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں شہلا بہت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیکٹس بالواس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں سنیوہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے ڈاکٹر شہلا کو طلاق سوچ چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بچے سے باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعاً تیار نہیں۔ ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کے بدلتے رویوں سے تنگ آ کر اپنی پھوپھو کے گھر لا کر جا جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ میں ربیعہ کی ملاقات عبادت سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ شہلا کے گھر آ رہی ہے۔ وہ از خود اس کی پھوپھو کے رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

گیارہویں قسط

ایقان دکھ کے احساس میں ڈوبی بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ شہلا اپنے آنسوؤں کی خوشی میں ہوتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں یا بہن کے دل میں ان آنسوؤں کو دیکھ کر استغناء پیدا ہو اور بات بڑھے۔ اصرار کو مزید افراد کی کمک حاصل ہو جائے۔ وہ اس بات کو محض اپنے اور ایقان کے مابین ہی ختم کر چاہتی تھی۔

”تم نے۔۔۔ اہی سے کچھ کہا تو نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔“
”نہیں۔۔۔“ ایقان سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”میں صبح سے پہلے تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتی تھی۔ ہاشم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کی بات سن کر فون بند کر دیا تھا اسے کوئی جواب دینے بغیر۔ وہ اس خاموشی کو تمہاری رضامندی پر محمول کر رہا ہے۔ وہ بہت بہت۔ بہت خوش ہے شہلا! تم کیوں ایک رُخِ خلوص سے اس سے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین رہی ہو جبکہ اس کی خوشی تمہاری مانگ کی افشاں بھی بن سکتی ہے تمہارے بیٹے کے سر کا سائباں بن سکتی ہے۔ بے وقوفی منت کرو شہلا! زندگی کی حسین ترین تمنا سے سجا ہوا تمہارا طرف بڑھا ہوا ہے اس تمنا کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لو اور اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں یہ راہبہ کی سی زندگی کب تک گزراؤ گی۔ آئینے میں اپنا کبھی غور سے نہیں دیکھا تم نے؟ عمر کے جس دور سے تم گزر رہی ہو وہاں ہمیشہ ایک ساتھی کے مضبوط سہارے ضرورت ہوتی ہے شہلا! میں۔۔۔ میں۔۔۔ اور کیا کہوں تم سے؟“

ایقان بے بسی سے اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر بولی۔ شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی پلکوں پر نمی اور لبوں اور اس مسکراہٹ تھی۔

۱۱۱ کھانا چھی تعلیم چھا مستقبل دے سکتی ہوں۔ بس اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔

دونوں کے مابین خاموشی کا طویل وقفہ در آیا۔ ایقان کی نگاہوں میں ہاشم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی روشنی اس کے لبوں کی وہ مدھم مسکراہٹ چہرے کی لہر کتنا خوش تھا وہ اسے سب کچھ بتاتے تھے۔ اس کے انگ انگ سے خوشی چھلکی پڑتی تھی۔

”میں نے کہہ دیا پچھو! سب کچھ کہہ دیا۔ جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا تھا برسوں سے سب کہہ ڈالا۔ میری رہبری ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔“

”اس نے کیا کہا؟“ وہ بے حد پر تجسس تھی۔

”اس نے؟“ وہ لہجہ بھر کے لیے مدھم پڑا تھا۔ ”خاموشی ہم رضا مندی۔“

وہ ہنس کر بولا تھا۔ اس کی ہنسی میں یقین تھا۔

ایقان نے گہری سانس بھری۔ اس کی زندگی کی حسین تناسل سے نچی ہتھیلی پر اسے شہلا کا انکار رکھنا تھا۔ کس قدر مشکل کام تھا جو اسے کرنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی جوت پھونکنا مار کر بھائی تھی۔

اس کی وہ دلی دلی خوبصورت مسکراہٹ اس کے لبوں سے مٹھ ہوئے دیکھتی تھی۔

”اتنا جو صبر کیسے کروں شہلا!“ وہ بول اٹھی۔ ”کیسے مایوس ہو نا؟“ اس نے لہجہ تمنا سے قرب کی تمنا کی ہے۔

”جانتی ہوں ایقان! لیکن میرے قرب سے اسے خوش نہیں کرے گا۔ اسے دکھ سے بچاؤ۔“ شہلا ایوانی سے بولی۔ ایقان نے غور سے اس کی سمت دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

”اچھا۔ ایسا کرو۔ کچھ دن سوچ لو غور کر لو۔ کیا خبر تمہارا دل کوئی مڑ نہ سادے۔“ شہلا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا دی۔

”بہت خوش امید ہو ایقان تم ہمیشہ کی طرح۔“

”اور تم کہی ہی گھوس۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”تمہیں احساس نہیں ہے شہلا! کہ تم کسی کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر رہی ہو۔ اپنے آپ کو مناد شہلا! دل کے دیب جلاؤ جلاؤ کی کوشش تو کرو۔ اپنی سیاہ آنکھیں غور سے دیکھا کرو اپنے تراشے ہوئے لبوں پر دھیان دو ذرا۔ اپنی زلفوں سے پوچھو اتنا حسن تم سے شکایت نہیں کرتا کبھی؟ کہ اسے ایک سراپنہ والا درکار ہے چاہنے والا درکار ہے۔“

شہلا کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کے گال سرخ ہو گئے تھے۔ ایقان خوش ہو گئی۔

”دیکھا آئی تالاج اس تصور سے؟ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ جذبول کے الاؤ سرو پڑ گئے ہیں۔ رخساروں پر بکھرتی حرارت جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”ایقان پلیز۔“ شہلا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”میں تمہیں وقت دے رہی ہوں شہلا! خوب سوچ لو۔ ہاشم کا بچا ہوا چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں۔ میں اسے یہی کہوں گی کہ تم نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“

”نہیں ایقان!“ وہ بے مانی سے بولی۔ ”وہ نجانے کیا سمجھ بیٹھے اپنے اندر اس کے مزید لیے جلا لے۔“

”کیا خبر کسی دے سے تمہارے اندر کا الاؤ ہی بھڑک اٹھے۔“ ایقان نے اسے گھورا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔“

اسے یوں اچانک ہی مایوس اور نامراد مت کرو۔

پھر اس نے لا چاری سے سر جھکا لیا۔

”حیات ولا“ کے بڑے سیاہ گیسٹ پر اپنی فہ اس کے مقابل تھا۔ ایقان ٹھنک گئی۔

”کیا تمہیں اس نے؟“ وہ بے مانی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”نہیں! دم تو لینے دو میرا سانس پھول رہا ہے۔“

”میرا دم نکل رہا ہے پچھو! آپ کو سانس لینے کی بڑی ہے۔“ وہ چڑ گیا۔

”ہائیں۔“ وہ رک کر اسے گھورنے لگی۔ ”یعنی پچھو مرنے ہے تو مرے تمہیں زندگی کی نوید مل جائے۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی اور بے قراری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ایقان کھڑی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے اندر توڑ پھوڑی ہونے لگی۔ اپنا یہ بےوقوف ساجھتیہا جو تقریباً اس کا ہم عمر تھا اسے بے حد عزیز تھا۔

”اس نے منع کر دیا پچھو؟“ وہ ویسے ہی نظریں جھکائے ہوئے پوچھنے لگا۔

ایقان ہولے سے مسکرا دی۔

”نہیں۔“ وہ رمانیت سے بولی۔

ہاشم جھک اٹھا۔ اس کے چہرے پر روشنی سی لپکی۔

”میں؟ مطلب ہاں! اس نے۔“ اس نے۔

”ایقان! طمینان سے کہہ کر پھر چل دی۔“

ہاشم چند سیڑھیاں جگہ پر کھڑا اس کی بات پر غور کرتا رہا پھر پھٹنا کر اس کے پیچھے چل دیا۔

”پچھو! اللہ کا واسطہ ہے آپ کو۔ مجھے اس طرح جاگل بنا کر آپ دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی ہیں؟ پلیز اپنا یہ حق سنا کر پھر کھینچو اور کریں۔“

اس نے اس کا بازو دھریا۔ ایقان رک گئی۔

آپ کو میں انتظار بغینت کا احساس نہیں ہے ورنہ آپ کبھی ایسا مذاق نہ کریں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

ایقان کی آنکھوں میں آنسو تھپ تھپ رہا تھا۔ اس نے نگاہیں جرابی تھیں۔

”اس نے ہاں کہہ دی تھی۔“ ہاشم نے سچ کہہ دیا تھا۔

”نہیں! یہ بات سنا کر جواب ہے؟“ وہ دھڑکتے بولا۔ ”اور آپ؟ آپ اس جواب سے مطمئن ہو کر واپس

پہنچیں؟“ ہاشم نے اس سے سوچنے کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔

”نہیں! اس نے سوچنے کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“

ہو اس کے لیے محسوس کرتے رہے ہو۔ ویسا اس نے نہیں سوچا پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم ہاتھ بڑھاؤ گے اور وہ جھٹ تمہارے ہونٹے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرو گے۔ وہ ایک ذمہ دار لڑکی ہے ایک بڑھتے ہوئے بچے کی ماں ہے۔ خود کو مطمئن کرے گی اپنے گھر والوں سے مشورہ کرے گی اپنے بچے کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گی تب ہی ایک واضح ٹھوس درست فیصلہ کرے گی۔ تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو۔“

”سوزی۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”میں واقعی ایسا سوچ رہا تھا کہ آپ زندگی کا پروانہ لیے چلی آ رہی ہوں گی۔ میں تو تب سے نہیں کھڑا ہوں۔“

ایقان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ قریباً ”تین ٹھنڈے وہاں گزار کر آئی تھی۔“

”ہاشم! پھر وہ ہمدردی سے بولی۔ ”کسی کو چاہو ضرور لیکن چاہت میں خود کو نظر انداز مت کرو۔ اپنی ہستی کو پہلے مقدم جانو۔ وہ غم سے کی طلب میں خود کو مٹانے کا فلسفہ میری نگاہ میں تو سرا سر غلط ہے۔ بہر حال زیادہ بے تاب

ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر چل پڑی۔ ”یہ یاد رکھنا ہاشم! کہ فیصلے میں ہاں، ناں کا چانس فنی فنی ہوتا ہے اور عقلمند لوگ ناں کو سیونٹی فائیو پرسنٹ دیتے ہیں تاکہ نتائج کا اثر مثبت ہی رہے۔ دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اگر وہاں سے انکار ہوا تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی اور مہینے بھر میں بیاہ کروں گی تمہارا“

ہاشم وہیں کھڑا سے جاتا دکھتا رہا۔

”اللہ آپ کا حفظہ سلامت رکھے۔ پتہ نہیں ہمارے پھوپھا سے اتنی محبت کیسے کر لی آپ نے؟“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا۔



”آج کیسے سہیلی کی یاد جاگی من میں خیر تو ہے؟“ شفیقہ حیات نے اسے آنا دیکھ کر اپنے پاؤں سیٹے۔ وہ سلام کرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑا سا جلنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔

”یاد تو خیر ایسی چیز ہے اماں! بنا ٹکٹ کے جب چاہے چلی آتی ہے لیکن اس حال میں اتنا چلنے کی ہمت کہاں تھی مجھ میں ہاشم کے اصرار پر گئی تھی۔“

”ہاشم کا اصرار سبب؟“ ان کا ماتھا ٹھنک رہا تھا۔ ”کیا ہے پر اصرار کرتا ہے؟ تمہارے وہاں جانے سے اس کا کیا تعلق؟“

”بھول گئیں آپ شہلا نے جب برابر جیلانی سے شادی کر لی تھی تو کیا حال ہو گیا تھا اس کا؟ مرنے والا ہو گیا تھا۔ اب بھابھ جان اس سے شادی کے لیے اصرار کیے جاتی ہیں اور اس کی سولی وہیں انکی ہوئی ہے۔ کہتا ہے شہلا سے ہی کرے گا۔ مجھے بھیجا تھا اس کی رائے لینے کے لیے۔“

شفیقہ حیات ٹھوڑی پرانگی رکھے حیرانی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے

”اس نے بھیجا اور تجھے چلی گئیں؟ ارے لڑکی! بچوں والی ہو گئی ہے۔ کلب قتل سیکھے گی ایقان؟“

ایقان چونک سی گئی۔ قدرے حلق سے اس نے ماں کو دیکھا۔

”لیجئے بے عقلی کا کون سا مظاہرہ سرزد ہوا مجھ سے؟ وہ اس سے شادی کا خراج مانگ رہی ہے تو میں میرا کیا ہاتھ؟ اور

URDU PHOTO

اس میں برائی بھی کیا؟

”جو بھی برائی ہے وہ اس کی ماں تمہارے کھاتے میں ڈال دے گی سیدھے سیدھے۔“ وہ بگڑ گئیں۔ ”بڑی قابل بنی پھر رہی ہو۔ ہاشم سے کہا ہوتا اپنی ماں بسن کو بھیجے اس کے گھر۔ وہ جا کر رشتہ ڈالیں وہاں۔“ ہاں، ہوئی تو ہم بھی شرکت کر لیں گے منگنی بیاہ میں۔“

”جی ہاں۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”وہ بھیجے گا اور وہ چلی بھی جائیں گی۔ اتنی ہی سیدھی ٹھہریں آپ کی ہو بیگم۔ زمین و آسمان ایک کر ڈالیں گی پہلے تو پھر جا کر ڈھیر صلواتیں سنا آئیں گی اس غریب لڑکی کو جس کا رتی برابر قصور نہیں اس سارے قصے میں۔“

”اب تم سینا اور ڈھیر صلواتیں۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”اور تمہارے ویسے ہم بھی سن لیں گے۔“

”افوہ اماں! ایسا کچھ نہیں ہوا، چسپا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”کون سا رشتہ جوڑ آئی ہوں میں۔ ذرا سی رائے معلوم کرنے گئی تھی وہ بھی قطعاً مثبت نہ ملی۔ بھابھی کو تو پتہ بھی نہ چلے گا۔“

”اچھا۔“ شفیقہ حیات کو قصے میں کچھ دلچسپی نظر آئی۔ ”منع کر دیا اس نے؟ چلو تو ٹھیک ہے اب اسے اپنا بچہ پالنے کی فکر ہونی چاہیے کہ نو عمروں کے سے شوق کرے گی۔ ہاشم کا تو دماغ چل گیا ہے۔ گھر میں ایک سے ایک ہیرا لڑکی ہے لیکن وہی بات ہے دور کے ڈھول سنانے۔ گھر کی مرغی وال برابر۔“

ایقان چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔

”اچھا اماں! سچ سچ کہیں شہلا کی جگہ میں ہوتی تب بھی آپ ایسا ہی کہتیں؟ میرے مستقبل کو اندھا شیشہ سمجھ لیں۔“ ان لوگوں کی لسٹ سے نکال دیتیں جنہیں جینے کی تمنا کرنی چاہیے؟“

”دیکھو مت۔“ وہ غصہ ہو گئیں۔ ”میرے منہ کو نہ آؤ“ اچھی بات کرو کوئی اور بیٹا! اماں ابھی زندہ ہے، کچھ کرنے سے پہلے صلاح کر لیا کرو تاکہ بعد میں مشکلیں نہ اٹھانی پڑیں۔“

ماں بیٹی کی بحث کے دوران عذرا بیگم بھی چلی آئی تھیں۔

”خیر تو ہے؟“ وہ ہنس کر پوچھا۔ ”کس بات پر آج ایقان کو بہت دن بعد ڈانٹ پڑ رہی ہے؟“

”ڈانٹ تو مجھے ستر برس کی عمر میں بھی پڑ سکتی ہے بھابھی جان!“ اور بے شک پڑے۔ میں محسوس نہیں کرتی۔ اماں ہیں میری مار بھی لیں تو کوئی بات نہیں لیکن میں وہ کر گزرتی ہوں جو سچ اور حق بجانب سمجھتی ہوں۔“

”تو بیٹا! سچ تو یہی ہے کہ ہاتھم رشتہ دے کر ماں بہن کو روانہ کرے۔ تمہیں کیوں اتنی دوسرے بھیج لایا ہے؟ اور اگر ماں بہن راضی نہیں تو پھر یہ سچ کیسے ہو گیا؟ پہلے گھر والوں کو تو منائے ماں سے توجیت کھائے یا دوسری مرتبہ کورٹ میں ج کروائے گا تمہاری سہیلی سے۔“

وہ خفگی سے کہنے لگیں۔ ایقان چند لمحوں کے لیے چیٹ سی ہو گئی۔

”تم جوش میں آکر مدی سے زیادہ چست ہو جاتی ہو۔ خود بھی باتیں کر رہی ہو، نہیں سمجھتی ہو۔“

”دیکھیں نا بھابھی!“ ایقان نے بے بس ہو کر بھانسنے کی کوشش کی۔ ”میں نے سچ سچ کہا ہے کہ اگر وہ اس سے کوئی رشتہ نہیں بناتا؟ اگر وہ اتنی شدید خوش رہتا ہے شہلا کے لیے تو اس کی ذرا سی اخلاقی ہندو سے مجھے انکار کر دینا چاہیے؟ اماں کہاں ان معاملات کو سمجھ آتی ہیں۔ دل کے معاملات سے تو انہیں یوں بھی بیخبر رہا ہے؟“

عذرا بیگم نہیں۔ حقیقہ حیات کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ آگئی۔

”ہاں بیٹا! درست کہا۔ پیر رہا ہے مجھے ان معاملات سے جب میں بیاد دیا تھا شرمیاں کے ساتھ۔ کوئی زور زبردستی نہ کی کہ بیٹی خوش رہے، ہمیں اور کیا چاہیے۔“ ایقان ہنس کر ان کے گلے لگ گئی۔

”نہیک ہی تو ہے۔“ عذرا بیگم بولیں۔ ”زندگی ہاتھم کو گزارنا ہے۔ اگر وہ ایسا چاہتا ہے تو بھابھی بیگم کو روڑے نہیں اٹکانے چاہئیں۔ کیا حال ہوا تھا اس کا بھول گئیں کیا وہ؟ میرا بیٹا اگر اتنی مدت سے کسی کو چھوڑ دے تو ہر کے بل بیابانے جاؤں اسے۔“

”آپ کا بیٹا؟“ ایقان نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ ”بیل ہے وہ تو۔ نازک احساسات سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔ مجھے کتا ہے۔“ اپنا تو یہ ڈیپارٹمنٹ ہی نہیں۔

”ارے سچ تو کتا ہے۔“ حقیقہ حیات جل کر بولیں۔ ”سب خلل ہے دماغوں کا۔“

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا تھا۔

اس گھر میں سوائے ترانہ کے اسے ہر کسی کو مخاطب کرتے ہوئے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہاں کے سب ہی افراد عجیب پر اسرار۔۔۔ کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ربیعہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور سیارے پر ایسی ہو، جہاں الفاظ اپنا مفہوم بدل چکے ہوں اور روسیہ اپنی سمت کھو بیٹھے ہوں۔ ہر شخص ایک عجیب انداز کا

مالک تھا۔ ربیعہ کو اپنا آپ اجنبی لگنے لگتا تھا۔

اس وقت بھی وہ منور امین کو دوا کھلا کر ان کے گلاس خالی کرنے کی منتظر تھی۔

”پوچھو۔ ضرور پوچھو۔“ انہوں نے خالی گلاس اسے تھمایا۔ ”پوچھنا چاہیے تمہیں۔“

”آپ۔ اتنا پانی کیوں پیتے ہیں؟“

اس کی بات برائے انہوں نے قدرے خفگی اور بے حد اذیت سے اسے دیکھا۔ غالباً ”وہ سمجھ رہے تھے کہ ربیعہ ان سے اپنی پچھلی زندگی کی کوئی بات جاننا چاہتی ہے“ اسی لیے انہوں نے بے حد بڑے پن سے اسے اجازت دی تھی اور اب اسے غصے سے دیکھ رہے تھے۔

”آگ لگی ہے میرے اندر۔ آتش فشاں ہے آتش فشاں اسے بھجھا رہا ہوں۔۔۔ احمق لڑکی۔۔۔ یہ سوال پوچھا ہے۔ احمقانہ۔ بھلا پانی کیوں پیتا ہوں۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ پانی کیوں پیتا ہے؟ ڈاکٹر نے بولا ہے مجھے، زیادہ پانی پیو اس لیے پیتا ہوں۔ تم کیوں پانی پیتی ہو؟ نہ لی کر دیکھو ذرا دلوں۔ لگ پتہ جائے تمہیں۔ ذرا سا کولر میں پانی بھرنا پڑ گیا تو میرا پانی پینا برا لگتا ہے تمہیں۔ کھوں کھوں کھوں۔ اچھا بابا!۔۔۔ مت دو مجھے پانی تم۔ پیا سا مار دو اور تم بھی کیا سکتی ہو۔ آخر کس باب کی بیٹی ہو۔ پیا سا ہی مارو گی۔ کھوں کھوں۔۔۔“

اسے سانس لینا محال ہو گیا۔ وہ گھبرا کر تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ جب اسے

میں نے یہاں تک کہ میں بل میں تولہ، بل میں ماشہ ہے تو بھلا اسے ایسا سوال پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ خواہ دن بھر تیل دلوں جگہ دس گولیاں پی جائیں، اسے کیا لینا دینا لیکن بات محض اتنی تھی کہ ایک جیتے جاگتے انسان کے لیے بات کرنا بھی ایک ضروری عمل ہے۔ خاموش رہ رہ کر اس کے جڑے درد کرنے لگتے تھے دل گھبرانے لگتا تھا۔

ایسے میں اگر وہ میرا سے کوئی بات کرتی تو کسی نہ کسی بات کا یہی رد عمل سامنے آتا جو ابھی سامنے آیا تھا۔ صولت کو

اٹک کر بیٹھ کر جاکر۔۔۔ پتھر کھینچ کر مارتی۔ منور امین صرف جسمانی ہی نہیں، ذہنی بیمار بھی تھے۔ دن بھر ایک نرس

ان کی دیکھ بھال کرتی۔ جب کبھی اپنے آپ کو چند ایک نمبر زیادہ دینے کی کوشش کرتی تو وہ اس کے خلوص سے کبھی کبھی کچھ کر لیتا۔ فیملی قرار دے دیتے تھے۔ وہ برآمدے میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر آنسو پینے کی کوشش کرتے۔

تب برابر والے کمرے سے اسٹاک کے سیارے چلتا ہوا تمدن باہر آیا۔ ربیعہ نے اٹھنے کے متعلق سوچا لیکن وہ

”ابا کیوں چیخ رہے ہیں؟“ وہ آہستگی سے پوچھنے لگا۔

”جس۔۔۔ وہ۔۔۔ پتہ نہیں۔“ اس نے آنسو لنگے۔ ”میں نے۔۔۔ شاید غلط بات پوچھ لی تھی۔“

”کیا پوچھا تم نے؟“ وہ کچھ چونکنا ہوا۔ ”بیسوں کے متعلق؟“

”ہیے؟“ ربیعہ بے حد حیران ہوئی۔ ”کون سے بیسے؟ میں تو ان سے پوچھ رہی تھی کہ آخر وہ اتنا پانی کیوں پیتے ہیں۔ سچ سے وہ اب تک بیس چالیس گلاس پانی پی چکے ہیں۔ بس اس بات پر وہ ناراض ہو گئے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ ان کو برا لگے گا۔ تو میں۔۔۔ ہرگز نہ پوچھتی۔“

اسے بے حد روٹا آ رہا تھا۔

”پانی کیوں پیتے ہیں۔۔۔ بابا بابا۔۔۔ اتنا پانی۔۔۔ بابا بابا۔۔۔“ اسے اس بات سے بڑا لطف آیا۔

ربیعہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

”شکر ہے تمدن بھائی! آپ کو ہنسنے دیکھا، ورنہ آپ بھی ناراض ناراض سے رہتے ہیں، نجانے کیوں۔ یہاں

سب لوگ غصے میں رہتے ہیں، سوائے ترانہ کے۔ قصور بھائی تو کبھی کبھی بات کر بھی لیتے ہیں لیکن آپسے۔
انے عجیب سے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ جھینپ کر خاموش ہو گئی۔

”ذرا ذرا سایا دپڑتا ہے مجھے۔ میں شاید تین برس کی ہوں گی یا چار برس کی۔ تمنا آتی مجھ سے دو برس بڑی تھیں
ہم گھر کے صحن میں بھاگتے پھرتے تھے، دھندلے دھندلے سے خاکے بنتے ہیں ذہن میں اور مٹ جاتے ہیں
پچھو بتاتی تھیں کہ آپ کی اچانک ہی شدید بخار ہوا۔ اتنا تیز بخار کہ لگتا تھا بدن کسی آگ سے جل رہا ہے۔
دن کی کیفیت طاری رہی۔ امی ان کی چارپائی کی بیٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ انہیں آپ سے بے حد محبت تھی۔
دن تک نہ آپ کے منہ میں دانہ گیا، نہ ہی امی نے کچھ کھایا پیا۔ تیسرے دن آپ نے تڑپ تڑپ کر جان دے
دی۔“

ترانہ گلو گریں لہجے میں بولی۔

ربیعہ بھی افسردہ ہو گئی۔ وہ دونوں بڑے سے پرانے برگد کی چھانوں تلے بیچ پر بیٹھی تھیں۔ گھر کے
نزدیک ہی تھا۔ آج ترانہ کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے یہاں تک چلی آئی تھی۔
”اور پچھو؟“ ربیعہ نے سوگوار سے پوچھا۔

”امی آپ کی موت کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہیں۔ انہیں آپ کا کچھ یاد نہ رہا کرتی تھیں، اکثر
کرتیں، اندر ہی اندر گھلتی گئیں وہ۔ امی کی وفات سے تم دن بھر بھائی کے داغ پر برا اثر پڑا۔ انہیں راتوں میں جلنے
عادت ہو گئی۔ آدھی رات کو نیند میں اٹھ کر جھٹ پر جلے جاتے تھے۔ ایک دن سیر میوں سے گر گئے، ٹانگ کی
ٹوٹ گئی۔ کئی دن بستر پر پڑے رہے لیکن اباجی سے۔“ وہ ایک گری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

”اباجی بھی ہمارے بس اپنے نام کے ایک ہیں۔ مینا بستر پر دس دن تھکتا رہا لیکن اباجی کو اپنی بیماری سے
فرصت نہ ملی۔ پچھو ہی ترس کھا کر ایک دن کسی جراح کو بلا لائیں۔ اس نے الٹی کیدھی پی کر کھٹے اپنی ٹیسٹی اور
چلتا بنا۔ بعد میں ہڈی کسی طور سیدھی نہ ہوئی، ہمیشہ کا نقص رہ گیا۔“

ربیعہ کے ذہن میں منور امین کا چہرہ اور ان کے الفاظ گھوم گئے۔
”آخر کس باپ کی بیٹی ہو، یا ساہی مارو گی۔“
وہ اپنے باپ کے متعلق کچھ نہ جانتی تھی لیکن وہ الفاظ اس کی ذہن میں گونجنے لگے۔

”ترانہ!“ وہ کسی سوچ میں گم ہو کر بولی تھی۔
”ہوں، کو؟“ وہ اپنی سوچ سے نکلی۔

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟ میرے امی ابو کے متعلق؟“ وہ نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔“ ترانہ کچھ
دیر سوچی رہی۔ وہ گھاس کا تنکا چبانے میں مگن تھی۔

”میں سے کچھ زیادہ تو نہیں جانتی ربیعہ! بس مجھے یہ علم ہے کہ مینا پچھو، تمہارے ابو سے منسوب تھیں۔ احمد
جہانزیب سے۔ میرے ماموں سے۔ پھر ماموں نے اچانک تمہاری امی سے شادی کر لی۔ تمہاری امی نے“

کچھ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہو گئی۔
”ہاں بولونا۔“ ربیعہ نے اسے پکارا۔

”اچانک ہی اس کا ذہن دوسری جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی بیچ پر عباد بیٹھا۔ اپنے کسی دوست کے

ساتھ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی نگاہیں ربیعہ کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں پھر اس نے چند لمحوں بعد نگاہ
بٹائی تھی اور اپنے دوست کی جانب دیکھنے لگا۔

ربیعہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے
اس نے عرصے کے بعد کسی اپنے کو دیکھا ہو۔ خوشی کی سنسنی لہر کے زیر اثر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عباد نے اسے
کھڑا ہوتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں لمحوں میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

”آپ۔۔۔ عباد۔ آپ یہاں۔۔۔“ ربیعہ کا لہجہ بے قابو ہو گیا۔
”میں۔۔۔“ اس نے ایک محتاط نگاہ پیچھے بیچ پر بیٹھی ترانہ پر ڈالی تھی۔ ”میں روزیہاں آتا ہوں ربیعہ!

روزانہ میں آپ سے بات کر سکتا ہوں نا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟“
”مسئلہ؟“ ربیعہ نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ”اوہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ترانہ ہے۔ میری

پھوپھی زاد بہن۔ وہ بہت اچھی ہے۔۔۔ آپ کچھ محسوس نہ کریں۔“
”مجھے بے چینی سی تھی۔“ تعینک گاڈ کہ آپ کو خیریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نجانے کیوں ربیعہ! میں۔۔۔ میں

ذہنی طور پر آپ سے انٹیج منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان
جانب سے تعلق جوڑ دیا ہے ہمارے بیچ۔ میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی، پتہ نہیں

میں۔۔۔ میں سے نبھایا بھی یا نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستاتے کہ میں نے ایک چھوٹی سی، معصوم سی، فرشتوں
جیسی لڑکی کو اپنے ایک اجنبی گھر میں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خیریت دریافت کروں لیکن پھر

خیال آتا کہ میرا آپ کا تعلق ہی کیا ہے؟ چند گھنٹوں کا ساتھ بھلا کب اتنا استحقاق بخشا ہے کسی نے کچھ غلط سمجھ
لیا تو آپ کو مشکل ہو جائے گی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”خیر، شکر ہے خدا کا۔“ وہ مسکرایا۔
”بھی کتنی مسکراؤ گی۔ اتنی دیر تک وہ اسے بولتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ اس کے لیے اتنا پریشان تھا، اتنے

دنوں سے یہ کچھ عجیب تھا۔ اس نے کچھ ٹھنڈی پھوار برس رہی تھی۔ عباد کے چہرے سے روشنی اتر کر اس کی
نگاہوں میں جذب ہو رہی تھی۔

”وہ نجانے کس چیز سے متغایب ہو کر بولی۔“ اور آپ اگر آتے تو مجھے کوئی مسئلہ نہ
ہوتا۔ میں سب سے پہلی یہ میرا بھائی ہے۔“

عباد نے سبے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
”میں اتنے دنوں سے یہاں صرف تمہارے لیے آتا ہوں ربیعہ! اس امید پر کہ شاید تم کبھی یہاں آؤ، یہاں

سے گزرو تو میں تمہاری خیریت معلوم کر لوں۔“
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”گھر والے کیسے ہیں؟“ وہ قدرے تذبذب کا شکار ہوا۔
”ٹھیک ہیں۔“ وہ یہی کہہ پائی۔ ”وہ ترانہ ہے نا، وہ بہت اچھی ہے۔ میرا خیال رکھتی ہے۔“

”میرا نمبر ہے نا تمہارے پاس؟“
”ہاں، وہ کارڈ میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“

”میں۔۔۔ آسکتا ہوں ملنے؟ تمہارے گھر؟“
ربیعہ نے چند لمحے سوچا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال مینا کا آیا۔

”میں ترانہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ ہم کچھ دن بعد پھر آئیں گے یہاں۔“ عباد مسکرا دیا۔

”منا معلوم کیوں ربیعہ! مجھے جیسے الہام ہوا ہو کہ قدرت نے ہمیں یونہی نہیں ملایا۔ میں سوتے سوتے تمہارے خیال سے جاگ اٹھتا ہوں۔ جیسے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری سوچی ہو خدا نے مجھے۔ بس اسی احساس کے زیر اثر میں نے گھر آنے کے متعلق پوچھا ہے۔“

”مجھے کوئی وہم نہیں ہے عباد بھائی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ گھر۔ میرا نہیں ہے۔“

”اٹس اوکے! اچھی لڑکی۔ اب چلتا ہوں پھر ملیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“

وہ مڑ کر اپنے دوست تک گیا پھر دونوں اٹھ کر پارک کی عقبی سمت چل دیے۔ ربیعہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”کون تھا یہ؟“ ترانہ کی آواز میں بھرپور حیرت تھی۔ ”یہاں لاہور میں تم کسی کو کیسے جانتی ہو؟“ ترانہ اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔

”ہم ٹرین میں ملے تھے ساتھ ہی لاہور اترے تھے اور تمہارا دوست ڈبے میں اپنے مری کی تھی۔“

”او۔“ ترانہ معنی خیزی سے بولی۔ ”اور یہ حضرت یہاں کیسے گشت میں رہے؟“

”میرے لیے۔“ ربیعہ بھرپور اطمینان سے بولی۔ ”میں نے ان کو مختصراً اپنے متعلق بتایا تھا۔“

”گھر آنے کی ہمت نہ ہوئی جناب کی؟“ ترانہ کی شوخی معنی رکھتی تھی۔

ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”مالی ڈیر ترانہ بی بی! اپنے یہ بڑے بڑے کان صاف کر کے سننا۔ کل نام عباد ہے اور میں اسے بھائی کہتی ہوں۔ بھائی۔ سناتم نے؟ عباد بھائی۔“

”اور وہ تمہیں ”منٹی“ کہتا ہے؟“ اس نے ناک چڑھائی۔ ربیعہ مسکرا دی۔

”چلو گھر چلیں۔“

وہ دونوں گھر کی سمت چل دیں۔ ربیعہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے باری باری دونوں میں منتقل ہو رہی ہو۔ فضا صاف اور اجلی ہو۔

”پتا ہے ترانہ! میرے من کا موسم آج بہت بہت اچھا ہو رہا ہے۔“

”اپنے ”بھائی“ سے ملنے سے پہلے یا ملنے کے بعد؟“ وہ بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

”ملنے کے بعد۔“ ترانہ ٹھٹھک کر رکی۔

”خدا کے لیے ربیعہ! یہ غضب مت ڈھانا۔ پیچھو اور صولت تمہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور کر دیں گی اور تمہیں بھائی! خدا کی پناہ! ایسے ایسے سوال پوچھیں گے کہ تمہاری روح کانپ اٹھے گی۔ مجھے اس کا انتہائی برا تجربہ ہے۔“

ربیعہ خوفزدہ ہو گئی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں عباد بھائی کو سختی سے منع کر دوں گی۔“

”ایک مرتبہ میں بہت بیمار پڑ گئی۔“ ترانہ بتانے لگی۔ ”باری میری خیریت پوچھنے گھر چلا آیا، بس سمجھو

قیامت ہی۔“ پیچھو تو اتنے دن تک۔“

”باری؟“ ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”باری کون؟“

”عبدالباری۔“ ترانہ جھینپ کر بولی۔ اس کے گل سرخ ہو گئے تھے۔

”گلستانِ دل کا مال؟“ ربیعہ نے شرارت سے پوچھا۔

اس نے شرمیلے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دی تھیں۔

آج وہ پھر اسے لینے چلی آئی تھی۔ ملے گلہائی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔ بے پردائی سے

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اپنی اڑتی ہوئی زلفیں بھی سمیٹتی جا رہی تھی۔

موسم خالصاً خوبصورت ہو رہا تھا۔ عاشر اسے دیکھے گیا۔

”اے سسر! اس نے عاشر کو چھیڑا۔“ یہ تم مجھے اتنا گھور کیوں رہے ہو؟ لگتا ہے آج میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوں۔“

”خلاف توقع فوراً مان گیا۔“ یہ لباس تم پر اچھا لگ رہا ہے اور اس موسم میں تم اچھی لگ رہی ہو۔“

”میں اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔“

”مالی ڈیر ترانہ بی بی! اپنے یہ بڑے بڑے کان صاف کر کے سننا۔ کل نام عباد ہے اور میں اسے بھائی کہتی ہوں۔ بھائی۔ سناتم نے؟ عباد بھائی۔“

”اور وہ تمہیں ”منٹی“ کہتا ہے؟“ اس نے ناک چڑھائی۔ ربیعہ مسکرا دی۔

”چلو گھر چلیں۔“

وہ دونوں گھر کی سمت چل دیں۔ ربیعہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے باری باری دونوں میں منتقل ہو رہی ہو۔ فضا صاف اور اجلی ہو۔

”پتا ہے ترانہ! میرے من کا موسم آج بہت بہت اچھا ہو رہا ہے۔“

”اپنے ”بھائی“ سے ملنے سے پہلے یا ملنے کے بعد؟“ وہ بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

”ملنے کے بعد۔“ ترانہ ٹھٹھک کر رکی۔

”خدا کے لیے ربیعہ! یہ غضب مت ڈھانا۔ پیچھو اور صولت تمہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور کر دیں گی اور تمہیں بھائی! خدا کی پناہ! ایسے ایسے سوال پوچھیں گے کہ تمہاری روح کانپ اٹھے گی۔ مجھے اس کا انتہائی برا تجربہ ہے۔“

ربیعہ خوفزدہ ہو گئی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں عباد بھائی کو سختی سے منع کر دوں گی۔“

”ایک مرتبہ میں بہت بیمار پڑ گئی۔“ ترانہ بتانے لگی۔ ”باری میری خیریت پوچھنے گھر چلا آیا، بس سمجھو

برابری کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مغرب کی عورت گھربانا نہیں جانتی، بسنا نہیں جانتی بچے نہیں پالتی، کیا نہیں کرتی مغرب کی عورت؟ تمہاری عورتیں تو جنت میں رہتی ہیں اپنے گھروں میں ملکوں کی طرح حکومت کرتی ہیں۔ کام ملازموں کے سپرد ہوتے ہیں اور گھر چلانے کی ذمہ داری مرد کی ہوتی ہے۔ ہم تو گھر میں بھی کام کرتے ہیں اور گھر سے باہر ملک چلانے میں بھی مرد کے شانہ بشانہ ہوتے ہیں۔ ابھی تو ترقی یافتہ ممالک کے عوام کہلانے کا لطف اٹھاتے ہیں۔“

”ویٹس! ویٹس! ویٹس! عائشہ نے تالیاں بجائیں۔“ ”بھئی لا جواب کر دیا تم نے تو! ویٹس! ایک بات پوچھوں۔ لڑا؟ تم اکیلی کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے والدین بہن بھائی؟“

”میں بتا تو چکی ہوں تمہیں۔ ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ہم تین بہن بھائی تھے دو بہنیں ایک بھائی بھائی، بی بی ازم سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مارا مارا پھرتا ہے اور میری بہن یو کے میں ہی سیٹل ہو گئی۔ مجھے کمپنی نے یہاں بھیج دیا اور یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ یہی اسٹرائیکنگ موڑ ہے زندگی کا۔ اس سے آگے اب کچھ دیکھنے کی تمنا اگر ہے تو وہ ہے تمہارا ملک تمہاری بیوی۔“

”سنو عائشہ! مجھ سے شادی کر لو!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں بہت زیادہ سیریس ہوں تمہارے لیے۔“

”ننڑا! میری بیوی مجھ سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میری زندگی مکمل ہے اس میں کسی رنگ کی کمی نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ بہت سوں کے لیے بہتر ہے۔“

”اور جب تک میں یہاں ہوں رہیں گے۔ بس! اس سے زیادہ میں افورڈ نہیں کر سکتا۔“

”وہ کچھ دیر بالکل خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد عائشہ کا گھر آ گیا۔ لڑا نے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکی۔“

”سنو عائشہ! اچھا! وہ بولی۔“ ”تم نے شکایت کی بیوی سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔ میں منتظر رہی کہ تم کہو گے، میں بھی اس سے بے پناہ عشق کرتا ہوں۔ میری زندگی میں وہ میری زندگی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کہا۔ جانتے ہو کیا؟“

”میرے دل کی محبت ہے۔“ وہ گنبد نہیں ہوتی۔ اس میں ہمیشہ پور دروازہ ہوتا ہے۔ اگر تم مجھے اس دروازے سے بلاؤ گے میں سب سے بھی اجاؤں گی! میری بات سنا یہ تو برا کر رہا!“

وہ گاڑی ریورس کر کے تیزی سے لے گئی۔ اور عائشہ اس کے الفاظ پر غور کرتا رہ گیا تھا۔



کروٹیں بدلتے بدلتے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اسے کسی طور آرام نہ آتا تھا! نجانے من کو کیا بے کلی تھی۔

وہ بستر سے اتر کر دروازے تک چلی آئی۔ باہر لاؤنج میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اوپری کمروں کی بتیاں بھی گل ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل علی اور حمزہ کے کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ لیکن اب وہ بھی بجھ چکی تھی۔ سب بتیاں گل ہو گئیں تو عریضہ کے من میں ایک چراغ کی روشنی ہوئی۔ اندھیرا پھیلا تو اس نے جانا کہ دل کو آج لگی ہوئی ہے کسی نے دل لگی میں اس کا دل ہتھیالیا تھا۔

چھوٹی سی تھی تو فردوس بیگم دن رات رافع کے قصیدے پڑھا کرتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی خوبیوں کا ذکر کرتیں۔ اس کا لانا قد انہیں بھاتا تھا اس کی خوبصورتی کی وہ مذاح تھیں۔ اس کے ادب و آداب سے وہ بے حد خوش رہتیں۔ عریضہ کا ذہن ماں کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اسے بھی رافع اچھا لگنے لگا۔ محبت و محبت کی اسے سمجھ تھی نہ

”آج آپ بولیں گی اور میں سنوں گا۔“ وہ جیسے اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھا تھا۔ ”یوں بھی میں تمہکا ہوا ہوں۔ جانتی ہیں آپ ٹرین پورے چھ گھنٹے لیٹ تھی اور میں نے گھر پہنچتے ہی آپ کو فون کیا ہے۔“

”آپ کامو بائل کیوں آف تھا؟“ وہ شکایتاً بولی۔

”آف نہیں تھا۔ چارج نہیں کیا تھا میں نے۔“ مسکرایا۔ ”لیکن اتنا علم ہو گیا کہ آپ نے بھی ایک کال ضائع کرنے کے متعلق سوچ ہی لیا۔ ورنہ تو بہت سنجوس ہیں آپ ایسوں کی بھی اور لفظوں کی بھی۔“

”آپ کو کس نے کہا میں سنجوس ہوں؟“ وہ بگڑی۔

”ہیکسی کابل تو اکثر بجا جاتی ہیں۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”عریشہ ہنس دی۔“

”اور لفظوں میں تو اپنی بونڈی مارتی ہیں کہ بس۔“

”باتیں بہت بناتے ہیں آپ۔“

”سنی جانی۔“ وہ ہنسا۔

عریشہ نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ نکھر نکھر الجھ کانوں میں گونجتا رہا۔



”اگر فارغ ہو تو رات کے لیے چاول بنالو۔“ مینا نے کمرے میں جھانکا تھا۔

”ابھی ابھی پیچھا کا کمرہ صاف کیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ مشین لگا کر سب کے کپڑے دھو رہی تھی۔ صبح سے اسے کمر سیدھی کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ فارغ ہو کر کچھ دیر لیٹنے کے ارادے سے کمرے میں آئی تھی۔ جب اسے نیا حکم ملا۔

”جی اجیہ۔“ وہ اتنا بولا کہ پانی۔

وہ حسب معمول کچھ دیر باس کا چہرہ نگاہوں سے ٹوٹتی رہیں کہ کہیں کوئی زاویہ بگڑا ہوا ملے یا ایک آدھ شکن کا ٹکڑا۔ لیکن پھر وہ سو کر رہ گئی۔

صبح بستر سے اٹھتی تو پچھلے رات کے گھبراہٹ کی خبریں یاد آ رہی تھیں۔ کمر سیدھی کرنا نصیب ہوتا۔ پھوپھا کے کام کا دائرہ اب پھیل کر وہ پچھلے میں اچلی آئی۔ چاولوں والے ڈبے سے چاول نکال کر صاف کرنے لگی۔ چاول نہایت سے قسم کے تھے۔ ان میں بے حد کنکر پھرتے تھے۔

”بچہ بچن کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ اسی وقت مینا بھی کچن میں چلی آئیں۔

”تم اور ترانہ کل کہاں گئے تھے؟“ انہوں نے جھوٹے برتن سنک میں جمع کرتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

”جی۔۔۔؟“ ”بچہ جو کئی۔“ ”کل؟“

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تو اسے کچھ یاد نہ آیا۔ وہ لوگ بھلا کہاں آتی جاتی تھیں۔

”اب کوئی بہانا سوچ رہی ہو شاید۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”کل تم دونوں پارک گئی تھیں نا؟“

”پارک؟ جی ہاں پارک تو گئے تھے۔ یونیورسٹی ڈرائیو چل قیدی کرنے کے لیے۔“

”ہوں۔“ وہ کچھ دیر کورکس۔ پھر بولیں۔ ”کون ملا تھا وہاں؟“

”بچہ کو سنا پ سو نکھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ انہیں کیا جواب دے۔ اسے ترانہ کی تنبیہ یاد آگئی تھی۔

پہچان۔ بس اتنا علم تھا کہ وہ اچھا لگتا تھا۔ یہ بتا تھا کہ ماں ایسا چاہتی ہے پھر فردوس بیگم کے تئیں چاٹک، بی بگڑے رافع نے اس کے لیے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ تو اس کے لیے ثانیہ اور سدرہ جیسی ہے۔ اس نے ہمیشہ امر چھوٹی بہن کی طرح سمجھا ہے۔ عریشہ کے معصوم سے دل کو رنج سا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ گھبراہٹ لگی تھی۔ لیکن وہ روتی اور بے نیازی کی عمر بھی چند دنوں میں وہ سب کچھ بھول بھال گئی۔ ماں نے کدورت کو بڑی حفاظت سے اپنے کے نماں خانوں میں سینت سینت کر رکھ لیا تھا لیکن سکینوں اور ہم جھولوں سے مل کر اونچے اونچے قہقہے لگاتے تھے۔

عریشہ کو یہ بات یاد بھی نہ آئی تھی۔

لیکن اچانک ہی جیسے کوئی گم گشتہ جذبہ یاد آیا تھا۔ دل کو پھر آج لگی تھی۔ وجود میں گلابی کنول تیرنے لگے تھے کسی کی شوخ چمکتی آواز نے دل میں نقب لگائی تھی۔

”چند دنوں کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ واپس آ کر یاد کروں گا آپ کو۔“ اس نے کہا تھا۔ عریشہ کو اندازہ نہ تھا یہ چند دن گزارنے کس قدر مشکل ہو جائیں گے۔ اس کا جی بہلتا ہی نہیں تھا اور آج پورا ہفتہ ہو گیا تھا اسے گئے ہوئے۔

عریشہ ہار گئی تھی۔ اس نے کبھی اسے فون نہ کیا تھا۔ ہمیشہ بے نیازی کی چادر اوڑھ کر یاد دہانی جیسے چند دنوں بول کر احسان کیا ہو۔

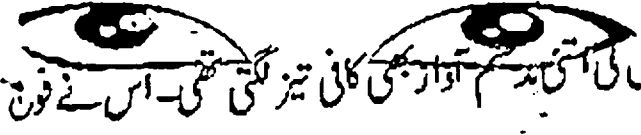
آج جی کہتا تھا وہ اس کا احسان مانے اگر اس کی آواز سن پائے۔ کتنی اچھی لگتی تھی۔ کتنا تھکا دہا۔ شگفتہ شگفتہ نکھری نکھری گنگو سن کر من ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ عریشہ کو دل شدت سے اس کی باتوں کو یاد کرنے لگا۔

اس نے بالآخر لاؤنچ میں آکر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ موبائل آف تھا۔ اس نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیسی بے بسی تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر نمبر ڈائل کیا۔ مگر نتیجہ وہی تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”گھر۔۔۔ گھر۔۔۔“ ہلکی کی گئی تیل جی تھی۔

وہ یوں اچلی جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ سناٹے میں تیل کی استیہ سم آواز بھی کافی تیز لگتی تھی۔ اس نے فون اٹھایا۔



PHOTO

”ہیلو۔۔۔ وہ دم ہم سروا میں بولی۔

”آداب!“ دوسری جانب سے سرگوشی آئی۔

عریشہ کا دل سات سروں میں گنگناٹے لگا۔ رواں رواں مہک اٹھا۔

”آپ! آپ آگئے!“ اس کی ساری خوشی چند لفظوں میں سمٹ آئی۔

”آپ کو اچھا لگا؟“ نہایت شوق سے پوچھا گیا۔

عریشہ خاموش ہو گئی۔ لبوں پر شرم کی مہر آ گئی تھی۔ اس سناٹے میں زندگی سے بھرپور وہ آواز کتنی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا آنکھیں بند کر لے اور وہ نکھر نکھر الجھ یونیورسٹی کانوں میں گونجا کرے۔ رات ایسے ہی بیت جائے۔

”عریشہ! آپ سن رہی ہیں نا!“ اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر وہ بولا۔

”جی۔۔۔ سن رہی ہوں۔۔۔ آپ بولتے رہیں۔“ اس کے من نے شرارت کی۔

”کیوں جی؟ یہ فون ہے یا ریڈیو؟“ وہ بگڑا۔

”نہیں پڑی تھی۔ ایسی شفاف نہی کہ خود اسے اپنے آپ پر تعجب ہوا۔

”باری ملا تھا نا؟“ انہوں نے رازداری سے پوچھا۔

ریحہ خاموش رہی۔ وہ اپنی بلاؤں سے سر ڈالنے کی روادار نہ تھی۔

”ترانہ سے ملنے آیا تھا؟ ترانہ نے بلایا تھا اسے یا خود آگیا تھا۔ دیکھو لڑکی مجھ سے تیزی طراری مت کرنا۔ تم دھڑکتی ہو موقیع پر پھر کہیں کا نہیں چھوڑتی میں سچ کچھ کو مجھ سے؟“

”وہاں تو کوئی بھی نہیں آیا پیچھو!“ ریحہ نے اچانک ہی بے حد اطمینان سے کہا اور سر جھکا کر چادل صادر کرنے لگی۔

وہ سچ کر رہ گئی تھیں۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ وہاں ایک لڑکے نے تم لوگوں سے باتیں کی ہیں۔ مجھے بتایا ہے کسی نے۔“

”جی ہاں۔“ اس نے سراٹھایا۔ ”ایک لڑکا ہم سے کسی کا پتا پوچھ رہا تھا۔ ترانہ سے نہیں مجھ سے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔ یہ باری کون ہے پیچھو؟“

”باری؟ اور تم نے پھر مجھے پیچھو کہا۔“ وہ جڑ گئیں۔ ”میں منع کرتی ہوں اور تم بولے جا رہے ہو بولے جاتی ہو۔“

”لیکن پیچھو! اس میں حرج کیا ہے؟ وہ سکون سے پوچھنے لگی۔ ”کتنا اچھا رشتہ ہے۔“

”بکو مست۔“ وہ اسے جھٹک کر کہیں سے باہر نکل گئیں۔

باہر صحن سے ان کے بڑبڑانے کی آواز آرہی تھی۔ کتنی پرست ہوئے کپڑے جھلاتے ہوئے اتار رہی تھیں۔ ریحہ نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

دوڑتے دوڑتے وہ پھر رک گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔

رافع نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھ پیٹے پر باندھے ہوئے سفید عمارت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

رافع اس تک چلا آیا۔

”اسے میاں راجھے۔“ اس نے ہاشم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ چونک اٹھا۔

”میاں۔۔۔ جب اپنی بارات لاؤ تب رکنا یہاں۔ ابھی میرا خیال ہے ہم جا لنگ لڑے لگے ہیں۔“

ہاشم نے اسے ایک چیت سے اسے نوازا۔

”تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے صاحبزادے۔“

دونوں پھر دوڑنے لگے۔

”معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ رافع نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ ”تم آج کل بہت خوش نظر آتے ہو؟“

ہاشم نے اس کی بات کا ثبوت فوری طور پر مہیا کیا۔ وہ مسکرائے لگا۔

”اس نے سوپنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“ وہ جھک کر پیروں کو چھونے لگا۔

”تو ٹھیک ہے۔“ رافع نے بھی اس کی تقلید کی۔ ”اب تمہارا بوتھا ایسا تو ہے نہیں کہ ایک خوبصورت باؤ قار

خاتون فوری طور پر ”ہاں“ کہہ دے۔ اسے یقیناً کافی سوچنا ہوگا۔“

”ہا ہا ہا۔“ اس نے ہاشم کو چڑاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ”ہا ہا۔۔۔ شاعر نے کہا ہے۔“

”بارے میرے جب میرے بارے میں تھائیوں میں سوچو۔۔۔“

”نفسر باؤ۔۔۔“ اور میری پرچھائیوں میں

جانتے ہو رافع! اس نے میرے اعتراف کا اظہار کا لفظ لفظ سنا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے انکار نہیں کیا وہ برہم نہیں ہوئی کہے برا نہیں لگا۔ یہ خوشی کیا کہ میرے لیے؟

رافع مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ دونوں بیچ پر جا بیٹھے۔

”رافع! تو اظہار کی طمانیت اور خوشی سے ناواقف ہے! کاش تو واقف ہوتا! میرے اندر جو خوشی ابھرتی ہے میں تجھ سے شیر کرنا چاہتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا۔“

اس نے تانسف سے سر ہلایا۔

”کیوں نہیں کر سکتے؟“

”اس لیے کہ تجھے تجربہ نہیں ہے۔ جب تو نے کسی کو چاہا ہی نہیں تو تجھے اظہار کی خواہش اور اس خواہش کی بے پناہ شدت کے کرب کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یا رافع! تو چاہتا کیوں نہیں کسی کو؟“ رافع دور سفید سے نیلے

ہوئے سماں کو دیکھنے لگا پھر بیچ سے سر ہٹا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

”مجھے پوچھنا چاہتا ہے پورے خاندان سے۔“ پھر مسکرایا۔

”میرا چاہنا تو نہیں چاہتا مگر تو میرا یہ ہے نا۔“ تجھ سے اپنے تجربات شیر کرنا چاہتا ہوں، مگر پھر ایک مثال

”ہاں۔۔۔“

”کیا رافع نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔“

”میرا کیا پتا ہے! اور ک کامرہ۔“ وہ مزے سے بولا۔

خدا نے رافع کو یہ نصیب دیا۔

”جہاں میرے لیے ہے۔“

”ابا ابو! بات کرنا ہے تم سے؟“

”ہاں۔۔۔“

”تم ضرور میرے۔۔۔“

”ابا ابو! بات کرنا ہے تم سے؟“

”جیسے صرف اس کی پروا تھی یا ر! وہ مان جائے تو کوئی مشکل، مشکل نہیں اور رہے یہ چھوٹے موٹے معرکے تو وہ

کیا کہا ہے کسی شاعر نے۔“

”معرکہ گرم تو ہو لینے دو۔“

”پلے۔۔۔“

رافع ہاشم کی آنکھوں میں کچھ دیر دیکھا رہا پھر نرمی سے مسکرا دیا۔

”یار! تجھے سچ کچھ کہوں؟“

”ہوں۔“ ہاشم نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ”خیریت؟“

”بھئی بھئی مجھے کبھی تم پر بہت رشک آتا ہے۔“

”ہاشم نے؟“ ہاشم کھلکھلا دیا۔

URDU PHOTO

مودب سے انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ہولے سے کہ نکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے ہمت مجتمع کی۔

”ابو جی! آپ نے بلایا تھا؟“

فاروق حسن نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور کتاب بند کر دی۔

”آئیے! میاں صاحبزادے! بیٹھے کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”گھر ہی میں ہوتا ہوں ابو جی۔“ وہ ان کے مقابل جا بیٹھا۔

”ماں تو آپ کی آپ کے ذکر پر پردہ لگتی ہیں۔“ انہوں نے غور سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ ”بیوٹل کے باپ بیوٹل کے متعلق اندازہ ان کی ماؤں کے انداز سے لگا لیتے ہیں ہاشم! آج کل آپ کی اماں آپ سے خوش نہیں ہیں۔ کیوں؟ وضاحت کریں گے آپ؟“

ہاشم نے ایک نظر اٹھ کر دیکھا۔

”نہیں! میں کیا وضاحت کروں ابو جی؟ ای نے مجھ سے تو کبھی ذکر کیا اپنی ناراضی کا ہاں! اگر آپ باضی کی وجہ بھی بتائیں تو میں ضرور وضاحت کر سکوں گا۔“

”آپ کے سر پر سہرا جانے کی خواہش مند ہیں وہ اور آپ کا زکارتی؟“ وہ بہت توجہ سے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”میں ہرگز انکار نہیں ہوں ابو جی! میں تو خود شادی کا خواہش مند ہوں۔“

”اچھا! ثانیہ سے شادی کریں تمہاری؟“

”جی۔“ حملہ اچانک ہوا تھا وہ گڑ بڑا گیا۔ ”نہیں ابو جی! میں بلاشبہ ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔“

عریشہ جیسی تہہ۔۔۔

”نہیں ابو جی۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”وہ بھی عریضہ جیسی لگتی ہوگی۔ اچھا۔“ انہوں نے چشمہ اتار کر اس کے علاوہ کوئی ایک لمحہ مجھے کوئی ایک لڑکی جو عریضہ جیسی نہ لگتی ہو تھیں۔“

”ابو پلینز۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”میرے جذبات کا مذاق مت اڑائیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ آپ نے سچ کہا میں ڈاکٹر شہلا کے علاوہ کوئی نام نہیں لے سکتا۔“

”تم فیصلہ کر چکے ہو؟“ انہوں نے کب بھیج لیے۔

”جی۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ ہاشم کو اپنے چہرے پر ان کی نظریں بخوبی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ حتی الامکان سیاہ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔

”اس لڑکی کا باضی ٹھیک نہیں ہے ہاشم! دفعہاً وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

”ماضی؟“ ہاشم نے حیرت سے ان کی بات کاٹی۔ ”کیا ہوا ہے اس کے ماضی کو ابو جی! اس نے شادی کی چلیں مان لیا۔ پسند سے کی ٹھیک ہے اسے طلاق ہو گئی اور اس کے پاس اس کی پہلی شادی کی نشانی بھی موجود ہے، لیکن

ان سب باتوں سے کہیں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس کا ماضی درست نہیں تھا۔ خدا نخواستہ وہ کوئی کیریئر لڑکی تھی۔ اس نے غلطی کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے قدرت کی جانب سے غلطی کی سزا مل گئی۔ اب وہ آئینے کے مانند صاف، پتھدار کردار رکھتی ہے گزرے ہوئے پانچ سال اس بات کا ثبوت ہیں۔ بابا! ایک مطلقہ بچے کی ماں سے شادی اگر کوئی بری بات ہوتی تو ہمارے پیسہ کی زندگی میں اس کا نشان نہ ملتا۔ ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں پھر ہم کیوں ایسا گمان رکھیں؟ بخدا کسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس چیز کو غلط سمجھے برا کہے۔“

فادق حسن کی نظروں میں ابھرنے لگی۔ چشمے کی کافی منہ میں دبائے وہ اسے دیکھتے رہے۔

”تمہاری ماں کو کون سمجھائے گا؟ وہ اس لڑکی کا نام سننا پسند نہیں کرتی۔“

”ہیلے! اس“ جانب سے کوئی مثبت جواب آجائے بابا! وہ آہستہ سے بولا۔ ”امی سے پھر بات کر لیں گے۔“

”وہاں کھلاؤ چکے ہو؟“ انہوں نے اسے گھورا۔

وہ گڑ بڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

”پچھلو کو بھیجا تھا یونہی ذرا رائے معلوم کرنے کے لیے۔ کوئی رشتہ تو نہیں بھجوا یا بابا میں نے۔“

”رشتہ بھی بھجواؤ تو ہم کیا کر لیں گے برخوردار۔“ انہوں نے چشمہ پھر لگا لیا۔ ”بہر حال اپنی والدہ صاحبہ کو آپ کا کام ہے مجھ سے یہ درو سری نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ۔۔۔“

چند لمحے گزر گئے۔

”زیادتی ہو جائے۔“

”آسان اسے ہو گیا۔“

چہرے پر شادیوں کی روشنی کے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”مگر ماضی اپنے ماضی کے علاوہ کوئی نام نہیں لے سکتا۔“

”رکھا ہوا۔“

”افقہ کمرے میں اس کی۔“

”غور سے۔“ وہ سخت بگڑی ہوئی تھی۔

”کس کا؟ ہاسپٹل سے؟“ اس نے چادر ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”پاگل خانے سے۔“ ہسپتال ہاسپٹل سے۔ داغی مریض آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ وہ بھرنی ہوئی شیرینی لگ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ گم صم سی ہوئی۔ ”ابراہیم کا فون ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کیا کہتا ہے؟“ اس کا دل اندیشوں کا شکار ہوا۔

”عمر کو لینے آ رہا ہے۔ کہتا ہے تیار کر دیں۔“

شہلا چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر وہ پھر کراشی۔ تن فٹن کرتی وہ فون تک پہنچی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ وہ فون اٹھا کر دھاڑی۔ ”کیا چاہتے ہو ابراہیم جیلانی؟ مجھ سے میرا بچہ چھین لینا چاہتے ہو اپنے سات جنم کے بدلے چکانا چاہتے ہو؟ تڑپا تڑپا کر میری بے بسی کا تماشا دیکھ کر جان لینا چاہتے ہو میرا ٹھیک ہے میں بھی دیکھتی ہوں تم کہاں تک جاؤ گے؟ لے جاؤ۔ تمہارا بیٹا ہے نا وہ میری سب سے ہستی پر تمہاری نوازش کے لمحوں کا ثبوت۔ ٹھیک ہے لے جاؤ اسے۔ میں سک سک کر جان دے دوں گی لیکن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ رو رو کر اندھی ہو جاؤں گی لیکن تمہاری چوکھٹ کو سجدہ نہیں کر سکتی۔“

وہ دم بخود اس کوٹن رہا تھا۔

”شہلا!“ اس کے خاموش ہونے پر وہ آہستگی سے بولا۔ ”آئی ایم سوری میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا یقین جانو میں ایسا کچھ نہیں چاہتا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ بخدا میں تو صرف عمر کی محبت سے مجبور ہو کر چند گھنٹے کے ساتھ گزار کر سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس طرح سے سوچو گی مجھے اندازہ نہ تھا۔ بھلا میں تم سے کب بات کا بدلہ لوں گا؟“

وہ چپ ہو کر گھرے گھرے سانس بھر رہی تھی۔

”کہاں تھے تم؟“ پھر وہ بولی۔ ”اتنے سالوں سے کہاں تھے؟ وہ اہوا اس نے کھنڈ پھینا کیسا ہے ہوا قدم اٹھانا سیکھا ماں کہنا سیکھا اپنے گشہ باب کے بارے میں سوچنا سیکھا۔ اتنے عرصے میں کہاں تھے ابراہیم؟ اب تمہیں اس کی یاد آئی جب اس کا معصوم ذہن ہر طرح کے گمان سے پاک تھا۔ ہزار ہا سوال سوچ سکتا ہے۔ اب اس کے سوالوں کا بچہ جواب بن کر آئے ہو؟ یہ محبت پہلے کہاں تھی؟“

اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”شہلا! پچھلے سال بابا سا میں چل بسے اور چند ماہ قبل اماں بھی رخصت ہوئیں۔ بابا نے مجھے قسم دی تھی تم سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کی وہ تمہاری اولاد کو اپنی جائیداد میں سے کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے جیتے ز میں مجبور تھا۔ لیکن اب میں مجبور نہیں ہوں۔ میں اس سے مل سکتا ہوں۔ اسے چار کر سکتا ہوں۔ اسے اس کا ہاتھ حق دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں میں باقی زندگی بھی دل پر پتھر رکھ کر گزار سکتا ہوں۔ تم خوش رہو۔“

شہلا کا گلا رندھ گیا۔

”بہت پروا ہے تمہیں میری خوشی کی؟“

PHOTO

”ہاں ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم یقین کر دیا نہ کرو۔ جس بیٹے کو میں نے کبھی دیکھا چھوٹا تھا۔ اس کی محبت نے مجھے اتنا عرصہ کیوں پریشان رکھا۔ اس بات کا جواب میں اکثر خود سے پوچھتا ہوں۔ تم بھی خود سے پوچھنا دیکھو کیا جواب ملتا ہے۔“

شہلا سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”میں فون رکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تیار کر رہی ہو؟ اسے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لے جاؤ۔“

اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”اب تک زندگی ہی ہو۔“

شہلا نے ریسیور رکھ دیا۔ ہل میں بے تماشا درد محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں میں بے حد و حساب جلن تھی۔ وہ تا دیر کھڑی اپنی سکیوں کا گلا کھولتی رہی۔

”السلام علیکم۔“

پاشدار کو آواز پر حقیقہ حیات اور عذرا بیگم دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

فردوس بیگم اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالنے چلی آ رہی تھیں۔

”و علیکم السلام۔ جیسی رہو۔“ حقیقہ حیات مسکرائیں۔ ”کہو! اچھی ہو۔“

”شکر ہے۔“ ان بیٹھ گئیں۔ ”بس یہ جوڑ بے کار ہوئے جاتے ہیں۔ جلتے پھرنے کے نہ رہے ہم۔ آپ تو ایسی رو تھیں بس چھوٹی بہو کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم صورت کو ترستے ہیں ایک ہی گھر میں رہ کر۔“

”ارے بی! اب اس عمر میں کیا روٹھنا ماننا اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہاں دن کٹے کہ وہاں کٹے بس چل جلاؤ گا۔ قتب۔ تم اپنی ساؤ با فاروق حسن کیسے ہیں؟ دو دو تین تین دن ماں کو پوچھنے نہیں آتے؟ بیٹے سے اچھے میرے پوتے ہیں۔ دن میں دس چکر لگاتے ہیں۔“

”آپ ہی سکے بیٹے ہیں وہ میری تو ایک نہیں سنتے۔“ وہ بیزار سے بولیں۔ ”ابھی بھی میں علی کا پتا کرنے آئی تھی۔ بیٹے کے بل کی آخری تاریخ ہے وہ لگ جائے گی کیا کہتے ہیں جرمانہ سوز پیر اور پھر نا پڑے گا۔ ابھی تو باوا بھرے تھے تو فکر نہیں انہیں اپنی جیب سے بھرے گا تو میا یاد آئے گی۔ اسے ہاں۔“

وہ بیاؤں داسے گئیں۔

”ارے بی! ابھی تو فکر نہیں آ رہے؟“ انہوں نے گردن گھمائی۔

”دونوں پورے ہو گئے ہیں۔“ عذرا بیگم نے جواب دیا۔ ”علی اور حمزہ کی کلا میں شروع نہیں ہوئیں؟“

”کیا خبر ہے؟“ یونیورسٹی کالج بھی ان کے باوا کی جاگیر ہوئے۔ جب جی ہوا منہ اٹھا کر چل دیتے ہیں ورنہ بے

تھے قتل و طرح طرح کے تھے۔

”اچھا! چلے گی ہو۔“ ایک صلاح دو۔ ”حقیقہ حیات اچانک ہی بول پڑیں۔“

انہوں نے غصے سے انہوں میں عذرا بیگم سے اجازت چاہی۔ وہ مسکرا کر رہ گئیں۔

”بہم نافع۔“ انہیں نہ آئیں؟“

وہ قہقہہ کر کے ہنس پڑیں۔

UR

”ارے بھئی۔ عرشہ کا ہاتھ مانگتی ہیں عذرا بیگم تم سے اپنے نافع کے لیے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

”کہو تم راضی ہو؟“

اندر آئی ہونی ناعمہ کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ کان کھڑے کر کے سننے لگی۔ فردوس بیگم تذبذب کا شکار تھیں۔

”اب اماں! ایسے جلتے پھرتے کیا جواب دوں۔ آپ کے بیٹے کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ پھر ہی کچھ کہہ پاؤں گی۔ ویسے مجھے تو نافع بھی پسند ہے۔ اپنا گھر کا بچہ ہے۔ نظروں کے سامنے ہی پلا برہا ہے۔ لیکن پھر بھی۔“

”ہاں ہاں فردوس! تم تسلی سے سوچو۔“ حقیقہ حیات نے انہیں مطمئن کیا۔ ”ہم تو یونیورسٹی ذرا ذکر کر رہے تھے تم سے۔ تم سوچ سمجھ لو۔“

ناعمہ پلٹ کر بھاگی۔ ایک اچھی خبر اس کے ہاتھ لگی تھی۔

(باقی آئندہ)

خیالی رکھتے ہیں۔ ورد کا میں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چچا کو دکانوں کا کرایہ لانے کی ذمہ داری سونپ کر وہ قدرے فکر و عااش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سیکھنے بھی پڑوس ہونے کا حق بھر پور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں ربیعہ کو کچھ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ربیعہ متوا۔ ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے رنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے ایک شاہت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلقیس بانواس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں سنبڑہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے بات کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ماشوم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔ ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کے بدلتے رویوں سے تنگ آگئی ہے۔ پھوپھو کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ بس ربیعہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ بیان کر کے ربیعہ کو اس کی پھوپھو کے گھر تنگ رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

۱۲

بارہویہ قیصر



”فدا شک نیونس“ وہ چلا نک لگا کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

چائے پیتی ہوئی رابعہ بیگم اور کڑھائی کرتی ہوئی وردہ چونک اٹھیں۔
”لوکی!“ رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”چلا وہ ہو کیا؟ پلک جھپکی حاضر پلک جھپکی غائب! ابھی تو تم ثانیہ کی طرف گئی تھیں۔“

PHOTO

”گئی تھی ای جان اب بالکل گئی تھی۔ وہیں سے تولائی ہوں چپٹی خبر اس نے بچھا رہی۔“
”ہاں۔ دیکھ آئی ہوگی کوئی نیا سوٹ یا نئی ڈش۔“ وردہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ”تمہارے لیے تو یہ بھی ”خبر“ ہوتی ہے کہ ثانیہ نے بہت اچھا سوٹ سلوایا ہے اور پھر اس ”خبر“ کے ساتھ ایک عدد فرمائش ٹانگ کرا می کو سنا دیتی ہو۔“

”جی نہیں جناب! اس بار میں اصلی سے سچی خبر لائی ہوں۔ میرے ان بے گناہ کانوں نے خود سنا ہے۔ لیکن جانیے! میں نہیں سنا آپ لوگوں کو۔ یہاں تو کسی کو کوئی دل چسپی ہی نہیں۔“
”ہاں نہیں ہے ہمیں پرانے گھروں کی باتوں میں دل چسپی!“ رابعہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے جانے کا مھونٹ بھرا۔

”پرایا گہ؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”میں سلجوق ماموں کی طرف گئی تھی۔ وہاں ثانیہ امی اور فردوس ممانی۔ خیر جانیے میں نہیں بتائی۔ رائے آئی ہو تیس تاہم تو اتنے ذوق و شوق سے پوری بات سنیں وردہ آپ تو بالکل ہی بڑا

اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ وردہ کو ہنسی آگئی۔

”اچھا چلو۔ بکواب!“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میں بے حد دل چسپی سے سن رہی ہوں۔“
”پتا ہے کیا۔“ وہ پھر بڑبڑاؤ ہو گئی۔ ”نانی امی عریشہ کا رشتہ مانگ رہی تھیں نافع بھائی کے لیے۔“
”اچھا!“ وردہ چونک اٹھی۔

”واقعی؟“ رابعہ بیگم نے بھی دل چسپی لی۔ ”پھر بھابی جان نے کیا کہا؟ وہ تو بڑی خفا خفا سی رہتی ہیں عذر رابعہ بھابی

”انہوں نے کوئی خفا خفائی نہ لگی نہیں دکھائی۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”بلکہ ان کا تو دل چاہ رہا تھا فافٹ ”ہاں“ کہہ دیں۔ بس ضبط کر گئیں۔“

”بد تمیز!“ وردہ ہنس پڑی۔ ”تم نے ان کے اندر جھانک کر دیکھ لیا؟“

”میں نے تو کمرے میں بھی نہیں جھانکا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”باہر ہی کھڑی تھی۔ لیکن ان کی آواز میں جو بے تالی اور خوشی تھی میں اسی سے سمجھ گئی کہ ممانی جان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔“

”طلب؟“ رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”یہ تم ساری گفتگو چھپ کر سن رہی تھیں؟ کہاں تھیں تم؟“
”ای۔ جی! میں کوئی ارادہ تھوڑا ہی تھا چھپ کر سننے کا۔ میں تو سچ سچ ثانیہ سے ملنے ہی گئی تھی لیکن جب میں گھر آئی تو مجھے ممانی جان کی آواز آئی۔ وہ تو میری صورت سے چڑتی ہیں۔ اسی لیے میں نے واپس آئے کا ادا کیا تب ہی کچھ جملے میرے کان میں پڑ گئے۔“

وہ معصومہ بن کر وضاحتیں دینے لگی، لیکن رابعہ بیگم اسے کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وردہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ وہ اپنے دے پٹے کی جانب متوجہ ہو گئی جس پر وہ پھول کاڑھ رہی تھی۔

”غصہ! تم سب عرصہ گزر گیا؟“

”نہیں۔“

”کس انداز سے؟“

”تربیت کی ہے بھابیوں کے گھر میں پور میں ملنے کے لیے۔“

”پوری بات سن کر آئی ہو اور کتنی ہوا اتفاقا“ سن لیا۔ اتفاقا“ ایک آدھ جملہ سنا جاسکتا ہے۔ جس کا کوئی مفہوم نہ ہے پوری کہانی معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور پھر روٹی جلی آئیں بات پھیلانے کے لیے۔ مزید غلط حرکت۔“

”لی، ہالو کیس کی۔“ وردہ نے اسے چڑایا۔

”بیٹے!“ رابعہ بیگم اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر نرم پڑ گئیں۔ ”جس طرح پیسے چوری ہوتے ہیں اسی طرح بات بھی چوری ہوتی ہے۔ تم بات چرا کر لائی ہو۔ اتفاقا“ سنا تھا تو اپنے شک رکھتیں، ہمیں بتانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ بھی چکارے لے لے کر۔“ وردہ نے اضافہ کیا۔

”دیکھیں نا امی۔“ وہ آخر کار بے طرح چڑ گئی۔ ”یہ آپلی! مجھے کیوں چھیڑ رہی ہیں۔“

”اسی سے عقل سیکھو۔ اتنی سمجھ دار بنی ہے میری۔ اور تم ہو کہ ہر دو سرے منٹ ڈانٹ کھاتی ہو۔“

ورد مسکراتے ہوئے اسے نظروں ہی نظروں میں گویا جیسٹر نے لگی۔
 ”میں عریضہ کے پاس جاتی ہوں۔“ اچانک ہی اسے نیا خیال سوچھا۔ ”نکھوں تو اسے علم ہے یا نہیں۔“
 ”میٹھو آرام سے۔“ رابعہ بیگم نے پھر ڈانٹ پلائی۔ ”بھی کیا بات سمجھائی ہے میں نے۔ اس کان سے سنی اور
 ذرا سا غور کیے بغیر اس کان سے نکال دی۔ خبردار جواب اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو۔“

”لیکن امی! اسے تو بتانا ہی چاہیے۔“
 ”ہاں تو اس کی ماں بتائیں گی۔ باپ بتائیں گے۔ تم کہیں خوشی میں دوڑی بھاگی جاتی ہو؟ دیوانی کہیں کی۔ اس کے
 ماں جب پوچھے گی کہ تمہیں کس فرشتے نے آکر اطلاع دی تھی تب کہنا اسے کہ چھپ کر بات سنی تھی۔ اچھڑ
 عزت افزائی ہوگی تمہاری۔“

”اچھا نا۔“ وہ نجل ہو گئی۔ ”آرام سے سمجھا دیا کریں نا۔ غصہ کیوں ہوتی ہیں۔“
 ”آرام سے سمجھنے والی ہو تم؟“ انہوں نے مزید گھورا۔
 ”ناعمہ نے سر جھکا لیا اور وردہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
 ”دیکھ لوں گی۔“ اس نے مکا دکھایا۔

آج وہ نہانے کے بعد لیمن کلر کا چکن کا سوٹ پہن کر باہر نکلا۔ چھت پر چلی آئی تھی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا۔
 آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے دوسرے دوسرے پھر رہے تھے۔ ہو گئی تھی خوب چل رہی تھی۔ اکثر گھروں کی چھتیں آبار
 آ رہی تھیں۔ آسمان پر رنگ برنگ پتنگوں کا جھوم تھا۔ ربیعہ سر اور پر کے انہماک سے پتنگوں کی لڑائی دیکھنے لگی۔
 اچانک ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ آسمان سے پھٹکتی اس کی نظر برابر میں کھڑے تصور پر پڑی۔
 ”نجانے کس وقت بالکل خاموشی سے اس کے بے حد قریب سے کھڑے ہو گیا تھا۔
 وہ گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تصور ختم ہو گیا۔
 ”کیا ہوا؟“ ڈر گئیں؟“ وہ چند قدم مزید آگے آگیا۔

ربیعہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً بولی۔
 ”میں تو بھوت سے نہیں ڈرتی“ آپ تو انسان ہیں۔“ وہ قدر پر ہنس پڑی۔
 پھر وہ دانستہ رخ موز کر چھت کے دوسری جانب چلی گئی۔ تصور سے وہ اکثر ایسی مذاق لیتی تھی۔ تمدن کی بات
 وہ خاصا بے ضرر اور شوخ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آج اس نے عجیب حرکت کی تھی۔ ایسی حرکت جس پر واضح طور پر
 کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

ربیعہ کو بدریا یاد آگیا۔ وہ بھی اکثر جان بوجھ کر بالکل قریب آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اتنا قریب کہ ربیعہ کو جھجک کر پیچھے
 ہٹنا پڑ جاتا۔ شاید صنف مخالف کو یوں جھجکتا یا کر مروانگی کو کسی قسم کی تسکین ملتی ہو۔
 ربیعہ کا خوشگوار موڈ اچانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ شاید تصور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس سے قدرے
 فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”پتنگیں اچھی لگتی ہیں تمہیں؟“ وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔
 ربیعہ نے چند لمحے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنی غلط حرکت کا احساس ہو جائے۔
 خاموشی کھڑی رہی۔

”بھی اڑائی ہے پتنگ؟“
 ”نہیں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آتا ہی نہیں ہوگا اڑانا! وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”سیکھو گی تو آجائے گا۔ میں سکھا دوں گا۔“
 ”مجھے شوق بھی نہیں ہے۔“ وہ ہنوز خشک لہجے میں بولی۔

”اچھا اچھا۔“ ہاں لڑکیوں کو کم ہی شوق ہوتا ہے۔ ”وہ بے وجہ ہنسا۔ ”لڑکیوں کو تو اور ہی طرح کے شوق ہوتے
 ہیں۔ تجھے سنورنے کا شوق، گورا ہونے کا شوق، بال بڑھانے کا شوق، ترانہ کو بھی بال بڑھانے کا شوق ہے اور وہ
 صولت! ہا ہا ہا۔“ سختی کو بورتی۔ اس کے بال ایسے ہی ذرا ذرا سے رہتے ہیں۔ بڑھتے ہی نہیں۔ ہا ہا ہا۔“
 پھر وہ سنجیدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں ربیعہ! اتنے لمبے، اتنے سیاہ، اس قدر ملائم۔“ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ
 ہاتھ بڑھا کر اس کے بال چھو لیتا۔

ربیعہ تلمل کر رہ گئی۔ اس نے کب کسی مرد کے لبوں سے ایسی بے باک تعریف سنی تھی کہ اس نے خفگی بھری
 نظروں کی جانب دیکھا۔

”نجانے کس نے اس طرح کی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ اس نے حتی الامکان پرسکون رہنے کی کوشش
 کرتے ہوئے کیا۔

”اچھا اچھا۔“ وہ پھر بے وجہ ہی ہنسنے لگا۔ ”لڑکیوں کو تو تعریف بہت پسند ہوتی ہے۔ تمہیں پسند نہیں۔ خیر کیا
 پسند ہے تمہیں؟“

”کبھی کبھار تم کو اس سے مانا۔“ اس نے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھی بھی کی جی چاہ رہا تھا اس لیے اوپر آئی تھی۔“
 ”نجانے کیا چہرہ دیکھ رہا ہے؟“ وہ اس کے طلب سمجھ گیا تھا۔

”میں نے جی چاہا تھا، پتنگیں دیکھنے۔“ مجھے علم نہیں تھا کہ اوپر تم ہو۔“
 ربیعہ خاموش رہی۔ تصور نے کسی گانے کی دھن پر سٹی بجاتا تھا، پھر آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا

وہ سری جانب چلا گیا۔
 ”سری جانب چلا گیا۔“

ربیعہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً بولی۔
 ”میں تو بھوت سے نہیں ڈرتی“ آپ تو انسان ہیں۔“ وہ قدر پر ہنس پڑی۔

پھر وہ دانستہ رخ موز کر چھت کے دوسری جانب چلی گئی۔ تصور سے وہ اکثر ایسی مذاق لیتی تھی۔ تمدن کی بات
 وہ خاصا بے ضرر اور شوخ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آج اس نے عجیب حرکت کی تھی۔ ایسی حرکت جس پر واضح طور پر
 کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

ربیعہ کو بدریا یاد آگیا۔ وہ بھی اکثر جان بوجھ کر بالکل قریب آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اتنا قریب کہ ربیعہ کو جھجک کر پیچھے
 ہٹنا پڑ جاتا۔ شاید صنف مخالف کو یوں جھجکتا یا کر مروانگی کو کسی قسم کی تسکین ملتی ہو۔

ربیعہ کا خوشگوار موڈ اچانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ شاید تصور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس سے قدرے
 فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”پتنگیں اچھی لگتی ہیں تمہیں؟“ وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔
 ربیعہ نے چند لمحے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنی غلط حرکت کا احساس ہو جائے۔
 خاموشی کھڑی رہی۔

ربیعہ نے سنک میں ہاتھ دھوئے اور کھڑکی تک چلی آئی۔
 ”کیا ہے۔ اندر کیوں نہیں آتیں؟“
 ”آہستہ! اس نے لبوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”پھیپھو کہاں ہیں؟“

”مسور ہی ہیں۔ کیوں؟“ اسے اس کے انداز پر تعجب ہوا۔

”مصولت؟ وہ کیا کر رہی ہے؟“

”مصولت تو گھر پر نہیں ہے۔ اسکول سے اب تک نہیں لوٹی۔“

ترانہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

”اچھا میں آتی ہوں۔“ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

ربیعہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے برآمدے میں چلی آئی۔ ترانہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ

میں ایک پیکٹ تھا جس کو خوبصورتی سے پیک کیا گیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ ربیعہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”شئی۔ خاموش!“ وہ سرگوشی میں بولی۔ اور سیدھی اپنے باپ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ پیکٹ اس نے

الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیا۔ منور امین اپنے بستر پر آنکھیں موندے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

ان کا زیادہ تر وقت اسی انداز میں گزرتا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔

”تم نے کھانا کھالیا؟“ ترانہ نے شگفتہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔ مجھے تو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کھانا نکالوں؟“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچن میں

آچکی تھیں۔ ”نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں برگر کھا کر آئی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔“ ربیعہ سادگی سے بولی۔ ”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“

”ہاں چائے پیوں گی۔ لیکن ٹھہرو، کچن کا نقشہ بتا رہا ہے کہ تمہارا شمار آج نہیں تمام ہوا ہے۔“ ترانہ نے

انگاہیں چاروں طرف دیکھنے لگیں۔

”یہ دھلی دھلائی بریاں اور بوتلیں۔ صاف ستھرے شیٹ بچھوئے۔“ ربیعہ نے برتن اور یہ چمکتا ہوا چولہا خوب

محنت ہوئی ہے۔“

”مجھ سے گندہ کچن براشت میں ہوتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”اس نے کہا نہیں تھا یہ سب کچھ کرنے“

لیے۔ بس وقت گزارنے کے لیے کوئی مصروفیت تو ہونا چاہیے نا۔“

”ٹھیک ہے بھئی، ٹھیک ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب کم از کم میں تمہیں چائے بنا کر تو پلاؤں

ہوں نا؟“

”نہیں۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں بناتی ہوں چائے۔ ذرا یہ چولہا صاف کر لوں۔“

”تم سے نہیں جیت سکتی۔ چلو میں تب تک کپڑے بدل لوں پھر چھت پر چلتے ہیں۔“ وہ کچن سے نکل گئی۔

ربیعہ نے مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ آج ترانہ بے حد خوش تھی۔ وجہ غنیمت پر

اسے معلوم ہونے والی تھی۔ چھت پر اسے لے جا کر ترانہ بھی چھت کی طرح ہو جاتی تھی۔ کھلی کھلی اور روئے

روشن۔ ربیعہ سے وہ اپنے دل کی سب باتیں کہہ ڈالتی تھی۔

ربیعہ نے چولہا صاف کر کے چائے کا پانی رکھ دیا۔ باورچی خانے کا آجلا پن اس کا من اجال رہا تھا۔ سب کا

صاف ستھرا اور نکھرا ہوا دیکھ کر اسے روحانی خوشی مل رہی تھی۔ اسے محسوس نہ ہوا کہ کچن کے دروازے پر کھڑا

ترانہ مسکراتے ہوئے اسے اپنی محنت پر خوش ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسدستی سے غور و خوض کریں۔

ترانہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے نیازی تھی۔

”جتنی سخت حکومت اتنی سر پھری بغاوت۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتیں ربیعہ ڈیرا سانس لینے کو روزانہ میسر نہ ہو تو دیواریں ڈھادی جاتی ہیں۔“

ربیعہ کو باغی ترانہ سے خوف سا محسوس ہوا۔ اچانک ہی وہ چونکی۔ سیڑھیوں پر اس نے بالوں کی سیاہی دیکھی، پھر اسے لال کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ کوئی چھپ کر واپس جا رہا تھا۔

”انسے کسی نے ہماری باتیں سنی ہیں۔“ وہ اچانک ہی ڈر گئی۔

”انہ نے مڑ کر دیکھا۔

”کون تھا؟“

”تیرے سرخ کپڑوں کی جھلک تھی۔“

”مصلحت!“ ترانہ نے لب سکوڑے۔ ”یہ لڑکی کسی دن نقصان اٹھائے گی میرے ہاتھوں۔“

”نیکے ڈر لگ رہا ہے ترانہ!“

”بدترانہ سے گھورا۔

”سنو رولر! جلدی کرو، سونا، ہم رات کو چھت پر گفٹ کھولیں گے۔ پتا نہیں باری نے میرے لیے کیا خریدا۔“

”وہ چپ چاپ متعلقہ سوچ رہی تھی، جبکہ ربیعہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔“

”جس رات کے کھانے پر منیوہ بیگم نے سب کو اطلاع دی تھی۔

شہلا اور انیقہ کے چہرے کھل اٹھے۔ عمر نے خوشی سے نعروں لگایا۔

”عباداموں! ہرے نانوں میں انہیں اپنے پیہا کے بارے میں بتاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔“

شہلا اپنی پلیٹ پر جھک گئی، جبکہ انیقہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ منیوہ بیگم نے پیار سے ساتھ بیٹھے ہوئے

”اواسے کا کال تھپکا۔

”نانو!“ اس نے پھر کچھ بولنا چاہا۔

”عمر!“ شہلا نے اسے ٹوک دیا۔ ”خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“

”کیوں جھمکتی ہو بچے کو بار بار۔“ منیوہ بیگم نے دھیرے سے اسے ٹوکا۔ ”اس کے معصوم ذہن میں بدگمانیاں نہ پیدا کرو۔ بول رہا ہے نا۔ بولنے دو۔ کیا لیتا ہے تمہارا۔ ہر طرح کے حالات کو ذہنی طور پر قبول کرنا سیکھ لو شہلا بیٹی! انسان پھر اتنا پریشان نہیں رہتا۔ بہتی دھارا کے ساتھ بننے دو سب کو۔“

”بہت خوش ہو؟“ اس نے پوچھا تو ربیعہ چونک اٹھی۔

”ہاں!“ وہ ہنسی۔ ”لیکن تم سے زیادہ نہیں۔“

ترانہ چونکی اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”تم سے کس نے کہا میں خوش ہوں؟“

ربیعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اور چائے کا گلاسے اٹھا دیا۔

”تم کوئی لیکن چھت پر چل کر۔“

ترانہ جینپ کر ہنس دی۔

”آج میری سالگرہ ہے۔ عبد الباری نے مجھے لپچ کرایا اور گفٹ بھی دیا ہے۔“ اس نے چھت پر چل قدمی

کرتے ہوئے اسے بتایا۔

”پسند کرتی ہو تم عبد الباری کو؟“ ربیعہ نے اس کی آنکھوں کی جلتی ہوئی جوت دیکھی۔

”ہر گز!“ ترانہ نے اسے گھورا۔ ”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ پسند نہ کرتی تو اس کے ساتھ متی

پھرتی، تنھے لیتی، خواہوا میں۔“

”شادی کیوں نہیں کر لیتے تم دونوں۔ اس سے کہنا دینا آئی ہے بات کر۔“

ترانہ کی آنکھوں کی جوت مدھم مدھم پڑ گئی۔ وہ اس سے ہونگی۔

”میں نے شادی کر لی تو ابو کا کیا ہوگا ربیعہ! بھائیوں کے متعلق تو تم جان ہی گئی ہو۔ انہیں گھر سے جتنی

پسند ہے وہ وہی چھپی بات تو نہیں۔ رو دو کر مہینے کا راشن لے آتے ہیں اور بس! ابو کی وہائیاں دیکھ کر اخراجات

یہ سب کچھ میری تنخواہ سے چلتا ہے۔ پھر ابھی باری کی پوزیشن بھی اتنی اسٹرونک نہیں ہے۔ ہم کچھ عرصہ تو

شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”دینا آئی جانتی ہیں اس کے متعلق؟“ ربیعہ نے پوچھا۔ ”وہ مجھ سے بھی پوچھ رہی تھیں باری کے متعلق۔“

”ہاں۔ معلوم ہے مجھے یہ صولت ایک نمبر کی جاسوس ہے۔ میں کبھی کبھار اس سے اپنے دل کی کہہ سن لیتی تھی۔

مجھے علم نہ تھا کہ یہ میسنس پیچھو کو پوری رپورٹنگ کرتی ہے۔ اس نے انہیں خوب بھڑکایا۔ پیچھو نے مجھے

دھمکی دی کہ اگر میں نے باہر کسی لڑکے سے روباہا رکھے تو وہ تصور اور تہن کو تباہ کرے میری خوب ٹھکانی کروائیں

گی۔“

ربیعہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد لاپرواہی سے سب کچھ کہہ رہی تھی۔

”لیکن سہو! اتنی سخت کیوں ہیں ترانہ؟“

ترانہ زور سے ہنس دی۔

”وہ ظالم سماج ہیں ربیعہ! ظالم سماج، محبت کے گلابی سپنوں سے انہیں سخت نفرت ہے۔ کسی کی آنکھوں میں

رنگین سپنے دیکھ کر ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ ان آنکھوں کو نوچ کر اندھا کر دیں۔ لبوں پر مسکتی ہنسی سے ان کے

کانوں میں زہر بھرنے لگتا ہے۔ آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ ایک ایسا قانون پاس کر دیا

دیں جس کے تحت محبت کا نام لینے والوں کی زبانیں کھینچ دی جائیں۔ خواب بننے والی آنکھوں میں سلاخیاں

پھرا دی جائیں۔ ننھے سننے والے کانوں میں سیسہ بھر دیا جائے۔“

ربیعہ دم بخود سنتی گئی۔

”بہت بہت والی ہو۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

شہلانے سہم کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

”دیکھا! آئی نالاج اس تصور سے؟“ ایقان کہہ رہی تھی۔ ”کیسے کہہ سکتی ہو شہلا کہ جذلوں کے الاؤ سرد پڑے ہیں۔ رخساروں پر بکھرتی حرارت جھوٹ نہیں بولتی۔“

”ایقان! اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔“ کیسے سمجھاؤں تمہیں یہ بات تو میں اپنے آپ سے کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ جذلوں کے الاؤ سرد نہیں ہیں مگر جنگاریاں جو چھپی ہوئی ہیں۔ ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس رُتِ پتے رستے پر بس ایک مسافر ہی منزل تک پہنچا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ منزل کو منزل نہ سمجھا۔ وقتی پڑاؤ سمجھا۔ لیکن اس کے قدموں کے نشان آج تک۔۔۔“

وہ سسک پڑی۔

”اب تک ویسی ہی ہو۔“ کسی نے ہنس کر کہا۔

شہلا ڈر گئی۔ یہ کس نے جی کا چور دیکھا تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جالی کے سفید پردے چپکے چپکے مسکرا رہے تھے۔



”یہ ایریو پلین کی تصویر یہاں لگاؤ اور یہ ٹرین یہاں۔“ ایقان بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔

”مما! یہ ایمان برابری گلو! (Glu) صانع کر رہی ہے۔“ مومن نے اس کی توجہ ننھی ایمان کی جانب مبذول کروائی۔ ”تو نکال نکال کر کاربٹ بر لگا رہی تھی۔“

”ہائیں۔“ وہ جلدی سے اٹھی۔ ”گندی بچی یہ کیا کیا تم نے کاربٹ کا ناس مار دیا۔ اب یہ کیسے صاف ہوگا۔ تمہارے ابا جاپان سے آئیں گے یہ صاف کرنے۔“

ایمان ہنسنے ہوئے اٹھ کر کھاگی۔ ایقان اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے چلا نکلی۔ کمر میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی جس نے اس کے پورے وجود میں آگ سی بھردی۔ وہ سینے سینے ہو گئی۔ اس کا حسی خشک ہو گیا۔

”مما! مومن جو غور سے ماں بیٹی کے درمیان ریس ملاحظہ کر رہا تھا چونک اٹھا۔ ”مما! کیا ہوا؟“ ایقان بمشکل ہونے لگی۔ مومن نے اس کے قریب جھک دیا تھا۔ ایمان پردے کے پیچھے جا چھپی تھی۔

”مما! آپ کی طبیعت خراب ہے؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

ایقان محض اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں۔“

”میں پانی لاتا ہوں۔“ وہ کچن کی جانب دوڑ گیا۔

ایقان نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر رہا تھا۔

دفعۃً ”فون کی بیل بجنے لگی۔ مومن نے جا کر فون کا ریسور اٹھایا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔ جی پیما۔ میں مومن ہوں۔“

ایقان چونک گئی۔

”مما کی طبیعت خراب ہو گئی پیما۔! میں انہیں پانی پلا رہا ہوں۔“ اس نے اپنی مستعدی کے متعلق بتانا ضروری خیال کیا۔

ایقان اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے فون تک گئی۔

”ہیلو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

"ایقان! کیا ہوا ہے یار؟" وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔
 "پتا نہیں عاشر! بس اچانک ہی کمر میں ٹیسس سی اٹھنے لگی ہیں۔ بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہی۔
 "تم۔ تم فون کر کے رافع یا ہاسم کو بلاؤ۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

"اچھا! اس نے کہا۔
 اس کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔ لب کا نیپے لٹکے تھے۔ عجب موسم تھے جدائی کے۔ پوری زندگی پر محیط دکھائی دیتے تھے اس کو، تو شخص آواز سے کب تک خود کو تسلیاں دیتی وہ۔ ایقان نے اس لمحے خود کو بے حد تنہا اور ملول محسوس کیا تھا۔

"ایقان۔ ایقان۔۔۔" وہ آواز سے دے رہا تھا۔
 "ہاں! اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "میں سن رہی ہوں عاشر!"
 "آئی لو یو جانو!" یہ بھی گویا تسلی دینے کا انداز تھا۔

ایقان کی تسلی اب اس جملے سے نہ ہوتی تھی۔ ورنہ بہت عرصے تک تو وہ یہی سہ لفظی جملہ سنا کرتا ہو جاتا کرتی تھی۔ دل ان ہی لفظوں کی تکرار کیا کرتا تھا۔ وہ خوش خوش پھرا کرتی تھی۔
 وہ سری جانب سے سلسلہ منتقل ہو گیا تھا۔ ایقان نے مرے مرے آواز میں ریسیور کے دھڑکنے کو اب اس کی تسلی کافی نہ تھی۔ جی بھر کر رو لینے کے لیے ایک کاندھا دے رہا تھا۔
 ٹیس پھرا تھی بھی۔ وہ "حیات دلا" کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ جن عذر ایٹم نے اٹھایا۔

"ہیلو بھائی جان!" وہ بولی۔ "ایقان بات کر رہی ہوں۔ جی میری طبیعت کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ کمر میں درد ہو رہا ہے۔ جی رافع کو بھیج دیں۔ بھائی جان کی گاڑی لے آئے۔ جی اچھا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"ہم بے چاری عورتیں!" صوفے کی پشت سے سر نکا کر سوچنے لگی۔ "ایک سو سو صدی کا نعروں کا شخص آزادی کی باتیں کرتی ہیں۔ سینار ہوتے ہیں، ٹیکہ چڑھتے جاتے ہیں۔ پھر عورتیں ہوتی ہیں۔ آزادی کے سوال کی باتیں ہوتی ہیں۔ عورت آزاد ہے، عورت 'مرد کے سہارے کی محتاج نہیں' عورت اکیلے رہ سکتی ہے، بچے پال سکتی ہے، نوکری کر کے اپنا گھر چلا سکتی ہے۔ سب ہی کچھ کر سکتی ہے بے چاری خواہ! سب کچھ کر گزری مگر آدم کے شکنجے سے آج تک اپنا دل آزاد نہ کروا پائی۔ آزاد وجود کے اندر قیدی دل لیے پھرتی ہے۔ وہاں سے محض ایک جملہ کہہ کر فرض پورا ہو جاتا ہے۔ آئی لو یو جانو! کتنی بڑی بات ہے نا۔ یہ بول رہی ہیں کہ 'دل کی آزادی'۔ دل کی آزادی دیا نہ ساری ساری رات اسی ایک جملے کا تعاقب کرتا ہے، یہی سننے سننے رہنے کی خواہش میں عمر گزار دیتا ہے اور بے چاری عورت! کہتی ہے 'میں آزاد ہوں! جن کا دل زنجیر کی چھٹک کا غلام ہو۔ ان کے وجود آزاد نہیں ہوا کرتے دیوالی عورتوں!"

وہ "حیات دلا" چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر نے دس بند روڈ ہسپتال کی ہدایت کی تھی۔

"نو عمر لڑکیوں بالیوں کی طرح تو اچھلتی کودتی پھرتی ہو تم!" شقیقہ حیات نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "شوہر پردیس میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ تمہیں تو دہری ذمہ داری بھانی ہے۔ اپنا خیال خود نہ رکھو! ٹولی! خدا فرشتے تو اتارے گا نہیں جو بل پل تمہارا ہاتھ پکڑ کر سارا دس۔ ہر کی سی قلا بچیں بھرتے میں نے بار دیکھا ہے تمہیں۔ میرا جی دھڑک دھڑک جاتا ہے پر تم بے دھڑک چلا نک لگاتی ہو یہاں سے وہاں تک کی۔"

وہ کان لپیٹے بیٹھی رہتی۔

"میرے منہ میں خاک! کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا تو میاں سے کیا کہتیں؟"

"اونہ! میں نے ٹھیکہ لیا ہے نایب کچھ سیدھا سیدھا رکھنے کا۔" وہ جھٹلائی۔ "یہاں ہمارا دل الٹا سیدھا آڑا ترچھا سب ہی کچھ ہو جاتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور اماں! عورت اپنے دل سے مرد کی باندی ہے۔ اسے مرد ہی بھاتا ہے ہر روپ میں، بھائی ہو، بیٹا ہو، اور تو اور داماد ہو۔ بس وہی صحیح ہے۔ آپ کو بیٹی کی فکر نہیں، داماد کی سوچ کی تشویش ہے۔ حد ہو گئی۔"

"ارے ارے کیسی نامعقول ہو رہی ہو تم۔" انہوں نے بیٹی کو گھورا۔ "وہ ہمیں ہی سوئپ کر گیا ہے تمہاری خبر گیری۔ فکر نہ کریں گے کیا؟ اور تمہیں یہ کا ہے کا بھوت سوار ہے؟"

"پتا نہیں! بس غصہ آ رہا ہے ہر کسی پر۔"

"بیٹی! وہ نرم پڑ گئیں۔" کیوں جان ہلاکن کیے رکھتی ہو۔ چار پیسے کمانے پر دیس گیا ہے بچہ۔ آجائے گا۔ ساتھ بننے کھیلنے کو عمر بڑی ہے۔"

ان تھیں۔ جال سے بے حال ہوئی بیٹی کے احساسات سمجھ گئیں۔

"بہن! درست کہا اماں! پیر میرے قبر میں لٹکے ہوں گے اور میں کھیلتی بھڑوں گی لاٹھی کے سہارے۔"

ان کا کھلکا کھلکا کر ہنس دیں۔ وہ اس کے لیے شیک بن کر لائی تھیں۔

"اپنے نام کا لکھنا ہی ہے۔" شقیقہ حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

فرانک پین میں رکھے ہوئے کبابوں کو احتیاط سے پلٹتے ہوئے انہوں نے ایک نگاہ عباد پر ڈالی۔ کچن میں پڑی کھانسی گول میر کچن کی پر جیلاؤ۔ مزے سے پلاؤ اور رستے کا لطف اٹھ رہا تھا۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

کمال کباب کی پائٹ سے نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔

”اچھا! انہوں نے سانس بھری۔ ”تو تیسری بہن مل گئی تھیں۔“

”میں اس۔“

”میں تو سمجھی ایک ذمہ داری سے جان چھوٹی میری۔ اب تمہارے رشتے کے لیے خوار نہیں ہونا پڑے گا۔“

”آپ خدا نخواستہ کیوں خوار ہونے لگیں۔ یہ میری اچھی اچھی بہنیں کس مرض کی لدا ہیں۔“ وہ مزے سے بولا۔

منوڑہ بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

”عباد! جانتے ہو ابراہیم اکثر عمر کو لے جاتا ہے۔“

وہ بھی گم صم سا ہو گیا۔

”اور ایسا! بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔“

”رو رو کر دیوانی ہو جاتی ہے بے چاری۔ پر کیا کرے ڈرتی ہے کہیں وہ کوئی دعوانہ کر بیٹھے۔“

”جانتا ہے تو کرے۔“ وہ بگڑا۔ ”ہم بھی دیکھ لیں گے۔“

”بیٹا! مردوں کے اس معاشرے میں ایک دکھی ماں کے دل کی فریاد کس نے سنی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”یہ ہے وہ ایک ماں۔“

”کتنے اچھا یاد آیا ہے؟“ وہ بھی مجروح لہجے میں یہی کہہ سکا۔

”کب تک یہ کھیل چلتا ہے۔“ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔

دل کے کا۔ ببب یاد آیا

تیرا یاد بھی اب یاد آیا

”پتا ہے! میں نے غزل تو میرے سینے میں ہے۔“

شاعری۔ لیکن اب میں غزل تو میرے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگتی ہے۔ میرا دل مضطرب ہو جاتا

ہے۔ سانس نہ لگتا ہے۔ میرے سینے میں ہے۔ اور جب یہ شعر آتا ہے کہ۔

”میرا دل مضطرب ہو جاتا ہے۔“

”میں بہت روئے وہ جب یاد آیا

تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”میں کیا جانوں۔ اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”آنسو کتنے ہیں دل سے پوچھو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے دل سے پوچھو۔“

”پوچھ تو رہا ہوں۔“

عریضہ کے گل تپ گئے۔ کان کی لوسن پر گئی۔

”بولو تا میرے دل۔ کوئی جواب؟“

”فرانس۔ پکیزا ایسے مت بات کرو۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”ہم کب میں گئے عریضہ؟“ اس نے اس کی کیفیت بھانپ کر ٹریک بدلا۔ ”اب تو تم تلف مار کیٹ بھی نہیں

”کہو بیٹے۔“ وہ اب اس کے لیے چائے دم کرنے لگی تھیں۔

”ایک لڑکی ملی تھی لاہور جاتے ہوئے۔ ٹرین میں ساتھ تھی میرے۔ رہینہ نام ہے اس کا۔“

”اچھا! ان کے ہاتھ رک گئے۔ لبوں پر متنی خیز مسکراہٹ جاگ اٹھی۔

”امی! وہ سوچ میں گم ہو گیا۔

منوڑہ بیگم اس کے کچھ کہنے کے انتظار میں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر کھنکھاریں۔ وہ چونک اٹھا۔ کچھ

کہے بنا وہ دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ وہ بھی چائے بنانے لگیں۔

کھانے اور چائے سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول ان کے کمرے میں چلا آیا اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ

گیا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

”امی جی! وہ بہت اچھی ہے۔“ وہ چیمت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”بہت حوصلہ مند خود دار باوقار اس کی بات

چیت میں بے حد شائستگی ہے، مسکراہٹ میں بچوں کی سی معصومیت، آنکھوں میں وہ روشنی جو صرف کردار کی

بلندی سے ہی ملتی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ بہت سختی برتی لیکن وہ عزم اور ہمت کی مثال ہے۔“

”بہت متاثر کیا ہے۔“

منوڑہ بیگم مسکراتی رہیں۔

”پتا ہے امی! اسے اپنی منزل کا علم نہ تھا پھر بھی وہ اس سے مدد خواست۔“

”جیسے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو خود پر ترس نہیں کھاتے۔“

”ہمت سے سراٹھا کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت کا چیلنج قبول کرنے والے لوگ۔“

منوڑہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں پرچھائیاں سی پھرنے لگی تھیں۔

”چڑیا کے سے دل پر اس نے ہمت اور حوصلے کا شیر کا سا خول چڑھا رکھا ہے۔ دل تو قدرت عطا کرتی ہے نا امی!

اس پر بس نہیں مگر خول انسان خود چڑھاتا ہے۔ یہ تو تعریف کا مقام ہے۔“

”ہاں! وہ چونک اٹھیں۔ ”ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔ مگر وہ ہے کون؟“

”ربیعہ! وہ سادگی سے بولا۔

”کہاں رہتی ہے۔ کیا کہانی ہے اس کی؟“

”ابھی تو میں خود ٹھیک طرح سے نہیں جان پایا۔ بس جو اندازہ کیا ہے۔“

”تاہم معلوم کر لو تو تمہارا رشتہ لے جاؤں“ وہ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”رشتہ؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مائی گاڈ! میری پیاری بھولی بھالی امی جان! ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“

”آپ سے یہ کس فرشتے نے کہہ دیا کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے؟“

”تعریفیں تو ایسے ہی کیے جا رہے ہو“ وہ براہمان کر بولیں۔

”امی جی! امی جی۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پتا ہے آپ کو مجھے اس میں سب سے زیادہ کس شے

متاثر کیا؟“

وہ بتا جو اس لیے اسے دیکھتی رہیں۔

”اس کی آنکھوں میں روشن بلند کرداری کے جگنوؤں نے۔ اور جانتی ہیں یہ جگنو میں نے اور کہاں دیکھے ہیں

آپ کی ان پیاری پیاری آنکھوں میں۔ اس کی جیا بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے آپ کی آنکھیں یاد آئیں۔ اور

”آگئیں۔ چھپی رستم!“ اس نے لتاڑا۔ ”ضرور کوئی خبر سنانے آئی ہوگی۔“

”ناعمہ!“ رابعہ بیگم کے لمبے میں اچھی بھلی تنبیہ تھی۔
عریشہ کے چہرے پر ہوا بیاں اڑنے لگیں۔ وہ جلدی سے ناعمہ کو کمرے میں کھینچ لائی۔
”کیا ہو گیا۔ یہ تم پچھو کے سامنے کیا بک رہی ہو؟“ وہ اپنے دل کے چور سے ڈر گئی تھی۔
”کیا مطلب؟“ ناعمہ نے غصے سے بازو چھڑایا۔ ”میں نے امی کے سامنے ایسا کیا کہہ دیا؟“
”تم نے مجھے چھپا رستم کیوں کہا؟“

”کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟“ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔
ناعمہ نے بولنا چاہا پھر اسے ماں کا چہرہ یاد آگیا جنھوں نے سختی سے کچھ نہ کہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ آنکھیں
جھما کر رہ گئی۔

”بولو نا۔“ عریشہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
”کچھ نہیں۔ یونہی تمہیں چھیڑنے کو جی چاہ رہا تھا۔“ وہ بات بدل گئی۔
عریشہ کی جان میں جان آئی۔ وہ نجانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔
”اور یہ تم کیوں رات کے دس بجے افتال و خیزاں دوڑی۔“ عریشہ نے اس کا
جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”مولیٰ جینس!“ عریشہ نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ ”جلی چکر دو کر نہیں۔ وہ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ
تمہارے پاس میڈم نور جہاں کی دو دو والی غزل ہے۔ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔“

”تمہارا دل دھڑکنے لگا ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔
”ہاں بابا! دھڑکنے لگا ہے۔“ وہ اس کے آگے بے بس ہوئی۔ ”میں تجھے کیسٹ دے دو۔“
”کس کی یاد سے یہ ناممکن کام ممکن ہوا۔ پہلے یہ بتاؤ۔“

”ناعمہ جاؤ! میں نہیں بولتی تم سے۔“ وہ بیزار ہوئی۔ ”بال کی کھال اتارتی ہو۔“
”اچھا اچھا جاتی ہوں۔“ وہ احسان کرتے ہوئے بولی۔ ”ویسے تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اندر ہی
اندر جو کچھ دیکھ رہی ہے نا۔ اس کی خبر ہے مجھے۔“

عریشہ جو بمشکل مطمئن ہوئی تھی پھر ریشٹان ہو گئی۔
”تمہیں قسم ہے ناعمہ! سچ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“
”او نہ!“ اس نے ریک میں لگی۔ کیسٹوں میں سے مطلوبہ کیسٹ کھینچ کر نکالی اور اس کے حوالے کی۔ ”جیسے
جانتے نہیں۔“ وہ طنز یہ بولی۔

عریشہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، خفگی سے سر جھٹکا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔
”سمجھوں گی بیٹا تم سے۔“ وہ اس کے جانے کے بعد بڑبڑائی۔ ”ناعمہ علی خان ہے نام میرا۔ دل دھڑکنے کا
سبب یاد آیا۔“

”بس بھائی جان! جو اماں نے کہہ دیا وہی میری خوشی، وہی میری اولاد کی خوشی۔“ سلجوق حسن مسکراتے ہوئے
کہنے لگے۔

شفیقہ حیات بھی مسرت سے بھرپور انداز میں مسکرائیں۔
”جیتے رہو! میرا تو خرد غرور ہو تم لوگ، بوڑھے لوگوں کو اور کیا چاہیے جتنا مان تم لوگ مجھے دیتے ہو میری عمر
برسا جاتا ہے۔“

”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے اماں! آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی اس گھر کے سب افراد
ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔“ فاروق حسن مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اور اللہ نے چاہا تو آپ کے
جوڑے ہوئے ان رشتوں سے یہ یا بھی اتفاق اور محبت بڑھتی ہی رہے گی۔“

”بس بیٹا! میں نے اسی لیے تم لوگوں کو یہاں اکٹھا کیا ہے کہ ایک ہی بار سب کی رائے معلوم کر لی جائے۔“ ہال
کمرے میں شفیقہ حیات، فاروق حسن، فردوس بیگم، سلجوق حسن، عذرا بیگم، رابعہ بیگم اور ایقان موجود تھے۔ سبھی
کے چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ ماحول بے حد خوش گوار تھا۔
”عریشہ سے بھی پوچھا ہے کسی نے؟“ ایقان کو خیال آیا۔

”ہاں پوچھ لیا ہے۔“ فردوس بیگم بے اعتنائی سے بولیں۔ ”ہماری بیٹیاں ہمارے سامنے نہیں بولتیں۔“
شفیقہ حیات کے چہرے پر سایہ سالہا گیا۔ ایقان ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ فردوس بیگم ہی کیا جو کوئی موقع
بات کرنے دیتیں۔

”قوتوں کے سوجانے کا اطمینان کر کے چمت پر چلی آئی تھیں۔“ چالیس واٹ کے بلب کے ملگجی روشنی میں
ترانہ نے بے حد بے تابی سے وہ پیکٹ کھولا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھی لیکن پوری احتیاط کے ساتھ رپڑا تار رہی
تھی۔ مبادا وہ کسی سے چھین جائے۔ شاید اسے وہ رہینگہ پیر بھی عزیز تھا۔ ربیعہ سوچ کر مسکرا دی۔
پیکٹ کے اندر ایک عام سا کاٹن کا بھری پیس سوٹ تھا جس کے مدھم مدھم رنگ ربیعہ کو تھیک طرح سے
پہننے آئے۔

”اگر سارا رشتہ نہ محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرا۔“ وہ کھار ربیعہ تم نے! اسے کس طرح میری
پند کا خیال رہتا ہے۔“
”بس!“ ربیعہ مسکرا کر ان کا ہاتھ کھینک کر سلی۔

”ابا! اب بھی نہ جانے گا۔“
”ابا! اب بھی نہ جانے گا۔“

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ترانہ کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی جس پر بکھرے ہوئے رنگ سوٹ سے زیادہ واضح
اور خوبصورت تھے اور چالیس واٹ کے بلب کی ملگجی روشنی میں بھی بے حد صاف نظر آتے تھے۔ ترانہ کا پورا
ہیماں سوٹ کی جانب تھا۔ وہ بار بار اسے کھولتی، اچھی طرح سے دیکھتی۔ کبھی قمیص کا پرنٹ دیکھنے لگتی تو کبھی
”سے کا۔“

”گفتا پیارا سوٹ ہے ناربیجہ!“ اس نے ایک مرتبہ پھر بے حد اشتیاق لیے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔
”بال بابا! کیسے کہوں، پیارا ہے، اچھا ہے، خوبصورت ہے۔“ ربیعہ ہنسنے لگی تھی۔
ترانہ نے خفت سے اس کی جانب دیکھا۔

”خداق اڑا رہی ہو؟ اڑا لو۔“ پھر اچانک ہی وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔
”اسے ربیعہ! ایک بات بتاؤ۔ کسی لڑکے نے کبھی تمہیں گفت دیا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کسی نے محبت کا اظہار کیا؟“ وہ بر شوق انداز میں پوچھ رہی تھی۔

ربیعہ کی نگاہوں کے سامنے سے یکے بعد دیگرے کتنے ہی مناظر گزر گئے۔ اس نے تفر سے سر کو جھٹکا۔

”پتا ہے ترانہ! مجھے بیزاری ہے اس لفظ محبت سے۔ کراہیت آتی ہے جب کوئی مرد نگاہوں میں ہوس ناکی بھر کر عورت کو دیکھتا ہے۔ اور اس سے آخری فیصلے بولنا شروع کرتا ہے۔“

”ارے بدھو!“ ترانہ خفا ہو گئی تھی۔ ”کیا بکواس کیے جا رہی ہو؟ میں محبت کی بات کر رہی ہوں ربیعہ! ہوس کی نہیں۔ تم محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”ہر کسی کی زندگی میں ایسا کوئی جذبہ ہونا بہت ضروری ہے کیا؟“

”تو اور کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”یہ تو توانائی ہے ربیعہ! توانائی جس کے سہارے انسان اپنی عمر تمام کرتا ہے۔ توانائی کے بارے میں جانتی ہو؟ یہ ششکلیں بدل لیتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی، مرتی نہیں۔ ایک رشتے سے دوسرے رشتے تک سفر کرتی ہے۔ اپنے رنگ بدل لیتی ہے لیکن ہر انسان کے اندر اس کا منبع ضرور ہوتا ہے اس منبع کے:

زندگی نامکمل ناممکن کہ تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی؟“

”کی ہے۔ بہت زیادہ کی ہے۔ اپنی دادی جان سے۔“ وہ آزرہ ہوئی۔ ”بس! ہے نامنع۔ نکل رہی ہے نا کہیں سے توانائی ایسے ہی ایک دن اس منبع سے ختم ہو جائے گی اور رچا کی کرنیں۔ لیکن پھوٹنے کی ضرور۔ بے وقوف لڑکی! تم محبت کے لہو انسان زندہ کیسے رہے؟“

ربیعہ مسکرا دی۔ ”تمہاری پچھو کیسے جیتی ہیں؟“ وہ ازراہ تشن بولی۔ ”تم تو کہتی ہو! انہیں محبت کے نام سے نفرت ہے تو پھر کس توانائی سے جی رہی ہیں بھلا؟“

ترانہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں اس کی نا سمجھی کے لیے توجہ تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو ربیعہ! پچھو کے اندر محبت نہیں ہے؟ انہوں نے کبھی کسی کو چاہا نہیں ہے؟ انہوں نے تمہارے ابو کو چاہا تھا۔ بے خدو بے حساب لیکن۔“

”لیکن کیا؟“ ربیعہ نے جیسے ایک خواب کے عالم میں پوچھا تھا۔

”لیکن ربیعہ! توانائی کو اگر صحیح طرح استعمال کرنا نہ آتا ہو تو خافضات بھی برباد ہوتی ہیں۔ پچھو نے جو۔۔۔“

لیکن وہ ٹھیک طرح سے اس کا مفہوم نہ جان سکیں۔ انہیں جلتی ہوئی باتوں کی یاد آ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ جلا لیے۔

ربیعہ کو اس کی گفتگو بے مقصد اور طویل معلوم ہونے لگی لیکن ترانہ کسی اور ہی تصور میں کھو گئی تھی سواں نے ربیعہ کی اکٹھا ہٹ محسوس نہ کی۔

”پتا ہے ربیعہ! اگر عبدالباری تمہیں دیکھے اور تم سے متاثر ہو جائے تو میں کیا کروں گی؟“

ربیعہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔

”میں خوشی خوشی تمہیں اس کی دلہن بنا دوں گی۔“

”ترانہ!“

”ایک مثال دے لڑکی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے توانائیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پچھو۔۔۔“

محبت کی جلتی سے اپنا دل جلا لیا۔ اپنا گھر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔ بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے جیسی ہوں گی نا! ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں جج۔

انہیں گھر لے آئے۔ پچھو نے یہ خبر سنی تو انہوں نے کیرے مار دوائی پی لی۔ بہت مشکلوں سے ان کی جان بچائی گئی۔ ابو نے جلد بازی میں پچھو کی شادی اپنے ایک عزیز دوست کے بھائی سے کر دی۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ اس نے پچھو کو خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن۔

اس نے گہری سانس بھری۔

”پچھو نے اپنی محبت کو اپنی جان کا روگ بنا لیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ پچھو نے محبت کی کرنوں کا رنگ نفرت کے دھوئیں سے سیاہ کر دیا۔ بالکل سیاہ۔ پتا ہے ربیعہ! پچھو میں محبت بہت زیادہ ہے۔ بہت زیادہ۔ لیکن سیاہ رنگ کی ہے۔“

”تم مجھ سے باتیں کرتی ہو ترانہ۔“ ربیعہ بولی۔ ”مجھے تمہاری باتیں کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”آئیں گی سمجھ میں! بس منبع سے کرنیں پھوٹنے کی دیر ہے۔“ اس نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔

”مجھے خند آ رہی ہے ترانہ۔“ اس نے جمائی لی۔

”پتا ہے ربیعہ! مجھے آج ساری رات خند نہیں آئے گی۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دل بے حد پیچھا۔ ہو رہا تھا۔ نجانے کیوں۔ اسے خواہ مخواہ ہی غصہ آتا۔ کسی سے بات کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ درجہ بہ درجہ اور ڈل ہو رہی تھی۔

ایسے ہی خفا میں بھر پور کے ساتھ اس نے آپریٹر سے کال ملانے کے لیے کہا۔ اس کا دل عاشق کی آواز سننے کی قدر کر رہا تھا۔

”دو دن کی جانب سے بولی۔ آواز سننے لگی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا تھا۔“

”یہ کون ہے؟“ وہ نے۔ ”نانا۔“ آواز سننے لگی۔

ایقان بے۔۔۔ ”ننانا! کیا ہوا؟“

”ایقان! کیا میں عاشق کے ساتھ کھڑی ہوں؟“ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

”ہاں! میں ان کی ڈال ہوں۔“ وہ اب تک بے یقین تھی۔

ریسیور عاشق نے لے لیا تھا۔ اس نے شاید اس عورت سے سخت لہجے میں کوئی بات کی تھی۔ ایقان کو ٹھیک طرح سے سنائی نہ دیا۔

”ایقان! اب عاشق لائن پر تھا۔“

”ننانا! اس کا جی بھر آیا۔“ میں ایقان ہوں۔“

”ہاں جانوس۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ کیسی ہو؟“

”کون ہے تمہارے پاس؟“ وہ مزید کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔

”ننکے کیسے ہیں؟ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ اس نے سنی ان سنی کی۔

”ننکے نے پوچھا وہ کون ہے۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

رکتے ہیں۔ دوکانیں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چچا کو دکانوں کا کرایہ لانے کی ذمہ داری سونپ کر دے قدرے فکر معاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سیکھنے بھی پڑا دن ہونے کا حق بھر پور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں ریجہ کو تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا ہسٹوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ریجہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائیں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایٹمس یا اس کی بیوی بیویوں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شمسلا اپنی ماں منیہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شمسلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھروں کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شمسلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔ ریجہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے تنگ آ کر اپنی پیچھونکے علاقہ پر جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ ریجہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ریجہ تنہا ہو کر رہی ہے اس کی پیچھونکے گھر تک رہنمائی در ذمہ داری لے لیتا ہے۔

عاشق (ایقان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلتا تو لیزا گاڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

۱۳ تیسویں قسط

”کیا ہو گیا ہے ایقان تمہیں؟“ وہ جیسے اسے چمکارتے ہوئے تھا۔ ”میری لینڈ لیڈی ہیں۔ اکثر آتی ہیں۔ والٹس پر اہل یار؟“ ایقان خاموش ہو کر گھرے گھرے سانس بھرنے لگی۔ کیا بتائی اسے کہ چند گھنٹوں میں ہی لیٹا تو ایقان کا کیا کچھ بیت چکا تھا۔ اس کی قربت میں کسی دوسری عورت کے وجود کا احساس کیا اسے؟ اس نے غصے سے گھر کی بیلی کی طرف اشارہ کیا۔ بل بھر میں نظروں کے سامنے سے کتنے ہی منظر گزر گئے تھے۔

اس کا باتیں کرنا اس کا مسکراتا اس کا وہ گہری نگاہوں سے دیکھنا کہ وہ سمٹ کر رہ جاتی۔ زیر لب وہ شریر مسکراہٹیں جن کی پھوڑا اس کا تن من بھگو دیتی۔ وہ سب کچھ ایک دوسری عورت کے قریب تھا۔ ایقان تصور سے ہی مجلس کر رہ گئی تھی۔

”ایقان! جانو۔ بولونا کچھ؟“ وہ پریشان ہوا تھا۔

”عاشق! اس کی آواز بھیگ گئی۔“ میرا دل بہت ادا ہو رہا تھا۔ میرا جی رونے کو چاہ رہا ہے۔ مجھے ہر وقت رونا آتا ہے۔“

وہ سچ رونے لگی تھی۔ عاشق کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں اداں تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بوکھلا سا گیا۔

”ایقان! ایک اسٹ ایزی یا رکھاں ہو تم؟“

”میں اماں جان کی طرف ہوں۔“ اس نے سسکی بھری۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر نے ریسٹ کے لیے کہا تھا اسی لیے یہاں آئی۔“ اس نے بھیگی بھیگی آواز میں بتایا۔

”بچے؟ بچے کیسے ہیں؟ ایمان کیسی ہے؟ اور موس؟“

”سب ٹھیک ہیں۔ خیریت سے ہیں۔“

”اور! اس نے گہری سانس بھری۔“ پھر میری جان! رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا ہے گڈے؟“

ایقان یکدم چپ ہوئی تھی۔ برسوں بعد اس نے اس انداز سے پکارا تھا۔ ایقان کے لبوں پہ تل بھر میں مسکراہٹ کی جوت جل اٹھی۔ وہ بہت محبت سے برس جانے کے موڈ میں اسے یونہی پکارا کرتا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی یادگار تھا یہ لقب۔

”اوس گڈے! ادھر آؤ۔“ ایقان غصے میں بھی ہوتی تو نفیس پڑتی۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔

”تو ہے یار!“ وہ ریلیکس ہوا۔ ”تم نے تو جان ہی نکال دی تھی۔ بھلا اتنی دور سے اس انداز میں پریشان کرو گی تو؟“

”کیا ہو گا۔ پہلی فرصت میں ٹکٹ کٹا کر دوڑا بھاگا چلا آؤں گا۔ نوکری جائے بھاڑ میں۔“

”تو تو ٹھیک ہے پھر۔“ وہ شانت ہو گئی۔ ”میں روز یونہی پریشان کروں گی تمہیں۔“

”بھندے کا تصور؟“

”تم بندے ہو؟ ایسے ہوتے ہیں بندے؟ اتنے سالوں سے میرے حوصلوں کو یوں آزار ہے ہو جیسے میری فوجی ٹینک جو چلتی ہے۔“

”اس بندے کا قصور بتاؤ؟ دن سے کھینچ کر رات کرتی ہوں اور رات کو کھینچ کر دن۔ کب ختم ہو گا؟“

”ملک میں تو زنگ نہیں ہے کیا؟ لوگ ریتے نہیں ہیں؟ کھاتے نہیں ہیں؟ جا کر بیٹھ گئے ہوا اتنی دن۔“

”جگہ کر کے رکھنی ہے تو۔“ وہ پھر پڑی سے اترنے لگی تھی۔

”یار! میرے گھر آیا ہوں تمہاری خبر گیری کے لیے۔ یاں تمہارے پاس بھائی تمہارے پاس“

میرے بچے تمہارے ہیں۔“ وہ تنہائی سے ز میں گزرتا ہوں یا تم؟“

”تمہاری خونہ اختہ ہے۔“ نہیں شکایت کا اعتبار نہیں۔ اور۔ اور۔ جو نام گنوار ہے ہو ان میں سے کسی ایک کی۔“

”کیا تمہاری سگھیرا میرے لیے؟“ تم تم ہو۔ میرے دن رات تم سے بندھے ہوئے ہیں۔ ایک تمہارا ہاتھ تمام کر میں ان تمام رشتوں سے منہ موڑ کر خوشی خوشی چل پڑی تھی اور تم کہتے ہو کہ سب لوگ ہیں تو سہی میرے پاس۔“

”آبا! اس نے چٹا رہ بھرا۔“ لطف آگیا یا! ایسی پیاری پیاری باتیں اور بل بھی اپنا نہ بنے، ماسوجی کا بنے۔“

”میرے کی بات ہے نا۔“

”عاشق! میری جان پر نی ہے تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“

”کیوں پریشان ہوتی ہو جانو! تھوڑا سا انتظار، تھوڑا سا صبر پھر سارا وقت ہمارا ہو گا سب خوشیاں ہماری ہوں گی۔ پریشان نہ ہو کرو۔ تمہارے لیے اور بچوں کے لیے ہی کر رہا ہوں مناسب کچھ۔ میرے حصے میں یہ گلے شکوے تو مت ڈالو ایقان!“

اس کی آواز میں تھکن در آئی تھی۔ ایقان خاموش ہو گئی۔

”سوری عاشق! پھر وہ بولی۔“ میں نے یونہی تمہیں پریشان کیا۔“

”میں سچ سچ پریشان ہو گیا تھا۔ آئندہ اس طرح روٹے ہوئے فون مت کرنا ایقان۔“

”پلیز!“

”پلیز!“

”پلیز!“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اب فون بند کرتی ہوں۔“
 ”بس ایسے ہی؟“ وہ مسکرایا۔
 ”آئی لو یو۔“ وہ جھینپ کر بولی۔
 ”لو یو ٹویار۔“

ایقان نے ریسور رکھ دیا۔

دوسری جانب وہ گہری سوچ میں تھا۔ کارڈلیس کا اینٹیٹنا دانتوں میں دبائے وہ نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ لڑا اس کے قریب چلی آئی۔

”میں سوچ رہی تھی کاش میں اردو سمجھ سکتی۔“ وہ شرارت سے بولی۔
 عاشق نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی بات کے مفہوم پر چند لمحے غور کرنے کے بعد وہ مسکرا دیا تھا۔

پھر وہی دھند تھی وہی سراب کی کیفیت۔
 ربیعہ ننگے پاؤں گرم ریت پر دوڑ رہی تھی۔ آگے پانی تھا۔ شفاف پانی۔ ربیعہ دوڑتی جاتی تھی آگے سر قلابا جاتا۔
 چھٹاڑیوں کے سر جھکے ہوئے تھے ٹیلوں میں دائرے دو دائرے تھے اور اس میں کسی جسم کی بھری سانس کی گونج تھی۔

”پانی۔ پانی۔ پانی۔“

ربیعہ دوڑتے دوڑتے تھک گئی تھی۔ اس کے گھٹنوں میں ہلکتی نہ رہی تھی وہ گرنا چاہتی تھی تھک کر ڈھیر ہو جانا چاہتی تھی۔

”تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی ربیعہ؟“ ترانہ نے نہیں کرنا چاہا۔
 سوال اس کے چاروں طرف چکرانے لگا تھا۔ لفظ نہیں رہے تھے۔
 ”محبت نہیں کی؟ نہیں کی؟ کسی سے نہیں کی؟“

”کی ہے۔ بہت کی ہے۔“ ربیعہ نے دوڑنا جاری رکھا۔ ”میں پانی لاتی ہوں دادی جان! میں لاتی ہوں میں ابھی لاتی ہوں۔“

PIOTO

”پانی۔ پانی۔ پانی۔“ حسرت بھری آواز۔

ربیعہ نے ایک جھٹکا کھایا اور ساکت ہو گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ چھت کو گھورتی رہی۔ پٹیکے کی گھر گھر کو بہت دیر تک سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے برابر والی چارپائی پر ترانہ بے خبر سو رہی تھی۔ سرہانے مینا کا پلنگ تھا۔ مینا کے پلنگ کے برلی طرف پڑے صوفے پر صولت تھی۔ ربیعہ کچھ دیر بیٹھی بے بسی سے سب کو پرسکون نیند کے مزے لوٹا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر پکد مود چوکی۔ اسے آوازیں آرہی تھیں۔ گھٹی گھٹی آوازیں جن سے مفہوم واضح نہ ہوتا تھا۔ وہ آوازیں کس کی تھیں کون گھٹنگو کر رہا تھا اسے اندازہ نہ ہوا۔ پھر اسے پھپھا کا خیال آیا۔ کہیں وہ پکار تو نہیں رہے؟ انہیں کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔

یہ خیال آتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ سنبھال کر وہ ترانہ کی چارپائی کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔ تیز مگر محتاط قدموں سے وہ کمرے کے دروازے تک پہنچی مگر پھر اندر سے آئی ہوئی آواز پہچان کر وہ یکایک اوٹ میں ہو گئی۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ خدی لہجے میں بولتا یہ تمدن تھا۔ ”آپ کو رقم دینا پڑے گی۔“

”ار کے بیٹے۔ گردھے کی اولاد۔ کھوں کھوں کھوں۔ ناخلف۔ مردار۔ کھوں کھوں کھوں۔ تو سمجھتا کیوں نہیں؟ تیرے دماغ میں اس بالٹی سے زیادہ گند بھرا ہوا ہے۔ کینہ ہے تو۔“ منور امین غصے کی شدت سے گھٹے جا رہے تھے۔

”ہاں ہاں کینہ ہوں۔ ہوں میں کینہ۔ میری زندگی تم نے تباہ کی ہے تم نے۔“ وہ نفرت سے پھنکارا۔
 ”لیکن ایک بات یاد رکھنا جو بھی ہوں تمہارا بیٹا ہوں۔ میں رقم نکلا کر رہوں گا۔“
 ”تو میری قبر کھودنا۔ میری قبر کھودنا آکر۔ اس میں سے نکلے گی رقم۔ سمجھتا تو۔“
 ”کھودوں گا۔ قبر بھی کھودوں گا لیکن پھوڑوں گا نہیں۔“

ربیعہ کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپے جا رہا تھا۔ ہاتھ تھر تھرا رہے تھے اور سانس دھونکنی بنا ہوا تھا۔

وہ بڑی مشکلوں سے اپنی چارپائی تک پہنچی تھی۔ رات کے تین بجے ہونے والی اس گفتگو کے پس منظر سے وہ ناواقف تھی لیکن فریقین کے تیور اور انداز اسے ہراساں کر گئے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تمدن اسے شروع دن سے براہِ معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی بدروح کی مانند لگتا تھا جو انسانی جسم میں حلول کر گئی ہو۔ اس وقت بھی اپنے باپ کا طرزِ مخاطب نہایت جارحانہ تھا۔ ربیعہ بستر پر کھیس اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس میں ٹھنڈی سرائیت کر رہی تھی۔ وہ اپنا خواب بھول بھال کر اب اس واقعے پر غور کرنے لگی تھی۔

پچھلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ بار بار پانی مانگ رہے تھے۔
 ربیعہ آنکھوں سے پانی پانی کر ریز ہو گئی تھی۔ اسی حساب سے اسے بار بار وہ گندی بالٹی ٹواٹٹ میں لے جا کر خالی کر دیتی تھی۔ وہ پانی سے پھٹنا چاہتی تھی کہ آخر انہیں کس کی بددعا ہے؟ یہ پیاس کس گناہ کا خمیازہ ہے لیکن ایسا سوچنا خدائے خالی سے روکنے سے ماتھے پر بل پڑ سکتے تھے اور ماتھے کے بل انہیں فوراً دکھائی دے جاتے تھے۔

”میں تمہیں خاموش رہنے کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ہاں۔ کچھ نہیں۔ تمہیں اپنی بوڑھی دادی یاد آ رہی ہے شاید۔ کیوں؟“

ربیعہ نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

”یا اپنی بنگوڑی ماں۔ بابا۔ ہیں؟ کیوں؟“

ربیعہ نے چونک کر ان کی صورت دیکھی جس پر طنز کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بے یقینی سے کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ انہوں نے کیا کہا ہے۔

”کیا۔ کیا کہا آپ نے؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ”میری امی کے متعلق؟“

”امی؟ بابا۔ امی۔ بہت گودوں میں کھیلی ہونا تم اس کی۔ امی جان کو اس کو۔“

ربیعہ کی آنکھیں اچانک ہی پانیوں سے لہلہا بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے وہ پتھر میں چلی آئی اور سنگ میں جھک گئی۔ اس کے اندر درد کی ٹہمیں اٹھنے لگیں۔ اس نے غل کھول دیا تھا۔ پانی اسکیل کے سنگ میں گر کر شور مچانے لگا۔ ربیعہ کے اندر آنسو شور مچا رہے تھے۔ سسکیاں چل رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر سنک کے پاس کھڑی رہی۔ سیاہر صحن میں مینا کے چلنے پھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کسی کام سے پڑوس میں گئی تھیں اور اب واپس آچکی تھیں۔
ربیعہ نے بے وجہ ہی چولہا جلایا۔
”کیا کر رہی ہو؟“ انہوں نے اندر جھانکا۔

”چائے بنا رہی ہوں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
”اچھا۔ ایک کپ سے زیادہ نہ بنے، پتی بہت مہنگی ہے۔ بار بار چائے کا شوق کوئی اچھی لت نہیں۔“ وہ چیل گھسیٹتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

”پھپھو کے اندر سیاہ رنگ کی محبت ہے۔“ اسے ترانہ کے الفاظ یاد آئے تھے۔
ایک زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔ اب وہ ترانہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ یہ کہ ترانہ کے باپ کے اندر کس رنگ کی نفرت ہے؟ ربیعہ کے ذہن میں گہرا سبز رنگ آیا تھا۔



اسے غم زندگی، کچھ تو دے مشورہ
میں کہاں جاؤں ہوتا نہیں فیصلہ۔
اک طرف اس کا گھر، اک طرف مکان۔
مغنی کی آواز، ساز کی جھنکار کے ساتھ گونج رہی تھی۔ عیشیہ کچھ دیر سنتی رہی۔
”یہ ہر وقت غم نہیں کیوں سننے رہتے ہو؟ اس روں۔“ وہ چیل گھسیٹتے ہوئے باہر چلی گئی۔
”تمہیں پسند نہیں؟ مجھے تو بہت پسند ہیں۔ مجھے یہ آج کل کے بے سُرے پاپ سگرز ایک آنکھ نہیں بھاتے،
اس پر عجیب قسم کی تنگ بندی۔ کم از کم اسے شاعری تو پسند نہیں، کہا جاتا ہے۔ شاعروں کی ارواح دوبارہ اجتماعی خود
کشی کر لیں اگر یا اپنے شکر کو سن لیں تو۔“
عیشیہ کو اس کی بات پر بے حد ہنسی آئی تھی۔
”ارواح اور اجتماعی خود کشی؟“
”یار! ارواح کے احتجاج کو کوئی بے وقوفی طریقہ تو دے گا ہی۔“
”مجھے تو سب سگرز پسند ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”جو بھی نئی کیسٹ آئے میں شوق سے خریدتی ہوں۔“
”ارے۔۔۔ بے حد ذوق ہو۔“

URDU

”تب ہی تو تم سے باتیں کرنے لگی ہوں۔“ وہ برجستہ بولی۔

”صرف باتوں سے کام نہیں چلے گا جناب۔ بد ذوقی کا پورا پورا ثبوت دینا پڑے گا۔“ وہ مزے سے بولا۔
”یعنی؟“

”یعنی شادی بھی کرنا پڑے گی مجھ سے۔“

عیشیہ بے ساختہ شرمائی۔ ”یہ تم یکا یک ٹریک کیوں بدل لیتے ہو؟ شادی وادوی کی باتیں مت کیا کرو۔“
”کیوں؟ شادی بھی نہ کروں تم سے؟“

”فراز پلینس۔“

”میں سیریس ہوں عیشیہ! لو ان فریٹ سائٹ کا شکار ہوا ہوں۔ تم مجھے اسی دن بہت اچھی لگی تھیں۔ تمہارا

انداز بالکل مختلف ہے۔“

”اس دن تو ہم تین تھیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔ ”تم نے کیسے جان لیا کہ میں وہی ہوں؟“

”تمہاری آواز سے۔ غلطی کی گنجائش ہی نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اور پھر اتنے دنوں سے ہم باتیں کر رہے ہیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔“

عریضہ پھر ہنس دی تھی۔ اچانک ہی وہ چونکی۔ بیٹھے کے دروازے سے باہر کھڑی شفیقہ حیات اور عذرا بیگم دکھائی دے رہی تھیں۔

”اچھا سنو، کل بات کریں گے۔“ اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم دارانی جان۔ چچی جان۔“ اس نے جیتے ہوئے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“ دونوں اسے دیکھ کر کھیل سی گئیں۔

”مال کیا کر رہی ہیں تمہاری؟“

وہ صوفوں تک آ گئیں۔

”ای شاید اوپر ہیں میں بلاتی ہوں۔“ وہ مڑنے لگی۔

”اچھا سنو۔ رگوزرا۔“ شفیقہ حیات نے اسے پکارا۔

”یہ انگوٹھی پہن کر دیکھو، یہی ناپ ہے تمہارا؟“

”انگوٹھی؟“ اس نے دیکھی سے ان کے ہاتھ میں ہلی مٹھلیں ڈبیا کو دیکھا۔

”ہاں۔ اور ذرا ڈیزائن بھی دیکھ لو۔ ہے تو پرانا مگر بے حد خوبصورت ہے۔“

”واؤ۔ کس قدر خوبصورت اور یونیک قسم کا ڈیزائن ہے۔ اینٹیک لگتا ہے۔ کس کی انگوٹھی ہے یہ چچی جان؟“

”میری متلنی کی ہے۔“ شفیقہ حیات ہنس دیں۔ ”برسوں سے سینت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے ایسے ہی کسی موقع کے لیے۔ اب میری پوتی پہنے گی۔“

”کون سی پوتی داوی جان۔“ وہ شوخی سے ہنسی۔ ”میں بھی تو پوتی ہوں آپ کی یہ نظر کرم مجھ پر کیوں نہیں؟“

”اے ہاں تو کیا تمہارے فرشتوں کی بات ہے۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”تمہاری متلنی کا سامان ہی کرتے ہیں۔ عذرا تو نئی انگوٹھی کا کہہ رہی تھیں مگر میں نے کہا۔ اتنی اچھی اور قیمتی چیز گھر میں موجود ہے تو الگ سے کیا پیسہ خرچ کرنا۔ وہی کسی اور مصرف میں آئے گا۔“

عریضہ گم صم سی ہو کر سن رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

”ہم نے سوچا تمہاری رائے بھی معلوم کر لی جائے۔ آخر بچوں کے بھی سوشل ہوتے ہیں، لیکن تمہیں تو ہم سے زیادہ پسند آگئی۔“ وہ ہنسی۔ ”اب تم اپنے جوڑے اور جوتی کا ناپ دو ہمیں۔“ ثانیہ سیدہ دوڑی آتی تھیں کہ ہم لاسٹے ہیں اپنی بھابھی کا ناپ۔ انہیں ڈانٹ کر بٹھایا کہ روٹی ہانڈی کرو گھر میں۔ ہمیں سو قسم کی باتیں اور بھی پتا کرنا ہیں۔“

انہوں نے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”آخر مہیا تمہاری کس کو نے میں تمہیں ہے؟“ تب ہی فردوس بیگم اسٹور سے برآمد ہوئی تھیں۔ عریضہ اپنا بے

جان وجود کھینچتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے کان میں سا میں سا میں کر رہے تھے۔ کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔

بے دم سی ہو کر وہ بستر پر گر گئی۔ اس کے کانوں میں کسی کی شوخ ہنسی گونج رہی تھی۔ بے اختیار ہلکوں پر ایک قطرہ آن نکلا تھا۔

کبھی میں سوچتا ہوں اک سہانی صبح ایسی ہو کہ جب میں خند سے جاؤں

تو بیل بھر کو

مری آنکھوں کے آگے نور کی دیوار بن جائے

قدم رکھوں زمیں پر تو کوئی مجھ کو بلا تا ہو

مری ہستی کے چاروں اور اک گلزار بن جائے

بدھ جھنکار کے جگنو مرے دامن سے لپٹے ہوں

کسی کی مسکراہٹ ہی مری رفتار بن جائے

صبح کے نور سے روشن نگاہیں مجھ سے گھبراہٹیں

نظران سے ملے تو دفعتاً ”شیرما“ کے جھک جائیں

گدھا برے تو میں لہراتے آپل میں سمٹ جاؤں

میں اس کے مر مر میں پیکر کی خوشبو سے لپٹ جاؤں

میں انقبیوں میں دبائے وہ تادیر صغے پر ابھری ہوئی تحریر کو دیکھتا رہا۔

سب کے سب کے قلم سے سرزد ہوا تھا اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا

ہو گیا۔ موسم نہایت دلغریب تھا۔ آسمان سیاہ گھاؤں سے ڈھک گیا تھا اور ہوا مستی بھری خنکی سے لبریز تھی۔

اس کی کھڑکی سے کاسنی پھولوں والی بیل کمرے میں گھسنا چاہتی تھی۔ بیل کی حرکت سے کبھی کبھی پانی کا ایک آدھ

قطرہ پڑتا تھا جس سے پتوں سے لگتا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ کیوں لکھا۔

”یار درخت! تو محبت نہیں کرتا۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا جملہ گونجا۔

”بندر کیا جانے اور یہ ہمارا۔“

یہ ہنس نکالتا تھا۔ قلم کے اس چٹنے نے ایک عجیب سی بے کلی کو جنم دیا تھا۔ اس کے اندر اس کے پردہ

خیال پر ساروں سے بھر پور تھا۔ آج موسم کی دلغری نے وہ آپل اس کے پورے وجود پر ڈھک دیا۔ وہ

بے خود سا ہو گیا۔ سادے کاغذ پر اس کی سیاہی نقش ہو کر رہتی چلی گئی۔ اور اب وہ بار بار اس تحریر کو پڑھتا تھا اور

اس سے اس کے نو دیکھا دونوں ہاتھوں میں نھاما اور پٹھا ڈالنا چاہا۔ ان خرافات کا وہ قائل نہ تھا۔ باہر بارش کی

چھماچھم میں تیزی آگئی تھی۔ کاسنی پھولوں والی بیل نے بہت سا پانی پھوار کی صورت میں اندر بھیج دیا۔ رافع نے

جلدی سے وہ صفحہ فائل میں رکھ دیا اور پھر کھڑکی بند کر کے لگا۔ آسمان پر سیاہیاں گہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ہواؤں کا

شور بڑھنے لگا تھا۔ رافع کھڑکی بند نہ کر سکا۔ پانی اسے بھگور رہا تھا۔ اس کی قمیص کے کھلے ہوئے بٹن سے بہت سا پانی

اس کے سینے کو بھگو گیا۔ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال بھیگ گئے۔ وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جما کر کھڑا

ہو گیا۔ اس نے اچھی طرح بھیگ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رودرو کر اس کی حالت غیر ہو چلی تھی۔ آنکھیں سوج کر آتھیں ”بند ہی ہو گئی تھیں۔ وہ بمشکل بھاری پوٹوں کو اٹھاتی تھی۔ فردوس بیگم بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ ان سے اور کچھ نہ بن پڑا تو ماہین کو بلوا بھیجا۔ وہ بھی خبر سن کر

دوڑی بھاگی آئی اور اب ماں پر برہم ہو رہی تھی۔

”آپ نے بھی سترتھویں صدی کی ماؤں کو مات کر دیا ای جی! کم از کم اس غریب کے کان میں بات تو ڈال دی

ماہین سانس بھر کر رہی تھی۔

”میں بہت دن سے دیکھ رہی ہوں تمہارے من کا موسم اب راتوں ہے۔“ ترانہ نے اسے چھیڑا تھا۔ ”بات کیا ہے؟“ ربیعہ نے نظر بھر کر اسے دیکھا مگر خاموش رہی۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں یہاں آتے ہوئے۔“ وہ پھر اصرار دیکھنے لگی۔ ”تمہارا وہ منہ بولا بھائی بھی پھر دکھائی نہ دیا۔“

ربیعہ نے بھی اداسی سے گردن جھٹکادی۔ ترانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کچھ دن سے وہ لوگ تقریباً روزانہ ہی وہاں آتی تھیں لیکن عباد اس دن کے بعد پھر دکھائی نہ دیا تھا۔

”منہ بولی بہنوں سے بہت جلدی دل بھر جاتا ہے ان لڑکوں کا۔“ ترانہ شرارت سے بولی۔ ”تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ویسے کچھ بتاؤ کیا اس کی وجہ سے اداس ہو؟“

”نہیں ترانہ۔“ زندگی کا کوئی مقصد بھائی نہیں دیتا۔ تم پلیز میرا ایڈیشن کروادو کسی پرائیویٹ ادارے میں۔“

”نہیں ترانہ۔“ پچھو پچھو نہیں پڑھنے نہ دیں گی۔ وہ تم سے نوکری کروانا چاہتی ہیں۔ کچھ دنوں سے وہ روز مجھے آفس جانے سے قبل یاد دہانی کرواتی ہیں کہ میں تمہارے لیے بھی اچھی سی نوکری ڈھونڈوں۔“ ربیعہ خاموش ہو گئی۔

”شاید ٹھیک ہی جاتی ہیں۔“ میں تم لوگوں پر ان چابا بوجھ ہوں۔“

”یہ نہ۔“ پچھو پچھو بہت مطمئن ہیں تمہارے آجانے سے۔ بھلا ان کا کیا نقصان ہے اس میں۔ دن بھر میں وہ کھاتی پکھاتی رہیں۔ عباد ان کا کام میں لگی رہتی ہو۔ ابو کی ساری ذمہ داری تم نے سنبھال لی ہے جو ہمارے گھر کا سب سے بڑا کام ہے۔ کوئی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔“

”اب وہ کس کام کی ہے؟“

”کرتی تھیں۔ اب وہ کس کام کی ہے؟“

”کرتی تھیں۔ اب وہ کس کام کی ہے؟“

”کرتی تھیں۔ اب وہ کس کام کی ہے؟“

ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔ ترانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بیٹا سے ایسی خود غرض سوچ کے سوا کچھ امید نہ تھی۔

”سنو ترانہ۔“ وہ بولی۔ ”میں ہر ماہ انہیں کچھ رقم دے دوں گی۔ لیکن میں باہر نوکری کے لیے نہیں پڑھنے کے لیے جایا کروں گی۔“

”کیا مطلب؟“ ترانہ نے اسے گھورا۔ ”پھر نوٹ کیا کسی جادوئی درخت سے توڑ کر لایا کرو گی یا پھر تمہیں پڑھائی کے عوض وظیفہ ملا کرے گا؟“

”میرے پاس کچھ رقم ہے۔“ دادی کی وفات کے بعد ان کے بینک اکاؤنٹ سے مجھے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ یہاں آنے سے قبل میں وہ پیسے نکالوا لائی تھی۔ تقریباً پچاس ہزار روپے ہیں۔“ ترانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”تم نے؟“ تم نے وہ پیسے کہاں رکھے ہیں؟ ربیعہ! انہیں حفاظت سے رکھنا ورنہ تم ان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“

ربیعہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”لیکن ترانہ میرے پاس زیور بھی ہے، میری امی کا زیور سوہ بھی اچھی خاصی مالیت کا ہو گا۔ میں نے سب چیزیں

ہوتی۔ اسے خبر تو ہوتی کچھ۔ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ان باتوں کو بہت قیل کرتی ہیں۔“

”اے ہاں، قیل ہی مچایا ہوا ہے تب سے۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”جا کر کہہ دیں باوا کو جنہوں نے رشتہ پکا کیا ہے خوشی خوشی یا پھر دادی کی گردن پکڑیں جو ایسا خیال جی میں لائیں۔ ہم بے قصوروں کو کس بات کی سزا دے رہی ہے۔“

عریشہ پتنگ پردوں میں تانتیں سیٹے بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ٹشو کا ڈبہ رکھا ہوا تھا جس میں سے ٹشو نکال نکال کر وہ وقتاً فوقتاً آنکھیں اور ناک صاف کر رہی تھی۔ ماں کی بات سن کر اس نے شکایت بھری نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

”وہ بھی تانت سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔“

”بس کہہ دیا ہے میں نے۔“ وہ ضد سے بولی۔ ”مجھے نہیں کرنی ہے متکلی و تکلی۔ بے شک ساری زندگی میری شادی نہ کریں لیکن نافع سے شادی نہیں کروں گی میں۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں اسے ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتی۔“

”اچھا تو بتاؤ ہمیں، کسے دیکھتی ہو ان نظروں سے تم؟ ہم اسی سے نکاح پڑھاؤ اس تمہارا؟“

”خفگی سے گویا ہو میں۔“ باوا کو بڑا مان ہے بیٹی پر اور ہم بھی دھڑلے سے کہہ چکے کہ ہماری بیٹیاں ماں باپ کے فیصلوں کے آگے سر نہیں اٹھاتیں۔ اب ہم بھی شرمساری سے سر ہٹائیں گے جب وہ مجھے طنز بھری نظروں سے ہمیں چھیدیں گے تو۔ غضب ہو گیا غضب۔ قرب قیامت۔ بیٹا سے تو بغاوت ہے جتنا کہرا رہا ہے بیٹی اس سے دو ہاتھ آگے۔ ماہین! میں کہہ دیتی ہوں مجھے زہر لادو میں چھٹکارا پاؤں ان سب جھمبیاؤں سے۔ اسی لیے انہیں پال پوس کر اس قابل کیا کہ یہ ہمیں زہر کھانے پر مجبور کریں۔ ارے لڑکی! میں کہتی ہوں آخر کیا خرابی ہے نافع میں؟ خوبصورت ہے، جوان ہے، ذہین، بالادب، بچہ ہے۔ اور تمہاری نظروں میں نہیں ساربا۔ تم خود کو کون سے پرستان کی پری جانتی ہو۔ اور مجھے بتاؤ کہاں ٹانگا جوڑے بیٹھی ہو؟ صاف صاف کہو۔“



”امی۔“ ماہین نے تنہی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

عریشہ دھواں دھار روئے ملی تھی۔

”اے ہاں۔ تو کیا سمجھوں؟ تم ہی کہو؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں چلتی ہوں، تم پوچھ کر بتاؤ ہمیں کیا مسئلہ ہے۔ اور اسے اپنے سسرال کے قصبے بھی سناؤ دو چار ذرا آنکھیں کھلیں لی لی کی۔ بہت افسانوں کی دنیا میں گم ہیں۔“



وہ اپنا وجود سنبھالتی، بکتی بھکتی باہر نکل گئیں۔

ماہین اپنی جگہ سے اٹھ کر عریشہ کے پاس چلی آئی تو وہ اس سے پٹ کر روئے لگی۔

”ایسا! بس مجھے نہیں کرنا متکلی۔ آپ کہہ دیں بابا سے۔“

”اچھا کہہ دیتی ہوں تم جی برا مت کرو۔“ اس نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔ ”لیکن پتا بھی تو چلے آخربات کیا ہے۔“

عریشہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ ابھی کسی سے کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ ابھی تو وہ خلا میں کھڑی تھی محض اپنی خوش گمانیوں کے پروں کے سہارے اور خوش گمانیوں کے بر تو موم سے بنے ہوتے ہیں۔ حقیقت کی ذرا سی پٹش ان میں جا بجا سوراخ کر ڈالتی ہے۔ خواہشوں کا موم پگھل پگھل کر دل پر گر رہا ہے۔ اور آبلے ڈال رہا ہے۔

”بولو عریشہ! ماہین نے اسے کریدا۔“

”بس ایسا۔ مجھے نافع اس لحاظ سے پسند نہیں ہے۔“ وہ مسنائی۔ ”وہ میرا آئینہ بدل نہیں۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤں گی۔“

اپنے سوٹ کیس میں رکھی ہوئی ہیں۔
”سوٹ کیس کولاک رکھتی ہو؟“ ترانہ بے کل ہو گئی تھی۔

”ہاں۔ بالکل خالی میرے نمفے میں ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھو ریجہ! میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتی لیکن ہمارا گھر اس معاملے میں کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ پیسے تو یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے انہیں راتوں رات پر لگ گئے ہوں اور خفیہ چور کا بھی علم نہیں ہو پاتا۔ تم اپنا سب سامان حفاظت سے رکھو۔ میں جلد از جلد تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلا دیتی ہوں تمہیں اپنی رقم بینک میں رکھنی چاہیے۔“

”ہوں۔“ ریجہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلایا۔

”اوس۔ اوس۔ پچھو کو اپنی رقم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ قدرے شرمساری سے بولی۔ ”جو کچھ تم ہمارے لیے کرتی ہو۔ وہی بہت ہے۔ مجھے پچھو سے لڑنا بھی پڑ جائے تو میں تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گی۔ تم بے فکر رہو۔“

”منیڈم۔ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔“

وہ ایک مریض کی کیس ہسٹری بغور دیکھ رہی تھی جب ہیرو نے قیامتیاں شہلا کی ہسٹری اسٹاف کو تھمائی اور نگاہوں میں الجھن لیے باہر کی سمت چل پڑی۔

ہاسپٹل کے لمبے کوریڈور میں چلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس سے ملنے کی ضرورت کس کو پیش آئی اور وہ بھی ہاسپٹل میں۔

اپنے کمرے کے دروازے پر وہ رک گئی تھی۔ آنے والا دروازے کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ شہلا دروازے پر ہی کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہی۔ اس کی پنسل ہیل کی ٹک ٹک پورے کوریڈور میں گونجی تھی سو یہ سن کر نہ تھا کہ وہ اس کی آند سے بے خبر ہوا۔

”ایکسکیوز می!“ وہ اندر چلی آئی۔ ”آپ۔۔۔“

وہ آہستگی سے مڑا۔ شہلا پتھر کی ہو گئی۔ میروں پلین شرٹ اور فان کلر کی جینز میں وہ ابر چلائی تھا۔ شہلا کی آنکھیں آہستگی سے پھیلیں پھر ان میں پانی بھرنے لگا۔ اس کے گلے میں گھٹیا نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی نمی اور چہرے پر شرمساری تھی۔ شہلا چند قدم آگے بڑھی اور اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ ابرار کی نظریں اس کے وجود پر پھسل گئیں۔

فیروز پلین ساڑھی اور سفید اور آل پہنے گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے وہ آج سے پانچ برس پہلے کی شہلا سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

”بہت بدل گئی ہو۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیوں آئے ہو؟“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔

ابرار کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ انگلی سے میز کی سطح پر لکیریں بنانے لگا۔

”جاؤ یہاں سے ابرا۔۔۔ پلیز۔“ شہلا نے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔

”شہلا میں میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں بس ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا تمہیں“ عمر سے عمر تمہاری باتیں کرتا ہے مجھ سے صرف تمہاری ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتوں نے میرے من میں خلش کی چنگاری کو لاؤ میں بدل ڈالا

”میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے شہلا۔!“

شہلا کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ گر کر اس کے اوپر آل میں جذب ہو گیا۔

”اب سب کچھ بعید از وقت اور بعید از اختیار ہے ابرار! میرا مذاق مت بناؤ دنیا کے سامنے۔ اب ان باتوں کی بھی گنجائش نہیں رہی زندگی میں۔ جاؤ یہاں سے اور کبھی دوبارہ مت آنا۔ پلیز۔“

ابرار نے ایک نگاہ میں اس کے سیاہ بالوں کو اس کی بھگی آنکھوں کو اور شدت غم سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔

”ٹھیک ہی کہتی ہو تم۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”وہ اجنبی ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں لیکن ہم تو نہ شناسا رہے نہ اجنبی۔ چلتا ہوں۔“

وہ اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا تھا۔ شہلا کو بڑے زور کا چکر آیا تھا۔ وہ سر تھام کر میز پر جھک گئی۔ ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے تھے۔



”ایسا ایسا کہانی ایسے ختم نہیں ہو سکتی۔ آپ کو اسے ایک فل اسٹاپ دینا ہو گا۔“ انیتہ پریشانی سے کہنے لگی۔
”ملا دونوں ہاتھ گود میں رکھے بالکل بے بسی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“ اس نے من کے سامنے اپنا جی ہکا کرنے کا سوچا تھا۔ اس نے اپنی سب پریشانی اس کے سامنے رکھ دی تھی اور اب خالی دماغ لیے بت بنی بیٹھی تھی۔

”بھی تو اس نے ابتدا کی ہے اور آپ جانتی ہیں وہ دل مارنے کا عادی نہیں ہے۔ جو من میں آئے کر گزرتا ہے اس من میں کچھ اور ہی سودا سایا ہوا لگتا ہے۔“

”میں یہاں سے چلا جانا چاہتی ہوں انیتہ!“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”میں کسی اور شہر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے گلے لے کر یہاں سے شائستہ بستر سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ بس یہی ہے میرے بس میں۔ عمر نہ ہو تو شاید میں مرنے کی بات کر لوں میرا یہی زندگی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی میں۔“

”ایسا۔۔۔“ انیتہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ایسا! ایک بات کہوں آپ سے؟“ شہلا چپ چاپ بے بس نظر آ رہی تھی۔

”انیتہ۔۔۔“ شہلا جھٹکائی تھی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات ہے تو کرو۔“

”ایسا! آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے وہ ایک مخلص انسان ہے۔ اس کا ہاتھ تمام کر زندگی کی ہر الجھن کو سلجھالیں۔ پھر ماضی کی کوئی پرچھائیں کالی بلی کی طرح آپ کا رستہ نہیں کاٹے گی۔ ایک سیدھی راہ پر چل پڑیں ایسا۔ یہی ہر مسئلے کا حل ہے۔“

”نہیں انیتہ۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری زندگی میں اب کسی مرد کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں سب سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ میں عمر کے ساتھ لاہور چلی جاؤں گی۔ میں کبھی پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گی۔ میں عمر کے ساتھ یہاں سے دور بہت دور چلی جاؤں گی۔ ضرورت پڑی تو یہ ملک بھی چھوڑ دوں گی۔“

”یہ حل ہے آپ کے مسائل کا؟“ انیتہ نے حقارت سے اسے دیکھا۔

”شاید۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”یقیناً۔۔۔“

ربیعہ چونکہ اٹھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی میں تصور کھڑا تھا۔

وہ تو نجانے کب سے وہاں کھڑا تھا۔ اپنے کام میں مگن ربیعہ نے بے خیالی میں ہی نگاہیں ادھر اٹھائی تھیں۔

”تصور بھائی۔۔۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ”وہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں آپ!“

وہ مسکرانے لگا۔ اس کی نظروں میں پیغام تھا۔ ربیعہ کی چھٹی جس بیدار ہو گئی۔ اس کے ابرو تن گئے۔ وہ چولے کے سامنے سے ہٹ کر کھڑکی میں چلی آئی۔

”تصور بھائی۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

”ہول۔۔۔“ وہ لگاوٹ سے بولا۔

”آپ کو کچھ کام ہے یہاں؟“

”کام؟ نہیں تو۔“ وہ مسکرایا۔

ربیعہ نے کھڑکی زور سے بند کر دی۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ پھر سے چولے کے پاس آئی لیکن اسے یاد نہ آیا وہ ہانڈی میں کیا ڈالنا چاہتی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔ دروازے سے آواز آئی۔

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اب دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ گویا گوند سے چپکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اب معدوم ہوتی ہی نہیں تھی۔

ربیعہ جتنے لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”آپ کچھ لپکتے کیوں نہیں؟“ وہ غصے سے بولی۔ ”کیا کام ہے آپ یہاں۔۔۔“

”مجھے چائے بنا دے۔“ وہ کچھ جھینپ گیا۔

”اچھا بنا دیتی ہوں۔“ اس کے ابرو ہنوز تنے ہوئے تھے۔ ”لیکن کیا آپ چائے بننے تک یہیں کھڑے رہیں گے؟“

وہ شرمندہ سا وہاں سے ہٹ گیا۔ ربیعہ نے ہانڈی کے نیچے سناٹا کر رکھا اور چولے کا پانی دوسرے چولے پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن بٹ گیا تھا ورنہ وہ بے حد لگن سے سالن بنا رہی تھی۔ سوچوں میں گم رہے ہوئے اس نے چائے بنائی تھی۔

”تصور بھائی!“ یکن سے نکل کر اس نے آواز لگائی تھی۔ ”چائے لے لیں۔“

جواب نہ دارو تھا۔ ربیعہ نے یکے بعد دیگرے تینوں کمریوں میں جھانکا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ حیران پریشان سی برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ یقیناً چھت پر چلا گیا ہو گا۔ نجانے کیوں وہ گھر کے افراد سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہ پیالی لے کر صحن میں نکلی۔

”تصور بھائی۔۔۔“ اس نے پھر آواز لگائی۔ ”یہ چائے لے جائیں۔“

مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ربیعہ کا جی چاہا چائے کسی کیاری میں گرا دے اور جا کر اپنا سالن پکانے لگے۔ پھر خود پر جبر کر کے وہ سپرٹھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اپنی پتنگوں کے پاس بیٹھا تھا۔ ان میں سوراخ کر کے دھاگا پرو رہا تھا۔

”یہ سبجے اپنی چائے۔“ ربیعہ نے چائے اس کے قریب رکھ دی۔

”سنو ربیعہ۔۔۔“ اس نے آواز دی تھی۔

”کیا مسئلہ ہو گیا؟“ ان کے کان کھڑے ہوئے۔
”کہتی ہیں، نافع سے منگنی نہیں کر لی۔ یہاں جوڑے اور انگوٹھی کا ناپ بھی جا چکا۔ بتلاؤ، کس قدر سبکی کی بات ہے۔“

فاروق حسن کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہ گئے۔
”کیا مطلب؟“ پھر وہ سنبھل کر بولے۔ ”آپ نے عریشہ سے پہلے پوچھا نہیں تھا؟“
”اے ہاں، سب قصور میرے، مجھے کیا خبر تھی کتنے پر نکالے ہوئے ہیں اس نے۔ بالشت بالشت بھر کی چھو کر یاں خود کو عقل کل سمجھتی ہیں۔“

فاروق حسن چند لمحے ساری بات سمجھنے کی کوشش میں خاموش بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنا گاؤں پہننے لگے۔
فردوس بیگم نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیں۔
انہوں نے عریشہ کے کمرے کے سامنے رک کر دروازہ بجایا۔

”نور!“ یہی کھلی گئی۔ سفید شلوار قمیص اور سفید تیل لگے سیاہ دھوپے میں ملبوس عریشہ ان کے مقابل تھی۔
”کیا نہیں مترمیم نہیں اور ناگ سرخ ہو رہی تھی۔“
”جیسے سننے سے ہٹ گئی۔“ آئیں۔“

وہ آگے کا ہاتھ دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ فردوس بیگم بھی دلی دلی سی چلی آئیں اور ایک کونے میں دبک گئیں۔
”بہن! وہ کونسا بچہ ہے؟“

”بہن! وہ کونسا بچہ ہے؟“
”سرخ لب کا بچہ لگے تھے۔ ماں کے مقابل وہ کیسی شیریں جاتی مگر باپ کے سامنے چپکے لڑکتی۔“

”بابا!“ اس نے تکیہ کیا۔
”ان کے انداز میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔“
”ابھی اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔“

”اچھی بات ہے، بہت اچھی بات ہے۔ شریف لڑکیاں ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنے والی بنیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ گھر میں ساتھ رہتے گزرتے کو بھائیوں کی طرح سمجھتی ہیں لیکن بیٹے شادی ایک بالکل علیحدہ قسم کا بندھن ہے۔ ایسا بندھن جو چند لمحوں میں دو اجنبیوں کو ایسا آشنا بنا دیتا ہے کہ ساری زندگی کے لیے اعتماد اور اعتبار کا تحفظ میسر آجاتا ہے۔ سوچے بیٹا! جب دو اجنبی ایک دوسرے کے متعلق بالکل نئے انداز سے سوچتے ہیں تو آخر اس رشتے میں کوئی تو ایسی پیچھوتی بات ہوتی ہوگی۔ انسان کی سوجوں کو ایک بالکل نیا رخ مل جاتا ہوگا۔ ابھی نافع کے حوالے سے آپ کے نو خیالات ہیں، وہ قابل قدر ہیں۔ لیکن اس بات کا یقین کر لیں کہ بعد میں آپ کے ذہن میں کوئی گڑبائی نہ رہے گی، آپ ویسا ہی محسوس کریں گی جیسا ایک شریک حیات کے لیے کرنا چاہیے۔ بچوں کو بہت سی باتیں اپنے والدین پر چھوڑ دینا چاہئیں۔ وہ عمر عقل اور تجربے میں اولاد سے بہت آگے ہوتے ہیں بہت آگے کا سوچتے ہیں۔ ہم آپ کی عمر سے گزر چکے ہیں، سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے کیا احساسات و جذبات ہوں گے آپ

”جی۔“ وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔
”او، تمہیں پتہ لگا اڑانا سکھاؤں۔“
”شکریہ۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا نا مجھے شوق نہیں ہے۔“
”ربیعہ۔ ربیعہ بات تو سنو۔“ وہ پتنگ چھوڑ کر اس کے قریب آگیا۔ ”تم مجھ سے ناراض سی کیوں رہتی ہو؟“
ربیعہ نے ناگہی سے اسے دیکھا۔
”نہیں تو، میں تو آپ سے ناراض نہیں رہتی۔“ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے سرسری سا اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا تو کچھ دیر بیٹھو یہاں، میرے پاس۔“
”تصور بھائی! ترانہ اور صولت آتی ہوں گی۔ مجھے کھانا پکانا ہے۔ چولہے پر سالن رکھا ہے، جل جائے گا۔“ وہ رسائی سے کہتے ہوئے مڑی۔

”سنو، سنو ربیعہ۔“ وہ پھر آگے بڑھ آیا۔
ربیعہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔
”تصور بھائی! مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ؟“
اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ تصور ڈر گیا۔
”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”مسئلہ تو کوئی نہیں، میں پوچھ رہا ہوں کہ کبھی ضرورت تو نہیں۔ کپڑے، چپیل، پنیں وغیرہ۔ لڑکیوں کا جو سامان ہوتا ہے مجھے لسٹ بنا دینا، میں لادوں گا۔“

ربیعہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔
”مجھے جو سامان چاہیے تھا تصور بھائی! میں نے ترانہ سے سب کچھ منگا لیا ہے۔ آپ کے پوچھنے کا شکریہ۔“
”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ چائے کے لیے شکریہ ربیعہ!“
”کوئی بات نہیں۔“

وہ پھر رکی نہیں تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔
ربیعہ کے ذہن میں گہری پڑ گئی تھی۔

PHOTO

سخت طیش کے عالم میں ان کے قریب آکر بیٹھی تھیں۔
فاروق حسن سونے کے ارادے سے چشمہ اتار رہی رہے تھے۔ مگر ان کے تیور بھانپ کر وہ رک گئے۔ بغور انہوں نے اپنی بھاری بھر کم بیگم کے بگڑے بگڑے انداز دیکھے اور گہری سانس بھری۔
”باسم کے پاس سے آرہی ہوں۔“ انہوں نے اپنی طرف سے بے حد عجیب نشانہ باندھا تھا۔
”یہاں جس کے پاس چلے جاؤ اس کی اپنی ہی کمائی ہے۔ آدمی کس کس کو پورا پڑے۔ اے ہاں، اپنی تو عمر بیت گئی سب کی لالو پتو کرتے کرتے۔“

”کس نے کیا کہہ دیا بھی؟“ وہ سونا چاہتے تھے اور کسی قسم کی بد مزگی کی داستان سننے کے قلعہ ”سوڈین“ نہ تھے۔
”بھیا رانی سے پوچھو جنہیں ہری ہری سوجہ زہی ہے۔ نئے سے نئے شوٹے نکل رہے ہیں اس گھر میں تو۔“
فاروق حسن! اپنی اولاد سے تمہاری نمٹو میں کہہ دیتی ہوں۔“

ہماری عمر کو نہیں پہنچیں، آپ نگاہ کی اس گہرائی کو نہیں جان سکتیں۔ آپ کے ماں باپ نے آپ کے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے اس کا اندازہ آپ کو عمر کا کچھ حصہ گزار کر ہو گا اور ضرور ہو گا۔“

انہوں نے ٹھہر کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ فردوس بیگم ان کی گفتگو سے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلائے جا رہی تھیں۔ لیکن عریشہ کے تاثرات کی سختی، هنوز برقرار تھی۔ وہ مارے باندھے بیٹھی تھی جیسے اس کا بس چلنا تو اٹھ کر کمرے سے بھاگ جاتی۔

”اور ایک آخری بات۔“ اب ان کے لہجے میں فخر اور سختی در آئی۔

عریشہ نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا۔

”میں اپنی ماں اور اپنے بھائی کو زبان دے چکا ہوں، میں جانتا ہوں بیٹا! کہ آپ کی ماں نے آپ سے پوچھے بغیر ”ہاں“ کر کے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے جس کے لیے پورے خاندان میں رنجش کی ایک نئی گرہ ڈال دی جائے۔ آپ کے دل کو اگر نہیں پہنچی ہے تو آپ کا باپ آپ کے سامنے کھڑا مذرت خواہ ہے۔“

”بابا۔“ اس کے لب کاٹنے۔

”لیکن اب آپ کو اپنے باپ کا ماں رکھنا ہو گا۔“ انہوں نے اس کی جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر عریشہ نے اپنے سر پر ایک بے حد گراں اور قیمتی شے محسوس کی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ہلکی سی لہریں اور دل ہر خواہش سے خالی اور دست بردار ہو گیا۔

”مائی گاڈ۔“ ہاشم کے لبوں پر مسکراہٹ چٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں تحیر تھا۔ چہرے پر خوشی کی الوہی سی چمک تھی۔

”بہت اچھے بھی ہیں۔“ اس نے کاغذ لہرایا۔

رافع جھینپ کر ہنس دیا۔

”لیکن یہ ”پوشیدہ ہستی“ ہے کون؟“

”جانتا نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا کسی کو۔“

”پھر یہ سب کچھ کس فرشتے نے لکھوایا تم سے؟“ کوئی تو حرکت کی ہوگی۔

”تحریک تو مجھے تمہارے عشق سے ملی ہے۔“ وہ قلم کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔ ”جی بات ہے۔“

”گویا ادھار کے جذبات ہیں؟ پھر تو یہ نظم مجھے ڈاکٹر صاحبہ کی خدمت میں اپنے نام سے پیش کر دینا چاہیے۔“

رافع! وہ منت بھرے انداز میں بولا۔

رافع نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”یا سہ چند ایک نظمیں ایسی اور لکھ دو مجھے۔ میں سنجیدہ ہو گیا ہوں۔“

”اے! رافع نے آنکھیں نکالیں۔ ”میرے جذبات کو دھڑکتے سے ادھار کا کہہ کر مذاق اڑاتا ہے اور مجھ سے

میری ہی نظمیں مانگ رہا ہے۔ ادھار یہ ہے یا وہ۔“

”بھئی۔۔۔ میرے جذبات ہیں نا اس نظم میں۔“

”الفاظ تو میرے ہیں۔“

”محبوبہ تو میری ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”تم تو یہ نظم کسی کے نام بھی نہیں کر سکتے۔“

”ارے واہ۔۔۔ محبوبہ کے محبوب! وہ جڑ گیا۔“ میں پھاڑ دوں گا لیکن یہ چیٹنگ نہیں کروں گا۔ محبوبہ تمہارے پاس ہے۔ جذبات تمہارے پاس ہیں تو نظمیں بھی لکھ لو۔ الفاظ کسی فرد واحد کی ملکیت تو نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک ہے شاعر صاحب! ایک نظم کیا مانگ لی تم تو طوطا بن گئے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم بھی کسی رڈی کی دکان پر ایک آدھ گھنٹہ ضائع کر کے کوئی شہسپا رہ ڈھونڈ ہی لیں گے۔ کسی مرحوم شاعر کی مثنیٰ بھی نہ کرنا پڑیں گی۔“

رافع قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اور مزہ آجائے جب ڈاکٹر صاحبہ کی کسی ڈائری میں پہلے سے وہ شہسپا رہ محفوظ ہوا۔“

ہاشم بھی اس تصور سے لطف اندوز ہو کر ہنس دیا۔

”یار ہاشم۔“ رافع سنجیدہ ہوا۔ ”ہوا کیا؟“

”ابھی تک تو ہری اور لال دونوں بتیاں خاموش ہیں۔“ اس نے آہ بھری۔ ”دیکھو کون سی جلتی ہے۔“

”تم نے پھر بات نہیں کی؟ کیا خبر ادھر بھی انتظار کی کیفیت ہو کہ دوبارہ استفسار ہو تو جواب دیا جائے۔“

ہاشم قدرے سوچ میں پڑ گیا۔

”میں نے تو معاملہ پیچیدہ کر کے سپرد کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”استفسار تو اب ان ہی کو زیب دیتا ہے۔“

”او نہیں یار! رافع بولا۔ ”تمہارے کہنے کی بات اور ہے۔ صنف نازک کے نازک احساسات کو تقویت ملتی

ہے صنف قوی کو سوال کرنا دیکھ کر دل میں شگوفے کھلتے ہیں تو لبوں پر ”ہاں“ آتی ہے۔“

”یہ تو بالکل سچ ہے طرح چونکا کچھ گھبرا یا۔“

”یار رافع! تو تھیک ہے نا؟“ اس نے رافع کا چہرہ اور سینہ ٹٹولا۔

”ہاں! اب کیا جواب دے؟“ وہ بھی گھبرا گیا۔

”یہ تو مجھے باتیں کر رہے آج تجھ میں کسی مرحوم شاعر کی روح حلول کر گئی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ رافع

”سے کہتے تو مجھے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”مجھے پھر بات کرنا ہوگی۔“

”تمہیں دوپہر کی بات یاد ہے؟“ رافع نے آنکھ دہرائی۔

پھر دونوں ہنس دیے۔

”حیات ولا!“ میں چاندنی آتری ہوئی تھی۔ پوری عمارت رنگین قسموں سے بٹی ہوئی تھی۔ کمرے اور دالان قوسوں سے گونج رہے تھے نہ نہ کرتے بھی بہت سے عزیز رشتہ دار بلوائے گئے تھے گھر کے سب ہی لڑکے انتظامات میں بھی مصروف تھے اور ایک دوسرے پر پیمبتیاں بھی کس رہے تھے۔

”یار عباد۔“ حمزہ بولا۔ ”دیگوں کا انتظام تمہارے سپرد ہے۔ خیال رہے کھانا میاں سے وہاں بھی ہو جاتا ہے اور خرواہوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔“

”اس کے سپرد انتظام کیا گیا تو یقیناً ایسا ہی ہو گا۔“ علی ہنس دیا۔

”پھر یوں کر کہ ایک خالی دیگ کے اندر علی کو چھپا دو۔“ عباد مزے سے بولا۔ ”میرے سر سے بھی نگرانی کا

تہہ اترے گا اور دیگوں کی حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔“

”گنڈ آئیڈیا۔“ سب ہی نے اس کے مشورے کو سراہا تھا۔

”چلو علی۔ شاباش۔ دیکھ پسند کرو۔“ اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا تھا۔

”صدمہ تو جاواں ہے۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”تندرستی رو سٹ کی دیکھ مناسب رہے گی۔“

”جی ہاں۔“ رافع وہاں چلا آیا۔ ”بلی کو دوریہ کی چونکداری سوچو گے تو یہی جواب ملے گا۔ تم سب لوگ یہاں کھڑے باتیں بنا رہے ہو۔ وہاں رسم کی ادائیگی ہونے والی ہے۔ لڑکا وہاں دیاں دے رہا ہے کہ میرے دوست کیا ہوئے۔ لڑکی اپنے بھائیوں کی راہ دیکھتی ہے۔ چلو سب اندر۔“

ایک دوست گود میں چھوڑ کر وہ سب اندر کی سمت چل دیے۔

”عزیزہ! ناعمہ نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔“ دلہن تم ضرور ہو مگر منگنی کی رسم کی۔ بلاوجہ تم رخصتی کا خیال ذہن میں لیے بیٹھی ہو۔ اتنا ٹینس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

عزیزہ نے جواب میں صرف زور سے ”سوں“ کیا۔

”یہ زکام ہے یا کچھ اور۔۔۔؟“ وہ بھٹائی۔

وردہ ہنس دی۔

”ناعمہ! کیوں اس بے چاری کو تنگ کر رہی ہو۔ وہ پہلے ہی اداس ہو رہی ہے۔“

”وہی تو میں پوچھ رہی ہوں! اداسی کی وجہ کیا ہے؟“

”جب تم دلہن ہونگی تو سب سمجھ میں آجائے گا۔“

”اپنی منگنی والے دن تو میں ہرگز اداس نہ ہوں گی۔“ وہ بولی۔

”اس دن تمہارا دلہا اداس ہو گا۔“ ماہین ہر جتہ بولی تو لڑکیاں ہنسنے لگا کر ہنس پڑیں۔ عزیزہ بھی مسکرا دی۔

”اللہ ماہین آئی! اس نے احتجاج کیا۔“ ایسے تو نہ کہیں۔ میں کیا اتنی بری ہوں؟“

کارڈور سے گزرتے ہوئے انیقہ کمرے سے نکلتے ہاشم کے مقابل آ کر کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم ہاشم بھائی! وہ مسکرائی۔

”وعلیکم السلام۔“ ہاشم کی نگاہیں اس کے عقب میں کچھ تلاش کر کے نامزد لوٹ آئیں۔ ”آپ کیلی آئی ہیں۔“ اس کے لہجے میں لکا سا شکوہ تھا۔ انیقہ مسکرا دی۔

”جی۔۔۔ وہ اپنا کام مزاج کچھ اچھا نہ تھا۔“

”بد مزاج ہیں؟“ ہاشم نے اس کی بات کا لطف لیا۔

”بہت۔۔۔ وہ برجستگی سے بولی۔ ”آپ سوچ لیں۔“

”ہمارا سوچنے کا وقت گزر گیا ہے انیقہ بی بی!“ ہاشم خوش دلی سے مسکرایا۔ ”بلکہ یوں کہیے کہ سوچنے سمجھنے کی

مہلت ہی نہ رہی۔“

انیقہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔ اس نے غور سے ہاشم کا مسکراتا ہوا روپ دیکھا۔

”لیکن ڈاکٹر صاحبہ نے زیادتی کی ہے۔“ وہ بولا۔ ”انہیں آنا چاہیے تھا۔“ حیات دلا کی ہر تقریب میں وہ

شریک ہوتی رہی ہیں۔“

”میں نے تو اصرار کیا تھا مگر۔۔۔“ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

”خیر۔۔۔ آپ بیٹھیے عزیزہ وہ سامنے والے کمرے میں ہے۔“

”شکریہ۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

بہت اداس اور لمعل سی وہ لان کی سیریلیوں کے پاس بیٹھی، چاند کے زرد تھال کو آسمان کی سیاہ چادر پر رکھا ہوا

دیکھ رہی تھی۔

زردی تنہا چاند اسے اپنی طرح اداس محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی بے چارگی اور حزن تھا۔ شہلا خاموشی سے اسے تنگ لگتی۔

”مہربا! عمر کارڈ لیس لیے باہر آیا۔“ آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ میں پورے گھر میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ اپنے خیالوں سے باہر آئی۔

جواب! اس نے اسے کارڈ لیس شہلا دیا۔ اور اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔

”ہیلو۔“

”ابرا بات کر رہا ہوں۔“

شہلا جھنجھلا گئی۔ جن خیالوں کو خود پر سے نوج نوج کر، پیچھا چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی وہ مکڑی کے جالے کی طرح اسے مزید اپنے اندر لپیٹتے جا رہے تھے۔

”تار کاؤ سیک ابرا۔!“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہیں عمر سے بات کرنا ہے میں نے تمہیں

اجازت دے دی ہے۔ تم اس سے ملنا چاہتے ہو میں تمہارے کہنے پر ہر مرتبہ اسے بھیج دیتی ہوں، لیکن اس

ملنے کے پریشان کرنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ آخر ہمارے درمیان کہنے سننے کے لیے بچا کیا ہے۔“

”شہلا! مجھ کو بخیر انداز میں بولا۔“ ”مجھے اس طرح مت جھڑکو کہ میں اپنی نگاہ میں مزید ذلیل ہو جاؤں۔ میں

پہلے ہی خود کو بے حد سست اور ذلیل محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اور شرمندہ مت کرو۔“

”میں لاپرواہ ہو جاؤں گی۔“ وہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آواز میں بولی۔

”آپ کی زندگی انسانی ہے۔ تم نے خود کو بھی اور مجھ کو بھی۔“ وہ شکایتاً بولا۔ ”کیوں کیا تم نے شہلا ایسا۔“

”میں۔۔۔“ وہ حیران ہو گئی۔ ”یعنی اتنے سالوں بعد بھی فرد جرم تم میرے کھاتے میں ڈال رہے ہو؟ ابرا

اپنے اپنے کھانے میں بھاگنے کی ہمت پیدا کرو خود میں۔ سچ کی آنکھیں چہرے پر لگا کر پھر آئینہ دیکھو۔ میرے پر

کاغذ نے مجھے سوئے ہوئے منہ پر بند کر دیا اور اب پوچھتے ہو کہ میرے دل نے اڑان بھرنے کی تمنا ہی

کیوں کی؟ اس نے یہ سب جھٹکا اور ہمارے اس سوئے ہوئے منہ کے پیچھے میں مر جاتی دم کھٹ جاتا ان تاریک کمروں

میں میرے لیے جگہ مجھے عمر قید کی سزا سنائی دیتی ہے۔ جگہ جگہ سے چلے گئے تھے۔“

”ابرا۔۔۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں بے حس نہیں تھا۔ تم سے بے پروا نہیں ہوا تھا۔ میں صرف

مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ سب کچھ۔ لیکن تم میں انتظار کا حوصلہ ہی نہ تھا۔ اپنی جلد

بازی میں سب کچھ تباہ کر ڈالا تم نے۔“

وہ خاموش ہو کر آنسو حلق سے اتارنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ میں مانتی ہوں میں نے غصے میں طلاق کا مطالبہ کیا تھا، زور اصرار کیا تھا۔ لیکن سپر سائنس

کر کے تم نے بھیجے تھے ابرا۔ تم نے وہ بھی اتنی عجلت میں جیسے تم یہی کچھ سننے کو بیٹھے تھے۔“ اس سے بولنا

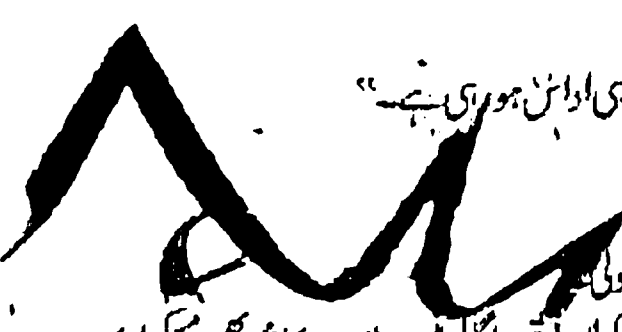
شوار ہوئے لگا۔ ”مطلق میں گولے پھینکے۔“

”میری خرابی کا تو تمہیں علم ہے شہلا!“ وہ شکست خوردگی سے بولا۔ ”بہت جلد چڑھنے اور بہت جلد اتر جانے

والا غصہ۔۔۔“ وہ مطالبے نے میرے دل و دماغ میں آگ سی بھردی تھی۔ اور اس آگ کو بجھانے والا کوئی ہمدرد

دلی قافلے میں بیٹھا نہ تھا۔ اس پاس جتنے بھی تھے جلتی پرتیل ڈالنے والے تھے۔ بابا سائیں، اماں، بہنیں، سب

میں نے یہ سے غصے کو خوب خوب ہوا دی۔ مجھ پر طعنے کے مذاق اڑایا گیا میرا کہ میں نے ایک ایسی عورت سے



PHOTO

محبت اور شادی کی جو محبت کے رستے کی معمولی تکلیف نہ سہہ پائی بھلا زندگی کی دشوار گزار راہوں میں وہ ہاتھ تمام کر کہاں تک چل سکے گی۔ میں غصے میں تھا میرا ذہن کام نہ کر رہا تھا۔ سب اچھی سوچیں تم اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

”بہر حال!“ شہلا نے آنسو پونچھے اور خود پر قابو پایا۔ ”محبت کے تناور درخت کو ہم نے خود مل کر کاٹ دیا اس کی بکھری ہوئی شاخوں سے الجھنے سے کیا حاصل ابرار! اب ان شاخوں پر نہ پھل ہیں نہ پھول۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

”میں اور تم جس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں شہلا! وہ دوسری جانب تمہارے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ احساس مجھے جینے نہیں دے رہا ہے۔ میں ماضی میں چل رہا ہوں شہلا۔“

”ابرا۔ ابرار تم مجھے کیوں نہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا! اس کی جڑیں بہت اندر تک پوست ہیں۔“

”ابرا!“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر سکتے میں رہ گئی۔ ”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”ہم پھریل جاتے ہیں شہلا!“

”فار گاڈ سیک! اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔ ”تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟“

”اس لیے کہ میں نے ایسا دیکھا ہے۔“ اب اس کا لہجہ مضبوط ہو چکا تھا۔

”ہوتا ہوگا۔“ وہ بے رخی سے بولی۔ ”میری زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”شہلا!“ وہ لجاجت سے بولا۔ ”صرف۔۔۔ صرف عمر کے بارے میں سوچو۔ موت سوچو میرے بارے میں موت

سوچو اپنے بارے میں۔ اس بچے کا سوچو جو میرا ہے تمہارا ہے اور تمہاری نونوں کے درمیان جینا چاہتا ہے۔ ذرا سا

کشت اٹھا لینے سے اگر روٹھی خوشیاں پھر سے مل سکتی ہوں تو میں اٹھا لیتا ہوں۔“

”تم مجھے مرنے کے لیے کہہ دو ابرار!“ اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں حراؤں گی۔“

”میں ہمیشہ تم سے بیٹھے رہے۔“ ابرار نے شہلا کی طرف دیکھا۔

اس کے لہجے میں بے تحاشا سچ تھا۔ شہلا پتھر کی ہو گئی۔

”شہلا!“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا ایک دوست ہے وہ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ سب

کچھ تیار ہے شہلا!۔ بس تمہاری ایک ”ہاں“ چاہیے۔“

شہلا نے فون بند کر دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔



”پھوپھو۔۔۔ پھوپھا جان بلا رہے ہیں۔“ نافع نے کمرے میں جھانک کر شرارت سے کہا۔

آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں گہرے ٹانگتی ایقان کا ہاتھ کانپا اور دل عجب انداز میں دھڑکا۔ وہ بے تابی سے

مڑی۔

”نافع!“

”جی ہاں۔۔۔ مگر فون پر!“ اس نے دانت نکالے۔ ”میں وہاں دو لہا بن رہا ہوں پھوپھا مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں۔“

”بد تمیز کہیں کا۔“ اس کو ہنسی اور غصہ ایک ساتھ آئے۔ ”لے کر دل دھڑکا دیا میرا میں سمجھی۔“ وہ سر

جھکتی، بڑبڑاتے ہوئے فون کی طرف بڑھ گئی۔

”ہیلو“ اس نے ریسپورڈ اٹھایا۔

”مبارک ہو، پیچھے، پیچھے کی منتی۔“

”خیر مبارک!“ وہ تازے بول۔

”منہ تو میٹھا کر اوسے“ ادھر سے شرارت ہوئی۔

”لڈو کھینچ ماروں؟“

”ہائے رے ستم ظریفی!“ اس نے شکوہ کیا۔ ”کس کی صحبت میں رہ رہی ہو جان من! تم اتنی ظالم تو نہ تھیں۔

اپنے بڑوس میں کوئی قصاص تو آکر نہیں بس گیا؟“

”آپ کس کی صحبت میں ہیں؟“ وہ جواباً بولی۔ ”بہت خوش مزاج ہوتے جا رہے ہیں۔“

عاشق دم خاموش ہوا۔

”اچھا یہ بتاؤ کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں تم نے؟“ پھر وہ خوش دلی سے گویا ہوا۔

”اپنے دل سے پوچھو۔ بوجھ کر دکھاؤ۔“ وہ ہنسی۔

”اچھا!“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ”سنہری سنہری ہی لگتی ہو۔“

ایقان کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے سامنے کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور اپنے گولڈن کپڑے دیکھے۔

”بہت بے ایمان ہو عاشق تم۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

دوسری جانب اس نے قہقہہ لگایا۔

”پکڑی گئیں نا۔ اچھا یہ بتاؤ میرے بچے کیسے ہیں؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس!“ اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔

”سب کو سلام کہنا۔ دو لہا، پلن کو مبارکباد۔“

”اوکے سر!“

”اپنا خیال رکھا کرو۔“

”ہوں!“ وہ ہنسی۔

”خدا حافظ۔ لو بوا!“ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایقان بہت دیر تک ریسپورڈ لیے کھڑی رہی۔

”پہچھو۔“ نافع کمرے میں جھانک کر منمنایا۔ ”مجھے یہاں تیار ہونا ہے۔“

”اوسے“ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ ”ہاں ہاں آجاؤ نافع! میں نے بات کر لی ہے۔ تمہارے ”پھوپھا“ بہت

بہت مبارکباد دے رہے تھے۔“

”متھینک یو۔ ویسے مجھے مبارکباد دے چکے تھے وہ۔“ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”اچھا!“ وہ ہنسی۔ ”اور کہا کہ رے تھے؟“

”یو چیپ رہے تھے تمہاری پیپھو نے کون سے کلر کا ڈریس پہنا ہے۔ میں نے بتایا گولڈن کلر کا۔“

”آں۔“ ایقان کا منہ کھٹکا کھٹکا رہ گیا۔ ”بے ایمان۔“

وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

”انسو جھر جھر کر رہے تھے اس کا چہرہ بھٹکتا جا رہا تھا۔

”میرا ایک دوست ہے۔۔۔ وہ یہ قربانی دینے کے لیے۔“

”آہ! قربانی میری مانگتے ہو۔ اور نام اپنے دوست کا لیتے ہو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”یہ نہیں

سوچا کہ مجھ پر کیا بیٹے گی۔ جو خوش رنگ بننے دکھا رہے ہو، ان تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے تلووں کو لہلہا کرنا

ہو گا اور اسی آہ۔۔۔ سے خیر میری مانگ بھر کر مجھ پر احسان کرو گے۔ ابراہیم جیلانی! تم مرد لوگ عورت کو محض ایک حقیر

کھلونا سمجھتے ہو۔۔۔ کہ لوٹا محض اس وقت تک کشش رکھتا ہے جب تک دسترس سے دور ہو۔“

اس کے تپہ زب رکھا کارڈ لیس پھر بجنے لگا تھا۔ شہلا پریشان ہوا تھی۔

”کیا چاہتا ہے یہ شخص۔ یہ مجھے سکون نہ دے گا نہ مرنے دے گا۔“

اس نے فون آن کیا۔

”ہیلو۔“

”ہاشم عرض کر رہا ہوں!“ سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں کہا گیا تھا۔

شہلا دفعہً اساکت ہوئی۔

”آپ مجھ سے خفا ہو گئی ہیں کیا؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگا۔

”جی۔ نہیں۔“ اس کا ذہن حاضرنہ تھا۔

”پھر آپ کیوں نہیں؟“ پچھو بھی آپ کی منتظر ہیں۔ اوسے میں بھی۔“

”ہاشم!“ وہ تھوڑے وقفے سے بولی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ورنہ میں ضرور آتی۔ پلیز آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔

اور آئینہ۔۔۔ اس کی ضرورت معذرت کر لیجئے گا میری طرف سے۔“

”آپ بوجھ کر ایسا کر رہی ہیں؟“ اچھا نہیں لگا ورنہ آپ ضرور آئیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ

میرا ہونا نہیں۔“

”اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سب لوگ برسبب اس کی منتظر تھے۔

عریشہ کہ نافع کے برابر لا کر رکھا دیا گیا۔ وہ بے حد شہ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ معمولی سی مسکان کی جھلک تک لبوں

پر نہ تھی۔

نافع کھڑی تھی۔ سسترا رہا تھا۔ دوست احباب کے چٹکوں کا جواب دے رہا تھا۔

شفیقہ حیات دو انگلیاں سنبھالتی دو لہا دلسن کے پاس آ بیٹھیں۔ دونوں جانب سے انگلیاں انہیں ہی پہنائی

تھیں۔

”بسم اللہ کیجئے اماں جان!“ فاروق بہن بولے۔

”ہاشم!“ نافع، ایقان اور ماہین دو لہا دلسن کے دھوکے پشت پر کھڑے سب کارروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ سب

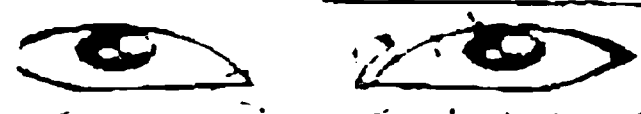
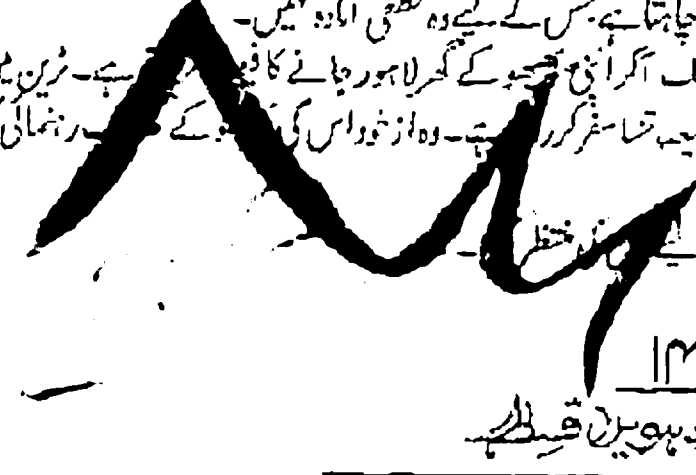
نے سب ہتھکے پر زت کی تھی۔

”نعنا!“ ہاشم کی زبانی انہی تھیں۔ خوشبو کے ایک مائوس جھونکے نے اسے چونکا دیا تھا۔

PHOTO

رکتے ہیں۔ دودھ کاغیر اور ایک گھمبیر اس کی ملکیت ہے۔ شام چاکو کو کانوں کا کرایہ لاسنے کی ذمہ داری سونپ کر وہ قدرے فکر
 وحاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ہوا سیکھنے بھی بڑوں ہونے کا حق بھرپور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں رہنے
 کوئی حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیٹے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عزائم
 شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگا آئے۔ نفیس، خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 رجبہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے
 دادی کے رُنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے
 بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے
 بلتیس یا اس کی بیوی بیوی ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر متکبرانہ ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل
 ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منیرہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔
 ڈاکٹر شہلا کو نملایا ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھروں کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔
 فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم، ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔
 رجبہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے غلٹ آکر اپنی بیوی کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔
 رجبہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ رجبہ تنہا سفر کر رہی ہے۔ وہ از خود اس کی خدمت کے لیے رہنمائی کی
 ذمہ داری لے لیتا ہے۔
 ناشر (ایقان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی لے کر دفتر پہنچ گئی۔



آنکھوں میں محبت کی جلتی جوت لیے وہ اس کے مقابل تھا۔ شہلا کے عقب میں پورا چاند چانک رہا تھا۔
 سکرانے لگا تھا۔ ہاشم کو روئے زمین کی ہر شے مسکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے وہ پورا منظر ایک طویل ریاضت
 اعجاز معلوم ہو رہا تھا۔

PICTO

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ وہ نرم لہجے میں بڑھ چکی تھی۔
 ”شہلا نے نظریں اٹھائیں پھر فوراً ہی جھک لیں۔
 میں نے سوچا۔ ”آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔“ وہ آستنی سے بولی۔ ”حیات والا“ کی ہر خوشی تھی میں
 ہمیشہ شریک رہی ہوں۔ تو پھر اتنی اچھی تقریب شخص ذرا سی ناسازی طبع کے باعث کیوں چھوڑ دی جائے۔ بعد میں
 مجھے ہمیشہ افسوس رہتا۔ ایقان بھی شکایت کرتی۔“
 ”تمہارا آپ شخص اتنا ہی سوچ کر آئیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”بہتر!“
 شہلا نے پھر بے چینی سے نگاہ اٹھائی۔ کھدر سلک کے گرے کلبے کرتے اور وہ ہائٹ شلوار میں ہاشم کی وجہ سے
 بہت نمایاں تھی۔ مناسب قدم قدامت کی شہلا کو اپنا آپ اس کے مقابل نہخامنا سا لگ رہا تھا۔ شناسائی کے
 سالوں میں وہ سینکڑوں مرتبہ اس سے ملی تھی لیکن آج سے پیشتر دل نے کبھی یوں چھپ جانے کی خواہش نہ کی
 تھی۔ جائے فرار نہ دھونڈی تھی۔
 ہاشم نے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا۔ اس کی ناک میں چمکتی لونگ سے زیادہ روشن نگاہیں اس سے گریزا

تھیں۔ ان نگاہوں کے عقب میں چاند جھینپا جھینپا سا مسکراتا تھا اور اپنی روشنی اس کے سیاہ بالوں پر بچھا کر کرتا
 جاتا تھا۔ چاند کی چمک سے مزین تھیں اس کے چہرے کے گرد جھولتی تھیں۔ بے حد مکمل اور خوبصورت منظر تھا۔
 ہاشم کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہ کرتا تھا لیکن ان نگاہوں میں فرار کی خواہش اس درجہ شدید تھی کہ اسے اپنے دل پر جبر
 کرنا ہی پڑا۔

”آپ کچھ لیجئے نا۔“ اس نے میزوں کی جانب اشارہ کیا۔

”مٹھنک ہو۔“ شہلا کو جیسے قید سے رہائی ملی۔

وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کی چمک نے منظر کو مزید روشن اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ ہاشم بھی
 ہنساہٹ سے مسکرا دیا۔

اچانک ہی کسی نے از حد بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر بازو دھرا تھا۔ ہاشم جو شہلا کی جانب متوجہ تھا
 چونک اٹھا۔ وہ رافع تھا۔

”میاں رائے!“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ جنون عشق کے انداز زرا قابو کر کے دیکھو۔ یہاں سب
 کے پاس دو آنکھیں اور دو کان ہیں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحبہ کے پر نفوم میں بے خودی کا کلوز فام ہوا ہے جو
 صرف ہماری قوت شامہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔“ ہاشم مسکرا دیا۔

”خیرے! اس شخص تو اس طرح کا کوئی دھندلا ہے نہیں، ہمیں تو روزگار سے لگا رہنے دے بھائی۔“
 ”جس شخص سے یہ کہہ بھی چھٹ جانے گی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”تائی امی! تمہیں ڈاکٹر صاحبہ سے محو
 گفتگو کا کرب حد غصے میں داک ٹوٹ کر چکی ہیں جس کا تمہاری صحت پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا کیونکہ تمہیں اس
 واقعہ کا علم ہی نہ ہو سکا۔ دادی جان اور امی جان مسلسل ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہیں اور
 چاند بیچھو رہے ہیں۔“
 ”میرا خیال ہے وہ تمہاری بات کا گھانا بھی چشم تصور سے اسی محفل میں اشارت کر چکی ہیں۔“



”چشم بد دوسرے کسی کی نظر نہ لگ جائے میری پیاری سی دوست کو۔“ ایقان شرارت بھرے لہجے میں
 کھانک اٹھی۔

”ایک عرصے بعد اتنا بنا سنو را دیکھا ہے تمہیں بہت اچھی لگ رہی ہو۔“
 شہلا نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجے پھر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

وہ دونوں کھانے کی میزوں سے کافی فاصلے پر آکھڑی ہوئی تھیں۔ ایقان نے محسوس کیا شہلا اس سے نظریں نہ
 ملا رہی تھی۔ وہ کنفیوژن کا شکار دکھائی دیتی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرائی۔

”شہلا! ایک بات پوچھوں؟“
 ”ہوں۔“ وہ کسی خیال سے چونکی۔
 ”ایک سوال کا جواب دینا اوصار تھا تم پر۔“

شہلا نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ ایقان کو اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آئی۔
ایقان تذبذب کا شکار ہوئی۔ نبھانے جو کچھ وہ محسوس کر رہی تھی وہ درست تھا یا صریحاً غلط۔
شہلا تو یوں بھی اس گھرانے کی ہر تقریب میں شریک ہوتی لیکن یہ بھی غلط نہ تھا کہ وہ عموماً ہر تقریب ہی اس کے
سان سے انداز میں ہی بھگتا لیا کرتی تھی۔ آج تو اس کا روپ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا مقابلہ کرنے پر آمادہ نظر
تھا۔

کادرانی سے سجاوٹوں کا خوبصورت سوٹ اس کے مناسب سراپے پر اپنی بہار دکھلا رہا تھا۔ سفید ٹیگنوں سے
مرصع کندن کا گوند اور آویزے اس کی آنکھوں سے پھوٹی چمک سے خیرہ تھے۔ خوبصورت کٹاؤ والے لب گہرے
میرون لب اسٹک سے سجے بے حد وضاحت سے اپنے حسن کا قصیدہ کہلا رہے تھے۔ کمر تک پہنچے ہوئے سیاہ جیکٹ
ہوئے بال خوبصورتیاں بکھیر رہے تھے۔

اس پر اس کی وہ قابل داد بے نیازی مزید خرابا کر رہی تھی۔
ایقان نے اور کھڑے ہاشم کی بے بسی پر ایک نگاہ ڈالی اور الجھ کر رہ گئی۔
”شہلا!“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔
شہلا نے سم کر اس کی صورت دیکھی۔

”ہاشم کا رشتہ لے کر آؤں باضابطہ طور پر؟“
”ایقان!“ وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔“
”تمہیں مہلت ضرور دیتی اگر تمہارا یہ قاتل روپ نہ دھنستی تو۔ لیکن یہ سب تیاری چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔
تمہاری خود ساختہ سزا آج ختم ہوئی۔ اب تمہیں مزید مہلت میں دی جاسکتی۔ قیدی کی رہائی کی تاریخ کا اعلان ہو گا۔“
”ج صاحب!“ شہلا مسکرا دی۔

”مذاق مت اڑاؤ ایقان! کیا ایک تقریب کے لیے یہ ذرا سی تیاری بھی میرا حق نہیں؟ اس کے بھی مطلب
نکالے جائیں گے؟“

ایقان لمحہ بھر کو گڑبڑا گئی۔
”خدا خواستہ میرا یہ مطلب نہیں تھا شہلا! میں کچھ غلط تو نہیں سوچ رہی۔“

”تم غلط ہی سوچ رہی ہو۔“ وہ پھر مسکرائی۔ ”میں یہاں تمہارا پیٹریوٹ نہیں۔“
ایقان کھلکھلا کر ہنس دی۔

”وہ تم بہت پہلے کر چکی ہو مائی ڈیر فرینڈ! وہاں تو نظر جگر دل پھینک رہا ہے۔ ہاں البتہ
پر تیل چھڑکنے کا سا اہتمام ضرور کیا ہے تم نے۔ اس کی بھی تو کچھ سزا ہونی چاہیے۔“

”مثلاً کیا؟“ شہلا نے تکیستی نگاہ سے اسے دیکھا۔
”مثلاً۔“ اس نے دیدے منکائے۔ ”مثلاً یہ کہ سارا اہتمام کم از کم اس کے نام تو کر دیا جائے۔ اتنا تو اقرار
کر کہ یہ سب ناز و انداز اس کے لیے ہی ہیں۔“

”ایقان!“
”شہلا پلین۔ کیا اس غریب سے پیر پکڑاؤ گی؟“ ایقان بھی سنجیدہ ہوئی۔
شہلا خاموش ہو گئی تھی۔

”میں کل آرہی ہوں“ آئی سے بات کرنے۔ ”ایقان نے دھمکایا۔ ”اور تمہاری جانب سے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

”اچھا۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ہائیں؟“ ایقان دم بخود ہوئی۔

پھر خوشی اس کے لبوں سے جھرنے کی صورت برآمد ہوئی تھی۔ شہلا بھی جھینپ کر مسکرا دی۔



سیاہ چیلے ڈھالے کرتے اور سیاہ چوڑی دارپا جامے میں ملبوس وہ مہرہ لب آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی سوچے چلی
جباری تھی۔ لائے سیاہ بالوں سے ٹپ ٹپ پالی کی بوندیں برس رہی تھیں۔ اس کا کرنا بھی جھیک چلا تھا اور نیلا
کارپٹ بھی۔ اسے مطلق پروانہ تھی۔ وہ نبھانے گیا کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔

تقریب ختم ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ سب ہی افراد سخت تھکاوٹ کے عالم میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے
تھے۔ تقریباً ہر پورشن کی لائٹس آف ہو گئی تھیں۔ اس نے پہلے تو بے حد بے دردی سے اپنے سنورے ہوئے

روپ کو بگاڑا تھا۔ کادر بیماری ویشہ اتار کر حقارت سے دور پھینکا۔ چوڑیاں توڑ توڑ کر اتاری تھیں۔ بال ہنسی نوج
عروج کر ڈرنک ٹیبل کے آئینے پر دے ماری تھیں پھر جا کر شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی۔ چہرہ بے دردی سے رگڑا

تھا۔ منہ سے سجے ہاتھوں پر نادر صابن ملا تھا۔ نہا کر نکلی تو آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ پوسٹلے بے تحاشا
سوچے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ذہن میں بھونچال سے اٹھ رہے تھے۔ پوری

دنیا اسے ایک غنائت حقیر شے دکھائی دے رہی تھی جسے ٹھکرا دینے کو من کرنا تھا۔ اسے سب ہی سے شکایت تھی
خود سمیت۔ وہ کیوں جھک گئی اس نے کیوں اتنی آسانی سے ہار مان لی اس نے کیوں مزاحمت نہ کی۔ کیوں کیوں

کیوں۔۔۔
رنگے میں گھر گھر رہوئی تھی۔ عیشہ کے لبوں سے سسکی نکلی۔ اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا

پھر ہٹا۔۔۔ اب۔۔۔ آواز کو۔۔۔ چاہتی تھی۔ وہ اسے بھولنا چاہتی تھی۔
فون لاؤ گھر گھر۔۔۔ ادکنان۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے دل سے خون رستا رہا لب سکتے

رہے۔۔۔ وہ نو۔۔۔ اسے۔۔۔ بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ نرم نرم رگوں میں دوڑتا لو خمار بن جاتا



مشقۂ عمود کی مرتبہ کے حوالے
کھانا پکانے کی مزیدار
ترکیبوں کی
رنگارنگ کتاب
مکھوئے کاغذ : ۳۷۰ اندو بازار کراچی

ایقان خود زانگیرائی پھر قدرے سنبھل کر گویا ہوئی۔
 ”بھابھی جان! تو بے خبری کی رستے پر بے حد خاموشی سے ”سبر سے محو خرام تھی۔ اسے تو بار بار جو نکایا گیا ہے
 رستہ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اب بھی اس کے انداز میں خوشی کم اور مجبوری زیادہ ہے۔ آپ بھی عورت ہیں
 بھابھی بیگم! ایک مجبور اور دکھی عورت کا درد سمجھنے کی کوشش کریں۔ کم از کم لفظوں کے استعمال میں تو کچھ احتیاط
 کریں۔ اسے دوسری مرتبہ دلہن کے روپ میں دیکھنے کے لیے آپ کا صاحبزادہ ہی بے قرار ہے اس نے تو ایسی کسی
 نوازش کا کبھی اظہار نہیں کیا۔“

فردوس بیگم بھناؤنٹیں نکھراہیں کچھ سنبھل سی گئی۔
 ”میں غلط کہہ رہی ہوں ماہین؟“ ایقان نے تائیدی انداز میں ماہین کو دیکھا۔
 ماہین جزبزی ہوئی۔
 ”تو جتنی تو آپ بھی غلط نہیں ہیں پچھو! اپنا سکہ ہی کھوٹا ہو تو دوسرے سے کیا شکوہ کرنا۔“
 ”اے بے امنہ میں خاک۔ سوچ سمجھ کر بولو۔ میرا بچہ کیوں کھوٹا ہونے لگا۔ بے چارہ بھولا ہے کم عمری میں ہی
 پھنس گیا امی جادو گرئی کی انٹوں میں۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا امی!“ ماہین بے چاری ماں اور پچھو کے درمیان شٹل کاک کی طرح پھنسن گئی
 ”خیرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ شہلا آئی کی طلب ہمارے بھائی کے دل میں جب اس قدر شدید ہے تو ہم شخص
 میں پچھو کی طرف سے کیا کر سکتے۔ وہ تو کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ سمجھانا ہے تو اپنے بھائی کو سمجھا لو۔“
 ”اے ہاں! ہم کسے سمجھائیں گے جب ان کا جادو سر چڑھ کر لو لے گا تو۔“ وہ برزراہیں۔
 ”ہوں! جادو بھابھی جان؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر پوچھی۔ ”اس کو راضی کرنے کے لیے
 ہاشم نہ بولے گا۔ ہوتا تو الگ بات ہے ورنہ وہ تو کسی صورت راضی نہ تھی۔“

”بھابھی! وہ تو بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اپنی قیمت بڑھواتی ہیں۔“ وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔ ”بہر حال ہم تو مجبور
 ہیں۔ ہمارے ہاں تو کمال ہاتھ ہے۔ ہلکا نظر آتا ہے۔ اسے تو کورٹ کچریوں میں بیاد کرنا آسان ہے۔
 ہم کمال ہاتھ ہیں۔ ہمارے ہاں تو کمال ہاتھ ہے۔ ہلکا نظر آتا ہے۔ اسے تو کورٹ کچریوں میں بیاد کرنا آسان ہے۔
 اسے ہمارے نور چشم کو کھینچ لیں۔ ہمارا کالجیہ جلتے تو کس کو پروا ہے یہاں۔ یہاں تو سب ہی
 غائب ہو چکے ہیں۔“

ایقان نے ہاتھ دھو کر باہر نکلیں۔ وہ تو سب کچھ بارے بیٹھی تھیں۔ بس ایک زبانی جنگ تھی جو کہ
 سدا جاری رہنا تھی۔ اس نے تین گے تھے تھے چہرے پر ایک مسکراتی نگاہ کی۔
 ”بھابھی! ہون تو مان گئی ہیں۔“
 ”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”میں اس بے چاری۔“
 ”اور بھابی جان؟“ اس نے بے تالی سے پوچھا۔
 ”اب تو پتہ ہے راضی ہیں۔ ہاشم بھائی انہیں کب کا منا چکے۔“
 ”اور تم؟“ وہ شرارتاً بولی۔
 ”نہیں کون پوچھتا ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”اور ہمارا کیا ہے بھائی خوش تو ہم خوش۔ وہ اپنے گھر کے ہم
 اپنے گھر کے۔“

”پھر کب چلیں رشتے لے کر؟“ اسے فوراً جلدی پر غمی۔
 ”جب آپ کہیں چاہتے ہیں۔“

ہے۔ اس خمار کو جسم سے نکال پھینکنا روح نکال دینے کے مترادف لگتا ہے۔ جذبوں کے الاؤ میں شدت کی تیز
 ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم وعدے اس بھیٹی میں تپ کر ایسی مضبوط صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ انہیں
 توڑ دینا دل کی رگوں کو کاٹ دینے جیسا لگتا ہے۔
 وہ ایسی ہی اذیت میں مبتلا تھی۔ جسم سے روح نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔
 فون مایوس و نامراد ہو کر خاموش ہو چکا تھا۔ عریضہ کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ اٹھ کر بستر جا گری اور
 تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

بیگم کر سائیہ گل میں جنا صبر۔
 ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا۔
 ”جب یہ شعر آتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“
 ”میں کیا جانوں! اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔“
 ”آنسو کہتے ہیں دل سے پوچھو۔“
 عریضہ کے دل سے آنسو گر رہے تھے۔

”اسلام علیکم۔“ بکلی کھلی سی ایقان اندر داخل ہو گئی۔
 ”وعلیکم السلام۔“ فردوس بیگم خفگی سے بولیں۔
 ”کیسی ہیں پچھو؟“ ماہین نے بھی اس خوش و خروش ’مظاہرہ نہ کیا جو وہ عموماً اس کی آمد پر کیا کرتی تھی۔
 ”فرسٹ کلاس۔ تم کیسی ہو۔ میں ڈر رہی تھی کہیں تم چلی ہی نہ گئی ہو۔“
 ”آیا تمہارات کو تسلیم میاں کا فون۔“ فردوس بیگم نے لٹے کی بنا پر مصالحت کا گھونٹ ناچار بھر گئی تھیں اور
 وہ اتنی جلدی کسی کی خطائیں نہ بخشتی تھیں۔
 ”کہتے تھے تیار رہنا“ اپنے آؤں گا۔ دیکھو رات تک پچھو کے۔“
 ”کچھ دن اور رہ جائیں۔“ ایقان محبت سے بولی۔
 ”ارے اس کے سسرالی بڑے ٹھنڈے ہیں۔“ فردوس بیگم ہر بات کا جواب بذات خود بنا ضروری خیال کرتی
 تھیں۔ ”وہ چار دن کو چھوڑ دیا وہی ان کی مہربانی ہے۔“

”ہفتہ بھر تو ہو گیا ہے امی!“ ماہین بولی۔ ”اب مہینہ تو رہنے سے رہی۔ ہن کی مٹی ہی مٹی۔ شادی ہوتی تو باہر
 دو مہری تھی۔ اب ہاشم بھائی کی کہیں بات ٹھہرے تو دیکھیں۔“
 ”ان کی تو مہری ہی سمجھو۔“ فردوس بیگم نے جلتے بھنے انداز میں کہہ کر کن اکھیوں سے ایقان کو دیکھا۔
 ”اس دن تیاریاں نہ دیکھی تھیں تمہارا کی۔ مانو محفل لوٹے آئی تھی۔“
 ایقان قدرے جزبزی ہوئی۔ بھارج کے تیور پہلے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ اس نے ہولے سے کھنکھار
 گلا صاف کیا۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے بغور اس کا سراپا دیکھا۔
 ”جی۔۔۔ اب اچھی ہے۔۔۔“ اس کا ذہن ابھرا تھا۔ بات شروع کرنے کا سراپا تھوڑا آ رہا تھا۔
 ”تمہاری سہیلی تو لگتا ہے جی جان سے تیار بیٹھی ہے۔ دوسری مرتبہ دلہن بننے کو۔ کیوں؟“ انہوں نے زہر
 لہجے میں بات کا آغاز کر کے گویا اس کی مشکل بھی آسان کی تھی۔

”بس تو تیار رہنا شام کو اوھر چلتے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ نیم دلی سے بولی۔

ایقان کا روم روم مسکرا رہا تھا۔ اس کے تصور میں ہاشم کا چمکتا ہوا چہرہ تھا جس کی پر خلوص تمنا کا جھنڈا محبت کے قلعے پر بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔



وہ پانی کا کولر بھر کر کمرے میں لائی۔ فل سائز کا کولر پانی سے بھرا ہوا ہونے کے باعث بے حد وزنی ہو رہا تھا۔ ربیعہ نے اسے بمشکل تمام اٹھا کر میز پر رکھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بار بار یہ بھاری کولر کچن سے کمرے تک لانا دن بھر کا مشکل ترین کام تھا۔

”پانی پلاؤ لڑکی۔“ منور امین بولے تھے۔

ربیعہ زچ ہوئی۔ پانی پانی کی تکرار سے وہ عاجز ہو چلی تھی۔ ان کے اندر نجانے کون سا توردن رات دہکا کر تھا۔ کس احساس کی پیش آن کے جسم و جان کو جلایا کرتی تھی۔ وہ کون سی جھلستی ہوئی سوچ تھی جو ان کے تعاقب میں لگی رہتی تھی ربیعہ سمجھ نہ پاتی۔

وہ بس نگاس بھر بھر کر انہیں دیتی رہتی کولر لمحہ۔ لمحہ خالی ہوتا چلا جاتا۔ گندی بالٹی لفظ بہ لفظ بھرتی جاتی۔ ربیعہ کمرے کے چکر لگا لگا کر تھک جاتی تھی پانی پانی کی تکرار ختم نہ ہوتی تھی ان آنکھوں کی سرخی کم نہ ہوتی لہجے کی گرمی ماحول بڑتی لہجے سوسوں کی پیش برقرار رہتا تھا۔

ربیعہ نے گلا علی بھر کر ان کے رو برو کیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے ایک سانس میں اسے خالی کیا۔ ”شباباش۔“

پھر وہ بولے۔

”تم ایک اچھی لڑکی ہو۔“



ربیعہ کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ اس کے تھے ہوئے احساسات میں سے گویا ایک گرہ کھلی۔ اتنی سخت مشقت کے بعد بھی وہ ان کی سانس سے کس سخت فقرے کی منتظر رہتی تھی۔ وہ بیل میں قلم پل میں ماشہ تھپاں صفت مزاج کے حامل۔ ان کی منظر پر طبیعت ربیعہ کو ہر وقت سبے چین رکھتی تھی۔ گڑھوں میں تیزی سے حرکت کرتی پتلیاں لبوں کے پھڑکتے ہوئے گوشے اور ہمہ وقت تھے ہوئے تھننے ان کے اندر ابلتے لاوے کا پتا دیتے تھے۔ ربیعہ کو کبھی کبھی دھواں اگلنے اس آتش فشاں سے سخت خوف محسوس ہوتا تھا۔ کب وہ کون سا روپ اختیار کریں کوئی گارنٹی نہ تھی۔

”آپ کے لیے چائے بنا لاؤں پیھا جی؟“ ربیعہ کو ایک تعریفی جملہ سرشار کر گیا تھا۔ ترسی ہوئی مٹی بارش کی چند لوندوں سے ہی مہک دے اٹھتی تھی۔

”میرے بہانے تم پینا چاہتی ہو تو بنا لو۔“ وہ بے نیازی سے بولے۔ ”مینا کہتی ہے تم چیزوں کا بے دریغ استعمال کرتی ہو۔“

ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بادل کسی دوسری طرف جانکے تھے۔

”جی مجھے تو طلب نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“ وہ نجانے کیوں خوش ہوئے۔ ”بہت چالاک ہو تم اپنی دلدی کی طرح۔ سازشیں کرنا تمہیں

خوب آتا ہے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“

ربیعہ ہکا بکا ہوئی۔ اس نے بھلا کون سی سازش کی تھی۔ وہ تو اس قدر مجبور تھی کہ وہاں سے نکل بھاگنے کے بھی کوئی سازش نہ سوچ سکتی تھی۔ نکل بھاگنے کا نہ تو کوئی ذریعہ تھا نہ وہ سرا کوئی ٹھکانہ۔ وہ ایسی پرکٹی چڑیا تھی جس کے لیے پیچھے کی سلاخیں معنی نہ رکھتی تھیں۔

”اے ربیعہ!“ ترانہ کی آواز پر وہ چونکی۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور خوف تھی۔

”ادھر آنا زرا۔“

ربیعہ سب کچھ بھول بھال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ترانہ کے انداز میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔

”چلو چھت پر چلیں۔“ ترانہ بولی پھر اسے خیال آیا۔ ”پچھو کہاں ہیں؟“

”مارکیٹ گئی ہیں تصور بھائی کے ساتھ۔“

”میدان صاف ہے گویا۔ اور صولت؟“

”تمہاری ہے۔“

”آجاؤ پھر۔“ وہ جوش بھرے انداز میں بولی۔

ربیعہ بھی تجسس سی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

”میں تمہارے لیے ایک چیز لائی ہوں۔“ اس نے غور سے لٹکانے کے لیے لٹکائی۔ ربیعہ نے لٹکانے

کھول کر دیکھا۔ اس میں یونیورسٹی کا پراسپیکٹس اور فائلز تھیں۔

”ہاں۔“ بے حد خوشی کے عالم میں اس کے لبوں سے نکلا۔

”شام کی کلاسز کے لیے جو سبیکٹس ہیں ان میں سے امیجس سمجھ کر کوئی سلیکٹ کر لو پھر میں تمہارا فارم

کروا دوں گی۔“

”اور پچھو۔“

”اوہ۔۔۔ پہلے داخلہ تو ہو لینے دو باقی بعد میں دیکھی جائے گی۔ پچھو سے ایک مرتبہ معزکہ تو کرنا پڑے گا۔“

اس میں ابھی دیر ہے۔“

ربیعہ خوش خوشی پر امیجس دیکھنے لگی دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو اُڑ آئے۔ ترانہ دلچسپی سے اس

چہرہ دیکھنے لگی۔

”تھینک یو ترانہ!“ وہ ممنون لہجے میں بولی۔

”تھینکس فار واٹ؟ جو کچھ تمہارے لیے کرتی ہو ربیعہ! اس کے شکریے کے اظہار کی یہ انتہائی معمولی

صورت ہے بلکہ اس کے شکریے کا اظہار بھی ناممکن ہے۔ یہ سب کچھ تو تمہارا اپنا حق ہے اور جو کچھ تمہارے

تم کرتی ہو وہ تمہارا احسان۔“

ربیعہ خوش دلی سے مسکرا دی۔

”احسان کیسا ترانہ! اپنی جائے پناہ کا خیال تو ہر کوئی رکھتا ہے۔ تم یہ ہر وقت احسان احسان کی راگنی مت

کرو۔ اچھا اب چائے پلاؤ آج میں تمک گئی ہوں۔“

”ہوں۔“ ترانہ شوخی سے مسکرائی۔ ”آج تو ہرگز چائے نہ پلاؤں گی۔ آج تو چائے پیوں گی تمہاری اس بے

خوشی کی قیمت تو وصول کروں تم سے۔“

ربیعہ اچانک ہی زور سے چونکی۔ سیڑھیوں پر نیلے بالوں کی جھلک معدوم ہوئی تھی۔

”صولت نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

ترانہ نے مڑ کر دیکھا اور کچھ سوچنے لگی۔

”وہ ابھی ابھی گئی ہے۔“ ربیعہ فکر مند ہو رہی تھی۔ ”میں نے خود دیکھا ہے۔“

”ہوں۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری سوچتی ہوگی میں ہی چائے بنا لوں۔ یہ دونوں تو راضی نہیں ہیں۔“

ربیعہ کو زور سے ہنسی آگئی۔

”تمہیں کسی بات سے دُور نہیں لگتا ترانہ؟“

”یہ کہ میری شادی باری سے نہ ہو سکے۔“ ترانہ نے شوخی سے اس کے گل پر چٹکی بھری۔ ”اور تو ایسی کوئی

بات نہیں جس سے میں ڈروں۔“

ربیعہ نے رشک سے اسے دیکھا۔

مینا کے انداز حد درجہ خشک تھے۔ ربیعہ اپنی جگہ پر چور سی بنی ہوئی تھی۔ صبح سے وہ انہیں کئی بار مخاطب کر کے

دیکھ چکی تھی لیکن وہ اپنی خشک مزاجی پر ہنوز مصر تھیں۔

ربیعہ کو ان سے اور ان کی ناراضی سے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔

”جانی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر ہنسا کیں۔

”دیکھنے میں تو بہت معصوم لگتی ہو لیکن ہو کس قدر گھٹنی۔“

”میں نے کیا کیا ہے مانی؟“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بڑی ہی غصے کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ بڑی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

باتوں کی پچھڑی کی۔

”جانی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر ہنسا کیں۔

”دیکھنے میں تو بہت معصوم لگتی ہو لیکن ہو کس قدر گھٹنی۔“

”میں نے کیا کیا ہے مانی؟“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بڑی ہی غصے کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ بڑی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

باتوں کی پچھڑی کی۔

”جانی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر ہنسا کیں۔

”دیکھنے میں تو بہت معصوم لگتی ہو لیکن ہو کس قدر گھٹنی۔“

”میں نے کیا کیا ہے مانی؟“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بڑی ہی غصے کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ بڑی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

باتوں کی پچھڑی کی۔

”جانی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر ہنسا کیں۔

PHOTO

”ڈیزائن؟“

”جی ہاں، قمیصوں کے ڈیزائن۔ ترانہ نے اپنا سوٹ سلنے کو دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، اگر صولت نے دیکھ لیا بھی ویسا ہی ڈیزائن بنوانے کی ضد کرے گی، اسی لیے وہ مجھے چمپ کر دکھا رہی تھی۔“

مینا نے کچھ دیر تک نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹولا۔ ربیعہ نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا کر دانتوں سے نچال لیا تھا۔ اس کے آثار نہ جان بیاہیں۔

”اچھا۔ مجھے وہ ڈیزائن کاغذ پر آواز کرو۔“ پھر وہ بولیں۔ ”میں صولت کو اس سے پہلے وہ ڈیزائن سلوا کر گی۔ وہ سمجھتی کیا ہے۔ چار پیسے زیادہ کمالیتی ہے تو ہم سے بہت اونچی ہو گئی ہے۔ ہم اس کے جیسے کپڑے نہیں بنا سکتے کیا؟“

وہ بڑبڑاتے ہوئے ایک کالی اٹھالا میں۔

”اور دیکھو لڑکی! زیادہ ہوسٹیاں مت دکھانا۔ بالکل ویسا ہی ڈیزائن بناؤ، رتی برابر فرق نہ نکلتے، ورنہ مجھ سے کوئی نہ ہوگا اور ترانہ کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میں کل ہی صولت کو ایسا سوٹ سلوا دوں گی۔“

ربیعہ نے بے حد مشاقی سے ایک خوبصورت گھٹے کا ڈیزائن کالی کے صفحے پر اتار دیا۔ ”خوش ہو گئیں۔“

نے اسے کئی مرتبہ بتایا تھا کہ صولت دو سروپوں کی ہر شے کی حریف بنتی تھی۔ خواہ وہ پیر میں چلی جاتی کیوں نہ ترانہ اس کی اس عادت سے حد درجہ بیزار تھی اور خاص طور پر اس کے کپڑوں کے ڈیزائن اس کو تنگ کر دیتے تھے۔

ربیعہ کے ذہن کے کسی گوشے میں پڑی ہوئی بات کھولنے کے کی مانند خوش قسمتی سے چل گئی تھی۔



”ارے کمینہ۔۔۔ ناشتہ ہی کروادے۔۔۔ میں گھنٹہ بھر سے بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ ایک تہہ کی بات ٹھیک طرح سے جواب نہیں دیتی ہو پھر چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔“

ناعمہ، ثانیہ کی بے توجہی محسوس کر کے سلگ اٹھی تھی۔ ”ممنگنی“ پرومکس کرنے کے لیے وہ عالم اشتیاق میں صبح اٹھ کر بنا کچھ کھائے پیے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ ثانیہ کچن میں مصروف تھی سو وہ بھی وہیں پڑے اسٹوا بیٹھ کر رواں تبصرہ شروع کر چکی تھی لیکن اب اسے خیال آیا تھا کہ اولاً وہ اپنے آپ کو اتنے بے پروا نہیں بنا سکتی۔ ثانیہ نے اس کی کسی قسم کی خاطر مدارت کرنا بھی ضروری خیال نہ کیا تھا۔

کاؤنٹر پر گیلاد سٹر پھیرتی ثانیہ چونکی۔

”اچھا۔ تم ناشتہ بھی کر کے نہیں آئیں۔“ وہ عام سے انداز میں بولی۔ ”ٹشمو، میں بناتی ہوں چائے۔“

”تم بھی تو اکثر بغیر ناشتے کے آجاتی ہو۔“ ناعمہ اس کی بات سے مزید خفا ہو گئی۔ ”ہم بھی تو تمہیں پوچھتے ہیں نہیں۔“

ثانیہ کو ہنسی آگئی۔

”ارے بھئی! تو کہہ دیا ہوتا، میں پہلے ہی کروادیتی ناشتہ تمہیں۔ اتنی دیر سے خواہش جی میں ہی دباؤ بیٹھی اور اطلاعاً عرض ہے محترمہ! کہ میں جب بھی بنا ناشتہ کیے تمہارے ہاں آتی ہوں تو اس بات کا خیال ہمیشہ وارد کرتی ہیں۔ تمہیں کبھی توفیق نہ ہوئی۔“

”اے تمہیں تو کرنا ہی ہے خیال۔“ اس نے دیدے مڑکائے۔ ”ویسے تمہاری عدم توجہی مجھے بہت کھل رہی ہے چاہتا ہے تمہاری گدی پر ایک مکا لگاؤں اور گھر چلی جاؤں۔“

وہ پھر ہنستے ہوئے چائے کا پانی رکھنے لگی تھی۔

”میری گدی پر ہی یہ کرم نوازی کیوں بھیجی؟“

”بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے گدی ہی اکڑتی ہے نا، اس لیے۔“

”میں نے کیا بے نیازی دکھائی ہے؟ مسلسل تو باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ اپنا کام منٹا چکی تھی۔ سو روپے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”بے رنگ باتیں، وہ بھی غائب دماغی سے۔“ جواب یوں دے رہی ہو جیسے کوئی احسان کر رہی ہو، ”ناغہ کافی خفا ہو چکی“

ثانیہ قدرے سنجیدہ ہوئی۔

”ناعمہ، اتم نے کچھ محسوس نہیں کیا، عرشہ کے متعلق؟“

”وہ کیا؟“ وہ چونکی۔ اچانک ہی گفتگو میں دلچسپی در آئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اس نے تعلق سے ناخوش ہے۔“ ثانیہ نے کچن کے دروازے کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”ہائیں۔ اچھا۔۔۔ وہ کیسے؟“ ناعمہ نے اپنا سر اس کے قریب کیا۔ ”ویسے لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ثانیہ نے

”گھوڑا، ہاتھ پائی کی شاں شاں سن کر اس میں تپتی ڈالنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تبصرہ سے بر سوالیہ الفاظ کے بعد یہ تابید کا کیا مقصد؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا جو میں نے لگایا۔“ وہ ٹھیسائی ہو کر بولی۔

”اس لیے کہ ذہن پرے پاس بھی کسی ہی آنکھیں ہیں جیسی تمہارے پاس ہیں۔ تمہاری ذرا گول ہیں، میری لمبی“

”وہ چل کر گویا ہوئی۔

”گول ہوں یا لمبی، آج تمہیں تو ہیں۔ شکر ہے خدا کا۔“ وہ قدرے برا مان کر بولی۔ ”دیکھتے ہیں ہم۔“

”بے کار رویہ۔“ ثانیہ نے چائے چھان کر کپ اس کے سامنے رکھا اور ٹو سٹر میں سلائس ڈالنے لگی۔

”خوفزدانی کر رہی؟“

”میں نے کیا کیا؟“ ثانیہ چو لے پر فراٹنگ بین رکھ کر فریج سے انڈہ نکالنے لگی۔

”اس کی آنکھیں روتی ہوئی تھیں۔“ وہ کہہ کر وقت اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تک نہ جاگ۔

”انڈہ جلد ہی میری چائے کھڑی ہو رہی ہے۔“

”بے پروا۔“ وہ کہہ رہی تھی کہ مشنگی کے دن تو

”کیا اس نے اتنی اداس نہیں ہوئیں۔“

ثانیہ نے انداز میں اس کے سامنے رکھا اور اپنا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

”لیکن وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔“ ثانیہ بولی۔ ”کیا اسے نافع بھائی پسند نہیں؟“

”کس کو پسند ہو سکتے ہیں؟“ ناعمہ نے قہقہہ لگایا۔ ”ہاؤ لے سے۔“ ثانیہ اسے کھورنے لگی۔

”کیا مطلب، کوئی برائی ہے میرے بھائی میں؟“

”نہیں۔“ وہ منہ چلا تے ہوئے بولی۔ ”برائی تو نہیں ہے کوئی بھی، بس وہ لڑکیوں کی دماغوں میں وہ خناس ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں جسے۔۔۔ نینٹسی۔۔۔ وہ نہیں کری ایٹ ہو پائی۔ اسے اسی کا دکھ ہوگا۔“

ثانیہ کا کپ لبوں تک جاتے جاتے رک گیا۔ وہ تھیر سے اسے دیکھنے لگی۔

”ارے واہ! یہ بات تم نے کہی ہے؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ منہ چلا تے رہی۔ ”میں نے ہی کہی ہے، میں ہی تو ہوں یہاں۔“

”یقین نہیں آتا۔“ اس نے کتاب بند کر کے ہاشم سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے انہی میں سر ہلایا۔

”مجھے خود نہیں آتا۔“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”یار ہاشم! عشق تو کر رہا ہے اور خوشبو مجھ سے بھوٹنے لگی ہے۔ یہ

ایسا جڑا ہے؟“ ہاشم خالی الذہن سے اسے تکتا رہا۔ رافع اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ کاسی

پھولوں سے لدی ہوئی تیل اس کے سامنے جھونکے لگی۔

”میں تیرے عشق کے جذبے سے متاثر ہو گیا یہ سچ ہے ہاشم! مجھے تجھ پر رشک آنے لگا۔ تیری آنکھوں سے

پھونکتی وہ مقناطیسی روشنی مجھے سنسزائز کرنے لگی۔ ٹھیک ہے لیکن یہ سب کیا ہے؟ میں یہ سب کچھ

نیسے لکھنے لگا؟ ایک۔ ایک۔ ایک۔ ان جانی خوشبو ہے ہاشم! جو مجھے کھینچتی ہے۔ میرا ہاتھ تھام کر اس میں گم دیتی ہے۔

میرے دماغ کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ مجھ میں جذبے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ میں ان جذبات کو نہیں پہچانتا۔ میں

نے اب سے پیشتر انہیں کبھی محسوس نہیں کیا۔ بس لگتا ہے خوشبو ہی خوشبو ہے۔ میرے اندر۔ میرے باہر۔

ان جذبات میں محض خوشبو کا نام دے سکتا ہوں۔ ان سے میری بس اتنی ہی شناسائی ہے جتنی کسی انجانی مگر مسکور

کرلی ہوئی خوشبو سے ہو سکتی ہے۔ یہ خوشبو مجھے مغلوب کر ڈالتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لکھتا چلا

اٹتا ہوں۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ اس نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔ ”میرا جی چاہتا ہے میں ان احساسات کو کھینچ کر خود

علاج دے دوں۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”تیرے اندر اس قدر رافع تک پہنچا اور اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔ کچھ دیر وہ

اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”رافع! میں تجھے مزاجا سیر کھاتا تھا۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

”میں نے اس کی طرف سے ایک مسکراہٹ دیکھی۔“ ہاشم نے اس کی بات سن کر اسے تکتا رہا تھا۔

پھر اس کا چلتا ہوا منہ رکا وہ اسے گھورنے لگی۔

”کیا مطلب میں اتنا بھی نہیں سوچ سکتی۔ تم آخر مجھے کتابیہ وقوف کر دانتی ہو؟“

”بہت زبردست بات کسی تم نے۔“ ثانیہ ہنوز سوچ میں تھی۔ ”یہی ہوا ہے۔ لڑکیاں منگیتر کے نام پر کوئی

چاہتی ہیں جسے کسی نے پہلے نہ دیکھا ہو جو ایسا ہو کہ بس پھر سب ہی اسی کو دیکھیں۔ واہ واہ ہو۔ لڑکے کی مہینوں

قصیدہ خوانی ہوتی رہے لڑکی کی قسمت پر سالوں رشک کیا جائے۔ میرا معصوم سا بھائی ابھی اپنی عمر کے حساب سے

سیدھا سا ادا ہے۔“

”مسخو بے مسخو۔“ ناعملہ نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

”ثانیہ نے پھر اسے بری طرح گھورا۔

”میں کچھ دے ماروں گی۔ تمہارے سر پر۔“ اس کا تھل جواب دے گیا۔ ”کیوں ہونے لگا میرا بھائی مسخو؟“

”نذاق تو سب ہی لڑکے کرتے ہیں اس عمر میں۔“

”اچھا۔ دیکھو۔“ ناعملہ نے کام پینا کر دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھا۔ ”فرض کرو تمہاری نسبت علی سے

کردی جائے۔“

”کیا؟“ وہ بھڑکی۔ ”یہ کیا فضول بات کی تم نے؟“

”اگر ایسا ہو جائے تو کیسا ہے خوش ہوگی تم؟“

”نہم کر لو نا اس جو کرے میرا نام کیوں لے رہی ہو۔“

ناعملہ نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

”دوسروں کے بھائی جو کر رہے ہیں اور تمہارا بہت دینا شک اور شائستگی کیوں؟ اسے کوئی مسخو نہیں کہہ سکتا۔“

”تھیلی کے تو ہیں سارے۔“

”لیکن علی؟“ ثانیہ کو تصور سے ہی الجھن ہوئی۔ ”نہیں۔“

”تب ہی تو وہ بے چاری رو رہی تھی۔“ ناعملہ نے آدھ بھری۔

PIOTO

میری چادر گرے ترے بن میرا ہر خواب بے رنگ بے ثمر

میری ہر نگاہ بے سمت ہے میرا ہر نغمہ بے سحر

میری شام کا ہر ایک رنگ ہاں چلا لیا ترے سنگ سنگ

یہاں رہ گئے ترے منتظر یہ اجاڑ اجاڑ سے باجم و در

مرے ہر زخم کا علاج تو مری ہر خوشی میں شریک تو

تو ہی رہنما تو ہی راستہ تو ہی رہ گزر تو ہی ہم سفر

جو نہیں ہے تو تو تیری قسم یہاں کوئی دل سے نہیں مرا

مری ہم قدم میرے ساتھ آ کہ ویران ہے مری رہ گزر

ہاشم پریشانی سے صحنے پر ابھری تحریر دیکھتا رہا پھر اس نے نگاہوں میں تحریر اور الجھن بھر کر اس کی سمت دیکھا

”یار رافع! ایسے یہ تو نے لکھی ہے؟“

”انگلیوں میں پکڑ۔“ بال پوائنٹ کی نوک منہ میں لیے رافع نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا پھر وہ ہنس پڑا

دکھ بیاں کر دیکھ لے جو یقین نہ ہو تو۔“

”ہاں۔ ڈونٹ ٹیل می۔“ وہ استہزائیہ ہنس دیا۔ ”میں بندر بننا چاہتا ہوں۔ میں عافیت چاہتا ہوں۔“

”میرے پیارے!“ ہاشم مزے سے پیر پھیلنا کر بیٹھ گیا۔ ”مرزا غالب بڑے کام کی باتیں بتا گئے ہیں۔“

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
راجہ کچھ سوچے لگا تھا۔ اور ہاشم کے لبوں پر مسکان تھی۔

وہ دروازے کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ ایسا اس نے دانستہ کیا تھا کیونکہ وہ ترانہ کے لائے ہوئے پر اسے کھینچ کر رکھ رہی تھی۔ یہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے کسی بھی فرد کی نگاہ اس پر پڑے۔

وہ بے حد دلچسپی اور جستجو سے صفحات پلٹ رہی تھی۔ جب اسے اپنی پشت پر لباس بدلنے کے لیے اٹھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ربیعہ نے جھٹ پراپیکٹس تکیے کے نیچے سرکا دیا۔ تکیے کے سر ایک گھریلو قسم کے برتن رکھا ہوا اس صفحات پلٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہونے والے شخص کے متوجہ قیاس کر رہی تھی۔ کچھ دیر گزر گئی تو اس نے اپنی آبد کو شاید خفیہ رکھنا چاہا تھا۔ ربیعہ کو اس کی آبد کی طرف سے پلٹ کر دیکھا تو تصور بننے لگا۔

”تمہیں پتا چل گیا تھا نا کہ میں آیا ہوں۔۔۔ لیکن تم بن ہی نہیں رہے تھے۔“

ربیعہ کو کوفت بھری انھوں نے آکھیرا۔ اس کھر کے سب ہی کیلین ایک خاص طرز فکر کے حامل تھے۔
رانہ کے ترانہ کو کچھ اس کی تعلیم نے اور کچھ اس کی جاودا اثر محبت نے یکسر تبدیل کر دیا تھا۔

وہ سرے گفتگو میں اس نے مہذب انداز میں تمنا کرنے کی خواہش ظاہر کیا تھا۔ تصور وہیں صوفی پر

”میں تمہیں کوئی کام تو نہیں بتا رہا بیٹھا ہوں بس۔“

دوسرا کمرہ لڑکوں کے نام تھا۔ تصور اور تھانوی ان میں بہت کچھ موجود تھا۔ تہ تیغ الحیات اور تہ کوہِ ناز کے

نہ کر گئے۔ تیسرا کمرہ ترانہ، صولت اور مینا استعمال کرتی تھیں۔ سوا ب ربیعہ بھی ان کی چوتھی روم میٹ بن

ریحہ کا جی چاہا کہ وہ تصور کو صاف طور پر دیکھ کر اس کے لیے کہے لیکن وہ بے حد مصلحت پسند تھا۔ ہر معاملے میں وہ وہاں تک جھک سکتی تھی جہاں تک جھک جانا اس کے اختیار میں ہوتا تھا۔

”اچھا۔۔۔ اپنی سیمیں نہیں چلی جاتی ہوں۔“ وہ آرام سے کہتے ہوئے اٹھنے لگی۔
 ”میں کیا تمہیں کاٹ رہا ہوں۔“ وہ تنک کر بولا۔

”میں کچھ دیر سکون سے رہنا چاہتی ہوں تصور بمبائی! ایسا محض تنہائی میں ہی ممکن ہے ورنہ مجھے آپ کے

(52)

بات کی خبر نہیں ہے۔

صولت پتھر کی ہو گئی۔ ترانہ نے اس کے بال چھوڑ دیے تھے لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے غصہ کا فور ہو چکا تھا۔

”اگر پتھرو نے مجھ سے یا ربیعہ سے اس واقعہ کے متعلق کوئی استفسار کیا تو یاد رکھنا۔“ ترانہ نے دھمکی لہجے میں کہا تھا۔ ”میں انہیں سب کچھ بتاؤں گی۔“

صولت بے حد تیزی سے کچن سے باہر نکل گئی۔ ترانہ نے جیسے کسی بھرے ہوئے غبارے کو سوئی لگا دی تھی۔ ربیعہ کی پلکوں پر اشک چمکنے لگے۔ ترانہ نے اسے خود سے لگا لیا۔

”یہ پتھر تمہیں مارنا چاہیے تھا ربیعہ۔“ وہ ہولے سے بولی۔ ”اپنے حقوق ہمیشہ اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ ربیعہ خاموش کھڑی آسوی پتی رہی۔ اسے کسی کے سامنے رونا بہت مشکل لگتا تھا۔

”جیسے دیکھو ربیعہ! ذرا صولت جیسی ہو گئی ہے۔“ ترانہ آہستگی سے بولی۔ مسلسل ابلی ہوئی کالی چائے دیکھ کر ربیعہ کو ہنسی آگئی۔

شہلا ایک دم ہی پریشان ہو گئی تھی۔ ہال کا منظر اس کے لیے عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ وہ اپنی ڈھولی پر کر کے ابھی ابھی لولی تھی۔ اپنی سفید آئینہ سے اتر کر وہ اپنے خیالی کے عالم میں تین سیڑھیاں چڑھ کر۔

سی لاؤنچ میں داخل ہوئی تھی اور پھر دروازے میں ہی پتھر گئی تھی۔ اندر بڑے بڑے میزوں صوفوں پر محفل بھی ہوئی تھی۔

سامنے ہی ایقان بیٹھی کھلکھلا رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو اور عمر بیٹھے ایک دوسرے کے کانوں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

ایقان کے دائیں جانب پڑے ہوئے دو صوفوں پر ماہین اور منیزہ بیگم براجمان تھیں۔ وہ دونوں بھی کسی دلچسپ بات پر مسکرا رہی تھیں۔ انیقہ سینئر نیبل کے پاس فلور کشن رکھے بیٹھی تھی اور کپوں میں چائے اندل رہی تھی۔

اس خوش رنگ ماحول کو دیکھ کر بے ساختہ ہی اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

”اگر گزرتی تھی۔ سو فیصد وہ اس کے لیے ہاسم کا باضابطہ پروپوزل کے کر آئی تھی۔ ماہین غاس کے ہمرہ ہونا بات پر صاد تھا۔

شہلا نے اپنی ہتھیلیوں پر نمی اترتے ہوئے محسوس کی۔ اسے اس ماحول کا حصہ بننے کے خیال سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کیسا عجیب موڑ تھا زندگی کا۔ اس کی شادی بھی ہوئی تھی، اولاد بھی اور پھر طلاق بھی ہوئی۔ لیکن اس وقت وہ نو عمر لڑکیوں کی سی گھبراہٹ اور شرم کا شکار بھی کیونکہ زندگی میں کبھی اس طرح کا موقع آیا ہی نہ تھا۔

”بیٹھی تھی اس لیے شہلا سب سے پہلے اسی کی نظر پڑی۔“ وہ وہاں چوروں کی طرح کھڑی ہیں۔ ”ایقان چونکہ متانہ بیٹھی تھی اس لیے شہلا سب سے پہلے اسی کی نظر پڑی۔“ وہ وہاں چوروں کی طرح کھڑی ہیں۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شہلا من من بھر کے قدم اٹھاتی وہاں تک بیٹھی آواز میں سلام کیا۔ ”وعلیکم السلام۔“ ایقان نے اسے ساتھ لگا لیا۔ ”ہم کب سے آپ کے منتظر ہیں ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو اب مریضوں سے فرصت نہیں۔ کچھ مریض محبت کا بھی خیال کیجئے۔“

آخری جملہ اس نے سرگوشی میں اس کے کان میں کہا تھا۔ شہلا نے خفگی سے اسے گھورا۔ اس نے فوراً ”بابا

نتوں تلے دبائی۔

”تم نہیں سدھرو گی۔“ شہلا اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”میرا میاں بھی یہی کہتا ہے۔“ وہ مزے سے بولی۔

شہلا کی نگاہ خاموش بیٹھی ماہین پر پڑی۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ماہین کی جوابی مسکراہٹ میں رسمی انداز تھا۔

”جی نہیں۔“ ایقان نے اسے ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ”کوئی اجازت و اجازت نہیں ملے گی یہاں سے

نکلنے کی اور ان کپڑوں میں بھی ٹھیک ہی لگ رہی ہو۔“ پھر اس نے رک کر مومن اور عمر کو دیکھا۔ ایمان کو وہ عذرا بیگم کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

”بیٹا۔۔۔ آپ لوگ باہر کیوں نہیں کھینچتے؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”دو دنوں جیسے تیار ہی نہیں تھے۔ کھانکھلا تے ہوئے باہر کی سمت ہو لیے۔

دشمن ابلی!“ منیزہ بیگم بے حد حساب خوش نظر آئی تھیں۔ ”یہ لوگ تمہارے لیے پروپونل لائی ہیں۔ ماہین کے بڑے بھائی اور ایقان کے چھوٹے بھائی صاحب کا۔ آپ تو جانتی ہی ہوں گی انہیں۔ برسوں سے آئی جاتی ہیں

”جی ای۔۔۔ ساری خود اعتمادی ہوا ہو رہی تھی۔ وہ بے حد خفت کا شکار تھی۔

”بیٹا۔۔۔ فلاں ہے ایسے فیصلے یوں اچانک تو ہو نہیں سکتے۔ تمہیں بھی سوچنے کو کچھ وقت درکار ہو گا لیکن انیقہ

میں۔۔۔ ہم دونوں تو مستحق تنظیم ہیں کہ ہماری جانب سے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ اٹھے گا۔ باقی تمہاری رائے

”ایقان نے شوخی سے ہنس کر کہا۔ ”جی کیا کہتی ہو؟“

”ہاں بولونا۔“

”میں آئی ہوں۔“ وہ ایقان کی طرف اشارہ کرتی ہوئی اندر کی سمت بڑھ گئی۔

”ایقان نے کافی کامک سائیڈ نیبل پر رکھ کر محبت سے اس کے سوجے ہوئے پونوں کو دیکھا پھر وہ اس کے

”ہوں۔“ شہلا نے کتاب پر سے نگاہ نہ اٹھائی تھی۔

”ادھر دیکھیں میری طرف۔“ وہ شرارتاً ”مسکرائی۔

شہلا نے گہری سانس بھرتے ہوئے کتاب بند کر دی اور سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھنے لگی۔

”ایقان نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”یہ گولڈن چانس ہے آئی! اسے من نہ کریں! تقدیر نے آپ کو آپ کی سابقہ خطائیں معاف ہو جائے سنگل دیا ہے۔ ریاضت کا صلہ مل رہا ہے۔ فوراً سے پیشتر ہاتھ بڑھا دیں۔“
شملہ نے نظریں چرائیں۔

”ہر طرح کی الجھنوں سے چھٹکارا مل جائے گا آپ کو۔ مجھے آپ کی راہوں میں دور تک گلاب بیچے دکھائی دے ہیں۔“

”ہنس پٹکی!“ شملہ نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”راہ تو بس وہیں تک نظر آتی ہے جہاں پر قدم ہوتے ہیں۔ گز آگے کیا ہے گولی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم نے دور دور تک سنب دیکھ لیا۔“
”کیا! اگمان تو اچھا رکھنا چاہیے نا۔“ وہ سانسیت سے بولی۔ ”تمنا کے گلزار میں ہمیشہ خوش رنگ پھولوں کا ہونا چاہیے یہی جینے کی اساس ہے۔“

”تمنا کا گلزار!“ وہ اداس ہو گئی۔ ”تمنا کا گلزار تو صحرا کا نخلستان ہے پٹکی! اس کی حد سے پرے دور دور جھلکتا ہوا ریگ زار۔ تمنا کا گلزار وہم ہے دھوکہ ہے۔ حقیقت ریگزار تمنا کی طرح اچانک منہ کے سامنے ہے۔ پھول پتے پودے پانی سب سراب ٹھہرتا ہے اور انسان عمر بھر اسی سراب کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ یہی سزا سنانی ہے سب کو۔“

”او فوہ!“ اس نے شملہ کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ ”اتنی جتنا باتیں کر رہی ہے تمنا تو ہے۔“
انسان جینے کا ارادہ ہی ترک کر دے۔ گلزار تمنا جینے کا ہے۔ ”تمنا تو ہے۔“
”ایسا ہے تو پھر ریگزار تمنا زندگی ہے۔“

”قنوطیت کی انتہا۔“ انیس نے اسے بری طرح گھورا اور ایک ٹون بدل دی۔
”تو محترمہ شملہ محسن علی صاحبہ! قدرت اس ریگزار سے باحفاظت گزرنے کے لیے آپ کو ایک عدد ٹکڑا اور نہ فراہم کر رہی ہے۔ میرا اشارہ جناب ہاشم فاروق حسن کی جانب سے ہے۔ انیس نے آپ کو منظور ہے؟“
شملہ نم پکوں کے ساتھ اچانک ہی ہنس دی۔ اس کی شیں بے ساختہ گور شفاف گئی ہر دم اور اندیشہ سہاگ۔ انیس نے اسے ہنسا دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”انیس!“ شملہ ایک سنجیدہ دہنی۔ ”تم بہت سمجھ دار بچہ ہے اور اب تو وہ اپنے باپ سے بھی مل چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے ذہن کو متاثر کر سکتا ہے۔“
”جناب! عمر سے زیادہ سمجھ دار ہاشم فاروق حسن ہیں جو ان کے متاثر کر سکتا ہے۔“
”کیجئے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر ان کے قریب ہو چکا ہے اور مجھے اکثر ان کی باتیں بتاتا ہے۔ مجھے یقین ہے عمر اس نے رشتہ کو ذیل و جان سے قبول کر لے گا بشرطیکہ۔“

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ شملہ نے اس کی جانب دیکھا۔
”بشرطیکہ۔“ کہیں ”سے گڑ بڑ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔“
”اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے۔“ شملہ نے سر جھٹکا لیا۔
انیس کی آنکھوں میں ایک فیصلہ کن سوچ ابھری تھی۔

وہ مڑ کر دوبارہ کچن میں گھس گئی۔ فردوس بیگم نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
”لو کی! میں کہتی ہوں علی کو جگا دو۔ اس نے کہا تھا گیارہ بجے جگانے کے لیے۔“
”جگا دیتی ہوں۔“ وہ ہیزاری سے بولی اور دروازے کی جانب پشت کھڑی رہی۔
”ارے۔“ وہ متعجب ہوئیں۔

اسی لمحے دروازے میں نافع نمودار ہوا تھا۔
”السلام و علیکم تائی امی!“ وہ کچھ جھینپا جھینپا دکھائی دیتا تھا۔
فردوس بیگم کے تاثرات آن واحد میں تبدیل ہوئے تھے۔ وہ ماتھے کی سلو میں چھپا کر مسکرا نے لگیں۔
”علیکم السلام ہر خوردا۔ جیتے رہو۔ خیر ہے ہو۔“

”جی۔“ اس نے بے ہوشی پر بے خبر نگاہ کی۔ ”علی اور حمزہ کہاں ہیں تائی امی! ہمیں یونیورسٹی جانا تھا۔“
”کب سے تو کہہ رہی ہوں اس لڑکی کو! انہیں جگا دے جگا دے۔ سستی ہی نہیں ہے۔“ وہ ہیزاری سے بولیں پھر لخت انہیں کچھ خیال آیا۔ ”اے ہاں! بے چاری مصروف بھی تو ہے صبح سے۔ میرے ساتھ لگی ہوئی ہے لڑکے ہی بڑے ڈھیٹ ہیں! اٹھ کر نہیں دیتے جاؤ بیٹا! تم خود ہی جگا لو انہیں! اوپر اپنے کمرے میں۔“

”جی۔“ غائب ہوا۔
فردوس بیگم نے اس کا پتھر پلا چہرہ غور دیکھا مگر پھر انجان بن کر کینٹ میں ہاتھ مارنے لگیں۔

بڑے بڑے شیشے کے بعد نمبر کھو جاتا تھا۔ وہ شملہ سے بھی پوچھ سکتی تھی لیکن وہ یہ کام بہت خفیہ طور پر انجام دیتا تھا۔
”دو دو صرف! جناب جان! قتل سننے لگی۔“
”ہیلو۔“ ریچھو اڑنے لگا تھا۔ ”انداز میں بلا کا اشتیاق تھا۔ غالباً“ اس نے سی ایل آئی پر آنے والی ٹان کا نمبر غور دیکھا تھا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔
”انیس!“ شملہ نے کہا۔

PHOTO

گلاب دور کے باہر نافع کھڑا نظر آ رہا تھا۔ کچن سے نکلتی عریضہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر اس کے اندر سخت ناپسندیدگی کی ایک لہر اٹھی تھی۔

ریمو کے متوازی ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی عوامی شدید بیماری کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی نے ٹنک میں درجہ کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شباب بہت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جیسے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیس اس کی پچھون میں ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں سیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو ملاقات ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے کی باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا اسٹیم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قلعی آمادہ نہیں۔ ریمو اپنی تنہائی اور لوگوں کے ہلنے پھرنے سے تنگ آ کر اپنی پچھون کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ رٹن میں ریمو کے ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ریمو تنہا سفر کر رہی ہے۔ وہ از خود اس کی پچھون کے گھر تک رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ ماسٹر (ایقان کاشوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا لگاڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

پتلا سون قسط

انیقہ سوچ میں پڑنی تھی۔ ابراہن کی اس قدر خوشی کی وجہ اسے سمجھ میں نہ آ سکی۔ برسوں سے ٹٹے والے رشتے کے بد اثرات سے بادلوں کی طرح ان کے گھر کی خوشیوں کی خوشبو بھی گزرتی رہی تھی۔ ان کا رستہ روکے کفر سے تھا۔ گمان غالب تھا کہ وہ سری جانب بھی اس حادثے کا اثر نہیں سکتی۔ وہ گزندہ ہو سکتا تھا، پھر اس بے طرح خوش دلی کی کیا وجہ تھی وہ چند لمحوں کے لیے سوچتی رہ گئی۔

”ہیلو“ وہ اسے خاموش پاکر پکارا اٹھا۔ ”نکی! کہو تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ کیا بات ہے ایسی جو تمہیں سمجھ نہ آئے۔“

انے کئی بار فون پر اس کی بد تمیزی سے واسطہ پڑ چکا تھا، سو وہ بہت جلدی کر رہا تھا۔

”جی ہاں! بات ہی کچھ ایسی ہے جو مجھے خود پر جبر کرنا پڑا۔“ اس نے صاف کوئی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ ”ورنہ میں آپ کی آواز سننے کی روادار نہ تھی۔ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول جاتا ہے۔ معاف کر دیتا ہے لیکن اپنے پیاروں کا دکھ دیکھنا اور دکھ پہنچانے والے کو معاف کرنا ناممکن امر لگتا ہے۔ میں اپنی باری بہن کی آنکھوں میں پچھلے پانچ سالوں سے مسلسل آنسو دیکھ رہی ہوں۔“

عرصہ تھا جب ہر لڑکی صرف اور صرف مسکراتا جانتی ہے اور ہر موسم مسکراہٹ کے پھول اس کے حائر حق کی طرح اس کی گود میں ڈال کر گزرتا ہے۔ ہر موسم بہار کا موسم لگتا ہے۔ آپ نے اس کی زندگی کو خزاں کا گھن لگا دیا۔ جینا بھول گئی، مسکراتا بھول گئی۔

”تم بھی کچھ بھول رہی ہو نکی!“ وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔ ”بن باس اگر اس نے کاٹا ہے تو یہ سزا میں نے بھی اتنی ہی بھگتی ہے جتنی اس نے۔ اس کے پاس میرا بیٹا تھا، میرے پاس کیا تھا؟ اس کے پاس ”سچ“ ہونے کا غرور تھا، میرے حصے میں ندامت اور پشیمانی کے انگارے آئے تھے۔ انسان حق پر ہو تو سولی بھی سکون سے چڑھ جاتا ہے۔ ظلم و زیادتی کا احساس انسان کو نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ میں نے ایک ایک لمحہ اس کرب ناک سوچ کا شکار نہ کر گزارا ہے نکی! کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا جو کچھ بد نفسی سے ہو گزرا وہ میری کوئی سوچی سمجھی سازش نہ تھی، اس کے نازک جذبوں کا خون ہوا تو بخدا یہ قتل عمد نہ تھا۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ میری سیاہ نفسی تھی۔ ابراہن کی ٹھنڈی نرم پھوار سے رگ جال سیراب نہ ہو پائی تھی اور میری بد قسمتی نے ہاتھ

”میں بھی کچھ بھول رہی ہو نکی!“ وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔ ”بن باس اگر اس نے کاٹا ہے تو یہ سزا میں نے بھی اتنی ہی بھگتی ہے جتنی اس نے۔ اس کے پاس میرا بیٹا تھا، میرے پاس کیا تھا؟ اس کے پاس ”سچ“ ہونے کا غرور تھا، میرے حصے میں ندامت اور پشیمانی کے انگارے آئے تھے۔ انسان حق پر ہو تو سولی بھی سکون سے چڑھ جاتا ہے۔ ظلم و زیادتی کا احساس انسان کو نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ میں نے ایک ایک لمحہ اس کرب ناک سوچ کا شکار نہ کر گزارا ہے نکی! کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا جو کچھ بد نفسی سے ہو گزرا وہ میری کوئی سوچی سمجھی سازش نہ تھی، اس کے نازک جذبوں کا خون ہوا تو بخدا یہ قتل عمد نہ تھا۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ میری سیاہ نفسی تھی۔ ابراہن کی ٹھنڈی نرم پھوار سے رگ جال سیراب نہ ہو پائی تھی اور میری بد قسمتی نے ہاتھ

انیقہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ جیسے جو کچھ اس کے ذہن میں تھا۔ اس پر جی ہی جی میں غور ہو پھر اس نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا۔
 ”ابرا بھائی! ہم لوگ اپنا کی شادی کر رہے ہیں۔“
 ”کیا؟“ وہ ایسے بولا جیسے ٹھیک طور پر سنا نہ ہو پھر کاٹیک ہی بجانے کیا سوچ کر وہ دفعاً خوشی سے بولا۔
 ”واقعی؟“

انیقہ کو اس کی ذہنی کیفیت پر تعجب ہوا۔
 ”ہم۔ ہم لوگوں نے اپنا کارشتہ طے کر دیا ہے۔“ وہ پھر جتانے والے انداز میں بولی۔ مبادا ابرار نے۔
 ”کچھ ہی عرصے میں باقاعدہ رخصتی عمل میں آجائے گی۔“
 ”شہلا مان گئی؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
 ”جی۔ جی ہاں، مشکلوں سے سہی، لیکن مان گئی ہیں۔“ انیقہ اب تک اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ پر کنفیوژ ہو رہی تھی۔

”اچھا!“ وہ ٹھنڈے اور ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ”یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔“
 ”آپ۔ آپ کے اعتراض سے ہرچند کہ کوئی فرق تو نہیں پڑتا لیکن میں یونہی ایک غلط غرض سے پوچھ رہی ہوں۔ آپ کو اپنا کی نئی زندگی شروع کرنے کا کیا اعتراض ہے؟“ ابرار ہلکے

جیسے اسے انیقہ سے اس بے وقوفی کی امید نہ ہو۔
 ”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
 ”آپ عمر کی کسٹڈی کا دعوت تو نہیں کر دیں گے؟“ وہ جیسے ڈرتے ڈرتے بولی۔
 ”وہ چند لمحے اس کی کیفیت سے مفلوظ ہوا۔
 ”اگر کروں تو؟“

”پلیز ابرا بھائی!“ وہ لجاجت سے بولی۔ ”میں نے دراصل یہی بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ یہی اصل تھا جس کے لیے۔“
 ”تم نے خود پر جبر کیا تھا۔“ وہ بات کاٹ کر ہلکے سے ہنسا۔
 ”میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے ایسا کہہ کر آپ کے دل پر جو اثر کیا ہے۔ میرے دل میں آپ کے خلاف غم و غصے کے جو کثیف صفائی میں کہا، اس نے مجھے بھی بے حد متاثر کیا ہے۔“
 ”تھے وہ آپ کے اعتراف سے جیسے چھٹ سے گئے ہیں۔ لیکن پلیز ابرا بھائی! میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتی ہوں کہ اب میری بہن کو زندگی کی حقیقی خوشیوں کا لطف اٹھالینے دیجئے۔ اس کے بن باس پر رحم کھائیں۔ اگر وہ آپ اپنے لیے پریشیاں ہیں تو اب اسے ایک اچھی اور مکمل زندگی کی شروعات کی دعا دیجئے۔ عمر میں اپنا کی جان ہے۔ وہ اس کے ہونے سے ہیں، اس کی سانسوں سے جیتی ہیں، اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اگر آپ کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی کا سوچا بھی تو میری بہن اس خیال سے ہی مر جائے گی۔“ بولتے بولتے اس کا سنا پھول گیا۔ الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے۔ آنسو زبان بننے پر آمادہ ہوئے۔
 ”تم فکر مت کرو کی!“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”میں ایسا کچھ نہیں کروں گا جیسا تم سوچتی ہو۔ شہلا کو نئی زندگی شروعات مبارک ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی غصہ نہیں ہے۔“
 ”اور۔ اور۔ عمو۔“ وہ اٹکنے لگی۔

میں اتنا بھی کمینہ نہیں کہ میں ایک ماں سے اس کے جینے کی امید چھین لوں۔“
 ”اوہ!“ انیقہ نے سکون کا سانس لیا۔
 ”اس سانس میں ابرا کی قوت کے احساس کا اعتراف تھا۔ وہ مسکرا دیا۔
 ”پوچھ سکتا ہوں کس کے نصیب جاگے ہیں؟“
 ”ہمارے دیرینہ ہمسائے ہیں۔ بہت عرصے سے اپنا کے طلب گار ہیں۔ خدا خدا کر کے اب اپنا کو ان پر ترس ہے۔ ورنہ اب تک تو وہ باہمی ہی نہ بھرتی تھیں۔“ وہ ہلکی پھلکی ہو کر اب سکون سے بول رہی تھی۔
 ”ابرا کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ بجی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆
 ”السلام علیکم ممانی جان۔“ ناعمہ خوش خوش اندر داخل ہوئی۔
 ”فردوس بیگم بیوی پروگرام میں محو تھیں۔ چونک اٹھیں۔ ریموٹ سے آواز ہلکی کی۔
 ”و علیکم السلام۔“ انہوں نے حسب عادت گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ ”کہاں سے دوڑی بھاگی آ رہی ہو۔“
 ”جی ہاں! سب خیریت۔ اللہ کا احسان ہے۔ عریشہ کہاں ہے؟“
 ”اپنے کمرے میں ہے۔“ انہیں قدرے تامل ہوا۔ ”بلکہ شاید سو ہی گئی ہو۔“
 ”اچھا!“ ناعمہ وحیرت ہوئی۔ ”اس قدر جلد تو وہ کبھی نہیں سوتی؟“
 ”ماں بی! اہم جوہر ہے۔“ وہ اطمینان بھرے غصے سے بولیں تو وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔
 ”نہیں۔ نہیں ماں۔“ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی۔
 ”نہیں دن۔“ گئے ہیں اب نے ایک۔“ تک نہیں لگایا ہمارے گھر۔“ منگنی کو مایوں سمجھ بیٹھی وہ توم۔ مہ۔ میں دیکھ

میں اس نے۔ میں۔“ جانے جاگ رہی ہو۔“
 ”مرضی ہے مہارن۔“ انہوں نے ریموٹ سے آواز پھر اونچی کر دی۔ گویا اسے اذن خصت عطا ہوا۔
 ”اب دیکھو۔“ وہ بولی تو تھی الم عریشہ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ باہر نکل رہی تھی۔ ناعمہ سے نگاہیں گرا آئیں تو وہ ہلک سی لٹی اس کی آنکھیں متورم تھیں۔
 ”ناعمہ ایک قدم آگے بڑھی۔
 ”کیسی ہو عریشہ؟“
 ”ٹھیک ہوں!“ وہ بے رخی سے کہہ کر فریج کی سمت بڑھ گئی۔
 ”ناعمہ اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔
 ”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“
 ”نہیں۔“ اس نے ٹھنڈی بوتل نکال کر فریج بند کیا اور واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ناعمہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ اس سلوک کا تو اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ پھر وہ تیز قدموں سے اس کے پیچھے چل دی۔ عریشہ کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اسے اپنے پیچھے آتی ناعمہ کے قدموں کا احساس تھا سوا تا غنیمت تھا کہ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا۔ ناعمہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی پھر ٹھٹک کر رک گئی۔
 ”کمرے کی سب ہی لائٹس آف تھیں۔ کھڑکیاں بند تھیں اور ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں مکمل

اندھیرا تھا۔ کونے میں رکھے ڈیک سے غزل کی مدہم سی آواز ابھر رہی تھی۔

حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا
دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

عریشہ نے آگے بڑھ کر لائنس آن کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ناعمہ جھپکتے ہوئے اس کے مقابل پر تھی۔ عریشہ نے ریوٹ سے ڈیک آف کر دیا۔ کمرے میں ایک تخت خاموشی چھا گئی۔ چھت پر گھومتا ہوا پتلا سی آواز پیدا کر رہا تھا۔

ناعمہ کو تادیر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے، کیا پوچھے۔ عریشہ اس کے مقابل بیٹھی تھی لیکن اس سے ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں کوئی خفتہ کہانی کہہ رہی تھیں۔ ناعمہ کا ذہن اس بولی کو سے قاصر تھا۔

”عریشہ“ بالآخر وہ بولی۔

”ہوں!“ اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ”کہو“

”تمہاری طبیعت۔“

”ٹھیک نہیں ہے“ اس نے اپنی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اطمینان سے کہہ دیا۔ ناعمہ کو سوائے اس کی متروک آنکھوں سے طبیعت کی اور اپنی کا کوئی اور سراغ ہاتھ نہ آیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی جس میں نہ غصہ تھا نہ شکایت۔

ناعمہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت دیکھی۔

”کیسے آنا ہوا؟“ بظاہر اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ ٹائیس۔۔۔ ٹائیس اور میں۔۔۔ اور سرد رہا۔۔۔“ اس نے کمرے میں ہیں۔“ وہ

تمام بولی۔

”اچھا!“ عریشہ اسی سکون سے بولی۔

”ہم لوگ۔۔۔ بپ۔۔۔ باتیں۔۔۔ باتیں کر رہے تھے۔“ ناعمہ کو لگتا تھا وہ کسی انجان ہستی کے مقابل بیٹھی ہے۔

یہ وہ عریشہ تو نہ تھی جسے وہ جانتی تھی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کر باتیں۔“

”تم۔۔۔ تم چلو نا میرے ساتھ۔“ اس نے بے حد جھپکتے ہوئے کہا۔

عریشہ نے نفی میں سر ہلایا لیکن بے حد واضح انداز میں۔ ناعمہ کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا۔“ وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ ”میں چلوں؟“

”خدا حافظ“ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

ناعمہ ایسے ڈر کر کمرے سے نکلی جیسے عریشہ اسے مارنے کے لیے پیچھے دوڑے گی۔ تیز تیز قدموں سے اتر

لاؤنچ پار کیا تھا کہ فردوس بیگم کی آواز نے اسے مزید سہا دیا۔

”ارے ٹھہرو تو لڑکی! کہاں بھاگے جاتی ہو۔“ وہ بیگم سے نکل کر اس کی جانب آ رہی تھیں۔

”جی ہاں! ممانی جان!“ وہ ٹھہر گئی۔
 ”ہو گئی بات؟“ انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں ہلایا۔
 ”کیا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کیا بات ہوئی؟“
 ”جی؟“ ناعمہ کو مزید حیرانی کا سامنا ہوا۔

آج سے پیشتر انہوں نے کبھی دونوں سیلیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کیا تھا۔

”دوست بیٹا! اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ نرمی سے بولیں۔ ”وہ ہم سب سے بھی ایسی ہی اکٹھی ہے۔ تم محسوس نہ کرنا کچھ۔“
 ”جی ممانی! ٹھیک ہے۔ اب میں چلوں!“ وہ مڑی تھی۔
 ”بات سنو ناعمہ!“ انہوں نے پھر اسے پکارا۔
 ”جی؟“ وہ بلی۔ اس کی حیران آنکھوں میں استفسار تھا۔
 ”دوست بیٹا۔ عریضہ کی طبیعت کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“ وہ کچھ خفت سے بولی گئیں۔ ”کیا یہ اور دن میں سنبھل جائے گی۔“

ناعمہ کی آنکھوں کی حیرانی میں یک لخت کی واقع ہوئی۔ یہ وہ کچھ سمجھ گئی۔
 ”جی ممانی جان!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ترانہ ایک بات کہوں تم سے، تم برا تو نہیں مانو گی؟“ ربیعہ نے اداسی سے پوچھا۔ اس کی بات میں عجب گہرائی تھی۔ ترانہ اسے دیکھنے لگی۔

”میرا کسی ہاسٹل میں بندوبست کرو۔ میں نوکری کر کے اپنے اخراجات پورے کر لوں گی۔“
 ”ربیعہ!“ ترانہ نے یک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔

ربیعہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو اٹھ اٹھے۔ ربیعہ حیران بھی ہوئی اور شرمسار بھی۔
 ”ترانہ! میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہ تھا۔ لیکن میں نے بے حد مجبور ہو کر یہ بات کہی ہے۔ تم سے ہاسٹل ہر شہر میں ہوتے ہیں، میں اپنے شہر میں ہی کسی ہاسٹل میں کسی دکان میں اپنے دلجو دوستوں کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ لیکن اگر تمہاری خوشبو بہت اثر ہوئی ہے۔ یہ انسان کو پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ خونی رشتے بہت توانائی رکھتے ہیں انہیں جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہاں کچھ چلی آئی۔ اپنوں کی تلاش میں اپنائیت کی خاطر۔“
 ”اور یہاں تمہیں غیریت ملی دکھ ملا۔“ ترانہ نے سر ہٹا کر کہا۔

”تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کی روشنی میں ہر سیاہ روپہ دھندلا گیا ہے ترانہ۔“ ربیعہ پیار سے بولی۔ ”تم نے مجھے ایک بہن کی سی چاہت دی ہے، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ترانہ!“ وہ اداس ہو کر بولی۔
 ”مجھے میرا پندار بہت عزیز ہے۔ مجھے میری ہستی کا غور، میرے کردار کی بلندی ہر شے سے برتر کر بیاری ہیں۔ میں اپنے دامن کو آلودہ نہیں دیکھ سکتی۔“

”تمہارا دامن کوئی معمولی سا دغا دار بھی نہیں کر سکتا ربیعہ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ترانہ جوش سے بولی۔

”ترانہ تم بڑھتے ہوئے قدم روک سکتی ہو، اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ سکتی ہو لیکن چلتی ہوئی زبان کو روکنا تمہارے اختیار

میں نہ ہو گا۔ صولت کی بات نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزا کر رکھ دیا ہے۔ میں نے رائی کا پہاڑ بنے سنا ہے لیکن بنا رائی کا پہاڑ۔“
 ”تم صولت کی باتوں پر دھیان دے رہی ہو یا گل لڑکی!“ ترانہ پیار سے بولی۔ ”جس کی کھوپڑی بالکل کھوکھلا ڈبہ ہے، دماغ نالی کسی شے کا معمولی سا سایہ بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ آسے تو سوچنا تک نہیں آتا ربیعہ!“
 ”جو کچھ اس نے کہا، وہ معمولی سوچ کی کرشمہ سازی نہ تھی۔“ ربیعہ نے سر جھٹکا۔ ”معمولی سوچ کی اڑان اتنی اونچی نہیں ہوتی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ طے کیا ہے کہ میرا کردار درست نہیں ہے۔ اپنے حساب سے اس نے مجھے ہر بات کا جواز بھی پیش کیا تھا۔“

”ربیعہ! تم نے ٹھیک کہا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھتے ہوئے ہاتھ کو روکا جاسکتا ہے لیکن چلتی زبان پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے تاریخ میں بہت عظیم کردار کی حامل خواتین پر بھی بہتان تراشی کے واقعے رقم ہیں، ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟ پھر کیوں ہم ایسی گندی زبانوں کی پروا کریں۔ ان کے خوف سے اپنی زندگی کے فیصلے کریں۔ اپنے دن رات بسر کرنے کا طریقہ کار ہم ایسے ذہنوں کو بد نظر رکھ کر ترہیب دیں۔ کیوں؟ کیا ایسی دانش مندی ہے؟“
 ربیعہ نے گہری سانس بھر کر سر اٹھایا اور بوڑھے برگد کی لنگتی شاخوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے حد اداس ہو رہی تھیں۔ ترانہ کو اس پر ٹوٹ کر بیاں آیا۔ اس نے ربیعہ کا گورا چٹا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ربیعہ! تم دنیا میں تنہا ہونا؟ تمہارا کوئی نہیں؟“
 ”جی نہیں۔“ اس نے نظروں سے اسے دیکھا۔

”ربیعہ! میں تم سے زیادہ تنہا ہوں۔ میرا باپ ہے، بھائی ہیں، بیٹی ہے، صولت کے نام پر بہن بھی ہے۔ لیکن ربیعہ! جس شخص کو رشتوں کے بیچ رہ کر بھی تنہائی کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے، اس کی تکلیف رشتوں سے کم ہو مگر شخص کا تعلق کون سے رشتوں سے محروم شخص کو محض محرومی کا احساس ہوتا ہے نا؟ رشتوں میں جو بے حد تنہائی کو ذرا بھی تنہائی بھگتا ہوتی ہے۔ ذہنی تنہائی بہت تکلیف دہ احساس ہے ربیعہ! جیسے جیسے جیل میں نووارد۔ نیر کا احساس، اجنبیت کا احساس، ذہنی فاصلوں کا احساس۔ میں نے ایک طویل عرصے ان احساسات سے جھٹلایا ہے۔ خود کشی کر لیتی شاید اگر مجھے عبد الباری نہ ملتا، باری نے مجھے زندہ رکھا اور تم نے مجھے ذہنی ہم آہنگی دی، محسوس کیا کہ میں اپنے رشتے کی سیانی اور توانائی کا احساس دیا۔ تم میرے لیے بہت کچھ ہو۔ یہ بہت کچھ۔ مجھے یہ بھی دور ہونے کی بات مت کرنا۔ تم مجھے عبد الباری کی طرح عزیز ہو۔ میں تمہیں ہر وقت یاد رکھتی ہوں۔“

ربیعہ نے پہلی مرتبہ ترانہ کو اس قدر جذباتی دیکھا تھا۔ وہ دم بخود تھی۔
 ”میں کہیں نہیں جاؤں گی ترانہ!“ وہ بولی ”جب تک تمہاری شادی باری سے نہیں ہو جاتی۔“
 ترانہ زور سے ہنس دی۔

”بے وقوف!“ پھر وہ خوش دلی سے بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟ میں خوشی خوشی باری سے شادی کروں گی اور تمہیں اس جنگل میں چھوڑ کر چل دوں گی؟ بد عویہلے میں تمہاری شادی کروں گی کسی بہت بہت اچھے انسان سے۔ پھر باری کے ساتھ چل دوں گی۔“
 ربیعہ کو ”بہت“ کی تکرار سے ہنسی آئی۔

اچانک ہی اس کی ہنسی ختم ہو گئی۔ آنکھوں میں جگنوؤں کی بارات اتری تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے کنول کھلے تھے۔

سامنے والی بیچ پر عباد بیٹھا تھا۔ آج وہ تنہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ لائٹ گرین دھاری دار شرٹ اور

مسٹر کلر جینز میں وہ بے حد اسارٹ دکھائی دیتا تھا۔

”واؤ۔ زبردست!“ ترانہ نے سرگوشی کی۔ ”ابھی بھی سوچ لے ربیعہ۔! منہ بولا بھائی بھی کوئی ارشتہ بھلا؟“

ربیعہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھ کر عباد کی سمت بڑھی۔

اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر عباد کھڑا ہو گیا۔ ربیعہ اس کے مقابل پہنچ گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”کیسے ہیں عباد بھائی؟“

”وعلیکم السلام!“ وہ جواباً مسکرایا۔ ”میں ٹھیک ہوں تم یہ بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا۔ خیریت سے ہو؟ کسی پریشانی تو نہیں ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں!“ نجاب نے کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھٹکالیں۔

”ربیعہ!“ عباد کے دل میں جیسے کسی نے پین چھو دی۔ ”ربیعہ۔! ادھر دیکھو۔“

ربیعہ نے جلدی سے انگلی کی پور سے پلکوں کے کنارے صاف کیے اور مسکراتے لگی۔

”آپ کی اس قدر اپنائیت اچھی لگتی ہے عباد بھائی بس! اور کوئی بات نہیں۔“

عباد نے گہری سانس بھری اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ہر ادھر دیکھنے لگا۔

”تم اتنی کم زور کیا ہو۔۔۔ یہ۔۔۔“ ”کون سا؟“ ”یہ تو۔۔۔“

”جی ہاں۔ شاید!“ وہ سوچ کر بولی۔ ”میرے کپڑے دھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے فلاں بیٹھنا پسند نہیں ہے۔“

کچھ کرنی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“

عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔

”فارغ بیٹھنا تمہیں پسند نہیں یہ اور بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا فارغ بیٹھنا پسند نہ ہو؟“

ربیعہ اس کی بات پر غفلتگی سے ہنس پڑی۔

”اچھا سنو میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے بیچ پر رکھے شاپرز کی جانب اشارہ کیا۔ ”اگر تمہیں کوئی پراہم نہ ہو تو۔“

”میرے لیے۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”کیوں عباد بھائی؟ یہ زحمت کیوں؟“

”یار! بھائی بھی کہتی ہو اور یہ زحمت و زحمت کا ذکر بھی۔“

”بھئی۔۔۔“

عذاب میں رکھتی ہیں ہر وقت تم کیسی بہن ہو؟“

ربیعہ ہنس دی۔

”پھر بھی عباد بھائی! اچھا نہیں لگتا میں احساس کمتری کا شکار ہو جاؤں گی۔“

”ہاں۔! اگر مجھے واقعتاً بھائی نہ سمجھو گی تو۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ دنیا کی کوئی بہن ایسی نہیں جو بھائی کا لایا ہوا تحفہ ٹھکرا دے۔“

ربیعہ کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔

”اوکے!“ وہ بولی۔ ”تھینک یو بھائی!“

”یو آر ویلکم!“ وہ کھل کر مسکرایا۔

”ترانہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر وہ منمنائی۔

”کس بات سے؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”یہ۔ یہ بھاری بھر کم شاپرز لیا کہیں گے سب سے؟“

تم فکر مت کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ عمرو عیار کے جیسی ایک زنبیل میرے پاس بھی ہے جس میں

بجوں کا اسٹاک رہتا ہے۔ میں ابھی اپنی زنبیل میں سے ترکیب نمبر چار سو بیس نکالتی ہوں۔“

”جتنے جتنے گلی کے ایک مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی۔“

”کون؟“ اندر سے آواز آئی۔

”اماں! میں ہوں ترانہ!“

”دروازہ کھل گیا تھا۔ اندر ستر پچتر برس کے سن کی ایک عمر رسیدہ بوڑھی عورت کھڑی تھی۔“

”اماں! یہ سامان رکھ رہی ہوں اپنا۔“ ترانہ نے اندر گھس کر وہ شاپرز ایک طرف کورکھ دیے۔ ”رات کو کسی

لے جاؤں گی۔“

”اچھا۔“ اس عورت نے سر ہلایا تھا۔ ”یہ کون ہے؟“

اس نے ربیعہ کی بابت استفسار کیا۔

”یہ میری ماموں زاد بہن ہے۔ ربیعہ۔ اچھا اماں! دروازہ بند کرلو۔“ ترانہ جلدی میں تھی۔

ربیعہ اس کی اس ترکیب پر حیران تھی۔

”یہ کیا تھا؟“ اس نے ربیعہ سے پوچھا۔ ”یہ اماں کون ہے؟“

”ایک فریب موت ہے۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری تن شہا رہتی ہے۔ بیٹا افغانستان کی جنگ میں شہید

کیا۔ بیٹی بیاہ کر سسرال چلی گئی۔ یہ یہاں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ میں اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ

لی رہتی ہوں سب محکمے والے اس کا خیال رکھتے ہیں۔“

”اوہ!“ ربیعہ کو نجات کہیں رادی جان یاد آئیں۔ وہ او اس ہو گئی تھی۔

”مجھے جو چیز چھو۔ اور صوف سے پوشیدہ رکھنا ہو وہ میں یہاں اماں کے پاس رکھوا دیتی ہوں پھر مناسب وقت پر

لے جاؤں۔“

”مثلاً؟“ ربیعہ نے ہنس کر پوچھا۔

”مثلاً باری۔“ ترانہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”وہی ایک دلکش راز ہے میری زندگی کا۔“

”اب شاپرز کس وقت آئیں گی؟“ ربیعہ پوچھنے لگی۔

”آج ہی لاؤں گی محترمہ!“ پھر وہ ہنس کر بولی۔ ”مجھے خود بے حد اشتیاق ہو رہا ہے۔ پیچھو اور صولت کے

سونے کا انتظار کرنا ہو گا۔“

ربیعہ نے سر ہلادیا۔

”گھر پہنچ کر ترانہ زمانے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ ربیعہ کچن میں چلی آئی۔ مینا بیگم نے ٹوٹتی

نگاہوں سے اسے گھورا۔

”یہ تم لوگ روزانہ باہر کیا کرنے جاتی ہو؟“ وہ کچھ بد مزگی سے بولیں۔ ”لو کیوں کو زیب دیتا ہے؟“

ربیعہ تو جانے پر رضامند بھی نہ تھی۔ ترانہ اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔

”واؤ۔! آئی۔! روٹیاں ڈال لوں؟“ اسے کچھ اور نہ سوچنا۔

”ہاں!“ وہ برسیں۔ ”اور کم مت پکاتا۔ روز تمہاری پکانی ہوئی روٹی کم پڑتی ہے۔ بے چاری صولت کو اکثر اپنے

لیے آٹا گوندھ کر روٹی پکاتا پڑ جاتی ہے۔ تمہیں تو احساس نہیں کسی کا جو نوکری کرتے ہیں ان کے دل سے پوچھو۔“

وہ بوڑھانے لگی تھی۔

49

وہ شاید نہا کر سوئی تھی۔ سیاہ بال نہایت محسوس ہوتی چمک لیے اس کے کاندھوں پر پریشان تھے۔ نیند سے لبریز نگاہیں معصوم اور پرکشش لگتی تھیں۔ قدرتی گلابی لب نرم انداز میں ہلکی سی جھینپی جھینپی لیے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ٹھوڑی کا سیاہ نل جگمگا رہا تھا۔ نکھرا نکھرا روپ اپنی بہار پر تھا۔ کسی کو کچھ غلط سوچنے کا موقع دستیاب نہ ہوا۔

”یہاں آؤ بیٹی! ہمارے پاس۔“ شفیقہ حیات نے اپنے اور فردوس بیگم کے درمیان جگہ بنائی۔ وہ دیر دیر چلتی ہوتی وہاں آکر بیٹھ گئی۔

انہوں نے بے اختیار ہی اس کی پیشانی چومی اور اپنی چند لمحوں پیشروالی سوچ پر شرمندہ ہوئیں۔ اس کی پر شرم و حیا کا نور تھا۔ اس کے وجود سے اب تک الہرود شیرازوں کی مہک اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ سر سے تنگ بہار ہی بہار تھی۔ کہیں کچھ کمی نہ تھی۔ کوئی داغ نہ تھا، کوئی جھول نہ تھا۔

”معاف کرنا بیٹی!“ وہ بولیں۔ ”ہندو معاشرے کے درمیان ایک طویل عرصے رہے ہیں نا۔ ہماری سوچ اب تک ان کے غلط نظریات کے اثرات میں ہے۔ حالانکہ مذہب اسلام تو خود سونے جیسا ہے۔ یہ تو اپنے رب و والوں کو سنہا کر دیتا ہے۔ ہندوؤں کو ہمارے ساتھ رہ کر احساس ہو گیا کہ ان میں کیا کچھ غلط ہے۔ وہ یہاں کے حقوق کی بات کرنے لگے ہیں۔ انہیں مردوں کے ساتھ جلاؤالنے سے باز آگئے، ان کی دوسری شادی کے خود میں چک پالے لگے۔ اور ہم مسلمان انہیں اپنی اچھی باتیں دے کر ان کی غلط سوچیں اپنے دامن تبرک کی طرح لیے پھرنے لگے۔“

ہمارا مذہب تو کفارہ کی کاغذ سب ہے۔ وسیع الگ نظری کی بات کرتا ہے۔ وہم، نحوست، سب کچھ شدت سے کرتا ہے۔ بیواؤں کو، مطلقہ عورتوں کو دوسری شادی کی پرزور تائین کرتا ہے۔ پورے معاشرے کو پابند کرتا ہے۔ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ کہیں کوئی عورت تنہائی کی، تنہا کی زندگی بسر نہ کرے۔ مرد کی حفاظت اور ذمہ داری ہے۔ ہم لوگ یہ سب کہہ تو سکتے ہیں۔ عمل کرنے کا وقت آئے تو اٹھ پھرتے ہیں۔“

یاسف سے بولتے ہوئے ان کی نگاہ منبذہ بیگم پر پڑی تھی جو بچاؤ کے سامنے کھڑی ان کی گفتگو رہی تھیں۔ سلیقے سے دوڑے اوڑھے، مہبان سی منبذہ بیگم انہیں بہت بھاہیں۔

”ارے، بیٹی! خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ جلدی ہے۔“

”السلام علیکم۔“ منبذہ بیگم نے مسکرا کر حاضرین کو سلام کیا اور شفیقہ حیات سے معاف کرنے لگیں۔ فردوس بیگم بھی ساس کی تقریر کے زیر اثر دیا دیا مسکراتی تھیں۔ وہ بھی اٹھ کر منبذہ بیگم کے گلے لگیں۔ ملائے کے مراحل طے ہوئے ہی تھے کہ انہما نازک گلاسوں میں ٹھنڈا مشروب لیے چلی آئی۔ اور سب کو کرنے لگی۔

”ہم بتا کر نہیں آئے۔ معافی چاہتے ہیں۔“ شفیقہ حیات نے مفرح شربت کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”دراصل یہ لوگ اکٹھے ہو کر رشتے کے متعلق بات کر رہے تھے تو لڑکوں نے شور مچا دیا کہ جب سب ہی کچھ طے ہو چکا ہے تو کیسی۔ آج ہی انگوٹھی ڈال کر آئیں اور برات کا دن طے کر لیں۔ پھر یہ ہماری صاحبزادی۔“

انہوں نے ایقان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ مسکرائے لگی۔

”ان کے مغز میں کچھ سما جائے تو نکلنا مشکل۔ بچوں کی طرح دیوانی ہو کر ضد کرتی ہے۔ بھاگم بھاگ ہاشم میاں کے ساتھ جا کر انگوٹھی اور مٹھائی لے آئیں۔ آدھے گھنٹے میں کبھی کچھ ہو گیا۔ ہم نے بھی سوچا کیا روم و روان اس قدر پابندی کرنا۔ عمر بیت گئی یہی سب کرتے کرتے حاصل نہ وصول۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو آؤ۔“

ہم بھی بچوں کی مان کر دیکھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ دیں۔ پرائز۔
 ”سربراہ! اور وہ نچلا لب دبا کر لولا۔“
 ”آں ہاں وی۔“

سب ہی ہنس لیے شہلا سمیت وہ از حد مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ پیچھے دنوں کا وہ سارا اضطراب سب چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا اور مسرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک نتیجے پر پہنچنا، بھنور سے کنارے پر پہنچنا۔
 لگتا تھا۔

”اجازت ہے بہن؟“ انہوں نے پرس میں سے مٹلیں ڈبید نکال کر منیزہ بیگم کو دکھا۔
 ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ انہوں نے بمشکل خود پر قابو پا کر اثبات میں سر ہلایا۔
 شفیقہ حیات نے بسم اللہ بڑھ کر انگوٹھی شہلا کی انگلی میں ڈال دی۔ شہلا کا سر جھکا ہوا تھا۔ پلکیں بھاری بھاری لگنے لگی تھیں۔ لبوں پر شرمیلی مسکان کا راج تھا گالوں پر گلال پھیل رہا تھا۔

”ہائے اللہ! ایقان نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔“ کیمرو تو بھول ہی آئی میز پر۔ اب ہاشم لڑے کا مجھ سے۔
 ”ہاں جی! حولا خفتا تو ہو تم۔ تم سے یہی امید۔“ شفیقہ حیات شہلا کی ہتھیلی پر لفافہ دھری ہوئی بولی۔
 ”یہ تمہارے جوڑے کے پیسے ہیں۔ برانہ ماننا۔ ہم نے ابھی بازار تان سالی تاکہ کیسے آئے ہیں ششم بھتیجی۔“
 ”یہ لیجئے ایقان آپ! آپ کے مسئلے کا حل۔“ انہوں نے کیمرو لایا تھا۔ ہمارے دولہا بھائی۔
 کچھ زیادتی ہوگی۔“

سب ہی ہنس دیے۔
 ایقان جلدی جلدی تصویریں کھینچنے لگی۔
 اچانک ہی سب کی توجہ عمر نے اپنی جانب کھینچ لی۔ وہ غالباً ماں کے ساتھ سویا ہوا تھا اور اب اسے ساتھ نہ پا کر پریشان ہو کر باہر چلا آیا تھا۔ اتنے لوگ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گیا اور جلدی سے شہلا سے لپٹ گیا۔
 ”مما!“

شہلا اپنی کیفیات سے پلک جھپکتے میں باہر آئی۔ عمر کے گرد بازوؤں کا مضبوط حصار بنا کر اس نے اس کی پیشانی پر بے ساختہ پیار کیا۔

حاضرین خاموش سے ہو گئے۔ فردوس بیگم گویا بغلیں جھانکنے لگی۔
 ”جاری تھی۔ منیزہ بیگم نے آگے بڑھ کر عمر کو شہلا سے علیحدہ کرنا چاہا۔“
 ”اؤں بچے۔ نانوپاس آؤں۔ میں آپ کو اوولٹین بنا کر دوں۔“
 ”نہیں۔“ وہ مچلا۔

”رہنے دیں ای! سو کر اٹھا ہے نا۔“ شہلا نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔
 ”اب ممّا کو تھوڑا فری ٹائم دو۔“ عذرا بیگم نے ہنس کر ماحول خوشگوار کرنا چاہا۔ ”اب آپ اپنی نانو کو تنگ کر دو۔ تمہاری ممّا کو تو ہم لے جا میں گے اپنے ساتھ۔“

عمر نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ شہلا سے لپٹا کر ٹکرا نہیں دیکھے گیا۔ اس کی نگاہوں میں خوف ور آیا تھا۔ شہلا کے چہرے پر سے سایہ گزرا تھا۔ فردوس بیگم ماتمی انداز میں بیٹھی تھیں۔

”باشاء اللہ! چشم بد دوست۔ نظر نہ لگے دوستے میاں کے بتیں دانتوں سے بچی مسکراہٹ کو۔“
 ہاشم مسکراتے مسکراتے چونک اٹھا۔ ہنستا ہوا رافع مقابل تھا۔ ہاشم جھینپ گیا۔

”ارے تم کب آئے؟“
 ”جب آپ چاند میں محبوب کا مکھڑا دیکھ کر فل ٹائم مسکرا رہے تھے۔“ وہ بمشکل خود پر قابو پا کر لولا۔ ”بائی دا“
 ”یہ نسبت طے ہوتے ہی شرمیلی لڑکیوں کی طرح آپ نے چھت کا رخ کیوں کر لیا؟ خیالی پلاؤ کی ویگ کیا چھت سے لپکتی ہے؟“

”چل نا بندر۔“ ہاشم نے خفت مٹانے کو اسے مٹا سید کیا۔ ”تو کیا سمجھے ہم سے دیوانوں کی دماغی کیفیت کو۔“
 ”میاں! احساسات کو سمجھنے کے لیے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر تجربے سے نہیں گزرے تو احساسات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ دانت اندر کر لو۔“

”تجربے سے کیسے نہیں گزرے؟“ رافع معنی خیزی سے بولا۔ ”تجربے سے تو الحمد للہ ٹھیک ٹھاک گزرے ہیں۔“

”ہاں تو“ ٹھیک ٹھاک ”گزر گئے نا۔ مسئلہ یہ ہے۔“ ٹھیک ”سے لگی نہیں تمہیں۔ ورنہ تم بھی یونہی دانت نکوٹے چاند کو دیکھ کر۔“ ہاشم اپنی شرمندگی پر قابو پا چکا تھا اور اب مائل بہ ڈھٹائی تھا۔
 رافع مسکراہٹ ہلکی ہوئی اور منسوب بدلتے لگی۔ اب وہ کچھ سوچتا ہوا نظر آتا تھا۔
 ”یا۔ غ۔“ ہاشم نے بلکورے لیتی ہوا کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہا۔ ”یار! ایک نظم لکھ میرے لیے۔“ رافع۔
 ”نک اٹھ۔“

”کیا مطلب؟“
 ”یار! عجیب سی کیفیت ہے میری۔ اتنی بڑی خوشی سے گزر رہا ہوں اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے خود سے ڈھیر ساری باتیں کہنے کا جی جا رہا ہے۔ ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی مجھے اوروں سے بن کا۔ اس سائل۔ جیسے کہیں کوئی کی ہے۔ جیسے خوشی پوری طرح سے کھل نہیں رہی۔ جیسے میں خود۔ ٹھیک طرح سے باتیں نہیں کر پا رہا۔ یا۔۔۔ ایسے عالم میں ایک چیز سہارا دیتی ہے۔ جانتا ہے کیا؟“

”راز کے چہرے پر بکھری گشتی حیران آنکھوں سے سمیٹ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ پایا۔“
 ”شاعری۔“ وہ کہہ نہ سکا۔ ”میں ڈھلے الفاظ۔ کیفیات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یا۔۔۔ رافع! قدرت نے مجھے ہم سے دیوانوں کے احساسات کی تکمیل کا ذہنک دیا ہے۔ ہمارے جذبات کی تشکیل کا ہنر ہے تیرے پاس۔“
 ”بار۔۔۔“ کہہ کر۔۔۔ کچھ سانچے ایسی باتیں جو دل سے نکلے اور دل میں اتر جائے۔ مجھے سن کر یوں ہے۔“
 ”میر۔۔۔ بات کو زبان دے دینی ہو۔ جو بات میں خود سے نہ کہہ پایا۔ وہ بات کہہ دے میرے دوست۔“

”کیا کہوں؟“ رافع ہنس دیا۔ ”کیا کہنا چاہتا ہے تو خود سے؟“
 ”اپنی خوشی کا مکمل احساس دلانا چاہتا ہوں خود کو۔ اس کے تصور کو حقیقت کی سطح پر لا کر اپنی خوشی شہر کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”فرش کر رافع! اتنے سالوں تو کسی کو دیوانہ وار چاہتا ہو اور اچانک تجھے اس کی ہر اہی کا اعزاز حاصل ہونے لگا۔ کیا کہتا؟“

رافع سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھنڈی متوالی ہوا اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے گزری۔ بادل کے مہین غلاف کو بٹا کر چاند نے تہا نکا اور مسکرایا۔ جنگلی گھلاہوں کی بھنگی ہوئی خوشبو کسی جھوٹے کاہاتھ تھام کر اس کے بے حد قریب سے گزری۔ اس کی براؤن آنکھیں دور دیکھنے لگی تھیں۔ اس کا تخیل چاندنی کے ساتھ ساتھ بھٹکتے لگا۔
 ”اس کی ہر اہی! شبہ تمہاری بے لوث چاہت کا اعجاز ہے ہاشم۔“ پھر وہ بولا۔ ”جب اس سے ملو تو بتانا کہ۔۔۔“

تری آنکھ کی یہ روشنی میرے خون دل کی لکیر ہے
 ترکش زلف کی یہ چاندنی مرے خوابوں کی تعبیر ہے
 یہ کشش تھی میرے خیال کی جو یوں کھم گئے ہیں تیرے قدم
 یہ تیری ادائے دلبری میری چاہتوں کی اسیر ہے
 میری بے بسی میں سوال ہیں ترا نقش نقش جو اب رہ
 مری مہ رو کوئی بات کرا تو نہ بت ہے نہ تصویر ہے
 ”اوسہ اور رافع!“ ہاشم نے بھیج دیا۔ ”گھر!“
 رافع حیران پریشان کھڑا تھا۔
 ”بیر با گل ہو جاؤں گا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“
 خوشی میں مگن ہاشم نے کچھ نہ سنا تھا۔

”اچھا۔۔۔ معافی چاہتی ہوں۔“
 ”ایک اور اجنبی جملہ۔“ وہ فوراً بولا۔
 وہ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہی ہو گئی۔ ہاشم نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر تھک کر بولا۔
 ”جلنے کہیے۔ کیا کہنا چاہتی تھیں آپ۔ آپ کو شناسائی کی زبان نہیں آتی تو اجنبیت کی بولی میں ہی بات
 کریں۔ لیکن بات تو کریں۔“
 ”ہاشم صاحب۔“

”صاحب ہٹادیں۔“ آج وہ بے حد حق کے ساتھ بات کر رہا تھا۔
 ”اچھا ہاشم۔“ وہ کھنکھارے گویا کسی کمی کا احساس ہوا تھا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں
 کہ۔۔۔ عمود عمر کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟“
 ”وہ سب کچھ جو عمر کے متعلق آپ سوچتی ہیں!“ وہ ہنسا۔ ”عمر کے معاملے میں کبھی بھی خود کو مجھ سے علیحدہ
 کر کے نہ سوچئے گا۔“

شہلا نے جیسے پر سکون سانس بھری تھی۔
 ”سے اپنے ساتھ رکھوں گی ہر جگہ۔ خواہ وہ میری ماں کا گھر ہو یا آپ کا۔“
 اچھا۔۔۔ ہی ہاشم۔۔۔ ہوش ہوا تھا۔ فاروق حسن کے چند الفاظ دماغ کے کسی خفیہ گوشے سے نکل کر حافضے کی سطح
 پر ابھر آئے۔

”اس گھر میں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“ وہ سخت لہجہ، وہ ٹھوس اور حتمی بات۔
 وہ کیسے بھول گیا تھا اتنی اہم بات! یہاں تو خیالات کا سخت ٹکراؤ ہونے جا رہا تھا۔
 ”آپ خا۔۔۔ کیوں؟“ وہ جیسے ڈر کر بولی۔ ”دیکھیے آپ کے ذہن میں اگر کوئی اور خیال ہے تو ابھی کلینر
 کو بتا دیتے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”بھلا۔۔۔“ وہ بولا۔ ”میں زندگی کے ہر موڑ اور ہر معاملے میں آپ کا ساتھ دوں
 گا۔ اور یہ تو آپ کی زندگی کا الگ باب ہے۔ اہم بات یہ ہے۔“
 ”کوئی شادی سے پہلے ہی اپنے گھر میں یہ پوسٹ کلینر کر دیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”بعد
 میں وہ کم کی بد معنی نہ ہو۔“

”بہتر جناب!“ وہ بشارت سے مسکرایا۔ ”مزید کوئی حکم؟“
 ”یہ حکم نہیں گزارش ہے۔ عاجزانہ التماس ہے۔“
 ”اوہ۔“ اس نے بے بسی سے آنکھیں میچ لیں۔ ”وہی غیریت سے بھرے الفاظ۔ آخر آپ کب اپنی لگیں
 گی؟“ شہلا نے جھینب کر فون بند کر دیا۔

وہ بے حد احتیاء سے فارم فل کر رہی تھی۔ اپنے پچھلے ڈاکو مینشنس وہ اپنے ساتھ ہی لائی تھی۔ ان میں سے
 ضروری ڈیڑا وہ بہت اٹھماک کے ساتھ فارم پر منتقل کر رہی تھی۔

کھٹ کھٹ کی آواز نے تمدن کی آمد کا پتا دیا تھا۔ ربیعہ نے ڈر کر جلدی جلدی سارے کاغذات تکیے کے نیچے
 کر دیے اور اوپر رسالہ رکھ کر پڑھنے لگی۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ چند لمحے دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو کر وہ
 اس کی مصروفیت کا اندازہ کرتا رہا۔ ربیعہ رسالے میں پوری طرح محو دکھائی دیتی تھی۔

”مری مہ رو کوئی بات کر۔ تو نہ بت ہے نہ تصویر ہے۔“ ہاشم مسکرایا۔ وی بی سی چینل کی مری ہوئی تصویر
 انٹارنٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین پر شہلا کا شریگیں سے جھانک رہا تھا۔ اس کا
 قدرے جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے درپچوں پر پلکوں کی لڑائی تھی۔ ہاشم کو بے کلی محسوس ہونے
 ان نگاہوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ محض ایک شریگیں سے اس کے ہر سوال کا جواب نہ تھی۔
 ”کیسے گزریں گے یہ چند روز تمہارے بغیر۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں ان آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں شہلا! جہاں
 میرے کئی قیمتی برس قید ہیں۔ مجھے ان لمحوں کا سراغ چاہیے۔“
 اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی تھی۔ وہ چونک اٹھا۔ اتنی جگہ سے اٹھ کر وہ اپنے بیڈ کی جانب لوٹا۔
 روشن ہمبر کے ساتھ شہلا کا نام درج تھا۔ ہاشم کے دل کی کئی کئی جگہیں۔
 ”ہاشم میاں۔ قبولیت کا وقت ہے مانگ لو اور کچھ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگا
 ”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔“ اس کی مدھم آواز آئی۔ ”تعارف کی ضرورت تو شاید نہیں ہے۔“
 ”جی نہیں۔ میرے موبائل نے آپ کا تعارف کر دیا ہے۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ ”جیسے ہزار جگہیں۔“
 ”جی۔۔۔ شکریہ!“
 ”خوش ہیں آپ؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔
 ”مطمئن ہوں!“ پھر وہ بولی۔
 ”جلے!“ اس نے سانس بھری۔ ”اتنا بھی بہت ہے۔“
 ”مجھے ایک ضروری بات کرنا تھی ہاشم صاحب۔! بے وقت آپ کو زحمت اسی لیے دی ہے۔“ وہ محتاط انداز
 اختیار کرنے لگی تھی۔

”مائی گاؤ!“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”شہلا پلیز! اجنبیت کی اس دیوار میں اب تو کوئی در پچہ ڈا کر لیجئے جہاں
 سے شناسائی جھانکے دوستی مسکرائے۔ معنویت باتیں کرے۔ آپ تو بے مہر کی حد کرتی ہیں۔“ اس کے
 میں بے پناہ شکایت تھی۔ شہلا دھیرے سے ہنس دی۔

”پھپھو کہاں ہیں؟“ بالآخر وہ بولا۔

”جی!“ اس نے سر اٹھایا۔ ”پھپھو سبزی خریدنے گئی ہیں۔“

”ہوں!“ اس نے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

پھر اس کی نظر تکیے کے نیچے سے جھانکتے کاغذ پر پڑی۔

”ایک کپ چائے بنا دو۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے آنکھیں میچیں۔ وہ دل ہی دل میں یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے کسی کام سے اٹھا نہ دے۔

”جی اچھا!“ وہ چند لمحے رک کر بولی۔ ”ابھی بنا دیتی ہوں تمدن بھائی!“ تمدن وہیں کھڑا رہا۔ ربیعہ کسمسا کر رہ

گئی۔

”اٹھ بھی جاؤ۔“

ربیعہ نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پھرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی اس سے پہلے
تمدن کمرے سے نکل جائے۔ اسے وہ کاغذات وہاں سے اٹھا لینے کا موقع مل جائے لیکن ایسا ناممکن لگنے لگا۔ وہ ہنوز
وہیں کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ربیعہ کو وہاں سے ہٹے ہی بنی۔

اس کی جانب دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ کمرے سے نکل کر پچن میں چلی آئی۔ بے کلی اور اضطراب کے عالم
میں اس نے جلدی جلدی ساس پیر کاٹنے کا لہجہ بولنا شروع کیا۔ ”جائے کا پانی چھوٹے پر رکھ دیا۔ باہر صحن میں گیٹ کھلنے کی آواز آئی
تھی۔ شاید سبزی سبزی لے کر آئی تھیں۔ کچھ کو مزید کوفت بنے آگھیرا۔ وہ باہر سے آکر چند لمحوں کے لیے
ضرور کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹتی تھیں۔ ان کے تکیے کے نیچے اس نے گویا پٹانے رکھے ہوئے تھے۔ اس
کے دل میں ان لپٹاؤں کے چلنے کی آوازیں ابھی سے گونج رہی تھیں۔

مینا پچن میں چلی آئی۔ ان کے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔ ربیعہ نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔

”سب سبزی دھو کر رکھنا ہے۔ قیمہ بھی لاتی ہوں۔ دھوا فریزر میں رکھو۔“

”جی!“ وہ مرل انداز میں بولی۔ ”چائے دوں آپ کو؟“

”نہیں۔ مجھے سب سے پہلے وقت کی چائے پسند نہیں۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”مم۔ میں تمدن بھائی کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ مینا بیگم نے گھور کر اسے

دیکھا۔

”لیموں لائی ہوں۔“ پھر وہ بولیں۔ ”مجھے سکنجبین بنا کر دو۔“

”جی اچھا!“ وہ فرماں برداری سے بولی۔

تمدن نے لیے چائے اور مینا بیگم کے لیے سکنجبین کا گلاس لیے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ اس کی گویا

روح قبض ہونے لگی۔

تمدن اس کا فارم ہاتھ میں لیے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب کاغذات اس کے سامنے پڑے تھے۔

”تمدن بھائی!“ ربیعہ جلدی سے بولی۔ ”یہ میرے ہیں۔“

تمدن نے خشمگین نگاہیں اٹھائیں۔

”کس نے لا کر دیا ہے یہ؟“

”ترانہ نے۔“ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

”کیوں منگوا دیا ہے تم نے؟“ وہ غرایا۔

”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“

تمن چند لمحے اس کی جانب دیکھا رہا، پھر اس نے فارم پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ربیعہ کے لبوں سے سسکیاں نکلتی تھیں۔

تمن نے فارم کے ٹکڑے وہیں فرش پر پھینک دیے اور حقارت سے اسے دیکھنے لگا۔

”پڑھنا چاہتی ہو۔ کیا تیرا کوئی چند کتابیں اور بڑھ کر۔ ترانہ اور صولت کی طرح کمانے نکل کھڑی ہوگی؟ تمہیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تمہارے لیے ہم لوگوں نے کچھ اور سوچا ہے۔“

ربیعہ کے خاموش آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ کسی بہت کی مانند ساکت کھڑی رہی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ قرعہ نال میں اب کون سی سزا اس کے نام کی پرچی کے ساتھ نکلی ہے۔ لیکن اس کی قوت گویائی غم غصے اور بھڑپور احتجاج کو دبانے میں مصروف تھی۔ سو وہ اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

”مبصری دھوکہ اور کرلیے پکاؤ آن جس۔“ مینا بیگم بے حد مسرور نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑھ کر رے اس کے ہاتھوں سے لے لی تھی۔ ربیعہ بے جان قدموں کو کھینچتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ترانہ اسے دھونڈتی، آوازیں دیتی، چھت پر چلی آئی۔ پھر وہ بیڑھیوں کے پاس ہی کھڑی رہ گئی۔

ربیعہ چھت کے آخری کونے پر چھوٹی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے انداز غیر معمولی تھا۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ ترانہ کی آمد پر وہ یوں کونے میں بیٹھتی رہتی۔ اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیتی۔ اب وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ترانہ کی طرف دیکھا تھا۔

ترانہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس تک پہنچی۔ ربیعہ کی گود میں اس کی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ انگلیوں میں قلم ڈھیلے انداز میں جھول رہا تھا۔ ربیعہ کی نگاہیں ڈائری کے صفحے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے قریب بیٹھ کر محبت سے بولی۔

”ہوں!“ جواب آنے میں چند لمحے لگے تھے۔

”کیا بات ہے؟ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔؟“

ربیعہ نے ایک گہری سانس بھری۔

”بچے بہت مٹھن ہے ترانہ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں مر جاؤں گی۔ اتنی مٹھن تھی اتنی۔ اتنی۔“

ترانہ گھبرا گئی۔ اس نے ربیعہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”ربیعہ! کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا تم سے؟“

اس نے نفی میں سر ہلا کر خلق میں گرتے آنسو نکلے۔

”پھر میں نے پہلے کبھی تمہیں اس قدر پریشان نہیں دیکھا۔“

”پریشان تھی۔ اب نہیں ہوں۔“ وہ بولی۔

”یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“ ترانہ کی الجھن اس کے ادھورے جوابوں سے بڑھ رہی تھی۔

”میں خود کو سمجھا رہی تھی۔“ ”کیا؟“

ربیعہ نے پہلی مرتبہ چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے۔ ترانہ نے بے ساختہ ہی اس کی گود میں رکھی ڈائری کی جانب دیکھا۔

ربیعہ نے ڈائری اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں دے دی۔ ترانہ اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر ڈائری میں لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگی۔

اپنے کاندھوں پر لیے اپنے گناہوں کی شہرہ پر ہم کیوں گامزن کیا جانے دقت کی شاہراہ پر ہم کیوں گامزن کیا جانے کیوں نگاہیں بے ہوشی کے شہر کے شہر کیوں گامزن کیا جانے کیا ہوئے اس شہر کے شہر کے شہر کیوں گامزن کیا جانے دل کہ سنا تھا غلط انداز لہجے بھی پر اب کیوں تھیں نظروں سے ہوتی ہے تھکن کیا جانے کیا کہیں عزت نشینی کیوں ہمیں راس آگئی کس سے تنہائی میں ہیں محو خن کیا جانے

ترانہ نے اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے ربیعہ؟ کس نے لکھا ہے یہ؟“ ”میں نے!“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

”تم نے؟ کیوں؟“

”کتھار سس کے لیے۔ شاید۔“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”نا سر جھک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ اسے شاید کوئی سراہا تھا آیا تھا۔“ ”تم نے کیا کیا؟“

ربیعہ نے غالی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ترانہ۔۔۔ تمن بھائی نے میرا فارم پھاڑ دیا۔“ اس کے گلے میں آنسوؤں کی نمی سی گھلتی لگی۔ ”وہ کہتے ہیں مجھے برا بھائی کی ضرورت نہیں وہ کہتے ہیں سب گھر والوں نے میرے لیے کچھ اور سوچا ہے۔“

”کیا؟“ ”ربیعہ بولی۔“

”میں نے تمہیں سر ہلا کر مجھے نہیں پتا۔“

”بلکہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے سر اٹھایا۔“

”تم غیب کی بات کہتی ہو جیسی لڑکی اس گھر میں رہے گی تو ضرور مر جائے گی۔ میں۔ میں تمہارا ایڈیشن کروا دوں گی اور تمہیں ہر لمحہ یاد دلادوں گی۔ تمہا کل فکر مت کرو۔“

”اس نے کوئی بات نہیں کہی۔“

”میرا۔“ ”انہوں نے اس کی طرح سے چونکی تھیں۔ وہ نجانے کب آکر ان کے سروں پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ترانہ اور ربیعہ سر اٹھائے انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کے لبوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔“

”کیا کہنا چاہتی ہیں پچھو آپ؟“ ترانہ نے دلیری سے پوچھا۔

”ربیعہ کو نہ کہیں جانے کی ضرورت ہے نہ پڑھائی کی۔ ہم اس کے بڑے ہیں۔ اس کے متعلق زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔“ ”پھر کیا سوچا“ ”بیویں“ نے؟“ ”ترانہ نے ملتی سے پوچھا۔“

”تمن ربیعہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھیں۔ ”اور میرے خیال میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ بن ماں باپ کی بچی کا ٹھکانا بھی پکا ہو جائے گا۔“

ترانہ نے ہر اسماں ہو کر ربیعہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”شو“ کر کے کوئی پھلجھڑی چھوٹی تھی۔ ربیعہ کے چاروں جانب دھماکے ہونے لگے۔

اس کی آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ دیا۔ کانوں نے سنا موقوف کیا۔ ذہن نے سوچنا بند کیا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ روئے زمین پر تنہا کھڑی تھی۔ بالکل تنہا۔

(باقی آئندہ)

عربہ نافع کے رشتے کا سنتے ہی منگنی سے انکار کر دیتی ہے۔ لیکن فاروق حسن سمجھا بھجا کر اسے راضی کر لیتے ہیں۔
 رافع شاعری شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نظم ہاشم کو بہت پسند آتی ہے۔
 ابرار شہلا کو فون کرتا ہے اور دوبارہ تعلقات کی استواری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شہلا سنتے ہی رنگ رہ جاتی ہے۔

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گستاخے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نشانج کی دھمکی دیتی ہے۔
 انیفہ ابرار جیلانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

بارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے بارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساسی اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو منگنی کی انگوٹھی پہناتی ہیں شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس بات مان لیتا ہے۔
 تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
 لیکن اس پر غم کا بھانڈا اس وقت لگتا ہے جب مینا بیگم تمدن کے اس کی شکایت کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۶

سولہویں قسط

ترانہ کو اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ غم صم غم میں بیٹھی ایک ٹیبلٹ دیکھتے ہوئے مینا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بیچو؟“ وہ تدریجاً لہجے میں دلی بیگانگی کے ساتھ فریاد اٹھاتی ہے۔ گھر والوں کی خوشی اور مرضی کا نام تو نہیں ہے۔ شادی تو بندھن ہے دو افراد کو آپس میں جوڑتا ہے۔ کسی ایک شخص کی مرضی کے تحت بندھن نہیں بندھ جاتے۔ ربیعہ کی مرضی جانے بغیر آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔

مینا بیگم نے ربیعہ کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بے پناہ تحقیر تھی۔
 ”اس کی کیا مرضی ہوگی؟ اکیلی لاوارث لڑکی جس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ہم ہی ہیں اب اس کے سرپرست۔ اور مشرقی لڑکیاں اپنے سرپرستوں کے سامنے زبان نہیں کھولتیں۔ اسے تو سہارا ہی چاہیے۔ سرچھپانے کو چھت پناہیے کھانے کو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ مل رہا ہے نایاں اسے یہ سب کچھ۔ پھر رشتہ جوڑنے میں اعتراض کیسا؟ یوں تو یہ کوئی ہاسٹل ہے نہ دارالامان تمدن سے اس کا نکاح ہو جائے تو لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے۔ اسے عزت مل جائے گی۔ بندے کا نام مل جائے گا۔ ابھی یہ ہے کیا؟“

”بیچو!“ ترانہ از حد تاسف سے بولی تھی۔ ”یہ ایک مکمل ذات ہے اگر اس کے سرپر باپ کا سایہ نہیں یا ماں کی نرم گود اسے میسر نہیں تو اس سے اس کی ذات ادھوری نہیں ہو جاتی۔ یہ ایک وجود ہے، ٹھوس حقیقت۔ اس کو جو کچھ مل رہا ہے یہ اس کی پالی پالی کا حساب چکا رہی ہے۔ جسمانی روحانی ذہنی تھکن۔ ہر طرح سے قیمت ادا کر رہی ہے یہ اس عظیم احسان کی جو ہم اس کو یہاں رکھ کر کر رہے ہیں۔ اور کن لوگوں کی زبانوں کی فکر ہے آپ

کو؟ یہ سچے والے؟ چند ایک دروازے کے رشتے دار جو محض کسی کے مرنے پر بمشکل پرسہ دینے پہنچتے ہیں۔ اگر ان ہی لوگوں کی بات کر رہی ہیں تو آپ کی یادداشت بہت کمزور ہے پچھو! ان ہی لوگوں نے صولت کے بھی۔

”ترانہ!“ مینا بیگم کی آواز غم و غصے سے پھٹ گئی۔ ”زبان کو لگام دو۔ تم جانتی ہو تم کس سے مخاطب ہو!“

”ایسا ہی افسوس ابھی ربیعہ کو ہوا پچھو! مجھے ہوا اب آپ کو ہوا تو آپ نے جانا کہ زبان کا غلط استعمال ازیت پہنچا سکتا ہے۔“ ترانہ نے تاسف سے گہری سانس بھری تھی۔

”یہ ہاشل یا دارالامان نہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہ لڑکی اگر یہاں آنے کے بجائے کسی دارالامان کا رخ کرتی تو شاید اس کی ذہنی ازیت یہاں کے مقابلے میں کچھ کم ہی ہوتی۔“

”مجھ سے کیا بحث کر رہی ہو تم!“ وہ دانت کچکچا کر بولیں۔ ”اپنے بھائی سے کیوں نہیں پوچھتیں جا کر جو بے تاب ہو رہا ہے۔ پھر اپنے باپ سے پوچھو جس نے اس لڑکی کو سو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ یہاں رہے تو سونے کے انڈے نہیں دیتی۔“

”ضرور پوچھوں گی۔“ ترانہ پھر کر بولی۔ ”ربیعہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔ خون میرا اپنا بھائی بے تاب یا باپ۔ یہ ایک جیتی جاگتی سانس لیتی باشعور لڑکی ہے۔ اور یہ مجھ سے بے در کا گنہگار ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ مینا بیگم قدرے سہولت سے بولیں۔ ”کچھ تم ربیعہ کی مرضی تو پوچھ لو نا کیا جبراً اسے اس رشتے پر اعتراض نہ ہو۔ تمدن میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔ چنانچہ چھانٹو گے مزان تو کچھ بھڑکیلے ہوتے ہی ہیں شادی کے بعد سب ہی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ بیوی کی مانگ لگتے ہیں۔“ وہ نرم پڑنے لگیں۔

”پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ہم سب ربیعہ سے کتنا پیار کرنے لگے ہیں۔ یہ تو ہم سب کی ضرورت بن گئی ہے۔ تمہارے ابو تو اس کے بغیر نہ کھانا کھاتے ہیں نہ دوائی پیتے ہیں۔ تم سے اور صولت سے اس کی بہنوں جیسی دو ہے۔ تمدن تو خیر اس کے گن گاتا ہی ہے تصور بھی بہت کم اور کتنا ہے اس سے۔ پھر اتنی انہی لڑکیوں کو ہم پر گھر بھیجیں اور برائی ان جانی لڑکی بیاہ کر اپنے گھر لائیں تو یہ تو کھلی بے وقوفی ہی ہوگی نا! نجانے آنے والی کیسی ہو والوں سے اس کا برتاؤ کیسا ہو۔ ربیعہ تو ہم میں بالکل کھل مل گئی ہے۔ خون اپنا ہو تو محبت کی خوشبو تو محسوس ہوتی ہے نا! شادی تو ہم نے ربیعہ کی بھی کرنا ہے اور تمدن کی بھی۔ پھر کیوں نہ رشتے دار کی کو مزید مضبوط کر دیا جائے بھی! آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

ان کے لہجے میں اصرار تھا۔ ترانہ اب کسی سوچ میں غم گئی۔ مینا بیگم نے سر جھکائے بیٹھی ربیعہ کو ایک نظر دیکھا پھر ترانہ کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

”اب دیکھو نا ترانہ!“ وہ بے حد بیٹھے لہجے میں بولیں۔ ”تمہارے ابو کی دیکھ بھال کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ انہیں لمبی عمر دے۔ لیکن عمر تو رب تعالیٰ لکھتا ہے نا۔ نجانے ابھی انہوں نے کتنے سال اسی طرح پلنگ پر گزارنے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ ربیعہ کا ہی حوصلہ ہے جو یہ ان کی ایسی بہترین دیکھ بھال کرتی ہے۔ ایک بیٹی تو باپ کی ایسی خدمت کر سکتی ہے۔ آج کل کی بہوؤں کا تو کام نہیں ہے یہ۔“

ترانہ نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”ہم اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں پچھو! جو کچھ بھی ہو اس کی خوشی کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہاں اپنی مرضی سے بنا کوئی نیا رشتہ جوڑے بھی رہنا چاہیے تو یہ اس کا حق ہے۔ اور اگر اس کی سوچ میں تبدیلی آئے تو یہ بھی اس کی مرضی ہوگی۔“

”تم تم پوچھ لو نا!“ وہ مسکرائیں۔ ”لڑکیاں اپنے دل کی باتیں اپنی سہیلیوں سے ہی کرتی ہیں۔ اور اتنے عرصے سے تم دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کہتی آرہی ہو۔ جانتی ہو ایک دوسرے کو نہیں کہتی ہوں ایک دو ن اس موضوع پر کھل کر آپس میں گفتگو کرلو۔ تم اپنے بھائی اور باپ کی طرف سے اپنی سہیلی کو قائل کرنے کی کوشش کرو۔ بھلا کون سی ایسی ناممکن بات ہے؟ ہم کوئی جبراً تو نکاح نہیں پر دوا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ترانہ بولی ”کرتے ہیں بات پھر میں آپ کو اس کا جواب بتا دوں گی۔“

”ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

جاتے جاتے وہ ربیعہ کے سر پر دست شفقت پھیر کر گئی تھیں۔

”آپ! اچھی میں تو ڈر رہی گئی۔ اس کا چہرہ بالکل پتھر کا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں کوئی احساس کوئی جذبہ نظر نہ آتا تھا۔ لکل رو بوٹ لگ رہی تھی۔“

وردہ جاؤں ہاتھ گود میں رکھے گہری سوچ میں غم بیٹھی تھی۔ ناعمہ نے ذرا ٹھہر کر اپنی بات کا اثر دیکھنا چاہا۔

”ممنی ہو کر رہی اشارت ہوئی۔“

”اور ممانی جان رہی ہیں تو نجانے کون سا خیال ستا رہا تھا، پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ میں عریشہ سے ملے بغیر جلی جاؤں پھر واپسی پر مجھے روک کر بولیں کہ کسی سے کچھ کہنا نہیں۔ ان کا مطلب تھا عریشہ کے رویے کے متعلق۔“

وردہ نے غمازی سے اسے دیکھا۔

”پھر بھی تم نے لے کر مجھے سب کچھ بتا رہی ہو۔ حالانکہ تمہیں یہ بات خود تک محدود رکھنا چاہیے تھی۔“

”ممنی!“ وہ جھنجھکی۔ ”کوئی بتا رہی ہوں نا۔ کوئی دھول لے کر محلے میں تو نہیں نکل گئی۔ اور یوں بھی آپ! آپ تو مجھے سے پیٹے پیتے ہیں۔ وردہ ہو جاتا ہے کوئی بات چھپانے کی کوشش کروں تو۔ اس لیے کم از کم کسی ایک بندے سے تو ڈرتا ہوں۔ کرنا ہی کرنا ہوتا ہے عموماً وہ بندہ آپ ہی ہوتی ہیں۔“

”مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟“ وردہ نے اسے گھورا۔

”اگر وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہے۔“ ممانی جان بچنے لگی۔ ”ممانی جان مجھے گردن سے پکڑ لیں گی۔“

”کم از کم عذرا ممانی کے گھر یہ بات نہ پہنچے۔“ وردہ نے اسے تسلیہ کی۔ ”تانیہ یا سدرہ سے اس موضوع پر بات مت کرنا۔“

”تانیہ سے۔“ اس نے ڈر کر لبوں پر زبان پھیری۔

”کر چکی ہو؟“ وردہ نے اسے بری طرح سے گھورا۔

”آئی۔“ وہ تو منگنی کے دوسرے دن کی بات ہے۔“ وہ منمنائی۔ ”ہم تو منگنی پر ڈسکشن کر رہے تھے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا، شاہینہ بولی تھی کہ عریشہ کا منگنی کے دن رویہ نارمل نہیں تھا۔“

”ہاں۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سب ہی نے محسوس کر لیا تھا، لیکن زیادہ تر افراد نے اسے اہمیت نہ دی۔ سب ہی جانتے ہیں کہ عریشہ سر پھری سی لڑکی ہے ذرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن اتنے دن بعد بھی وہ نارمل نہیں ہوئی۔ تب یہ فکر کی بات ہے۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ اگر اسے نافع پسند نہ تھا تو اسے ہائی ہی نہیں بھرتا چاہیے تھی۔“

”بے چارہ نافع!“ ناعمہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”بچنس گیا بری طرح سے۔“
 ”بس“ فضول ہی بولنا تمہیں مجھے تو تمہارا ہی خوف رہتا ہے ہر وقت کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ بک دیتی ہو اور پھر اڑ
 کو باتیں سننا پڑتی ہیں۔“ وردہ نے اسے فوراً ڈانٹا۔

”رائمہ آپ کی شادی پتا نہیں کیوں پہلے کر دی امی نے۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”آپ کی کر دیتیں تو میری از
 پیشیوں سے جان چھوٹی۔ بہن سمجھ کر میں اپنے دل کی باتیں کرتی ہوں، آپ فوراً ڈانٹنا شروع کر دیتی ہیں۔
 رائمہ آپ اپنی دلچسپی سے میری باتیں سنتی ہیں۔ خوب ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور اگر میں کوئی نئی تازی نہ سناؤں،
 ان کا تو دن ہی بے کار جاتا ہے۔“
 وردہ کو بے ساختہ ہی ہنسی آگئی۔

”میں تمہارا اینٹی بدھوپن اسکو اڑھوں، اس لیے۔“ اس نے خفا بیٹھی ناعمہ کے سر پر ایک چپت لگائی۔
 ”سمجھتی تو کچھ ہو نہیں سوچتا تمہیں ویسے ہی نہیں آتا۔ بی جملہ دینی پھرتی ہو اور اپنی اس ڈیوٹی پر بہت خوش
 رہتی ہو۔“

”اچھا۔ تو محترمہ عقل کل صاحبہ! ذرا سی روشنی بھینکیے اپنی عقل کے مینار سے اور بتائیے کہ میں نے کون سے
 بدھوپن کا مظاہرہ کیا ہے۔ عریشہ نافع جیسے منگنی کر کے خوش نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے کیوں
 زباں بندی اس قدر شدت سے رہا ہے؟“
 وردہ غلاموش ہو کر گھورنے لگی۔

”جانتی ہوں اس گھر کے بزرگوں کو گھر کے رشتے گھر ہی میں توڑنے کا کتنا کریز ہے۔ لڑکوں کے خاندان سے باہر
 جانے کا تصور ہی ان کے لیے کتنا روح فرسا ہے۔ ہاشم بھائی بے چارے ابھی تک سخت تنقید کی زد میں ہیں۔ اسی
 حساب سے لڑکیوں کی باتیں بھی یہی کچھ یہی جتنی ہیں۔ نافع کے عریشہ اور تمہارا دونوں نام زیر غور رہے ہیں پھر
 بزرگوں نے فیصلہ عریشہ کے لیے ستایا۔ کیونکہ۔“ وہ کہتے کہتے ہنسی بھجی۔ ”جوچہ تم جانتی ہو۔ اب اگر تمہارے
 منہ سے یہ پروپیگنڈہ کسی نے سن لیا کہ عریشہ اس رشتے سے ناخوش ہے تو جانتی ہو اس کا منطقی نتیجہ کیا نکلے گا؟ سب
 یہ کہیں گے کہ تم جلے ہو۔“

”ہائے اللہ۔ وہ خفی سے اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے کیا جبر سہلی میں لو اب شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔“
 وردہ کو ہنسی آگئی۔ ”کیوں“ یہ نافع اتنا برا تو نہیں ہے بے چارہ۔ تم لڑکیاں استاد ک کیوں رہی ہو۔ خوب
 صورت خوب سیرت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔“

”بھئی مجھے خاندان میں شادی کرنے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔“ اس نے ناک سکوڑی۔ ”بچپن سے جنہر
 دیکھتے آرہے ہیں، انہیں بربھاپے تک برداشت کیے جاؤ، کوئی سزا ہے یہ ہماری؟“

”یہ آئیڈیالزم ہی تو مار رہا ہے اس دور کی لڑکیوں کو۔“ وردہ کو غصہ آیا۔ ”میڈیا نے اور غضب ڈھایا ہے
 لڑکیاں خود کو جانے کون سی مخلوق تصور کرنے لگی ہیں۔ ناک کے نیچے کوئی سہا تا ہی نہیں۔ لی وی اسکرین توڑتا ہو
 کوئی ہیروز زندگی میں آگھے اور ہاتھ پکڑ کر واپس فلمی دنیا میں لے جائے جہاں ڈوسٹ ساگز ہوں اور عشقیہ ڈانٹا لگا
 یہی چاہتی ہوں نا تم لوگ؟“

ناعمہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔
 ”اب سب آپ کی طرح تو نہیں ہوتیں اللہ میاں کی بکری۔“ وردہ کو غصے کے باوجود ہنسی آئی۔
 ”یہ مثال کو کیا ہوا؟“

”اب آپ کو گائے تو کہنے سے رہی سبائیں انچ کی کر ہے۔ آپ کے لیے یہی مثال مناسب ہے۔“

”اور جو کچھ میں نے عرض کیا اتنی دیر میں دل پلے پڑا آپ کے؟“ اس نے تبسہ ہی انداز میں پوچھا۔ اس نے معصومیت سے سر ہلادیا۔

”میں پوچھتی ہوں اب کتنے دن سوگ مناؤ گی اپنی مری ہوئی ماں کا؟“ فردوس بیگم کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ تنہا فن کرتی اس کے سر پر اکھری ہوئیں۔ ”ایسی فتنہ لڑکیاں۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔ لوگ یونہی تو نہیں زندہ گاڑ دیتے تھے۔ خبر ہوتی ہوگی انہیں کہ جوان ہو کر منہ کو آئیں گی یہ بالشت بالشت بھر کی چھو کر یاں۔۔۔ سروں میں خاک ڈالیں گی۔۔۔“

عریشہ ماں کے توروں پر کھڑے کر اندر سے سہم گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک ہفتہ سے وہ نہ ڈھنگ سے کھاتی پیتی تھی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ منہ دھوٹا بال بنانا، کپڑے بدلنا سب ہی چھوڑ رکھا تھا۔ گلابی رنگت پہلی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔

فردوس بیگم چند لمحے بیچ بویا بویا رہیں پھر اس کی صورت دیکھ کر نظریں چراتے ہوئے پردہ اٹھانے لگیں۔ ”صبر اور حوصلہ تو رہا ہی نہیں لڑکیوں میں۔۔۔ ناشکری سی ناشکری۔۔۔ ارے ایسا کون بنا پڑا تو دیا ہم نے تمہارے سر پر۔۔۔ منگنی ہی کدی ایک دیکھ بھالے بچے۔۔۔ وہ بھی ہماری محبت میں۔۔۔ کہ بیٹی کو لاڈلوں سے پالا ہے، کہیں اور دینے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ ہماری بیٹی ہماری بیٹیوں کے سامنے رہے گی۔ ہماری آنکھیں اور کلیجہ ٹھنڈا رہے گا لیکن بچی نے تو مانو اندھیر چا ڈالا۔ اتوانی کھلوانی بچے بڑی ہے سو بڑی ہے۔ اب ہمیں بتاؤ ہم کیا کریں؟ ناک رگڑیں؟ پیر پیریں تمہارے؟ اپنے سر پر جوتے ماریں؟ کیا کریں جو تم خوش ہو، بتاؤ؟“

”بہت خیال رکھا آپ نے میری خوشی کا۔۔۔ شکر ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب مزید میں کیا چاہوں گی؟ اپنی آنکھیں اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا سوچا تھا، میرے سر کیا احسان؟“ تبسہ نے ہنس کر کہا۔ ”تو تب سے سلگ رہی ہیں اور ہمیشہ سلگیں گی۔ میرے تصور کی دنیا میں آگ لگ گئی ہے۔ اب مجھے کسی سے کیا؟ آپ خوش ہو گئیں۔ آپ کو مبارک ہو، اب میرا خیال نہ کریں۔“

”کیسے نہ کریں خیال؟ تمہارا خیال نہ کریں اپنی عزت کا تو کریں گے۔ بات پہلے ہی تو ہماری رسوائی ہوگی۔ تمہارا کیا جائے گا۔ تم تو ہیروئن بنی کو نے میں پر ہی ہوگی۔ لوگوں کو تو جوہر۔۔۔“ تبسہ نے ہنس کر کہا۔ ”کاشیہ ہے ہماری لڑکی پر؟ ارے بیٹا! چھوڑو یہ ڈرا ہے۔ ماں باپ کی عزت کا کچھ لحاظ کرو۔ ارے نہیں کر لی تھی تو منع کر دیتیں باپ کو۔ اب ہو گئی تو بھگت لو۔“ وہ پردہ ہلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھیں۔ عریضہ بیٹھی ہونٹ چباتی رہی۔

اتنا جلدی کیسے بھول جاتی۔ دل کی دنیا بننے سے پہلے ہی اجاڑی گئی تھی۔ ابھی تو آنکھوں نے خوش رنگ سنے بننے کا آغاز ہی کیا تھا۔ ابھی تو دھڑکنوں نے نئی تال پر دھڑکنا شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی تھی وقت ہی گزرا تھا۔ سپنا مکمل ہونے سے پہلے ہی اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا تھا اور اب حواس بحال نہ ہونے کی شکایت بھی کی جا رہی تھی اس میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ تنہا کے رنگ اس کی آنکھوں پر رہ گئے تھے۔ ان رنگوں کو مٹنے کے لیے کچھ عرصہ درکار تھا۔

ماں باپ بھی کبھی کبھی بے مروت ہو جاتے ہیں۔ جس اولاد کی خوشی کا لمحہ لمحہ خیال کر کے اسے پروان چڑھاتے ہیں جسے شروع سے احساس دلاتے ہیں کہ تمہاری خوشی ہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اسی اولاد کی رگ جاں سے سب سے خوش کن احساس کو نوج کر علیحدہ کر ڈالتے ہیں۔ زندگی بھر چھوٹی چھوٹی خوشیاں ڈھیر کرتے رہتے ہیں

اور جہاں زندگی کی سب سے بڑی خوشی کا مقابلہ آتا ہے وہاں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ زبان کے مسئلے کھڑے ہوتے ہیں، عزتوں کی بات ہوتی ہے۔ خاندان سے تعلق یاد آتا ہے اور جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اسے بھول جاتے ہیں۔

زبان۔۔۔ ہر شے سے برتر کراؤر دل؟

عزت۔۔۔ ہر شے سے زیادہ اہم اور جذبہ؟

خاندان۔۔۔ وجود کی بنیاد اور روح؟

دل جذبات، روح پیا سے رہ جائیں۔ زبان، عزت، خاندان، خون، جگر سے اپنے ہونے کا خراج مانگیں۔ دل کی ناقابل برداشت اذیت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئیں تو یہ ایکٹنگ قرار پائے۔ ڈراموں میں فلموں میں، قصوں میں، کہانیوں میں، انسانوں میں کیا کچھ بھی سچ نہیں ہوتا؟ آنسو کب جھوٹ بولتے ہیں؟ زبان جھوٹ بول سکتی ہے لیکن آنسو ہمیشہ سچ کہتے ہیں۔

عریشہ جتنا سوچتی، اتنا الجھتی تھی۔ اسے بھولنا چاہتی تھی لیکن وہ آواز خوابوں میں بھی اسے ستاتی تھی۔ وہ جتنے سوچتے تھک جاتی۔ مگر ابھن کا سراپا تھ نہ آتا۔ اسے کیسے فراموش کرے، نئی زندگی کی ابتدا کیسے کرے، نیا کو کیا کہہ کر سمجھائے؟ اس وقت جذباتیت، شوریدہ سری اور غم و غصے کا شدید غلبہ تھا۔ وہ کچھ فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھی۔

”شہرت بناؤں؟“ منیزہ بیگم نے انیقہ کو محبت سے دیکھا۔ ”نہیں اور بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ شوز اتار کر لاؤنج میں ہی صوفے کے گداز پن کا لطف اٹھا رہی تھی۔“ ”پتلی“ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ ”آپ نے دیکھا؟“ اس نے سراٹھایا۔ ”میں خود کچن میں آتی ہوں، بھوک لگی ہے۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ ”انہی دنوں میں۔“ ”یا نچ بچ رہے ہیں۔“ ”آج بہت سہولت رہی۔“ ”انہی دنوں میں۔“ ”پتلی کیوں نہ بتایا۔ حیران جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آؤ، میں کھانا بنا دوں گی۔“

”ایسا؟“ اس نے شہلا کی بابت استفسار کیا۔ ”وہ تو ڈھائی بجے آگئی تھی۔ دونوں ماں بیٹا سو رہے ہیں۔“ ”وہ بتاتے ہوئے کچن کی طرف برہہ گئیں۔ سالن کا ڈونگا مائیکرو ویو اوون میں رکھ کر وہ روٹیاں پکانے لگیں۔ انہی قدموں سے پیچھے سے آکر ان کی گردن میں لاڈ سے بازو سمائل کر دیے۔

”سارا دن لگی رہتی ہیں، ہم سب مل کر کتنا ستاتے ہیں آپ کو۔“ ”وہ ان کے شانے پر سر رکھا کر بولی۔ ”ماں کا کام ہی یہی ہے۔“ ”سکرانی۔“ ”کبھی بیمار پڑ جاؤں تو خدمت بھی تو تم لوگوں کو کرنا ہے۔ ماں کی زندگی اپنی اولاد کے لیے ہی وقف ہوتی ہے اور اولاد کی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔“ ”پتلی بھی ایسی۔۔۔ مجھے کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم لوگ بہت تنگ کرتے ہیں آپ کو۔“ ”پاگل لڑکی۔“ ”وہ ہنس دیں۔“ ”چلو، میز پر سالن رکھو، اور کھانا شروع کرو۔ باتوں میں ہی تم نے سب کچھ ٹھنڈا کر دیا ہے۔“

”بڑے لاڈلے ہو رہے ہیں بھی“ شہلا کی آواز پر وہ دونوں مڑی تھیں۔

وہ لبوں پہ مسکراہٹ لیے بچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ آج کل وہ ہر وقت مسکراتی نظر آتی تھی۔

”جی ہاں!“ انیقا مزے سے بولی۔ ”امی اب پوری طرح سے میرے تصرف میں آنے والی ہیں۔ عباد بھائی لاہور میں اور آپ سرال میں۔ میں اور امی خوب جی بھر کر باتیں کیا کریں گے۔“

”باتیں تو میں اب اپنی بہو سے کروں گی، تمہیں تو میں پڑھائی مکمل ہوتے ہی بیاہ دوں گی۔“ انہوں نے ہات پات میز پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا

”امی!“ انیقا نے احتجاج کیا۔ ”ناٹ خیر! مجھے کچھ تو لطف اٹھانے دیں، آپ کے پورے پورے پیار کا۔“

شہلا بھی گنگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میز پر آ بیٹھی تھی۔

”بھئی تم کیسے لطف اٹھا سکتی ہو۔“ وہ بولیں۔ ”میرا نواسا جو ہے۔ خدا سے سلامت رکھے، وہ کہاں تمہیں لاڈ کرنے دیتا ہے۔“

شہلا ان کا مطلب سمجھ گئی تھی، یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

”شہلا!“ منیوہ بیگم نے اب اسے مخاطب کیا۔ ”بیٹا! وہ لوگ کئی شام آرہے ہیں، نکال دینا، میں تو بے گھر ہوں۔ کل تمہارا آف ڈے ہے نا، اسی لیے میں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ یوں تو نیک کام غیر مناسب نہیں ہے۔“

اب دن نو کیا بل گرن رہی ہوں۔ کب وہ مبارک گھڑی آئے گی اور میں تمہیں اپنے گھر میں روپ میں رکھوں۔“

”امی!“ وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔ ”میں عمر کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

منیوہ بیگم نے کچھ دیر سوچا پھر مسکرا دیں۔

”شروع شروع میں تو مناسب معلوم نہیں ہوتا بیٹی! ہاشم میاں ماشاء اللہ سلجھے ہوئے، نیک طبیعت آدمی ہیں پھر بھی ان کے بھی جذبات و احساسات کا خیال نہیں کرنا ہو گا نا۔ ہاں چند ماہ بعد جب زندگی کی گاڑی ایک طے شدہ راستے پر چل نکلے تو آہستہ آہستہ اس گھر میں عمر کی جگہ بیدار ہو لیتا۔ تب تک میں عمر کا ویسے ہی خیال نہ رکھوں گی جیسا تم خیال کرتی ہو۔ میں اس کی ماں جیسی ہوں، مجھے اس کی نالی نہ سمجھو، ہمیشہ سے وہ تم سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتا ہے۔“

شہلا کی ہلکوں پر نمی تپکنے لگی تھی۔

”میں اس کے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟ ساری رات مجھے اس کا خیال تھا نا۔ وہ رات کو تو میرے بغیر ہی صورت نہیں رہتا۔“

”بہل جائے گا، پتہ ہے۔ تم کون سا میلوں دور جا رہی ہو، دن میں دوبار آ سکتی ہو اسے دیکھنے۔“

”میں زیادہ دن اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔“ وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بس ہفتہ بھر میں لے جاؤں گی اسے۔“

”جی ہو۔“ منیوہ بیگم مسکرائیں۔ ”میرا بھی اعتبار نہیں ہے؟“

”آپ کا اعتبار نہ ہوتا تو کبھی ہامی نہ بھرتی۔“ وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ، اگلے چاند کی تاریخ تمہارا دس؟“ اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”اس راہ پر چلنا ہی ہے تو سوچنا کیا؟“

انیقا غور اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

”تو پھر ملے ہے بہن، اگلے چاند کی دس تاریخ؟“ شفیقہ جیات نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ منیوہ بیگم کے روم روم سے مسرت کی لہریں نکل رہی تھیں۔

”جلے پھر منہ بیٹھا کرتے ہیں۔“ انیقا نے ڈانٹنگ ٹیبل کی جانب اشارہ کیا، جمال اس نے بے حد پر تکلف قسم کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

سی گرین کمر کے کڑھائی والے لباس میں شہلا صوفے پر بیٹھی تھی۔ سر پر آنچل لیے، نگاہیں جھکائے وہ خالصتاً ”مشرقی لڑکیوں کے انداز میں بیٹھی کارروائی ملاحظہ کر رہی تھی۔ وہ وہاں آنے سے بھی گریزاں تھی اور اپنے کمرے میں ہی بیٹھنے پر مصر تھی، لیکن ایقان اور انیقا اسے پکڑ لاتی تھیں۔

ایقان چند لمحوں میں ہی اپنی پلیٹ بھر کر اس کے قریب آ بیٹھی تھی اور اب بے حد شوق سے ایک روٹ لکھا رہی تھی۔ شہلا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں بے حد بھرے بھرے گداز جسم کی مالک، روشن و شاداب چہرہ لیے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شہلا چند لمحے اس پر سے نظر نہ ہٹا سکی۔

”تم بھی کھاؤ نا۔“ ایقان اس کی توجہ محسوس کر کے بولی۔ ”ہم سے کیسی جھجک، ہم تو سب تمہارے جانے پہچانے دیکھے بھالے ہیں۔ یہ لوگ اب جاسن میرے ہاتھ سے کھاؤ۔“

اس نے اپنی پلیٹ میں رکھا گلاب جاسن اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ بیشتر حاضرین محفل مسکرانے لگے تھے۔

”تم ایقان کی بچی۔“ وہ بولی تھی۔ ”سدا ہر وہی نہیں۔“

”یہ جملہ میرے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔“ ایقان ہنسی۔

اس کی ہنسی میں مسرت تھی۔ شہلا اسے پھر سے بغور دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ غالباً مجھ سے۔“

انصاف کرنے کا تہہ کیے ہوئے تھی۔

”کچھ دیر بعد آؤں گی؟“ ایقان نے شرارتاً پوچھا۔

شہلا بیٹھ کر اپنی پلیٹ مزید کرنے سے باز رہی۔

ایقان اپنی پلیٹ مزید کرنے سے باز رہی۔

”اب اپنی بھلی نوکری تو تم چھوڑ دو گی نہیں۔ نہ ہی ہم کوئی زور زبردستی کریں گے، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ کمانا چاہتی ہو تو شوق سے کماؤ لیکن چھٹیاں لے لینا، مادہ دوا کی۔ آخر ہمارے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔ پہلا پہلا لڑکا ہے ہمارا۔ کچھ تو شوق پورے کر لیں۔“

انہوں نے حسرت سے سانس بھری تھی۔ شہلا خفیف سی ہو گئی۔

”نہ۔“ وہ بے وجہ ہی کھنکھاری۔ ”عریشہ نہیں آئی؟“

”اے ہاں۔“ آج کل کی لڑکیاں اپنی مرضی کی مالک۔ ہم نے تو بہتیرا کہا، بہن نے سمجھایا۔ وہ منہ لپیٹے پڑی رہیں۔ بے چاری کی طبیعت خراب ہے کافی دن سے۔“

”خیر تو ہے۔“ شہلا بولی۔ ”کیا ہوا ہے؟ آپ لے آئیں تو میں چیک اپ کر لیتی۔“

”ارے نہیں۔“ وہ مزید گھبرائیں۔ ”ایسی کوئی خاص بات نہیں، سرور کی شکایت کرتی ہے۔ میں نے کما نظر چیک کروا لو۔“

انہوں نے جلدی سے بات سنبھالی پھر موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”عمر کہاں ہے؟“

”جی دوبا ہر لان میں ہے۔ ایتان کے بچوں کے ساتھ۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ مومن میاں کا دوست ہے نا۔“

”جی ہاں۔“ شہلا مختصراً بولی۔

”ماں سے ملنے آؤ تو اس سے بھی مل جایا کرنا شروع شروع میں تو تنگ کرے گا ناںی کو پھر ہل جائے گا۔“

نے چونک کر سر اٹھایا۔ قدرے فاصلے پر کھڑی انیقہ کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔

”اب ایسے بچوں کا تو مسئلہ اٹھتا ہی ہے بعد میں۔ یہ تو پہلے سوچنے کی باتیں ہیں۔“

اس سے پہلے کہ شہلا کچھ بول پاتی وہ وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ شہلا کی ابھی ہوئی نگاہیں انیقہ کی محتاط نظروں سے ٹکرائیں۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

گلاس ڈور بے فکری سے کھول کر اندر آنا نافع بری طرح سے چمکا تھا۔

وہ سامنے بڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔ گیلے بال اس کے آواز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مریم کامی ٹیشن کا سوٹ پہنے وہ قدرے افسردگی سے عالم میں بیٹھی تھی۔

وہ پلٹ میں پڑا آئیٹ بے دلی سے کھا رہی تھی۔

نافع شوخی سے کہنے لگا۔

عزیز نے اس کی نظریں اٹھائیں اور ایک دم گڑبگڑ گئی۔

”آپ۔۔۔“ اس ایک لفظ میں بیزاری کو فٹ ناپسندیدگی سب کی رچھ تھا۔ وہ گڑبگڑا گیا۔

”ہاں وہ۔۔۔ علی۔۔۔ مجھے اس نے مس کال دی تھی۔“

”علی اوپر ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

پھر یوں سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی جیسے اس کے وہاں سے جانے کی خواہش تھی۔

نافع چند قدم آگے بڑھا شاید اسے کچھ خیال آیا تھا۔

”تم شہلا آلی کے گھر نہیں گئیں اتنے اہم موقع پر؟“

”نہیں۔“ وہ مختصراً بولی۔

نافع نے اس کی صورت دیکھی۔

”کسی سے لڑائی ہو گئی ہے کیا؟“ وہ مسکرایا۔

اس کی ہچکانہ طبیعت سے چھوٹے بڑے سب ہی واقف تھے۔ عزیز نے خاموش نظریں اٹھا کر چند لمحے اسے

دیکھا پھر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔ اس کی نظروں میں نجائے کیسی غیرت تھی کہ نافع سے پھر کچھ نہ بولا جاسکا۔

وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

اچانک ہی دل و دماغ شدید قسم کی بغاوت برپا آئے تھے۔ اس نے پلیٹ میں رکھا آئیٹ بیزاری سے پرے

سر کا دیا۔ نمک والی بات مار کر گرا دی۔ میز پر رکھا اخبار اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اور پھر جیسے بے بس ہو کہ میز پر سر

وہ اس قدر خاموش تھی کہ ترانہ کو اسے مخاطب کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے محض ربیعہ کی

خاطر چھٹی کی تھی اور صبح سے اس سے بات کرنے کے بہانے تلاش رہی تھی۔

اور ربیعہ روٹ کے سے انداز میں روز مرہ کے کام کر رہی تھی۔ کوئی اس سے کچھ پوچھتا تو وہ اسے میکانیکی انداز

میں جواب دے دیتی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔

ترانہ اس کی کیفیت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے ربیعہ سے ڈر لگ رہا تھا۔ یہ ربیعہ بے حد اجنبی معلوم ہو رہی

تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے گانگی نہ تھی لیکن شناسائی کا جذبہ بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی نگاہوں سے وہ اس کی سمت

دیکھتی تو ترانہ نظریں جرابیتی تھی۔ ترانہ اس سے کچھ کہنے کے لیے پر توتی تو وہ کتر جاتی۔

پھر ترانہ کو ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ صولت تصور اور تمدن گھر پر نہ تھے۔ مینا بیگم حسب معمول محلے کے ٹور

پر نکلتی ہوئی تھیں۔ ترانہ نے چپکے سے ربیعہ کو دیکھا اور چادر لے کر گھر سے نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوٹ آئی

تھی۔ اس کے ہاتھوں میں شاپر ز تھا۔

”۔۔۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”دیکھو تو میں کیا لائی ہوں؟“

بیٹھی سبزی بنارہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر بے اثر نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہمارے گڈا میں۔“ ترانہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ”جلدی سے کھول کر دیکھ لو پھر انہیں اپنے سوٹ کیس

میں رکھو۔ اس سے پہلے کہ کوئی آجائے۔“

”یہ تم رکھو ترانہ۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔ ”میں بھلا ان کا کیا کروں گی؟“

”میں؟“ ترانہ کو حیرت ہوئی۔ ”لیکن یہ تمہارے لیے ہیں ربیعہ! یہ میں نہیں لے سکتی اور پھر ذرا کھول کر تو

دیکھو کیا آیا ہے؟“

اس نے بات کرتے ہوئے شاپر ز بستر پر الٹ دیے۔ بہت سی چیزیں نکل کر وہاں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ کچھ کتابیں

تھیں۔ ایک بلیٹ۔ ایک خوبصورت ڈائری، قیمتی پین سیٹ اور کچھ اسٹڈ ٹواز تھے۔ ترانہ ایک ایک چیز

اٹھا کر شوں۔۔۔ کتنی رعبہ میں اس نے کچھ کہنے کے لیے اشتیاق سے سراٹھایا تھا کہ ربیعہ کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔

ربیعہ کہیں اور دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کھانسی کی آواز سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنے لب و لہجوں سے

کچھ کہتے۔

”ربیعہ!۔۔۔“ وہ بے ساختہ ہی اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”اتنی اداس کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

ترانہ چپ ہو گئی۔ سب ہی کچھ تو اس کے علم میں تھا۔

”گفتگو اچھے ہیں نا؟“ وہ پھر بولی۔

”ہاں۔“ ربیعہ جیسے بے خیالی میں بولی تھی۔

”انہیں سنبھال کر رکھ لو۔“ ترانہ نرمی سے بولی۔

”انہیں تم رکھ لو ترانہ۔ میں بھلا ان کا کیا کروں گی۔“ وہ دیا سیت سے بولی تھی۔

”میں۔۔۔ میں بھی ان کا کیا کروں گی ربیعہ؟“ ترانہ نے سب چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تو تمہارے لیے

خرید آیا ہے۔ ایک بات پوچھوں؟ بہن دین کر؟“

ربیعہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم۔۔۔“ ترانہ جھجکی۔ ”تم تمدن بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ ہے نا؟“

ربیعہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

”تم۔۔۔ عباد کو چاہتی ہو؟“ ترانہ نے آہستگی سے پوچھا۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں کھیر تھا۔

”ترانہ! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے بالآخر لب کھولے اور گلے میں گھلتی نمی کو محسوس کیا۔ ”میں

بس اتنا جانتی ہوں کہ میں مردوں سے الگ رہوں۔ کیوں؟ کب؟ کیسے۔۔۔ ان سوالوں کے جواب نہیں ہیں میرے

پاس۔ بس میں شادی نہیں کر سکتی۔ میں یہاں اس گھر میں ساری عمر بتانے کو تیار ہوں ترانہ! میں۔۔۔ میں پیچھا

جان کی خدمت کروں گی۔۔۔ جب تک ان کی یا میری زندگی ہے، میں تمدن بھائی اور تصور بھائی کی شادیوں کے گیت

گاؤں گی، ان کی دہنوں کے چاؤ اٹھاؤں گی۔۔۔ پیچھو کے لیے صولت بن جاؤں گی لیکن پلیز ترانہ! مجھ سے شادی

کے لیے اصرار نہ کرو مجھے اس سے بچالو ورنہ۔۔۔ ورنہ شاید میں مر جاؤں گی۔“

وہ سسکا اٹھی۔ ترانہ اس کی پشت سہلانے لگی۔

”پہلی۔۔۔ میں تو نجانے کیا سمجھ بیٹھی۔ مجھے لگتا ہے ربیعہ! تمہاری زندگی میں کچھ ایسے حادثات گزرے ہیں

جنہوں نے تمہیں مردوں سے متنفر کر دیا ہے ورنہ تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم اس قدر گہرائی سے ان معاملات کا

تجزیہ کر سکو۔“

”کچھ بھی سمجھ لو“ ربیعہ گلو گیسے میں ہلی۔ ”تم تمدن بھائی کو سمجھاؤ ترانہ! انہیں بہت اچھی لڑکی مل سکتی

ہے۔“

”تم بھی تو بہت اچھی ہو ربیعہ!“ ترانہ نے محبت سے کہا۔

ربیعہ چونک کر ترانہ کی جانب دیکھنے لگی۔ گویا اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”دیکھو ربیعہ! اگر بات یہ ہوتی کہ تم تمدن بھائی کو ناپسند کرتیں، میں کسی کو بھی تم سے زبردستی نہ کرنے دیتی یا

اگر تم کہیں اور شادی کر دینے کی خواہش مند ہوتیں جیسا کہ عباد سے۔۔۔ تب بھی ایک ٹھوس وجہ بنتی

لیکن محض اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ تم شادی نہیں کرو گی۔ یہ بات اس کے ذہن میں نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ

قدم اٹھانا ہی ہو گا تو پھر آج ہی کیوں نہیں اوسسے اور اگر تمہارے ذہن میں واقعی کوئی نتیجہ کوئی پائیڈیل نہیں ہے تو

پھر۔۔۔“

وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اب کی بار سر اٹھا کر اسے نہ دیکھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ترانہ کا مطلب کیا

ہے۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے ہاتھ تھام کر خوشامد سے بولی۔ ”ربیعہ! تم اس گھر کو سنبھال سکتی ہو، سنوار سکتی ہو۔

تمہاری ”ہاں“ اس گھر کا مقدر بدل ڈالے گی مجھے یقین ہے۔“

ربیعہ کے اندر آنسو گرنے لگے۔ طوفانی ہوائیں زور پکڑنے لگیں۔ اس کا دل شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا

لیکن وہ ساکت بیٹھی رہی۔

”پیچھو نے حقیقتاً میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے نظر آنے لگا کہ اس گھر کی خوشیاں صرف تمہارے وجود

سے وابستہ ہیں۔ یہاں چاہتوں کے گل و گلزار محض تم کھلا سکتی ہو۔ اتنی محبت، اتنی طاقت میں نے تم میں پائی ہے

ربیعہ! تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو۔ اس گھر کے معمولی افراد کو اپنا کر غیر معمولی کر سکتی ہو۔ میں جانتی ہوں ربیعہ! میں

بہت زیادہ طلب کر رہی ہوں لیکن محض تمہارے اندر موجزن بھلائی کے سمندر کے سہارے میری اتنی ہمت

ہو پائی ہے۔“

ربیعہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ترانہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ اس سے

سائلس لیٹا محال ہونے لگا تھا۔

”بولو تاربیہ!“ ترانہ جیسے خود بھی کسی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔

ربیعہ خاموشی سے اپنے بچے آنسو صاف کرنے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا انداز ہار مان لینے والا تھا۔

موبائل کی ہپ بہت دیر سے بج رہی تھی۔ عاشق بہت تھک کر سویا تھا اس لیے اسے شعور کی کیفیت میں آئے

میں کچھ وقت لگا۔

”ہیلو؟“ بدقت تمام اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“ لڑکی شوخ آواز گونجی۔ ”کیسے ہو ڈار لنگ؟“

”فائن۔“ وہ مکمل طور پر حواسوں میں آنے کی کوشش کرنے لگا۔

”لگتے تو نہیں ہو۔“ خیر کیا کر رہے ہو؟“

”اس وقت تو تم سے باتیں کر رہا ہوں۔“ وہ بیٹھ کر جمائی لینے لگا۔ ”چند لمحوں قبل سو رہا تھا۔“

”اوس۔“ میں نے تمہاری نیند خراب کی۔ سوری۔“ وہ شوخ بولنے لگا۔

اس کا اچھ اس کے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔

”کیسے میم! نیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“

”خدمت میں آپ کی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ ”آپ ہمارے پسند کریں گے؟“

”کیا؟“ اس نے ایک اور جمائی لی۔

”میری خدمات۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً“ یہ کہ چھٹی کا دن ساتھ گزارتے ہیں، میں تمہارے لیے کوئی اچھی سی ڈش بناؤں گی۔ ہم لنچ ساتھ کریں گے اور آؤنگ پر چلیں گے۔“

”ہوں۔ اس پورے پروگرام میں آپ کی خدمت محض لنچ بنانے تک محدود ہے مادام؟“

”جو آپ چاہیں پروگرام میں شامل کیا جاسکتا ہے۔“ وہ سب سے باکی سے بولنے لگا۔

عاشق کو رگوں میں لہو گرم ہوتا محسوس ہوا۔

”کافی اوپن مائنڈ ہیں آپ۔“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔

”صرف تمہارے لیے۔“ اس نے جتایا۔

”مائی گاڈ۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تم کچھ کر کے رہو گی۔“

”شیور۔“ وہ ہنسی۔

”یا پھر میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”مائی پلینز۔“ وہ گنگنائی۔

”یا سہ! تم چاہتی کیا ہو؟“ وہ نہج ہوا۔

”آجاؤں؟“

”اوکے۔“ اس نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔

”سوائس آف یو ڈار لنگ۔۔۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

عاشق نے موبائل آف کر دیا۔ دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا کر وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ آج کا پورا دن وہ سو کر گزارنے کا

راہ رکھتا تھا اور اس نے گیارہ بجے ہی اٹھادیا تھا۔ ساری نیند آبی بخارات کی مانند اڑ گئی تھی۔

وہ گہری سوچ میں گم تھا پھر سر جھٹک کر وہ نہانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

باشم آفس جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ ٹائی صحیح انداز میں سیٹ کرنے کے بعد اب پلین وہاٹ شرٹ کے

کف لٹکے لگا رہا تھا۔ ایک نظر اس نے آئینے پر ڈال کر بالوں میں جلدی جلدی انگلیاں چلائی۔

”کافی ہینڈ سم ہو یا ر!“ اس نے اپنے عکس سے کہا اور مسکرایا۔

فون کی بیل بج رہی تھی۔ وہ برش کرتا ہوا وہاں تک آیا۔

”ہیلو! باشم از میسر۔“

”ہیلو۔“ باشم انکل۔ میں عمرات کر رہا ہوں۔“ معصوم آواز کی چکار گونجی تھی۔

باشم نے ابلوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ہیلو میسر!۔۔۔ کیسے ہو؟“

”فائن۔“ آپ آفس جارہے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ آپ نے چلنا ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”تھو۔۔۔ آپ؟“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”جی ہاں۔“ میں آؤں گا۔ ابھی دین والا نہیں آیا۔“

54

”نہیں۔“

”کیا کرونا یا ر! کام کے بندے نہیں ہو تم۔“

”ممانع کرتی ہیں نا۔“ وہ منمنایا۔

”کیا کہتی ہیں؟“

”وہ کہتی ہیں مجھ سے پایا کی باتیں مت کیا کرو۔ وہ تمہارے پایا ہیں مگر میرے کچھ نہیں ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

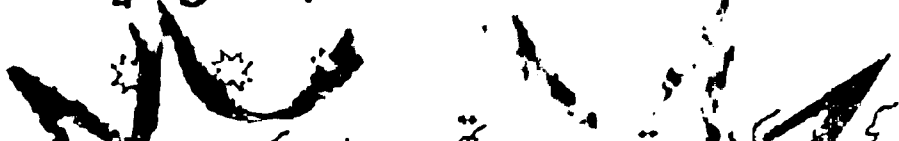
”اچھا!“ لگتا ہے تمہیں وکالت سکھانا پڑے گی۔ خیر ہم بھی تمہارے باپ ہیں یا ر! کیا یاد کرو گے تم اور۔ تمہاری ماما۔“

”پاپا میں لیپ ٹاپ (کمپیوٹر) لوں گا۔“ موضوع تبدیل ہونے سے وہ بیزار ہوا تھا۔ ”میرے سب فرینڈز کے پاس ہے اور چھروں والی گن بھی۔ ماما مجھے نہیں دلاتیں۔ وہ کہتی ہیں تم کسی کوز خمی کرو گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دلاؤں گا۔ ویسے تو بہت سافٹ ہارڈ ہیں تمہاری ماما! مگر ہمارے کیس میں تو۔“ اس نے جملہ اوتھورا اچھوڑ دیا۔

”خالہ جانی آگئیں۔“ عمر نے سیڑھیاں اترتی انیقہ کو دیکھ کر کہا تھا۔

”اوسکے جانوس خدا حافظ۔“ اس نے فی الفور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔



ربیعہ کیچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ صولت بھی خلاف معمول آن کچن میں نظر آرہی تھی۔ وہ آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً اسے سالن بنانے کا آرڈر ملا تھا۔ تمدن اور مینا بیگم آج بڑے خفیہ انداز میں خوش خوش کہیں روانہ ہوئے تھے اور تاحال نہ لوٹے تھے۔ تصویر چھت پر چنگیس اور اراکھان تھا اور ترانہ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر آئی تھی اور کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی ہوئی تھی۔

کیچن کی کھڑکی سے لال فرش والے صحن کا منظر نظر آرہا تھا۔ فرش خشک پتوں سے اٹلا ہوا تھا۔

”برتن دھو کر آج کچن میں جھانڈ لگاؤتی صولت۔“ ربیعہ نے دل میں سوچا۔

”اچانک ہی اسے اپنا کھن یا د گیا تھا۔ جہاں ہمارے گھر کے ختمے پتے پھول پھول بکھرا کرتے تھے، جنہیں وہ روز سیٹھتی تھی جن کی خوشبو اسے دیوانگی کی حد تک پسند تھی۔ بچپن میں بھی وہ ان پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر پھرا کرتی تھی۔“

ربیعہ کو دادی جان یاد آئیں۔ ان کا چمکتا چہرہ، شفیق مسکراہٹ، مہربان لمس، شناسا خوشبو۔

ربیعہ کسی اور منظر میں جا پہنچی تھی۔ جب گیٹ کھلنے کی آواز سے وہ حال میں لوٹ آئی۔ تمدن اپنی موٹر سائیکل اندر لا رہا تھا۔ مینا بیگم ہاتھوں میں کئی شاہرز تھا اس کے ہمراہ تھیں۔

”امی آگئیں۔“ صولت مسرت سے چلائی۔

ربیعہ کو اندازہ ہوا کہ وہ ان دونوں کے ایک ساتھ کہیں جانے کے مقصد سے واقف تھی اور بات کچھ ایسی تھی کہ وہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ وہ جلدی آلو پرے کھسکا کر کیچن سے نکل گئی۔ ربیعہ گوگو کی کیفیت میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا پھر مینا بیگم نے کیچن میں جھانکا۔ ان کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو ربیعہ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

”ربیعہ ذرا یہاں تو آؤ۔“ وہ کمال مہربانی سے گویا ہوئیں۔

ربیعہ کے ہاتھوں پر صابن کا جھاگ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی پھر میکا کی انداز میں وہ انہیں دھونے لگی۔ ہاتھ دھو کر وہ کچن سے نکل کر کمرے میں آئی۔

تمدن مینا بیگم صولت اور ترانہ سے چاروں ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ ربیعہ کی نگاہ ان کے چہروں سے پھسل کر ان کے درمیان رکھی چیزوں پر گئی۔

”دیکھو ربیعہ! یہ جوڑا کیسا ہے؟“ مینا بیگم نے گہرا سرخ متعیش کے کام سے سجا ہوا سوٹ لہرایا۔

”اُمی!“ صولت جلدی سے بولی۔ ”یہ میرا ہوگا۔ ربیعہ کو دو سرا والا دے دیں۔ مجھے لال رنگ پسند ہے۔“ ترانہ نے خفگی سے صولت کو گھورا تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ مینا بیگم جلدی سے بولیں۔ ”تمہیں یہ پسند ہے تو تم یہ لے لو۔ ربیعہ تو بے چاری بہت صابر و شاکر بنی ہے۔ ایسی باتوں کو محسوس نہیں کرتی۔“

انہوں نے جلدی جلدی شاپر سے دو سرا سوٹ برآمد کیا۔ وہ گہرے جامنی رنگ کا تھا۔ اس پر بھی متعیش کا ہی کام تھا۔

صولت نے دو سرا سوٹ دیکھتے ہی جلدی سے جھپٹ لیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یہ لے لیتی ہوں۔ یہ زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔“ مینا بیگم نے صولت کو دیکھا۔

”لے لائی تھیں اُمی کو دے دیں۔“ ترانہ نے بد مزگی سے اسے دیکھا۔

”مسکون سے دیکھتے دو چیزیں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ہیں۔“ ربیعہ نے جو بوجھیں پسند آتی جا میں وہ تم رکھتی جاننا۔ ربیعہ کے لیے بے شک کچھ نہ بچے۔“ ترانہ جل کر بولی۔

صولت کے چہرے کے زاویے کئی بار بگڑے مگر وہ اس قدر فکوش تھی کہ اس نے ترانہ کی خفگی کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

”یہ سینڈل ہیں۔“ مینا بیگم نے سلور کلر کی دو سینڈل ایک شاپر سے برآمد کیں۔ ”ان پر لڑائی نہیں ہو سکتی۔“

صولت نے سینڈل غلٹ کے عالم میں ان کے ہاتھ سے چھین لی اور پہننے لگی۔ مینا بیگم اس کے انداز پر دل کھول کر ہنس جگہ جبکہ ترانہ کے چہرے پر شدید بیزاری کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ تمدن صوفی پر بیٹھا خواتین کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے خواہیہ کے حوالے سے وہی بات کہی۔

ربیعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کیا تھا، کس لیے تھا، کیونکر تھا؟ وہ سمجھ کر بھی سمجھ نہ پا رہی تھی۔

”آہ! ایک ایک۔“ بولی بکس دیکھ کر صولت چلائی۔ ”مزہ آگیا۔ میں تو روز تیار ہوں گی۔“ اچانک ہی کمرے میں تصور داخل ہوا پھر اندر ہونے والی کارروائی دیکھ کر وہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ غالباً ”ربیعہ کی طرح وہ بھی لا علم تھا۔“

”یہ کیا ہے؟“ وہ آگے بڑھ آیا اور اشیاء کے متعلق استفسار کرنے لگا۔ ”یہ کس کے کپڑے ہیں؟“ اشکارے مارتے۔

”بوجھو تو جانیں۔“ مینا بیگم ہنسیں۔

صولت شرمانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ تصور نے الجھے الجھے انداز میں سب کے چہروں پر نگاہ کی۔

دیکھا مطلب؟ یہ کون سی ساتیں ہو رہی ہیں؟“

”ہکا ز شیں؟“ ترانہ اچھپے سے بولی۔ ”اس میں سازش کی کیا بات ہے۔ کیا آپ بھول گئے کہ دو سال قبل صولت سے آپ کی منگنی ہوئی تھی۔“

”اس منگنی کا یہاں کیا ذکر؟“ وہ مسلسل بگڑا ہوا تھا۔

”ذکر یہ کہ منگنی کے بعد شادی بھی ہوئی ہے۔“ تمدن نے بالآخر قطع کلامی کی۔ اس کے لمبے میں کرختگی تھی۔

”اور اب تمہاری شادی ہو رہی ہے صولت کے ساتھ۔“

”ساتھ ہی تمدن اور ربیعہ کی بھی شادی ہے۔“ مینا بیگم نے آرام سے بتایا۔

ربیعہ کے سامنے رکھی ہر شے دھندلانے لگی۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ دل کو جیسے کسی نے پیچھے لے لیا۔ بے رحم گرفت میں سختی سے بھیج کر ترانے اور پھر کتنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

”اگلے ہفتے نکاح ہے۔“ مینا بیگم اطمینان سے چیزیں سمیٹنے لگیں۔

”کمال ہے۔“ تصور اچانک ہی بھڑک اٹھا تھا۔ ”مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں اور لگے اپنی اپنی کہنے۔ مجھے تو اس کی دادی کرنی اور اس صولت سے تو ہرگز نہیں۔ ربیعہ سے تو میں شادی کروں گا۔ بھلا یہ۔ یہ آدمی اس کا بھائی ہے؟“

اس نے ختم سے تمدن کی جانب اشارہ کیا۔ تمدن پر گویا کسی نے تیل ڈال کر تیلی دکھادی۔ وہ لپک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے تصور کو زور سے دھکا دیا۔

”کتنے تیری یہ مجال۔ تو اس پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور تو خود کس قابل ہے۔“

تصور نے کمر اس کا جھان پکڑ لیا۔ دونوں بھائی آپس میں کھم کھم ہو گئے۔ عورتیں چیخنے لگی تھیں۔ ربیعہ تو کچھ پائی پائی پھٹی پھٹی نظروں سے وہ دونوں بھائیوں کو آپس میں لڑتا دیکھتی رہی۔ ترانہ اور مینا بیگم آگے بڑھ کر غلجہ کی کھڑکی کو کھینچنے لگیں جبکہ صولت زور زور سے رونے لگی تھی۔

”زنی۔“ صولت نے کچھ کہہ کر چلائی۔ ”بس پر مٹی ٹھنڈا کھجے میں؟ لگاری آگ میری زندگی میں؟ مجھے پتا تھا۔ اچھی طرح پتہ تھا تو کوئی غصہ نہ کرتا۔“ ایسے ہی لپچھن تھے تیرے۔“ ترانہ لپک کر آئی۔ اس نے

”وہ تو کھانا ہے۔“ وہ چیخیں۔ ”اپنے گریبان میں جھانکو۔ تم نے کیا کیا حرکتیں نہیں کیں یہاں سب کی نظروں کے سامنے؟ اس پر الزام لگاتی ہو۔ اپنا آلودہ من وہ کھو اسی لیے تصور بھائی نے تم سے شادی سے انکار کیا ہے۔ تم جیسی لڑکیوں کو کون پوچھتا ہے۔“

”دفعاً“ مینا بیگم نے مڑ کر ترانہ کے بال دیوے۔

”وہم بخت! میری فرشتہ صفت بیٹی پر الزام دھرتی ہے۔ خود نجانے کیا کچھ گل کھلا کر آئی ہے باہر۔ پرائے لڑکوں سے ختمے تھانف و صولتی پھرتی ہے۔ ایسے کون کسی کو کچھ دیتا ہے۔ بدلے میں تو کیا دیتی ہے اسے؟“

تمدن تصور سے علیحدہ ہو کر ترانہ کے بال مینا بیگم کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

کمرے میں کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، چیخنے چلانے کی آوازیں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔

ربیعہ کی نظروں کے سامنے سب کچھ اوٹھل ہونے لگا۔ بالآخر وہ تیرا کر نیچے گری۔ اس کا سر چارپائی کے پاس سے ٹکرایا تھا۔ اچانک ہی خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔

عرشہ نالغ کے رشتے کا سنتے ہی منگنی سے انکار کر دیتی ہے۔ لیکن فاروق حسن سمجھا بھجا کر اسے راضی کر لیتے ہیں۔
 رافع شاعری شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نظم ہاشم کو بہت پسند آتی ہے۔
 ابرار شہلا کو فون کرتا ہے اور دوبارہ تعلقات کی استواری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شہلا سنتے ہی رنگ رہ جاتی

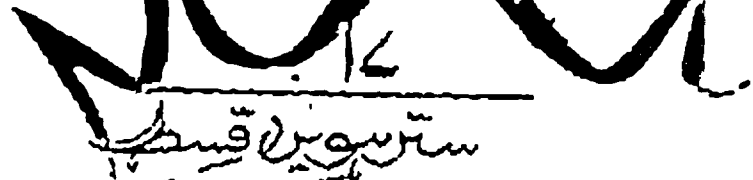
ہے۔
 ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رضا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر
 مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر
 گھناؤنے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نتائج کی دھمکی دیتی ہے۔
 انیقہ ابرار دیوانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی
 ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

یارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عبادتے ہوتی ہے۔ تمدن۔ یارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس
 کے یارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ماس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو منگنی کی انگوٹھی پہناتی ہیں شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ
 شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
 لیکن اس پر غم کا پہاڑ اس وقت ٹوٹتا ہے جب بیگم اس سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔



ایک کراہ کے ساتھ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے اس کے لبوں سے چند بے
 معنی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔ اس کے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ بھری ہوئی موجوں کی
 مانند اس کے احساسات سے پوری شدت سے آکر ٹکرا رہی تھیں۔

ربیعہ کی ادھ کھلی آنکھوں نے بڑے بڑے گہرے گہرے نظر سے ترانہ کی نظر کوئی۔ ترانہ کے
 چہرے پر تاسف اور فکر مندی واضح تھی۔ ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے بولنا چاہا تو کراہ کر رہ گئی۔
 ”ترانہ“ یہ بمشکل بولی تھی۔

”ہاں ربیعہ!“ اس نے اپنے ہاتھ کو ترانہ کے گرم برخلوص ہاتھوں میں پایا۔ ”میں ہوں تمہارے پاس۔ اب
 کیسی طبیعت ہے تمہاری تم تھیک تو ہونا۔ دو روز زیادہ تو نہیں ہو رہا؟“
 ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر ترانہ کا چہرہ دیکھتی رہی جس پر اب ایک مہربان برخلوص
 مسکراہٹ تھی۔

”تم گر گئی تھیں ربیعہ۔ تمہارا سر پھٹ گیا تھا۔ پھر خون بہنے کی وجہ سے تم نقاہت سے بے ہوش ہو گئیں۔
 ابھی ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے تمہاری بینڈج کی اور انجکشن بھی لگایا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمہارا بلڈ پریشر بہت زیادہ لو
 ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔“

ترانہ اسے دیکھے دیکھے انداز میں بتا رہی تھی۔ ربیعہ آنکھیں موندے سنتی رہی۔
 ”کیا بات ہے ربیعہ۔ تمہارا بلڈ پریشر آخر اتنا لو کیسے ہو گیا؟ کیا تم نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے؟ یا۔۔۔ یا۔۔۔ تم نے

بست زیادہ ٹینشن لی ہے؟ کیا بات ہے، مجھے تو تاؤ۔

ربیعہ کی بند پلوں سے ایک قطرہ نکل کر اس کی کپٹی سے ہوتا ہوا اس کے بالوں میں کہیں گم ہو گیا۔ اس ہونٹ دھیرے دھیرے کانپنے لگے۔ وہ شاید خود بہت ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ترانہ اس کا ہاتھ ہولے تھپکتے ہوئے پر سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔



”مجھے پتا تھا۔۔۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا ای! جس دن میں نے اس جڑیل کا یہ سفید چہرہ دیکھا تھا، اسی دن میرے میں ایک سوئی سی کھب گئی تھی۔ آخر وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔۔۔ ہوا نا وہی؟“ صولت فریاد کنناں تھی۔

”چل اب بند کر اپنی بکواس۔ کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑا تیرے سر پر۔“ مینا بیگم کی تند آواز آئی۔ دودھ کا پیالہ ربیعہ کی انگلیوں میں کنب کر رہ گیا۔ اس نے سامنے بیٹھی ہوئی ترانہ پر ایک تھکی تھکی سی نگاہ ڈالی۔ ترانہ نے اس کی نظریں محسوس کیں لیکن اس نے نگاہ اٹھا کر ربیعہ کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنی سوجھی ہوئی ڈوبی ہوئی لگتی تھی۔

”اور کیسے ٹوٹا ہے آسمان؟ وہ ڈائن میرا کلیجہ نوچ کر لے گئی اور اب کتنی ہیں کس۔۔۔“ اس نے شدت سے صولت کی آواز بیٹھ گئی۔ اس سے بولنا نہ گیا۔

”نہ مرنے نہ مرنے ہو جائے گا سب کچھ ٹھیک۔۔۔“ مینا بیگم قد کے آگے آگے سے بولیں۔ ”ادھا کام تو نیٹ ہے یا ابی ادھا بھی نیٹ جائے گا۔“

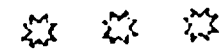
”کیسے۔۔۔ کیسے ہو گا سب کچھ؟ وہ تو کہتا ہے صرف اسی جہنم جلی سے شادی کرے گا۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے صولت! ہم بیٹھے ہیں تم لوگوں کے سروں پر۔ اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مینا بیگم اب کی بار قدرے سہولت سے بولیں۔

”شادی کر کے بھی تو اسی کا دم بھرے گا نا۔۔۔ مجھے کب پوچھتے گا۔۔۔ مجھ سے تو دل بھر گیا اس کا۔۔۔ اب توئی ہو اؤں میں اڑنا چاہتا ہے۔ یہ دن رات سامنے رہے گی تو۔“

”مر جا کہینی!“ مینا بیگم اب یکایک ورشت ہو گئیں۔ ”پھر کھالے زہر۔۔۔ یہاں ہم پہلے ہی پریشان بیٹھے ہیں۔“

”جھے ماتم سوچ رہے ہیں۔ کہہ جو دیا سب ٹھیک ہو جائے گا پھر۔۔۔“ مینا بیگم کی ہنسی سن کر سولت غائب ہو گئی۔ صولت غالباً ”ماں کے جارحانہ تیور دیکھ کر سہم گئی پھر اس کی سسکیاں بھی اچانک ہی کسم گئیں۔ ترانہ ہونٹ چبانے لگی تھی۔ ربیعہ کو نجانے کیوں ترانہ سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ اس نے جلدی سے ہلادی ملا دودھ کا پیالہ لبوں سے لگالیا۔



”سوٹ کا کلر ہاشم سے پوچھ لیتا جا رہی ہے۔“ رُجوش ہوتی ایقان، فردوس بیگم سے کہہ بیٹھی پھر فوراً ”ہی ٹھنڈی پڑ گئی۔ انہوں نے از حد بد مزگی سے تھوک نکالا تھا۔

”جی پیچھو۔۔۔ زبردست آئیڈیا پیش کیا ہے آپ نے۔“ رافع اندر چلا آیا تھا۔ ”دو لہا میاں کا سوا سیر خون برہہ جائے گا اس استفسار پر۔ گالوں پر گلال پھر جائے گا۔ آنکھوں میں ایسی قندیلیں روشن ہوں گی کہ شادی میں لائننگ وغیرہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہ پڑے گی اور چشم تصور سے وہ شہلا بھا بھی کو وہ رنگ پہنا دیکھیں گے تو۔“

وامس۔۔۔ وامس۔۔۔ وامس۔۔۔ ان کا اپنا چہرہ دیکھنے۔۔۔ دیکھنے۔۔۔ والامس۔۔۔ میرا مطلب ہے، ”آہم!“

تب ہی اس کی نظر بھی اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی فردوس بیگم کے خون آشام تاثرات اور ایقان کی جنبشی نظروں پر پڑ گئی تھی۔

”کب آئیں پیچھو آپ!“ وہ یکایک ہی موضوع بدل کر خوش گواری سے یوں بولا جیسے چند لمحوں قبل وہ کچھ کہہ ہی نہ رہا تھا۔

”میں۔۔۔“ ایقان سے مسکراہٹ ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ ”میں۔۔۔ بس۔۔۔ ابھی۔۔۔ بھابھی بیگم کا فون آیا تھا کہ ہاشم کی بری کی تیاری کرنا ہے۔۔۔ چند ایک روز کے لیے آگئی ہوں۔ میں رات نہ اور ورہل کر شاپنگ کر لیں گے۔“

”اور ہم۔۔۔ ہم کیا کریں؟“ فاطمہ جوش سے کہتے ہوئے آگئی تھی۔

”تم ڈھولک بجاؤ۔ گانے گاؤ۔ اب دن ہی کتنے ہیں شادی میں۔۔۔ کتنی کے بیچتیس دن ہیں۔۔۔ کتنے سال بعد اس گھر میں خوشی کا ایسا موقع آیا ہے۔ جم کر منائیں گے۔“

رافع بے حد خوش نظر آتا تھا۔ چوری چوری اس نے اپنی بات کا رد عمل فردوس بیگم کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بہ مشابہ آہ کے بھری اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہاں رافع میاں! کتنے توچ ہی ہو۔“ وہ جاتے جاتے بولی تھیں۔ ”اچھا ایقان! پھر یوں کرو بازار جانے سے پہلے شہر میاں سے بچھو علاج کر ہی لینا۔“

”مجھے کتنے درد موں سے چلتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ رافع اور ایقان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ جب کہ فاطمہ چہرے سے ہی رُجوش لگنے لگی تھی۔



”ہاشم کرے۔۔۔ داخل ہو تو وہ انگلیوں پر کچھ گنتے میں مصروف تھی۔ ہاشم دروازے پر ہی رک گیا اور مسکراتی نظر سے اس کی طرف اٹھنے لگا۔ اس کی گنتی میں بار بار گڑبڑ ہو رہی تھی۔ یکایک جھنجھلا کر اس نے نگاہ اٹھائی تو سامنے کمرے کے دروازے پر ایک شخص کھڑا تھا۔

”ہاں! کون کھڑے ہوئے اندر آؤ۔“ ہاشم کے چہرے پر ہنوز دلچسپ و شریر سی مسکراہٹ تھی۔

”نہ تو۔۔۔“ رافع نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایقان نے اسے چھیڑا۔ ہاشم کو ہنسی آگئی۔

”رافع بالکل ٹھیک رپورٹنگ کر رہا تھا تمہاری۔ اب مجھے اس کی رپورٹ درست ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔“ ایقان نے اس کا کان پکڑ لیا۔ ”شادی میں ہمیں گھر پر قہقہے لگوانے کی ضرورت بالکل نہ ہوگی، تمہیں چیمت پر کھڑا کر دیا جائے گا۔ وہ تمہاری آنکھیں اور ہمیں تمہارے دانت، پورے چوٹیس بلب روشن ہوں گے۔“

”میرا کان چھوڑیں اور اپنی گنتی پوری کر لیں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک آدھ دن کہیں بس نہ ہو جائے۔ بائے راولے“

”کس دن شریف لارے ہیں پھوپھا موصوف؟“

”تمہارے منہ میں کھی شکر۔“ ایقان نے اس کا کان چھوڑ کر گہری سانس بھری۔ ”ابھی تک تو وہاں سے ایسی کوئی خبر نہیں آئی۔“

”پھر یہ کون سے واسطے پڑ رہی تھیں آپ؟ میرا مطلب ہے کیا مگن رہی تھیں۔ عاشر۔۔۔ عاشر کا وظیفہ تو نہیں بتا دیا کسی ”بابے“ نے؟“

”اگر اسے ایسے چار سو بیس لوگوں پر یہ ہلکے پھلکے وظیفے کام نہیں کرتے۔“ وہ جھنجھلائی۔
 ”چار سو بیس؟ یعنی بابو وغیرہ؟“

”جی نہیں تمہارے پھوپھا موصوف۔“ وہ جلی بیٹھی تھی۔

”چشمہ چشمہ چشم۔ بہت افسوس کی بات ہے ڈیر پھوپھو! آپ کی محبت سے مجھے اس ”جلی کٹی“ کی امید تھی۔“

”محبت نام ہی ”جلنے“ اور ”کٹنے“ کا ہے ڈیر بیٹھے! تمہیں تو خوب خوب تجربہ ہے۔“

”بجائے فرمایا لیکن ہم نے کبھی ڈاکٹر صاحبہ یعنی آپ کی دوست موصوفہ کو اس طرح نمبر سے یاد نہیں کیا۔“ ایقان ہنسنے لگی۔

”تمہیں زیب بھی نہیں دیتا کہ تم میری پیاری سی دوست کو اس نمبر سے یاد کرو۔ یہ تو تمہارے پھوپھا جیسے مروت لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ آج پورا آنکھواں دن ہے پلٹ کر خبر نہیں لی کہ بیوی! جیتی ہو یا مرنی ہو۔ خیر میری بلا ہے۔ یعنی میری جوتی سے۔ میں بھی کون سی پروا کر رہی ہوں۔ خوشی خوشی تمہاری کھانسی تیار یوں میں مصروف ہوں۔“

”سچ کہا۔“ اس نے شرارت سے سر ہلایا۔ ”۲ ٹکلیوں پر نجائے۔ سا اسم پڑھ رہی ہیں ابھی آپ کو یوں آپ کو کیا پروا۔“

”جانتی نہیں کیا بات ہے عاشر! وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوئی۔ ”میرا دل اچانک ہی گھبرانے لگتا ہے۔ جب عاشر مجھ سے یوں غفلت برتنے لگیں تو میرا کسی چیز میں نہ دل جاتا ہے نہ دھیان آتا ہے۔ نجائے کب پوری ہوگی یہ سزا کی مدت۔“

ہاشم نے چند لمحے بغور اس کا چہرہ دیکھا، کچھ سوچا پھر ایک دھبہ لہجہ بدل کر بولا۔
 ”یار پھوپھو! سنا ہے آپ ڈاکٹر صاحبہ کا ویڈیو ڈریس لیمے جارہی ہیں۔“ ایقان جو کسی خیال میں نہ تھی۔
 ”چونک انہی۔“

”آلہ ہاں۔ ہمارے بیگم نے اسی لیے تو بلوایا ہے مجھے۔“
 ”تو پھر ایسا لباس لے آئیں جس میں دھنک کے سب ہی رنگ ہوں۔“

”ہائیں۔“ ایقان نے برا سامنے بنایا۔ ”یہ تمہیں نیکنی کلر لیں۔“ وہ اس کی طرف اشارہ کرتی ہوئی۔
 ”بندے لگتے تھے ہمیں۔“

”بائے پھوپھو۔ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں۔ جو رنگ بھی سوچتا ہوں اس میں ڈاکٹر صاحبہ کا تصور ایسا جھلملاتا ہے کہ باقی سب ہی رنگ اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں پھر اچانک ہی ڈاکٹر صاحبہ کسی اور رنگ میں نمودار ہوتی ہیں تو بس پھر ہر سو وہی رنگ چھا جاتا ہے۔ ایسے میں کسی ایک رنگ کا انتخاب تو بہت مشکل ہے نا اسی لیے یہ نیکنی کلر والی ترکیب اچھی ہے۔ ذرا سا کپڑا ہر رنگ کا لے لیں پورا لباس تیار ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے؟“

ایقان کے لب مسکرا نے لگے۔
 ”اب اگر تم مذاق بھی کر رہے ہو تو میں ضرور تمہارے ساتھ یہی کرنے والی ہوں۔“
 ”مذاق؟ میں حد درجہ سنجیدہ ہوں پھوپھو!“
 ”بس تو سمجھ لو کہ تمہاری دلہن کے عروسی لباس میں ایک سو ایک رنگ ہوں گے۔“
 ”ہاں۔ ہاں۔ تصور میں ایک دنیا آباد کر دی آپ نے تو۔ کیا خوبصورت جملہ بولا ہے۔“

ایقان ہنس ہنس کر دھری ہو گئی پھر اس نے ہاشم کو ایک دھپ لگائی۔
 ”اور بے چاری ڈاکٹر صاحبہ کا کیا تصور ہے جو اس کو ایسی عالی شان سزا دی جائے۔ اتنی سوبر اتنی ڈینٹ سی میری اکلوتی اویس۔ اور۔۔۔“ ایقان کی ہنسی کسی طور نہ ٹھہر رہی تھی۔
 ”شباباش ہاشم میاں۔“ ہاشم نے چشم تصور سے خود کو ہتھیلی دی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“
 ربیعہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تمدن سامنے کھڑا تھا۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔
 ربیعہ نے محسوس کیا کہ نرم لہجے اور نرم بات کے پس پردہ ایک نامحسوس سی تپش تھی جیسے وہ کوئی خاص بات محسوس کر کے یہ سب کچھ کہہ رہا ہو۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر تمدن کو دیکھا۔ وہی نامحسوس سی تپش اس کی نگاہوں میں بھی تھی۔
 ”بات تو کچھ بھی نہیں ہے تمدن بھائی!“ وہ رمانیت سے بولی۔ ”ترانہ بتا رہی تھی کہ میرا بلڈ پریشر بہت زیادہ ہو گیا۔“
 ”اس کی وجہ سے۔“

”ہاں۔ دیکھیں ربیعہ! کوئی اور چکر و کرچلا رکھا ہو تو اب بھول جاؤ اسے۔“ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ ربیعہ رونے لگی۔
 ”جی۔۔۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔
 ”اس پارک والے لڑکے نے اگر کوئی سہانے خواب دکھائے ہیں تو یہ مت سمجھ لیتا کہ وہ خواب کبھی حقیقت نہیں بنیں۔ تمہاری حقیقت یہی گھر ہے۔ اس حقیقت کو دل سے قبول کر لو گی تو تمہارا بلڈ پریشر پھر لو نہیں۔“

”کے لیے۔“ ایک بے دل جلانے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ایسی مسکراہٹ ربیعہ اکثر منور امین کے لبوں پر دیکھتی تھی۔
 ”اس کی ماں کے متعلق کوئی بات کیا کرتے تھے۔ ربیعہ کھلی آنکھوں سے تمدن کو منور امین میں دیکھتی تھی۔
 ”تبدیل ہو تا دیکھتی رہی پھر وہ اپنی اسٹک کا سہارا لے کر کمرے

URDU PHOTO

مشقۂ محموند کی قرابت کے خوں

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگ کارنگ کتاب

خانوں کا

دسترخوان

شائع ہو گئی

نگوئے کاہنہ : ۳۷ اند بازار کراچی

ربیعہ کے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے اس کا وجود کسی بہت پرانی عمارت کا کھنڈر ہو۔

”میرا خیال ہے۔ سنہری۔ راسلک کا کرتا۔ شیروانی کار کے ساتھ۔ اس پرڈل گولڈن امیر انڈری۔ کیوں علی؟“ حمزہ نے گھٹلاگ پر سے نظر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔

”صدقے جاؤں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”دستار بندی میرا مطلب ہے سہرا بندی کی رسم آپ کی سرانجام نہیں پار رہی۔“

”نہ ہی آپ کا سہرا لکھا جا رہا ہے۔“ نافع اسے مزید ملبوسات دیں۔

”رسم نکاح میں آپ کا نام ہرگز نہیں پکارا جائے گا۔“ علی نے ٹکڑا جوڑا۔

”کوئی کمٹنگ مشین کئی چکر بھی بنی الحال نہیں ہے۔“ نافع مزید بولا۔

”تو پھر یہ گولڈن کرتا؟“ علی ہنس۔

”ڈل گولڈن امیر انڈری؟“

”نعم خدا کی۔“ حمزہ نے دانت چکچکائے۔ ”تم میرے بھائی۔ اور میرے ہونے والے دو لہا بھائی نکلتے تو اس وقت دونوں اپنا اپنا سر پکڑے بیٹھ جاتے۔“ نافع نے دھونڈ دھونڈ کر دیکھا۔ ”اپنے آئیڈیاز پیش کر رہا ہوں اور تم دونوں مل کر میرے آئیڈیا کی دجیاں نکھیر رہے ہو۔ تم دونوں کیا چاہتے ہو؟ کیا میں اپنے بھائی کی شادی کوئی دھولی وغیرہ لپیٹ کر اینڈ کر لوں؟ کسی چیز پر ہاں ہی نہیں بھرتے رہتے دو پھر ایک جیسے کپڑے بنوانے کا خیال میں اپنی ڈریسنگ علیحدہ ہی کر لوں گا۔“

”اپنے دو گھنٹے میں پیش کیے جانے والے سارے آئیڈیاز پر نظر ثانی کرو۔“ نافع نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”کیسے کیسے فضول خیالات پیش کر کے تم نے ہم دونوں کا وقت ضائع کیا ہے۔ غور کرو کیوں علی!“

”صدقے جاؤں۔ میرے دل کی بات کہہ دی دو لہا بھائی آپ نے۔ اس کے بتائے ہوئے تمام ملبوسات میں صرف یہ لاسٹ والا آئیڈیا قابل عمل ہو سکتا ہے۔“

”راسلک کا کرتا؟“ حمزہ جلدی سے بولا۔

”نہیں یا رہیہ دھوتی والا۔ وہ بھی صرف تمہارے لیے۔“

حمزہ اپنے آس پاس کوئی ایسی چیز ڈھونڈنے لگا جسے وہ علی کے سر پر مار سکے۔ علی اس کا ارادہ بھانپ کر اچھل کر بیٹھ گیا۔

”بھئی اب میری بات سنو۔“ نافع اس کا جارحانہ انداز بھانپ کر جلدی سے بولا۔ ”اب میں ایک آئیڈیا پیش کر رہا ہوں۔ یہ کرتے یہ کڑھائیاں وغیرہ بعد میں کام نہیں آتیں۔ کچھ ایسا بنواؤ جو بعد میں بھی کام آئے۔“

”مثلاً“ ”بعد“ کی وضاحت بھی کر دو۔“ حمزہ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”میرا مطلب ہے سوٹ۔ ٹوپیں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”اور بعد میں وہی سوٹ تمہاری رسم ہندی میں بھی چل جائے گا۔ ہے نا؟“ حمزہ جل کر بولا۔

”بھئی۔ تم دونوں کی مرضی ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”میں تو اس دن سفید کرتا شلواری پہنوں گا۔“ وہ مزے سے بولا تھا۔

”دیکھ لیں گے تیرے کرتے کو بچے۔ رتھیں نہ کر دیا تو سالانہ کہنا۔“ حمزہ نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”پھر اس دو سو روپے کی کیٹلاگ کا کیا ہو گا؟“ اچانک علی نے وہائی دی۔ ”یہ کیوں خریدی گئی؟“ یہ رقم چونک۔ اس کی جیب سے ادا کی گئی تھی اس لیے ورد اس کے دل میں اٹھا تھا۔

”بھئی یہ فضول خرچی کیوں کروائی گئی؟ اس سے تو اچھا تھا میں اپنی موٹر بائیک میں اتنے روپوں کا بیٹرول ہی ڈلوالیتا۔ وہ غریب بھی کیا سوچتی ہوگی۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ نافع نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”وہ بڑی منکسر المزاج قسم کی موٹر بائیک ہے اور پھر ایسی نیک اور متقی ہر وقت حالت صوم میں ہوتی ہے۔ وہ غریب کیا سوچتی ہے؟“

”بیوی ڈھونڈنے نکلا تو اپنی بائیک کی تمام خصوصیات ذہن میں رکھنا۔“ حمزہ نے بھی اگلے پچھلے ادھار اتارنے کی ٹھانی۔ ”صاحب جو شکر گزار۔ تھوڑے کو ہی بہت سمجھنے والی۔“ علی ویدے گھما گھما کر باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”ایک لباس میں زندگی بتادی غریب نے۔“ نافع مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔ ”آج تک سیٹ کو تبدیل ہونے کی نوبت نہ آئی۔“

”لیکن یا۔۔۔ بیوی کچھ صفائی پسند ہو، کبھی کبھی نہاد ہو بھی لیتی ہو۔ اس بائیک کے مکھڑے پر تو ہر وقت کیچڑ کے نشانی ملتے ہیں۔“

”خدا کرنا۔“ بالآخر علی کا صبر جواب دے گیا۔ ”اس کیٹلاگ کا سو روپیہ تم بھرو اور سو تم۔“ اس نے باری باری دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم دونوں کے پر زور اصرار پر ہی میں نے یہ خریدی تھی۔ کیا کہہ رہے تھے نافع تم؟ گہری پہلی پہلی تقریب ہے، بہت اعلیٰ ڈیزائن کے لباس تیار کروائیں گے اور اب۔؟“

”اب۔۔۔“ ”عیش“ اور ”مکیش“ کی ڈیرا کٹنگ اپنی سمجھ سے تو باہر سے اچھے بھلے کرتے کا گریبان تک آتا ہے۔ شیروانی ہے اور استیسن عاتب دو لہا میاں کھڑے مسکرا رہے ہیں گہری اور نچ برسانی اب۔۔۔“

”میرا مطلب ہے۔“ علی اس کے معذرتی انداز کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ”سو روپیہ بھرو۔“

”اوہو یاد آیا۔“ نافع نے ایک صوفیہ کام بتایا ہوا ہے۔ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔“

”میرا مطلب ہے۔“ حمزہ نے جماہی لی اور کیٹلاگ پرے کر کے لیٹ گیا۔ اس کے

علی کے چہرے پر نہایت جارحانہ تاثرات تھے۔ وہ بدلہ لینے کے سب ہی طریقوں پر غور کر رہا تھا۔

ہنستا مسکراتا وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اوپر آتی عریشہ کسی طور واپس نہ مڑ سکی۔ نافع عین اس کے مقابل اسی سیڑھی پر آ کر جس پر وہ کھڑی تھی۔

اس کی مشکراتی نظروں نے سیاہ لباس میں ملبوس عریشہ کو لمحہ بھر کے لیے اپنی گرفت میں لیا تھا۔ ”کیسی ہو عریشہ۔“ اس کے کنبے میں صرف دو ستانہ رنگ تھے۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس کا انداز حد درجہ سرد تھا۔

نافع اب کی بار کچھ ٹھنکا۔ وہ رنگ پر کمر نکاتے دونوں ہاتھوں سے رینگتا تھا۔ اسے دیکھنے لگا۔ ”سنو۔ عریشہ! وہ نجانے کیوں اسے پکار بیٹھا۔ عریشہ ختم گئی لیکن اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔“

”نتیجہ ناراض ہو مجھ سے؟ کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟“ عریشہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور آنکھوں میں ایسا گہرا دکھ تھا کہ نافع اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر پلٹ کر اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ نافع گہری سوچ میں گم تھا۔



”مما! یہ سب کس کے کپڑے ہیں؟“ وہ آنکھوں میں حیرانی کے سبب ہی رنگ بھرے رنگے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ اینتقہ مسکرا دی۔

”یہ سب کپڑے آپ کی ممما کے ہیں۔“ اس نے عمر کو بانہوں میں بھرا۔

”اتنے پیارے کپڑے۔۔۔ چمکیلے۔۔۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”میں نے کبھی ممما کو اتنے اچھے اچھے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ میری ممما کیا دلہن بنیں گی؟“

شہلا کے چہرے پر سنجیدگی بھی لیکن منیوہ بیگم اور اینتقہ مسکرا دیں۔

”ہاں عمر! آپ کی ممما دلہن بنیں گی بہت خوبصورت لگیں گی۔“ اینتقہ نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا تھا۔

”اور دولہا؟“ اگلا سوال برق رفتاری سے آیا تھا۔

”دولہا۔۔۔“ ابھی اینتقہ کی بات اس کے لبوں میں ہی تھی کہ عمر نے اچکلی۔

”دولہا تو میرے پڑا ہوں گے۔ ممما! دلہن تو کیا دولہا۔۔۔ سے نا ممما! اس نے تالیاں بجائیں۔ شہلا کے چہرے نے لمحہ بھر میں ہزار رنگ بدلے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر گئی۔ منیوہ بیگم نے تأسف سے اسے جاتا ہوا دیکھا۔ اینتقہ نے زچہ ہو کر عمر کو دیکھا تھا۔

”تمہاری یہ دو آنکھ کی زبان قابو میں نہیں رہتی تمہارے؟“ وہ چڑکھری۔

”میں نے کیا کہا ہے ناؤ؟“ وہ حیران ہوا۔ ”خالہ جانی تو مجھ سے لڑتی ہی رہتی ہیں۔ ان کو تو میں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔“

اس کی معصوم آنکھوں میں پانی اترتا دیکھ کر اینتقہ سب کچھ بھول بیٹھا۔ اس نے چٹاٹ اس کے گالوں کے کتنے ہی بوسے لے لیے۔

”آپ تو خالہ جانی کی جان ہیں۔“ اس نے اسے پیٹتے ہوئے کہا۔

”کوئی نہیں لگتا۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھا تھا۔ ”ابھی آپ نے مجھے ڈانٹا ہے۔“

”نہیں چاند! میں نے آپ کو نہیں ڈانٹا۔“

”مما بھی یہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ انہیں بھی میری باتیں بری لگیں“ اسی لیے اب میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔“ وہ مزید روٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی ممما نے کتنی بار آپ سے کہا ہے عمر کہ ان کے سامنے اپنے پیاز کا زکرمٹ کیا کرو۔“ اینتقہ نے اسے ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانا چاہا۔ ”پھر بھی آپ۔۔۔!“

”کیوں نہ میں پیاز کا ذکر کروں؟“ وہ اکڑا۔ ”وہ ممما کے کچھ بھی نہیں ہیں مگر میرے تو پیاز ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں ضرور ان کا نام لوں گا۔ پیاز۔ پیاز۔ پیاز۔ اور بھی لوں گا۔ پیاز۔ پیاز۔ پیاز۔ آپ کو بھی میرے پیاز لگتے ہیں ناؤ؟“

اسے لڑائی کے دوران اچانک ہی منیوہ بیگم کا خیال آگیا۔ اس نے از حد معصومیت سے سب کچھ بھول بھال کر پوچھا تھا۔

منیزہ بیگم اور انبیقہ بے اختیار ہی اس کے بھول پین پر مسکرا دی تھیں۔

”نہیں بیٹا! وہ کسی کو برے نہیں لگتے۔“ منیزہ بیگم نے اسے گود میں بٹھالیا۔ ”وہ آپ کے ابو ہیں۔ وہ آپ اتنے لگتے ہیں تو ہم سب کو اچھے لگتے ہیں۔“

”پھر آپ لوگ انہیں دولہا کیوں نہیں بناتے۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ میری ماما کے دولہا بس میرے چاہے نہیں گئے۔“

منیزہ بیگم ہونٹ سی ہو کر انبیقہ کو دیکھنے لگیں۔ نواسے کا یہ انداز ان کے لیے نیا اور بے حد حیران کن تھا۔ انبیقہ نے ماں کی گھبراہٹ کی صورت دیکھی تو جھٹکھڑی ہوئی اور عمر کو گود میں اٹھالیا۔

”چلو لان میں چل کر کھیلیں۔ وہاں میں آپ کو ساری بات بتاؤں گی۔“ وہ اسے چومتے ہوئے وہاں سے چل دی۔

منیزہ بیگم اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے جوڑوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں۔ وہ اور انبیقہ ابھی ابھی شہلا کی شادی کے لیے خریداری کر کے لوٹی تھیں اور شہلا کو کپڑے دکھا رہی تھیں۔ عمر کے غیر متوقع۔ ہست نے ماحول کا رنگ ہی بدل ڈالا تھا۔

”ہاں بھئی! اب بتاؤ۔“ اس نے عمر کو میڑھیوں پر بٹھایا اور خود اس کے برہنہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ”یہ کیا چکر ہے؟“

”کون سا چکر؟“ اس نے ابھ کر خالہ کی صورت دیکھی۔ ”آپ تو مجھے اپنے ساتھ کھینے کے لیے لائی تھیں۔“

”پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاپا تمہیں دن میں کتنی ہر تیرہ فون کرتے ہیں۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیوں بتاؤں؟“ وہ بگڑا۔ ”پاپا نے منع کیا ہے۔“

”اوہ۔“ انبیقہ کو گڑبڑ کا احساس ستانے لگا۔ ”لیکن ہم تو اب آپ کو منع نہیں کرتے بات کرنے سے پھر پاپا نے منع کیوں کیا؟“

”وہ کہتے ہیں کہ خالہ جانی اور نانا کو بالکل نہیں بتانا کہ ہم باپ بیٹا کیا باتیں کرتے ہیں۔“ وہ مزے سے ٹانگیں ہلانے لگا۔ ”اسی لیے آپ کو تو بالکل نہیں بتاؤں گا۔“

”اچھا۔“ انبیقہ نے بے اختیار ہی اس کی صورت دیکھی۔ ”اور تو بتاؤ اسے کہ میں نے منع کیا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے پر زور انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ تو کہتے ہیں اپنی ماما سے میری باتیں کیا کرو، انہیں ماما بہت پسند ہیں۔ ماما ان کی دلہن جو ہیں۔“

انبیقہ کو دم گھٹنے کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور میڑھیاں اتر کر لان میں چلی گئی۔ عمر بھاگتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ پھر وہ پیچھے سے آکر اس سے پٹ گیا۔

”آپ ناراض نہ ہوں خالہ جانی! میں بیٹا سے پریشانی لے لوں پھر آپ کو بھی سب بتایا کروں گا۔“

”یہ۔۔۔ دولہا اور دلہن۔۔۔ کی باتیں تمہارے پاپا کرتے ہیں عمر؟“ اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ کو کیوں بتاؤں؟“

انبیقہ، بری طرح سے اچھی۔ اس نے پلٹ کر اسے برہمی سے دیکھا پھر فوراً ہی اپنا انداز بدل لیا۔ اس بچے کا اس سارے معاملے میں رتی بھر قصور نہ تھا۔ وہ جھک کر اسے چومنے لگی۔

”سچ رائے آتی اور وہ آپ نے تو مجھے سخت بور کر دیا ہے۔ کیا تھا اگر یہ آپ سے بڑی ہو تیں یا پھر ان کی شادی پہلے ہو جاتی تو۔۔۔ حالات حاضرہ پر گفتگو تو انہیں بالکل پسند نہیں۔ کرنٹ افیئرز کی بات کرو تو یہ کرنٹ مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ کہیں سے اڑتی اڑتی کوئی سن کر نکلے اور تو یہ اس ”اڑتی“ کے سارے پرکٹ کر بندے کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں کہ لو! اب جی بھر کر شرمندہ ہو لو۔ قسم خدا کی گفتگو کا مزہ عارت کر دیتی ہیں۔ اچھا ہوا جو آپ آگئیں۔ میں تو سخت بور ہو گئی تھی ان کے ساتھ رہ رہ کر۔“

ناعمہ پیاز بھی کٹ رہی تھی اور فل والیوم میں کنٹری بھی نشر کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپاٹ گر رہے تھے لیکن اسے مطلق پروا نہ تھی۔ کبھی کبھار وہ چھری والے ہاتھ کی پشت دونوں گالوں پر پھیر لیتی۔ رائے اپنی اہمیت پر نازاں اور فرحان نظر آتی تھی۔ وہ بہت دل چسپی سے ناعمہ کی فضول گویاں سن رہی تھی۔

”اچھا پھر تم نے بتایا نہیں۔۔۔ وہ منگنی والے دن کے بعد عریشہ سے جو ملاقات ہوئی تھی تمہاری؟ ایک تو ہر بات ادھوری۔۔۔ گورڈ کر تم کوئی دوسری بات شروع کر دیتی ہو۔۔۔ تمہاری یہ عادت مجھے سخت ناپسند ہے۔“

”جی! اور یہ تھی آپ کو کہ وہ آپ سے سخت ڈانٹ پڑی تھی پھر وہ آپ کی بات چل نکلی۔ ہاں تو پتا ہے۔۔۔“

”لیکن یہ کیوں؟ کیا خالہ سخت ناپسند ہے۔“ ناعمہ نے پھر منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”لیکن یہ کیوں؟ کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ رائے کا تجسس اپنے عروج پر تھا۔

”نہیں خیر۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ایسی بات ہوتی تو کیا مجھے علم نہ ہوتا؟ میں تو اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بس مجھے مسئلہ ازم کا چکر ہے۔ عریشہ اپنے آپ کو ”کچھ“ سمجھتی ہے۔ ناس۔ تو اس کے معیار پر نافع شاد ہو رہا نہیں۔“

”ہاں۔۔۔“ رائے نے سر کا سر سمجھ داری سے ہلایا۔ ”مجھے بھی شک تو ہوا تھا اس کا بھجا بھجا سا چروہ دیکھ کر۔ اچھا خیر۔۔۔ تم یہ بات کہہ رہے ہو کہ میں نے اسے نہیں بے وجہ باتیں نہیں کی۔“

”لیس جی! مجھے چھپ چھپ ہے۔۔۔“ اور پھر وہ کہتی پھریں۔ میں کوئی بی جھالو ہوں۔ میں نے تو ممانی والی بات بھی کسی سے نہیں کہی۔“

”ہاں۔۔۔ بالکل جی! نہیں کسی تم نے کسی سے اور مجھے تو بالکل پتا نہیں ہے کہ کیا بات ہوئی۔“ دروازے پر درون کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

ناعمہ کی آدھی جان خشک ہو گئی۔ اس نے تھوک نکل کر رائے سے مکمل چاہی۔

”ارے لو۔ بڑی بہن ہوں اس کی اور تمہاری بھی۔ کوئی بڑوسن تو نہیں ہوں جس سے تم لوگ پروہ داری برتو۔“ رائے جی بھر کر خفا ہوئی۔ ”مجھ سے اپنے دل کی باتیں نہیں کہے سنے گی تو پھر کس سے کرے گی۔“

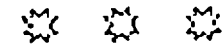
”یہ بات نہیں ہے ایسا!“ درون اندر چلی آئی۔ ”یہ بات میں اس کو پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ عریشہ والے معاملے میں اس کا یوں اچھٹا مناسب نہیں ہے۔ خدا انخواستہ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ساری برائی اس کے گلے میں آئے گی۔ یہ سمجھتی ہی نہیں ہے۔“

”تم تو درون سے ذرا اسی باتوں کو بہت گہرائی میں جا کر سوچتی ہو بھلا اونچ نیچ کیا ہوتی ہے؟“ رائے بے پروائی سے بولی۔ ”اور ہم کون سا اصول تاشے پیٹ رہے ہیں۔ آپس میں ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے ہیں نا۔!“

درد نے افسوس سے سر ہلایا۔ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔
 ”تم نے مہینہ کو کسٹرو کھلا دیا؟“ رائے نے بات بدلی۔
 ”جی ہاں اسے امی کے پاس سلا دیا ہے میں نے۔“

”اچھا یہ لیں۔“ ناعہ نے پیاز کی ٹوکری اس کی جانب بڑھائی۔ ”برائی کی پیاز بھی میں نے کاٹ دی ہے گوشت بھی دھو کر فریق میں رکھ دیا ہے۔ برائی بنانا آپ کا خاص الخاص ڈیپارٹمنٹ ہے۔“
 ”یوں کہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں تاکہ تم گفتگو کا ٹونا سراجوڑ سکو۔“ وہ مسکرائی۔ ”چلو ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔“ پھر وہ ٹوکری تمام کر کرے سے نکل گئی۔

”ہاں۔ اب بتاؤ!“ رائے نے پیر پھیلائے۔ ”یہ ممانی جان کا قصہ کیا ہے؟“
 ”ہو ایوں کہ ایک دن عریشہ سے ملنے گئی۔“ ناعہ مزے سے شروع ہوئی تھی۔



صورت نے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ مینا بیگم سخت برہم تھیں، لیکن یہ انداز نہ ہو۔ دراصل ان کی برہمی کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ خود بھی اس حقیقت سے ناواقف تھیں۔ ربیعہ سے پرہیز ہونے اور اس پر غصہ اتارنے سے وہ فی الحال احتراز برت رہی تھیں کیونکہ ربیعہ کی اپنی خاص زبان خود بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ صورت کے انداز انہیں غصہ دلا رہے تھے لیکن ان کی اگلی آنکھیں بھر میں ان کی محبت و چاہ کا واحد مرکز تھی۔ سو اس پر اٹھتا غصہ بھی وہ اپنے اندر دبا کر پرہیز کر رہی تھیں۔ ترانہ تو کئی دن سے مہرہ بلب تکھی لہی لہی تو ہر طرح کی پریشانی کا عنوان تصور تھا جو تین دن سے گھڑنے لگا تھا۔

صورت سے شادی سے علی الاعلان انکار کر کے وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ اور اب تین دن سے اس کا کچھ اتنا پتا نہ تھا۔ صورت نے محبوب کی جدائی کو از حد دل پر لیا تھا۔ اور وہ نہ صرف مدیٹ رہی تھی بلکہ کھانے پینے سے بھی گریزاں تھی۔

اسے وہ کہہ کر ربیعہ پر غصہ اتارنے کا جوش چڑھتا تھا اور وہ جو منہ میں آتا سو کہنے لگتی تھی۔ شروع شروع میں مینا بیگم نے اسے کسٹرو ل کر کے کی کوشش کی پھر وہ بھی بارمان کر چیب ہو گئی تھیں۔

ربیعہ کو اس وقت آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کی حالت کے آواز باہر اس کے اعصاب چنبھوڑ رہی تھی۔ صورت اسے کوستی، منحوس قرار دیتی تھی اس امر میں انداز و سبب پر وہ اپنی پھر تھک بار کر چیب ہو جاتی۔ کچھ دیر کے بعد اسے پھر نئے سرے سے جوش چڑھ جاتا۔

”میں کتنی ہوں امی سے نکال باہر کریں اس جڑیل کو یہاں سے۔ اس کے یہاں ہونے سے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ آئے چل رہے ہیں آئے۔ بار بار مجھے خیال آتا ہے کہ جانے کس وقت میں اس نے کیا منتر پڑھ کر بیوڑا تصور پر مجھ دیا تو ایسا نہ تھا۔ ہائے میری قسمت۔“

”کیا بات ہے۔ کیا کو اس ہے یہ؟“ گھر میں یکایک تمدن کی ترش آواز گونجی تھی۔
 ”جس وقت گھر میں داخل ہو تمہارے بھائی بھین سننے کو ملتے ہیں۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟ مر نہیں گیا وہ۔ پڑا ہو گا اپنے کسی یار کے گھر منہ چھپائے۔ چار دن اور گزریں گے۔ بے غیرتی سے چلا آئے گا۔“

صورت پھر خاموش ہو گئی تھی۔ اسے خاموش ہونے کے لیے ایسے ہی کسی بیوی اور ذہنی ضرورت پڑتی تھی۔
 ”پتا تو کیا ہوتا تمدن!“ مینا بیگم قدرے سہولت سے بولیں۔ ”غصے میں گھر سے گیا ہے۔ جوان خون ہے کچھ ایسا ریسانہ کر بیٹھے۔“

”بابا بابا۔ بابا بابا۔“ تمدن کو یہ بات کافی پر مزاح لگی۔ ”جوان خون! پیچھو جوان خون ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ خون میں غیرت بھی ہونا چاہیے۔ جو اس بے چارے کے پاس بالکل نہیں ہے۔ سالابد معاش ہونے والی بھابھی پر نظر رکھتے بیٹھا ہے۔ خبیث۔“

صورت پھر صول بھنوں کر کے رونے لگی تھی۔ مینا بیگم اور تمدن نے اس مرتبہ اسے بالکل لفٹ نہ کرائی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں کمرے میں چلے آئے تھے۔ ربیعہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو مینا بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

”آرام کرو۔“ تمدن بھی نرمی سے بولا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

پھر وہ مینا بیگم کی سمت مڑا۔
 ”پیچھو! فی الحال اس سے گھروں کا کوئی کام نہ کرواؤ لگنا۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں ہے۔ شکل سے ہی اندھا حال لگتی ہے۔“

”اب خیر میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں۔“ مینا بیگم کو برا محسوس ہوا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے قدرے ظالم ہونے کا اعتراف بھی کیا۔

”تمہارے چھپ جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ تمدن اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جس پر ربیعہ لیٹی ہوئی تھی۔

ربیعہ نے صولت کر خود کو سمیٹا۔ وہ بالکل پرے ہو گئی۔ تمدن نے ایک سرسری نگاہ اس کی حرکت پر ڈالی تھی۔
 ”میں نے اپنے سب دوستوں کو مدعو کر لیا ہے۔ اور اپنا پروگرام بدلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس مجمعے کو میں میاؤں کی ٹہنیوں کا گھر میں ہی نکاح پڑھاؤں گے۔ چند دوستوں اور رشتے داروں کو بلا کر ہلکا پھلکا ارتج

بھٹ کر لیں گے۔“
 ”تین دن سے اٹھنے لگے۔ وہ کسی صحرائی طوفان میں جا پھنسی۔ تمدن اس کی کیفیت سے بے خبر ہو کر صولت کر لیں گے۔“

”ہمارا ہمارا ہمارا۔“ مینا بیگم نے پین بٹے گا۔
 ”لیکن تمدن!“ مینا بیگم نے صولت کر لیں گے۔

”تصور کے نہ ہونے پر بہت باتیں بنیں گی۔ یوں بھی جن لوگوں کی نظر میں میں نہیں دوڑوں شادیوں کے متعلق بتایا تھا۔ اب اگر صرف تمہاری رسم نکاح منعقد کر دیتی ہے تو اس کا شور کا شکار ہوں گے اور لشکر کا اس موقع پر نہ ہونا ان اندیشوں کو اور بھی ہوا دے گا۔“

”پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ خود غرضی سے بولا۔ ”وہ ساری عمر نہ لوٹے تو کیا میں اور ربیعہ ساری عمر اس کا انتظار ہی کرتے رہیں گے؟“

”ایسے نہ کہو تمدن۔ اتنے خود غرض نہ بنو۔“ مینا بیگم خود پر مزید جبر نہ کر سکیں۔ یوں بھی تصور ان کا ہونے والا ہوتا تھا۔ سو تمدن کی نسبت وہ اس سے زیادہ انصاف رکھتی تھیں۔
 ”اس میں خود غرضی کی کیا بات؟ حقیقت پسندی ہے یہ۔ اور یوں بھی اگر آپ غور کریں تو ہمارا نکاح ہونے سے اس معاملے پر اچھا اثر پڑے گا۔ تصور کی امیدوں پر پائی پھرے گا تو وہ خود ہی چلا آئے گا۔ یہ سوچ کر کہ اب تو کچھ ہو نہیں سکتا۔“

تمدن کی بات پر مینا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔
 ”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔

ثانیہ خاموشی سے چلی آئی تھیں۔
 وردہ نے ناعمہ کے اصرار پر میروں لہنگا خریدنے کی کوشش کی لیکن اس کی قیمت ان کی قوت خرید سے دوگنی تھی سو وہ اسے لے کر دوسری شاپ پر چلی آئی۔
 ناعمہ کی حسرت بھری نظریں بار بار ادھر کا ہی طواف کر رہی تھیں۔

”جی ای۔۔۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اڈر کر بیچ جاؤں۔۔۔ مجبوری ہے ابھی کلاسز آف ہونے میں چند دن باقی ہیں۔ کس طرح سے یہ دن گزریں گے میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ میرا یہاں بالکل دل نہیں لگ رہا ہے۔“ عباد بہت بیزار تھا۔

”کوئی بات نہیں بچے! چند دن اور سہی۔ دل لگا کر کلاسیں لو اپنی۔“

انیقہ نے بے صبری سے منیجر بیگم سے ریسپور لے لیا تھا۔

”عباد بھائی! مجھے بالکل مزہ نہیں آ رہا ہے آپ کے بغیر۔ بس آپ جلدی سے آجائیں۔“

”جی! آپ کی خوشی میں انو؟“ وہ جانے کیا سوچ کر بولا۔

”ابا! خوش ہیں اچھا۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے نا۔۔۔ کتنا چھپا چھپا کر رکھتی ہیں اپنے دل کی بات۔۔۔ کہیں سے بھی لیک اؤٹ نہ ہو چکے دیکھیں۔ پھر بھی۔ اتنا اندازہ تو ہے مجھے۔۔۔ بہت متفہم نظر آتی ہیں وہ اس فیصلے پر، مطلب خوش ہیں۔“

”ہوں۔۔۔ اور عم؟“ اسے کس نے برف کیا؟ ”وہ خوش دلی سے بولا۔

انیقہ لمحہ لمحہ کے لیے خوش ہوئی پھر کھٹکھٹا کر بولی۔

”میرا تو بچہ ہے۔۔۔ ان بھائی! ابھی اسے ان باتوں کا زیادہ پتا نہیں ہے۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ گزرتے ہوئے حالات سے غافل کرے گا۔“

”میں نے سوچا تھا کہ وہ بچہ نہیں ہے۔۔۔ اے ہی تو نہیں وہ خود کو ”سیرین“ کہتا ہے“ اسے ذہنی طور پر اس حقیقت کے لیے تیار کر دیا۔۔۔ انڈین کوئی برا نہیں کرے۔ شہلا آلی ڈسٹرب ہو سکتی ہیں۔“

”اب آپ کی خوشی میں ہیں آپ کی جلدی سے آجائیں۔۔۔ یہاں میں اکیلی کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔“

”میں جلد سے جلد بیچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ، لاہور سے کیا کیا خرید کر لاؤں؟ میں نے تمہارے اور شہلا آپ کی کے لیے کچھ ڈرمنڈ لیے ہیں۔ اسی کے لیے گرم شالیں لی ہیں۔ اور کچھ چاہیے تو بتاؤ۔“ انیقہ مسکرا دی۔

”اب آپ کی یہاں موجودگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔ میں اور امی جی بھر کر شاپنگ کر چکے۔ ضرورت سے زیادہ خرچہ کر لیا ہے، ہم نے ایکسٹنشن ملے۔“

”خرچے کی پروا مت کرو انو۔۔۔ اتنے عرصے بعد تو خوشیوں نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ خدا ان خوشیوں کو قائم و دائم رکھے۔“ وہ قدرے جذباتی ہو گیا۔

”آمین۔۔۔! انیقہ آہستہ سے بولی تھی۔

”سب کا خیال رکھنا انو۔۔۔ میں جلد آ رہا ہوں۔“ اس نے رابطہ منقطع کیا تھا۔

”سو فیصد یہی بات ہے پیچھے۔! ربیعہ سے مایوس ہو کر وہ ضرور صولت سے شادی پر آمادہ ہو جائے گا۔ آج دیکھ لینا۔۔۔ وہ دوسرے دن ہی صولت صولت کرنا چلا آئے گا اور پھر ہم تو سب کچھ بہت سادگی سے کریں گے۔ سارا دھوم دھڑکا ریمیں و سیمیں صولت اور تصور کی شادی پر ہو جائے گا! کیوں ربیعہ؟“

اس نے پہلی بار اسے ایک جیتی جاگتی ہستی کا درجہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن ربیعہ اب خودیہ مقام قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ وہ پتھر کا بت بنی لیٹی رہی۔

”ٹھیک ہے!“ مینا بیگم نے تمدن کے پروگرام پر تصدیق کی مہر ثبت کی۔ ”میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی ہو۔ تو پھر اس جمعے کو طے ہے یہ نکاح۔“

”بالکل۔۔۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔

مینا بیگم آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی ربیعہ کو دیکھنے لگی تھیں۔

”کتنا اچھا ہوتا اگر عریشہ بھی ساتھ ہوتی تو۔“ ناعمہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے افسوس سے رہی تھی۔ وردہ نے اسے جی بھر کر گھورا لیکن وہ اپنے ارد گرد کا جائزہ لینے میں مشغول تھی۔

”اتنا تو کہا تھا اسے۔“ ثانیہ تنگی۔ ”اب کیا گود میں اٹھا کر لے آتے۔۔۔ اس کی عادی میں ایسی ہے۔“

کہیں کی۔۔۔ جب سے یہ رشتہ طے ہوا ہے۔ میرا تو دل بڑا تار تار ہے۔۔۔ تو بھائی! پھر اسے کون سے دل تیار ہے۔

”جانے وہ ثانیہ۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وردہ نے ثانیہ کو ٹھنڈا کرنا چاہا اور ناعمہ کو جی بھر کر آنکھیں دکھائیں۔

ناعمہ کا اس کی آنکھیں دیکھنے کا قطعاً ”کوئی موڈ نہ تھا۔ وہ اپنے فیورٹ شاپنگ ایپوریم میں آکر ایسے خوش تھی جیسے چاند گاڑی سے ابھی ابھی چاند پر اتری ہو۔ مختلف کانٹوں کی دست دیکھ کر اس کا اپنا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔

”بائے ایسا۔۔۔ مرگئی میں تو۔“ ”چانک ہی ناعمہ کی دردناک صدا ابھری تھی۔ وردہ اور ثانیہ گھبرا کر مڑیں۔

”کیا ہوا ناعمہ۔۔۔“ وردہ نے جلدی سے اسے سر سے پاؤں تک چیک کیا۔

”وہ دیکھیں وہ میروں لہنگا۔۔۔ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔“

وردہ کی جان میں جان آئی۔ اب کی بار اس نے نظروں سے کام لینے کے بجائے ہاتھ سے کام لیا اور نظریں بچا کر ایک دھپ اس کی پشت پر سید کر دی۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ!“ وہ آواز دبا کر غرائی تھی۔

”بد تمیزی۔۔۔“ ”نہ سمجھی۔“ ”لہنگا ہے ایسا!“

”بالکل انسان بن جاؤ اب۔۔۔ وردہ اعلیٰ مرتبہ میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گی۔“

وردہ کی دھمکی میں بہت جان تھی۔ ناعمہ شرافت کا مجسمہ نظر آنے لگی۔ وہ تینوں آج ہاشم کی شادی کی تقریبات میں پہننے کے لیے کپڑوں کی خریداری کرنے نکلی تھیں۔ انہوں نے عریشہ سے بھی ساتھ چلنے کے لیے بے حد اصرار کیا تھا لیکن وہ صاف انکار کر گئی تھی۔

”ماہین آپ ہی کر لیں گی میری شاپنگ بھی۔“ وہ بے زاری سے بولی تھی۔ ”مجھے نہیں جانا کہیں۔“ ناعمہ اور

وردہ ہری طرح سے جھنجھلا گئی تھی۔

”مجھے نہیں لگتا تمہیں کچھ لینا ہے۔ تمہاری سوئی اسی لہنگے پر الٹ چکی ہے۔ سب تشریحات اپنی اپنی جگہ رک گئی ہیں۔ اب تم سکون سے بیٹھو اور مجھے اپنی شاپنگ کر لینے دو۔“

”تو آپ کریں ناشاپنگ۔ میں نے آپ کو منع کیا ہے۔“ ناعہہ کچھ خفاسی ہو گئی۔
”میں نے سوچا تھا پہلے تم سے نمٹ لوں۔ پھر وہ لکھوں کیا بچتا ہے میرے لیے۔“

”اتنا سیکرینا نزنہ کیا کریں وردہ آپ! صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔“ وہ طنز سے بولی۔ وردہ اور ثانیہ کو اس پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اسے مزید تاؤ آگیا۔

”میں اپنے فیورٹ سائنگز کی سی ڈیزلے رہی ہوں۔ اس شاپ پر ہوں۔“ ناعہہ نے اشارے سے بتایا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ وردہ نے اس کے پھولے ہوئے منہ کے پیش نظر سہولت سے اس کی بات مان لی۔ وردہ عموماً وہ مارکیٹ میں بھی کسی لڑکی کو تنہا کسی شاپ پر نہیں جانے دیتی تھی۔ وردہ اور ثانیہ کپڑا دیکھنے لگیں۔ ناعہہ سی ڈیزلے دکان کی جانب بڑھ گئی تھی۔

سیلز مین سے کافی ساری سی ڈیزلے نکوا کر وہ بہت دھیان سے ان کے گانوں کے بول پڑھ رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ناعہہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ وہ اس کے قریب اس طرح سے کھڑا تھا جیسے وہ اسی کے ساتھ ہو اس کے چہرے کی اپنی پُریش نگاہیں بھائے۔ ہونٹ پیچھے وہ اس کے عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ان کی برسوں کی شناسائی ہو۔ جیسے ان کا بہت قریبی رشتہ ہو۔

جیسے وہ کئی بات اس سے بے حد خفا ہو۔

جیسے اس کو انھیں لگی ہو۔ جیسے وہ آزرہ ہو۔

ناعہہ سے نگاہ نہ جھکا لی گئیں۔ وہ اس کے کھلی آنکھوں سے دھمتی رہا۔

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟“ اس کا لہجہ بھی آج آج تھا۔

وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جی۔ اچھا۔“

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

ناعہہ نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہ تھا۔ چند لڑکے اپنی پسند کی سی ڈیزلے رہے تھے۔ سیلز مین انہیں اڈیل کر رہا تھا۔

”آپ۔۔۔! کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے حسب معمول ہتھیلی کی پشت سے پیشانی صاف کی۔

”جاننا چاہتا ہوں۔ تمہارے اس طرز عمل کی وجہ۔“ وہ درجہ سنجیدہ تھا۔

ناعہہ سخت پریشان ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟ کیا بگاڑا ہے آپ کا؟“

”اپنے دل سے بوجھو۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔

ناعہہ کو اس کی شکل دیکھی دیکھی سی لگی۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی کہ اس دیوانے کو اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

وہ بھی بے حد غور سے اس کا نقش نقش دیکھ رہا تھا۔

”اسی بھول پن پر مرنا تھا میں۔“ پھر وہ بولا۔ ”کیا خبر تھی کہ بھول پن کے پردے میں کتنا قریب پوشیدہ

ناعمہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ کیا کرے۔ درد کے لیے کسے پکارے۔
 ”فرانسہ!“ کسی لڑکے نے آواز دی تھی۔
 ”کم آن یار!“

فرانز نے ایک بے بس نگاہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتے وجود پر ڈالی اور بادل نخواستہ اپنی جگہ چھوڑی۔ شاب سے نکلنے سے پہلے بھی اس نے بت بنی ناعمہ پر نظر ڈالی تھی۔

”مما!“ عمر بے حد غصے میں معلوم ہوتا تھا۔

شہلا چونک اٹھی۔ وہ پندرہ دن کی چھٹی کے لیے تحریری طور پر درخواست تیار کر رہی تھی۔ بین ایک طرف رکھ کر وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”جی جناب کیسے!“ وہ مسکرائی۔ ”خالدہ جانی سے لڑائی ہو گئی ہے شاید۔“

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟“ اس نے دونوں ہاتھ کھینچ لیے۔

شہلا دم خم سا مسکرائی پھر اس نے عمر کو اٹھا کر اپنے زانو پر بٹھا دیا۔

”میں آپ کی ماما ہوں جانو۔ ماما اپنے جانو کو چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟“

”نہیں۔ آپ جا رہی ہیں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ آپ ہاشم انکل کے گھر جا رہی ہیں ان کی دلہن بن کر۔“

مجھے نانو نے بتا دیا ہے۔ میں یہاں نانو کے پاس رہوں گا اور آپ اور ہاشم انکل کے پاس رہیں گی۔ ہے نا۔“

و منہ بسور نے لگا تھا ”شہلا کو اس پر ٹوٹ کر بیاہ آیا۔ اس نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ اس کا ہاتھ چومنا پھر اس نے بال سنوارنے لگی۔“

”عمیرہ میں آپ کو یہاں نانو کے پاس صرف ایک چھتے کے لیے چھوڑوں گی۔ میری جان بلی پر اسی میں۔“

”بیشہ آپ کو اپنے پاس رکھوں گی۔“

”کہاں؟ کہاں رکھیں گی؟ ہاشم انکل کے گھر؟ میں وہاں نہیں رہوں گا۔“

شہلا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی منہی میں مسل دیا ہو۔

”کیوں؟“ اس نے کمزوری آواز میں پوچھا۔ ”کیوں نہیں؟“

”وہ میرا گھر نہیں ہے۔ وہ مومن کا گھر ہے۔ میں اس کے گھر میں کیوں رہوں؟“

”بیٹا!“ وہ جزبہ ہوئی۔ ”وہ تو مومن کی نانو کا گھر ہے۔“

”تو اسی کا گھر ہونا؟ یہ میری نانو کا گھر ہے تو میرا گھر ہے نا۔“

شہلا کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیسے سمجھائے۔

شہلا نے جواب نہ دیا۔ صرف استفہامی نگاہیں اس کے چہرے پر نکادیں۔

”بچوں کا گھر وہ ہوتا ہے جو ان کے پاپا کا گھر ہوتا ہے۔“

شہلا کو یوں لگا جیسے چھت اس کے سر پر آگری ہو۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جو میرے بہا ہیں نا۔ ان کا نام ابراہیم جیلانی ہے۔ انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے۔ اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے بہا کی دلہن بن جائیں تو ہم تینوں وہاں رہیں گے۔ میں آپ اور بہا! اکتا مزہ آئے گا نا۔“

شہلا کا سانس اس کے گلے میں پھنس گیا۔ اس سے آواز نکالنا مشکل ہو گیا۔ اپنی ہتھیلیوں کو اس نے غم ہوتا

محسوس کیا۔
 ”مما!“ اس نے شہلا کو ہلایا۔ ”بتائیں نا! آپ چلیں گی نا اسلام آباد!“ شہلا کا حوصلہ جواب دے گیا۔ بنا سوچے

سمجھے اس نے ایک طمانچہ اس کے گلے پر دے مارا تھا۔

”بند کرو بکواس۔ کس نے سکھایا ہے تمہیں یہ سب کچھ۔“ وہ پھنکاری۔

عمر گل پر ہاتھ رکھے سخت خوف زدہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

کاغذ پر اس کا قلم نہایت برق رفتاری سے رواں تھا۔ چند اسائنمنٹ تھے۔ جنہیں چند ایک روز میں پورا کرنا

بے حد ضروری تھا۔ اس کا پورا پورا اوصیان اپنے کام کی جانب تھا۔

اس کے موبائل کی بپ بجی تو اسے سخت کوفت ہوئی۔

اس نے آنے والی کال کا نمبر دیکھا۔ اسے اندازہ نہ ہوسکا کہ کالر کون ہے۔ اس نے منہ بنا کر کال ریسیو کرنے کا

ارادہ ترک کر دیا اور اپنے نوٹس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”ہوا؟“ عبد الباری نے اس کا فکر منہ چروہ دیکھا۔

”نہیں۔ وہ کال کیوں ریسیو نہیں کر رہا ہے؟“ موبائل تو اس کے پاس ہی ہو گا نا۔“ ترانہ نے فکر مندی سے

کہا۔

”پریشان مت ہو، ہو سکتا ہے وہ واش روم وغیرہ میں ہو۔“ عبد الباری نے اسے تسلی دی۔

”نہیں! کہیں جانتی ہو کس انسٹیٹیوٹ میں پڑھتا ہے۔ ورنہ ہم اس سے ملنے چلے جاتے۔ میرے پاس صرف اس

کا موبائل ہے۔“ ایک مرتبہ ربیعہ نے لکھوایا تھا۔

”ڈونٹ ڈو ٹرانز۔“ ٹھیک ہو جائے گا۔“ ٹرائی آئیں۔“

”جی! میں سرور میں سرور اور ایک مرتبہ پھر نمبر مانے لگی۔“

اس نے جواب دیا۔ لیکن اب اس کی روشن اسکرین اطلاع دے رہی تھی۔ کہ کال کرنے والا

بات کرنے پر مصر ہے۔ سانس بھری اس نے پتہ چھین رکھ کر فائل بند کی اور موبائل آن کیا۔

”جی! میں ترانہ کی بات کر رہی ہوں۔“

”ترانہ؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”میں ربیعہ کی کزن ہوں۔ اکثر آپ نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”اوہ گاڈ! ہاؤ کین آئی فار گیٹ! سو سو سوری ترانہ۔ میں اس وقت کسی اور دھیان میں تھا۔ جی کہہیے، کیسے

مزان ہیں۔ ربیعہ کیسی ہیں۔ ایونڈی تنگ از آل رائٹ نا؟“

”جی نہیں!“ ترانہ دھیسے سے بولی۔ ”یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ عبا! مجھے آپ سے بہت ضروری بات

کہنا ہے۔“

”کہہیے۔“ وہ بری طرح سے چونکا تھا۔

”عبداللہ! آپ۔ ربیعہ سے شادی کر لیں۔ فوری طور پر۔ آج ہی آپ کو منظور ہے؟“

”وباٹ!“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رنڈا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس ربیعہ ربیعہ پر کھناڑے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نتائج کی دھمکی دیتی ہے۔ انیسوا ابراہیم جیانی کو چھٹیپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

پارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے پارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو سنگنی کی انگوٹھی پہناتی ہیں، شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا پھاڑ اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۸

رکھلا بیوی پر قابض

اس نے ایک خطرناک نگاہ گردو پیش پر اور دو سری اپنی رسٹ واپس چڑھائی تھی۔

باری مسکرا دیا۔ پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے ترانہ کے ہاتھ پر ڈھیر سے کھینچا۔ ترانہ چونک اٹھی۔

”ریلیکس۔“ باری نے اسے تسلی دی۔ ”تم بہت شینس نظر آ رہی ہو۔“

”شینس ہوں تو۔“ انظر بھی آؤں گی۔ ”وہ ہوئے سے مسکرائی اور واحد انسان بن گئی۔ کہ تم میرے ساتھ ہو۔“

اتنا وقت میں اسی لیے کاٹ پائی ہوں۔ پتا نہیں وہ آئے گا بھی یا نہیں۔ ”عید البیاری کی سبھی اپنی رسٹ واپس دیکھ رہی ہے۔“

URDU PILOT

”وہ آئے گا ترانہ۔“ میں ”شینس“ سے کہتا ہوں۔ یوں بھی ہم اس کے لیے ہوئے وقت سے بہت پہلے ہی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس نے پانچ بجے آئے کو کہا تھا اور ابھی صرف سو پانچ ہوئے ہیں۔“

”پتا ہے باری۔ جو کچھ میں کرنے جا رہی ہوں اس کے لیے بہت ہمت درکار ہے۔ مجھے یہ ہمت نبھانے کس چیز نے دی ہے۔ شاید۔ شاید میرے احساس جرم نے۔ یا پھر اس محبت نے جو میں ربیعہ کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ جب سے میں نے اسے تمدن بھائی سے شادی کرنے پر فورس کیا ہے میں ایک عجیب سی خلش ایک ناقابل بیان احساس جرم میں مبتلا ہوں۔ یہ جانتے بوجھتے کہ کسی بھی طرح تمدن بھائی اس کے لائق نہیں ہیں۔ میں پھپھو کی باتوں میں آکر اسے ایک آگ کے دریا میں دھکیلنے لگی تھی۔ وہ گھر ہی آگ کا دریا ہے باری! میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر بھی پھر بھی میں ربیعہ کو وہاں عمر قید کی سزا سنانے والوں میں شامل ہو گئی۔ ربیعہ تو موسم کی گڑیا ہے۔ وہ کیسے جی پائے گی وہاں؟ کھل کھل کر مرجائے گی وہ۔“

باری گال کے نیچے ہاتھ رکھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ترانہ بات مکمل کرتے کرتے جھینپ گئی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو پاری؟“

”سوچ رہا ہوں!“ وہ واقعی سوچ میں گم تھا۔

”کیا؟“ ترانہ نے اچھپنے سے اسے دیکھا۔

”ایسا ہی ایک آگ کا دریا میرے گھر میں بھی بہتا ہے ترانہ۔ یہ کیسی حقیقت ہے؟ ہم انسان اپنے ان رویوں سے آگ کے دریا کیوں بناتے ہیں؟ ہم پر سکون ٹھنڈی میٹھی پھیلیں کیوں نہیں بناتے ترانہ؟ ابھی تو جب یہ سب کچھ کہا تو میں۔۔۔ میں بھی ایک احساسِ جرم میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ کہیں میں بھی تمہارے ساتھ نہ تو نہیں کر رہا۔“

ترانہ مسکرا دی۔

”نہیں باری! دونوں چیزیں بہت فرق ہے۔ ربیعہ اس سیٹ اپ کا دائمی حصہ بننے پر آمادہ نہیں ہے۔ نے کبھی ایسے ماحول کو نہیں برتا۔ وہ بالکل الگ نیچر کی لڑکی ہے۔ جب کہ میں تو ہمیشہ سے ہی آگ کے دریا کی ہوں۔ مجھ پر جگمگاتے بد لے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ پھر میں خود اس بات پر ذہنی طور پر رضامند ہوں۔ کہ میں ترانہ ہوں، موم کی گڑیا نہیں۔“

باری اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ تب ہی ان کی نگاہ گلاس ڈور کھول کر اندر آتے عباد پر پڑی تھی۔ وہ اندر اب متلاشی نگاہوں سے مختلف میزوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ترانہ کو باری کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیا۔ تو ان طرف بڑھا۔

ترانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ باری عباد کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر چند قدم آگے بڑھ کر ترانہ بھی کھڑی ہوئی۔ بھام وعا کے مرحلے طے کر کے وہ تینوں اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے تھے۔ ترانہ جا بختی ہوئی نگاہوں سے عباد کو دیکھا۔ گرے شرٹ اور گرے جینز میں وہ ہمیشہ کی طرح فریش اور خوب لوگ رہا۔

شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے وہ قدرے بے پروا انداز میں تھا۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا اور اس گلے میں پڑا ہوا سیاہ تھوڑا کھائی دیتا تھا۔

ترانہ نے چشمِ اقصور سے اسے ربیعہ کے ہمراہ دیکھا اور خوشی سے مسکرا دی۔ ربیعہ جیسی خوبصورت، نازک، حساس لڑکی کے لیے ایسا ہی شاندار سا بندہ ہونا چاہیے تھا۔

”جی مس ترانہ۔“ اس نے کہا۔ ”جیپ بھر کر مجھے جو ڈاکے ہوئے بالآخر عباد نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔“ تو اب ہم بات کر سکتے ہیں۔“

ترانہ نے ایک نگاہ باری پر ڈالی اور ہولے سے کھنکراتے ہوئے بات شروع کی۔

”عباد۔۔۔ میں نے آپ سے فون پر ایک درخواست کی تھی۔“

”اور ایسی باتیں فون پر تو ہر گز نہیں ہوتیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”اسی لیے میں نے آپ لوگوں کو یہاں آنے

زحمت دی ہے۔ اچھا ہوتا کہ آپ ربیعہ کو بھی ساتھ لے آئیں۔“

”وہ فی الوقت ایسی پوزیشن میں نہیں ہے۔“ ترانہ افسردگی سے بولی۔ ”اور پھر اسے تو بالکل علم نہیں ہے کہ میں

نے آپ سے ایسی کسی بات کے لیے رابطہ کیا ہے۔“

اس نے عباد پر نگاہ ڈالی وہ سوچتی نگاہوں سے اس کی گفتگو میں تسلسل آنے کا منتظر تھا۔

”در اصل عباد! بات یہ ہے کہ میری پیپھو اور میرے بڑے بھائی تمدن نے ربیعہ سے زبردستی کی رضامندی

کر اس کی شادی تمدن بھائی سے طے کر دی ہے۔ اس۔۔۔ اس جمعہ کو ان کا نکاح ہے۔ شروع میں تو میں بھی سوچتی

تھی کہ اگر ایسا ہو جائے تو شاید ہمارے بد قسمت خاندان کو ایک بہت اچھی، سچھی، ہوئی یا رسالہ کی عیبی مدد کی

ناعمہ کو بار بار جیسے کچھ یاد آتا تھا پھر ذہن پر بننے والے یاد کے نقش کسی دوسری سوچ کی لہر میں بہہ جاتے تھے۔ کون تھا وہ؟ پہلے کہاں رکھا تھا اسے؟ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا؟ وہ اس سے خفا کیوں تھا؟ پھر اس کا نام سنا سنا سا جانا پہچانا سا۔

”فراں! اس کے کانوں میں باز بار آواز گونجتی۔“

اس کا مڑ کر ناعمہ کو بے بسی سے دیکھنا اور بادل خواستہ وہاں سے ہٹنا۔ ناعمہ کے دل و دماغ پر وہ منظر نقش ہو گیا تھا۔ پھر اس کی وہ دیوانوں کی سی باتیں سننے سمجھ میں آنے والی نہ رہی جانے والی۔ کچھ مطلب تھا ان بے سرو پا باتوں میں۔ کوئی دُور تھی جو ہاتھ میں آجاتی تو سب ہی معے حل ہو جاتے۔ لیکن وہ دُور۔ اس کا میرا۔ کہاں تھا؟

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں؟“

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ وقت گزاری تھی؟“

”اسی بھولپن پر مر رہا تھا میں کیا خبر تھی کہ اس بھولپن کے پروے میں کتنا فریب پوشیدہ ہے۔ کیا خبر تھی؟“

”کیا خبر تھی؟“

ناعمہ نے ارد گرد اس کے الفاظ میں چھپی بے بسی چکرانے لگی۔ اس کی سوچ کی پرواز نہ حال ہو کر گر پڑی۔

”اب اپنے بستر کی پشت سے نکال کر آنکھیں موند لیں۔“

”کیا بات ہے؟“

”وردہ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے کی کوشش کی۔“

”میں ٹھیک ہوں ایسا۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے؟ آپ نے مجھ کو نظر انداز کر کے مجھے میری پسند کا لباس دلوایا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”ہائیں! وردہ وندنا ہو گئی۔“

”یہ تم ہی ہو ناعمہ؟ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو۔؟ یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“

”میری طرف سے کوئی بات نہیں۔“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

”یہ بات ہے؟“

حاصل ہو جائے گی۔ شاید یہ شاید اس کے ہمارے خاندان کا حصہ بن جانے سے خوش قسمتی کا کوئی درجہ ہمارے لیے بھی کھل جائے۔ لیکن گزشتہ چند روز میں مجھے احساس ہوا کہ میں بالکل غلط سمجھتی اور سوچتی تھی۔ خاندان واقعی اس قابل نہیں ہے کہ وہاں ربیعہ جیسی معصوم فرشتہ صفت لڑکی اپنی تمام زندگی کسی ناکردہ گناہ قابل معافی سزا کے طور پر گزار دے۔ وہ گھر تو کالے لپائی کی سزا ہے۔ میں بچپن سے وہیں ہی بڑھی ہوں۔ لیکن درود یوار میں میرا دم گھٹتا ہے تو ربیعہ ربیعہ تو بہت نازوں سے پلی ہوئی نرم و نازک تیل جیسی لڑکی ہے۔ وہ تو دنوں میں مرجھا جائے گی۔“

عباد سیٹ چہرہ لیے اپنی نگاہیں بولتی ہوئی ترانہ پر جمائے ہوئے تھا۔

”وہ سزا کوئی آپشن میرے یا ربیعہ کے پاس نہیں تھا۔“ ترانہ نے نظریں جھکا کر جیسے اپنے جرم کا اعتراف

تھا۔ ”اور ربیعہ بے چاری کے ذہن میں تو ایسا بھی کوئی آپشن نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو ایک بھائی کی طرح مخلص

مددگار سمجھتی ہے۔ لیکن عباد ایہ پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ ربیعہ کو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ایک غیر

رشتے کی ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کی نظر میں منہ بولے رشتوں کی کوئی قیمت نہیں۔

اگر میں کسی طرح ربیعہ کو اس گھر سے نکال بھی لاتی ہوں تو مجھے ایک سائبان چاہیے۔ ایک مضبوط

چاہیے۔ اس لیے میں نے آپ سے یہ بات کی تھی۔“

ترانہ نے نظروں میں آس بھر کر اسے دیکھا۔

”میں جانتی ہوں عباد! اس نے لیوں پر خاموشی کی مہر لگائی ہوئی ہے لیکن اس کا دل دہائیاں بے رہا ہے۔ اس

آنکھیں خشک ہیں مگر اس کے احساسات آشک بار ہیں۔ وہ اس حالت میں زیادہ عرصہ نہ جی سکے گی۔ اس کے

چینے کی آس اگر کہیں موجود بھی ہوئی تو میرا ظالم بھائی اسے کسی شمع کی لوکی مانند ایک ہی پھونک میں بجھا دے

پلیز عباد! آپ۔ آپ اس کا ہاتھ تھام لیں۔ اگر آپ کے دل میں اس کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی ہے تو

آپ اس سے شادی کر لیں۔“

عباد نے پہلو بدلا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے جیسے صورتحال پر غور کیا تھا۔

”لیکن ترانہ! آپ کے گھر والے؟ انہیں کون ذیل کرے گا؟“

”کوئی نہیں!“ وہ سیٹ انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ عباد کو الجھن ہوئی۔ ”ربیعہ آپ کے گھر میں ہے۔ اس کا جہہ تو نکاح ہے۔ ایسی صورت

میرا اس سے شادی پر ہائی بھرنا کس درجہ حماقت کے زمرے میں آتا ہے۔ کیا آپ کو احساس ہے؟“

”عباد!“ ترانہ کو اس کی بات سمجھ گئی۔ ”میں آپ سے کوئی بارات وغیرہ لانے کے لیے نہیں کہہ رہی ہوں

میں تو آپ سے ربیعہ کو بھگا کر لے جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”کیا بات!“ عباد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

عبدالباری نے بڑی مشکلوں سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

اس کا پسندیدہ میروں لہنگا اس کی نظروں کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور مرکوز تھا۔ گھر

سوچ میں گم بیٹھی وہ اپنی چٹنگلی کا ناخن دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ نجائے کون تھا وہ اجنبی جو دل کو بے چینی کا عار

رہے گیا تھا۔

مشق محمد و محمد فرشتہ کے حوئے

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

خانہ کا

دستخطات

شاہد ہونی

نگوئے کاہنہ : ۳۷ اردو بازار کراچی

وردہ کے لب مسکرانے لگے۔ اس نے ناعمہ کے سامنے پڑے لباس پر ایک نگاہ ڈالی۔
 ”ویسے ڈریس تو واقعی اچھا پسند کیا ہے تم نے۔ پہن کر دیکھا ہے؟“
 ”نہیں۔ ابھی تک تو نہیں!“ وہ کسلمندی سے بولی۔

وردہ نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں پوری طرح سے کھول کر اسے دیکھا۔
 ”ناعمہ۔۔۔ تم مجھے واقعی بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔ یعنی کل سے تم نے اسے پہن کر ہی نہیں دیکھا۔ کہاں تو تمہارا لب نہیں چل رہا تھا کہ تم اسے وہاں ایچمپوریم میں ہی پہن کر کھڑی ہو جاتیں۔“
 ناعمہ کو بہن کی باریک بینی کا احساس ہوا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرا دی۔
 ”میں ابھی آپ کو پہن کر دکھاتی ہوں۔“ وہ چٹکی بجا کر بولی۔
 وردہ بے ساختگی سے مسکرا دی۔



”کیا بات ہے عریشہ! سچ بچ بتاؤ مجھے!“ ماہین سب کام سمیٹ کر اب بے حد فراغت سے اس کے سامنے یوں آکر بیٹھی تھی کہ فرار کے سبب ہی راستے میں وہ تھے عریشہ نے کتاب پر سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر نظریں چرا کر لب کاٹنے لگی۔ ماہین بغور اس کے تاؤ اسے ملاحظہ کر رہی تھی۔
 ”آپ کیلچا جانا چاہتی ہیں؟“ وہ دھڑکے سے بولی۔

”تمہارے لب بالکل بدلے ہوئے رویے کی وجہ! اور آج میں جان کر رہوں گی۔ دیکھو عریشہ! لڑیا گڈنے سے کھیلنے کی عمر گزر گئی ہے تمہاری۔ زندگی کو کچھ سنجیدگی سے لو۔ اگر تمہارے ساتھ کہیں کچھ غلط ہوا ہے کوئی زیادتی ہو گئی ہے ہم سے تو بتاؤ ہمیں۔ تمہارے لب آزاد ہیں۔ لیکن اپنی گویائی کو قید کیا ہوا ہے تم نے۔“
 ”کیا بات ہے کیا!“ وہ پھسکی سی ہنسی نہیں دیتی تھی۔ ”آج تو بہت فلسفیانہ گفتگو کر رہی ہیں آپ اتنے دنوں بعد آج آپ کو یہ خیال آگیا کہ میرے لب آزاد ہیں۔ اور لبوں کے آزاد ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ گویائی کی طاقت ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ بات تو سماعتوں کی ہے ایسا۔ سننے والوں نے سماعتوں کے درپردہ کھڑے ہو کر گویائی کی بے اثر دستک ان پر اثر انداز نہیں کیا۔“
 ماہین نے ہمدردی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”عریشہ! بہت ڈسٹرب لگتی ہو تم مجھے۔ تم یہ بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں نافع پسند نہیں ہے یا پھر تمہیں کوئی اور پسند ہے؟“

عریشہ کا دل یکبارگی کسی اور تال پر دھڑکا تھا۔ ”کوئی اور“ نے عجب طرح سے احساسات کو چھوا تھا۔ اس کی پلکیں لرزسنے لگیں۔

”بولو۔۔۔ جواب دو۔۔۔ میں تمہارا جواب سنے بغیر یہاں سے اٹھنے والی نہیں ہوں۔“
 ”اپنا۔۔۔ کیوں راکھ کرید رہی ہیں۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”سب چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔“
 ”جھوٹ۔۔۔ غلط۔۔۔ پورا الاؤ روشن ہے یہاں تو۔۔۔ اس کی تیش باہر والوں تک نہ پہنچے اس بات کا خوف ہے ہمیں۔ عریشہ! یہ خاندان کا معاملہ ہے۔ اور وہ خاندان جو برسوں سے ایک ہے۔ تمہاری کسی بچکانہ حرکت سے اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچا تو ساری عمر پچھتاؤ گی تم بھی۔ اور ہم بھی۔ ابھی وقت ہے فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے جو کہنا ہے وضاحت سے کہہ دو۔ تمہارا یہ رویہ گھر والوں کو تکلیف دے رہا ہے اور باہر والوں کو

شک میں مبتلا کر رہا ہے۔ سب لوگ تمہارے اس برتاؤ کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ جب سے نافع سے تمہاری معافی ہوئی ہے تم نے کسی سے بھی کلام کرنا چھوڑا ہوا ہے۔ تم کہیں آنا جانا ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اور اب ہاشم بھائی کی شادی کی تاریخ بھر گئی ہے اور تم نے اس معاملے میں بھی رتی برابر دل چسپی نہیں لی بھی۔ خاندان کی سب ہی لڑکیاں بہت شوق سے اپنی تیاریاں کر رہی ہیں اور تم دو لہا کی بہن ہوتے ہوئے بھی لا تعلقی سے کونے میں پڑی ہوئی ہو۔ آخر کیوں؟

عریشہ نے سر جھکاتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ کیا بتاتی وہ کسی کو؟ اس سارے قصے میں بتانے والی آخر کی بات تھی؟ بس صرف اتنی سی بات تھی کہ اس کا دل اسے کسی گھڑی کسی پل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اسے آنکھیں یا آتی تھیں۔ اسے باتیں یاد آتی تھیں۔ اور وہ یوں پہلو بدلتی تھی جیسے کسی والاؤ پر بیٹھی ہو۔ ماہین اسے دیکھتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”نافع سے کوئی شکایت ہے؟“ اس نے پھر زچ ہو کر پوچھا تھا۔
 ”نہیں۔!“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”اس میں یہ ہے کیا اچھا یا برا لگنے کو۔“
 ”اوہ!“ ماہین اچانک ہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ ”عریشہ! حد تو رکھو گئی بچپنے کی۔“
 وہ تاسف سے بولی تو عریشہ نے آنسو بھری نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”بس۔۔۔ نہیں پسند مجھے۔“ وہ ضد سے بولی۔
 ”پھر توڑ دیں مٹکئی؟“ ماہین نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔ ”کچھ ایسا ناممکن تو نہیں۔ گھڑی کی بات ہے۔ بعد میں تم اس کے ساتھ کسی روئیہ اپنائے رکھو گی تو کچھ نہ ہو پائے۔“

عریشہ لب چبانے لگی۔
 ”بولو۔ جواب دے۔ کہتی ہو تو میں ہنوں سے بات کروں۔ اتنا پیچیدہ کو بیچ میں ڈال کر میں دلوں پہ جان تک بات پہنچا دیتی ہوں۔“
 عریشہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے الفاظ ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئے۔ چشم تصور سے اس نے ایک مضبوط ہاتھ کو اپنے سر پر آتے اور ٹھہرتے دیکھا تھا۔ اس ہاتھ کے دیاؤ میں جو مان تھا جو بھروسہ اور جو اعتبار تھا۔ عریشہ کا رواں رواں اسے محسوس کر سکتا تھا۔

”بولو عریشہ۔ جواب دے۔!“ ماہین جھنجھلا گئی۔ ”ہاشم بھائی! شادی کے بعد جب سے وہاں سے گئے۔ توڑ ڈالتے ہیں یہ مٹکئی۔ جب تم ہی خوش نہیں ہو۔“
 ”نہیں! کیا۔!“ وہ کانپتے لبوں سے بولی۔ ”اب کچھ نہیں ہو گا! میں۔۔۔ میں خوش ہوں۔“
 ماہین نے گہری سانس بھری اور کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”پھر اپنا رویہ درست کرو۔ انسان بن کر رہو۔ اب کسی کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور ہاں! کل ہم تمہارے کپڑے لینے جا رہے ہیں۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک تمہارے ہی کپڑوں کا کام رہتا ہے۔“
 عریشہ چپ رہی اس کی پلکوں پر کمی تھی۔

نہاد کو وہ بستر پر بہت آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن ذہن، جسمانی آرام کا اثر قبول کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھا۔ وہ بے حد منتشر! بخیالی کا شکار ہو رہی تھی۔ بالوں سے ٹپکتے پانی سے خنک ہوئے بستر پر اس نے گروٹ بدلی اور

جالی کے سفید پردوں کو وہ خالی الذہنی کے عالم میں گھور رہی تھی۔ بیڈ پر دونوں ٹانگوں کو سمیٹ کر بیٹھی ہوئی وہ نجانے کیا کچھ سوچے جا رہی تھی۔ کچھ دن بعد اس کی سونی اجڑی مانگ پھر سے جتنے والی تھی۔ ہتھیلیوں سے روٹھی ہوئی مندی کے رنگ پھر سے دوستی کرنا چاہتے تھے۔ سرخ زرتار آچل پھرے لہرانے کو تھا۔ لیکن روٹھا ہوا دل سے مان کرنے دیتا تھا۔ نجانے کیا چاہتا تھا یہ دل، شہلا اپنے آپ سے ڈر رہی تھی۔ اسے خود سے باتیں کرنے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

عمر کی باتوں نے اس کے دل کو آج سی لگا دی تھی۔ نجانے وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔ شہلا جانتے بوجھتے بھی بے نیاز رہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی کوشش کچھ ایسی کامیاب نہ ہو پاتی تھی۔
 ”بچوں کا گھر وہ ہوتا ہے جو ان کے بابا کا گھر ہوتا ہے۔“
 ”انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے، اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے بھائی کی دہن بن جائیں تو ہم

تنبہاں وہاں رہیں گے۔ میں آپ اور پہا۔ کتنا مزہ آئے گا۔!

شہلا نے بے ساختہ ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا ہو۔

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا!“ اس کے کانوں میں ابرار جیلانی کی آواز گونجنے لگی۔

”میرا ایک دوست یہ قربانی دینے کو تیار ہے۔ ہاں کہہ دو شہلا! ہاں کہہ دو۔“

شہلا کے لبوں سے بے اختیار ہی سسکی نکلی تھی۔ وہ تکیہ میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ گئی۔ قسمت نجانے کیا ہر موڑ پر آزمانے کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس نے مطمئن اور پرسکون رہنے کے لیے ایک راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس نے راہ نہیں دورا ہا منتخب کر لیا تھا۔ سامنے تو دورستے کھلے ہوئے تھے پوری وضاحت کے ساتھ۔



دوڑتے دوڑتے وہ حسب معمول بھاگ گیا تھا۔ رافع کافی آگے نکل گیا پھر وہ بھی رکا اور پلٹ کر واپس آنے لگا۔ ہاشم دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس کی سفید ماریش سے بنے بنے کودیکھ رہا تھا۔ پام کے خوبصورت پودوں سے سجا ہوا ٹیرس فی الوقت سنسان تھا۔ کتنی پھولوں سے لکڑی ہوئی ٹیل جیسے کھڑکی تک جا رہی تھی وہ کھڑکی بھی بند تھی۔ اس کے شیشوں کے پیچھے پڑے دبیز پردے نظر آتے تھے رافع اس کے قریب آکر رکا اور اس کی حد درجہ محویت دیکھ کر مسکرا دیا۔

”میاں رانجھے! کیا سوچنے لگتے ہو یہاں تک پہنچ کر تم۔“

ہاشم نے رافع کو دیکھا۔ اس کے لب مسکراتے لگے۔

”اب تو خیر سے شاعر ہیں جناب!“ وہ بولا تھا۔ ”اب تو میرے جذبات تیرے احساسات شہس بغیر میرے کچھ کے بھی سمجھ لینے چاہئیں۔ شاعر تو انسانی احساسات کے سمجھنے والی زبان ہے۔“

رافع نے اس کے کھلتے چہرے پر مسکراتے لبوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں ان تمام چیزوں کے رانگی ہونے کی دعا مانگی۔ دونوں اب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

”یار رافع!“ ہاشم نے اس کے کاندھے پر اپنا بازو رکھ لیا۔ ”وہ جو لڑکی ہے تیرے خیال میں حقیقت میں وہ کہاں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ رافع نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”جو خیال میں ہے وہ خیال میں ہے۔ حقیقت سے خیال کا واسطہ ہی کیا؟“

”نہیں یار! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تو نے اسے ہی اپنے خیالوں کا پیکر بنایا ہے۔ لاشعوری طور پر اتنی بڑی حقیقت تیرے سامنے ہے اور پھر بھی تو اس سے انکاری ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔“

”نہ مانے دل!“ رافع مسکرایا۔ ”اسے منانا میری ذمہ داری تو ہے نہیں۔ اور میاں رانجھے! تمہیں یہ گمان کب سے ہوا کہ میں تم سے کچھ چھپاتا ہوں۔“ اس کا وجود میرے خیالوں کی اس ماورائی دنیا میں نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔“

ہاشم کو الجھن نے آگھیرا۔ دونوں اب پارک میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک بیچ پر بیٹھ کر رافع گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے صبح کی خوبصورتی کو اپنے اندر سمونے لگا۔

”رافع!“ کچھ دیر کے بعد ہاشم بولا۔ ”کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”کیا...؟“

”یہی۔ اتنا بڑا ٹکراؤ۔“

”کہیں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ یو ڈونٹ وری۔“ رافع اٹھ کر بچوں کے بل اچھلتے لگا۔

”ٹکراؤ ہے رافع! تم ابھی اس کی ٹیگنی سے آگاہ نہیں ہو۔ لیکن میں سمجھ سکتا ہوں انسان کے خیالوں اور اس کی حقیقت میں اتنا بڑا تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ٹکراؤ ہو کر رہتا ہے۔ رافع! ایک مشورہ دوں۔؟“

رافع نے اچھلتے اچھلتے ہی ایک نظر اس برڈالی۔

”شاعری کرنا چھوڑ دو۔ پھاڑو اپنی نظمیں، غزلیں۔ سبھی کچھ! بھول جاؤ کہ تم نے لفظوں سے خیال میں ایک بری پیکر تراشا تھا۔ بھول جاؤ۔“

رافع رُک کر حیران و پریشانی سے اسے گھورنے لگا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا وہ کچھ دیر کے لیے کچھ بول نہ پایا۔

پھر وہ آکر ہاشم کے برابر بیٹھ گیا۔

”یار ہاشم!“ کچھ دیر کے بعد وہ خود پر قابو پا کر بولا تھا۔ ”میں تیری گردن دبا دوں گا کسی دن۔“

ہاشم بے ساختہ ہی مسکرا دیا۔

”بندہ“ ”پھول“ نہیں کرے گا۔ ہم یاروں کے یار ہیں۔“

”میں سکون سے جی رہا تھا، اطمینان ہی اطمینان تھا میری لائف میں۔ اتنا سیدھا میں تھا اس شاہراہ میں کہ آنکھیں بند کر کے بلا خوف و خطر دوڑ لگا سکتے تھے۔ تو نے مجھے ابھارا۔ بار بار ابھارا۔ اتنا کہ میں مجبور ہو گیا خود سے باتیں کرنے پر۔ میں نے اپنے اندر ایک خیالی دنیا بسائی۔ میں نے ایک خیالی محبوبہ اس دنیا کی کمین بنائی۔ اسے سب سے چھپا کر صرف اور صرف خود تک محدود رکھا۔ اور اب جب کہ میں اس دنیا کی سیر کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ تو فرماتا ہے۔ بلکہ بکواس کرتا ہے کہ میں آگ لگا دوں اس دنیا میں۔“

”تو نے کبھی کچھ سوچا تھا؟ یار ہاشم! میں انسان ہوں۔ یارو بوٹ ہوں؟ اپنے احساسات کو سنگ دی سے پھاڑ کر پھینک دینے کا ظالمانہ مشورہ کیوں دیتا تو نے؟ وضاحت کر؟“

ہاشم نے گہری سانس بھری اس کی سانس میں رافع کے ہر لفظ کی تائید تھی۔

”رافع! میں تجھے مشینی خیالات کے حوالے سے جھیڑتا تھا تو مجھے پتہ نہ تھا کہ میں ہی بادلوں کو پرے کر دیا۔“

”کی طرح ہیں جو بے خبری کے سیاہ بادلوں کے پیچھے سفر کر رہا ہے۔ میں نے اسے انجاسے میں ہی بادلوں کو پرے کر دیا۔“

رافع! اور اس چاند کی روشنی سے خوفزدہ ہو گیا ہوں یا تو اس روشنی کو ”اس“ کے نام کر دیا۔ یا پھر یہ بھادوا ہے۔ گل کر دیا۔ تم سے بہت محبت کرتا ہوں رافع! اسی لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم بری طرح سے پھنس جاؤ گے۔ کسی بھی وقت۔ کسی بھی وقت رافع!“

”میں نا الوقت۔“ اس کے نام کچھ بھی نہیں کر سکتا ہاشم! مجھ میں یہ خیال دیولپ ہی نہیں ہو پاتا۔ مجبور ہوں۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی اور خیال تو خیال ہے۔ اس سے کیا ڈرنا؟ حقیقت کی سب ہی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔“

”ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ جذبے اور خیال حقیقت کو کس طرح بے بس کر دالتے ہیں۔“

”اے۔۔۔ دیکھی جائے گی!“ وہ شیر جوان کی مانند اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پہل دیکھتے ہیں کون اس پھیل کے درخت کو پہلے ہاتھ لگاتا ہے۔“

”تو جیت جائے گا یا نہ!“ ہاشم نے جمائی لی۔ ”میری دراصل نیند پوری نہیں ہوئی رات کو۔ میں کچھ ست

ہو رہا ہوں۔“

”ابھی سے یہ حال ہے۔“ رافع نے شوخی سے دانت نکالے۔

”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!“ ہاشم نے بھی خوش دلی سے ٹکڑا لگایا۔

دونوں کے زبردست قہقہے نے پاس بیٹھی چیزوں کو اڑا دیا تھا۔

”ربیعہ!“ ترانہ نے سرگوشی کی تھی۔

اور وہ تو نجانے کتنی راتوں سے جاگی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی پھلتے ہی اس کا دل جیسے کسی آہنی شکنجے کی گرفت میں آکر پھرجھڑانے لگتا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے چھت پر گھورتے چٹھے کو دیکھا کرتی، بے سوچ، خیالی ذہن کے ساتھ وہ دیواروں کے اکھڑے ہوئے پینٹ سے بنے ہوئے نقش و نگار بھول بھلیوں میں پھرا کرتی۔ کمرے میں سوتے ہوئے نفوس کی سانسوں کے زبردست سستی اور اپنی کھوئی ہوئی نیند کے بارے میں سوچتی کہ کبھی وہ اس کی کتنی اچھی سہیلی تھی۔

ابھی میں ترانہ کی مدد ہم سرگوشی سے فوراً ہی چونکنا لازم تھا۔ ربیعہ نے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھٹکے ہوئے

پتے دیکھا۔ اگر ترانہ نے اسے پکارا نہ ہوتا تو وہ یقیناً ڈر جاتی۔

”ترانہ! پھر بولی تھی۔“ میں اوپر چھت پر ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر آجاؤ۔ کسی کو پتہ نہ چلے۔“

ترانہ بات مکمل کر کے آہستہ سے پیچھے ہٹی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر کے اندھیرے میں مدغم ہو گئی۔

ربیعہ کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ چارپائی اس کی غیر متوقع حرکت پہ جنملا کر کراہی

تھی۔ ربیعہ کامل سماج پر آہستہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر کھڑی رہنے کے بعد صولت کی سانسوں سے ان کی گہری نیند کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی پھر اس

نے سہا ہر کی گواہی برضا دے دی۔

پنست پھٹنا لگتا تھا۔ فضا میں قدرے خنکی کا احساس ربیعہ کو نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے ٹھنڈ محسوس

ہونے لگی۔ اس کے ذہن میں بازو پھینک کر ڈیوڑھی کی کوشش کی۔ ترانہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے ہمدردی

کے ساتھ اسے سہارا دیا اور اسے لے کر کوسٹ میں رکھی کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے ربیعہ کو کرسی پر

”کیا بات ہے ترانہ!“ ربیعہ نقاہت سے بولی تھی۔ ”رات کے اس پہرے کوئی خاص بات ہے۔؟“

”ہاں۔۔۔“ ترانہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”بہت خاص، یہاں اس لیے لائی ہوں تمہیں کہ یہ بات ابھی

ہمارے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلتا تھا۔“

ترانہ بہت مدد ہم آواز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ربیعہ نے ڈر کر اندھیرے میں اسے غور سے دیکھا۔

”جلدی کہو ترانہ! مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔ ڈر لگ رہا ہے۔“

”بس رنجیلے۔ اب تمہارے سارے ڈر اور خوف ختم ہونے والے ہیں۔ ایک نئی خوبصورت، مسکراتی ہوئی

زندگی تمہارے احاطہ میں دبے پاؤں چلی آرہی ہے۔“

”ترانہ!“ ربیعہ کے لب کاٹنے، مجھ سے ایسے مذاق مت کر۔ پلیز۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور ترانہ کے ہاتھوں پر گرے۔ سو تڑپ اٹھی تھی۔

”ربیعہ۔! ربیعہ! مجھے معاف کر دو، میں اپنے خاندان کے لیے بہت خود غرض ہو گئی تھی۔ میں کسی شاک

پجاری کی طرح تمہارا خون بہا کر اس گھر کے لیے عافیت مانگ رہی تھی۔ ربیعہ! بہت بڑی زیادتی کرنے جا رہی
میں تمہارے ساتھ۔“

”ایسا نہ کہو ترانہ!“ ربیعہ آہستگی سے بولی۔ ”میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا، کوئی شکایت نہیں کی۔ پھر تم کیوں
ایسا سوچ رہی ہو؟“

”میں جانتی ہوں ربیعہ! تم کتنی صابر، شاکر، معصوم اور نیک فطرت لڑکی ہو۔ اسی لیے تو میری نیت میں بھی نرا
در آیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ گھر اور اس گھر کے مکین اس لائق ہی نہیں ہیں کہ تمہاری جیسی بے غرض
اور بے لوث لڑکی اپنی خوشیوں کی قربانی دے۔“

ربیعہ خاموش رہی۔

”مجھے معاف کرو ربیعہ! لیکن تم سے پوچھے بغیر ہی میں تمہارے مستقبل کے بارے میں ایک فیصلہ کر بیٹھ
ہوں۔!“ ترانہ قدرے شرمندگی سے بولی۔

”میں تو یہ فیصلہ کب کا قبول کر چکی ہوں ترانہ!“ ربیعہ نے گہری سانس بھری۔ ”تم اب اس بات کا ذکر کیوں
کر رہی ہو؟“

ترانہ نے سراٹھا کر محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں ربیعہ! میں کسی اور فیصلے کی بات کر رہی ہوں۔“

”اور فیصلہ کیا ہے؟“

”ربیعہ! کل رات کو اسی وقت ہم لوگ خاموشی سے اس گھر سے نکلیں گے۔“ ترانہ مدہم آواز
میں بولنے لگی۔ ”ہم لوگ۔“ ہونٹ چاٹیں گے۔ وہاں عباد ہمارا منتظر ہو گا۔“

ربیعہ حیرت سے بت بنی اس کی بات سن رہی تھی۔

”ربیعہ! ہوٹل میں باری اور باری کے ایک دوست کے ساتھ عباد سے تمہارا نکاح پڑھوایا جائے گا۔ پھر
ایک گھنٹے بعد تم دونوں رات میں بیٹھ کر کراچی چلے جاؤ گے۔ پوچھنے کے لیے۔“

”ترانہ! ربیعہ! بمشکل بول پائی تھی۔“ تم۔ تمہا گل ہو گئی ہو لیا ہے۔

”نہیں ربیعہ! میں اب مکمل ہوشاں ہوں۔“ اس میں آچکی ہیں وہاں خائیں کچھ دنوں میں پڑ گئی تھیں۔“ ترانہ
سکون سے بولی۔

”جانتی ہو۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کرنے جا رہی ہو؟ تم اس گھر کا ایک فرد ہو ترانہ! تمہارا ہر قدم اس کی بہتری
اور بھلائی کے لیے اٹھنا چاہیے۔ اور تم۔ یہاں آگ لگا دینے والا کام کرنا چاہتی ہو؟“ ربیعہ جذباتی ہو گئی۔

ترانہ نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”ہاں ربیعہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچھ دن پہلے تک میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرا ہر قدم، ہر عمل صرف اپنے گھر کی
بہتری اور بھلائی کے لیے ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اب میں جان چکی ہوں کہ صرف اپنے گھر کے متعلق سوچنے والے
خود غرض ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کی خوشی کے لیے کسی معصوم کی زندگی بھونک دینا سخت ترین خود غرضی کے سوا کچھ
نہیں ہے۔ میں خود غرض بن کر جینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”اور میں ایسا کچھ بھی کرنے پر تیار نہیں ہوں ترانہ!“ ربیعہ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے تمہارا یہ فیصلہ منظور نہیں
ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”ربیعہ! ربیعہ!“ ترانہ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”تم پاگل مت بنو! اس گھر میں کوئی تمہارا ایسا خیر خواہ نہیں
ہے جو تمہارے اس ایثار اور خلوص کے بدلے تمہیں کبھی چاہت اور محبت کا ایک لفظ بھی خیرات میں دے

دے۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھ سے۔ میں نے اس گھر کی بنیادوں کو اپنا خون جگر دیا ہے۔ اور اگر آج میری طرف سے رتی برابر بھی کوتاہی ہو جائے تو یہ لوگ میرا خون پیئیں پر آمادہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے خونی رشتوں کو بخوبی جانتا ہوں۔“

”جو بھی ہے ترانہ! اب یہی میرا مقدر ہے۔“ ربیعہ آنسو پی کر بولی۔ ”ان باتوں پر سوچنے اور بولنے کا وزن گزر چکا ہے۔ اب تو فیصلے پر عمل درآمد ہونا پائی ہے۔ سو ہو جائے دوست اور پھر میں تیرا بھائی سے شادی کر رہی ہوں، لیکن عباد بھائی سے۔ کبھی نہیں۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ اور وہ کیسے مان گئے؟“ ربیعہ کی آواز بھرا گئی۔

”انہوں نے اپنی رضامندی تمہاری رضامندی اور خوشی سے مشروط کی ہے ربیعہ!“ ترانہ نے جیسے کسی گناہ اعتراف کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”اور میں قطعاً رضامند نہیں ہوں۔“

”ربیعہ! یہ وقوف مت بنو۔ تم کھائی میں گرنے جا رہی ہو۔“ ترانہ جیسے گڑگڑائی تھی۔

”یہ رستہ تم نے ہی تو چنا تھا ترانہ!“ وہ یاسیت سے بولی۔ ”اب یہ کنویں کو جائے یا کھائی کو۔ میری قسمت!“

ترانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اپنی آنکھوں پر گر رہے تھے۔

وہ یوں روئے روئے انداز میں چلتی ہوئی فون تک آئی تھی جیسے دو سری جانب وہ دیکھ ہی رہا ہو گا۔ چند لمحے اس نے ریسور کو غصے سے گھورا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بددلتائی پھر ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہوں!“ وہ بولی تھی۔

”ہیلو!“ دو سری جانب صورت حال سمجھنے پایا۔

”ہوں!“ اس نے اصرار کیا۔

”بھئی یہ“ ہوں کیا ہے؟ نہ دعا نہ سلام نہ منہ میں کچھ رکھا ہے کیا؟

”ہاں! غصہ رکھ رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ پتلا کر لیا ہوا ہونے لگا۔

”ہا ہا ہا!“ عاشر نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ ”بے وجہ غصہ تو نر دماغی کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ہماری

پیاری سی بیگم صاحبہ خرم غ ہو گئی ہیں شاید۔“

”ایقان نے ایک ہاتھ سے ریسور سنبھالا ہوا تھا اور سر ہاتھ اس نے لڑنے والے انداز میں کمر پر رکھا تھا۔

”اس وقت اگر تم میرے سامنے ہوتے تا!“ اس نے دانت پیسے۔

”اچھا! پھر کیا کرتیں؟“ اس نے بہت سارو مانیں لہجے میں سمو کر پوچھا۔

غصہ سے بھری ہوئی ایقان دفعتاً ہی مسکرا دی تھی۔

”عاشر تم!“

”ہاں بھئی!“ ایسے خوبصورت جملے ادھر سے نہیں چھوڑا کرتے۔“ وہ مسلسل اسے چھیڑنے کے موڈ میں

تھا۔ ایقان کو اپنی بے بسی پر رونا ہی آگیا۔ اس کے آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔

”ہیلو! کھو تمہاری خاموشی بھی خوبصورت ہے بیگم! لیکن میرا بل اگر تمہاری کھکتی آواز سے سینے تو زیاں

اچھی بات ہے۔“

ایقان نے زور سے ”سوں“ کیا تھا۔ بصورت دیگر اسے علم ہی نہ ہوا یا تاکہ وہ رو رہی تھی۔

”ہائیں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ اوہ۔۔۔ دیکھو ایقان اب بہت بری بات ہے۔ تم مجھے اتنی دور ہونے کی سزا تو مت دو۔۔۔“
”سزا تو تم مجھے دے رہے ہو عاشق شاید اس محبت کی جو میں تم سے کرتی ہوں۔ آخر تم مردوں کو بیوی کو بیٹے
تسارے میں کیا لطف آتا ہے۔“ وہ سسک کر بولی۔

”ہاں یار! حمزہ تو خیر آتا ہے۔ لیکن آنسوؤں کا سارا لطف تو قرب میں ہے انہیں اپنے ہاتھ سے نہ صاف کر
تسکی نہیں جاتی۔ اس لیے تم ان آنسوؤں کو میرے آنے تک سنبھال کر رکھو۔ فون پر تو بس تم ہنستی ہوئی ان
لگتی ہو۔“

”اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا تم نے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”میں یہاں نہیں تھا یا۔۔۔! کمپنی کے کام سے تاسیوان گیا ہوا تھا۔“

”وہاں فون لا سز نہیں ہیں؟ کوئی گاؤں ہے؟“ وہ پھری ”یا میرا نمبر بھول گئے تھے تم!“ عاشق کو ہنسی آگئی۔

”ایسا کچھ نہیں تھا جانو۔ میں بڑی بہت زیادہ تھا۔ اب معاف بھی کرو۔ ساری کال تو تم نے لڑنے میں

ضائع کر دی ہے۔“

”عاشق! تمہیں میرے جذبات کا بالکل خیال نہیں ہے۔“ اس نے خود پر قابو پایا۔ ”جس طرح کی صورت

حال سے میں گزر رہی ہوں۔ اس میں یوں بولا اور پریشان رہنا کتنا مشکل اور کتنا خطرناک ہے۔ تمہیں اس بات

بھی احساس نہیں ہے ایک کمانے کے چکر میں پڑ کر تم ہر طرح کی فکر سے بے نیاز ہو گئے ہو۔ مرد کا کام صرف

اور صرف کمانا ہی تو نہیں ہے عاشق!“

عاشق کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ ایقان کا لفظ لفظ سچا تھا۔ وہ اپنی سچائی کہاں سے پیش کرتا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ایقان!“ پھر وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ ”میں واقعی اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گیا

ہوں۔ شاید تم پر بے پناہ یقین کا منظر ہے یہ کہ میری ایقان نے سب کچھ بہت احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔

”ہاں۔۔۔ بس ایک اپنا دل ہی نہیں سنبھالتا ہے اس نے۔۔۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ حالات کی کیا پوزیشن ہے؟ ہاشم میاں کے آرمی کتبے کیسے ہو رہے ہیں؟“

”اگلے ہفتے بارہ بجے تک کسی ایسی کی بتا دیوں میں لگے ہوئے ہیں۔“

”میرے بچوں کے کپڑے بہت اچھے ہوئے جائیں گے اور بیوی کے لائسنس۔“

ایقان نے گہری سانس بھرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

”اپنا خیال رکھنا۔ اور بچوں کا بھی سب کو سلام کہنا۔ خدا حافظ۔“

لائسنس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایقان نے بے دلی سے ریسور رکھا۔ الفاظ جیسے اپنے معنی اور اپنا اثر کھوئے

جار ہے تھے۔



نافع اور علی ڈھول کا ایک ایک سائیڈ بری طرح سے پیٹ رہے تھے اور حمزہ کھڑا ڈی ڈال رہا تھا۔ لڑکیوں کی ٹونڈ

رستے میں ہی رک گئی تھی اور اب حیرت اور غصے سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”یہ یہ پھاڑ دیں گے اس ڈھول کو۔“ ثانیہ قدرے خفگی سے بولی۔ ”جنگلیوں کی طرح سے پیٹ رہے

ہیں۔“

”اوس۔ اوس۔ اوس۔“ حمزہ نے اس کی بات سن کر افریقی قبائلیوں کی سی تان لگائی۔ علی اور نافع نے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے محفوظ رکھیں۔

بھی کانگوا سائل اپنا لیا۔ اب حمزہ قبائلیوں کا مخصوص رقص پیش کرنے لگا۔

”بھئی کیا بد تمیزی ہے یہ۔۔۔“ ”وہ بھنا کر آگے بڑھی۔“ ”ہم نے یہاں یہ سارا رنچ منٹ تمہارا یہ جنگلی راز دیکھنے کے لیے نہیں کیا ہے۔ واپس دو ہمارا ڈھول۔ ہمارا بہت اچھا موڈ ہے اس وقت۔ اسے خراب مت پلیر۔“

”ان سب کو درختوں سے باندھ دو۔ اور لاؤ روشن کیا جائے!“ علی نے حیب سے رومال نکال کر ماتھے پر پڑا انداز میں باندھ لیا۔

”یہ ایسے نہیں ماننے والے۔“ ماہین نے حسام کو گود سے اتارا اور آگے بڑھی۔

علی اور حمزہ بڑی بہن کو خطرناک تنقیدوں سے اپنی جانب آتا دیکھ کر بدک کر بھاگے۔ نافع بیٹھا مسکراتا رہا۔ وہ اپنا رشتہ بخوبی پہچانتا تھا۔ ماہین کے بچے مسکرائے۔

”تم کیا سمجھتے ہو؟ بہت لمبا کڑوں کی میں ہمارا ہے؟“

”کرنا تو چاہیے!“ وہ شرارت سے ہنسا۔

ماحول کی خوش گواریت محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک شریر سی نظر لڑکیوں کے درمیان کھڑی عریشہ پر ڈا تھی۔ عریشہ کے گال سرخ ہو گئے۔ اس کے اندر ناگواری کی بہت منہ زور لہر اٹھی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

”ایسے جناب!“ اب ماہین قدرے رسائی سے بولی۔ ”نہیں تو ہم آپ کے جوتے چھپا دیں گے۔“ ایک قہقہہ لگا۔ نافع سچ بچ بہت فخر ہوا تھا۔ کان کھجا تا وہ لڑکیوں کے درمیان سے نکل بھاگا۔

”میلو تان سین کی شاگردوں تان لگاؤ!“ ماہین نے ڈھول بجا لیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اس ساز کو بجانے میں مہارت رکھتی تھی۔

اس نے ایک ہاتھ ڈھول پر مارا اور اگلے ہی پل دکھ سے چلائی۔

”کیا ہوا ہے؟“

لڑکیاں چونک اٹھیں۔ ڈھول کا پروہ چاک ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔



بہت دیر تک وہ فون کے پاس ہی کھڑی رہی تھی پھر اسے دھیان آیا۔ لڑکیوں کا ارادہ تو پچھلے لان میں جمع ہو کر گانے بجانے کا تھا۔ وہ بھی رائے کے ساتھ وہیں جا رہی تھی جب عذرا بیگم نے اسے عاشر کے فون کا بتایا۔

فون کے پاس سے ہٹ کر وہ رافع کے کمرے سے نکل آئی۔ بے دلی اور بے دھیانی کے عالم میں اس نے پہلا میٹھی پر نجانے کس طرح سے قدم رکھا تھا کہ پیراس کا بوجھ نہ سہا رہا۔ ایقان ایک دردناک چیخ کے ساتھ لڑھکتے ہوئے آخری میٹھی پر آگری تھی۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ)

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا، ہاشم کے لیے نیم رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

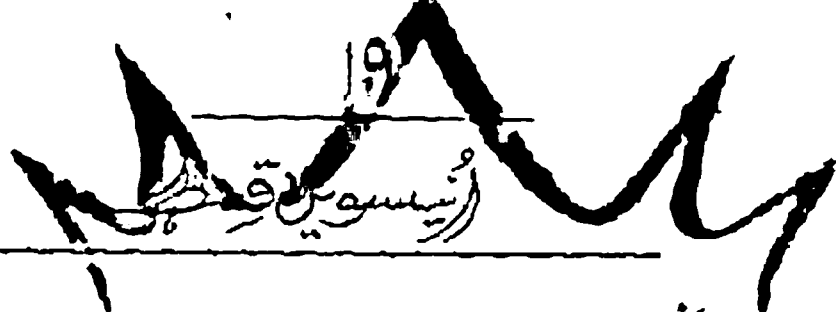
ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گناؤں کے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نکتہ کی دھمکی دیتی ہے۔

انیقہ ابرار جیلانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

پارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے پارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور سند کے ساتھ جا کر شہلا کو منتہی کی انگوٹھی پہناتی ہیں، شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو لینے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا پٹا اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔



19

رُسیسویں قدح

”اٹھو بیٹی۔ یہ ذرا سی پنشن پی لو۔“ شفیقہ حیات نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔

ایقان نے بے دلی اور جبر زاری سے پنشن کا پیالہ دیکھا پھر اس نے نفی کی سر ہلائی۔

”نہیں اماں! بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔“

”من نہیں ہے۔“

”نہ بیٹی! انہوں نے اسے کارا۔ ایسی باتوں سے من نہیں دیکھتے۔“

ایقان نے جلدی اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ گی اپنے پیروں پر۔ شاباش۔

ایقان چند لمحے چھت کو گھورتی رہی۔ دنیا بھر کی بے زاری اور کوفت اسے اپنے اندر بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی سے کلام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ آنکھیں موند کر لیٹے رہنا ہی ہر غم کا علاج محسوس ہوتا تھا۔

شفیقہ حیات اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ ان کے انداز میں محبت بھرا اصرار تھا۔ ایقان کو محبت سے منہ موڑنا دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔ وہ ناچار اٹھ کر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”ایسے جموٹے موٹے حادثات تو عورت کے مقدر کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں بیٹی! ان کو اس طرح دل پر لے لینا اچھا نہیں ہے۔“

انہوں نے موقع غنیمت جان کر اسے سمجھانا چاہا، ورنہ وہ تو پچھلے چار دن سے کسی سے دو لفظ بولنے پر آمادہ نہ تھی۔ کسی بے جان لاش کی طرح دن رات آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی۔

ایقان نے پیالہ لبوں سے ہٹا کر ماں کو ایک نظر دیکھا۔ اس کی نظروں میں افسردگی اور عجیب سا گلہ تھا۔ شاید ان کی بات اس کے دل پر لگی تھی۔ شفیقہ حیات اس کی نگاہوں کی زبان سمجھ گئیں۔

”آٹھ اولادیں ہولی تھیں میری چار بیٹیاں اور چار بیٹیاں۔ ان میں سے صرف چار نے زندگی پائی۔ اللہ تم چاروں

”شہلا کی زندگی میں پھر سے بہار لوٹ آئے اس کے لیے اس کی غلغلہ کو ششوں کا بہت ہاتھ ہے۔ ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر خوشی منانے کو تو میرا دل بھی ہامی نہ بھرتا اور شہلا۔۔۔ وہ کہاں مانتی تین دن بعد نہ سہی دس دن بعد تھی۔“

انیقہ نے نظروں کا زاویہ بدلت کر انہیں دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی۔
”کہتی تو آپ کھیک ہی ہیں۔ ایتقان آپ کی کا بہت ہاتھ ہے یہ رشتہ یوں آسانی سے طے ہو جانے میں اور ان کے بغیر شادی میں بالکل بھی مزہ نہ آتا۔“
”شہلا کہاں ہے؟“ منیڑہ بیگم نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”صبح سے کمرے سے ہی نہیں نکلی۔“

”بیگم! ہوں گی اداس شاعری کی کوئی کتاب کھولے۔ عجیب ہی مخلوق ہیں قسم۔ میری شادی اتنی قریب ہو تو میں صرف شادی کے گانوں کی کتاب برصوں اور اچھے اچھے گانے سلکٹ کروں؟ نہیں تو کوئی دل چسپی ہی نہیں ہے۔ میں نے اتنا اچھا ایشن لا کر دیا تو بولیں۔ مجھے اس کی خوشبو سے سخت المیہ ہے۔ مہندی کے ڈیزائن دکھائے تو بولیں۔ کوئی نئی ہلکا سا ڈیزائن ہو زیادہ تیل بولے نہ ہوں۔ ان کا بس چلے تو سفید رنگ کا ویڈنگ ڈریس پہن کر بیٹھ جائیں۔ شادی والے دن۔ کہہ دیں گی کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ کل تو اس جملے کی رٹ لگائی ہوئی ہے انہوں نے۔“

انیقہ جس طرح رہی تھی۔ منیڑہ بیگم مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے دیکھتی رہیں۔
”ہاں تو دلچسپی ہے۔ کتنی ہی ہیں سفید لباس بھی۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”مجھے تو خود بہت پسند ہے سفید لباس۔“
”ہائیں۔“ انیقہ نے خوب سے ان کی صورت دیکھی۔ ”کمال ہے امی۔ اچھا! آپ نے کون سے رنگ کا لباس پہنا تھا اپنی شادی میں؟“
”سفید۔“
”سفید؟“
”ہائیں۔“
انیقہ حیران ہو کر ان کی صورت دیکھتی رہی۔

اس سے ساتھ ساتھ ہی ہوئے عمر اور مومن کو دیکھا پھر مسکرا دی۔ وہ نما کر و اش روم سے نکلی تھی۔ نیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے وہ کھڑکی تک چلی آئی اور وہ ہٹا کر سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ باہر منظر خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے سرمئی ٹکڑے چل رہے تھے۔ کہیں چھپے ہوئے سورج کی کرنیں ان کے کناروں کو روپوشی بخیل لگا رہی تھیں۔ ہوا میں نامعلوم سی خوشبو تھی۔ شہلا کی خوبصورت سیاہ آنکھیں بادلوں سے پرے دیکھنے کی جستجو کر رہی تھیں۔ پاس رکھے موبائل کی لیمپ بجھ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”سیاہ۔ شہلا۔“ دوسری جانب موڈ خوشگوار تھا۔
شہلا کا سانس لمحہ بھر کے لیے اس کے سینے میں مقید ہوا پھر پھر پھڑپھڑا کر نکلا۔ اس سے کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔
”شہلا! ابرار بات کر رہا ہوں۔“
”یہ۔ یہ نمبر۔“ وہ ہٹائی۔

کو سلامت رکھے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو تم لوگ لیکن جو چار نہ رہے ان کا دکھ آج تک سینے میں محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس زمانے میں نہ تو پیدائشی ٹیکوں کا طریقہ بچاؤ تھا نہ ہی دوسرے جدید علاج نکلے تھے بیماریوں کے۔ بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھا ہے میں نے۔ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے۔ بناؤ بیٹی! ہم بھی جیتے ہیں ہنستے ہیں کلام کرتے ہیں تم لوگوں کی خوشیوں اور تندرستی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تم اس حادثے کو جو روگ بنائے بیٹھی ہو۔ بچے تمہارے ارد گرد پھر پھرا کر مایوس ہو کر کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ ان کا خیال کر انہیں پیار دو۔ تسلی دو۔ عجیب ہونق سے پھرتے ہیں دونوں۔“
ایتقان کو ماں کی باتوں سے یک گونہ تسلی ملی۔ اس کے دل کو قرار سا آیا۔
”کہاں ہے ایمان؟ کس کے ساتھ ہے؟ اور مومن کیا کر رہا ہے؟“ اس نے بے چین سے ہو کر پوچھا تھا۔

شفیقہ حیات مسکرا دیں۔
”ایمان کو دورہ اپنے ساتھ لے گئی ہے اور مومن کو شہلا ساتھ لے گئی تھی صبح جب۔۔۔ اس فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کھانا کھا کر عمر کے ساتھ ہی سو گیا ہے۔“
ایتقان کے لبوں پر بھیجی بھیجی سی مسکراہٹ پور آئی۔ اس نے سختی سے ہالہ سائیڈ ٹیبل دھکا دیا۔
”کیا سوچتی ہوگی شہلا بھی اور بے چارہ ہاشم! کس قدر خوش تھا اپنی بزرگت کے تصور سے۔ میں نے اس۔۔۔ ارا مانوں کو مزید انتظار کی سزا سنائی۔“

”اے لوسہ! اچھی کمی۔“ انہوں نے براہمان کر اسے دیکھا۔ ”بیٹی! لکھے پر کس کا زور؟ جس وقت ملنا لکھ دیا ہے اسی وقت ملیں گے۔ نہ گھڑی بھر آگے نہ گھڑی بھر پیچھے۔ تم سے بھلا کسی کو کیا شکایت ہوگی۔ تم تو خود اس وقت سب کی توجہ اور ہمدردی کے لائق ہو۔ لا حول ولا قوۃ۔ یہ کیا کچھ خرافات سوچتی رہتی ہو تم۔“
برائت چلی جائے گی۔ ہمارے ہاں صد شکر کہ شہ گھڑیوں کا فضول ہے۔ ہوتا ہے۔“
وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسی لمحے عذرا بیگم جوس کا کلاس لے کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ ایتقان کے لبوں پر چاہتے ہوئے بھی اداس سی مسکراہٹ عود گئی۔
”لیجئے! آگلی شفٹ تیار ہے۔“ وہ بولی۔
شفیقہ حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

URDU PHOTO

”بے چاری ایتقان!“ منیڑہ بیگم تاسف سے شہلا کے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”دوسرے قدر خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھی اور ناگہانی حادثہ پیش آگیا۔“
”بس امی جی!“ انیقہ نے گہری سوچ کے اثر سے نکل کر سانس بھری۔ ”میرا دل تو لمحہ بھر کے لیے جیسے کسی مٹھی میں دیوچ لیا تھا۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اچانک ہوا کیا ہے۔ جس تاریخ کا اتنے دن سے شدت سے انتظار تھا وہ تین روز بعد ہے لیکن اب۔۔۔“
”دل برا نہ کرو۔“ منیڑہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”انہوں نے زیادہ دن آگے نہیں بڑھائے۔ صرف ہفتہ بھر کی مہلت مانگی ہے۔ ایتقان صحت یاب ہو جائے، ہنسی خوشی شادی میں شریک ہو تو ہمیں بھی خوشی ہوگی۔“ پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔

42

”ربیعہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا رواں رواں
کھڑا تھا۔ اس کا حلق دھوپ میں پڑے ہوئے گھڑے کی مانند خشک ہو رہا تھا۔ بدن میں ارتعاش تھا اور اسے سردی
لگ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح لیٹی کانتی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھی۔ اپنے سن ہوتے ہاتھوں کو آپس میں مل کر اس نے بدن کے ارتعاش اور سردی کے احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی پھر پیروں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ آہستہ سے چارپائی سے اتر کر اس نے چادر کو اچھی طرح سے اپنے ارد گرد لیٹا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ کچن میں جانا چاہتی تھی؛ جب اس نے منور امین کے کمرے سے آئی ہوئی آوازیں سنیں۔

ربیعہ کو چند لمحوں تک ان ٹھٹھی ٹھٹھی آوازوں کا مفہوم سمجھ نہیں نہ آسکا پھر وہ قدرے تیزی سے ان کے کمرے کی جانب بڑھی۔ اس کے ہی پل وہ دروازے کے ایک طرف پہنچی۔ کمرے کا منظر ناقابل برداشت اور ناقابل یقین تھا۔

تمہاں نے منور امین کو گردن سے پکڑا ہوا تھا اور وہ انہیں جھٹکے دھڑے رہا تھا۔ ربیعہ نے اس کی کواں درجی جھونے کے لیے لبوں پر سختی سے ہاتھ رکھ لیا۔

”تمہیں وہ رقم مجھے دینی پڑے گی۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔ وہی ہیں تمہیں بیان ہے اور وہ بول گا، جان لے لوں گا میں تمہاری۔“

تمدن بہت دلی دلی لیکن نہایت درشت آواز میں بول رہا تھا پھر اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ کھانسنے اور ہانپنے لگے تھے۔ ربیعہ نے خوف زدہ نظروں سے ذرا کی ذرا ابد رجھانکا۔ وہ قسم کر رہ گئی تھی۔ ساٹھ واٹ کے بلب کی زرد سی روشنی میں تمدن کسی دیوانے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں چمکی چمکی ہو رہی تھیں اور سرخ تھیں۔ لبوں سے گویا جھاگ سا نکل رہا تھا۔

”بد بخت۔۔۔ کیسے۔۔۔ نافرمان۔۔۔“ منور امین نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے، میری جان لے کر تو وہ رقبہ پالے گا۔؟ کبھی نہیں مردانہ۔ کبھی نہیں۔۔۔ لے لے تو میری جان۔۔۔ مار دے مجھے۔۔۔ میں دیکھتا ہوں کیا ملے گا تجھے۔۔۔ چڑیا کی بیٹ بھی مل جائے تو کرنا۔۔۔ ناخلف۔۔۔ خاں مجھے گا۔۔۔ کچھ کچھ۔۔۔ کچھ کچھ۔۔۔ برا جسم۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔“

”بھونہ! تمدن نے سر جھکا۔“ تم اپنی فکر کرو بڑھے! جیسے میں جانتا نہیں تمہاری پیار سالی کو۔ تمہاری قبر میں کیا کچھ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

وہ اپنی چھتری ڈسوندے لگا تھا۔

ربیعہ نے خود بر قابو ہونے کی کوشش کی اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ اس کی چیخ بس نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے پیچھے ترانہ گھڑی تھی۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔۔۔! میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ وہ کانپتے ہوئے بول رہی تھی۔ اسے جیسے بخار چڑھنے کو تھا۔ ترانہ نے متاسف نظروں سے اسے دیکھا پھر اس نے اپنی مثال اتار کر اسے پہنا دی۔ وہ دونوں چیمت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چار بجے کا عمل تھا۔ اتنی پر اب پوچھنے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ باد نسیم

رک رک کر چل رہی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نار بیعہ! لیکن تم نہیں مانتیں۔“ ترانہ بولی۔ ”جانتی تھی میں۔۔۔ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ تمہارا نازک دل ان حالات کو برداشت کرنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ مر جاؤ گی تم یہاں۔۔۔ کتنا سمجھایا میں نے تمہیں۔۔۔ لیکن تم نہیں مانتیں۔“

”پلیز نہ پلیز ترانہ!“ وہ ہلکی انداز میں بولی۔ ”میں نے اس وقت جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد میں اگر یہاں رہی تو یا تو مر جاؤں گی یا پھر پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے بھیج دو، کہیں دور بھیج دو۔“

ترانہ اپنے لب کاٹے ہوئے کچھ سوچنے لگی تھی۔

”اس کی بہن کی شادی تھی۔“ پھر وہ بولی۔ ”ہو سکتا ہے وہ کراچی چلا گیا ہو پھر تو کیا کیا ہوں گی میں تمہارے لیے۔ یہ لوگ زبردستی تمہارا نکاح پر حوا دیں گے۔“

ربیعہ کی نظموں میں تمدن کا وحشت ناک چہرہ گھوم گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ ترانہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔
ربیعہ تسکینے لگی تھی۔

”میں روڈ پر بیچ رہی تھی۔ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مت روکو۔“ ترانہ نے اسے تھپکا۔

نے بچوں کی طرح سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اگر آپ یہ نہیں ہوں گے۔ میں جانتی ہوں۔ عباد بھائی مجھے مشکل میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

”تم ٹھیک رہ رہی ہو۔“ ترانہ بولی۔ ”وہ تمہارے لئے بے حد فکر مند تھا، کچھ کرنا چاہتا ہے، تمہارے لیے۔“

”ترانہ لکھ میرے لیے جو بھی بستر سمجھتی ہو وہ کرو۔“ رسیحہ نے گویا ہار مان کر کہا تھا۔ ”مناطے ہے کہ میں تمدن

بھائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے کیا جانتی تھی ترانہ۔ ! کہ وہ اس

“

اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ آنسوؤں سے اس کا گلہا رہندھ گیا تھا۔ ترانہ کسی سوچ میں گم تھی پھر اس نے سر

۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰

”اگر وہ نہیں لایا، میں نے تو تمہیں اس کے ساتھ چلی جاؤ گی۔ ایسا سامان اس طرح سے سیٹھنا کہ کسی کو

رتی برابر بھی شک نہ ہوئے تھے۔ یہ خاص طور پر صوفیوں سے مختار رہا۔ وہ ایک نمبر کی جاسوسی ہے۔“

دستِ مبارک سے دعا ہے کہ اس مضمون کے حامل مسافر کو ایک بری جگہوں پر

7-10-1964


13

”السلام علیکم۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

ایقان نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور کسل مندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس کا

آنہنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی اخلاقی تقاضے نبھانے کی خاطر وہ اٹھ بیٹھی۔

وہ انہوں نے اس کے سامنے پردی کر سیدوں پر آ بیٹھے تھے۔

”یہی ہیں پیچیدہ اب آپ؟“ رافع اس کے پاس پرے ہوئے انگوٹھ رکھنے لگا۔

”تھکیک ہوں۔“ ایقان نے ایک شرمندہ شرمندہ سی نظر ہاتھ میں ڈال۔

وہ بہت ہمدردی اور اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔ ایقان نے آنکھوں میں بھر آنے والے پانی پر قابو پایا اور پلکیں جھمکنے لگیں۔

”وہی ہے جس نے ان کو تیار کیا۔“

”بھئی پیچھو! یہ بہانے نہیں چلنے والے۔“ ہاشم دفعتاً بولا۔ ”آپ نے تو گھر میں دیرانی پھیلا دی۔ انوائی

کھٹواٹی۔ وہ کیا ہوتا ہے یار! وہ لے کر پڑ گئی ہیں۔ انھیں بھی۔ وہ لہا کی پیچھو ہیں خیر۔ کوئی ڈھول تاشے کوئی گانے شانے یا۔۔۔

ایقان چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول بھال کر مسکرانے لگی۔
 ”ہاں پیچھو! وہ کون سا گانا تھا جو آپ سلامی مشین کا ڈبہ بجا کر گایا کرتی تھیں اپنی گڑیا کی شادی میں؟“ رافع ذہن پر زور دینے لگا۔

”میں لکھ لکھ بھیجوں بتا شے میں۔“ ہاشم کو نکلایا دیا گیا۔
 ”اللہ ہٹو بھی۔“ ایقان کو بے حد شرم آئی۔ ”کون کون سی باتیں یاد کر رہے ہو۔ بے وقوف۔“
 ”ہاں ہاں۔ کیا تھا وہ۔ میں لکھ لکھ بھیجوں بوتل میں سیاں آؤ گے کون سے بوتل میں۔“ رافع کو پورا مصرعہ یاد آ گیا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔
 ”پیچھو! یہ گانا تو ضرور سنا ہے آپ سے۔ آخر آپ کی عزیز از جان سہیلی کی شادی ہے۔“ ہاشم خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”ابے راجھے!“ رافع نے اسے چھیڑا۔ ”تو عزیز از جان بھتیجا بھی کہہ سکتا تھا لیکن وہ کیا کہا ہے شاعر نے بات کوئی ہو تیرا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔“
 ہاشم کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے لہجہ بکھرے۔ ایقان اب دل چسپی اور شوق سے ان کی باتیں سنتے ہوئے مسکراتی ہوئی تھی۔

”ہر بات میں پیچھو کی سہیلی کا ذکر نکال لیتا ہے یہ۔“
 ”ارے یار! حکم زباں بندی کی اس قدر طویل سزا بھگتانی ہے اسی کا ردِ عمل ہے یہ۔“ ہاشم نے بات کا اثر کم کرنے کی کوشش کی۔ ”بندر اتنا اسٹاک جمع کیجئے وقتاً فوقتاً بکھارتا ہے۔“
 ایقان چند لمحے محبت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بیکار سا لہجہ بھری تھی۔

”تم بھی سوچتے ہو گے ہاشم! اچھی بھلی طے شدہ تقریب میری وجہ سے۔“
 ”اوسے یار پیچھو! ہمیں کیا بات کا لگا ہے آپ کو؟“ ہاشم نے اسے دیکھا۔
 ”ہم میں سے ہیں۔ آپ ہماری ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔“ ہاشم نے اسے دیکھا۔
 ”آپ ہمارے ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔ آپ ہماری ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔“ ہاشم نے اسے دیکھا۔
 ”آپ ہمارے ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔ آپ ہماری ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔“ ہاشم نے اسے دیکھا۔

”آپ بے فکر رہیں۔“
 ”اور جھٹ پٹ بھلتی چنگی ہو کر ڈھول سنہا لیں۔ وہ گانا ہم نے ضرور ہی سنا ہے۔“ رافع نے مزے سے فرمائش داغی۔

”کوئی نہیں سنا گانا وانا۔“ ایقان نے صاف انکار کیا۔ ”میں ہر گز اتنے پرانے گانے نہیں گاؤں گی۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ یہ اتنی پرانی خاتون ہیں۔“
 ہاشم اور رافع نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔ اس مرتبہ ایقان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔



”تائی امی! اندر آ سکتا ہوں؟“ وہ پر شوق انداز میں اندر جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 ”زیور است کی جانچ پڑتال کرتی ہوئی فردوس بیگم لکھتے ہی بوکھلا اٹھیں۔“

”ہائیں۔ کون۔ نافع۔ ارے اونچے۔ آؤ۔ یوں غیروں کی طرح باہر کھڑے ہو کر پوچھتے ہو کہ ہمیں کس شرم آجاتی ہے۔“

انہوں نے بڑی بڑی ہنسی کی۔ ہیکو کو ڈبے میں واپس ٹھونسنے کی کوشش کی۔ نافع خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اندر چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیک کیا ہوا ڈبہ تھا۔

”یہ کیا اٹھا لائے؟“ انہوں نے جیسے کی گمانی سنبھالتے ہوئے اس کا ہاتھ میں تھاما ہوا ڈبہ بغور دیکھا۔

نافع نے قدرے جھینٹے ہوئے ڈبہ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

”آپ کیا کر رہی ہیں مائی امی!“ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی۔

”ارے نیچے! کیا کہوں تم سے۔ دس ہزار جھنجھٹ چھپے ہوئے ہیں جان کو۔ میری لڑکیاں تو کسی کام کی نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھو۔ کچھ پرانا زبور بھی بری میں رکھنے کا سوچ رہے تھے، اسی کا مینا اور ٹکینے دیکھ رہی تھی۔ مہینے کا کام نہیں کرتی سزا ان جھکیوں اور گلوبند کے ٹکینے چیک کر لے۔ مجال ہے جو یہ سنے کسی کا ہات۔“

وہ قدرے غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار تھیں۔ سو انہوں نے نافع کے سامنے بھی عریضہ کی داری کی ضرورت محسوس نہ کی۔

”لایئے مجھے دیں۔ میں چیک کرتا ہوں۔“ اس نے مخلصانہ پیش کی۔

”اچھا۔ تم کر لو گے۔ ہاں کر تو سکتے ہو؟“ انہوں نے پھر مڑتے ہوئے دیکھ کر تین رنگوں کے ٹکینے ہیں ان جھکیوں میں سزا دیکھو تو پورے ہیں۔“

نافع جھکیوں کو بغور دیکھنے لگا۔

”میں تائی امی سے! پھر وہ بولا۔“ کئی خانے خالی پڑے ہیں۔ نئے ٹکینے لگوانے ہوں گے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے سوچا پھر تم ہی یہ سیٹ سنار کے چولہے کر آؤ۔ اس سے کونا کل پر سب تک تیار کر دے۔ بالمش وغیرہ بھی کر دے۔“ وہ جھکیاں اور گلوبند ڈبے میں رکھنے لگیں۔

”تائی امی! میں ذرا عریضہ سے مل لوں۔“

”ہیں۔؟“ وہ بری طرح جو نکلیں۔ ”عریضہ!“

”تائی امی! آج اس کی سالگرہ ہے نا۔ میں صرف شکرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ گفٹ بھی دے رہا ہوں۔“

صاف گوئی اختیار کی اور منتظر نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

فردوس بیگم کافی جڑبڑ ہوئیں، لیکن اسے منع کرنے کا حوصلہ نہ کر سکیں۔

”اچھا۔! پھر وہ نیم دلی سے گویا ہوئیں۔ ”دے آؤ اسے۔ اپنے کمرے میں ہوگی۔“ نافع جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جلدی آجافسہ میں بیٹھی ہوں۔“ پیچھے سے انہوں نے جتایا تھا۔

”جی جی۔ میں بس ابھی آیا۔“ وہ مڑے بغیر بولا تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ بجا کر اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا۔ پھر اس نے ہلکا سا دباؤ والا تودروانہ کھٹکا چلا گیا۔ نیم اندر سے کمرے میں عریضہ لٹٹی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں پر سی ڈی پلیئر کا ہیڈ فون تھا۔ شاید اسی لیے وہ دستک کی آواز نہ سن سکی تھی۔

نافع چند قدم آگے بڑھا تو عریضہ نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے کھڑے ہوئے نافع کو دیکھ کر وہ چند لمحے کچھ نہ سمجھ پائی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے قدرے غصے سے ہیڈ فون کانوں پر سے کھینچا تھا۔

”ہائیں۔ یہاں!“ اس کے انداز جارحانہ تھے۔

نافع بے چارہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

”دوسرے عریضہ۔ میں۔ میں تمہیں یہ دینے آیا تھا۔“ اس نے جلدی سے وہ گفٹ باکس اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کے ابرو ہنوز چڑھے ہوئے تھے۔

”یہ۔ یہ تمہارے لیے گفٹ ہے۔“ وہ جیسے شرمندگی سے بولا تھا۔

”گفٹ۔؟“

”ہاں۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ اس لیے۔“ نافع کے انداز ایسے تھے جیسے اس سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

عریضہ نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ گویا اسے جانے کا اذن دیا ہو۔

”اچھا۔ پھر۔ میں چلوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

جواباً خاموشی چھائی رہی۔ نافع بے چارگی سے دروازے کی سمت ہولیا۔ پھر وہ جیسے ہی باہر نکلا، اچھل ہی پڑا تھا۔ فردوس بیگم بالکل دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ وہ نافع کو دیکھ کر سٹپٹا کر پڑے ہوئے گویا انہیں اس کے اس قدر جلد بردہ ہونے کی قطعاً توقع نہ تھی۔

”اچھا۔“ وہ تجالت سے غصے۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔! وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ تجالت سے غصے۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔! وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ تجالت سے غصے۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔! وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ تجالت سے غصے۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔! وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ تجالت سے غصے۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔! وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

ہوئے جھنجھلا کر مڑی تھی۔ پھر اگلے ہی پل وہ جیسے پتھر کی ہوئی۔

سامنے مسکراتا ہوا عاشر کھڑا تھا۔

”عاشق! ایتقان کے لب کا ہے۔“

عاشر ایک قدم آگے بڑھا تھا۔ ایتقان کئی قدم وڑ کر اس کے سینے سے جا لگی۔

”عاشق! سارے بند ایک ساتھ ہی ٹوٹے تھے۔ ایتقان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔“

”بس جانو! وہ اسے تھیلنے لگا۔“

ایتقان کا بس نہ چلتا تھا وہ ساری کی ساری آنسوؤں میں بہہ جاتی۔ جانے کہاں کہاں سے کون کون سے گلے شکوے شکایتیں، دکھ، تکلیفیں۔۔۔ آنسوؤں کی زبان میں نکلتے چلے آ رہے تھے۔

”بس ایتقان! بس کرو یا۔۔۔ میں بہہ جاؤں گا۔“

ایتقان نے سر اٹھایا۔

”شرابی آنکھوں کو شہنی کر کے مزید ظلم نہ ڈھاؤ۔“ وہ مسکرایا۔

”بہت برے ہو تم! اس نے ایک مکا اس کے سینے پر مارا تھا۔“ تمہیں بس باتیں بنانا ہی آتا ہے۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”ہٹو پرے۔“ ایتقان نے اسے دھکیلا اور اس کے پیچھے رافع کو کھینچنے لگی۔ پھر اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”اطلاع ہم سے اچھی ہے کیا؟ اس نے اطمینان سے بیڈ پوئیم دراز ہوتے ہوئے ایک پرسکون سانس کھینچی۔“

”میرا ہارٹ فیل ہو جاتا پھرے؟“ وہ بکری۔

”ہارٹ تمہارے پاس ہوتا تو یقیناً اتنا ہی نکما ہوتا۔ وہ تو خیر سے میرے پاس ہے۔“ وہ آنکھوں کو دبا کر تھوکتے ہوئے بولا۔ یقیناً وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔

ایتقان اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”حزوا نہیں قریبی پارک لے گیا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ مجھے اٹھاتا ہوا دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

”تم کیسی ہو؟“ اس نے دلتا اس کا ہاتھ تھا، طبعیت ٹھیک ہے؟“ ایتقان نے سرسبز جھیل اور ہوش کاٹنے لگی۔

”بولو بولو ایتقان!“

”بس عاشق! کچھ مت پوچھو۔“ وہ لرزتی آواز میں بولی تھی۔ ”ورنہ مجھے پھر سے رونا آجائے گا۔“

”ہم شام کو اپنے گھر چلیں گے۔“ وہ قدرے اداسی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے نا؟“

ایتقان نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک دے کر شفیقہ حیات اور عذرا بیگم اندر چلی آئی تھیں۔ دونوں کے چروں پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ عاشر اٹھ کر ان دونوں سے ملنے لگا۔

ایتقان یکدم ہی بہت ہلکی پھلکی اور خوش باش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی چمک آ گئی تھی جو پہلی نظر میں ہی محسوس ہوتی ہے۔

وہ خالی خالی نظروں سے پورے گھر کو دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر ویس نکالا ل رہا تھا۔ ظلم و ستم نے ایک بار پھر ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔

ربیعہ نے درحقیقت اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بچپن سے جوانی تک خونی رشتوں کی ملک سے اپنے پیاروں کے لمس سے محروم رہی تھی۔ سو اس نے ان کو بھی اپنا سمجھنے کی غلطی کی تھی جو اس کے اپنے نہ تھے۔ نتیجتاً اس کے حصے میں صرف خلص اور دکھ ہی آئے تھے۔

ترانہ اسے آفس جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر تلقین کر گئی تھی کہ وہ اپنا سامان وغیرہ خاموشی سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتی رہے۔ اس طرح کہ مینا بیگم یا صولت کو رتی برابر شک نہ ہونے پائے۔ ترانہ آج بینک سے اس کی رقم اور زیور وغیرہ بھی نکلوا کر لانے کا کہہ گئی تھی۔ اس نے ربیعہ کو آج عبادت سے منسلک کرنے کا پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔

ربیعہ کی اپنی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا ارادہ تو کر چکی تھی، لیکن اب اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، کیوں جانا ہے، وہ کیس اور جا کر آخر کیا کرے گی۔

یہ کیفیت میں قطعاً غائب و غای سے چلتے ہوئے وہ منور امین کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بستر پر پڑے اور نگاہیں اس کی آہستہ آہستہ کر جوتے سے اٹھ گئی۔

اس وقت ان کا بستر ان کا لباس اور کمرے کی ہر شے بہ زبان خود ربیعہ کی غیر حاضری کی کہانی سن رہی تھی۔

ربیعہ اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ منور امین نے قدرے نفرت سے اس کی جانب سے دیکھا۔

”تمہارے پاس کچھ خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پھنکارے۔

”نہیں دیکھنے لگی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

قدر گری ہوئی ہے۔ اس سے مجھے یہی امید ہونا چاہیے تھی۔ تمہارا انتخاب کر کے اس نے مجھے حیران نہیں کیا۔

اب کی بار ربیعہ نے سراٹھایا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں اس ظالم شخص کے لیے لمحہ بھر کے لیے شکایت چمکی پھر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”تم بھی۔ تم بھی اپنی ماں والی روایت دہراؤ گی سو کچھ لینا۔ بھاگ جاؤ گی ایک دن کسی کے ساتھ۔“

ربیعہ کے سر پر انہوں نے آسمان لا کر آیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”میری ماں! اس کے لب کا نیچہ۔“

”ہاں ہاں تمہاری ماں!“ وہ نفرت سے پھنکارے۔ ”دو کوڑی کی عورت۔ جسے تمہارا باپ کہیں سے اٹھالایا تھا۔“

ربیعہ کو چکر آنے لگے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”مسلمان نہیں تھی وہ۔ اور اسے مسلمان کیے بغیر ہی تمہارے باپ نے اس سے شادی کر لی تھی۔“

اسی گناہ کی پیدوار ہو تم۔“

ربیعہ کو یوں لگا جیسے ابھی اسے الٹی ہو جائے گی اور اس کی آنتیں منہ کے رستے باہر آ جائیں گی۔

”پھپھا جان۔!“ وہ بمشکل بولی تھی۔ اس کے لیے خاموش ہو جائیں۔“

”ارے سنتی کیوں نہیں ہو اب۔“ وہ سننے کی ہمت پیدا کرو خود میں سے بھاگ کر آئی تھی کہیں سے اور

تمہیں پیدا کر کے پھر بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔“

ربیعہ کے لیے آتی وقت ہلنا بھی محال تھا۔ پھر بھی وہ بہت ہمت کر کے اٹھی اور مردہ قدموں کو گھسیٹی ہوئی

کمرے سے نکل گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں آکر وہ منہ کے بل چارپائی پر اوندھنی گری اور سکیاں بھرنے لگی۔ آج اس کے کانوں نے

اس کی پوری زندگی کی بدترین بات سنی تھی۔ ہمیشہ ہی سے وہ کہنے لگا کہ اس کا باپ کسی متعلق جاننے کے لیے بہت پر شوق

رہا کرتی تھی۔ دادی سے کرید کرید کر باتیں پوچھا کرتی تھی۔ جہاں کہیں اس کے کچھ نقلہ۔ ربیعہ کے کان

کھڑے ہو جایا کرتے۔ لیکن آج جیسے کسی نے وہ بھاری تلواریں اس کا کلا پیر ڈالا تھا۔ ربیعہ سنّت ترین اذیت

کا شکار تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

آج اس نے جانا تھا کہ کیوں دادی جان ہمیشہ ہی اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں رہا کرتی تھیں۔ ربیعہ کے ماں

باپ کا ذکر ان کے لیے تکلیف دہ کیوں تھا؟ وہ اسے اس روحانی تکلیف سے بچانے کی سعی کرتی تھیں جس سے

اسے منور امین نے دوچار کیا تھا۔

آج ربیعہ کو علم ہوا تھا کہ کیوں بیٹا بیگم اور صولت اسے اتنی حقارت بھری نظروں سے دیکھا کرتی ہیں۔ کیوں

ان کے انداز میں ربیعہ کے لیے اس قدر تنفر ہوتا ہے۔

آج جیسے اسے اپنی ہستی کے بے وقعت ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ اسی دوران اس

نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔

اس کے وجود کے ساتھ جو کہانی جڑی ہوئی تھی اس نے ربیعہ کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اس دنیا میں سر

اٹھا کر ایک باعزت زندگی گزار پاتی۔ اور جب اپنی ذات مٹا کر بھلا کر، سر جھکا کر زندگی گزارنا تھی تو اس کے لیے یہ

گھر دنیا میں سب سے موزوں تھا۔



آنکھیں موندے وہ گویا جنت کے کسی باغ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بالوں میں دھیرے دھیرے چلنے والیوں کا دھڑکنا محسوس کرنا پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کبھی آنکھیں نہ کھولے۔

ایقان! "عاشق نے محبت سے اسے پکارا۔

ایقان نے آنکھیں کھول کر عاشق کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ میں تو سمجھا تم سو گئیں۔"

"نجانے کون سی حالت میں ہوں عاشق! یہ نیند ہے نہ بیداری ہے نہ خواب ہے نہ حقیقت نہ کوئی سوچ ہے نہ احساس ہے بس سکون ہے اتنا گہرا اتنا گہنا اتنا خاموش سکون کہ ان چند لمحوں میں پوری زندگی بتا دینے کی جی چاہتا ہے۔"

عاشق نے گہری سانس بھری اور کچھ سوچنے لگا تھا۔ ایقان نے منظور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ متوجہ نہ تھا۔

"کیا سوچنے لگے اب؟ کہیں وہ سوئی ہو کر تو نہیں یاد آنے لگی؟" اس نے جل کر پوچھا تھا۔

عاشق نے ساختہ ہی ہنس دیا۔

"کمال کرتی ہو یا! اس قدر خاتون پن۔ میری وہ چلی شرارتیں سی ایقان کہاں ہے؟" اس نے کچھ کڑوا کر کہا تھا۔

"تمہاری جدائی کے غم میں گھل گھل کر ختم ہو گئی ہو عاری! ایقان نے آہستہ سے کہا۔

"خاتون نما" کتنی ہے۔ اسی سے کام چلاؤ۔"

"کام تو خیر ہم اپنی اخیر عمر تک چلائیں گے۔" وہ مزے سے بولا۔ "لیکن کام میں دل تو لگے۔"

"کیا مطلب؟" وہ بڑی۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں جانو۔ کہ "موتی نوکری" اور "موتی چیمبر" سے اپنے بندے کا دھیان جھٹکنا موتی خاتون کو کافی جتن کرنے پڑتے ہیں۔ تم جانتی ہو تمہارا بندہ جس پرستِ باغ ہو ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔"

وہ اسے چڑانے کے موڈ میں لگتا تھا۔ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی اور کڑے تیوروں سے اسے گھورنے لگی۔

"اب یہی دیکھ لو۔" وہ فوراً بولا۔ "شادی سے پہلے تم نے کبھی مجھے اتنی بری شکل بنا کر نہیں گھورا۔ اور اب تمہیں پرواہی نہیں ہے کہ ایسے گھورتے ہوئے تم کتنی بری لگتی ہو۔"

"میں اب تمہیں بری بھی لگنے لگی ہوں۔" وہ روٹی صورت پر لگتی تھی۔

"میں تو صرف گھورتے وقت کی بات کر رہا ہوں۔" وہ چکارنے والے انداز میں بولا۔

"تم کچھ بدل گئے ہو عاشق! وہ مشکوک ہوئی۔ "پہلے تو میں تمہیں کسی صورت بری نہیں لگتی تھی۔"

"ارے جانم! وہ ہنس پڑا۔ "مذاق بھی نہیں سمجھتیں تم۔ مجھے تم بری لگتیں تو یوں کھنچا چلا آتا۔ میرے لیے تو تم متناطیس ہو۔ اور میں آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر یقین سے مسکرا دی۔"

ایقان چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر یقین سے مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"آداب عرض! وہ اپنے مخصوص، مطمئن و شاداب انداز میں بولا تھا۔ "مزاج بخیر ہیں!" شہلا دھیمے سے مسکرا دی۔ فون اتفاق سے اسی نے اٹھایا تھا۔

"جی!" وہ آہستہ سے بولی "اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا ہے۔ خیریت سے ہیں!"

☆ ☆ ☆

"آداب عرض! وہ اپنے مخصوص، مطمئن و شاداب انداز میں بولا تھا۔ "مزاج بخیر ہیں!" شہلا دھیمے سے مسکرا دی۔ فون اتفاق سے اسی نے اٹھایا تھا۔

"جی!" وہ آہستہ سے بولی "اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا ہے۔ خیریت سے ہیں!"

"بس جناب۔ گھٹنے پر لگے ہوئے ہیں۔ دن ہوں کہ پل ہو۔ کزرتا مشکل!" شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

"ایقان کیسی ہے اب!" اسے خیال آیا۔

"فرسٹ کلاس۔ اپنے میاں جی کے ساتھ ہنسی مسکراتی پھر رہی تھیں یہاں سے وہاں سے۔" وہ بشاش انداز میں بولا۔

"عاشق صاحب آگئے ہیں!" شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پیچھو کے بارے میں سنا تو فوری چھٹی کی درخواست منظور کروا کر دو ماہ کے لیے آئے ہیں۔" ہاشم نے اسے اطلاع دی۔

"دہلیس یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ایقان تو بہت خوش ہوگی۔"

"کیا خبر!" اس نے گہری سانس بھری۔ "آپ زیادہ بہتر بتا سکتی ہیں۔ سیاں جی کی آمد پر کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟"

شہلا کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب آپ بنا میں مت۔!" وہ دھیمے سے بولی۔ "ان باتوں کا تو اچھا بھلا تجربہ ہے آپ کو۔"

"آپ کو اگر اندازہ ہے تو میرے لیے تو یہ احساس بھی بہت ہے۔ کم از کم ہمارے متعلق کچھ سوچتی تو ہیں آپ۔"

"ہاشم نے شوخ ہونے کی جسارت کی۔ "ورنہ یہ بے چارہ دل تو عجب خدشات کا شکار رہتا ہے۔"

شہلا کا دل جیب انداز میں دھڑکا۔

"خدشات۔!" وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔ "کیسے خدشات۔!"

"سنا جانے دیجئے۔" وہ مسکرایا۔ "آپ برا نہ مان جائیں۔"

"میں نہیں۔" وہ بولی۔ "آپ کہہ دیجئے جو بھی آپ کے دل میں ہے۔ ہاشم صاحب! میں بعد کی بدگمانیوں سے بچنے کی خاطر زیادہ سوچتی ہوں۔"

"آپ تو اس قدر گھبرا گئیں۔ چلیے یہ بھی اچھا لگا مجھے۔ یعنی ناچیز کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟" وہ بولی۔ "تو صرف اس خدشے کا اظہار کر رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری پیہم خواہش وصال ہے۔" وہ بولی۔ "میرا دل بار بار فون کرتا ہے۔ ناگوار تو نہیں گزرتا آپ کو؟"

"دکھتی مشعل! میں گرتی ہوں ہاشم آپ؟"

"بعد میں بتائیں گے آپ کو ایسی باتوں کا مطلب۔ ایک شاعر خیر سے یار غار ہے۔"

شہلا کے لیے تو "بعد میں" ہی کافی تھا۔ وہ جھینپ گئی۔

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ میمونہ خورشید علی کی بڑی بہن قضائے الہی سے وفات پا گئیں۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون ○

ادارہ خواتین ڈائجسٹ، میمونہ خورشید علی کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔

میمونہ خورشید اور دیگر ہمدرد گان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

۱۰۱۔ نی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گھٹاؤ نے
 ۱۰۲۔ اس پر رانہ صولت کو پھینک دیتی ہے اور اسے ستین نکاح کی دھمکی دیتی ہے۔
 ۱۰۳۔ رانہ کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے
 ۱۰۴۔ اسے نہیں سمجھتے گا۔

۱۰۵۔ میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عبادت سے ہوتی ہے۔ تمدن پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس
 ۱۰۶۔ کے سامنے پر پابندی لگا دیتا ہے۔
 ۱۰۷۔ سیکر اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو سنگنی کی انگوٹھی پسنا تی ہیں 'شہلا' ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ
 ۱۰۸۔ 'بد مکر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

۱۰۹۔ رانہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
 ۱۱۰۔ اس پر فلم کا پٹا اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔
 ۱۱۱۔ رانہ سے التجا کرتی ہے کہ وہ کسی طرح اسے عباد بھائی تک پہنچا دے۔ ترانہ تمام پروگرام ترتیب دے لیتی ہے۔
 ۱۱۲۔ 'ریشہ کو اس کی سالگرہ پر تحفہ دیتا ہے۔ عرشہ بے حد بے اعتنائی سے پیش آتی ہے۔ ناز کو اس کے رقصے پر افسوس

۱۱۳۔ مائٹری کا چاک پاکستان آمد پور ہے۔ خاتون کو مسرور کر دیتی ہے۔ امام ایقان اس کے رقصے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی
 ۱۱۴۔ زور امین کی تنقیدیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ لیکن ترانہ اس کی انگوٹھی نہیں سنتی۔ جس پر
 ۱۱۵۔ یہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

۱۱۶۔ **UrduPhoto.com**

بیسویں قسط

ربیعہ بے اختیار ہی گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نے اپنے نظروں کی نظروں میں پر سکون رہنے کے لیے کہا
 ۱۱۷۔ ہر وہ دونوں تمدن کا چہرہ دیکھنے لگیں جو کمر پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ چونک کر
 ۱۱۸۔ ان کی جانب متوجہ ہوا اور ایک گہری نگاہ ربیعہ پر ڈالتے ہوئے ترانہ سے مخاطب ہوا۔
 ۱۱۹۔ "ترانہ! اسے تیار کر دو۔"

ربیعہ اور ترانہ ایک مرتبہ پھر چونک اٹھی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ۱۲۰۔ "تیار کر دوں؟" پھر ترانہ اچھی سے بولی۔ "یہ کہاں جا رہی ہے؟"
 ۱۲۱۔ تمدن ایسے ہنساجیسے ترانہ نے کوئی بہت بڑا مذاق جبات کی ہو۔
 ۱۲۲۔ "کہیں جا نہیں رہی ہمیشہ کے لیے اس گھر کی ہونے جا رہی ہے۔ میرا ایک دوست نکاح خواں اور گواہوں کو
 ۱۲۳۔ لے کر پہنچ رہا ہے۔ اسی وقت میرا اور ربیعہ کا نکاح ہو گا۔"

اس نے پھر ایک گہری نظر ربیعہ پہ ڈالی جس کا چہرہ یکدم شعلے کی زد میں آئے ہوئے پھول کی مانند کھلا گیا۔ ربیعہ
 ۱۲۴۔ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کا سہارا لے لیا اور نہ شاید وہ گری جاتی۔ ترانہ کے چہرے پر از حد فکر مندی اور
 ۱۲۵۔ انھوں میں بے حد گہری سوچ کے سائے ابھرے تھے۔ وہ ایک ننگ تمدن کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”تم دونوں کو سانپ کیوں سوگنوا گیا؟“ تمدن قدرے غریبا۔ ”میں نے وہی کچھ کہا ہے جو طے شدہ ہے۔ کہ ان بات تو نہیں کی۔“

دوسرے کمرے سے نکل کر یہ تاجیک اور صولت بھی چلی آئیں۔
 ”کیا بات ہے تمدن؟“ مینا تیکم نے فدا حلال میں تازہ سادہ کمرہ باری سب کو دیکھا۔
 ”کچھ نہیں پوچھو! تمپ نے شاید ان لوگوں کو بتایا نہیں کہ صبح میں تمپ سے کیا کہہ کر کیا تھا۔“ تمدن وہیں پڑی کر سی پٹیتے ہوئے بولا۔

”میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ میں چاہتی تھی انہیں یہ خوش خبری اچانک ہی دی جائے۔“
 ”کیا۔۔۔ کون سی خوش خبری۔ کیا ہو رہا ہے؟“ صولت نے نئے والے انداز میں پوچھنے لگی۔
 ”شاید مینا تیکم نے صبح سے یہ خبر اس لیے پوشیدہ رکھی تھی۔ انہیں اپنی ہی بیٹی کے رد عمل کا خوف تھا۔“
 ”کچھ نہیں صولت! تم خاموش رہو۔“ مینا تیکم نے اسے ہنر کا۔ ”بچیاں ایسے معاملات میں بالکل ہوشیار ہوتی ہیں۔“

”خدا کے لیے امی۔“ وہ ہنسی۔ ”اپنے یہ سوسل پرانے اصول اپنے باپ کی سنبھال کر رکھیں۔ مجھے بتائیں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے لگتا ہے تمدن ہماری اکیلے ہی اپنی برات کا انتظام کر رہے ہیں۔ میرے اور تصور کے معاملے کی برکت نہ کسی کو فکر ہے نہ پردہ اور کیوں کسی کو پروا ہو؟“
 ”جسب اپنا رنگ تم رہا ہو تو دوسروں کی زندگی کے جھکے پن کی فکر کیوں ہو کسی کو؟“
 ”صورت!“ تمدن نے آغا۔ ”بے ہوشم رنگ۔ دفع ہو جا سکتا ہے۔“
 ”جسب اپنا رنگ تم رہا ہو تو دوسروں کی زندگی کے جھکے پن کی فکر کیوں ہو کسی کو؟“
 ”صورت!“ تمدن نے آغا۔ ”بے ہوشم رنگ۔ دفع ہو جا سکتا ہے۔“

وہ جارحانہ طور پر آغا۔ صولت اس کی مینا تیکم کے چہرے پر غور کر رہی تھی۔
 ”تمپ نے انہیں ہنگام میں ڈال دیا۔“
 ”نہیک ہے تمدن۔ وہ تو ہے ہی۔“
 ”اس موقع پر یوں چیخا جانا کیا اچھا لگ رہا ہے؟“
 ”نہیک ہے تمدن۔ وہ تو ہے ہی۔“

”تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟“ مینا تیکم نے ریجہ کو بری طرح سے گھورا تھا۔
 ”جسب کے سامنے تصویر بنی کھڑی ہو۔“
 ”جسب کے سامنے تصویر بنی کھڑی ہو۔“

ریجہ کا زور جسم زور سے کانپا۔ اس نے تھوک ٹپکا اور آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ترانہ نے جلدی سے اسے سنبھالا۔

”سے تیار کرو۔“ مولوی آگاہی ہو گا۔ ”مینا تیکم نے حد تک ہی سے کہا۔
 ترانہ ریجہ کو ساتھ لگے کمرے میں چلی آئی۔ ریجہ سوکے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت اس جگہ کے کسی بھی شخص کی فکروں کے سامنے تعاقب چھری کو دھار دے رہا ہو۔ ترانہ نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھکا پھر کمرے میں موجود صولت کو دیکھا جو تنے میں سر۔ دیکھو حواں و حار دور رہی تھی۔
 ”صولت! ترانہ رمانیت سے بولی۔“
 ”صولت! ترانہ رمانیت سے بولی۔“
 ”صولت! ترانہ رمانیت سے بولی۔“

”الہا کر دعا دی۔“ میں اس چیل کو کیا کہہ رہی ہوں؟ تم شوق سے اسے جتنا مرضی سناؤ۔
 ”میں لگنے والی ہوں۔“

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔
 ”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

”لی ہراس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہیہ کو دیکھا۔
 ”جسب کے کمرے تبدیل کر دئے ہیں۔“ ترانہ پھر عازمی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ باندھے والے عوارے پر نکل کر رہی تھی۔

ایک اندھی سیاح سرنگ میں داخل ہونے جاری ہوں جس کے دوسری جانب کیا ہے۔ کچھ بتائیں۔"

"حوصلہ رکھو۔ یہ اندھی سیاح میرے ہیہ ہیں۔"

"تمہارے یقین کے سارے ہی اکتا ہوا قدم اٹھاپائی ہوں میں۔" وہ ایسی سے بولی۔ "وہ میرے اندر تو نہیں ہے۔ نہ امید نہ یقین نہ حوصلہ۔ میں۔ میں خود کو بہت ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ ترانہ۔ زرا سی نہیں سے بکھر چاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے کہ تمہیں کوئی نہیں لگے۔ میری ساری باتیں صرف تمہارے لیے ہیں۔ تم مجھ سے باری کے موبائل پر رابطہ رکھنا۔"

"تم۔ تم اب کھر جا کر سب سے کیا کہو گی ترانہ؟" وہ یہ کہہ کر پھر اندیشوں نے آکھیرا۔

"کچھ بھی۔ تم میری فکر مت کرو۔" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں خطرناک پوشیدہ تھا۔ وہ یہ کہہ کر پھر کچھ ہونے لگا۔

"یہ۔ عباد کیوں نہیں آیا اب تک؟" ترانہ نے پریشانی سے اوپر اٹھ کر کہا۔ "عباد باری کا بھی کچھ بتائیں۔ کئی دن گئے ہیں یہ دونوں؟"

منیزہ بیگم انھیں قریب چلی آئیں۔ وہ ریور تھا۔ کم سے کم کچھ سوچ رہی تھی۔

"کیا بات ہے انھیں؟ کس کا ہوا تھا؟"

انھیں نے چونک کر ان کی سمت دیکھا پھر گری سانس دیا۔

"عباد کا۔" منیزہ بیگم مسکرا دیں۔ "گیا کہ رہا تھا؟"

"کہہ رہے تھے کہ۔" انھیں نے ایک مرتبہ پھر الجھ کر کہا۔

"وہ اسے کھر آ رہی ہے۔"

منیزہ بیگم بے اختیار ہی ایک قدم پیچھے ہٹی تھیں۔

"لڑکی آ رہی ہے۔ عباد کے ساتھ۔؟ کون ہے وہ لڑکی؟"

"یہ وہ انہوں نے نہیں بتایا۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔" انھیں ہونٹ کاٹتے ہوئے تھیں۔

"یا اللہ خیر۔" منیزہ بیگم نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ "یہ کیا جڑا ہے۔ کیوں آ رہی ہے وہ لڑکی۔ تم نے پوچھا تو ہوتا۔"

"میں کیا پوچھتی ہی ہوں نے بتایا تا۔ وہ بہت غلط میں تھے۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ ای کو تار میں لٹا دیا۔"

"نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایک لڑکی بھی آ رہی ہے۔ اس کے لیے بند ہو۔ یہ تو تار کو اڑیں۔"

"انھیں مجھے تو بہت فکر و رہی ہے۔" منیزہ بیگم پریشانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"مجھے تو صرف یہ خیالی ستارہ ہے کہ برسوں آگئی کی سندی اور اس سے اگلے دن رات ہے۔ پتا نہیں یہ عباد بھائی کو ایسے موقع پر کیا سوچا۔" وہ پیشانی مسلتے لگی۔

منیزہ بیگم اب بے حد تشویش کا شکار تھیں۔

کراچی جانے والی ٹرین کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ تب ہی دور سے عباد اور باری تیزی سے آتے ہوئے نظر آئے۔ ترانہ کی جگہ میں جان آئی۔

"کہاں رہ گئے تھے یہ لوگ۔ میں تو زوری مٹی تھی۔"

وہ ایسی تھیں۔ "عباد مسکرا کر پیچھے ہٹنے لگا۔

طرس برتاؤ میں اور آنسوؤں کا ریا دار کھٹکے لیے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"ہاں! یاد دقت نہیں ہے۔ یہ۔" عباد اس کی کیفیت بھانپ کر نکلیں دیکھنے لگا۔ "ٹرین دوسرے آ رہی ہے۔ جلدی چلیں۔"

"ان سے لپٹ کر رو دی۔ ترانہ بھی رہا سا حوصلہ بار بیٹھی۔ دونوں زار و قطار رونے لگی تھیں۔

"اور باری اس۔ رقت آمیز منکر سے متاثر ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔

۱۱۰

۱۱۱

۱۱۲

۱۱۳

۱۱۴

۱۱۵

۱۱۶

۱۱۷

۱۱۸

۱۱۹

۱۲۰

۱۲۱

۱۲۲

۱۲۳

۱۲۴

۱۲۵

۱۲۶

۱۲۷

۱۲۸

۱۲۹

۱۳۰

۱۳۱

۱۳۲

۱۳۳

۱۳۴

۱۳۵

۱۳۶

۱۳۷

۱۳۸

۱۳۹

۱۴۰

۱۴۱

۱۴۲

۱۴۳

۱۴۴

۱۴۵

۱۴۶

۱۴۷

۱۴۸

۱۴۹

۱۵۰

۱۵۱

۱۵۲

۱۵۳

۱۵۴

۱۵۵

۱۵۶

۱۵۷

۱۵۸

۱۵۹

۱۶۰

۱۶۱

۱۶۲

۱۶۳

۱۶۴

۱۶۵

۱۶۶

۱۶۷

۱۶۸

۱۶۹

۱۷۰

۱۷۱

۱۷۲

۱۷۳

۱۷۴

۱۷۵

۱۷۶

۱۷۷

۱۷۸

۱۷۹

۱۸۰

۱۸۱

۱۸۲

۱۸۳

۱۸۴

۱۸۵

۱۸۶

۱۸۷

۱۸۸

۱۸۹

۱۹۰

۱۹۱

۱۹۲

۱۹۳

۱۹۴

۱۹۵

۱۹۶

۱۹۷

۱۹۸

۱۹۹

۲۰۰

"ماشرا! وہ نرم آواز کچھ بولی۔

ماشرا چونک اٹھا۔ اس نے اچھٹا کر دیکھا اور مسکرا کر پھر ایک ٹپک میں سے مسکرت نکال کر ساگانے لگا۔

"کہو۔" انکی دیر بعد وہ بولا تھا۔ "کیا کچھ بتائیں؟"

"یہ تم کئی سوچوں میں گم رہنے لگے ہو۔" وہ لڑکھائی میں بولی۔ "جب سے تم آئے ہو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم بدل گئے ہو۔"

"آج تو رہا۔" اس نے اچھٹا کر دیکھا۔

"اس نے حواس کر کے اسے خود سے قریب کر لیا تھا پھر ایک کش لگا کر اسے ہٹا دیا۔

"آؤ۔ آؤ۔ یہ مسکرت کیوں اس قدر پیچھے لگے ہو تم۔" ایجن بھائی۔ "جب کچھ۔ پھر شکر کی طرح ہوں۔ بھول کر رہتے ہو۔ کس بات کا پریشاں ہے؟"

ماشرا نے بے اختیار ہی ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا۔

"نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جس۔ اب خوش ہے؟" ایجن بھائی داؤسے۔ یہ تم مٹی کی بانڈی کی طرح چپکے چپکے کیوں بکے جاتی ہو؟

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

"نہیں۔ اب بھائی۔" وہ بول رہی تھی۔

کا احساس ہو گیا۔
 ”چلو دینچ چلیں۔ بونے فونز کرتے ہیں۔“ وہ لمانت سے بولا۔
 ایقان نے پلوں پر چسکتی نمی کو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیا تھا۔



شور مچاتی ٹرین تیزی سے منزل کی جانب محو سفر تھی۔ عباد نے ایک نگاہ ریجہ کے سستے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر مسکرا دیا۔ وہ حد درجہ پریشان نظر آ رہی تھی۔
 ”ریجہ۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

ریجہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ٹیک ایزی۔ تم بہت زیادہ گھبرا رہی ہو۔ ریلیکس۔“

”عباد بھائی۔ ہمہ۔ ہم کہاں جا رہے گے؟“ وہ کچھ سوچ کر گویا ہوئی تھی۔

”کہاں جا رہے گے؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ارے بھی ہم اپنے گھر جائیں گے“

وہاں میری امی ہیں۔ میری دو بہنیں ہیں۔ ایک پیارا سا کیوٹ سا بھانجا ہے۔“

ریجہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

”کیا سوچ رہی؟“ عباد کو اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ تھا۔

”عباد بھائی۔ میں یہ نہیں سمجھتی کہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”کسی کا بھی نہیں“ آپ

اپنے گھر جانے سے پہلے مجھے کسی ہاسٹل میں۔“

آواز رندھ جانے پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ پھر کچھ دیر اسے غور پر غور ہانپنے میں لگی تھی۔

”میرے ہیں میرے۔“ عباد نے اسے دیکھا۔ ”میرے ہیں میرے۔“

”ریجہ۔“ عباد تاسف سے بولا۔ ”نہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اپنا گھر ہوتے ہوئے میں تمہیں ہاسٹل میں

چھوڑ دلا گا؟ شاید تمہیں تنگ مجھ پر بھروسہ نہیں کیا میں۔“

”عباد بھائی!“ ریجہ روتی ہوئی تھی۔ ”خدا کے لیے ایسا تو مت کہیں۔ میں نے اس کی دنیا میں محبت صرف چند ایک

لوگوں سے پائی ہے اور آپ ان لوگوں میں شامل ہیں۔“

”پھر تم نے ایسا کیوں کہا؟“

”اس لیے عباد بھائی کہ میں۔ میں لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ میں کون ہوں، کہاں سے

آئی ہوں، میرے ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار، سب کون ہیں، کہاں ہیں۔ میں۔ میں کسی بھی سوال کا جواب

نہیں دے سکتی، نہیں دے سکتی۔“ اس نے سر جھکا کر ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

عباد چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

”کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا ریجہ۔! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تمہارا حوالہ صرف اتنا ہو گا کہ تم میرے ایک

بہت اچھے دوست کی بہن ہو۔“

”یہ کافی نہیں ہے عباد بھائی۔ انسان کے لیے رشتوں کا حوالہ ضروری ہے۔ خصوصاً لڑکی کے لیے۔“ وہ

ما یوسی سے بولی۔

”انسانیت کا رشتہ ہر رشتے سے بڑا ہے ریجہ۔! محبت، خلوص، رواداری۔ یہ سب انسانیت کے رشتے سے

آتی خوشبو کے نام ہیں۔۔ اور۔ میرے گھر کے افراد میں تمہیں یہ خوشبو ملے گی۔ میری بات کا یقین کرو۔“

”عباد بھائی! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کسی مشکل کا شکار ہوں۔ میرا آپ کے ساتھ آپ کے گھر

جانا سستے دوسروں کو جنہوں سے ملتا ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

"میں سمجھ رہا ہوں ریڈ۔ لیکن پھر بھی میں تمہیں اس بے مروت دنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ انسان کے لیے ذکر رشتوں کا حوالہ ضروری ہے تو پھر یہ حوالہ تمہے ہر جگہ طلب کیا جائے گا۔ اور اگر تم اپنے رشتوں کو اپنا حوالہ بنا نہیں چاہتیں تو نئے رشتے بناؤ ریڈ۔ محبت اور خلوص تم باب سہی لیکن نایاب نہیں۔"

"میرا بھائی اکیلا کموں کی تپ کے گھروالوں سے نکلیا تاسکوں کی نہیں اپنے بارے میں۔؟"

"میں نے کہا تم میرے ایک انحصار دست کی بہن ہو۔ جو چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر تمہاری ذمہ داری میرے سپرد کر کے باہر گیا کیا ہے۔ اور تم اس سے آگے تمہے کوئی کچھ بھی نہیں پوچھتے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اپنے گھروالوں کو میں خود سمجھا دوں گا۔ ویسے بھی میری ماں میری بہنیں بہت اچھی ہیں۔ تم ان سے مل کر تو دیکھو۔"

"یقیناً ہوں گی ان سے ملنے بغیر بھی میں جانتی ہوں۔" یہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔

اس کے دل کو جیسے قرار سا گیا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر اپنا سر سیٹ سے ٹکایا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

ہاتھ ملے اپنے سامنے جے ہوئے زورات پر ایک ایسے ہی گھبراہٹ والی آواز۔ سبزمین نے کاؤنٹر پر مختلف ذرائع کے زورات کا انبار لگا دیا تھا۔ لیکن ہاتھ کی بے چین منتظر آواز کو کوئی بھی چیز مطمئن نہ کر پاتی تھی۔ رات کے ٹھنڈی راتیں بھرتے ہوئے پتیلی کا گھونٹ بھرا۔

"یہ میں نے گولڈ ڈرنک کا نہیں مگر کا گھونٹ بھرا ہے میں۔" یہ آواز تو تیرے ہی گھبراہٹ والی آواز کی تھی۔ ربا جے دیکھنے چالیس منٹ ہو چکے ہیں میں قدم رنجہ فرائض میں۔ لیکن اسے سرگرمی محسوس کر رہا ہوں۔ میں بے چارہ مل جا رہی ہوں زیادہ خزانہ اٹھالیا ہے اپنے آہنی سیٹ سے اور تو ہے کہ۔"

ہاتھ ملے اسے گھورا۔

"جب ایسا دلہن کے لیے زندگی کا پہلا متحدہ دھوڑنے ٹپکے تو میری آواز کو فیت کو یاد کرنا۔ پھر تجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں لٹلٹی کی تھی۔"

"آپ بھائی کوئی بھی چیز اٹھالے اس جیسے۔ یہ انکو بھی یاد ہو سکتا ہے۔ یہ گلوں کی جگہ نہیں۔"

"یہ اتنا بھاری گھونٹ مت دکھائی میں دے دوں؟" ہاتھ چڑ گیا۔ "یار شاعر! آج تیرے ہاؤس کے آگے کھڑا ہوں۔"

جاسوے ہیں؟

"میں خود بخود دن سے نہیں سویا۔" اس نے حتمی لہجہ "شادی تیری ہے" خوار میری۔

"دوستوں کے لیے خوار میمن معلوم ہے۔" ہاتھ اس کی حالت سے بے نیاز شوٹیں میں آکا بھاگی کرنے لگا۔ پھر ایک اس کی نظروں میں چمک سی آئی۔

"یار راتیں۔" اس لاکٹ پر پہلے لگاؤ نہیں بڑی ذرا دکھنا۔

میلز میں دل کی شکل کا انعام سا لاکٹ بیل کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہاتھ نے شوق سے لاکٹ اٹھا کر دیکھا۔

"یہ بیٹی مل۔" چھوڑ دیا۔ "میں تمہیں بے نیچے بھی چاہیے۔"

"سو نے کابل میرے کے سر کو!" رات نے جھوکر کے پھر ایک عمل کیا۔ "ویری گڈ۔"

"دل تو ہمارا سونے کا ہی ہے۔" ہاتھ نے دانت نکالے۔ "اور ان کی محبت اس میں میرے کی مانند دک رہی"

"ہمارا ہاتھ ملک کیا جذبات کے اظہار کا۔"

"بھئی بھئی میری لڑکی چاہتا ہے کاش میں ڈاکٹر شہلا ہوتا۔"

... اور تو تمہارا کیا۔ پھر جگہ کا احساس کر کے یکدم جھینپ گیا۔

نہ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے گھڑی کی جانب دیکھ کر واش دوم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی۔

نہ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے ایتان کی باتیں یاد تھیں۔ بجائے کیا تبدیلی آگئی تھی اس کے

نہ اس نے خود سمجھ نہیں پایا تھا لیکن ایتان کی چھٹی جس سے آخر کو ان ہی بہت محسوس کی گئی۔ یہ وہ سمجھنے

تھوڑا اس کے موبائل کی تپ کی تو یہ بری طرح سے چونکا۔ موبائل پر دو ٹوننگ آ رہی تھی جو اس نے

جھپٹا کر مخصوص نمبر کے لیے پیٹ کی ہوئی تھی۔

اس نے دو ٹوننگ کی گربا تھا "اور دو مہم سروں میں ایتان کی گٹنا ٹیٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ناشر نے جلدی

نہ مل رہی تھی۔

"آپ ڈارلنگ۔" دوسری جانب یہ آواز بھی گئی تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا لڑاکا۔"

"کہ فون نہ کروں۔" نا اطمینان سے اس بات کاٹ کر بولی۔ "لیکن کیا کروں تاثر! میرا دلخ تمہارا تا بعد از

نہ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"ڈونٹ ڈری ڈارلنگ۔ میں تو صرف تمہیں چھوڑنا چاہ رہی تھی۔ ہاتھ کے مطابق رات کے بارہ بج

رہے ہیں تا میں تو چپک کر رہی تھی کہ تمہیں کیا ضرر ہے ہو؟" وہ شرارت سے ہنسی۔

"شباب لڑا۔" وہ غرا۔

"اور کے ڈارلنگ۔ تمہیں اب آرام سے سو پاؤں گی۔ بانی داد سے کہنا ہے؟" واش دوم سے پانی

گرنے کی آواز آئی۔

"اس نے موبائل آف کر دیا۔ واش دوم سے فلفی ایتان نے مسکرا کر اسے دکھا۔

"کے ڈانٹ رہے ہو؟"

"کیا۔؟" وہ گڑبگڑا۔

"کس سے کہہ رہے ہو کہ اب فون مت کرنا؟" یہ ٹیلی فون بوتل سے رگڑتی اس کے متقل آئی تھی۔

"آپ نے ایک دوست سے۔"

"کیا کیا ہے بے چارے نے؟" ایتان نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔

ناشر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایتان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے خود سے

تھپ کر لیا۔

"میرے اس قیمتی ہفت میں مداخلت کی اس نے جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔"

اور پتھان نے برا سامنا نہ کرنا اپنی ہاک پر لٹاؤ لیک رکھ لیا۔
 وہ سکرٹ کی نو آری ہے جب کہ ہے پھر سکرٹ کی ہے؟
 وہ ہندواری زلفوں کی خوشبو میں ابھی تب کچھ کم ہو جائے گا۔ "عاشق نے توبہ لے کر دوڑا چھٹل دیا۔



پہلوں کی گڑ گڑا ہٹ، کی آواز نہ ہم ہوتے ہوتے بالکل ختم مٹی۔ عباد نے چہرے پر سے اخبار اٹھایا۔ اور نیند
 بھری آنکھوں سے ریہہ کو دیکھنے لگا تو ہتھیلیاں مسل رہی تھیں۔
 "ریہہ! ہماری منزل آگئی ہے۔" عباد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"جی عباد بھائی! وہ دھیرے سے بول رہا ہے۔
 "میں تکی دیکھ رہا ہوں، تمہیں بھوک لگی ہوئی۔ کچھ لے لوں؟ یا پھر گھر چل کر کھائیں؟ اسی نے مزے
 مرنے کی چرس بتائی ہوں گی۔"
 "جی ٹھیک ہے۔ گھر پر ہی کھائیں گے۔" ریہہ نے اس کا دل رکھنے کو کہا اور نشی الوقت سے بالکل بھوک
 بھوک محسوس نہ ہو رہی، مگر اس کے دل و دماغ ایک مرتبہ بھرا اضطراب کا شکار تھے۔
 کھڑے تھے۔ عباد اور مرد مرد دیکھ رہا تھا۔

"کسے دیکھ رہے ہیں؟" ریہہ نے تعویذی دیر سے پوچھا۔
 "اے ایک دوست کو! میں نے اسے لاہور سے نہیں کر دیا تھا۔ میں نے اسے آئے گا۔ افسوس! ابھی کہا۔" عباد
 چند قدم آگے بڑھا۔ ریہہ کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے سے ایک خود غور تو ہوا جن مسکراتے ہوئے چلا
 آ رہا تھا۔ عباد اس سے بھٹک کر ہو گیا۔ پھر وہ اسے لیے دے رہا تھا۔ کس پاس چلا گیا۔
 "یہ ریہہ۔ جب میرے ایک دوست کی، بس ہے اور میرے۔"
 سے اس کا تعاقب کر دیا نہ لگا۔

"اور نہ۔ یہ۔ یہ فراز ہے۔ میرا بہت اچھا دوست اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور
 ہماری دوستی ملا ہو رہی ہے۔ پچھلے سال ہی لاہور سے یہاں کراچی آیا ہے۔"
 فراز مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ریہہ نے بھی دیر سے اسے دیکھا اور سر ہلایا۔
 "چلیں۔؟" فراز نے تکی کو سامان اٹھائے کھڑا دیکھ کر پوچھا۔
 "بالکل بننا۔" عباد نے قدم بڑھا دیے۔

گاڑی ایک خوبصورت چٹلے کے سامنے جا رہی تھی۔ ریہہ نے شیشے سے باہر جھانکا اور سفید دانتوں سے بے
 چٹلے کو دیکھ کر اس کا دل پھر انجانے غم شامت کا شکار ہو کر دھڑکنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ بالکل
 برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

عباد اور فراز گاڑی سے اتر کر ڈکی سے سلمان نکلاں رہے تھے۔ پھر عباد نے اس کی جانب کا دروازہ کھولا۔
 "کیا بات ہے ریہہ! انہیں کسی اور جانا ہے کیا؟" وہ گفتگو سے پوچھ رہا تھا۔
 ریہہ گاڑی سے اتر آئی۔ اپنے گھر تک پہنچ کر عباد کے انداز میں بے حد ناؤکی اور مسرت ورتی تھی جو اس کی
 ایک ایک حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا سکون اور اطمینان محسوس کر کے ریہہ کے اندر ایک ہوک سی
 اٹھی۔ سکون اور اطمینان اس کی قسمت نہیں کہیں پوشیدہ تھا۔ وہ قطعاً "لاطم" تھی۔
 وہ لوگ آگے بڑھے۔ عباد نے پاؤں کے سامنا تھپتا ہوا لکڑی کا چھوٹا ٹکیت کھولا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔
 پورچ میں دو گڈیاں کھڑی تھیں۔ سائینڈ میں بے پھوٹے سے لان میں خوشنما بھولوں کی بہتات تھی۔ ہری

بہاؤ الدین، بہادر بنک جابو تھی۔
 اور۔۔۔ کے دل کی تیرائیوں سے دماغ لگی تھی کہ باہر سے گھر جس قدر پر سکون اور خوشنما دکھائی دیتا ہے
 باہر کی ایسی طرح فحشی مسرت اور سکون کا پیرا ہو۔

"میرے دوں تک پہنچے تھے تب ہی لکڑی کا سفید و دروازہ ہوا اور ایک شفیق سی خاتون کا چہرہ دکھائی دیا۔
 الی تباہی رک گئی۔ خاتون چند قدم آگے بڑھیں۔ ان کی نظریں ریہہ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ ایک
 اچھے جادری تھیں۔ سفید لباس میں ان کا سر ابا بے حد برقرار اور شائستہ نظر آ رہا تھا۔ سفید پونے کے
 لباس میں ان کا ستون چو محبت کی نرمی اور شفقت کے احساس سے معمور تھا۔ پھر بھی ان کی نظروں میں تشویش کی
 لگی تھی۔ ریہہ نے اپنی دیر سے بھی محسوس کر لیا تھا۔

"کی۔! عباد نے ایک سی جست میں یہ زبانی پوچھ لی تھی۔
 "سیدہ بیگم نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ ریہہ بھی اس کی سے آگے بڑھی۔
 "اسلام علیکم۔" وہ عباد کے انداز میں بولی۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

ریہہ نے دیکھا۔ ان کی ساری تشویش محبت اور اپنائیت کی لہروں میں بہہ گئی تھی۔ انہوں نے اسے
 نالوں سے تمام کراپے مقل کیا، پھر پھر محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

"جیتی ہو۔ اللہ تمہارے نصیب بلند کرے۔" شاہا اللہ بہت پیاری لگی ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"
 "ریہہ۔" ریہہ نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

"اسلام علیکم۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔
 "و علیکم السلام۔" عباد نے جواب دیا۔

سب لوگ زائیکہ خیل کی جانب بڑھ گئے تھے۔ یہ یہ کہ کوبہ حد ممکن کا احساس ہوا تھا اسے اپنا کسی بھوک
محسوس ہونے لگی تھی۔

یہ سب باتیں سن کر مجھ پر ہنس پڑا۔ میں نے کہا: "اے صاحبزادے! یہ تو علم تھا کہ عباد کا ایک بھانجا ہے لیکن اپنی سوجھ بوجھ میں ابھی اس نے کبھی اس بات پر غور نہ کیا تھا کہ عمر کی ماں کون ہو سکتی ہے۔ اب اس وقت اسے اچانک ہی ظلم ہوا تھا کہ شہلا ایک بچہ کی ماں بھی ہے۔"

ک لیکن۔ سامنے صوفے پر بے حال اور بے ترتیب سے اکثر مایاں بڑے ہوئے تھے۔
 "اے بھگت" وہ بے فکر چریٹین ہوئیں، "پھر لپک، جھپک ان گتے قریب چلی آئیں۔" یہ تم کہاں سے نکلیے

ہو اس وقت۔ کہاں جا رہے تھے؟“
 اختر میاں نے سرخ سرخی نگاہیں اٹھائیں اور سوکھے لبوں پر زبان پھیری۔
 ”سپا! السلام علیکم۔“

”ارے وعلیکم۔ میں پوچھتی ہوں کہاں سے چلے آ رہے ہو؟ حلیہ دیکھا ہے اپنا۔ جیسے کڑے سے نکل کر آئے ہو۔ چلو اٹھو۔ سارے نما کر آؤ۔ بوسے داغ پھنا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں فاروق حسین نے اگر تمہیں اس طیلے میں دیکھ لیا تو بھٹیوں سے اٹھوا کر گلی میں پھکوا دیں گے، سمجھ لے اے ہاں۔ جسے دیکھو وہی گلے کا طوق ہے۔ چلو اٹھو اب۔“ وہ حد درجہ جھنجھلا گئی تھیں انہیں دیکھ کر۔

”باجی۔!“ وہ پھر نقاہت سے بولے تھے ”چائے تو ملا دو۔“
 ”ارے سب کھلا پلا دیں گے تمہیں۔ مر نہیں جاؤ گے ذرا سی دیر میں۔ اب اٹھو بھی۔ جا کر ہمارا غسل خانہ پلید کرو۔ چلو جاؤ۔“

اختر میاں بہن کی جھاڑ پھینکار سن کر لڑکھڑاتے ہوئے غسل خانے کی سمت کو برہ گئے فردوس بیگم ہاتھ پر سو بل ڈالے کھڑی سوچتی رہ گئی تھیں۔

ہاشم میاں کو جی بھر کر یہ لکھا گیا تھا، لیکن انہوں نے قطعاً برا نہ مانا۔ بقول رافع کہ ان کے دانت تک پہلے ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔

”یار۔ ذرا انداز بند کرنا۔“ رافع کھڑا تصور کھینچ رہا تھا۔ ”اسی نہیں چل رہا ہے کہ کہاں ختم ہیں اور رانت کہاں سے۔“

”چلو۔ ہم نکلتے ہی سسی، سری جڑھیں گے نالسی کے۔“ وہ گجل ملتے ہوئے ابٹن اتار رہا تھا۔
 ”پلیٹ بھی کتنے ہیں کسی کو۔“ حمزہ بے سوچے سمجھے بولا۔
 ”یہ بھی برا نہیں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

بات سمجھ لینے والوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”یہ جا رہا ہے جیل میں، ہو نہیں سکتا۔“
 ”چلو کھسکو یہاں سے۔“ وردہ نے سرگوشی کی۔ ”تب یہ لوگ نجانے کیا کیا اول فول پولیس گئے۔“
 ”بکتے رہیں۔“ ماہین جھجھلائی۔ ”ہم کیوں جا میں۔ ہم نے تو ابھی گائے گائے ہیں۔“
 ”تمہارا نگلا ابھی دکھا نہیں۔؟“ رانمہ نے اسے کھوڑا تھا۔

”ارے۔ میرے بھائی کی شادی ہے۔ کوئی مذاق ہے۔“
 ”یہ مذاق نہیں آئی۔ یہ۔ حقیقت ہے۔“ یکایک پیچھے سے حمزہ نے جملہ کہا اور جلدی سے ڈھیر سارا ابٹن ماہین کے چہرے پر مل دیا۔ وہ بھوت بنی بیٹھیں رہ گئی۔ لڑکیاں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں تو وہ جھٹلا کر حمزہ کو مارنے لگی۔ پھر زور سے ہنسنے لگی۔ اس کے ساتھ وردہ بھی ہنسنے لگی۔

کسی نے ان دونوں کی چٹیا آپس میں باندھ دی تھیں۔ اور اب سارے کے سارے انہیں دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ لوٹ ہو رہے تھے۔

پھر تو گویا ایک طوفان بد تمیزی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب ایک دوسرے پر ابٹن کے گولے بنا بنا کر پھینکنے لگے تھے۔ کپڑوں، میک اپ کا شہر ہو گیا تھا۔ قہقہوں سے پورا لان گونج رہا تھا۔ بزرگ حضرات تو یہ صورتحال شروع ہوتے ہی اندر کی جانب ہرہ گئے تھے۔ اور اب کوئی کسی کا ایرسان حال نہ تھا۔ لڑکوں کی تو باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو چکی

تھی۔ غلی اور مانع نے حنز کو کر لیا تھا اور اب جی بھر کر اس کا حلیہ بکا زور ہے تھے۔ جامعہ اور سدرونے نام، ا شامت ہلائی ہوئی تھی۔ عاشر نے ایچن کے منہ پر انٹن کا لٹک دینا تھا۔ اور اب اسے دیکھ کر منٹس پر ہاتھ عریض پر انٹن کا کولہ آکر کڑا تو وہ چونچ بچا کر قدرے کوئے تک چلی آئی تھی۔ بھنا کر چلی۔ سامنے مانع شرار سے مسکرا رہا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ منگ کر بولی۔

”بد تمیزی؟ یہ تو داخل کا تقاضا ہے۔“ منٹس دیا۔

”منٹس آپ۔“ وہ غرائی اور لٹٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

مانع ایک ایک بکا بکا رہ گیا تھا۔ ست عرصے سے وہ اس کے گرد کو شرم، جینیب اور جا کا نام نہ جاتا تھا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے وہ اس گریز میں حقارت، انفرت، سخت قسم کی ناپسندیدگی کی خشک دیکھ رہا تھا۔ غمراہ سے کچھ کچھ میں نہ آتا تھا۔ سدرون کھڑی وردہ نے یہ منہ دکھا تھا اور مانع کی طرف ادھی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

رات اسے بہت اچھی نیند آئی تھی۔ اسی لیے وہ صبح سویرے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ ابھی گھر کی کے پردوں پر صبح کی سفیدی کے آثار نمودار ہو رہا تھا۔ منٹس ہی ہوئے تھے، باہر لان میں چلتی چلتی منٹس کی معدوم آوازیں اس کے دل کو خوشی اور تشکر کے احساسات خشنے لگیں۔

ریجہ بستر سے نکلتی آئی۔ دوش روم میں جا کر اس نے وضو کیا، پھر گاہٹ پر جائے نماز بچھا کر خدا کے حضور حاضر ہو گئی تھی۔ نماز میں اسے بہت لطف محسوس ہوا تھا۔ دل و دماغ اچھے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد بالکل ہلکے پھلکے سے محسوس ہو رہے تھے۔

دعا مانگ کر اس نے دونوں ہتھیلیاں اپنے چہرے پر نکالیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی منٹس کی خوشیوں پر اترنے لگی۔ تب ہی اچھا چہرے پر پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بیڈ روم کا ایک دو اذان لان کی سمت بھی کھلتا تھا۔ ریجہ دو دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ پھر موسمی کی خولہ دھرتی لے آئے۔ پھر کھڑا کیا۔ آسمان سرسبز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور باؤ صبح میں بے حد نازکی اور خوشبو تھی۔ ہر شے اپنے اصل رنگ میں نیا در نکلتی اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ ریجہ نے لکڑی کے چھوٹے سفید گیت کے قریب آکر باہر جھانکا۔ مار لکڑی کی سیاہ سڑک در تک جاتی دکھائی دیتی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب بے پارک کے سرسبز درخت در سے دھند میں چھپ چکے تھے۔ جیسے وہ سفید باریک جلیلا کا لباس پہنے کھڑے ہوں۔ پارک میں چھپا ہوتے پر عموں کی خوش نما ٹھکانے پر لڑکے اور لڑکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ریجہ نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت اور خوش کن منظر نہ دیکھا تھا۔ اس نے گیت کا دھری کھڑا ہٹایا اور باہر چلی آئی۔ صاف ستھری سیاہ سڑک پر چلتا بھی ایک خوشگوار عمل تھا۔ در در تک سسٹن دکھائی دیتی سڑک پر ٹھنک سے موسم میں چلتے چلے جانا بے حد بھلا لگ رہا تھا۔

ریجہ پارک میں داخل ہوئی۔ پارک میں کہیں کہیں کسی ڈی فٹس کی جنگ دکھائی دیتی تھی۔ منٹس کی سیر کے لیے نکلے ہوئے بڑے بڑے یا جانگ کھڑے کرتے تو جوان در سے نکل آ رہے تھے۔ ریجہ پینل کے ساتھ بڑی بیچ پر جا بیٹھی۔ اور اس کی پشت سے سرنجا کر آنکھیں بند لیں۔

جانگ کرتا ہوا رافع یکھٹ لھرا تھا۔ لہو بھر کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے ابو دھر اوھر دیکھا۔ پارک کا منظر نگاہ خالی ہوا تھا۔ نرم نرم دھوپ درختوں کی ان کی شاخوں پر اپنی غلی اور اب نیچے اترنے کے

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

۱۰۱۵

کی دہ سے اس کی آنکھ قدرے تازہ سے کھلی تھی۔ سو باشم کو تازہ دم ہونے کے لیے سوتا ہی آیا تھا اور اب کھڑا حیرت سے اس بے فکر دیوالی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جو پارک کی تنگی بیچ پر بیٹھی

مالی آہل اس کے کانڈھے پر سرسرا رہا تھا۔ دو سرا پلو ہری گھاس پر پھیلا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ کود میں ۱۔ وہ کمری نیند میں تھی۔ سیاہ گھنیرے پاؤں کی بدلی اس کے شانے پر پھیلی ہوئی تھی اور گلابی ہونٹوں ۲۔ اب کی مسکان کا مایہ تھا۔

۱۔ نے زندگی میں ایسا دلکش منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر اس سے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر جیسے ۲۔ میں سا آیا۔ اس نے ٹراؤ زر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پانڈر تھکڑا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ ۳۔ سہ چٹاؤں کا مسانی منج ایسی ہو

۴۔ ہوں تو نہ ہوں ہے جاگوں

بندہ میں کے آگے لہو کا پلو دین جانے ۵۔ رافع نے بجائے کب سے لکھنے لگی لکھ اپنے ٹراؤ زر کی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کیوں ۶۔ اس لیے وہ اسے ہرا لے کر پھر آتا تھا۔ اس نے پریشانی نگاہوں سے پھر اسے دیکھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ۷۔ وہ پھر پھر اس کے ہاتھوں سے نکلتا تھا۔ پھر رافع کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی ریجہ کی گود میں جا کر ۸۔

۹۔ نہ زور سے چوگی تھی۔ گھبرا کر اس نے ابو دھر ان پھر دیکھا اور گود میں پڑے کانڈ کو بے اختیار ہی اپنی طبعی میں سمجھتی ۱۰۔ پھر اس کی نظر سامنے پھر سے پڑی تھی۔ ریجہ نے جلدی سے دوبارہ سنبھالا اور آگے جانے ۱۱۔ لے گئے تھے۔

۱۲۔ وہ پھر پھر اس کے ہاتھوں سے نکلتا تھا۔ پھر رافع کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی ریجہ کی گود میں جا کر ۱۳۔

۱۴۔ ریجہ کھڑی تھی۔ لیکن اس نے مرکز نہیں دیکھا تھا۔

۱۵۔ ”تب سے آپ کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔“

۱۶۔ ”جی ہاں۔“ اس نے ہلکی سی ہلکی سی مڑی مڑی آہلی ہوں۔“

۱۷۔ ”ابھی میں اب تک؟“ وہ ہلکی سی ہلکی سی سے بولا۔

۱۸۔ ریجہ نے اعتبار نہ کیا۔

۱۹۔ ”ابھی میں نے حیرت سے اس اجنبی کو دیکھا۔“

۲۰۔ ”میرا مطلب ہے تب کہاں سے نکلی ہیں؟“

۲۱۔ ”میں نے چند لمحے سوچا پھر جواب دیا کہ اس کے لب مسکرا رہے۔“

۲۲۔ ”اللہ تعالیٰ کیسے اس سے؟“ اس کے سنجیدہ انداز میں ہلکی سی شرارت تھی۔

۲۳۔ پھر وہ مزید نہیں دیکھی۔ رافع پوری آنکھیں کھولے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

۲۴۔

۲۵۔ جیسے ہی گھر کے گیت کے پاس پہنچی حیران پریشان عباد باہر کی سمت ہی پلک رہا تھا۔ ریجہ کو دیکھ کر اس کی جان

۲۶۔ میں زبان نکلتی۔

۲۷۔ ”نہیں! کھلی چلی گئی تھی تم؟“

”عباد بھائی! میں ذرا پارک تک چلی گئی تھی۔“ ربیعہ بھی اپنی غلطی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

”میں پریشان ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک تمہارا دروازہ بجایا پھر دوسری جانب سے دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ تم نجانے کہاں چلی گئیں۔“

ربیعہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر مسکرا دی۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی عباد بھائی!“ وہ ہنس دی تھی۔ ”بے فکر رہیے۔“

عباد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

”نچلو۔ ناشتہ کرلو۔ امی بہت مزے کے پرائے بناتی ہیں۔ اور ہاں رات کو شہلا آپلی کی مندی کی تیاری بھی کرنا ہے۔ تم نے اور انیقہ نے سنبھالنا ہے سب کچھ۔“

”ضرور۔“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

پھر اپنے کمرے میں آکر اس نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ دیکھا اور مسکرا دی۔ نجانے کیا تھا جسے وہ اتنی دیر تک مٹھی میں دبائے پھر رہی تھی۔

ربیعہ نے کانڈ پھیلا کر دیکھا پھر حیرانی سے مسکرائی۔ اس پر تو پوری لطم تحریر تھی۔ ربیعہ لطم پڑھنے لگی۔

”کمال ہے۔“ پھر وہ بولی تھی۔ ”یہ میرے ہاتھ میں رکھا ہے۔“

پھر وہ بتا: ”اس کے ذہن میں یہ پورا منظر آ رہا ہو گیا تھا۔ وہ ان حیران نظروں کو دیکھ کر کے مسکرا دی۔“

”ربیعہ! منہ بند نہ کیجی! آواز سے وہ چونک اٹھی۔“ ناشتہ کرلو۔“

وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

UrduPhoto.com

رات روشنیوں سے سمور تھی۔ عباد کے کمرے کی پھت پر تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ ڈیکورنگ والوں نے پھت کو خوبصورتی سے سجانے میں کوئی رقتہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ ہرے اور پیلے رنگ کے جھلما پتے دیوٹیوں سے پورا ماحول سج گیا تھا۔ جگہ جگہ گلاب کے پیلے اور نارنجی پھولوں کے گلہ سے سجائے گئے تھے۔ اسٹیج پر گیندے کے پھولوں کی فراوانی تھی۔ رنگین منیٹھنوں نے جا بجا مختلف رنگ کی روشنیوں کو ہم آہنگ کیا ہوا تھا۔

انیقہ اور شہلا کی سیلیوں نے اسٹیج پر تھیں اور مختلف گھول پر طبع آزمائی کر رہی تھیں۔ ربیعہ کھانے کے انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عباد موسیقی اور تصویریں بنانے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

تب ہی ہاشم کی طرف سے مندی لے کر پوری پلٹن آچکی۔ آنے والے بھی ڈھول اور دف بجا رہے تھے۔ ادھر والوں نے بھی فل دیویم میں ڈیک آؤن کر دیا۔ موم بتیاں روشن ہو گئیں کلاسیں بجھا دی گئیں۔

دولہا میاں کی بہنوں اور کزنز کے چہرے موم بتیوں کی سحر انگیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ تب ہی عریشہ کی نظریں دو آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس کا دل ایک بارگی زور سے دھڑکا۔ لیکن وہاں اجنبیت اور بے نیازی تھی۔ عریشہ کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ سب کے ساتھ گھسنے لگی۔ فراز ایک جانب کھڑا سینے پر بازو لپیٹے خاموش نظروں سے ہنسی مسکراتی کھلکھلاتی ناعمہ کو دیکھ رہا تھا۔

ناعمہ مندی کا تھال اٹھائے اس کے بالکل قریب سے گزری تھی۔ مگر تے مگر تے اس نے نظریں اٹھائیں اور اس کے لب جیسے مسکراتا بھول گئے۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

نہیں پہلے نے فل والیوم میں ابرار کا "ساں تیری گل کرنی" لگا دیا تھا۔ تقریب کا رنگ یکجہت ہی بدل گیا۔
ہی بانہ سے آئے ہوئے لڑکوں نے ٹولی بنا کر گانے پر رقص شروع کر دیا تھا۔ عباد، فراز اور عباد کے دیگر
نہی ماحول کا اثر قبول کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سارے لڑکے مل کر خوب خوب ہنگامہ کرنے

"اگرے بھی۔ پہلے رہیں تو کر لیتے۔" شفیقہ حیات نے پاٹ دار آواز میں کہنے کی کوشش بھی کی لیکن اتنے
نہیں کی نے ان کی ایک نہ سنی۔

ایاں بھی تاہاں بجا بجا کر اپنی طرف کی باری کو پوری دوا دے رہی تھیں۔ ربیعہ شوق اور دل جیسی کے عالم
نہی یہ سارا ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کب اپنی زندگی میں اس طرح کا بے فکر اور خوش باش ماحول دیکھا
پوری طرح سے تقریب کو انجوائے کر رہی تھی۔

ربیعہ ربیعہ۔ "کوئی اسے پکار رہا تھا۔"
یہ چونکی۔ اس نے اپنے چہرہ پر دیکھا۔ دور کھڑی انقیہہ نے جانے کب سے اسے پکار رہی تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر
کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ربیعہ جلدی سے کھڑی ہوئی اور شور مہا کرتے لڑکوں سے بچ بھاگ کر نکلنے لگی تب ہی بے خوشی میں دھمال ڈالتا
اس کے سامنے آ کر کھتا۔ "بچہ ٹھنک کر کی رافع بھی تو کھڑا ہے۔ آگے میں لے آ کر خیر مند ہوا۔"
"اگھاروں بے چارے کی جگہ سے دور رہو۔"
مستی گھر آ جا رہے تھے شیرے سو رہے۔

ایک برابر چٹک چلا تھا۔ ربیعہ اس نکر اور خامی ندوس ہوئی تھی۔ وہ نظریں چمک کر لڑکائی چہرہ موڑے جلدی
اگے رہے تھی۔ رافع اپنی بیعت کو کوئی نام نہ دے سکا تھا۔ تپتے شور مچاتے لڑکوں کی ٹولی کے نیچے وہ ٹک
نہیں میں گم کھڑا تھا۔ اسے کسی کا دھکا تو نہ جلدی رہے۔ وہ فوج ہاتھ اٹھا کر پھر شروع ہو گیا لیکن اب کی بار
میں میں پہلی ہی سرستی نہ تھی۔



یہ انقیہہ کے ساتھ چلی منزل پہنچی آئی جہاں سکون اور خاموشی تھی۔
نہیں کسی کام سے نیچے آئی تو دیکھا عباد بھائی کا موبائل بج رہا ہے۔ "انقیہہ اسے بتانے لگی۔" میں نے کال
کی تو دوسری جانب کوئی عبد الباری صاحب تھے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔

اوسے "ربیعہ کاہل غیر معمولی انداز میں دھڑکا۔" پچھلے پچھلے "اس نے بے تالی سے پوچھا۔
بھم میں نے انہیں تقریب کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگے۔ بعد میں بات کر لیں گے اب اگر تم کو تو میں اسی نمبر
بادیتی ہوں یا پھر یہ تقریب ختم ہو لے تو بات کر لیں۔ کیا خیال ہے؟"

انہی اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ربیعہ کو بھی احساس ہوا کہ یہ موقع اس امر کے لیے مناسب نہ
ہی شہلا کی رہیں ہونا باقی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں بعد میں بات کر لوں گی۔“

انہیہ مطمئن ہو کر پلٹ گئی۔ ربیعہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہر چند کہ اس کا دل ترانہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

لڑکوں کا جوش کچھ سرد رہا تو انہیہ اور ربیعہ شہلا کو قہقام کرا سٹیج پر لے آئیں۔ شہلا کے چہرے پر پہلے آنچل کا سایہ تھا اس لیے اس کے تاثرات سب ہی سے پوشیدہ تھے۔ سب ہی کی پر شوق نظریں اس کے سراپے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایقان سے ممبر کرنا دشوار تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی عزیز از جان سیلی کے تاثرات معلوم کرنے کی خواہش مند تھی۔

رسمیں شروع کی گئیں۔ شفیقہ حیات، فردوس بیگم اور عذرا بیگم سب سے پہلے اسٹیج پر پہنچیں۔ انہوں نے اسے ایٹن، ہندی، تیل سب ہی کچھ لگایا۔ شہلا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بڑے سے لڑے میں چھپے اس کے وجود میں ارتعاش تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک انجانا سا شور بیا کر رہی تھی۔ اسے نجانے کیوں کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ بے شمار نظریں اور مودی کیمروں کے لینس اس پر مرکوز تھے۔ وہ ماتھے پر کیا پامیٹ تک پونچھنے سے قاصر تھی تب ہی اس کے قریب ایک شوخ اور مانوس آواز چھمکانی تھی۔

”ہمیں تو دیدار سے محروم نہ کر دینا۔“ اس نے آواز میں ہنس بول کر کہا۔
یہ ایقان بھی جو شوخی پر کبھی بڑبڑاتی تھی پھر اس کے گھونٹ میں سے جھانک نکلتی تھی۔ شہلا کے لبوں پر مدھم سی مسکان اڑ گئی۔

”ہول۔“ پھر ”مطمئن ہو کر بول۔“ اب کم از کم دو لہا میاں کے سوالوں کے جواب تو دے پاؤ گی۔“
شہلا کے کانوں میں ایک مرتبہ پھر سائیں سائیں سی ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یہ حوالہ دیا۔ جیسی لگ رہا تھا، نجانے کیوں۔

UrduPhoto.com



ہاشم چائے کی طلب سے کمرے سے نکلا تھا۔ شادی کے کاموں کی غرض سے رخصتی جانے والی جزوقتی ملازمہ بچن میں موجود تھی۔ اس کا ہاتھ اس سے چائے بنوانے کا تھا۔ وہ بیڑیوں پر آکر ٹھنک گیا۔ بیڑا ہزار سی عریشہ بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ سارے بیڑوں میں بیوس بی اور اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ حالانکہ وہ تیار ہو کر سب کے ساتھ اس کی ہندی لے کر شہلا کے گھر گئی تھی۔

عریشہ نے بھی ہاشم کو دیکھ لیا، وہ چوری ہو گئی۔

”عریشہ! ہاشم نے تشویش سے پکارا۔

”جی سستی بھائی!“

”تم واپس آگئیں؟“

”جی!“ وہ نظریں جھکا کر بس اتنا ہی کہہ پائی۔

”کیوں خیریت؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میری۔۔۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سر میں۔۔۔ درد تھا۔“ اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ ہاشم

چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھ رہا۔

”اکیلی ہی آگئیں؟ اتنی رات میں۔“ پھر وہ بولا۔ ”چھا خیر۔۔۔ آئی گئی ہو تو ذرا چائے بنوا دو، میں بھی سرد

محسوس کر رہا تھا۔

"کیا وہ بڑی ہے؟"
"سنو" "ناشتم کو دیکھنا خیال آیا۔" "کسی کو بتا کر آئی ہو؟"
عزیزہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر آہستگی سے بولی۔
"زمین ہی نہیں رہا بھائی۔"

"اوہ گڈ!" وہ تدرے پر ہنس پڑا۔
پھر وجہ سے موبائل نکالتے ہوئے وہ سڑکیاں چڑھنے لگا۔



سب لوگ کھانا کھا رہے تھے جب تھوڑے لمحوں کی گلی ریو کی۔
"عزیزہ؟" وہ بولا۔ "وہ آپ کے پاس ہے؟ کھلے ہو؟ کسی سے کچھ کہہ کر ہی نہیں گئی۔ نہیں۔ اے
ہنگامے میں کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ اچھا میں اسی سے کہہ دیتا ہوں۔"
موبائل جیب میں رکھ کر وہ پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا تھا جبکہ قریب کھڑے کمراسٹس بھرا تھا۔
کتنی دیر سے اس کی ستلاشی نظروں اسے ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ بتا کسی کو کہ وہ کھانا کھا رہی تھی۔ اس کا ذہن
یہ محنت حل کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک عجیب سا لہجہ محسوس کرنے لگا تھا۔



"اور کچھ لیں گی آپ؟" کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔
ناعملہ چونک کر مڑی اور ڈر گئی۔ فراز اس کے عین مقابلے پر کھڑا تھا۔
اور تدرے شرمندہ کی ہو گئی۔
"جی ہاں۔ نہیں شکریہ۔" وہ ہنسنے لگی۔ "بوسٹ کیس اس کے حلق میں جیسے انکس کی گئی تھی۔"
فراز نے ہاتھ میں تھامی ہوئی پیٹی آگے کی۔ ناعملہ نے جلدی سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ کسی تازہ
اسے دیکھنے جا رہا تھا۔ ناعملہ نے چند لمحوں جلدی جلدی بھرے اور کہا اسے اوتارنی چاہی تب اس کے چہرے
وہی کی مسکان نرمی کی صورت سامنے آئی۔

برصا کے پاس مری اس نے ہاتھ کی
کر رہا تھا عزت بھی دل چاہی کی
وہ دم سہل میں بولا۔ ناعملہ کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے سڑک سدا کے پاس جا کھڑا
ہوئی۔ فراز اس کی گوری گریٹ میں دھکی چھین کر دیکھنا نہ کیا تھا۔

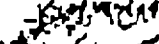


ریجہ کے ذمے انہی نے شہلا کو کھانا کھلانے کی ذیوی لگا دی تھی۔ وہ پلیٹ میں چاول اور بوسٹ کا پیس رکھ کر
اب پیٹنے کی تلاش میں نظروں دوڑا رہی تھی۔
"ایک کیو زی۔" کسی نے کھنکھارے ہوئے کہا۔
ریجہ چونک اٹھی۔ رات اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ریجہ نروس ہوئی پھر ہونٹوں پر رکھی سی سکا۔

آہستہ بچنے لگی۔

"کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"
"جی ہاں۔ آپ سے ہی کہا ہے۔" وہ بھی مسکرایا۔
"کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"
"جی ہاں۔ آپ سے ہی کہا ہے۔" وہ بھی مسکرایا۔
"جی ہاں۔ آپ سے ہی کہا ہے۔" وہ بھی مسکرایا۔

"بھئی جان سکا ہوں آپ کے متعلق؟" وہ جیسے کسی کشمکش کا شکار تھا۔
"نہیں۔ کیا؟" وہ پریشان ہو گئی۔ "کیا جانا چاہتے ہیں آپ؟"
"میں یہاں لٹا ہے جیسے آپ کو گیس دیکھا ہے؟"
"میں یہاں لٹا ہے جیسے آپ کو گیس دیکھا ہے؟"



"پارک میں کھانا کھا کر باہر احمد سے مسکرائی۔"
"اے! اس نے جیسے ریجہ کی محنت پر تاسف سے سر ہلایا۔" "میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔"
"اے! بھئی آپ کے اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کچھ اور بے دہی تھی۔ شاید شاید میں نے
اسے آپ کو دیکھا ہے۔ شاید وہ میں ایک دھڑکنے کو پہچانتی ہیں۔"
"جی ہاں۔ ریجہ کی آنکھوں پر کتنی چمک کی گئی تھی۔"

UrduPhoto.com

یہ چمک تھامے آگے بڑھی۔

رات کے لگ بھگ تھے جب کسی نے تلاش کا دورانہ بجایا۔ عزیزہ جاگ رہی تھی اور نامعلوم اذیت کا شکار ان
باز آنکھوں کو سوئے چلا رہی تھی۔
"دوازے پر ہلکی سی دھمک نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر
میں ایک لڑکی تھی۔ وہ اسے کڑے تیروں سے گھور رہی تھی۔ عزیزہ کی نظریں جھک گئیں۔

"آپ اس وقت؟"
"نہ اؤں کی بیٹیوں نے لگام کھوٹوں کی طرح ڈھیر لگائیں ان کی خیریں پوچھنی روئی جاتی ہیں بچی۔" وہ طنز
پر ایک طرف میں ہو گئی تھی لیکن انہوں نے کمرے میں قدم نہ دھرا۔
"اسی سے اجازت لیے بغیر پھر ڈھیر لگائی گئی۔" وہ بولی۔ "اچھا اثر پڑا ہو گا تمہارے بھیا کے
ان پر۔"

"میں میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔"
"محنت تو تمہاری پچھلے کئی ماہ سے خراب ہے بیٹا! اچھا انک رہا ہے بیٹی ہو نہ مرنے ہو نہ ہمیں جینے رہتی

غریبہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز شکایتی نظریں اٹھائی تھیں۔
 ”گھر میں اتنے مہمان نئے لوگوں سے واسطہ بھائی کی خوشی کا موقع۔ ہمیں کسی شے کا لحاظ نہیں۔ تمہارا
 ماتم ہے کہ پورا ہو کر نہیں رہتا۔ ہماری عزتوں کا بھی پاس نہیں۔“
 ”میں نے آخر کیا کیا ہے امی!“ وہ دمھم لہجے میں شکایتا بولی۔ ”آخر کیوں سب لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟“
 آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔“ وہ خود بے اختیار سسکا اٹھی۔
 ”تم اپنے حال پر توجہ کرو بیٹی، تو کسی دوسرے کو یہ تکلیف کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔“
 ان کے دل کو بھی اس کی بے بسی دیکھ کر کچھ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے لہجہ کچھ نرم کر لیا۔
 ”بھائی کی شادی کا موقع ہے اپنے آپ کو کچھ عقل کی بات سمجھاؤ۔ ہماری باتیں تو تمہاری سمجھ میں آتی نہیں
 ہیں آپ کسی کو تم سے شکایت نہ ہو۔“
 اسے تنبیہ کرتی ہوئی وہ مزگنی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑے فاروق حسن دلعنا ”راہداری میں
 ہو گئے۔ فردوس بیگم اپنی دھن میں غلطی چلی گئیں۔“
 غریبہ دروازے سے سر نکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔



رات کے چار بجے کا مکمل تھا۔ گھر کے تمام افراد تقریب کے اختتام پر تھک کر چور ہو چکے تھے۔ رات
 دو نوں ہاتھوں کا تھکا ہوا سر کے نیچے جمائے سیدھا لیٹا جھٹ کو گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ عجیب ہو رہا
 تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔
 اور شرم سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔
 پیشانی کی محراب پر ہونے لگی تھی۔
 بے چینی حد سے بڑھی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسے ہاشم کی یاد آئی۔ بے سوچے
 سمجھے اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر پیش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہاشم کی نیند میں ڈوبنے لگا۔ ”آواز بھری۔“
 ”اے آواز تیرے سونے کا وقت نہیں ہوا۔“

”بار ہاشم۔“ عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے مجھے۔“
 ”ہاں۔؟“ گھر میں مجھے صبح سے ناظم دیکھنے دے ہائیں! اے الو کی دم۔ یہ اس وقت تجھے کون سی الجھن
 ستانے لگی ہے؟“

”پتا نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”جی چاہتا ہے کچھ کہوں۔ کچھ کچھ اعتراف کروں۔“
 ”میں یاد ری نہیں ہوں میرے بھائی۔“ وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ ”اور دیکھو۔ مجھے سونے دے، کل مجھے جاگنا
 ہے۔“ بلینز۔ کوئی التماس نہ تھا اعتراف کر کے کہیں تو میری نیند ہی عتاب کر دے۔“

”ابھی سے بے ترقی کا یہ عالم!“ وہ چیخ کر بولا۔ ”ابھی تو رات پڑی ہے درمیان میں۔“
 ”ہاں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”رات تو گزرنے والی ہے۔ ہاں پورا دن ضرور پڑا ہے۔ ایک عالم
 انتظار کا باقی ہے۔“
 رافع کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اسے ہنسی آ گئی۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر ہاشم نے پھر ایک سرتوہ
 بھری۔۔۔ رافع نے ہنسنے ہنسنے موبائل آف کر دیا۔

اس نے کھڑکی کا پرہ سر کا کر مکن میں اترتی شام کو دیکھا پھر نجانے کیوں وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ایک عجیب اضطرار تھا جو انا آہنی پنجول کے گردنگ کرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ایک بے کلی تھی جو کسی طور کم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ ایک بے چینی جو بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس وقت انھوں نے دروازہ کھول کر اندر بھاگنا کوشش کیے پار دیکھ رہی تھی۔

”ایسا! شہلا! ہسٹکی سے مزی۔“

انھوں نے مدد طلبی آئی۔

پار سے بار بارانی کے لیے فون آیا ہے۔ تمپ کو ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچنا ہے۔ ساڑھے چار بج رہے ہیں۔“

شہلا نے بے جا ہی فوننگوں سے گھڑی کی سمت دیکھا۔

”آپ کو چاہئے یا نہیں؟“ انھوں نے پوچھا۔

شہلا نے اثبات میں سر ہلاتا تو جانے کے لیے مزی۔

”ممنوع! شہلا! مضطرب ہو کر رہی۔“

انھوں نے رک گئی۔

”عمید کہاں ہے؟“ اسے میرے پاس بھیج دلا۔ ”اس کی آواز میں اس وقت کی فحالب نے لگی تھی۔ انھوں نے

مرکز کو کہنے کا حوصلہ نہ کیا۔ جب چاہ سہا تے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

چند لمحوں بعد مسکرا ہوا مگر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ شہلا کے قریب چلا آیا۔

”مما! آپ نے مجھے۔“ وہ جملہ مکمل نہ کیا۔

اس کی توجہ بیز پر پڑت ہوئی جوڑے سے اپنی جانب مبذول کر رہی تھی۔

”مما! تو پر شوخی انداز میں کپڑوں کی طرف برعلا۔“ ”آج چھپ یہ ڈریس نہیں کی؟“

شہلا نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ عراس کی جانب مڑا۔

”مما! کج آپ دلس نہیں کی؟“ شہلا جڑ بڑھ کر کہی۔

”ادھر آؤ چند! اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کا پیچہ غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بھی ایک

تک سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنے منہ سے کچھ نکالی۔ اس کا چہرہ تھم لیا۔

”مما! آپ دلس ہیں کچھ نہیں چھوڑ جائیں گی؟“

شہلا کو یوں محسوس ہوا جیسے عمر سے دو دواری گوار اس کے دل پر رکھ دی ہو۔ اس نے کیا ایک سے خود سے اپنا

لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ عمر کے سوال نے اسے سر ہکا ایک کاٹھارا احساس سے دوچار کیا تھا وہ دھواں دھواں

رہتی رہی۔

اس وقت انھوں نے اپنے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ رعبہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ دونوں کچھ وقت اس

کے ہمراہ گزارنے کی غرض سے اس کے ساتھ چائے پینے کے ارادے سے آئی تھیں۔ شہلا کو یوں وہ یاد دیکھ کر

انھوں نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور تیزی سے شہلا اور عمر کے قریب آئی۔ اور پھر شہلا کے آنسوؤں میں

اس کے بھی آنسو بھی شامل ہو گئے۔ رعبہ کے لیے یہ رقت آمیز منظر ناقابل برداشت تھا وہ بھی سسکا نہ تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ سب کی سب دھواں دھواں رہی تھیں۔ کیا ایک کمرے کے دروازے پر مینڈو ٹیم نمودار

”نہی! اور یہ کالیاں کس پھر اندر آکر شہلا کو سارے چپ کرواتے تھیں۔“

”نہی! یہ آہستہ آہستہ چھو اور نئی زندگی کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہو۔ بھول جاؤ ان آنسوؤں کو۔“

”نہی! تمہاری ہر بات پر کچھ کہہ رہی ہیں۔“

شہلا آنسو پونچھنے لگی۔

”فراخ تمہارے کپڑے اور زلیو رانگ رہا ہے۔ وہ تمہیں پار لے جانے کے لیے تیار ہے۔“

انھوں نے بھی اٹھ کر چھوٹے سے بیگ میں شہلا کا عویں جوڑا اور زلیو رات کے ڈبے رکھنے لگی۔ رعبہ نے کم مہم

سے عمر کو خود سے لپٹا لیا اور ڈھونڈنے لگی۔

”ایسا۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔“ ”میں سمجھیں عمر کے لیے میں آپ کی جگہ لے رہی ہوں۔ میں

اسے آپ سے زیادہ چاہنے کا رجحان تو نہیں کر سکتی لیکن عمل میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ

ہے۔“ ”رعبہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

شہلا اندر سے بیگ لے کر اندر آئی۔

”شکریہ رعبہ! تم میری حفاظت کر رہے ہو۔ تم میری تسلی دے رہی ہو۔“

”گویا میری جانب سے آپ کو کوئی کچھ تھا؟“ انھوں نے آنکھیں نکالیں۔

”تم میرے بیٹے کو ذاتی برت ہو۔“ ”شہلا! یہ ہے ہنسی۔“ ”شکریہ! میں لگا تا ہے یہ تمہاری۔“

”روز ملوانے! اس کی آپ سے۔“ ”میرا پوچھو۔“ ”اس سے۔“ انھوں نے عمر کو گدگدایا۔

شہلا کچھ سوچنے لگی تھی مینڈو ٹیم کے لیے اسے اس کا شانہ دیا۔ وہ چوکی۔

”ایسا! تو میری طرف سے۔“

”رعبہ! یہ ہے۔“

”قد آدم! آئینے میں خود کو ہر روز دیکھ کر رہا تھا۔ نگاہوں میں تشویش کی لہریں تھیں۔ عقوبت میں

کھڑے رافع نے بشکل مسکراہٹ میں دجائی اور بظاہر اپنی نالی درست کرنے لگا۔

”پار شاعر! پھر وہ لڑکھائے۔“ ”نالی! اچھی تو لگ رہی ہے۔“ ”اس سوٹ کے ساتھ؟“ رافع نے تھوڑا سا ہن کر

اپنے کپڑے دکھائے۔

”نالی! وہ اچھی لگ رہی ہے۔“

”نالی! تم! یہ تو! کیا مطلب؟“ ”خواب کیا لگ رہا ہے؟“

رافع نے بغور اس کا منہ دیکھا پھر یوں خاموش ہوا جیسے اپنے عمل سے اس نے اس بات کا جواب دے دیا ہو۔

”اسم! اس کی بات سمجھ کر بے مزہ سا ہوا اور غور سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔ رافع کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہاتھ نے

اس کی پیٹ پر ٹھونسا دیا۔

”تیرے نصیب میں بھی خدا نے ایسا دن لکھا ہو گا پھر ہم بھی ایسے ہی بنیں گے۔“

رافع کی ہنسی ایک لخت رک گئی۔ وہ پھر سے نالی کی جانچ کرنے لگا۔ اسم نے بغور اس کی یہ حرکت دیکھی۔

”رات تو نے مجھے چاہتے فون کیا۔ کس خوشی میں؟“

”ہنس پونسی۔“ رافع بیٹھ کر دوتے پہننے لگا۔ ”تینو نہیں آ رہی تھی۔“

ہاشم اب خود سے مطمئن ہو چلا تھا۔ لہذا سرسری سا آئینہ دیکھنے لگا۔

”اور وہ اعتراف؟ جو وقت تجھ نازل ہوا۔ وہ کیا تھا؟“

”اعتراف؟“ رافع یوں بنا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”کون سا اعتراف؟“ ہاشم نے پھر ایک دھمو کا اسے رسید کیا۔ رافع کراہ اٹھا۔

”اھ۔۔۔ کچھ نہیں یاد۔ ایسے ہی تجھے جھپٹ رہا تھا وقت تجھ۔ تو سچ سمجھ بیٹھا۔“

”اور جو میرے منہ سے کچھ نکل جاتا انا سیدھا۔ پھر؟ قبولیت کا وقت تھا۔“

”قبولیت کا؟“ رافع سوچنے لگا۔ ”قبولیت کا وقت تھا؟“

اسی لمحے کمرے میں حمزہ نے جھانکا اور اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

”حضرت۔۔۔ وقت سرا بندی ہوا چاہتا ہے۔ ابو جی دونوں ہاتھوں میں سرا تھا اسے دو لہا کے خنجر ہیں۔ تشریف لے آئے۔“

”س۔۔۔ سرا۔۔۔؟“ ہاشم کو جھٹکا سا لگا۔ ”یعنی کے سرا؟ میں سرا باندھوں تو پیس پر؟“

رافع اور حمزہ ہنسنے لگے۔

”وہ بھی نوٹوں کا۔ ہزار ہزار ایک نوٹ ہیں آپ کے سرے میں۔“ حمزہ پھر ہلکا ہلکا۔

”نوٹوں کا سرا۔۔۔؟“ ہاشم کو پھر کرٹ لگا۔ ”وہ خدا کے لیے بھائیو۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں ستر ہویں صدی کا

بکری نما دو لہا نہیں ہوں۔ اندھوں کی طرح کہاں ٹانگ ٹوئیاں ماروں گا؟“

کمرے میں رافع اور حمزہ کے قہقہے گونجنے تو علی اور رافع بھی چلے آئے۔

”تو بے فکر رہو۔“ حمزہ نے ہاتھوں میں ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خیر تک؟“ اس نے ابو جی سے کہا۔ ”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب یہ ہے۔ جب تک تو اپنے سہارے آپ چلنے کے قابل نہیں ہوتا تب تک یہ

”میں ہرگز سرا نہیں باندھوں گا۔“ وہ ہلکا۔ ”اور وہ بھی نوٹوں کا سرا۔“

”سوچ لے۔ آیا ابو کو غصہ آئے گا تو جو توں کا سرا باندھ کر لے جائیں گے۔ تو رافع نے دھمکایا۔

”اچھا۔۔۔“ وہ سہم گیا۔ ”پھر نوٹوں کا بانی کسی باندھے۔“ علی نے نوٹ ہوں گے اس میں لگس بھگ؟ ہنی

مومن کا بندوبست ہو جائے تو میں یہ قربانی بھی دے سکتا ہوں۔“

”صدمہ تو جاواں۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”بھائی جان۔۔۔ محتاط رہیے ہزار کا تو اس میں صرف ایک نوٹ

سے باقی سب پانچ کے نوٹ ہیں۔“

”پانچ کے نوٹ؟“ وہ چیخا۔ ”وہ تو کب کے متروک ہو چکے ہیں۔“

”تب ہی تو ابو جی نے نوٹوں کا سرا بنوایا ہے۔ صرف نوالی کے پیسے دیے ہیں انہوں نے۔“

”یا خدا۔“ ہاشم کو چکر آگیا۔ اسی لمحے باپتی کا پتی فردوس بیگم نمودار ہوئیں۔

”ارے بیٹا۔۔۔ سب کے سب ہی دو لہا بن رہے ہو کیا؟“ وہ حلقی سے بولیں۔ ”نیچے ہال میں ایک لڑکا نہیں جو

ہمارے کچھ کام آئے۔ اور ہاشم بیٹے اتیار ہو تو چلے آؤ۔ برات لے جانے میں اب کون سی کسر ہے؟“

”امی جی۔ میں سرا نہیں باندھوں گا۔“

”سرا۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”کون سا سرا۔؟ تمہارے ابا میاں نے تو صرف پھولوں کے ہار منگوائے

پس ہم کے لیے۔
ہاتھ لے غصے سے مٹھیاں بھیج کر مزہ کی تلاش میں اور حرا دھڑکھا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینک کی مانند
جانب تھا۔



اس نے اٹھنے کا لٹ پرل غراہ سوٹ پرنا تھا۔ لباس اس پر اس طرح سے سجا تھا جیسے اسی کے لیے بنا ہو۔
ڈرننگ روم سے نکلی اٹھنے ٹھک کر روک گئی۔
اس کے لانے سیاہ بل کر سے نیچے تک اپنی چھب کھلا رہے تھے گوری رنگت ذرا سے سبک اب سے دیکھ
انہی بھی سیاہ آنکھوں کو لانگوں نے نمایاں کر دیا تھا۔ نیٹ کا بڑا سا ہم رنگ لاپٹہ اوڑھے وہ کوئی مٹل شاہ زادی
لگ رہی تھی۔
"بی بی نل!" بے ساختہ ہی اٹھنے کے لبوں سے نکلا۔ "ریجہ ریجہ۔۔۔ یہ تمہی ہو نا۔" ریجہ شرابی لگی۔
"بس ایک لمبی ہے۔" اٹھنے اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

ریجہ اسے دیکھنے لگی۔
"بی بی لری کہ۔ گردن بھی خالی ہے اور کانٹوں میں بھی کچھ نہیں۔"
"اسی لیے میں اس کے لیے یہ لائی ہوں۔" منہ زور بیٹیم کی تار پڑھ لوں نہیں۔ ہاتھوں میں چو لری باکس
تھامے کمزری تھیں۔
"ریجہ تم یہ پہن لو۔ یہ میرا سچے سوٹیوں کا سیٹ ہے۔ تمہارے اس لباس کے ساتھ بہت اچھا لگے گا۔"
"اٹنی۔ لیکن۔۔۔" وہ چپک چپکی۔
"اور اب مجھے اسی کا کمر۔ میری بیٹیوں جیسی ہو تب۔" منہ زور بیٹیم نے دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں۔۔۔" وہ بھی قانٹ تیار ہو جاؤ۔ ہل چیتے میں بھی ناظم لگے۔
"بس اسی رنگ۔ میں یوں تیار ہو گئی۔" اس نے چٹکی بھائی۔
"یہ دیکھو۔ تمہارے کھڑی روٹی تھی۔ کبجیوں کی خوشبو اس کے ارد گرد بھری تھی۔ اس کا دودھ پھول بن کر کھلے
لگا تھا۔"



ناشر اندر داخل ہوتے ہی ٹھک کر رہ گیا تھا۔ سفید سوٹیوں کے کام والے فیوڈی لباس میں ملبوس ایڈن کی
آنچ چھب بی نرالی تھی۔ ناشر کو ڈرننگ روم کھیل کے آئینے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈن نے ایک بے
نیازی سے نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنی لب اسٹک درست کرنے میں مگن ہوئی تھی۔ کھلے ہوئے براؤن بالی اس کا
پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا بے پروا متنازل روپ بلبلی گرانے پر تان تھا۔
ناشر نے اس کے قریب آکر اسے کمر سے تمام لیا اور اپنا چہرہ اس کے شانے پر لگا دیا۔ ایڈن گڑبڑا گئی۔
"ناشر! ناشر! دروازہ کھلا ہے۔ کیا کر رہے ہو۔"
"ایسا کچھ نہیں جس کے لیے دروازہ کھلا جائے۔ یونہی قریب سے دیکھ رہا ہوں تمہیں۔"
آئینے میں اس سے لگا ہوا عمار کرتے ہوئے شوخ رہے مسکرایا۔

"اول ہوں۔" وہ کنہسیائی۔ "ڈرا دور سے دیکھو تو اچھا ہے۔ یہ میرا مہکمہ ہے۔ ابھی میرے ایک
انارٹ پر میرے بھائی بند آجائیں گے سمجھو۔"
"وہ فلف۔" وہ ہنس رہا اور قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ "یہاں مہکمہ ہے بھائی بندوں کا۔ ڈرا بااؤت۔ ہم نے
بھی کو قال نہ بلوالیا تو کھتا۔"

ایڈن نے بونٹ تاز سے ابھڑا حاکر اسے دیکھا اور سخت سے تاک مکوڑی۔
"اڑی پر آجائیں، ہم تو کو توکل بھی کچھ نہ کہا ہے۔ یاد رہے۔"
"اور ہم اگر خد پر آجائیں تو بھری محفل میں بھی منہ چوم لیں گے۔ تمہیں بھی یاد رہے۔"
"اوہ!" ان باتوں میں پکڑی لب اسٹک میز پر رکھ کر اسے مصنوعی حیرت سے دیکھنے لگی۔ "لا بچوں کی ماں کا منہ
ہوئے شرم نہ آئے گی آپ کو؟"

"اول ہوں۔ تم کو تو ہم کسی چار بچوں کی۔"
"ایڈن نے بیئر برش سے اسے لا تین ضربیں لگائیں۔ "جائو یہاں سے۔ مجھے تیار
لے جاؤ۔"
"بھائی! میں نہیں چیدا ہوتا!" اس نے طینان سے نفی میں سر ہلایا۔

ایڈن جبر زور توئی تب ہی ناشر کا مہر باکل بننے لگا۔ ایڈن سنتی ہی ناشر اٹھ کھڑا ہوا۔
"اگے تم جلدی تیار ہو میں ذرا خون سن لوں۔" ناشر نے کمر سے سے نکلا تھا۔ ایڈن دل ہی دل میں خدا کا شکر
اگر آتے دیکھنے کی جانب توجہ نہ ہوتی۔

"تم۔۔۔" وہ بھی کھڑے ہوئے۔ ناشر نے ناشر کے آگے آتے ہوئے لبی لبی توازن میں غرا
"تم۔۔۔" وہ بھی کھڑے ہوئے۔ ناشر نے ناشر کے آگے آتے ہوئے لبی لبی توازن میں غرا
"مرا۔۔۔" وہ بھی کھڑے ہوئے۔ ناشر نے ناشر کے آگے آتے ہوئے لبی لبی توازن میں غرا

"لیکن سمجھ پائی تب نا۔ کب آؤ گے؟"
"ابھی تو مینہ پڑا ہے تم آرام سے رہو۔"
"آرام؟ تمہارے بغیر؟ NO!"
"کچھ نہیں ہو سکتا۔" ناشر نے رخ سے بولا۔
"میں کچھ نہیں چاہوں؟" وہ فراخ دل سے بولی۔

"نرا! ناچ کر بولا۔" اپنے حواسوں میں رہو اور یاد رہے اب فون مت کرنا۔ "وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔
"بائٹے سے علی اور ناخ آ رہے تھے ناشر نے فون آف کر کے جب میں ڈالا اور مسکرائے لگا۔
"بلیس ناشر بھائی! بارات بالکل تیار ہے۔ دو لہا ایک دم دیڈی۔" ناشر بولا۔
"بل۔۔۔ میں ایڈن کو لے کر آتا ہوں۔" وہ جلدی سے کمرے کی جانب مڑ گیا۔



ات است شین سے اتری تھی اور باٹھم بے حد اربن لیے گاڑی سے باہر آیا تھا۔ رنگ بوا کا بچب ساں تھا۔
"میری ہمار تھی۔ مسکرائے جھللاتے چہرے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔
۔۔۔ اور اٹھنے خواتین کو گھر سے چڑا کر رہی تھیں۔ تب ہی ایڈن سے کوئی مشورہ کرتے رہنے کی نظر اس کی

جانب انھی تھی سو چند لمحوں کے لیے تم ضم سا ہوا۔
 ”لیکن بھائی صاحب کو ہوا کیا اچانک؟“ ایقان کچھ بھٹا کر پوچھ رہی تھی۔ رافع چونکا اور جلدی سے
 کھٹکھٹا رہا۔

”پتہ نہیں۔۔۔ وجوہات کا علم نہ ہو سکا لیکن اصرار میں بے حد شدت ہے۔۔۔ دادی جان راضی ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ اماں بھی مان گئیں؟ اور اصل باری؟ اس سے کسی نے پوچھا؟“

”اب جان اور تایا اب اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”نکال ہے! کوئی تک ہے بھلا۔“ اس نے خفگی سے سر جھٹکا ”اب میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”آپ سے انہوں نے عریضہ کو سمجھانے کے لیے کہا ہے۔۔۔ بلکہ بتانے کے لیے۔“

”یا اللہ!“ اس نے سر تھام لیا۔

”قاضی صاحب کو میں لے کر آتا ہوں آپ اسے بھی وہاں لے آئیں۔“

وہ کہہ کر آگے بڑھا۔ تب ہی اس نے پھر ایک اچنتی سے نظر اس پر ڈالی تھی۔ مسکراتی ہوئی ریجہ بھی کسی سے

بات کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رافع کو متوجہ پا کر اس کی نظریں فوراً جھٹک گئیں۔

ڈرننگ روم کے قریب آدم اینے میں شہلا کو اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ موو اور لکھن گرین کامبی نیشن کے

غریب سوٹ میں اپنے اپنا آپ اجنبی لگ رہا تھا۔ یہ وہ شہلا تو نہیں تھی جسے وہ اب تک دیکھتی آئی تھی یہ تو کوئی اور

UrduPhoto.com

ی تھی۔

اجنبی سا چہرہ!

اجنبی سی سوچ!

اجنبی سی راہیں!

سب کچھ کسی سے ادھار مانگا ہوا لگ رہا تھا۔ دم صم سی بیٹھی تھی جب پرواہ بکھلا اور بلخاری ہوئی۔ ایقان

دورہ ثانیہ غذرا بیگم ہنستی مسکراتی اندر پہلی مٹکی بٹھیں۔ شہلا کی نظریں جھٹک گئیں۔

”ہائے سہلی۔۔۔ سن تو بیچانی نہیں جا رہیں۔“ ایقان نے اسے گد گدایا ”وہ میری سادگی اور متانت کا نمونہ

بنے رہنے والی دوست کہاں ہے؟“

شہلا دھیرے سے مسکرا دی۔

”خیر خیر۔۔۔ مجھے اس کی کچھ ایسی تلاش بھی نہیں۔ یہ نئی دوست مجھے زیادہ بھائی ہے۔ خدا کرے کہ ہمیشہ

حمیس ایسا ہی سجا بنا مسکراتا دیکھوں۔“

ایقان نے اس کا گال چوم لیا۔ شہلا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سب کی نظریں اس کے اس انمول روپ کو سراہ

رہی تھیں۔

تب ہی دروازہ کھلا اور فردوس بیگم عریضہ کو لیے چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی رقم تھی عریضہ کا چہرہ از حد تپا

ہوا تھا۔ شہلا کے دم صم سروں میں کیسے گئے سلام کا بھی وہ جواب نہ دے پائی تھیں۔

ایقان اور غذرا بیگم نے ایک دوسرے کو بے بس نظروں سے دیکھا۔ دورہ ثانیہ نظریں چراغ لگیں۔

اسی لمحے رافع اور عاشر قاضی صاحب کو لے کر وہاں چلے آئے تھے۔ پیچھے عباد اور فراز تھے۔ خواتین دور دور ہو

گئیں۔ فردوس بیگم نے عریشہ کا بازو پکڑ کر اسے شہلا کے قریب بٹھادیا اور اس کا دوشہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ سب دم بخود تھے۔

قاضی صاحب نے شہلا سے ایجاب و قبول کروایا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ مبارک سلامت ہوئی۔ پھر وہ عریشہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

”عریشہ بی بی! آپ کو بخوش پچاس ہزار روپے سکہ رائج الوقت میاں تاج الحق حسن ولد سلجوق حسن کے نکاح میں آنا منظور ہے؟“

عریشہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ ایتقان اور وردہ نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شہلا متعجب تھی۔

قاضی صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔ تب اس نے کاش وار نگاہیں اٹھا کر بے خونی سے عباد کے پہلو میں کھڑے فراز کو دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے سینے پر بازو لیٹے بے نیازی سے کھڑا تھا اور اپنے جوتوں کی شیب پر غور کر رہا تھا۔ عریشہ کے سینے میں سانس اٹکنے لگی۔

”بی بی! جواب دو۔“ قاضی صاحب نرمی سے بولے۔

”ہاں!“ وہ چٹختی۔ ”منظور ہے، منظور ہے، مجھے ہر شے منظور ہے۔“ قاضی صاحب قدرے بوکھلائے۔ حتیٰ کہ بے نیازی سے کھڑا فراز بھی بے طرح چونکا۔

”ادھر دستخط کرو بی بی!“ قاضی صاحب نے جیسے اس کے رویے پر غور کرتے ہوئے کاغذات آگے بڑھائے تھے۔ اس نے جھپٹ کر ان کو ہٹا دیا۔

”اس نے جھپٹ کر ان کو ہٹا دیا۔“ قاضی صاحب نے جیسے اس کے رویے پر غور کرتے ہوئے کاغذات آگے بڑھائے تھے۔ اس نے جھپٹ کر ان کو ہٹا دیا۔

”اس نے جھپٹ کر ان کو ہٹا دیا۔“ قاضی صاحب نے جیسے اس کے رویے پر غور کرتے ہوئے کاغذات آگے بڑھائے تھے۔ اس نے جھپٹ کر ان کو ہٹا دیا۔

عریشہ کے اصرار پر حمزہ اسے گھر چھوڑ آیا تھا۔ تھوڑی بہت بد مزگی جو چند افراد نے محسوس کی تھی وہ کچھ ہی دیر میں ماحول کی ست رنگی اور تازگی میں کھو گئی تھی۔ سب ہی نے ہاشم میاں کی بے پناہ خوشی اور مسرت کو محسوس کیا تھا اور نئے جوڑے کے لیے دعاؤں کی پھینکیں۔

وقت رخصت شہلا کی مثلاًشی نظروں کا عندیہ پا کر انہی چپکے سے اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

”عمر کو فراز کے ساتھ مصروف کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں اسے صح ضرور لے کر آؤں گی۔“

اس کی سرگوشی شہلانے اور شہلا کے عین عقب میں موجود ہاشم نے بھی سنی تھی۔ انہی کی بات پر شہلا بے اختیار ہی رو پڑی تھی۔ پھر منیذہ بیگم، عباد اور پھر بیچہ سے گلے لگ کر وہ سسکتی ہی رہی۔

ہاشم نے قدرے پیچھے ہو کر برابر کھڑے رافع کے کان میں کچھ کہا۔ رافع خاموشی سے مڑ گیا تھا۔ پھر جی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر شہلا زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہو گئی۔



کر شل کا گلدان زور سے ڈرنسک ٹیبل کے آئینے سے ٹکرایا۔ گلدان وہ میز اور پھر فرش پر گر اور چکنا چور ہو گیا۔ آئینہ چٹ کر کئی حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پھر شیشے کا گھاسا تاج محل دیوار پر لگا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ چینی کی گڑیا، پلاسٹر آف پیرس کا مجسمہ اور ایسے ہی کئی شو پیس کمرے میں ابھرے اور ہر جا کر گرے اور انجام کو پہنچتے گئے۔ اس کے بعد بستر کے تکیے، بیڈ شیٹ، میک اپ کا سامان، سی ڈیز، کتابیں غرض کہ کچھ بھی اس کے خون اور وحشت سے محفوظ نہ رہ پایا۔ ایک کے بعد ایک وہ ہر چیز کو توڑتی اور بھیرتی چلی گئی۔ ایک عالم جنون تھا جو اس برطاری تھا۔ اس کی روح کسی ناویدہ قوت سے مصروف جنگ تھی۔ وہاں تو شاید کہیں تھا ہی نہیں، صرف اور صرف وحشت کا راج تھا۔

پھر اس نے چیخ چیخ کر رونا چاہا مگر اس کی آواز گلے سے نکل نہ پائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ گونگی ہو گئی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے دکھنا چاہا مگر اسے کچھ بھائی نہ دیا۔ غم وغصے کی بے پناہ شدت نے شاید اسے اندھا بھی کر دیا تھا۔ اس نے خود کو آواز دینا چاہا لیکن اسے اپنی ہی بیکار کا جواب نہ مل سکا۔ وہ شاید خود سے بھی بچھڑ گئی تھی! وہ دنیا میں بالکل اکیلی۔ اندھی، بھری اور گونگی ہو گئی تھی۔ اس سوچ نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ پٹی پٹی آنکھوں سے گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو پکارنے لگی، غبار بیٹھنے لگے، وحشت شانت ہونے لگی، جنوں رخصت ہونے لگا۔

عریضہ تھک کر کمری گہری سانس بھرنے لگی تھی۔ اسی لمحے شہنائیوں کی آواز سے گھر کے در و دیوار گونج اٹھے۔ بارات دلن کو لے کر آجی تھی۔

شہلا کو ماہرین کے مطابق یہ ایک بڑا بڑا شہلا تھا۔

دن بھر رافع، نافع، منہ علی اور خود ہاشم میاں بھی کمرے میں موجود رہے تھے اور اب وہ لوگ بلان کی محنت کو ناستا نشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ بیڈ کے پتوں بیچ گلاب کی سرخ، نرم پتیوں سے بڑا ہلال بنایا گیا تھا۔ جبکہ بیڈ کے چاروں جانب گلابی اور نارنجی پتوں کی لڑیاں تھیں۔ کمرے میں جا بجا گلاب بیڈ تھے جوئے تھے جن کی محک سے ماحول میں حسن، محبت اور انتظار کی سب سے قیمتی نمایاں تھیں۔

ایقان اور ماہرین سحر انگیز ماحول کو زیادہ دیر نہ نہ پائیں۔ وہ شہلا کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئیں۔ یوں بھی لڑکے لڑکیوں نے چمت بررت جگے کاروگر اس پر بنایا ہوا اٹھا اور ان کا خوب خوب ہلا گلا کرنے کا پروگرام تھا۔ شہلا ایک نامعلوم سی کیفیت کا شکار تھی، بھاری بھاری سے پونے اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سب ہی کچھ محبت کی طرح خوب صورت تھا۔

تب ہی دروازہ ٹھلنے کی آواز پر وہ چونکی تھی۔
 ”مما۔۔۔“ چمکتی ہوئی آواز سن کر شہلا کا اپنا دل بھی جیسے چمکا تھا۔
 سامنے عمر کھڑا تھا۔ شہلا کی آنکھوں میں بے ساختہ جھک نمودار ہوئی تھی۔
 ”عمہ۔۔۔“ انتہائی حیرت اور مسرت سے اس نے کہا تھا۔
 وہ دڑکرا اس کے قریب آ بیٹھا۔
 ”واؤ ممما! سب کچھ زبردست ہے۔ اب ہم یہاں سو یا کریں گے؟“

ارے نک نیکل کے آئینے کے سامنے وہ قدرے گم صم سی بیٹھی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی اسے جھپٹ کر خود میں واپس آئی۔ لیوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجائے فریش فریش سا ہاتھ ہاتھ گاؤں لگا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے بالوں میں چلاتے ہوئے وہ اس کے عقب میں آگھڑا

”ما بھی خاموشی سے برش کرنے لگی تھی۔ ہاشم نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو بغور دیکھا۔ لائٹ ریٹ کے لباس میں وہ بے حد سادگی کے عالم میں بھی عجیلیں گرا رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی بدلی نے اس کے منہ پر اپنے کو مزید جاذبیت بخش دی تھی۔

”ٹانوں میں میرے کتے تھے تو بڑے دنگ رہے تھے۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر شہلا نے خاموش نظریں اٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا پھر ٹپکلیں گرائیں۔

”کیا بات ہے شہلا۔“ ہاشم قدرے عجیب کر بولا تھا۔ ”مگر بڑے اس پردے کو درمیان سے ہٹا کیوں نہیں آتیں تم؟ کھل کر مسکراؤ۔“ کھل کر کھینچ کر کھل کر اپنی لگو۔ یہ کیا کہ بے غمی کی ہر چادر تم ساتھ ساتھ لیے چلی آئیں۔“

وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے آیا تھا۔ شہلا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ہاشم بھی بے ساختہ ہی سیدھا ہوا تھا۔

”دوست“ شہلا نے کہا۔

”اچھا!“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”دوست ہوئی ہے؟“

ابھی شہلا کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر بج بج دنگ ہوئی۔

”بھئی!“ ہاشم دھیرے دھیرے ہنس رہا۔ ”میں کچھ زیادہ ہی بے خود ہو گیا تھا شاید۔“

ہاشم دروازے کی جانب بڑھا تو شہلا نے خود کو کیڑا کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگاتے تھے۔ دروازہ کھلنے پر باہر کھڑے کئی افراد نے مسکراتے اندر آئے۔ ان کی رہنمائی میں انفقہ ربیعہ، عمر عباد کے علاوہ ناعمہ، وردہ، ثانیہ اور سدرہ بھی تھیں۔ لمحہ بھر بعد ہی سب ہی چمک رہے تھے ہنس رہے تھے۔ شہلا عمر کیوں ساتھ لگائے بیٹھی تھی جیسے برسوں بعد ملی ہو۔

”فرزاد بیگم نے کمرے میں جھانکا۔ ان کی سب سے پہلی نگاہ شہلا اور عمر پر ہی پڑی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے چہرے پر نہایت بد مزگی کے آثار است ابھرے۔ شہلا بھی اتفاقاً ”ان کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ قدرے خفیف سی ہوئی۔

”ای جی۔۔۔ آئیے نا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں۔“ ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی جانب بڑھا۔

”ہم باہر ہی بھٹکے قی دھرنے کی جگہ نہیں اندر۔“ وہ بے زار سے لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”اے ماہین۔۔۔ یہاں بیٹھی ہنس مذاق کر رہی ہو! باہر ناشترہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ دلہن کی بہنیں جو سامان لائی ہیں وہ بھی ویسا ہی پڑا ہے۔ چلو ذرا ناشترہ لگواؤ۔“

ان کے بیزار لہجے اور کرخت آواز نے لمحہ بھر کے لیے گل دگزار ہوئی محفل کو سراسیمہ سا کر دیا تھا۔ سب ہی خاموش ہو کر رہ گئے۔ ماہین خجل سی ہو کر انہی تو در در اور ثانیہ بھی جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹانے کے خیال سے کھڑی

ہو گئیں۔

”اویا سہ ذرا رافع کی خبر لیں۔“ ہاشم نے عباد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے بغیر ہر محفل کچھ ادھوری سی لگتی ہے۔“

عباد فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ ناعمد اور سدرہ بھی ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کمرے میں اب صرف شہلا، انیقہ اور ربیعہ ہی رہ گئی تھیں۔

”ایا سہ کیا رائے ہے دو لہما بھائی کے بارے میں؟“ انیقہ نے مسکراتی نظروں سے شہلا کو دیکھا۔ وہ رسائیت سے مسکرا دی تھی۔

”رائے اگر اچھی نہ ہوتی تو ہای کیوں بھرتی میں۔ ظاہر ہے رائے تو شروع سے ہی اچھی ہے۔“ وہ عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”اور ان کی رائے آپ کے بارے میں؟“ اب ربیعہ کی باری تھی۔ ”منہوں نے کیا بتایا آپ کو؟“

”کیا جانا چاہتی ہو تم دونوں؟“ شہلا نے دونوں کے کان پکڑ لیے۔ ”اب کیا میں لفظ بہ لفظ ان کی باتیں دہراؤں؟“

دونوں ہنسنے لگیں۔ عمر حیران لگا ہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”مما۔۔۔ اب آپ یہاں رہیں گی؟“ بالآخر اس نے جلد ہی وہ سوال پوچھ لیا جو وہ جملہ نے کب سے لبوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

”عمربہ۔۔۔“ نے بار بھری سرزنش کی۔ ”میں نے آپ کو کیا سمجھا یا تھا؟ اب بھول گئے ہیں؟“

”نہیں تو۔۔۔“ نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”اب آپ کو کیا سمجھا یا تھا؟ اب بھول گئے ہیں؟“

اس کی صورت دیکھ کر ربیعہ اور انیقہ کو ہنسی آئی جبکہ شہلا سنجیدہ سی ہو گئی تھی۔ اسی وقت دروازہ کمرے میں آئی تھی۔

”اب لوگ آجائیں۔۔۔“ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ انیقہ اور ربیعہ سے مخاطب ہوئی پھر اس نے شہلا پر نظر ڈالی۔

”شہلا بھائی۔۔۔ آپ کا اور ہاشم بھائی کا بیٹھنے میں بیٹھ لے آئی ہوں۔“

”نہیں ورنہ۔۔۔“ شہلا جلدی سے کھڑی ہوئی۔ ”میں اور ہاشم آپ سب کے ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“

وہ مسکرا دی تھی پھر اس کی ہمرای میں وہ تینوں کمرے سے نکلی تھیں۔

ڈانگنگ ٹیبل کے آس پاس مزید کچھ کرسیاں لگا کر سب کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ یوں بھی خاندان کے بڑے اپنے کمروں میں ہی تھے۔

”آپ ادھر بیٹھیں شہلا بھائی۔۔۔“ رافع جو ہاشم کے برابر والی کرسی پر بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا اسے سامنے بیٹھتے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں رافع۔ آپ بیٹھیں۔“

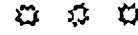
”پلینر۔۔۔“ رافع مصر تھا۔

شہلا جھکی جھکی ٹنٹریں لیے ہاشم کے برابر آئی تھی۔ رافع وہ سری کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے پھر چونک اٹھا تھا۔ اس کی نظر ربیعہ پر پڑی تھی۔ وہ چند لمحے بے اختیار اس سے دیکھا رہ گیا۔ دفعتاً ”ہاشم کھانکھارا۔“ رافع چونک اٹھا پھر وہ ادھر ادھر دیکھا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

”عمر شہ لہاں ہے ماہین آئی؟“ دلہتا“ انقلہ کو خیال آیا تھا۔ ”ہم تڑا سے اکل کی مبارکباد دینا چاہتے ہیں اور وہ ہے کہ سلیمانی ٹولہا بہن کر بیٹھ گئی ہے نہ لہا۔“

”وہ ہاں وہ دراصل۔ بعد از اس سے اٹھتی ہے۔“ ماہین سے بات پانے سننی تو جریز ہو کر رہ گئی۔

”دہ اور ڈانہ کی کٹاں چار ہوئیں پھر وہ نول سے ہی ٹھنڈی سانس بھری تھی۔“



”عباد بھائی!“ ریبہ نے بولے سے دھمک دے کر کمرے میں جھانکا۔ ”میں آج ہوں؟“

عباد کا تیزی سے چلا ہوا قلم رک گیا۔ اس نے مرکز دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے خوش حال سے مسکرایا۔

”آؤر بیہ۔“

”آپ مصروف نہیں؟“ اس نے اس کے سامنے بھلے ہوئے کا انداز سے ڈھک کر دیکھا۔

”کچھ ایسا خاص نہیں۔“ اس نے ریبہ کو سامنے بیٹھے ڈاڑھا کیا۔ ”کھو گئی پرانہ ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ وہ بیٹھت سے مسکرائی۔ ”میں تو آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں عباد بھائی!“

”آپ سب میری زندگی میں بھائی نہیں فرشتہ بن کر آئے ہیں۔“

ریبہ کی نظریں جھک گئی تھیں اور جیسے پر احسان مندی کے جذبات سے بھر پور تھے۔

”اے گاؤ!“ عباد نے مصروفی سے اسے دیکھتے ہوئے اور مسکرایا۔ ”اگر تم صرف یہی بات کرنے آئی ہو تو

یقین مانو میں سب معمول ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اس کے علاوہ یہ کہ میں نے تم سے کچھ بات چینی کرنا چاہتی تھی۔ اگر آپ میرے

ایڈیشن پورے ہوئی میں کو ادب کرتا۔“

”اے ہائے!“ سب کی باتوں میں کھل کر مسکرایا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات سوتی ہے تمہارے میں خود بھی نہیں چاہتا

کہ تم کمرہ میں فضول سوچوں سے اچھوٹی رہو۔ میں کئی گنا ضرور تم سے فائدہ مند بن کر رہا ہوں۔ تمہارا ایڈیشن

ہو جائے گا۔ ہاں سبیکس۔“ وہ بولے کے بارے میں بے ہار تھا۔

”عباد بھائی۔“ ریبہ کچھ ہنسنے لگی تھی۔ ”ایک بات اور۔“

”ہاں ہاں بولو۔“ جیسے گھبراہٹ سے ریبہ نے کہا۔ ”میں نے تمہیں بہن کا نام نہیں دیا۔ دل سے سمجھا

بھی ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔“

ریبہ کی پکوں پر موتی چمکنے لگے تھے۔ اس نے احسان مندی کے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا۔

”عباد بھائی۔“ پہلی اکثر لوگ مجھ سے میرے ماسی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ میں سب میں

سمجھ نہیں پاتی کہ انہیں کیا جواب دہی۔ آپ سب مجھے بتائیں کہ آپ نے میرے بارے میں سب سے کیا کہا

ہے یا یہ کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔“

”ریبہ!“ ایک بات یاد رکھو۔“ عباد چہن رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”میرے بارے میں اتنا زیادہ کافنس

ہونے کی ضرورت نہیں ہے جس سے تم کو بھی ہو اپنا حالہ آپ ہو۔ کوئی دوسرا شخص تمہاری ذات کا حالہ نہیں

بن سکتا۔“ وہ بولے کے لیے سانس لینے کو رکھ رہا تھا۔

”دوسرے یہ کہ میں نے تمہارے بارے میں سب کو مرلہ بتایا ہے کہ تم میرے ایک عزیز جان دوست کی

بہن ہو جو کچھ عرصے کے لیے تمہاری ہمدردی کا وارڈ بننے سوچ کر گیا ہے اور میں۔ تم سے کوئی کچھ پوچھتے تو نہیں کیا

کہتا ہے کہ بھائی کے سوا دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ دیکھو ریبہ! دنیا کو بات سے بات نکالنے کی اور کھونہ اور

کھونج کی عادت ہوتی ہے۔ تم خود کو جتنا پردوں میں چھپاؤ گی۔ دوسرے دنیا ہی تمہارے بارے میں تجھ سے نہیں

کے۔ لہذا اگر تمہاری ہے کہ تم خود کو دوسروں سے الگ رکھنے کی یا چھپانے کی کوشش ہی نہ کرو۔ دوسروں کی پروا کرنا

ہموند نہ دوسرے تمہاری پروا کرنا چھوڑیں گے۔ رائے!“

ریبہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور اب میرے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ”تمہارے میرے سر میں درد کوا

ہے۔“

ریبہ دھیرے سے ہنس دی اور انھو کر کمرے سے نکل آئی۔ کچن میں آکر وہ چائے کے برتن نکالنے لگی۔ اس کا

ذہن شملہ کی شادی کی وجہ سے بٹ گیا تھا لیکن اب بچہ سوں سے فاصلہ ہو کر وہ مسلسل اس گھر کے حقیقی سوچ رہی

تھی۔ خیال میں وہ اپنے قیام کر کے اپنا سکہ، زمین عمارت کر کے چلی آئی تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پر ہمیشہ کی

رہتی تھی۔ یہاں پر زمین کے بھر بھرے تھے۔ زمین کی مٹا مسکراہٹ تھی۔ تصور کی حرص سے چلتی آتھیں

تھیں۔ معمول کی گشت گنج اور دینا تنیم کی آوارہ ہوتی نظریں۔ اور ان سب سے پرے سب سے الگ ترائی کی

گرہم جوش اور پر خلوص محبت کے مناظر تھے۔ ریبہ ترائی کو شدت سے یاد کر رہی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی

تھی کہ اس کی چلے جانے کے بعد اس پر کتنی بوجھ کچھ جاننا چاہتی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں غمگین ارادہ کیا کہ بات کو وہ ضرور چلوے کہے گی کہ اسے عید الباری کا نمبر اپنے

معاہدے سے ملاوٹ نہ ہو۔ وہ کمر کا فنڈ باندھ کر اپنے گھر پر گریز کر رہی تھی کہ کہیں انقباضیت نہ ہو کہ کوئی غلط خیال نہ

کرے۔ اور وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سب سے اچھا اور چلوے کرے کی سمت بڑھتی تھی۔



دلوں باندھنے کی صورت سر کے نیچے پرے رہے۔ بستر چت لیتا ہوا تھا۔ سی ڈی پلیئر پر ہم سوں میں نور

جہاں کی سترم توازی میں ”دل دھڑکنے کا بیجا آقا“ چل رہا تھا۔ ذہن کے پردے پر کچھ مناظر متحرک تھے۔

اسے بوشیرو شیک لڑکی کا حورنہ بھونٹ تھی جو ایک روز بڑے دھڑلے سے اس کی گاڑی کا دروازہ کھول کر

لوں بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھنے کی زاتی گاڑی ہو اور وہ اس کا ڈرائیور۔ سارا راستہ وہ بیک و فوروٹ میں اس کے

گھونپے گاڑی میں لگا ہوں سے کھارہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ ذرا سی دل لگی لڑکی گئی میں تبدیل ہو جائے گی پھر فون

پر اس کا وہ شریا شریا۔ سیم لہو۔ بچوں کی سی باتیں اس لڑکی کو شاید خبر نہ تھی کہ اس کا پورا راسخا کھیل کسی کے

دل کی دنیا کا سکہ چھین کر ہلا کر ڈالے گا۔

فرزاد اپنے جذباتوں میں سنجیدہ ہو چلا تھا اور وہ۔ وہ شخص ایک کھیل کھیل رہی تھی جس سے دل آہن جانے پر اب

وہ اسے پہچاننے کی بھی راہ نہ تھی۔ کتنی یاد نکرائی تھی اور ہر بار اس کی نظریں میں بے نیازی کی کیفیت تھی۔

فرزاد نے کئی بار اسے مخاطب کر کے دیکھا تھا اور ہر بار وہ کئی کترا کر نا آشنا ہی بن کر گر رہی تھی۔

”تمہارے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ دکھ سے بیڑیا۔ ”میرے جذبے اتنے ازلوں تو نہیں تھے کہ تم

انہیں پورے دھڑک رہی ہو۔“ تاکہ تم کو بھی مل کر اتنی ہی عزیز تھی ہو۔ جتنی کہ کل لیکن خود کی نا اہلی کی وجہ سے

دلی کی کچھ سزا بھی تو ہونا چاہیے تھی۔ سزا جس نے کی ضرورت تھی۔“

وہ جلتی آنکھوں پر بازو دکھ کر دکھ کر شہت کو کم کرنے کی کوشش کرتے لگا تھا۔

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ایقان کو پہلے پہل نیند میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کسسا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔
عاشق کے موبائل پر مدھم مدھم سروں میں بیج بج رہی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر گہری نیند سوئے ہوئے عاشق کو دیکھا پھر
ہاتھ بڑھا کر اسے جگانا چاہا مگر کسی عاشق نے خود جاگ گیا تھا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایقان نے پھر آنکھیں موند لیں۔
”ہیلو“ عاشق کی مدھم مدھم لیکن قدرے خفا خفا آواز آئی تھی۔

نجانے کیوں ایقان کی سوئی ہوئی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ عاشق مزید کچھ بات کیے بغیر اٹھا اور ڈرننگ روم میں
گھس گیا۔ وہاں سے اس کے مدھم مدھم ہونے کی آواز آرہی تھی لیکن ایقان کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔
چند لمحوں بعد وہ بے حد تیزی سے باہر آیا تھا۔ اس کی نظریں جاگتی ہوئی ایقان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ عاشق
ٹھٹک گیا۔

”کیا بات ہے عاشق! اس کا فون تھا؟“ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”کسی کا نہیں تم سو جاؤ۔“ وہ سیلینگ سوٹ کے ٹخن کھولنے لگا۔ ”میں ذرا ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔“
”ایئر پورٹ؟“ وہ نہایت حیرانی سے بولی۔ ”خیریت؟“
”ہاں خیریت ہے ایک دوست کی فیملی پہنچ رہی ہے۔ اسے گھر تک ڈراپ کرنا ہے“ اسی کا فون تھا۔“
”تمہیں چاہئے بناؤں؟“ وہ بستر پر اتر آئی۔
”نہیں۔“ وہ شرٹ پہننے لگا۔ ”جما لینڈ کر چکا ہے دیر ہو جائے گی۔ میں چاہئے ایئر پورٹ پر ہی بیٹھوں گا۔“
”ہوں۔“ اس نے مدھم مدھم سروں میں کہا اور اس کی غلٹ بھری حرکت دیکھنے لگی۔
عاشق رانچ منسٹ میں تیار ہو گیا تھا۔ اس نے کم صم سی ایقان پر ایک نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے اس کا کال
تھمتھمتا یا۔
”ڈونٹ وری ڈرنک۔“ میں کھنڈہ ڈیرہ ٹھٹھٹھ میں لوٹ آؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔“ ایقان نے اثبات میں
سر ہلایا۔ عاشق تیزی سے باہر نکل گیا۔



وہ برہم برہم سا کارڈ اسٹو کر رہا تھا۔ ”خدا ہنڈھڑا دیتی نظروں سے اچھلتا تھا بڑھا کر اس کا کالر کھینچا۔
”اے مسٹر! میں تمہاری جدائی میں بے تاب ہو کر یہاں تک چلی آئی ہوں اور تم ہو کہ ٹھیک سے بات تک
نہیں کر رہے ہو۔ یہی صلہ ہے میری بے تابیوں کا تمہارے پاس؟“
عاشق نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

”تمہاری اس حرکت سے میری ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے لڑا! تمہیں احساس نہیں؟“
”اے ڈونٹ وری۔“ وہ اطمینان سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ”میں تمہاری بیوی سے کوئی مناظرہ
کرنے کے ارادے سے نہیں آئی پھر بھلا تمہاری ازدواجی زندگی کس طرح متاثر ہونے لگی؟ ہر سال لاکھوں سیاح
تمہارے ملک میں گھومنے پھرنے کے ارادے سے آتے ہوں گے۔ ایک میں بھی ہوں۔ تم کس بات کی فکر میں پڑ
گئے؟“

”وہ لاکھوں سیاح ہر گھنٹے بعد میرے سیل فون پر کل نہیں کرتے۔“ اس نے نوانت پیسے۔ ”تم سب کچھ سمجھ کر
بھی کچھ سمجھنا نہیں چاہ رہی بات یہ ہے۔“
لڑائے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور دلکش انداز میں مسکرا دی۔

"تمہاری بے بسی مزید سے رہی ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔ "جہاں میں تو تم قابو میں آکر نہیں دیتے تھے۔ میں نے اچھا کیا جو یہاں تک آئی۔"

وہ کار سے باز دیکھنے لگی۔ "مگر کی نرم و صوب بلند گلوں کے اوپری حصے سے نیچے اترنے کی تیاری میں تھی۔ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے ہیں یا پھر سیدلی ہی اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ محل میں صبح کی مخصوص پُرجوش چل چل تھی۔ گاڑی ایک نایاب اشار ہو بل کے احاطے میں جا کر رہ گئی تھی۔"

بادور دی زبان نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔
"تم چلو۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔" غاشر نے اسے ایک نظروں پر کرکھا۔
زرا حشر کر سہلا کر اترتی تھی۔

"میلو۔ نیلو۔ باری بھالی؟ میں مزید بات کر رہی ہوں کراچی۔" وہ لان میں بیٹھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"اگر مزید کسی ہو تو؟" عبدالباری اس کی توازن کر دیتا تھا۔ "خوش ہوا تو ہے۔"
"میں بالکل ٹھیک ہوں بالکل خیریت ہے۔" وہ اپنے ترانہ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ "کسی ہے نہ ٹھیک تو ہے۔"

عبدالباری چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔
"میلو۔" مزید بے آبی سے بولی۔ "باری بھالی۔"
"ہاں مزید۔" پھر وہ بولا۔ "سب ٹھیک ہے تم بے فکر۔"
شکایت ہو تو سب سے پہلے مجھے فون کرنا۔

"باری بھالی! مجھے ترانہ کے بارے میں بتاؤ۔" وہ بے تابی سے بولی۔
باری کے لیے سے اتنا انداز تو ہو ہی گیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ وہ خاموش سا لگ رہا تھا۔ مزید کے
دل کو کچھ ہونے لگا۔

"ترانہ ہسپتال میں الٹ مٹ ہے۔" عبدالباری دھیرے سے بولا۔ "اسے خود چیک ڈاؤن ہوا ہے۔
تمہارے چلے جانے کے بعد گھر والوں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ اسے" وہ بول رہی تھی۔
بھی اتنا کچھ بڑا شہنہ کہا تھا۔"

مزید کے ساتھ چل رہی ہے گویا جان نکل گئی۔ چند لمحوں کے لیے گویا اس کے دل نے نو حشر کنا پھوڑا تھا۔ باری
کوچہ پر اس کے کچھ کئے کا حشر ہا پھر بولا۔
"تم فکر مند مت ہو ریدھا! آزمائش کے یہ چند دن ہی ہیں مگر جانتیں گے ان شاء اللہ۔ جو کچھ بھی ہو گا ہمارے
حق میں بہتر ہو گا۔"

"باری بھالی۔" میری کسی طرح ترانہ سے بات ہو سکتی ہے؟" وہ گویا کہیں سے بولی۔
"شکل ہے۔" میرا خورہ پہلے نہیں ہے۔ آفس والوں کے ذریعے اس کی خیریت پتا چلتی رہتی ہے۔"
"تجربہ ہو سکے تو اسے میرا سلام پہنچا دیجئے گا۔" وہ آزدگی سے بولی۔
"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔" وہ بولا۔
"خدا حافظ۔" مزید نے جھکے ہوئے انداز میں موبائل آف کر دیا۔ اس کے ذہن میں پھر سے نئی مناظر دیاں

ہو رہی تھیں۔

شمالی اُتلی تھی۔ مگر میں گویا خوشیاں خوشی کی صورت اترتی ہوئی تھیں۔ اللہ ربیعہ، عمر منیرہ، بیگم سب
اس سے کھڑے میں لیے بیٹھے تھے۔

"سب لوگ کیسے ہیں وہاں اپنا؟" اللہ، خوش و خوش سے پوچھ رہی تھی۔ "جب تک کی اور ایقان پانی کی
مرت اوستی تھی تب تو مجھے وہ گھر بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے سارے لوگ اتنی دھیر ساری روئیں۔ اتنی چل

پہل۔ سب کچھ کتنا اہل کرتا تھا۔ اب جہاں کا ماحول کیسا ہے؟"
"دور کے ماحول سامنے" شمشاد میرے سے ہنس رہی۔
"کیا مطلب؟" سب کسی کان کھڑے ہو گئے۔

"میں نے سوچا ہے کہ اب سب کے سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔ ان مغللوں کا ان دنوں کا تو اب
زور ہے۔ وہ تو اپنی زندگی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں دورہ ستا چکی
لڑکی ہے وہ اکثر مجھ سے ملتی رہتی ہے۔" اللہ نے جلدی سے پوچھا تھا۔ "وہ تو مجھے عجیب سے بھلی سی لڑکی لگتی ہے۔ اپنے قب میں گم۔"

"دور عرش؟" اللہ نے جلدی سے پوچھا تھا۔ "وہ تو مجھے عجیب سے بھلی سی لڑکی لگتی ہے۔ اپنے قب میں گم۔
نہ کسی سے کہہ لیانا نہ وہاں شادی کے ہر ایک میں میں محتاج تھی۔"

"عرش؟" شمشاد نے بھر کے لیے سوچ لیا۔ "ہاں شاید۔" پھر بار بھی وہ میرے سامنے آئی ہے۔ میں نے
اسے گم سمجھ لیا ہے۔ یہ نہیں اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی پرالیم ہے یا کچھ اور۔ میں اب تک سمجھ نہیں

تھی۔ ابھی باہر گاڑی کا دارن بجا تھا کہ گھر کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ لمحہ بھر میں باجھل کو دیا ہوا تھا۔ شمشاد نے نام
دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

"میرا خیال ہے ایشم آگے ہیں۔ میں نہیں لے کر آئی ہوں۔"
اللہ اور مزید اٹھ کر کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں جس جگہ پر رکھنے لگیں سنیرہ بیگم وہ نہ ٹھک کر گئیں۔

بھاگتے ہوئے پھر کچھ دیکھتے تھے شمشاد لڑکی کے گیت تک جا پہنچی تھی۔ تب ہی وہ ٹھک کر رہی اور بے اعتبار
نظر آ رہی تھی۔ وہ شمشاد سے ٹیک لگا کر کھڑے ابرار کو دیکھنے لگی تو ایک تکاسی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ بھائی۔ "مگر ہاں اس سے جا لینا۔
ابرار نے عمر کو گود میں اٹھا کر چڑا دیا اور چند قدم آگے بڑھ آیا۔

"کیسی ہو شمشاد؟" اس نے ایک گہری نگاہ اس کے بچے سنوے سے سراپے پر ڈالی تھی۔
"میں۔ ٹھیک ہوں۔" وہ قدرے ناگوار سے بولی۔ "تمہیں یہاں آنے سے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ یوں

اچانک۔"
"میں نے فون پر عمر کو بتایا تھا کہ میں اسے لینے تھا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔ "یہ شاید
تمہیں بتانا ماحول کیا۔" کیوں شمشاد نے؟

"میں بھول گیا تھا۔" مہا نکیش تو انہیں دیکھ کر ہنس پھوٹ گیا۔
"بے قصور دیکھا۔" اس نے معنی خیز لہجہ اپنایا۔ "کچھ ایسی ہی ہیں تمہاری مہا۔"

شہلا نے اسے غصے سے دکھا۔ اس نے لمحہ بھر میں لہجہ اور انداز بدل لیا۔

”اینی بوسے اب تم یہاں تک آئی گئی ہو۔ تو اجازت بھی دے دو۔ کیا میں عمر کو لے جاسکتا ہوں؟“
شہلا متذبذب ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، کسی گاڑی کی روشن ہیڈلائٹس ان تینوں پر پڑی تھیں۔ شہلا اور ابراہانے ساختہ ہی اس جانب متوجہ ہوئے۔ لائٹس آف ہوئیں اور گاڑی میں سے ہاشم برآمد ہوا۔

شہلا کو ایک پل کے لیے اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہوا۔ اس منظر میں اس کی پوزیشن کچھ انکوڑسی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔
ہاشم گاڑی بند کر کے قدم قدم چلا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ابراہان کو دیکھا۔ گویا اس کا تعارف چاہتا ہو۔

شہلا کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو وہ پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ شرمندگی کا ایک گہرا احساس اس کے پورے وجود پر غالب تھا۔ وہ سیدھی بچن میں چلی آئی۔ فریق کھول کر پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی اندر پلٹے لگی۔

”کیا ہوا بیٹا۔“ پیچھے سے انہی کی آواز آئی۔ ”یہ ہاشم ہیں؟“

”ہاں۔“ اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گلاس لیوں سے لگا لیا۔

”السلام علیکم۔“ ہاشم کی خوشگوار آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

انہی، ریحہ اور منیزہ بیگم ہاشم سے ملنے میں مصروف ہو گئیں۔ شہلا اتنے عرصے میں خوب قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

شہلا نے بے اختیار ہی اس کی نظروں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”کیا بات ہے جناب اسے؟“ ہاشم نے اسے دیکھ کر اس کی طرف اشارہ کیا۔

”جی۔ نہیں۔ وہ میں۔ دراصل میں شہلا کے ذہنی مسائل کا سبب بنی ہوں۔“ شہلا نے گھڑائی سے ہاشم دھیرے سے دیکھا۔

”عمر کہاں ہے شہلا؟“ منیزہ بیگم کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔
ریحہ اور انہی جلدی جلدی ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگانے لگی تھیں۔ شہلا ایک مرتبہ پھر الجھن کا شکار ہوئی۔ کیا کے کیا نہ کہے۔

”عمر کو اس کے والد ابراہان جیلانی لے کر گئے ہیں۔“ ہاشم نے ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سلاٹس سے کھیرے کا پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا اور عام سے انداز میں اٹھا کر دی۔

شہلا نے قدرے متحیر ہو کر اسے دیکھا۔ ریحہ اور انہی دلعنا ”اپنی اپنی جگہ ختم سی گئی تھیں۔ منیزہ بیگم بھی کچھ پریشان سی ہو کر ہاشم کو دیکھنے لگیں۔

وہ بے حد ناراض انداز میں اپنی بات کہہ کر اسی پانی کا گلاس بھر رہا تھا۔
”ابراہان؟“ پھر منیزہ بیگم بولیں۔ ”ابراہان آیا تھا؟“

”ابراہان؟“ ہاشم نے ہر سے ہی عمر کو۔ ”گئے ہیں۔ چند گھنٹے بعد چھوڑ جائیں گے۔“

تھی۔

رافع بھی مرکز جا لنگڑیک پر دوڑنے لگا۔ دل ٹھہر گیا تھا، قدم دوڑ رہے تھے، جب ایک جنگ سی اس کے وجود کے اندر پیا ہونے لگی۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری مرمریں پیشانی سے۔“
وہ خود بخود ہی گنگنایا تھا پھر ٹھہر گیا۔

”وہ خدا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

بارک دلاور دور تک خالی تھا۔ اس کی نظریں بے قرار ہو گئیں پھر اس نے سر جھٹکا۔ خود کو کوسا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری مرمریں پیشانی سے۔“

دل تھا کہ تکرار کیے جا رہا تھا۔ رافع یہ نظم شروع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نظم کی طرح وہ اپنے انجام سے بھی واقف تھا۔ ایک ایک وہ ٹھٹھک کر رکا۔ ربیعہ اس کے سامنے سے آ رہی تھی۔ رافع کی مانند بھی پلٹ کر چل پڑی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ایک گولائی میں جلتے جلتے پھر آئے سامنے تھے۔

فاصلہ اب اس قدر کم تھا کہ گریزنا ممکن تھا۔ رافع چوتھے قدم پر پہنچا۔
”السلام علیکم۔“ وہ بے اختیار ہی مسکرایا۔

”و علیکم السلام۔“ یہ بھی جیسے رہا۔ ”مسکرائی تھی۔“ آپسے روز آتے ہیں۔ یاں؟“

”جی ہاں، تقریباً۔“ رافع کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے لگا۔

”پہلے ایک روایت مراء ہوا کرتا تھا اب کچھ عرصے سے وہ پھولا کی اور کا ہو گیا۔“

کے لیے مس کال ہو گیا۔
ربیعہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

”چلیں صبر کریں اللہ خدا نے چاہا تو آپ کو کوئی اور دوست مل جائے گا۔“

رافع چلتے چلتے رک گیا۔ ”ربیعہ کی سادہ انداز میں کسی گئی بات نے اس کے اندر پر اثرات کی رنگ پھر کا دی۔ اس

کے رک جانے پر ربیعہ نے گردن موڑ کر کہا۔ ”یہ کچھ عجیب ہے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی معصومیت تھی۔ رافع معمول کی مانند پھر چل پڑا۔“

”ربیعہ تھی ہیں اب؟“

”میں نے گریجویشن کیا ہے۔ اب اسٹریز کرنے کا ارادہ ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آپ شہلا بھاگھی کی رشتہ دار ہیں؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی آپ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”نہیں۔“ ربیعہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ ”جی۔ رشتہ دار ہی سمجھ لیجئے۔ ہاں وہ اس روز آپ کی ایک نظم

میرے پاس رہ گئی تھی، آپ کہیں تو میں واپس کر دوں؟“

رافع مسکرایا اور ایک ٹھہری سی نظر اس پر ڈالی۔ صبح کی خوشگوار روشنی میں وہ ہار سنگھار کے پھولوں کی سی لگتی تھی۔

”نہیں۔ واپس کرنے کے بجائے آپ رکھ لیں تو مجھے اچھا لگے گا۔“

اس کے جواب میں نجانے کس جذبے کی حدت تھی۔ ربیعہ کی پیشانی چمک اٹھی۔ اس نے رسمی سا مسکرا کر اسے دیکھا اور گھر جانے والے رستے پر چل دی۔

آنکھوں میں گہری سوچ لیے رافع اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
 ”یہ سپیدی رافتی سے اتری ہے۔ یا تری مرمرس پیشانی سے۔“ ذہن نے پھر تکرار شروع کی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔ نظم نے خود کو مکمل کر دیا کر ہی رہتا تھا۔



دوداش روم سے نکل کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رہی تھی۔ ہاشم بستر نیمہ راز بے دلی سے لی بوی کے چیل بدل رہا تھا۔ شہلا کو آنا دیکھ کر اس نے لی بوی آف کر دیا۔ گویا وہ اسی کے انتظار میں تھا۔
 شہلا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ہاشم نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”نا رافع ہیں آپ؟“

”جی ہاں“ وہ آہستہ سے بولی۔
 ”کچھ باتیں کر لی جائیں؟“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ شہلا چونک اٹھی۔
 ”ضرور۔۔۔“

ہاشم کھسک کر اس کے قریب ہوا اور اپنی کاپی پر تمام لیا۔
 ”شہلا! کتنا اعتبار کرتی ہو مجھ پر؟“
 ”جی؟“ شہلا نے حیران نظروں سے انہیں دیکھے۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں ہاشم۔“
 ”میں نے پوچھا۔ کتنا اعتبار کرتی ہو مجھ پر۔ نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے اس میں؟“
 ”آپ۔۔۔ میرے شوہر ہیں۔ میں نے اپنی مرضی سے یہ تعلقات قبول کیا ہے۔ تو سنا۔۔۔ کس اعتبار کروں گی آپ پر۔۔۔“
 ”اسی طرح تم بھی میری بیوی ہو شہلا۔ میری عزت ہو۔ میری محبت بھی ہو۔ میں نے تمہیں بہت خواہش سے اپنایا ہے۔ کل تک مجھ پر اور اعتبار کرتا ہوں تم پر۔ اعتبار بھی اعتماد بھی۔ تم سے غلط کچھ سب ہی رشتے استوار کر لیے ہیں میں نے۔ شہلا! نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی آنسو تھے۔
 ”اس روز تمہیں گھرایا ہوا دیکھ کر مجھے یہ دل چلا کہ یہ سب کچھ تو سنا۔۔۔ کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں؟ تمہارے انداز کہہ رہے تھے کہ تم مجھ کو کچھ کر پریشان ہو گئی ہو۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے حوالے سے کبھی کوئی غلط خیال میرے دماغ میں آسکتا ہے ہو لو۔“
 شہلا چند لمحے خاموش رہی۔ اسے ہاشم کی نگاہ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔

”دیکھو شہلا! میں تمہارے ماضی سے بخوبی واقف ہوں۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں اپنایا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے سب ہی حوالوں کے ساتھ قبول کیا ہے۔ تمہارے اور عمر کے ساتھ اس شخص کا نام وابستہ تھا۔ عمر کے ساتھ اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس تعلق کے حوالے سے تمہارا اس سے سامنا بھی ہو سکتا ہے بات بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ خدا خواستہ تمہارے دل میں کوئی غلط خیال ہو۔ میں مگر کبھی یہ بات نہیں سوچ سکتا۔ تم میری جانب سے اپنا دل صاف کر لو۔ اور آئندہ ایسی کسی بھی چیز پر توجہ نہ دو۔ تم میری بیوی ہو شہلا! میرا اعتماد ہو۔“
 شہلا دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”ازاٹ کیٹیر؟“ اس کی صورت دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔
 ”ہوں؟“ وہ چونکی۔ ”لیس۔ آف کورس۔“

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں فائدہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔
ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے محفوظ رکھیں۔

”جاگنا ہے یا سونے کے ارادے ہیں؟“ اس کے انداز میں شرارت برپا رہی تھی۔

”میں سونا چاہتی ہوں ہاشم۔ پلیز نہ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔“

”نیو مائنڈ۔“ وہ اپنا تکیہ اٹھا کر قدرے دور ہوا۔ ”یوں تو آپ جاگنا چاہتی ہیں لیکن اکیلے میں۔ چلیں

جناب۔ جیسے آپ کی مرضی۔ شب بخیر۔“

وہ تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ شہلانے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شاہیہ تک نہ تھا۔ ہاشم نے درست کہا تھا۔ وہ جاگنا چاہتی تھی مگر تنہائی کے ساتھ اسے مختلف باتوں پر غور کرنا تھا۔ اس کے ذہن میں گولے سے بھرزہ تھی۔

ابرار کے انداز اسے بے حد خوف زدہ کر چکے تھے اس کے مقاصد اسے بے چین کر رہے تھے اس کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔



رات کا نچا ہے۔ اس نے کہا۔ عاشر اپنے سر پر مڑو۔ وہ تھا۔ اور اس کے موبائل کی سٹیجنگ ”کلی کال آری“ تھی۔ عاشر نے موبائل کی آواز بے حد ستم کی ہوئی تھی۔

ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہاشم روم سیاہی کرنے کی آواز آ رہی تھی جس کا مطلب یہاں ہاشم کی موجودگی تھی۔ سب مسلسل سو رہی تھی۔ سٹیجنگ ہاشم کو پالی کرنے کی وجہ سے بے سالی نہیں دی تھی۔ ایقان نے ہاشم کو کہا ”صبح کے چار بجے کا عمل تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ ڈسٹن انٹرین پر ٹولز کالنگ“ کے الفاظ چمک رہے تھے۔

”اٹھو؟“ اس کی نیند لمحہ بھر میں اڑن چھو ہو گئی۔

موبائل تن کر کے اس نے کان سے لگایا اور خاموش رہی۔

”عاشر۔ ڈسٹن۔ ٹاک ٹوی۔ پلیز۔“ لہجہ التجائیہ تھا۔

ایقان نے موبائل آف کر کے جگہ پر رکھا اور کسی چور کی طرح اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ دوش روم سے عاشر نکلا تھا۔ وہ اپنی جگہ آکر لیٹا پھر اس نے بازو بڑھا کر ایقان کو گھیرے میں لے لیا۔

ایقان کی دند ٹر زنی پلکوں سے ایک موتی نکلا اور اس کے بالوں میں گم ہوا۔

”زات یو؟“ وہ لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

یقین کے محل میں پہلی دراڑ پڑی تھی۔ اس کا وجود جیسے تیز ہوا کی زد میں تھا۔ عاشر کا بازو اسے آگ سے بنا محسوس ہونے لگا۔

بے حد رغبت سے سب کا مرتہ کھاتے ہوئے وہ بہت فریض اور قدرے خوش نظر آ رہا تھا۔ ایقان نے کن انہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ عاشر اس کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا وہ مرتبے کی تیشی میں چھپے ڈال کر سب کے نگرے نکالتا اور منہ میں رکھ لیتا۔ ایقان چند لمحے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس قدر بے فکری خوش باشی زندگی سے بھرپور انداز سے جیسے کوئی غم کبھی چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔ وہ اتنا خوش کیوں تھا؟ اس کے ارد گرد سوالیہ نشان پھرنے لگے۔

”عاشر وہ ازاں یو؟“ وہ لہجہ پھر اس کی سماعتوں میں سرسرا نے لگا تھا۔

”عاشر وہ ڈ۔۔۔ پلینز ٹاک ٹوی۔۔۔“ وہ التجائیہ انداز اس کا دل چھیدنے لگا۔

”نہ اسے یہ پڑا کون تھی؟ کیا عاشر اسے جانتا ہے؟ کیا وہ اس سے بات کرتا ہے؟ کیا وہ اس سے ملتا ہے؟“ سوالوں کی ایک یلغار تھی جو اسے رات کے پچھلے پہر سے لے کر اب تک پریشان کر رہی تھی۔ عاشر نے مرتبے کا جار بند کرتے ہوئے نظریں اٹھائی تھیں پھر وہ ٹھٹک سا گیا۔

ہاتھ میں سلاکس تھا وہ بے حد عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سلاکس کی بھی خبر نہ تھی۔ اسے ہاتھ میں موجود سلاکس کی بھی خبر نہ تھی۔

عاشر نے مسکرا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ایقان بری طرح سے چونکی پھر اس نے سلاکس واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور پٹائے رکھی ٹھنڈی ہوتی چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ کوئی ڈانٹنگ پلان چل رہا ہے؟“ اس نے ایقان کی بات سننے میں عدم توجہی محسوس کی۔

”ہاں۔۔۔“ وہ پھر بولنے لگی۔

”کیا کہا؟“

عاشر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر زور سے چٹکی بھری سوہ ”سی“ کر کے رہ گئی۔

”کیا ہے عاشر!“ خلاف توقع وہ بیزاری سے کہتے ہوئے کھڑی ہوئی پھر وہ ٹانھتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

عاشر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ان پر اپنا چہرہ رکھا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ برتن سمیٹ رہی تھی لیکن اس کے پورے وجود میں ایک اضطراب سا تھا۔ ایک بے گلی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ ایک تناؤ تھا جو اس کے انداز سے بھی جھلکتا تھا اور چہرے سے بھی۔

”ایقان۔۔۔“ عاشر نے اسے پکارا۔

”کہو۔“ وہ کچن کی جانب جاتے جاتے رک گئی۔

”تمہارے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

ایقان نے مڑ کر نجانے کیسی نگاہوں سے اسے دیکھا وہ گریڈ سا گیا پھر وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ عاشر الجھنے لگا۔ چند لمحے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس نے کچھ اندازے لگانے کی کوشش کی پھر اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ وہ ساس پین میں بانی ڈال کر جوئے پر رکھ رہی تھی۔ عاشر آہستگی سے اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔

ایقان چونکی۔ اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

”کیا بات ہے ایقان۔۔۔“ عاشر نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔ ”بیزار ہو گئی ہو مجھ سے واپس چلا جاؤں؟“

”پاکل ہوئے ہو۔“ وہ کھوکھلے کچے میں بولی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔“

”بسیا تم سلوک کر رہی ہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”میں نے کہا کیا ہے عاشر؟“

”عدم تو جہی کی مار مار رہی ہو اور پوچھتی ہو۔“ اس نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ ”کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟“

اس کے دونوں ہاتھ ایتقان کے کاندھوں پر تھے۔ ایتقان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ عاشر کے انداز میں بناوٹ کی پوند کاری بھی تھی۔

”یہ لڑا کون ہے؟“ اس نے پوچھنا چاہا لیکن الفاظ اس کے لبوں تک آنے سے پہلے ہی تحلیل ہو گئے۔ جانے اس سوال کا کیا جواب آتا؟ اگر وہ ٹکفٹ نظریں چرائی تاکہ اگر ایتقان کے شانوں پر دھیرے اس کے ہاتھ بے اختیار پھسل جاتے۔ اگر وہ پھیکے سے انداز میں ایسی وضاحتیں دینے لگتا جو ایک آن دیکھے جھوٹ کا آئینہ معلوم ہوتیں۔ پھر کیا ہوتا؟ ایتقان اپنی خوش فہمیوں سے اس قدر جلد دستبردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے پھر سے رخ موڑا اور چولہا جلانے لگی۔

”رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ طبیعت مضطرب ہو رہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے جلد از جلد سب کام سمیٹ کر سو جاؤں۔“

”ہاں۔“ عاشر نے چند لمحوں کی بات پر غور کیا۔ ”نیند کیوں نہیں آتی کوئی پریشانی؟“

”کمال ہے عاشر۔“ وہ زبردستی مسکرا دی۔ ”مجھے بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔“ ایتقان کا شکر ہے۔ کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ زندگی میں نہ تمہاری۔ محبت میں۔“ اب کی بار اس نے سوچ میں گم ہوئے عاشر کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے چوڑا پھر مسکرایا۔

”چلو پھر ٹھیک ہے۔ تم آرام کر لو۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک لوٹوں گا۔“

”کام سے؟“ ایتقان نے اسے دیکھا۔ ”کام کیا؟“

”چند ایکسپیرانے دوستوں سے ملوں گا۔ سوچتا ہوں واپس لوٹ کر جو کاروبار کرنا ہے ابھی اس کی سمری تیار کر لوں۔ اچھا ہے یہ معلومات جمع ہوتی رہیں گی تو کام آئیں گی۔“

”ہوں۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تازہ چائے تمہارے لیے ہی بنا دیتی تھی۔ اب بی کر جاؤ۔“

”نہیں یا۔ تم پی لو۔ مجھے تو ابھی نیند نہ آئی۔“ کہاں کہاں چائے پینا ہوگی۔ ”وہ ایک بار پھر بے فکر اور خوش باش لگنے لگا تھا۔“

”چلتا ہوں۔ دروازہ بند کر لو۔“ ایتقان پر سوچ نگاہیں لیے کچن کے دروازے پر ہی ایستادہ ہو گئی تھی۔ وہ آئینے میں خود کو بغور دیکھتے ہوئے سفید شرٹ کا کالر ٹھیک کر رہا تھا جب اس کے پیچھے شہلا کا عکس نمودار ہوا۔ ہاشم کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ جاگئی۔ اس نے غور سے خود کو اور اسے ایک ساتھ دیکھا اور پھر مسکرایا۔ شہلا آہستہ آہستہ جلتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔

”صبح بخیر مدام!“ وہ ٹکفٹگی سے بولا۔

”ہاشم۔ ایک بات کہنا تھی آپ سے۔“

”ہوں ہوں جتنی چاہے کہیے۔ آپ کے لیے تو ہم آفس سے لیٹ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ شہلا مسکرا دی۔ ”میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ میں نے جتنی چھٹیاں لی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں۔ میں اب ہسپتال جایا کروں گی۔“

”ضرور جائیے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی جیسے اسے کسی بات کے کہنے سے جھٹک سی تھی پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”ای سے آپ بات کر لیجئے گا۔ وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں جاب مستقل“ چھوڑ چکی ہوں۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔“

ٹائی کی ٹاٹ باندھتے ہوئے ہاشم کے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے تذبذب ابھرا تھا۔ ”شہلا! تم ای کو مناسب الفاظ میں یہ وضاحت کرو کہ تم چھٹیوں پر تھیں۔ میرا خیال ہے میرا اس سلسلے میں کچھ کہنا غیر مناسب ہو گا۔ ہاں پھر اگر وہ کوئی نکتہ اعتراض اٹھاتی ہیں تو میں انہیں سمجھا لوں گا۔ یا ایسا کرو۔“

”ماہین بھی آئی ہوئی ہے۔ اس سے تذکرہ کرو۔ ای خود سمجھ جائیں گی۔ کیا خیال ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔“ وہ آواز ہو گئی۔ ”میں ماہین سے بات کر لوں گی۔ ایک بات اور بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ وہ اب بریف کیس میں رکھی فائلیں چیک کر رہا تھا۔

”میں کچھ دن کے لیے عمر کو اپنے پاس لے آؤں؟“

ہاشم چونکا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے اس سوال کا جواب نہ دے پایا۔ چند منٹ پہلی جملے اس کی یادداشت سے ٹکرائے تھے۔

”اس گھر میں صرف ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“

”ہوگ کیا نہیں گے۔ ہو کے ساتھ پوتا بھی ملا ہے۔“

شہلا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی ہاشم چونک کر خود پر قابو پانے لگا۔

”آں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ ہم چلیں گے ان سب سے۔“

”تو عمر کو بھی لے آئیں گے۔ کچھ دن ہمارے ساتھ رہ لے گا۔“

”کچھ دن۔“ شہلا کے دل میں پین سی چھبی۔

اس نے قدرے بے اعتباری سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ ہاشم اس کی کیفیت سے خبر نہ لے سکا۔

اس نے مسکرا کر شہلا کو دیکھا اور اس کے قریب آ کر اس کا گال پتھپتھپایا۔

”میں اب چلوں شام کو ملے ہیں۔“

اس نے بے دلی سے سر ہلادیا۔

”میرے اے کی کلاسز اشارت ہو چکی ہیں پھر بھی تم فکر مت کرو میری کچھ جان پہچان ہے تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گا۔ ہاں یہ ہے کہ یونیورسٹی میں اب ایڈمیشن مشکل ہے۔ کالج سے ماسٹرز کر لو کیا خیال ہے؟“

ربیعہ نے چونک کر عباد کو دیکھا اور مسکرا دی۔

”میرے لیے پڑھائی اہم ہے عباد بھائی! یونیورسٹی یا کالج نہیں۔ آپ مجھے فارم اور پراسپیکٹس وغیرہ لادیں تاکہ یہ مراحل جلد سے جلد طے ہو جائیں۔“

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سارے کام کل ہی ہو جائیں گے۔ تمہارے پاس تمہارے ضروری ڈاکومنٹس تو ہیں نا؟“

”جی ہاں۔ میں ابتدائی عملت میں بھی اپنی فائل لینا نہیں بھولی تھی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ پرنڈھن پر چند مناظر پھر گئے تھے اس کا دل اداس ہوا۔

”شہلا! آپ کے سسرال سے بھی کافی لڑکیاں کالج جاتی ہیں۔“ عباد بولا۔ ”تمہیں وہاں سے اچھی خاصی پہچان مل سکتی ہے۔ تمہیں کو کہ اینتہ کے ساتھ شام کو شہلا آپ سے ملنے چلی جاؤ۔ ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور

ضروری انفارمیشن بھی مل جائے گی۔“

”کیسی انفارمیشن درکار ہے جناب کو۔“ انیقہ چانے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں آ رہی تھی۔ اس کے ہاں کھڑے ہو گئے۔ ”وہ بھی شہلا آپ کے سسرال سے۔ خیر تو ہے؟“ وہ جھک کر چائے میز پر رکھنے لگی تو عباد نے اس کا ہاں پکڑ لیا۔

”تمہاری کھوپڑی الٹی فٹ ہے اس لیے تمہارے سوچیں بھی الٹی سمت میں سفر کرتی ہیں۔“

”پھر اس میں میرا کیا قصور ہے میرا تو کان چھوڑیں۔“ وہ کراہی۔

”جلدی سے ڈاکٹر بن جاؤ تو تمہارا بھی کچھ علاج کریں۔“ انیقہ زور سے ہنس دی۔

”بھئی! ڈاکٹر بنوں میں۔ اور علاج کریں آپ۔ یہ تو لطیفہ ہو گیا اور مجھے آپ کہہ رہے ہیں کہ میری سوچیں الٹی سمت میں سفر کرتی ہیں۔“

”بہت ٹھیک خیال ہے۔“ وہ اطمینان سے پیر پھیلا کر بولا۔ ”چلو چائے بناؤ۔“

”یہ کام ربیعہ کرے گی۔“ وہ مزے سے کشن گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

ربیعہ دونوں بہن بھائی کی نوک پر چھوٹے چھوٹے منہ سے سن رہی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میز کے قریب آ بیٹھی اور چائے بنانے لگی۔

”ربیعہ! اتنے دن ہو گئے۔“ انیقہ نے کہا۔ ”تم نے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا اپنی فیملی کے بارے میں۔ اپنا بیک گراؤنڈ۔“

ربیعہ کا دل دھڑکا ہاتھ کانٹا چائے کپ سے جھٹک کر ہاتھ سر میں گری۔ وہ عباد کو چائے پکڑا رہی تھی۔

”اگرچہ میں اب باپ جیسا نہیں ہوں۔“ عباد چائے کا کپ تھامتے ہوئے سکون اور اطمینان سے بولا۔ ”اس کا ایک ہی بھائی ہے۔“

داروں کے خوف سے وہ ربیعہ کی ذمہ داری میرے سر و کچے گیا ہے اور اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں۔ ہم جو ہیں۔“ منیہہ تلیم اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرائیں۔ ”ایسا کیوں کہتے ہو کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔“

”میں اس کی ماں ہوں۔ انیقہ اور شہلا اس کی بہنیں ہیں۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

منیہہ تلیم نے اپنے وجود سے انتہی خوشبو اسے بہت اپنی بہت مسکراتی ہوئی۔ اس نے اپنے اختیار رہی اپنے بازو ان کے گرد جمائے کر لیے تھے۔

”دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔“ وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا۔“

ربیعہ نے آواز میں غزل کے دلکش بول کمرے کی خاموشی میں گونج رہے تھے۔ ناعہ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھٹھک کر رک گئی۔

عریشہ بستر دراز تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے، آنکھیں بند کیے وہ کسی بلاش کی مانند ساکت لگ رہی تھی۔ چند دنیوں میں اس کا وجود جیسے برف کی طرح سے گھلا تھا۔ چہرہ جو کبھی شگفتہ گلاب کی مانند تھا، بے رونق اور زرد ہو رہا تھا۔ آنکھیں گڑبڑوں میں دھنسی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ناعہ کو اس پر بے حد ترس آیا اور اس سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اس کے قریب آ بیٹھی۔ آہٹ محسوس کر کے عریشہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحوں کے بعد ناعہ کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے ریموٹ سے سی ڈی پلیئر آف کر دیا۔

”عریشہ۔۔۔ کیسی ہو۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اتنے دن ہو گئے، تم تو اب ملنے آتی ہی نہیں ہو۔ خود کو قید کر لیا ہے تم نے اس کمرے میں۔ ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“

عریشہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اداسی سے مسکرائی۔ ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے نکل کر بالوں میں گم ہو گیا۔

”بیمار تو میں ہو گئی ہوں ناعمہ۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔“

”ایسا کیوں کہتی ہو، خدا نہ کرے جو ہمیشہ کے لیے بیمار پڑو تم۔“ ناعمہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے دھچکا سا لگا۔ اس کا ہاتھ ہڈیوں سے بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”ایک بات پوچھوں تم سے۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”کون سی نئی بات ہے پوچھنے کو ناعمہ!“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”کیا جان لو گی تم؟“

”تمہیں نافع پسند نہیں ہے؟“ وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔

عریشہ لختی سے ہنس دی۔ اس کے چہرے پر ہنس پھیل گیا تھا۔

”اب ان باتوں سے کیا فائدہ ضرورے کو دفنا کر پوچھنا کہ تمہیں قبر پسند آتی یا نہیں۔ عجب لا حاصل سوال ہے ناعمہ!“

ناعمہ خوف اور وحشت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے عریشہ واقعی ایک مروے کی مانند محسوس ہوئی۔ سرد اور بے جان۔

”عریشہ!“ وہ ایک مرتبہ پھر ہمت کر کے بولی۔ ”تم نے ایک جھوٹی سی بات کہی کہ خود پر سوار کر لیا ہے۔ باہر نکلو، ہنسو، بولو تو تمہاری یہ بے شکونی کچھ کم ہو۔ ماحول بدلنے سے خیالات پر بہت اثر پڑتا ہے عریشہ!“

”مجھے اب کبھی بات سے فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ”اب تم جاؤ ناعمہ! میرے پاس بیٹھنے سے تمہیں ضرور فرق محسوس ہو گا۔ کہیں تم میں سے بھی کافور کی بونہ آنے لگے۔“

ناعمہ سن سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ عریشہ نے پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ ناعمہ اٹھ کر مرے مرے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔



”ہوں۔“

وردہ متفکر ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں وردہ آلی! وہ وہ مر جائے گی۔ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے خود کو ایک مروہ تصور کر لیا ہے اور اس کے اندر یہ یقین پختہ ہو چکا ہے۔“

ناعمہ اسے لفظ بہ لفظ ساری کہانی سنا کر بیٹھی تھی۔ دونوں بہنیں حقیقتاً ”پریشان“ ہو گئی تھیں۔

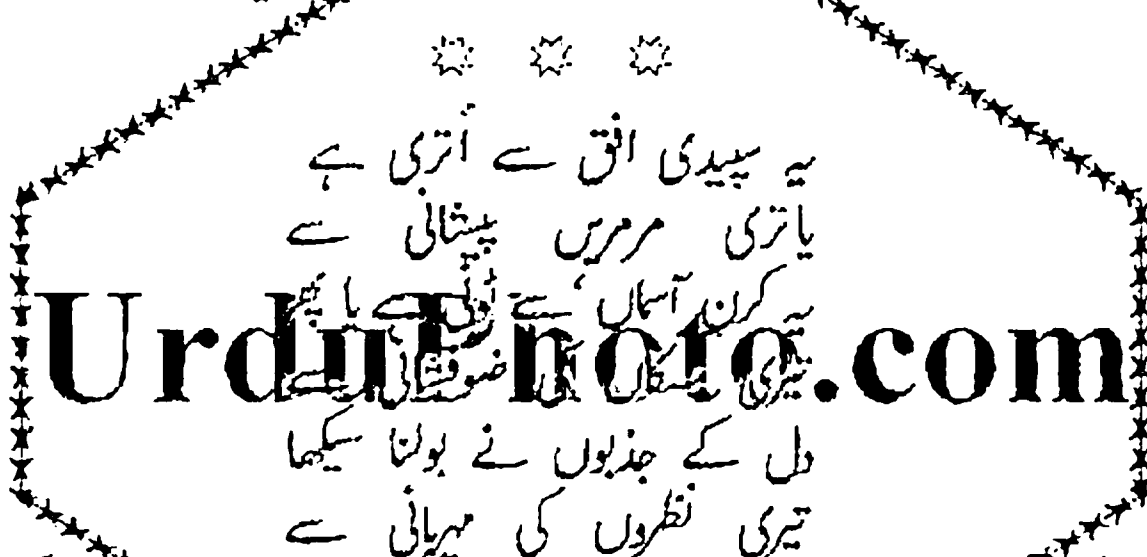
”کیا کیا جائے۔“ وردہ سوچ رہی تھی۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے“ فاروق ماموں نے بہت عجلت دکھائی ہے فیصلہ سنانے میں۔ لڑکیاں بھی جیتی جاگتی مخلوق ہیں۔ وہ بھی جذبات و احساسات رکھتی ہیں، ان کی بھی پسند ناپسند ہو سکتی ہے۔ اگر اسے نافع پسند نہیں تھا تو بیوی کو اس بات کو سمجھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے تو اسے اپنا کامسکہ بنا لیا۔ مجھے لگتا ہے ناعمہ! عریشہ کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ وہ اتنی زیادہ حساس ہے، اس کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔“ ناعمہ

نے اثبات میں سرہلایا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ ورہ نے ٹولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم عریشہ اور ٹاٹا تو ایک دوسرے کی ہم رازو دساز تھیں۔ اس نے کبھی کسی اور کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا؟ کیا کبھی تم نے محسوس کیا کہ وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے نفی میں سرہلایا۔ ”کبھی بھی نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور ہم سے ذکر کرتی۔“
”ہوں۔“ اس نے رسوج انداز میں کہا پھر تو سارا مسئلہ بس یہی ہے کہ وہ نافع کو شدت سے رد کر رہی ہے۔ اتنی زیادہ شدت سے کہ اس کی اپنی ہستی مٹی جا رہی ہے اور اسے یا کسی اور کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔
”ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں اپنا؟“ ناعمہ نے تاسف کے احساس میں گھیر کر پوچھا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔

”آپ۔ آپ۔ رافع بھائی سے بات کریں نا۔“ ورہ نے اسے بری طرح گھورا۔
”یا گل ہوئی ہو، میں رافع سے کیوں بات کروں۔ بات کرنا ہوئی تو میں ڈائریکٹ نافع سے کروں گی۔ تمہارا دماغ بھی نجانے کہاں سے کوڑیاں لاتا ہے۔“
وہ بڑبڑانے لگی تھی۔ ناعمہ کے لب شرارت سے مسکرا اٹھے۔ اس نے پیار سے بہن کی جانب دیکھا تھا۔



وہ سارہ صفحے پر رقم الفاظ کو تک رہا تھا۔ عجب آرزو میں تھیں جو شہر تنہا میں مشو پانے لگی تھیں۔ رافع نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔
”یار رافع!“ اس کے کانوں میں ہاسٹم کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”خدا اگرے تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“
وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے چینی حد سے سوا ہونے لگی تھی۔ کھڑکی کے کھلے پیٹ سے کاسنی بیل جھک جھک کر اندر جھانکنے لگی تھی۔ رافع کا دل چاہا وہ بھاگے۔ بھاگتا جائے۔ اتنا بھاگے کہ تھک کر چور ہو جائے۔ ٹوٹے ہوئے ٹھکے ہارے وجود میں صرف ایک دھڑکتے دل کی آواز ہو اور ہر آواز معدوم ہو جائے، ہر خیال پس پشت چلا جائے۔ ہر احساس ختم ہو جائے۔ صرف ایک احساس کے سوا وہ ہر بات بھلا ڈالنا چاہتا تھا لیکن۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔

”کون ہو تم۔“ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔ ”کہاں سے آئی ہو، کیوں آئی ہو؟ کیا ملا تمہیں کسی کی پر سکون دنیا کو بے سکون کر کے۔ کیا پایا۔ بولو۔ جواب دے۔“ ذہن کے افق پر ایک مرمریں وجود کی مسکراتی شبیہ نمودار ہوئی۔

”ہاں سنگھار کے پھولوں سی لڑکی لوٹ جاؤ، جہاں سے آئی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے گلاب جذبوں کی خوشبو تم تک پہنچے اور۔ اور تم بھی میری طرح بے سکون ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتا۔ لوٹ جاؤ۔ لوٹ جاؤ۔“

”میری چھٹیاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔“ اس نے سلا کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے بظاہر عام سے انداز میں کہا۔ ”میں بھی کل یا پرسوں سے جوائن کروں گی۔“

کھانا کھاتے فردوس بیگم کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ شہلا ان کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی پھر بھی اس نے ان شکنوں کو محسوس کر لیا۔ منہ میں نوالہ ڈالتی ماہین کے ہاتھ بھی سست ہو گئے۔

”ابھی سے... ابھی سے بھا بھی!“ پھر وہ بولی۔ ”ابھی تو ہم نے اپنے چاؤ بھی پورے نہیں کیے۔“

”اے باب! کیسے چاؤ۔“ فردوس بیگم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی ہاٹ پاٹ میں رکھ دی۔ ”ہم نے تو پہلے دن ہی ہر چاؤ چوپچلے سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ جیسے چاہو کرو۔ ہم بے چارے نہ لیٹنے میں نہ دینے میں۔“

”ہی!“ ماہین نے ماں کو تنبیہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

شہلا خفیف سی ہو گئی۔ اس نے ایک نظر سب ہی پر ڈالی۔ مردہ دلی سے ٹونگتی ہوئی عریشہ نے ٹوکویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ حمزہ ماں کے انداز پر بے حد شرمندہ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا تھا۔ ماہین چورنی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ماحول میں عجیب سی ناگواری گھل گئی تھی۔

”ماہین!“ شہلا نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے... کیا امی جان کو میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے؟ دیکھو ماہین! میں تمہیں ایک بات بتاؤں... مجھے اس بات سے بے حد خوف محسوس ہو رہا ہے کیونکہ...“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ جھجک آڑے آگئی تھی۔ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے پہلے تعلق کے بارے میں بات نہ کر پائی۔ ہر چند کہ وہ ماہین کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا پہلا تعلق ختم ہونے کے نتیجے میں اسی تعلق کی بات کا ہاتھ تھا۔

”آپ دل پر زبردستی بھا بھیجنا ہی وجہ ہے اسے انداز میں بولی۔ ”امی کی انوعاوت ہے اور آزار اسی بات پر سوڈ خراب کرنے کی پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں پھر اصل بات تو ہاتھ بھائی کی اجازت کی ہے اگر وہ راضی ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے بہترین سمیٹنے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہلا سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا میکہ اور اس کا بے حد پرکشش ہونٹ کر یاد آیا پھر وہ ایک لمحے گہری سانس بھر کر کھڑی ہو گئی۔

گاڑی گریڈ کالج کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ فریجہ نے جوس کا خالی ڈبہ باہر پھینکا اور بھائی کی جانب دیکھا۔ وہ ہونٹ بھیچے نجانے کس سوچ میں گم تھا۔ سن گلاسز کے پیچھے چھپی آنکھیں اپنا بھید چھپانے میں کامیاب تھیں۔ فریجہ نے اس کے تاثرات دیکھے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ کاندھے اچکا کر کالج کالٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تب ہی گھڑی کی سوئیوں نے ایک بجنے کا اعلان کیا۔ چند لمحوں میں بڑا آہنی گیٹ واہوا تھا۔ لڑکیاں جوق در جوق باہر نکلنے لگیں۔ آپس میں باتیں کرتی، ایک دوسرے کو ہاتھ ہلاتی، خدا حافظ کہتی، بے فکر لڑکیاں ہستی کھلکھلاتی گھروں کو جانے کی عجلت میں تھیں۔

”وہ...“ فراز نے فریجہ کو مخاطب کیا۔ ”وہ سامنے... جس کے ہاتھ میں دو کتابیں ہیں اور کاندھے پر بلیک بیگ۔“

فریجہ نے جلدی جلدی گاڑی کے قریب سے گزرتی لڑکی کا مشاہدہ کیا اور مسکرائی۔

”گڈ! پسند تو آچھی ہے آپ کی۔“ فراز نے گہری سانس بھر کر گاڑی اشارت کر دی۔

”یاور کھوگی نا۔“

”بالکل۔“ وہ یقین سے بولی۔

”مجھے اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ شہلا آبی کی شادی میں علم ہوا کہ اس کا نام ناعمہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بالکل غلطی نہیں کروں گی۔ ویسے کیوں نہ اسے گھرتک ڈراپ کر دیں؟“

فراز نے ایک نظر بہن پر ڈالی اور زخمی سے انداز میں مسکرا دیا۔

”غلطی بار بار نہیں دہراتے“ وہ بولا تھا۔

پھر اس نے گاڑی سڑک پر ڈال دی۔ فریجہ نے نا سمجھی سے کاندھے اچکا دیے۔



”ہم اندر آسکتے ہیں؟“ شہلا نے جالی کا دروازہ کھول کر اندر جھانک کر پوچھا۔

کرۂ شہ سے نکل بناتی رابعہ بیگم نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور ایک دم بڑجوش ہو گئیں۔

”زہے نصیب۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔“ وہ والہانہ انداز میں انھیں۔ ”یہ آج چاند کہاں سے نکل آیا۔ وہ بھی

ہمارے گھر میں۔۔۔ آؤ آؤ نا۔“

شہلا مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کی ہمراہی میں انیقہ اور ربیعہ بھی تھیں۔ وہ آپس میں سلام دعا کرنے

لگیں۔ ان کی آواز پر سن کر اندر سے وردہ اور ناعمہ بھی نکل آئیں۔

”شکر ہے۔ آپ کو ہمارا خیال تو آیا۔“ ناعمہ نے شہلا کے گلے لگ کر جھٹ شکوہ کیا۔ ”وردہ اسے آنکھیں

دکھانے لگی۔ انیقہ اور ربیعہ مسکرا دیں۔“

وردہ انہیں برا بھلا کہہ کر وہ خود باہر نکل گئی۔

”واہ بھی بہت ذوق و شوق سے سوار رہے گھر۔“ شہلا نے خوشگوار لہجے سے بولے۔ ”وردہ دیوار کو دلچسپی سے

دیکھا۔“

”یہ سب وردہ کا کمال ہے۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔ ”گھر کو سجانے بنانے کا جنون ہے اسے۔ کتنے ہی کورسز

کروائے ہیں اسی چکر میں۔ بہر وقت کچھ نہ کچھ بناتی ہی رہتی ہے۔“

”اور ناعمہ۔۔۔“ شہلا نے بھڑبھڑاتے چہرے سے والی گلابی لڑکی کو شوق سے دیکھا۔ رابعہ بیگم نے آہ سے مشابہ

سانس بھری تھی جو اس کے استفسار کا خوب جواب تھی۔ ناعمہ شرمندگی سے مزید سرخ ہوئی۔ انیقہ اور ربیعہ نے

ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”ہاں تو چھوٹی بھی تو ہے نا۔“ شہلا بول اٹھی۔ ”چھوٹی بیٹیاں بلاؤلی زیادہ ہوتی ہیں نا۔“

”کوئی نہیں اپنا۔“ انیقہ نے احتجاج کیا۔ ”میں چھوٹی ہوں لیکن امی آپ کو زیادہ چاہتی ہیں۔ مجھے تو ڈانٹتی ہی

رہتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ ناعمہ جھٹ سے بولی۔ ”گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ میں ہی کھاتی ہوں۔ کہاں کا لاڈ کیسا

لاڈ۔ سارے نمبر تو یہ وردہ آپ لے جاتی ہیں۔“ ایک بار پھر سب اس کے احتجاج پر ہنس دیے۔

”وردہ میری سب سے پیاری اور نیک بچی ہے۔“ رابعہ بیگم کے لہجے میں کچی محبت پوائی تھی۔ ”میرا سب

سے زیادہ خیال کرنے والی، سلیقہ مند اور سمجھ دار۔ یہ ناعمہ تو ابھی بچپن سے ہی نہیں نکلی۔“

وردہ چائے کی ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ چائے کے ہمراہ پائسن اپیل کیک اور شامی کباب بھی تھے ٹرے

سینٹر ٹیبل پر رکھ کر وہ سب کو سرو کرنے لگی۔

لب۔ خاموش مگر ہمہ وقت کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ خاموش مہربان تبسم دل کو اچھا لگا تھا۔ نبانے کیوں اس وقت درد کے سوال پر ربیعہ کے ذہن میں اس نگاہ کا ہر لمحہ پھر گیا۔
درد بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ کر مسکرا دی۔



”آپ کی امی کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔“ چہرے پر کلیئرنگ کریم ملتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں کہا۔
وہ کلیئرنگ میگزین کی ورق گردانی کرتا ہوا ہاشم قدرے چونکا اٹھا۔ اس نے چند لمحے اس کے لہجے اور بات پر غور کیا پھر محتاط سے انداز میں بولا تھا۔

”امی کی پسند ناپسند سے اتنا فرق نہیں پڑتا شہلا! میں بارہا تمہیں کہہ چکا ہوں، تمہیں میرا اور مجھے تمہارا اعتبار ہونا چاہیے۔ جب میں تمہیں اجازت دے چکا ہوں پھر تمہیں کسی اور کی اجازت درکار تو نہیں ہونا چاہیے اور امی کی پیچیدگی کسی حد تک تو سمجھتی ہی ہوگی۔ مزید وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

”فرق کیوں نہیں پڑتا ہاشم!“ وہ کائن بال سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ ”ایک گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں سے فرق تو پڑتا ہے۔ خیر میں مینیج کر لوں گی۔ آپ میرے ساتھ ہیں تو میں مطمئن ہوں۔“

”میں تو کب سے آپ کے ساتھ ہوں؟“ ہاشم نے غصے سے کہا۔ ”آپ دھیان ہی نہیں دے رہیں۔ اب تو باپ بچ ہو کر سوچتا ہوں، رافع سے کپ شپ لگا آؤں۔“
”ضرور۔“ مسکرائی۔ ”میں نے آپ کو کبھی رد کا تو نہیں۔“

”کاش!“ لہجے نے آہ بھری۔
”آپ سچ جانتے ہیں؟“ شہلا کو حیرانی ہوئی۔

”روک لو، اگرچہ ہو چکا ہو، مگر شہلا اس سے ہنسنا۔“
شہلا جھینپ گئی تھی۔ ہاشم مسکراتا ہوا باہر کی سمت بڑھ گیا۔



”یا حضرت۔“ رافع نے اسے حیرانی سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ”یہ واقعہ آپ کی سواری باورساری ہے یا پھر میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“
”اے۔۔۔“ ہاشم نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے ایک دھپ سے نوازا۔ ”تجھ پر بھی یہ اچھا وقت آئے گا“ بے فکر رہ۔“

”آہ۔۔۔“ رافع نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”یار ہاشم! اچھی دعائیں دیا کریا! مجھے لگتا ہے تیری زبان اچھی بھلی کالی ہے۔“

ہاشم نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ رافع آنکھیں موند کر دم سڑوں میں کچھ گنگناتے لگا۔
”یہ جو ایک اچھی سی لڑکی ہے ربیعہ!“ ہاشم بولا۔

رافع نے اس قدر بے اختیار آنکھیں کھولیں کہ ہاشم کا دل حقیقتاً ”زور سے دھڑکا۔“
”یار رافع! سنبھل کر میرے بھائی۔“ وہ حقیقتاً پریشان ہوا۔

رافع کے لبوں پر جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔
”یونہی۔۔۔ خواہ مخواہ ہو اؤں میں تیرا!“ وہ سر جھٹک کر بولا۔

”تیر تو ہواؤں میں ہی چھوڑے جاتے ہیں دست۔۔۔ تب ہی نشانے پر لگتے ہیں۔۔۔“ ہاشم کے لہجے میں یقین

بھی تھا، بے یقینی بھی۔ ”میں تیرا دوست ہوں رافع۔ تیرا ہدم، ہم نفس۔ تو مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔“
 رافع سر جھٹکا کر اپنی ہتھیلیاں مسکنے لگا، پھر اس نے سر اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔
 ”میں خود اس سے بھی جھوٹ بولنے کی سعی پیہم میں مصروف ہوں دوست۔ پر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو
 برتا ظالم دوست ہے ہاشم۔ تو نے مجھے بہت بددعا میں دی ہیں۔“
 ”اوہ۔“ ہاشم جیسے بالکل ہی بیٹھ گیا تھا۔ ”آئی۔ آئی ایم سوری رافع۔ کیا خبر تھی۔ اوہ۔ آئی ایم ریلیں
 سوری۔“

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ ایقان نے اسکول سے آئے ہوئے مومن کو ہدایت دی تھی۔
 ”حمزہ بھائی آرہے ہیں ہمیں لینے۔ ہم نانی امی کے گھر چل رہے ہیں۔“ وہ خود ایمان کو شوہر پہنارہی تھی۔
 ”ہرے۔“ مومن نے تعز لگایا۔ ”ہم وہاں رہیں گے نامما؟“
 ”ہاں۔ آج رات رہیں گے۔ کل واپس آجائیں گے۔“ وہ اب ایمان کی پونیاں بٹانے لگی۔
 ”اتنی جلدی۔“ اس نے منہ سورا۔ ”مجھے عمر کے ساتھ کھیلنا ہے بہت بہار۔“
 ”بیٹا! آپ کی چٹھیاں تو نہیں ہیں پھر یہاں آئے ہوئے ہیں آپ کے بھائی نہیں گئے۔“
 ”پہا کتنے دن بعد واپس جائیں گے ماما؟“ ایقان نے تھکر کر اپنے دیکھا اور گہری سانس بھری۔
 ”پتا نہیں۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی۔ ”آپ کپڑے چھینچ کر لو جلدی۔“

وہ اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔ ایمان کو تیار کر کے اب وہ خود بال ہزارہی تھی۔ جب ڈور نیل بجی باہر حسب توقع
 حمزہ ہی تھا۔ اپنے لالہ بالی انداز میں ایمان کو کاندھے پر چڑھائے کر وہ اندر چلا آیا۔
 ”چلیں پیچھو؟“

”ہاں چلو، ہم لوگ تیار ہیں بالکل۔“

”اور پیچھیا حضور۔ وہ کہاں ہیں؟“

”کچھ خبر نہیں ملتی ان کی۔“ وہ جلتے بھنے سے انداز میں بولی۔ ”بھئی بالکل فارغ، کبھی بے حد مصروف۔ سنا ہے
 آج کل کسی بزنس وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ اکثری پشتر گھر سے باہر ہی پائے جاتے
 ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا اور فریج کھول کر کوئی کام کی چیز تلاش کرنے لگا۔ ”میں نے انہیں چند دن پہلے دیکھا
 تھا ایک فارز لڑکی کے ساتھ آئس کریم پارلر پر۔ شاید بزنس وغیرہ کے سلسلے میں مصروف تھے۔“

ایقان جہاں بھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے بے اعتباری سے حمزہ کی جانب
 دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو لیکن وہ اپنی بات پوری کر کے اب سنجیدگی سے مٹھائی کے ڈبے پر ہاتھ صاف کر رہا
 تھا۔

”تم نے۔ تم نے۔ عاشر کو دیکھا تھا۔ آئس کریم پارلر پر۔“ وہ بے اعتباری سے بولی۔ ”کب؟ کب کی
 بات کر رہے ہو؟“

”اول۔“ اس نے سوچا۔ ”شاید پرسوں کی بات ہے۔ پرسوں رات کی۔ جی ہاں۔ یقیناً میں اسی دن رہبر کے
 ساتھ نکلا تھا۔“

”پرسوں۔“ ایقان نے کھوئے کھوئے انداز میں سوچا۔

اس روز عاشق رات بہت دیر سے لوٹا تھا اور ایقان کے استفسار پر اس نے ایک دوست کے ہاں دعوت کا ذکر کیا
 تھا۔

”دچلیں پیچھو۔“ حمزہ نے قدرے اکتا کر کہا۔ ”مجھے دیر ہو جائے گی۔ میری شام کی کلاسز ہیں۔“
 ”آں۔“ وہ چونکی۔ ”ہاں چلو۔“

خود پر قابو پانا اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ بدقت تمام اس نے بیگ شانے سے لٹکایا۔ اس وقت
 اس کا اپنا جی کسی کے شانے سے لگ کر آٹو بہانے کو چاہ رہا تھا۔

”ایک فارز لڑکی کے ساتھ۔ آئس کریم پارلر پر۔“ حمزہ کے الفاظ اس کا دل کاٹ رہے تھے۔
 ”نرا کانگ۔“ عاشر کے موبائل کی اسکرین اس کے ذہن پر روشن تھی۔

”اوکے۔ میں اب چلوں گا۔“ کافی کا خالی مک سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑانے الماری کے پٹ بند
 کرتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

”آج یہیں رک جاؤ۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔
 ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ برش سے بال کھٹوارنے لگا۔

”کیا حرج ہے؟“

”عاشر! آؤ گھورا۔“
 ”نرا! یہی تمہیں ایک چیز ایک مرتبہ سمجھا چکا ہوں۔ ایسے مطالبات مت کرو جو میرے لیے ناقابل قبول
 ہوں۔“

”جو مطالبات تمہارے لیے قابل قبول ہوں ان کی ایک لسٹ بنا دو۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”میں تمہیں اپنا دائرہ عمل بتا چکا ہوں۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولا۔

”آہ۔“ اس نے منہ کھول کر کانڈھے آجکائے۔ ”آپ کب آؤ گے؟“

”پرسوں تمہاری فلائٹ سے پچیس سی آف کرنے آؤں گا۔“ وہ چند لمحے ٹھہرا۔

”تم آؤ۔“ ڈونٹ سے کہہ کر تم کل نہیں آؤ گے۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”اوکے۔“ وہ خوش گردن لگا۔ ”وہ نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر دروازے کی سمت برہہ گیا۔

”عاشر! اس نے پیچھے سے پکارا۔

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”کل۔ شادی کرو گے مجھ سے؟“

عاشر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

”یہ کون سا مذاق ہے؟“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ وہ حقیقتاً ”سنجیدہ تھی۔“

عاشر نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا بے تاثر سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔
 لڑا چند قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آرکی۔ مدھم مدھم روشنی میں وہ بلا کی سحر انگیز لگ رہی تھی۔ بے باغ
 چمکتے چہرے پر بچی سیاہ آنکھیں صراحت سے اپنا مدعا کہہ رہی تھیں۔
 ”بولو عاشرا!“ اس نے دھیمے سے کہا ”شادی کرو گے مجھ سے؟“

پھر اس نے اپنا سر اس کے کاندھے پر ٹکا دیا۔ چند لمحوں کے لیے ماحول میں بے حد گہیر خاموشی چھا گئی تھی۔
 عاشر کو اس لمحے میں بھری ہوئی جاوا اثر رومانیت سے نگلنے میں کچھ دیر لگی تھی۔ پھر اس نے آہستگی سے اس کا سر
 اپنے کاندھے سے ہٹایا۔

”نہیں لڑا۔“ وہ بولا تو اس کا لہجہ مضبوط تھا ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی ”کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا رکاوٹ ہے؟ تم مسلمانوں کو تو چار چار بیویاں رکھنے
 کی اجازت ہے؟“

عاشر کو لمحہ بھر کے لیے جھٹکا سا لگا پھر مسکرا دیا۔

”ہاں بالکل ہے اجازت لیکن یہ آپشن ہے مجھ پر ہی نہیں۔“
 ”کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے اس آپشن سے؟“ وہ ضدی پن سے بولی۔
 ”کیونکہ میں اپنی بیوی کو بہت چاہتا ہوں لڑا! میں اسے دکھی نہیں کر سکتا۔ میرے لیے سب سے بہتر عزیز ہیں۔ میں
 نہیں چاہتا کل کو ان کے ساتھ کوئی نا انصافی ہو۔ دو شادیاں کر کے میں انصاف کے تقاضے پورے نہ کر پاؤں گا۔“

”عاشر۔۔۔“ عاشر اب میں تمہیں ہر قیمت پر چاہتا ہوں۔“ اس کے اہواز میں انتظار سب سے بے بسی
 تھی۔

”سوری لڑا! میری کوئی قیمت ہے ہی نہیں۔ جو چیز ناٹ فار سیل ہو اس کی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ بات میں تمہیں
 نبھانے کب سے سمجھا رہا ہوں لیکن تم سمجھتیں نہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں تمہارے حقے کا
 وقت دے چکا ہوں۔ تمہیں مجھ سے کسی درکار تھا۔ تم خود کہتی تھیں۔ اب شکایت کا حق تمہارے پاس نہیں
 ہے۔“

”جھوٹے ہو، تم جھوٹے۔ تم مسلمان مرد دو غلے ہوتے ہو۔۔۔ منافق ہوتے ہو دل میں کچھ اور زبان پر کچھ
 اور۔۔۔ تم سے اتنے تو وہ ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کم از کم ان کے تعلق میں منافقت تو نہیں ہوتی۔“
 وہ الماری کے پٹ سے ٹیک لگا کر جنونی انداز میں بول رہی تھی۔ عاشر نے بے حد سکون سے اس کی بات سنی
 تھی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ پھر وہ بولا ”تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔۔۔ تم کسی ایسے مرد سے شادی کرو جس کا
 کوئی مذہب نہ ہو۔ مسلمان مرد سے شادی کر کے تمہیں کیا ملے گا سوائے منافقت کے۔“
 اپنی بات مکمل کر کے وہ رکائیں تھا۔

”عاشر۔۔۔ عاشر۔۔۔“ وہ اس کے پیچھے لپکی ”عاشرا! میری بات سنو۔“
 باہر کا ریڈور سنسان پڑا تھا۔



”کیا بات ہے بچی۔۔۔ جب سے آئی ہو، یونہی کھوئی کھوئی خاموش خاموش سی ہو۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے

تمہاری؟“ شفیقہ حیات نے بے حد محبت سے اسے مخاطب کیا
ایقان نے مرجھائے ہوئے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔ اس کا زبردستی بھی مسکرانے کو جی نہ چاہا تھا۔

”جی اماں!“ وہ گہری سانس بھر کر بولی ”طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔“
”عاشقیاں سے کوئی کھٹ پٹ تو نہیں ہوگئی؟“ وہ قدرے فکر مند ہوئیں۔
ایقان کے لبوں پر مرورہ سی مسکان پھیلی۔

”کیا کھٹ پٹ ہوئی ہے اماں۔! کھٹ پٹ کے لیے بھی وقت درکار ہے اور وقت ان کے پاس ہے ہی نہیں۔“

”اوہ!“ انہوں نے بغور اس کی بات سنی اور اطمینان کی سانس بھری۔ ”تو بنیا! مرد آدمی ہے۔ سارا وقت تو تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس کے اپنے سودھندے ہوں گے نمٹانے کو۔ تم اپنے کاموں میں جی لگاؤ۔“

”جی جلد اوکھیے۔۔۔“ وہ جل کر رہ گئی۔ ”اور میرے کسی گھٹنے، گھٹنے کی ایسی قسمت نہیں ہے کہ وہ اس سے ٹوٹے یا بھی دو گھڑی کو لگ کر بیٹھ جائیں۔ انسان کس سے دل کا دکھ کھے۔ مائیں بھی شادی سے پہلے بیٹوں کی اور شادی کے بعد دامادوں کی ہوتی ہیں۔“

”بنیا! بات تو حق کی کہنا چاہیے چاہے بیٹی ہو یا داماد!“ وہ اطمینان سے پان لگانے لگی تھیں۔
ایقان زیر لب برزدانے لگی۔ عذرا بیگم نے اندر داخل ہونے کے آثار اس کے تاثرات کا جائزہ لیا اور مسکرا دی تھیں۔

”کیوں ایقان۔۔۔! عاشق کی واپسی قریب ہے کیا؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتی ہوئے بولیں۔
”نہیں بھئی۔۔۔ ابھی قریب!“ پندرہ بیس دن کا قیام مزید۔
”تمہارا چہرہ تو کہہ رہا ہے جیسے وہ کل ہی جا رہا ہو۔“

”میرا چہرہ ہی ایسا ہے۔۔۔“ وہ خفگی سے بولی۔
عذرا بیگم ہنس دیں۔ شفیقہ حیات بھی مسکرانے لگیں۔
”آپ سنا میں کچھ نئی تازی۔“ وہ موضوع بدلنے کی خاطر بولی۔ ”کیا حال اب احوال ہیں سب کے۔۔۔ شہلا اور ہاشم خوش ہیں؟“

”سنائے بھالی بیگم کے مزاج اچھے نہیں ہیں۔“ عذرا بیگم دبا دبا سا مسکرائیں ”شہلا سننے کو بولیں جو ان کی کیا ہے اور بھالی بیگم کے مزاج پر یہ بات گراں گزری ہے۔“

”کیوں۔۔۔ اس میں اعتراض کا کیا سوال؟“ وہ حیران ہوئی ”بھالی بیگم جانتی ہی تھیں کہ شہلا ڈاکٹر ہے۔ اب اس نے اتنی محنت کھر بیٹھ کر رت باندھنے کے لیے توکی نہیں تھی۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو انہوں نے بد مزگی پھیلاتا شروع کر دی ہے چاہی شہلا کتنی مشکلوں سے راضی ہوئی تھی۔ کتنے دھڑکے تھے اس کے دل کو۔ کیا سوچتی ہوگی وہ غریب؟“

”شہلا سمجھ دار بیٹی لگتی ہے۔۔۔ وہ معاملہ سنبھال لے گی۔“ شفیقہ حیات بولیں ”پھر اس کو پرانا تجربہ بھی ہے۔“
سنبھل کر ہی قدم اٹھائے گی۔

”سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ہاشم میاں بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ بد مزگی کی فوجت آنے ہی نہیں دیں گے۔“ عذرا بیگم بولیں۔
”ہاں۔۔۔ یہ کسی سوا باتوں کی ایک بات!“ شفیقہ حیات نے خوش ہو کر ہو کو داد دی۔

ایقان خاموش ہو کر اب شہلا کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

بارنگنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کر کے وہ مصروف و مطمئن سے انداز میں چابی بیگ میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھی تھی تب ہی عقب سے آتی آواز سن کر اس کے قدم ٹھم گئے۔

”شہلا!“ شہلا تیزی سے گھوٹی۔ اس کے گلاسز برابر جیلانی کا عکس پڑنے لگا۔

”تم۔۔۔“ اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی پھر اس نے جھٹکے سے گلاسز اتار کر ادھر ادھر دیکھا۔
”کیا چاہتے ہو تم ابراہ؟ میری بدنامی؟ میری تباہی؟ بربادی؟“ وہ دہلی دہلی آواز میں بولی۔ وہ اداسی سے مسکرایا اور دو قدم آگے بڑھ کر اس کے متقابل آگیا۔

”میں تو خوشی سکون اور شاد آباد زندگی کے متعلق سوال کرنے آیا ہوں شہلا۔۔۔“

”خوشی سکون اور شاد آباد زندگی کے متعلق سوال کرنے؟“ اس نے جھٹکے سے رخ پھیرا۔

”سمجھ کر بھی انجان ہو کر ایک بات ہے۔“

”پبلک پلیس پر میرا تماشا بنانا چاہتے ہو؟ تم چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ بدنام ہو جاؤں؟ ابراہ۔۔۔ خدا کا واسطہ مجھے اب سکون سے جی لینے دے۔۔۔ پھر میرے راستے میں آنا چھوڑ دو پلیز!“

”میں تمہیں تمہارے ہر راستے میں ملوں گا شہلا۔۔۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔ اس لیے کہ اب تمہاری ہر راہ مجھ تک آتی ہے۔ میں تمہاری منزل ہوں یہ بات یاد رکھنا۔۔۔ جہاں پل دوپل کے لیے ٹھہری ہو وہ تمہاری منزل نہیں محض ایک گزر گاہ برقی پڑاؤ ہے۔“

”شہلا نے رنج کا کرشمہ کر کے اپنے قدم بڑھائے۔ ابراہ نے اپنا بازو گاڑی کی چھت سے ٹکا کر غیر محسوس طور پر اس کا رستہ روکا۔ شہلا نے پریشان ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کو اس نے ابراہ کی نگاہوں میں دیکھا تھا پھر گہری سانس بھر کر نظر پھیر لی۔

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو ابراہ۔۔۔ نہ اپنے منہ نہ میرے ساتھ۔“ پھر وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔
”منزل پر پہنچ کر تمہارے خیالات بدل جائیں گے۔ یہ میرا دعوا ہے۔ زندگی میں اتنے رنگ بھر جائیں گے شہلا کہ تمہیں یقین نہیں پائے گا۔ جلد سے جلد فیصلہ کر لو۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔“

شہلا نے ستور نگاہ پھیر کر کھڑی رہی۔
”چننا ہوں۔۔۔ جو کچھ میں نے کہا اس پر منطقی انداز میں سوچنا۔۔۔ مشکلوں کو چھوڑ کر آسانوں کا انتخاب کر لو۔“

وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ چند لمحوں میں اس کی گاڑی شہلا کی گاڑی کے قریب سے نکلی تھی۔ شیشے میں سے ابراہ نے پتھر کا بت بنی شہلا کو غور سے دیکھا تھا۔

دو تہی تہی سی فون تک آئی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ جتنی پن سے بولی۔

”ہیلو ایقان۔۔۔“ وہ سری جانب وہ قدرے تھکا تھکا سا تھا ”کمال ہے یار۔ بتائے بغیر چلی گئیں۔ کم از کم مجھے اپنا پروگرام تو بتا دیتیں۔ کھر لوٹا ہوں تو سنا نے استقبال کر رہے ہیں۔ کیا کروں اس اکیلے پن میں؟“
ایقان طنز سے ہنسی۔

”افوہ... اتنے سالوں سے وہاں جاپان میں یہی ”کیلا پن“ مسہر رہے ہو وہاں تو تمہیں کوئی شکایت نہ ہوئی یا وہاں بہت قربتیں میسر ہیں؟“
عاشق چونکا۔ اس کے لمحے کا طنز اور بدلاؤ بہت واضح تھا۔
”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے گویا سنی ان سنی کی۔
”ہمیں ہیں گھر میں۔“ وہ مختصراً بولی۔
”لینے آ جاؤں؟“

ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ جی چاہتا تھا۔ کوئی ایسا جملہ کہے کہ اس کے اندر کی ساری تپش اس جملے میں گھل کر اس کی سماعتوں میں اتر جائے۔ پھر اگلے ہی لمحے ہر طرح کی مصلحتیں اس کی زبان کے آڑے آ گئیں۔
”مرضی ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔
”کیا بات ہے ایقان۔“ وہ الجھ گیا ”تمہیں ہوا کیا ہے؟“
”خدا حافظ! وہ فون رکھ کر مڑ گئی۔“

”انیقہ! ربیعہ نے کمرے میں جھانکا ”بڑی ہو؟“
”ہاں ہوں تو۔“ اس نے جرنل پر سے سر اٹھا کر جرے پر ڈال دیا۔ ”کوئی ضروری کام ہے؟ میں ذرا یہ ڈالیا کر امز بنا رہی تھی۔“
”مجھے ورہ سے کچھ کام ہے۔ بکس کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی“ انیقہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔
”ہاں تو چلی جاؤ نا۔ اب تو تمہارا آنا جانا رہے گا۔“
”میں اکیلے؟“ وہ متذبذب ہوئی۔
”یار ربیعہ! یہ گز بھر کے فاصلے پر تو گھر پہنچ رہی تھی۔“ وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔
”نہیں نہیں۔“ انیقہ! تم اپنی اسٹڈی کمرے میں چلی جاؤں گی۔ تم ٹھیک ہی کہتی ہو ”اب تو اکثر آنا جانا ہو گا۔“
ربیعہ نے اسے کتابیں چھوڑ کر جلدی سے کہا۔
”شیوور؟“ اس نے پوچھا۔
اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئی۔

دوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے ماحول کو رنگ دیا تھا۔ اس سنہری سنہری شام میں اپنی دھن میں آگے بڑھتا ہوا رافع ٹھنکا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے گیٹ کے دو سری جانب کھڑی ربیعہ بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہری گئی۔
”آپ؟“ وہ مسکرایا ”ہاں؟“
ربیعہ بھی متانت سے مسکرائی ”کیوں۔۔۔ میں یہاں نہیں آ سکتی؟“
”زہے نصیب۔“ وہ قدرے شریر ہوا۔ ”ہزار مرتبہ آئیے۔“
”آپ دروازہ کھولیں“ تب نا۔“ وہ ہنس پڑی۔ رافع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بھی ہنس دیا۔ پھر اس نے کنڈی کھول کر گیٹ وا کیا۔
”تشریف لائیے۔“ یو آر موسٹ ویلکم۔“
ربیعہ قدرے جھینپ سی گئی۔ اندر آ کر اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے سامنے پھیلے بیگلے کے طول و عرض کو دیکھا

تھا۔ شہلا کی ہمراہی میں وہ رابعہ بیگم کے پورشن میں گئی تھی لیکن اب اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کے قدموں کو کس سمت میں بڑھنا ہے۔
”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ رافع نے اس کا چہرہ پڑھا۔ ”میرا خیال ہے شہلا بمبالی اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔“

”جی ہاں۔“ لیکن اس وقت میں درہ کے پاس آئی تھی۔ مجھے اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ شہلا آئی تو خود ہمارے کمرے والی ہیں۔ میں واپس جا کر ان سے ملوں گی۔“
”درہ سے!“ رافع کا چہرہ واضح طور پر بجھا تھا ”اوہ۔۔۔ اچھا آئیں میں آپ کو پھپھو کے پورشن تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

ربیعہ نے روش پر اس کی ہمراہی میں قدم بڑھائے تھے۔ رافع اس سے دو قدم ہٹ کر قدرے آگے چلنے لگا۔ اپنا ہاتھ دھو کر کمرے میں آئی۔ ربیعہ نے بھی قدموں کی رفتار تیز کی۔
اسی لمحے سامنے والے پورشن کا مرکزی دروازہ کھول کر باشم اور شہلا باہر نکلے تھے۔
رافع اور ربیعہ رک گئے۔ باشم بھی انہیں دیکھ کر جیسے ٹھنک کر اپنی جگہ پر ٹھہرا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور استعجاب کے رنگ تھے۔

ربیعہ شہلا کو دیکھ کر تیز قدموں سے اس تک پہنچی۔
”السلام و علیکم۔“ اس نے بے حد گرم جوشی سے ان دونوں کو سلام کیا۔
”علیکم السلام۔“ شہلا نے محبت سے اسے ہاتھ لگایا ”تم مجھ سے ملنے آئی ہو ربیعہ! اندر چلیں؟“
”جی ہاں۔“ ربیعہ نے ہنس دیا ”شرافت سے ہنس دی“ کیونکہ مجھے علم تھا کہ آپ کو اب بھی ہم لوگوں سے ملنے آنا ہے۔ یہاں درہ کے پاس آئی تھی۔ بیکل خریدنے سے پہلے اس سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھی۔“
”اچھا۔ یہ بات ہے۔“ شہلا نے گلابی لباس میں باشم کو غور سے دیکھا ”بہت پیاری لگ رہی ہو ربیعہ۔“
”یہ رنگ بہت اچھا لگ رہا ہے تم پر۔“

”اچھا۔“ وہ جھینپ سی گئی۔
باشم ان دونوں کو محو گفتگو کر چکے تھے رافع کی سمت کھسک لیا۔
”ابے شاعر۔“ اس نے ہنس کر گوتی کی ”تو تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔۔۔ یوں سر عام ہبانگ ہوئی۔“
”نیکو لکھی ہوئی۔“ رافع نے دانت پیسے۔ ”میں اسے پھپھو کے پورشن تک پہنچانے جا رہا ہوں۔“
”ہائے“ باشم نے آدھ بھری ”قسمت کی خوبی دیکھیے کہ کہاں پہنچانے جا رہا ہے“ رافع نے زیر لب اسے برا بھلا کہا۔

”ویسے سچ کہوں رافع۔۔۔“ وہ نزدیک تر ہوا ”جوڑی خوب بیچ رہی ہے۔ اگر میں تعصب کی عینک اتاروں تو میری اور شہلا کی جوڑی کو بھی مات دے دی تو نہ۔۔۔“ رافع نے گہری سانس بھری تھی۔
”باشم! باشم!“
”اوہ کے۔“ اس نے مصاحبتی انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے ”ہم چلتے ہیں۔ تم تھوڑی دور اور اس کے ساتھ چل لو۔“

پھر اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا۔ شہلا اس کی نگاہوں کا اشارہ پا کر ربیعہ سے اجازت چاہ کر آگے بڑھ آئی۔
”جلدی آ جانا۔“ اس نے ربیعہ کو تاکید کی تھی۔
”بس آئی۔“ دھسے گھٹنے میں آئی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

رافع نے جربز ہو کر اپنی نگاہ پھیری تھی۔

”ہائے ربیعہ تم!“ وردہ اسے دیکھ کر کھل ہی اٹھی ”ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔۔۔ پوچھو تو ناعمہ سے۔“

”بالکل سچ!“ ناعمہ بھی مسکرائی ”وردہ آلی آپ کا ہی ذکر کر رہی تھیں۔“

”اؤ اندر چل کر بیٹھیں۔۔۔ ناعمہ! تم ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ وردہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب چل دی تھی۔

ربیعہ ان لوگوں کی محبت اور خلوص سے حقیقتاً متاثر ہوئی تھی۔ خصوصاً ”وردہ“ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ ”حیات دلا“ کے جتنے افراد سے وہ اب تک متعارف ہوئی تھی ان میں سے دو افراد اسے خصوصیت سے اچھے لگے تھے۔ ان دو میں سے ایک وردہ تھی۔

ناعمہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں گہری سیلیوں کی طرح کچھ بھی بات پر ہنس رہی تھیں۔ ناعمہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

”کتنی اچھی لگتی ہیں آپ ہنستے ہوئے۔“ اس نے ٹرے ان کے ہونٹوں پر رکھی اور خود بھی ہنسنے لگی۔

”زیادہ سے زیادہ ہنسا کریں۔“

ربیعہ دفعۃً ”سنبھل گئی ہوئی تھی۔“

”ایسی ہنسی تو کبھی کبھار ہی آتی ہے۔“ نجائے کیا سوچ کر وہ بولی تھی پھر قدرے چونک کر ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

”اور تم لوگ تو یوں ہی ہنسی مذاق کرتی رہتی ہوگی۔ بہنوں کی تو آپس میں خوب ہنسی ہے۔“

ناعمہ نے وردہ کو دیکھ کر منہ بنایا۔ وردہ مسکرا دی تھی۔

”ان کے ساتھ اور ہنسی مذاق؟“ وہ بولی۔ ”انہیں تو میری ہزلیات پر نکتہ اعتراض اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بہن کم اور تاح زیادہ ہیں یہ۔ ہاں رائے آلی سے میری خوب ہنسی ہے۔“

”بہنوں کی اصل قدر شادی کے بعد ہی آتی ہے۔“ وردہ نے اسے چڑایا۔ ”تم کون ربیعہ؟“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ کی شادی کے بعد تم اسے بھی یونہی یاد کرو گی۔“

”جی رہنے دیں۔“ اس نے کپ ربیعہ کو تھمایا۔ ”یہ کون سا رائے آلی کی طرح کہیں دور جاؤں گی جو میں انہیں یاد کروں گی۔“ ناصح بن کر ہمیں رہیں گی۔۔۔ دن رات نصیحتیں کرنے کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“ ربیعہ نے دل چسپی سے وردہ کی شرکیں مسکراہٹ اور ناعمہ کے بھنائے ہوئے انداز کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ سلجوق ماموں کے بڑے صاحبزادے رافع حسن ان کے منگیتر ہیں۔“

ربیعہ کو نجائے کیوں لمحہ بھر کے لیے چکر یا آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا گیا۔ ہاتھ کانپا۔ چائے سا سر میں چٹک لگی۔ لمحہ بھر کی بات تھی پھر منظر صاف ہو گیا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور دھیرے سے مسکرائی۔

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”وردہ نے تو بتایا ہی نہیں کہ یہ انکیجڈ ہے۔“

”شرم کرو کچھ۔“ وردہ نے اسے جھڑکا لیکن اس نے قطعاً ”بروانہ کی۔“

”چند سال قبل بزرگوں کی باہمی رضامندی اور رافع بھائی کی پسند سے یہ رشتہ طے پایا ہے۔“ ناعمہ مسلسل بول رہی تھی۔

ربیعہ کو یوں محسوس ہوا گویا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکے ہیں۔ اس نے چائے کی پیالی ٹرے میں رکھ دی۔

”کوئی نہیں پسند و سہ۔“ وردہ جھٹ بولی تھی۔ ”ناعمہ! تم کچھ زیادہ ہی بول رہی ہو۔“

”بھئی! میں تو سچ ہی بول رہی ہوں۔ کیا غلط ہے کہ رافع بھائی نے عریشہ کے بجائے آپ سے منسوب ہونا پسند کیا تھا؟ ان کے سامنے دونوں آپشنز تھے۔“

”انہوں نے محض ترجیح دی تھی کیونکہ ان کے مطابق عریشہ ان سے کافی چھوٹی ہے۔ باقی یہ کہ اس رشتے کے سلسلے میں باجپے میں کسی قسم کی ذاتی پسندیدگی نہیں تھی۔“

”اللہ۔ تو آپ اس قدر صفائیاں کیوں دے رہی ہیں۔“ ناعمہ شرارت سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ”پسندیدگی اگر ہو بھی تو میں اور ربیعہ ہرگز ملنے نہیں ہوں گے۔ کیوں ربیعہ؟“

”ربیعہ محض مسکرا کر رہ گئی تھی۔ وہ بچہ اس کے اتق پر چمکتی دو نگاہیں اپنی جگہ ہنوز موجود تھیں اور ان میں موجود وہ جذبہ وہ کہانی وہ سیاقی وہ اخلاص؟“

”جھوٹ کہاں تھا کس جگہ تھا؟ ربیعہ سمجھ نہ پائی۔“

”سب کس سوچ میں کیوں گئیں؟“ ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تو وہ جلدی سے مسکرا دی۔

”جھوٹ کی ہوں! سب چاہتے ہیں کہ شادی ہو۔“ وہ سچ کھڑی ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ عاشق اندر داخل ہوا۔

شفیقہ حیات اور عذرا بیگم نے بے حد خوشی اور گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا جبکہ وہ بے نیازی سے اپنے ناخنوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔

عاشق نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ لائٹ براؤن لباس میں اپنی شہتی آنکھوں سے بے نیازی سے اور عذرا بیگم کی ہنسی میں بات چیت کی۔ لیکن اس کی بے نیازی کی وجہ سمجھنے سے وہ ہنوز قاصر تھا۔

”اؤ بھئی عاشق میاں۔“ شفیقہ حیات نے قریب رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہاں بیٹھو ہمارے پاس۔ اچھے لوٹے ہو باہر سے۔۔۔ دنوں چہرہ نہیں دکھاتے۔“

”بس اماں!“ وہ قدرے شرمندہ ہوا۔ ”کچھ دوستوں کے ساتھ مصروف تھا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ چاہنے کے باوجود جان نہ چھڑا سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔“

”ارے اب جانے بھی دو۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”میں نے تو یونہی ایک بات کی۔ تم اپنی طبیعت کا سناؤ خوش باش ہو؟“

”جی اماں! اللہ کا شکر ہے۔ آپ بتائیں، آپ کیسی ہیں؟“ وہ سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔

ایقان منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی تھی۔ اس کا سعادت مندانہ رویہ دیکھ کر اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

”اے بی۔۔۔ یہ تم کون سے منتر پڑھنے لگیں؟“ شفیقہ حیات نے اسے گھورا۔ ”بچہ کب سے آیا بیٹھا ہے چائے پانی ہی پوچھ لو۔“

بہنچ لیا۔
 یقین اور بے یقینی کے اس پل پر سفر کرتی اس کی سوچ اب یقین کے سرے پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ وہ جیسے سارے
 قصے سے آگاہ ہو گئی تھی۔ شک اور بے یقینی اپنا کام دکھا کر تحلیل ہو چکے تھے۔ وہ ایک فیصلہ کن موڑ پر تھی۔

بچوں کو اسکول کے لیے بھیج کر ایقان اندر آئی تو بیڈروم کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی۔ وہ نما دھو کر آئینہ کے سامنے موجود تھا۔ بالوں میں تولیہ رکڑتے ہوئے بے حد فریش موڈ میں وہ کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔

”یاں! چائے دو جلدی ہے۔“ آئینے میں ایقان کا عکس دیکھ کر وہ بولا اور بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

ایقان خاموشی سے پٹی تھمتھی۔ کچن میں آکر چائے بناتے ہوئے وہ خود میں چولیس سے زیان تیش اور کھولتے ہوئے پانی سے زیادہ کھولاؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا یہی آگ وہ عاشر کے وجود میں بھی بھر کا دے۔

بے حد مصروف سے انداز میں وہ ٹیبل پر اخبار بچھائے شہ سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ ایقان نے جانب بکلم کوپ لہجے سے اس کے سامنے رکھا اور کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آئی تھی۔ کرسی گسیٹ کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

چائے پیتے پیتے عاشر نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور بے حد چونکا۔

”ایقان! کیا ہوا تمہیں؟“

”طبیعت خراب ہے؟ اتنی سرخ آنکھیں جیسے روتی رہیں ہوں رات بھر۔“ اس نے ہاتھ برہا کر اس کا ہاتھ چھوٹا چاہا ایتقان نے اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ایقان نے عین اس کی نظروں کے سامنے مٹھی کھولی تھی کہ وہی ہلکے ہاتھ پر وہی آشوب مچا تھا۔
”کیا ہے یہ؟“ عاشر نے حیران ہو کر پوچھا۔

عاشق مجھ کا ہوا گیا۔ اس نے دیر پیسے سے ثبوٹ اٹھایا اور اگلے ہی پل مجھ سے سمجھ گیا۔ اس میں سے لڑا کے مخصوص ریفرم کی نہایت تیز خوشبو آ رہی تھی۔

”یہ کہاں سے آیا؟“ اس نے ایتقان سے پوچھا۔
”غیر ضروری سوال ہے۔۔۔ ان ضروری سوالوں کا جواب دو عاشر! جو میں نے تم سے پوچھے ہیں؟“ عاشر نے

”میں کہہ سکتا ہوں ایقان! کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا۔ یہ لڑا کی حرکت

”جیسے اس کے لیے جان بوجھ کر یہ میری جیب میں رکھا ہو گا۔“
ایقان کا نفس تیز ہو گیا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

”جائے ہو عاصرا! مردے زیب بن لیے لباس میں اگر کوئی لڑکی کچھ رکھنا چاہے تو اسے اس مرد کے کتنا قریب ہونا پڑتا ہے؟“

عاشقِ لمحہ بھر کے لیے دم بخود سا ہوا پھر وہ کچھ بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرنے لگا۔
 ”دیکھو ایقان! بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ دیر اصل میں تمہیں بتانا چاہا
 ”کہوں ہے یہ لڑا؟“ وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔

”جاپان؟“ بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”وہ جاپان سے تمہارے ساتھ آئی ہے۔“
 ”نہیں۔“ وہ جڑبڑہوا۔ ”وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ وہ بعد میں۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی آئی ہے۔“
 ”تمہارے لئے اربورٹ گئے تھے؟“

”اور۔۔۔ اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے دوست کی فیملی آئی ہے۔ اور اس دن کے بعد سے تم پورا پورا
 پسند پادھی پادھی رات تک غائب رہے۔۔۔ مجھ سے مختلف جھوٹ بول کر اپنی مصروفیت کا جواز پیدا کرتے
 رہے۔ اور۔۔۔ اور عاشرؑ میں یا گل بوجاؤں گی۔“

”ایقان۔۔۔ پلیزیار! مجھے راضی رہا ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ محض وقت گزاری کے چند لمحات۔۔۔ صل اس نے مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں نہ چلا سکتا ہوں۔۔۔ وہاں جاپان میں اکیلے پن کی وجہ سے ہم کچھ بے ہو گئے تھے۔“

وہ بکھڑے والے انداز میں بے تکلفی سے وضاحت کرنے کی کوشش میں نجانے کیا کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔

”تم نے مجھے بہت برا دکھایا ہے، تاہم اب بہتر بات یہ ہے کہ بے یقینی، بے اعتباری کا دکھ بے وفائی کا دکھ سے کم ہے۔ میں کچھ پیہہ کر سکتی ہوں، لیکن اپنی بے توقیری نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے میری ہی نظموں میں گرا دیا۔ کبھی، خاف نہیں

وہ روتے ہوئے انھی اور بھاگتے ہوئے چار دھم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر لیا تھا۔ عاشر

بالی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا روگینہ تھا۔

رہیجہ کو دور سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ سامنے جو جھلسلا ہٹ دکھائی دے رہی ہے۔ وہ یقیناً پانی کی ہے۔ وہ بہت بڑا
 سا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس پر جھلسا ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ چاندنی رات میں اس کے شفاف پانی کی جھلک چاند کی

رہیہ قدم برعکس چلی گئی لیکن یہ کس؟ وہ جتنا آگے بڑھتی تھی۔ مانی بھی اتنا ہی دور ہٹ جاتا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے

کیا وہ سراسر آبِ تھما نکلیاں کسی رنگِ زار میں تھیں کیا وہ فریبِ نظر تھا کیا وہ کوئی تمنا تھی؟

”ریحہ بھانسنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگوں میں درد ہوئے لگا لگیں پانی اتنا ہی درد۔“

”کس کی آواز ہے یہ؟“ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ شناسا، مہربان آواز۔

”ربیعہ ربیعہ آؤ۔ میں یہاں ہوں ربیعہ تمہارے سامنے۔“

ربیعہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ دفعتاً چاند کو بادلوں نے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ کچھ لمے قبل جگمگاتا ماحول اچانک اندھیرے میں بدل گیا اور پھر ربیعہ نے بارش برستی محسوس کی۔

اس نے ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ آواز اسے مسلسل پکار رہی تھی۔ ربیعہ کا ذہن اس کی پہچان کو گرفت میں لانے سے قاصر تھا لیکن شناسائی مسلسل محسوس ہو رہی تھی۔

”کون ہو تم؟ کون ہو تم؟ کہاں ہو تم؟“ وہ پانگلوں کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔

یہ ایک اسے ٹھوکر لگی۔ بڑے زور کی ٹھوکر۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ گر پڑتی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی گہرے گہرے سانس بھر رہی تھی۔ اس کے سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ برابر میں لیٹی ہوئی انیقہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ربیعہ۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

ربیعہ بھی اٹھ کر بیٹھی۔ ”پانی۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔ ”مجھے پانی چاہیے۔“

”میں لاتی ہوں۔ تم شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔“ انیقہ نے اس کا شانہ پھینک دیا اور بستر سے اتر کر فرنگ کی جانب بڑھ گئی۔

اپنی سانسوں سے ابھرتی ربیعہ اب خود سے الجھ رہی تھی۔ کیوں؟ کبھی کسی نے ایسے خواب؟ کس کی دعوت بہیم اسے بلاتی تھی؟ اسے کہاں جانا تھا؟ اس کے لاشعور میں کیا فتنے تھے؟

انیقہ اسے پانی پلا کر پھر سے لیٹ کر سوچنے کی تحریک دی۔ لیکن ربیعہ اب پچھلی کئی بار کی طرح نہ سو سکی۔ اب وہ سنجیدگی سے ان خوابوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ تسلسل اتفاق نہیں تھا۔ کوئی واقعی اس کا منتظر تھا۔ لیکن کون؟

وہ تیزی سے ریکٹ تھماتے ہوئے اپنے پورے بدن کی جانب جا رہا تھا جب اس نے لان کے پچھلے حصے میں چھت کو جاتی ہوئی میڑھیوں پر کسی کو بیٹھ دیکھا۔

نافع ٹھہر گیا۔ دور سے واضح نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس وقت اس یا سیت بھرے ماحول میں اس طرح شمالی میں کون بیٹھ سکتا ہے۔ ایک کڑواہٹ سی اس کے حلق میں اتری تھی۔ جھٹک کر اس نے پہلے کی طرح ریکٹ تھماتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا لیکن نجانے کیا بات ہوئی۔ وہ آگے بڑھ نہ سکا۔

اس نے پھر اسی جانب دیکھا۔ چند لمے سوچا پھر اس کے قدم بے اختیار ہی میڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ وہ عریضہ ہی تھی۔ کاسنی رنگ کے ملگے ملگے شکن آلود لباس میں ملبوس آنکھوں پر تھوڑی نکاسے والے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ نافع اس کے قریب جا رہا تھا۔ عریضہ نے سر اٹھایا دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں پھر اس نے کسی تاثر کے بغیر واپس سر جھکا لیا۔ نافع نے دیکھا ان نگاہوں کی وہ پچھلی حقارت اور نفرت اب معدوم تھی۔ اب وہاں سنجے ہوئے چراغوں کی سی کیفیت تھی۔ نہ کوئی تاثر نہ سوچ نہ خیال۔

اس نے گہری سانس بھری پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ عریضہ کے وجود میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

”عریضہ۔“ اس نے نرم لہجے میں پکارا۔

”کہو؟“ بے تاثر جواب آیا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

”سب مسئلے ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو ایک انتظار باقی ہے۔“

”کیسا انتظار؟“ وہ الجھا۔

اس بات کا کوئی جواب نہ آیا تھا نافع کچھ دیر خاموش رہ کر لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔

”دیکھو عریضہ۔“ پھر وہ بولا۔ ”کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ نکالا جاسکے۔ میں جانتا ہوں۔“

جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے تم ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گئی ہو اور جب سے نکاح ہوا ہے تب سے تو۔ تم جیسے بالکل بچھ ہی گئی ہو۔ دیکھو۔ میں ایک کھلے ذہن کا انسان ہوں۔ میں چاہتا ہوں ہر انسان کو اپنی ذاتی رائے پسند ناپسند کے مطابق فیصلے کرنے کا کلی اختیار ہو۔ میرا خیال ہے ہمارے معاملے میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسی بات نے تمہیں ہرٹ کیا ہے غالباً شاید میں تمہارے اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو تم نے اپنے جیون ساتھی کے بارے میں اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ عریضہ یوں بیٹھی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ کسی اور سے کہہ رہا ہو اور عریضہ نا۔

”ان باتوں کے متعلق ابی نہ ہو۔“

”عریضہ! اگر ایسی باتیں ہیں اور تمہاری اس کیفیت کی وجہ یہی ہے تو یقیناً مانو میں کسی جبر کسی زبردستی کا ساتھ نہیں دوں گا۔ تم میں نہ ہو لیکن مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں ایسے جبری فیصلوں کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہوں۔“

قانوناً شریعاً تم میری بیوی ہو لیکن اگر تمہارا دل اس رشتے کو تسلیم کرنے سے شدت سے انکاری ہے تو میں اتنا ظریف رکھتا ہوں کہ تمہیں پابند رکھنے کے بجائے آزاد کروں لیکن۔ لیکن پلینرٹ ایک مرتبہ اپنے منہ سے کہہ دے کہ تم آزادی چاہتی ہو۔ یہ بند صن تمہارے لیے تکلیف دہ ہے۔ تم ایک مرتبہ کہہ دو پھر پھر وہی ہو گا جو تم چاہتی ہو۔ ایک جیسے جاگتے انسان کو اس تکلیف دہ حالت میں دیکھنا کلم از کم میری برواشت کی حد سے باہر ہے۔“

عریضہ کی جھجھکی آزادی سے تھی۔ وہ اسے اپنے لیے کچھ بوجھ جو اب وہ کھڑی بات کا۔

”مجھے کسی بند صن یا آزادی سے اب فرق نہیں پڑتا نافع۔“ بالآخر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوئی تھی۔

”میں اب جیسی ہوں، مرتے دم تک شاید ایسی ہی رہوں گی۔ آخری دم سے بس اسی کا انتظار ہے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ اگر تم اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہو۔ کوئی قدم اٹھانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے۔ میں ہمیشہ تم سے دست بردار ہو چکی ہوں۔“

وہ دیر سے دیر سے چلتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔ نافع حیرانی سے بیٹھا اس کے لفظوں پر غور کرتا رہا۔

شہلا تھکی باری ہاسپٹل سے لوٹی تو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ پانی پینے کی غرض سے وہ کچن میں داخل ہوئی تو جلنے والے تیروں سے فردوس بیگم نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ شہلا ٹھٹھک سی گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے مسکرا کر شیریں لہجے میں سلام کیا۔

”اول۔ والسلام۔“ انہوں نے جواب دینے کے ساتھ سر کو بھی جھکا دیا تھا۔

”آپ۔ کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے ان کے لیے کون نظر انداز کرتے ہوئے دو ستانہ سے انداز میں پوچھا۔

”دور ہے ہیں اپنی جان کو۔“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”توڑ تھی ہڈیوں کو ٹکس رہے ہیں۔ سوچا تھا۔ سو گھر میں آئے گی تو جان کو سکھ نہیب ہو گا۔ ہم بھی تھوڑا آرام کر لیں گے۔ لیکن ہم سے بد نصیبوں کی قسمت

میں آرام ہو تب نا۔ صبح ہانڈی شام ہانڈی۔ یہی کرتے ہم چار دن بیمار ہوں گے اور خیر سے اپنی آرام گاہ کو پہنچیں گے۔ سو کوئی سربے مریض بنانے سے فرصت نہیں۔“

شہلا حد درجہ تجل ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چچہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”آئی ایم وری سوری۔ میں کل سے ضرور کھانا پکا کر ڈیوٹی پر جاؤں گی۔ آفٹر آل یہ بھی میری ڈیوٹی ہے۔ آپ آرام کریں میں کھانا پکاتی ہوں۔“

فردوس بیگم نے ہاتھ میں پکڑا چچہ اسے دینے میں تامل نہ کیا تھا۔

”آلو ڈلیں گے گوشت میں۔ دال بھی رکھنی ہے دوسرے چوسے پر۔ میں سوچ ہی رہی تھی۔“

”میں۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ آپ جائیں پلیز۔“ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

”اے ہاں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ کہاں تک چپ رہتے۔“ وہ زیر لب برہماتے ہوئے باہر نکلی تھیں۔

شہلا نے نجانے کب کار کا سانس خارج کیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر کے گوشت بھوننا شروع کر دیا تھا۔

”ویسے سچ کہوں رافع! جوڑی خوب بچ رہی ہے۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا شرارتی لہجہ گونجا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی گلابی کپڑوں میں ملبوس وہ بار سنگھار کے پھولوں سی لڑکی پردہ افق پر مسکرانے لگی تھی۔

رافع نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

”خدا کرے رافع! تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔ ہاشم بڑا بھلا لڑکا تھا۔“

”ستیاناں تیرا۔“ وہ برہم دیا۔ ”اور کوئی بدعا نہیں دے سکتا تھا ہاشم۔“

”میں نے تجھے بدعا نہیں دے دی ہے۔“ ہاشم کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔

”ٹھیک ہی کہتے تھے تم ہاشم میاں! بد دعا دی تھی تم نے مجھے میری پرسکون، مطمئن زندگی میں اضطراب کی لہریں تمہاری اس بد دعا سے ہی اٹھی ہیں۔ ہم نے تمہارے لیے دعا کی ہیں اور دیکھو عتم مطمئن اور شاداب بیٹھے ہو۔ بولو حق دوستی کس نے ادا کیا؟“

وہ اٹھ کر شہلے لگا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ رات کی ٹھنڈی ہوا میں کھلی چست پر چلتے رہے۔

رات پھیلی ہے تیرے سر میں آچل کی طرح
چاند نکلا ہے تجھے دھونڈنے پاگل کی طرح

نجانے کہاں کس نے نور جہاں کی آواز میں خوبصورت غزل لگائی ہوئی تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے ریلے لیکن اپنی آنچ میں مدھم مدھم سلکتے بول اس کی سماعتوں سے آکر اٹنے۔

رافع کا دل یکدم اداس ہو گیا، بے طرح، بے حد اداس۔ ایک عجیب تڑپ تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسے دیکھنے کی تڑپ۔ اسے پانے کی تڑپ۔

پھر اسے کچھ چہرے یاد آئے۔ اپنی ماں کا شگفتہ، مسکراتا چہرہ۔ اپنے باپ کا بارعب مگر پر شفقت چہرہ۔ اپنی بیوی پیمپس کا اداس مگر پر یقین چہرہ۔

وہ اتنے چروں سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ وہ صرف خود سے جھوٹ بول سکتا تھا اور اب تک بول رہا تھا لیکن شاید اب اس میں بھی ناکام ہو چلا تھا۔

”رافع! اسے اپنے باپ کے الفاظ اب تک یاد تھے۔ ”تم میرے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ میری امیدوں“ آرزوؤں کا مرکز۔ نجانے کیوں ہر باپ کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی اتنی شدید تمنا ہوتی ہے۔ تیرے۔ تمنا پوری ہونے میں تو ابھی وقت ہے لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں بیٹا کہ اس خاندان کے افراد ایک دوسرے کی منصوبہ بندی ہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت، ایک دوسرے کا مان ہیں اور ہم بزرگوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طاقت میں اضافہ کریں گے، کمی نہیں۔ بیٹا! تم جوان ہو یقیناً تمہیں تمہارے فیصلے کرنے کا اختیار ہونا چاہیے لیکن اگر تم یہ اختیار اپنے والدین کو سونپ دو تو ہم مرتے دم تک تمہاری فرماں برداری پر مشکور رہیں گے۔“

”آپ جیسا کہیں بابا! اس نے سعادت مندی سے کہا تھا۔“

”بھائی صاحب کا عندیہ عریضہ کے لیے ہے اور رابعہ کا وردہ کے لیے۔ اب تم بتاؤ، تمہاری پسند کیا ہے؟“

”میری پسند ناپسند کچھ نہیں ہے بابا! میں نے کہا تھا آپ کو اختیار ہے۔“

”عریضہ تو۔“ وہ جھجکا۔ ”ابھی کافی کم عمر ہے اور قدرے نا سمجھ۔“

”ہوں! اور وردہ۔“

”وردہ پسند نہیں بابا! میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ جو آپ بہتر سمجھیں۔“

”ہوں، ٹھیک ہے بیٹا! اب تم جاؤ، آگے سوچنا ہمارا کام ہے۔“

اور وہ مطمئن سا چلا آیا تھا۔ گزرے ہوئے سالوں میں اسے کبھی یہ باتیں یاد نہ آئی تھیں لیکن اب اکثر یاد آتی تھیں۔

”کبھی کبھی اس لڑکی کا چہرہ یاد آتا ہے۔“ وہ سوچوں کا رخ سوڑے۔ وقت اٹھے قدموں چل پڑے۔ اس کا دل اکثر یہ لہا حاصل تمنا کرنے لگا تھا۔

دیوار کے ساتھ گئے ہوئے چھوٹے گٹوں میں پانی ڈالتے ہوئے وردہ ٹھنکی تھی۔

حمزہ کی ہمراہی میں ایک بے پردہ خوبصورت، چھوٹے قد کی ماڈرن سی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ وہ ٹھنکی سے مسکرائی۔

وردہ اٹھ کر تھکے ہوئے ہاتھ ملایا۔

”وردہ آئی! یہ ناعمہ کا پوچھ رہی تھیں۔“ حمزہ بولا۔ ”میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔“

”آپ! ناعمہ کی فرزند ہیں؟“ وردہ نے دلچسپی سے اس کا روشن چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ”میں نے انہیں کالج میں دیکھا ہے۔ ویسے میرا نام فریحہ ہے۔ آپ کی تعریف؟“

”میں وردہ ہوں۔ ناعمہ کی بڑی بہن۔“

”اے ناعمہ گھر پر ہیں؟“

اسی لمحے کمرے سے کوئی گانا تیز سروں میں گنگناتی بے فکر ناعمہ باہر نکلی تھی۔

باقی اگلا شمارہ میگزین

منور امین کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن تراز اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ ربیعہ کا سہارا کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منزہ بیگم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔ ہاشم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریشہ کا نکاح پڑھا دیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔ شادی کی اولین رات ابرار جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔ فراز خود حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے فراز کی آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز یہی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔ رافع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا علم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔ لڑا عاشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلا سارے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ وردہ کے مشورے سے ایم ایسے سو سیالوٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاشر لڑا سے ملنے ہوئے آتا ہے تو لڑا اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً ”صدے“ لگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ وردہ سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ وردہ کی منگنی رافع سے ہو چکی ہے۔ لڑا اسے صدے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بلندی میں لایا گیا فیصلہ سنا کر رہا ہے۔ وہ وردہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

۲۵

پچیسویں قسط

فریحہ نے بے حد اشتیاق سے بھولے چہرے والی ناعمہ کو دیکھا تھا۔ وردہ جو فریحہ کو بغور دیکھ رہی تھی ان نگاہوں کی معنویت پر قدرے چونک سی گئی تھی۔ ناعمہ بھی ایک اجنبی مگر خوبصورت اور خوش لباس لڑکی کو گھر میں دیکھ کر ہنسی۔

”ناعمہ! یہ فریحہ ہیں۔ تم سے ملنے آئی ہیں۔“ وردہ نے نرم لہجے میں کہا۔

ناعمہ نے ایک مرتبہ پھر گڑبڑا کر ان دونوں کو دیکھا۔ ”مجھے سننے؟“ وہ حیرانی سے ناک چڑھا کر بولی۔

فریحہ کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ وردہ قدرے بھنائی تھی۔

”آئیں فریحہ!“ وہ خود ہی بولی تھی۔ ”اندر چل کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

فریحہ نے ہنوز مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وردہ آگے بڑھی تو فریحہ بھی اس کی ہمراہی میں قدم بڑھانے لگی۔ ناعمہ پہلے تو ہونقوں کی مانند کھڑی رہ گئی پھر کچھ خیال آنے پر وہ بھی تیزی سے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھی تھی۔

”کیا ایس گی آپ؟“ وردہ نے شائستہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”کو لڈ ورنک یا پھر چائے؟“

”میں جائے شوق سے پتی ہوں۔“ وہ بات بے بات مسکراتے اچھی لگتی تھی۔
 ”آپ ناعمہ سے باتیں کریں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ ورد وہاں سے اٹھ گئی۔
 اس کے جانے کے بعد فریحہ ناعمہ کی جانب متوجہ ہو گئی جو خود بھی اسے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔
 ”تو آپ ہیں ناعمہ!“

”جی ہاں۔ میں ہی ناعمہ ہوں۔ آپ مجھے کس حوالے سے جانتی ہیں؟“ وہ قدرے حیرانی میں مبتلا تھی۔
 ”ہے ایک حوالہ۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔ ”پھر بتاؤں گی۔“
 ”آپ مجھ سے ملنے ہی آئی ہیں؟“ ناعمہ کو یقین نہ تھا۔
 ”یہی سمجھ لیں۔“ وہ مختصراً بولی۔ ”کون کون ہوتا ہے آپ کے گھر میں؟“

”یہ میرے نانا ابو مرحوم کا بنگلہ ہے۔“ ناعمہ اسے بتانے لگی۔ ”یہاں ہم لوگ علیحدہ علیحدہ پورشنز میں آباد ہیں۔ دو پورشنز میں ہمارے دو ماموں اور ان کی لمبلیز ہیں۔ یہاں امی، میں اور ورد آئی ہو جتے ہیں۔ بروی دھن کی شادی ہو چکی ہے۔“
 ”آپ کے والد؟“

”ہمارے بچپن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”اوسہ بی سوری۔“ فریحہ بولی۔

”اور آپ؟“ ناعمہ اب تک اچھی ہوئی تھی۔ ”آپ بھی کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟“

فریحہ نے اچانک ہی اپنا پرس کھول کر ایک تصویر پر اشارہ کیا۔ وہ تصویر ناعمہ کی آنکھوں کے سامنے کی تھی۔

”میں ان کی بہن ہوں۔ انہیں جانتی ہیں نا آپ؟“

ناعمہ نے فراز کی تصویر دیکھی۔ کئی مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس کے چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا تھا۔

فریحہ نے تصویر واپس پرس میں ڈال لی۔

”فراز بھائی اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں اسی لیے مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ میں اسی شوق کے تحت میں یہاں چلی آئی۔“

ناعمہ گم صدمہ سی ہو گئی تھی۔ دو دو اناہ سال کا جو چند ایک مرتبہ اس سے ٹکرایا تھا وہ بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا تھا؟ اور فریحہ کے ”یونی“ چلے آنے کے پیچھے کیا عندیہ پوشیدہ تھا؟ اس کا دماغ الجھ سا گیا۔

”تم پریشان کیوں ہو گئی ہو ناعمہ؟“ فریحہ نے اس کا چہرہ دیکھا تو اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولی۔
 ”میں یہاں شہس پریشان کرنے تو نہیں آئی۔“

ناعمہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسی لمحے ورد چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تو فریحہ اطمینان سے صوفے سے ٹیکہ لگا کر بیٹھ گئی۔ ورد چائے بنانے لگی۔ اسی اثناء میں رابعہ بیگم بھی وہاں چلی آئیں۔
 ”السلام علیکم۔“ فریحہ انہیں دیکھ کر غظیماً اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”و علیکم السلام۔ جیتے رہو۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پرہت ہو ناعمہ کے ساتھ؟“

”جی؟“ وہ لمحہ بھر کور کی۔ ”یونی سمجھ لیں آئی!“

ناعمہ نہ جانے کیوں اس ساری صورت حال سے ہراساں سی ہو رہی تھی۔ رابعہ بیگم کے وہاں بیٹھتے ہی وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ فریحہ کی آمد کا مقصد کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا لیکن اس کا معنی خیر سا انداز اسے ابھار رہا تھا۔
 ”میں نے ناعمہ کو شہلا آلی کی شادی میں دیکھا تھا۔“ فریحہ رابعہ بیگم کو بتا رہی تھی۔ ”میرے بڑے بھائی فراز احمد عباد بھائی کے بہت اچھے جگر دوست ہیں۔ اسی حوالے سے ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں۔“

”اچھا اچھا۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔
 ”ناعمہ مجھے اچھی لگی۔ اسی لیے میں آج آپ لوگوں سے ملنے چلی آئی۔“ وہ ایک پس کھاتے ہوئے کہہ

رہی تھی۔ رابعہ بیگم اور ورد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں خوشی کی کیفیت تھی۔ فریحہ کو دیکھ کر اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کا بخولی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

”بھروسہ ہو رہی ہیں کہ یہ سب کچھ سچ ہے؟“ فریحہ نے پوچھا۔
 ”اے گھر والوں کو کچھ بتاؤ!“

اس کے اٹھنے پر رابعہ بیگم نے غصے سے حد خوشی اور شوق سے کہا تھا۔
 ”ضرور آئی! اب تو آنا جانا رہے گا۔“ مسکرائی تھی۔

”مما۔“ مومن نے ایتقان کا شانہ بلایا۔
 ”مما! آپ کی سچی آنکھوں میں سے مومن کی جانب سے کچھ۔“

”مما! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“ وہ اس کی آنکھوں کو غور دیکھ رہا تھا۔ ایتقان نے گہری سانس بھر کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

”مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جانو۔ ہمیں پوچھنا ہے اس لیے۔“
 ”آپ بھانے ناراض ہیں؟ انہوں نے رات آپ کو اتنی آوازیں دیں۔ آپ نے بیڈروم کا دروازہ کیوں نہیں کھولا؟“

ایتقان چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر اس نے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے۔ ”آپ نے ہوم ورک کیا؟“

”نہیں کرواؤں گا۔“ آپ کو بتا ہے میں اکیلا ہوم ورک نہیں کر سکتا۔ لیکن پہلے کھانا تو دیں مجھے اتنی بھوک لگی ہوئی ہے۔ آپ نے آج کھانا نہیں پکایا ممما؟“

چند آنسو ایتقان کے اندر گرے۔ اس نے مومن کو سینے سے لگا لیا۔
 ”میں آنے بتایا تھا۔ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے۔ ایمان سوری ہے اب تک؟“

”وہ تو سوری ہے ممما۔ لیکن مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“
 ”چلو میں آپ کو برگر بنا دوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ مجھے آپ چکن ڈال کر نوڈلز بنا دیں۔“ اس کے چہرے پر چمک آ گئی۔
 ”اچھا۔ بنا دیتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ اس کے سر میں درد سے دھماکے سے ہورے تھے۔ پچھلے چند روزہ تینوں سے اس نے اپنی کاغذوں تک حلق سے نہ اتارا تھا۔ ناشر نے پہلے اس سے بات کرنے کی بہتری کی کوشش کی تھی پھر وہ اسے

41

Photo.com

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مثنوی آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی روایتی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے ترتیبی سے محفوظ رکھیں۔

ربیعہ نے فریق بند کر کے لمحہ بھر کے لیے غور سے سنا پھر وہ نوکری ایک طرف ڈال کر تیزی سے اندر کی جانب بھاگی تھی۔ کمرے کا منظر اس کے ہاتھ پاؤں پھیلا دینے کے لیے کافی تھا۔ منیہ بیگم بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ ان کے پیٹ کے پچلے حصے پر سختی سے جمے ہوئے تھے اور وہ بری طرح سے گراہ رہی تھیں۔ ربیعہ دوڑتی ہوئی ان تک پہنچی۔

”آئی۔ آئی۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

”درد بہت ہے ربیعہ!“ وہ رو روئے کو تھیں۔

شدت ضبط سے ان کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا۔ آپ تھیں گھرے حلقوں میں اتری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”آئی۔ آئی۔! میں۔! میں۔! میں کیا کروں۔؟“ ربیعہ کے ہاتھ پیر پھول چکے تھے اور عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”میری بچی۔! میری بچی۔!“ منیہ بیگم تڑپنے لگی تھیں۔ ”میری بچی کو بلا دو۔“

”لو۔“ ربیعہ کی عقل گویا ٹھکانے پر آئی۔ فون اٹھا کر وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شہلا کا موبائل نمبر ڈائل کرنے لگی۔

شہلا ہاسپٹل جانے کے لیے تیاری کے آخری مراحل میں تھی جب اس کے موبائل کی بیل بجی۔ غلٹ میں کھائی پر نازک سی سلور ریسٹ وائچ ہاتھ دھتے ہوئے وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل تک آئی۔

اسکرین پر روشن نہیں دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”ہی! سلام علیکم۔“ اسے دوسری جانب سے منیہ بیگم کی آواز کی توقع تھی۔

”شہلا! آئی۔! میں ربیعہ۔! آپ۔! آپ جلدی سے یہاں آئیں۔! آئی کی طبیعت بہت خراب ہے۔“

ربیعہ کا انداز ہی نہیں الفاظ بھی ایسے تھے کہ شہلا کا وجود کانپ کر رہ گیا۔

”کیا۔! کیا ہوا امی کو؟“ وہ ہکا بکا لگی۔

”مجھے نہیں پتا۔ بس آپ جلدی آئیں۔“ وہ رو روئے کو تھی۔

شہلا پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ لمحہ بھر میں وہ مرکزی گیٹ پر تھی۔ سامنے ہی رافع اپنی بانٹیک اشارت کر رہا تھا۔ شہلا تیزی سے لپکی۔

”رافع۔! رافع پلینز۔! مجھے امی کے گھر لے چلو۔! ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔“

”کیا ہوا بھائی؟“ وہ بھی گھبرا گیا۔ ”ایسا کیا ہو گیا؟“

”پتا نہیں۔! بس تم جلدی چلو۔“ وہ اس کے پیچھے بٹھتے ہوئے بولی۔

رافع نے بانٹیک دڑادی تھی۔

اس کے حال پر چھوڑ کر شہلا نے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ایقان نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا تھا۔ اسے تو بس اتنا ہی علم ہو رہا تھا کہ عاشر کی زندگی میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اور یہ خیال سوہانِ روح تھا۔ جتنا سوچ رہی تھی گتیاں اتنی ہی الجھتی چلی جا رہی تھیں۔

موسم کو نوڈلز کا پیالہ دے کر وہ فریق سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر پھر کمرے میں چلی آئی۔ گھونٹ گھونٹ ٹھنڈا پانی اپنے اندر امارتے ہوئے اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ عاشر کو معاف کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ عاشر نے اس کے اعتماد کو بے حد ٹھیس پہنچائی تھی۔ اور بات صرف اعتماد کی کب تھی؟ یہاں تو محبت جیسی شے داؤ پر لگی ہوئی تھی جس کے پیچھے وہ آنکھیں بند کیے اتنے سالوں سے چلتی چلی جا رہی تھی۔

ایقان کی نگاہوں میں گزشتہ زندگی کے سارے مناظر ایک ریل کی مانند چل رہے تھے۔ وہ کالج کا خوبصورت

زمانہ، شہلا اور اس کی بے مثال دوستی کے دن۔ پھر شہلا کو ابراہار اور اسے عاشر مل گیا تھا۔ دونوں سیکیولر کے تھے تو

ایک ساتھ ہی زندگی کے نئے دور کا آغاز کیا تھا۔

ایقان اس حساب سے خوش قسمت نکلی تھی کہ اس کی محبت کو کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ عاشر کا

رشتہ آنے پر جب گھروالوں کو اس کی عاشر کے ساتھ انوالوومنٹ کا حکم ہوا تب اماں اور بھائیوں کی پیشانیوں پر بل

ضرور پڑے تھے لیکن کسی نے بھی ان دونوں کے مابین آپہننے کی کوشش نہ کی تھی سوائے فردوس بیگم کے جو اس کی

شادی آخر میاں سے کرنے کی خواہش مند تھیں لیکن گھروالوں نے ایقان کی خواہش کو مقدم جانتے ہوئے عاشر کا

رشتہ قبول کر لیا تھا۔

عاشر ایک خوبصورت طبقے سے تعلق رکھنے والا اچھا لڑکے خواہوں میں جینے والا تھا۔ ایقان کی

صورت بہت سے خوبصورت خواہوں کی تعبیر مل گئی تھی لیکن اس کے خواہوں کا ایک بڑا حصہ حصول آسائشات

سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے آگے سے آگے بڑھنے کی جستجو تھی۔ سو ایقان کے بہت روکنے پر بھی وہ خود کو آگے جانے

سے نہ روک سکا۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں میں ہی وہ بچہ پیدا کیا تھا کہ اگر کچھ بننا ہے تو جدائی کے سمندر کو پار کرنا

پڑے گا۔ سو وہ کوشش پیہم میں مصروف رہا اور ایک دن اسے سالوں کی جدائی کی نوید سنا کر جاپان چلا گیا۔

ایقان محبت کے پانی کی پھلی تھی۔ اس کی زندگی میں سب کچھ محبت سے ہی چھلکتا تھا لیکن محبت کے ساتھ

ساتھ اس کے اندر نہایت متضاد صورت میں انا اور خود پسندی کا جذبہ بھی ایسی شدت سے چھلکتا تھا کہ وہ ایک

وقت محبت اور محبوب دونوں بننا چاہتی تھی۔ وہ محبت میں پوجا کی قائل نہ تھی۔ کچھ وہ کچھ لو کا اصول اس کے اندر

پورے توازن کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اتنے سالوں بعد اچانک یہ توازن اس طرح بگڑا ہوا محسوس ہوا تھا کہ وہ

خود کو پھلی کی صورت تالاب سے باہر پڑا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ایک تڑپ تھی جو عضو عضو کو کرب میں مبتلا

کر رہی تھی۔ اس نے عاشر کو اتنا چاہا تھا کہ اس کی بے وفائی کا خیال اس کی رگ جال کو خنجر کی مانند کاٹ رہا تھا اور

جتنا تڑپ رہی تھی کچھ گزر کرنے کا خیال اتنا ہی قوی ہوتا جا رہا تھا۔

پلاؤ کو دم دے کر ربیعہ سلا دینے کے لیے فریق سے سبزیاں نکال رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس سے آواز دے رہا ہے۔

چند منٹوں میں وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ منیوہ بیگم کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔
 نے انہیں سلام کیا۔ وہ پیسہ پیسہ ہو رہی تھی۔

شہلا نے اپنا فرسٹ ایڈ باکس منگوایا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے انہیں فوری طور پر اڑا
 کرنے والی بین کمر ٹیبلٹ دی پھر سیڈ پر کچھ لکھنے لگی۔

”رافع۔ پلینز انجکشن لاؤ۔ اگر امی کو آرام نہ آیا تو میں انہیں انجکشن بھی دے دیتی ہوں۔“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن آئی کو ہوا کیا ہے؟“

”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔ شاید اینڈ کرس
 ہو۔ لیکن اینڈ کس لگتا نہیں ہے۔“

وہ منیوہ بیگم کے چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ رافع فوری طور پر نسخہ لے کر باہر نکل گیا تھا۔

”انیقہ؟“ شہلا نے سوالیہ نظروں سے ربیعہ کو دیکھا۔ ”کوئی نہیں اب شک؟“

”نہیں۔“ ربیعہ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اب آئی ہی ہوگی۔ عمر کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“

عمر کے ذکر پر شہلا کے چہرے کے تناؤ میں قدرے کمی آئی تھی۔ وہ پھر منیوہ بیگم کو دیکھنے لگی جو اب آہستہ
 آہستہ کراہ رہی تھیں۔ ان کے درد میں کافی کمی واقع ہوئی تھی۔ شہلا کافی متفکر انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”شہلا آئی۔“ آئی کو پہلے کسی انیسو اور داٹھا ہے؟“ ربیعہ ان کا ہاتھ دبا سنے ہوئے بوجھنے لگی۔

”نہیں۔“ وہ کچھ بولنے لگی۔ ”کبھی کبھار ہلکے پھلکے سے درد کی شکایت کرتی ہیں۔ ہاتھ کی دوائیاں بھی

اکثر استعمال کرتی ہیں لیکن اتنا شدید درد۔ کبھی نہیں ہوا۔“

”آئی کا مکمل چیک آپ کروانا چاہیے نا؟“

”ہاں ربیعہ۔“ میں انہیں بائیں ہاتھ سے لے کر جاؤں گی۔

رافع ہوسے دروازہ بجا کر اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں شاپر تھا جو اس نے سائڈ ٹیبلٹ پر رکھ دیا۔

”بہت شکریہ رافع۔“ شہلا نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ”میں تمہیں پیسے دینا بھی بھول گئی۔“

”بھابھی۔“ وہ شگاہی ہوا۔ ”کیسی غیروں جیسی باتیں کرتی ہیں۔ آئی میرے لیے بھی ناں جیسی ہیں اب ان کی

طبیعت کیسی ہے؟“

”آرام آگیا ہے۔ لیکن کل میں ان کا مکمل چیک آپ کرواؤں گی۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میں اب چلوں بھابھی؟“

”جائے پیتے جاؤ۔“ شہلا نے ربیعہ کو دیکھا۔

وہ جلدی سے گھڑی ہولی تھی۔ رافع نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”نہیں ربیعہ! پلینز میں چلوں گا۔ آپ تکلف میں نہ پریں۔“

”تکلف کیسا۔“ چائے بننے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے؟“

رافع نے لمحہ بھر کے لیے نگاہ اٹھائی پھر بے بسی سے اوڑھ اڑھو دیکھا۔

”بیٹھ جائیں نا پلینز میں صرف پانچ منٹ میں چائے بنا لیتی ہوں۔“ وہ شگستگی سے مسکرائی۔ رافع کسی معمول

کی مانند کرسی پر بیٹھ گیا۔



”امی۔ امی جی۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو۔“ انیقہ، منیوہ بیگم کی گود میں منہ چھپائے منمنارہی تھی۔ انہوں نے

مسکراتے ہوئے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”کچھ بھی نہیں۔ تم لوگ یونہی پریشان ہو رہی ہو۔ پرسوں میں نے بواکل اندھا کھالیا تھا اور تم جانتی ہو اندھا کچھ موافق نہیں آتا۔ پرسوں سے ہی ہلکا ہلکا سا درد تھا۔ کل وہی درد بڑھ گیا۔ بد بھمی ہو گئی تھی اور کچھ بھی نہیں۔“

”درد ڈاکٹر کی موجودگی میں آپ کی اپنی رائے کا وزن کچھ بھی نہیں ہے امی جان!“ شہلا مصنوعی خفگی سے بولی۔ ”یہ معاملہ آپ ہم پر چھوڑ دیں ہم خود تحقیق کریں گے مرض کی۔ آپ کل میرے ساتھ ہاسپٹل چل رہی ہیں۔“

”اچھی ڈاکٹر ہو تم دونوں۔“ وہ ہنس دیا۔ ”مریض خود بتا رہا ہے اپنے مرض کے بارے میں اور تمہیں کچھ بتائی نہیں چل رہا۔ ٹیسٹوں پر دارودار ہے تشخیص کا۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر اور حکیم نبض پکڑتے ہی مرض پکڑ لیا کرتے تھے۔“

شہلا اور انیقہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے لگیں۔

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ انیقہ نے تائید کی تھی۔ ”جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی بڑھتی جا رہی ہے انسانوں کی اپنی قابلیت گھٹتی جا رہی ہے۔ آج کا ڈاکٹر جب تک دس ٹیسٹ نہ کروائے اسے نسخہ تجویز نہیں کرتا۔“

”ہاں تو اپنے پاس ہی رکھو اپنی ڈاکٹری کو۔“ واطمینان سے پیر پیار سے ہوئے بولی تھیں۔ ”میں اپنا نسخہ خود تجویز کر چکی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔

”آئندہ میں اندھا نہیں کھاؤں گی۔“

شہلا اور انیقہ نے برا سامنہ بنایا تھا جبکہ ریحہ کی ہنسی اٹھ گئی تھی۔

ورد کافی پرجوش سے انداز میں ماں کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ رابعہ بیگم نے کروشیمے کی ٹیل بناتے بناتے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا دیں۔

”امی جی! آپ کا کیا خیال ہے؟“ ورد نے مدھم مدھم سی آواز میں پوچھا۔

”کس بارے میں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”افو۔ اسی لڑکی فریحہ کے متعلق۔“ اس نے اوجڑا ہوا منہ دیکھ کر ناعمہ کے موجود ہونے کا یقین کیا۔

”ہول۔ لڑکی تو اچھی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔

”امی جی! اس کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ کسی بہت اونچے اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ ہے نا؟“

رابعہ بیگم نے کروشیمہ اور دھا کا ایک طرف رکھ دیا اور قدرے سنجیدہ سی ہوئیں۔

”لیکن درد۔ اپنی ناعمہ تو بہت بوگٹی سی ہے ابھی۔ مجھے تو رہا رہ کر یہی خیال آ رہا ہے کہ مجھے ناعمہ کا رشتہ خاندان میں ہی کرنا چاہیے۔ اپنے پھر اپنے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن اپنے خاندان میں اب ہے کون؟“ وہ قدرے جڑی گئی۔ ”اور جب سے نافع اور عیشہ کا نکاح ہوا ہے تب سے میں خاندان میں رشتہ ہونے سے خوف سا کھانے لگی ہوں۔ نجانے کیا بات ہے جو ان لوگوں کی خوشیوں کو کٹن سا لگ گیا ہے۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں کون سی ماورائی دنیا میں رہنے لگے ہیں جو حقیقتوں کو قبول ہی نہیں کر پاتے۔ خیر۔ یہ تو ایک بے حتی سی گفتگو ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ لوگ ناعمہ کا رشتہ لے آتے ہیں جو کہ ایک لازمی بات ہے تو پھر ہمارا جواب کیا ہو گا؟“

رابعہ بیگم کے چہرے پر تفکرات کے سائے پھیلے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو درد۔ اچانک جانے کیوں مجھے بھی وہم سے نے لگے ہیں۔ رافع۔ یوں تو ہر لحاظ سے بہت ہی اچھا لڑکا ہے لیکن۔ لیکن تمہاری طرف سے وہ کچھ زیادہ ہی بے نیاز لگتا ہے۔ جیسے جیسے اسے اس رشتے کی اہمیت کا احساس ہی نہ ہو۔“

”افو۔“ ورد نے سر ہی پیٹ لیا۔ ”امی جی! یہ تو سوال گندم جواب چناؤ والی مثال ہوئی۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اپنی نہیں ناعمہ کی بات کر رہی ہوں۔“

”ناعمہ سے زیادہ اب مجھے تمہاری فکر ہے ورد! انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”ناعمہ کا رشتہ طے ہو جانے کے بعد اگر انہوں نے فوری شادی کی فرمائش کی تو میں کیا جواب دوں گی؟“

”تو کیا؟ ہم ناعمہ کی شادی کر دیں گے۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”پھر میں اور آپ عیش کریں گے یہاں۔ وہ مولیٰ گہری باتیں ہوتی ساری چیزیں کھا جاتی ہے۔ تنگ کیا ہوا ہے اس نے مجھے۔“

رابعہ بیگم ہولے سے مسکرا دیں۔

”نجانے کیا بات ہو رہی ہے ورد! اصل بات یہی ہے کہ عذرا بیٹا بھی ابھی رافع کی شادی کی بات نہیں کریں گی۔“

”نہ اور سرد رہی ابھی نہیں بات نہیں چلی۔“ نجانے انہوں نے تمہیں کتنے سال پونسی بٹھا کر رکھا ہے۔“

”تو آپ کو کاہے کی فکر ہے؟“ ورد نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانٹیں ڈالیں۔ ”میں تو خود بیٹیں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ساری عمر۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”اچھی بات ہے نکالتے ہیں بیٹا! مائیں بیٹیوں کو ان کے گھروں میں بستا دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اپنے ساتھ رکھ کر نہیں۔“

”امی جی! پھر اس بات کو۔ میں تو ناعمہ کی بات کر رہی تھی۔“

”وہ مجھ کو اس کا قصہ ہے۔“ انہوں نے سالمہ کی بھڑکی۔ ”اگر اس کا نصیب اسی گھر میں جڑنا لکھا ہے تو ایسا ہی ہو گا لیکن سچی بات تو یہ ہے جتنا کہ رشتہ دیشہ اپنے جیسوں میں ہی کرنا چاہیے۔ وہ بہت اونچے لوگ لگتے ہیں۔“

”تو کیا ہوا۔ ہماری ناعمہ کسی سے کم ہے کیا؟ کم از کم اس کا دماغ تو بہت ہی اونچا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنس دی تھی۔

باشم منیزہ بیگم کی مزاج پر وحشی کے لیے آیا تھا۔ کافی دیر سے وہ ان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

”یہ تو کون کون کی باتیں کر رہی ہیں آنٹی! آپ کو ضرور اپنا انجیلی چیک آپ کرانا چاہیے۔“

”تمہیں بھی انہوں نے اپنا ہم نوا بنالیا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔ ”چلو دیکھتے ہیں۔ ابھی تو مجھے مکمل آرام ہے۔ کوئی درد درد نہیں ہے۔ آئندہ کبھی اٹھا تو چیک آپ بھی ہو جائے گا۔“

”خدا نہ کرے۔“ شہلا نے خفگی سے انہیں دیکھا۔ ”آئندہ کیوں اٹھے درد۔ آپ بھی بچوں جیسی باتیں کرنے لگی ہیں۔“

باشم نے بے حد پرشوق انداز میں شہلا کو دیکھا تھا۔ اس کا خفا خفا سا انداز اسے بہت دلچسپ لگا۔ اسی لیے شہلا نے بھی نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پرل سی ہو گئی۔

”گھر چلیں جناب؟“ وہ بٹناشت سے پوچھنے لگا۔

شہلا نے نگاہ اٹھا کر گہری میں غائب ہو گیا۔ نجانے کیا بات تھی اس کا ”حیات ولا“ میں دل لگ کر نہ دیتا تھا۔

یہاں آکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی گم گشتہ جنت میں چلی آئی ہو۔

باشم نے اپنے سوال کے جواب میں اس کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بے حد دھیان سے دیکھا۔ اسے احرار ہوا تھا کہ شہلا کا وہاں سے جانے کا موڈ نہیں ہے۔
 ”میں چلوں پھر؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔
 شہلا چونکی تھی۔ اس نے باشم کا سوال یاد کیا پھر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”میں بھی چل رہی ہوں آپ اس کے ہی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟“
 باشم ذرا سا مسکرایا ”لگ رہا تھا کہ اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ چھٹی جس الارم بج رہی تھی۔“
 ”ہیسے تو آپ کی چھٹی جس کا علاج کر دوں۔“ صحیح صحیح کام نہیں کر رہی یہ۔“ وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

باشم ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھنے اور مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ شہلا کے انداز میں جیون ساتھی اور رنگ ابھرنے لگے تھے۔ اس کی روز اول والی اجنبیت میں کمی آتی جا رہی تھی۔
 ”اچھا ای جی۔! میں اب چلتی ہوں۔ کل آپ سے ملنے آؤں گی۔“ وہ انٹائم پر ہنسنے کا بلکہ خیر سے اپنے اور ربیعہ کو بھی یاد دہانی کرائی ہے۔
 ”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“ وہ بھی مسکرائیں۔ ”ربیعہ تو میرے منہ منہ کا حساب رکھتی ہے۔ وقت پر کھا۔ وقت پر دوائی۔ بیٹیوں سے بڑھ کر ہو گئی ہے میرے لیے۔“
 اندر داخل ہوتی ربیعہ نے ان کے جملے سنے۔ اس کی دلچسپی پھلکی ہو کر مسکرانے لگی جیسے ہر ریاضت کا عمل پالیا ہو۔ شہلا نے بھی اس کا خیر بہت محبت سے دیکھا تھا۔
 ربیعہ کی ہم راہی میں اندر آتا عمر بھاگ کر شہلا سے مل گیا تھا۔
 ”ماما۔! آپ جا رہی ہیں پھر۔“
 ”عمر۔“ ربیعہ نے اسے پکارا۔
 ”نہیں۔“ وہ ضدی بن سے بولا۔ ”میں آج ماما کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بہت دنوں سے ماما کے ساتھ نہیں سویا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔“
 ”جھوٹے“ ربیعہ نے اسے ایک چپت لگائی۔ ”روزانہ میں نہیں کھانی سناتی ہوں اور تم کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی سو جاتے ہو؟“
 ”تو میں کیا کروں۔ آپ کی کہانی اتنی لمبی ہوتی ہے۔ پورنگ ہونے لگتی ہے تو میں سو جاتا ہوں۔“ عمر کی بات پر سب ہنس دیے۔
 ”ربیعہ! اس کے کپڑے اور یونیفارم وغیرہ رکھ دو۔“ شہلا نے محبت سے اس کا سر ہلایا۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔“
 ”ہرے۔“ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔
 ماں بیٹی کی خوشی دیکھ کر پھر کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

| | | | | | | |
|-----|------|-----|------|-----|-------|------|
| اس | کے | گھر | کا | پتہ | نہیں | ماتا |
| ہم | کو | اک | رہنا | | نہیں | ماتا |
| ایک | عالم | کو | چھان | | بیٹھے | ہم |

| | | | | | |
|--------|----------|-----|-------|---------|------|
| آپ | کے | سچ | دوسرا | نہیں | ماتا |
| لفظ | بھی | بے | ختم | کھنگالے | ہیں |
| ”پیار“ | مگر ایوں | میں | ”ریا“ | نہیں | ماتا |
| اپنی | مگر ایوں | میں | ”ریا“ | نہیں | ماتا |
| بت | کدوں | میں | خدا | نہیں | ماتا |

رافع ”حیات ولا“ کے پچھلے بڑے لان میں شل رہا تھا۔ دماغ پر نجانے کیوں ایک پڑا بوجھ دھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس بوجھ کو خود پر سے اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن کسی طور کا میابی نہ ہوتی تھی۔ ایسے عالم میں لفظ سے حظ جڑا گیا۔ خیال سے خیال بننا گیا اور غرل ہوئی گئی۔
 وہ گھاس پھوس سے بھرے ہوئے حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن نجانے کیوں اسے پین وقت ایک بیکہ بیکہ کی طلب ہونے لگی تھی۔ ذہن میں بھرا ہوا دھواں کسی بہانے نکالنے کا جی چاہنے لگا تھا۔
 نجانے وہ آسانی رنگ انٹائم کی پہنتی ہے؟ شاید اسے علم ہے کہ آسانی رنگ اس کی صبح رنگت پر بہت چٹا ہے۔ اس رنگ میں اس کی سیاہ آنکھوں کی پیمک اور سیاہی مزید بڑھ جاتی ہے۔ شکر فی لبوں کی مسکان اور پھلی معلوم ہوتی ہے۔ شاید!

لیکن نہیں۔ وہ تو خود سے اتنی بے نیاز محسوس ہوتی ہے، جتنی باقی دنیا سے۔ اس کا دھیان تو نجانے کہاں رہتا ہے، بادلوں پر۔ چاند کی چاندنی پر۔ ان بنی دنیا میں۔ پڑیوں کی نگری میں۔ شاید وہ خود بھی وہیں سے آئی ہے۔ وہ بریڈن سے ہلکے لڑکی۔
 رافع نے اپنے آپ کو یاد دلایا۔ وہ پشیمانی و سیاہ چٹکی آنکھیں دھند۔ وہ۔
 کسی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ رافع اچھل ہی پڑا پھر اس نے باشم کے مخصوص ”Gucci“ کی خوشبو محسوس کی۔ وہ اس کے برابر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”توبہ ملے ہے کہ تو اس سے محبت کر رہا ہے۔ تیرے رت جگے بتا رہے ہیں۔“
 رافع خاموشی سے بیٹھا رہا۔ باشم نے اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن رات کافی سیاہ تھی۔
 ”تو کیوں جاگ رہا ہے؟“ رافع نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ”اگر محبت ہی جگاتی ہے تو اب تو تجھے سونا سب ہنس دیے۔“

باشم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس پڑا۔
 ”کیوں؟ شادی محبت کا اختتام ہے۔“ جیسے لاثانی جملے پر تیرا یقین ہے کیا؟“
 ”نہیں۔“ رافع بھی مسکرا دیا۔ ”میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں جدائی رت جگے دیتی ہے تو محبتوں کی قربت تو مدہوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے الٹو بھلے لگتے ہیں۔“
 باشم زور سے ہنس پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔
 ”یار رافع۔! تو کچھ دیر بعد بولا۔“ یہ دن دے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن دے محبت کی قربت کتنی دیر مدہوش رکھ سکتی ہے بندے کو؟“
 رافع چونک سا گیا۔ باشم کے لہجے میں کچھ تھا۔
 ”ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے محتاط سا ہو کر پوچھا۔

کسی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ رافع اچھل ہی پڑا پھر اس نے باشم کے مخصوص ”Gucci“ کی خوشبو محسوس کی۔ وہ اس کے برابر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”توبہ ملے ہے کہ تو اس سے محبت کر رہا ہے۔ تیرے رت جگے بتا رہے ہیں۔“
 رافع خاموشی سے بیٹھا رہا۔ باشم نے اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن رات کافی سیاہ تھی۔
 ”تو کیوں جاگ رہا ہے؟“ رافع نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ”اگر محبت ہی جگاتی ہے تو اب تو تجھے سونا سب ہنس دیے۔“

باشم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس پڑا۔
 ”کیوں؟ شادی محبت کا اختتام ہے۔“ جیسے لاثانی جملے پر تیرا یقین ہے کیا؟“
 ”نہیں۔“ رافع بھی مسکرا دیا۔ ”میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں جدائی رت جگے دیتی ہے تو محبتوں کی قربت تو مدہوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے الٹو بھلے لگتے ہیں۔“
 باشم زور سے ہنس پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔
 ”یار رافع۔! تو کچھ دیر بعد بولا۔“ یہ دن دے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن دے محبت کی قربت کتنی دیر مدہوش رکھ سکتی ہے بندے کو؟“
 رافع چونک سا گیا۔ باشم کے لہجے میں کچھ تھا۔
 ”ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے محتاط سا ہو کر پوچھا۔

کسی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ رافع اچھل ہی پڑا پھر اس نے باشم کے مخصوص ”Gucci“ کی خوشبو محسوس کی۔ وہ اس کے برابر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”توبہ ملے ہے کہ تو اس سے محبت کر رہا ہے۔ تیرے رت جگے بتا رہے ہیں۔“
 رافع خاموشی سے بیٹھا رہا۔ باشم نے اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن رات کافی سیاہ تھی۔
 ”تو کیوں جاگ رہا ہے؟“ رافع نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ”اگر محبت ہی جگاتی ہے تو اب تو تجھے سونا سب ہنس دیے۔“

باشم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس پڑا۔
 ”کیوں؟ شادی محبت کا اختتام ہے۔“ جیسے لاثانی جملے پر تیرا یقین ہے کیا؟“
 ”نہیں۔“ رافع بھی مسکرا دیا۔ ”میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں جدائی رت جگے دیتی ہے تو محبتوں کی قربت تو مدہوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے الٹو بھلے لگتے ہیں۔“
 باشم زور سے ہنس پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔
 ”یار رافع۔! تو کچھ دیر بعد بولا۔“ یہ دن دے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن دے محبت کی قربت کتنی دیر مدہوش رکھ سکتی ہے بندے کو؟“
 رافع چونک سا گیا۔ باشم کے لہجے میں کچھ تھا۔
 ”ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے محتاط سا ہو کر پوچھا۔

”اوشنیں یا سنا شکایت تو جب بھی ہوئی مجھے اپنے آپ سے ہوگی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔
 ”خدا نہ کرے۔“ رافع بردہ لایا۔
 ”اچھا غزل سنا۔“ ہاشم قدرے بے فکری سے پھیل کر بیٹھا۔
 ”کون سی غزل؟“

”جو ابھی وارد ہوئی ہے۔ ایسی رات اور ایسی تنہائی۔ شاعر غزل نہ کہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

رافع دھیرے سے ہنس پڑا۔ ہاشم یا رغار تھا۔ اس سے کچھ بھی چھپانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اسے غزل سنانے لگا۔ ہاشم بخور سن رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔ اس کا مطلب ہے۔۔۔“ پوری غزل سن کر وہ بولا ”خواہش کی رنگین تتلی۔۔۔ تصور کی حسین نگار سے نکل کر اب حقیقوں کی دنیا کی جانب نحو سفر ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”تیری غزل کا وہ ماورائی تصور اتنی رنگ غائب ہو رہا ہے جس میں صرف محبوب کو سوچنے سے ہی خوشی بلکہ روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ تیری سوچ میں اب لا حاصلی کی نئی اتر رہی ہے۔“ رافع خاموش سا ہو گیا۔ شاید ہاشم ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”یا ر شاعر! خوش رہنا چاہتا ہے تو۔۔۔ اسی تصوراتی دنیا میں لوٹ جا۔۔۔ محبوب کو سوچ اور بس سوچ۔۔۔ جہاں اسے اپنے لیے کچھ کشاکی۔۔۔ وہیں سے سوچ کا رنگ زار شروع ہو جائے گا اور تمنا شریک کی صورت دور دور ہوتی چلی جائے گی۔“

”ہاشم! وہ دھیرے سے بولا۔
 ”ہوں؟“
 ”تیرے پاس سگریٹ ہے؟“

”رکھتا تو ہوں۔“ اس نے جیب پر ہاتھ مارا پھر ٹوٹ کر ایک سگریٹ برآمد کی۔
 رافع نے اس سے پگھلنے والی سگریٹ لے کر سلگائی اور بہت سادھواں چھوڑا۔

”بس اب تو جا۔“ پھر وہ بولا ”شاعر!۔۔۔“
 ”اچھا۔۔۔“ ہاشم حیران ہوا پھر گہری سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ چلتا ہوں۔“
 پھر رافع پر ایک ترجم بھری نظر ڈال کر وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا چل پڑا تھا۔



شہلا کا ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہ تھی۔ روٹی پکاتے پکاتے اس نے ایک نظر لاؤنج کی دیوار پر نظر آتے والے کلاک پر ڈالی۔ محض آدھا گھنٹہ ہی رہ گیا تھا۔ اس نے پریشانی سے ماتھے پر آتے بال بازو سے ہٹائے۔ فردوس بیگم کچن کی ہر ذمہ داری اس کے سپرد کر کے خود ہر فرش سے سبک دوش ہو چکی تھیں۔ عریضہ کا گھر میں ہونا نہ ہونا بالکل برابر تھا بلکہ شہلا کو تو اس کی صورت بھی ہفتہ میں دو تین بار بمشکل نظر آتی تھی۔ ایسے میں شہلا کو اپنی ذمہ داریوں میں توازن قائم رکھنے میں کافی وقت پیش آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے مجھے کچن کے لیے ایک عدد ملازمہ رکھ ہی لینا چاہیے۔“ اس نے پاش پاش میں روٹی رکھتے ہوئے سوچا۔ ”میں ہاشم سے کہتی ہوں تو اس سلسلے میں اپنی امی کو خود ہی قائل کریں تو بہتر ہوگا۔“
 روٹیاں پک چکی تھیں۔ شہلا نے سنک میں ہاتھ دھوئے ہوئے اپنے آج کے ڈریس کے متعلق لمحہ بھر کے

لیے سوچا پھر مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

کیلے ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ جیسے ہی مڑی اس کی چیخ نکلتے نکلتے رد گئی۔ کچن کے دروازے پر ایک بڑے ڈیل ڈول سانولا آدی کھڑا تھا۔ اس کی سرخ نظریں شہلا کو اپنے وجود کے آپار گزری محسوس ہوئیں۔ لمحہ بھر کے لیے شہلا کے اعصاب بالکل جواب دے گئے تھے۔

”آپ کے ہاں بھوں کو سلام کرنے کا رواج نہیں ہے کیا؟“ وہ بولا۔

تب شہلا کے حواس دھیرے دھیرے واپس لوٹے۔ اس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔

”اویس“ اس کے لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ”السلام وعلیکم۔ کک۔ کیسے ہیں آپ۔؟“

”وعلیکم السلام۔“ وہ مسکرائے۔ ”ہم تو دیسے ہی ہیں شہلا بیگم! جیسا آپ کی دوست چھوڑ گئیں ہمیں۔“

”اویس گاڈ۔“ شہلا نے دل میں سوچا۔ ”یہ اختر میاں اب تک۔“

”آپ کو شادی کی مبارکباد۔“

”شکریہ۔“ وہ مختصر بولی تھی۔

اختر میاں کچن کے دروازے پر جم کر کھڑے ہوئے تھے۔ باہر نکلتے کے راستے پر شہلا کو کوفت لگ آگھیرا۔ اسے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ نجانے فردوس بیگم کہاں تھیں جو اپنے بھائی کو منبھالتیں۔

”دلہن بیگم! ہمیں ایک کپ چائے بنا دیں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔“ اختر میاں نے جیسے اس کی کوفت اور بیزاری محسوس کر لی تھی۔ وہ کچن کے دروازے پر سے ہٹتے ہوئے بولے۔

”جی۔ جی ضرور۔“ شہلا نے اپنی کوفت کو حتی الامکان دبائے کی کوشش کی۔

اختر میاں پلٹ گئے تھے۔ شہلا نے جلدی جلدی سانس پین چوسے پر دھرا تھا۔ تب ہی اس کے کانوں میں دہلی دہلی آواز آئی تھی۔

”اے بیٹے۔ تم پھر آں مرے۔ ہمارا سکون سلا دے۔“ یہ جانا بھٹا اندھا سوارے فردوس بیگم کے اور کس کا ہو سکتا تھا۔

”باتی۔! کوئی سلام دعا کا موقع بھی دے دیا کرو۔“ اختر میاں نے تھے۔ ”ہمیں دیکھتے ہی تم تو یوں کونے دیتی ہو جیسے ہم تمہارا کچھ لے بھاگے ہوں۔“

”ہماری عزت ہمارا وقار دو کوڑی کا کر جاتے ہو تم بھیا۔! اور بھلا کیا لایا ہے اور؟ نئی دلہن گھر میں ہے۔ کیا سوچے گی تمہارا یہ ”شریفانہ“ حلیہ دیکھ کر۔“

”بابا بابا۔“ وہ ہنسے تھے۔ ”اچھا۔ تو یہ نکرستائی تمہیں۔ کوئی بات نہیں باجی۔! زمانہ ہی عقیدہ خوں کا ہے۔“

سرخ لہو تو اب شاید ہماری ہی رگوں میں دوڑتا ہے جو ہم ”پنوں“ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ دیسے ”نئی“ دلہن کی بات بھی خوب کی تم نے۔ ہم کیا اسے جانتے نہیں۔ بابا بابا۔“

”بے میں چائے اور بسکٹ لے کر آتی شہلا کے ذہن کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ہنسکی۔ اس نے اپنا چہرہ سرخ ہوتا ہوا محسوس کیا پھر گرم گرم لہو اس کے پورے جسم میں گردش کرنے لگا۔ اس نے ٹرے اختر میاں کے سامنے تقریباً ”خنی“ دی تھی۔

فردوس بیگم نے حیرانی اور قدرے خفگی سے اسے دیکھا جیسے اس بدتمیز بی کا مطلب جاننا چاہتی ہوں۔ شہلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے پھر لمحہ بھر سوچا۔ اس کے بعد وہ لب کاٹتے ہوئے مڑ گئی۔ تھکے تھکے ذہن اور پر مڑو اعصاب کے ساتھ وہ میڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے تک چلی آئی تھی۔ اسے تازہ دم ہو کر اپنی دیوٹی پر پہنچنا تھا۔ سوچوں میں الجھ کر خود کو تھکانے سے کچھ حاصل ہی نہ تھا۔



پودوں کو پانی دیتی ربیعہ کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے سفید پھانک کے دو سری جانب درہ۔ کھڑی تھی۔ ربیعہ نے نیاپ کیاری میں ڈال دیا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے پھانک تک آئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرنے لگی۔

”وعلیکم السلام۔“ درہ اندر چلی آئی۔ ”کیسی ہو ربیعہ۔؟“

”بالکل ٹھیک۔“ آواز دے رہے ہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب پرہہ گئی۔ انقہ اپنے کمرے میں اسٹڈی میں مصروف تھی جبکہ منیزہ بیگم عصر کی نماز سے فارغ ہو کر چائے پی رہی تھیں۔ درہ کی آمد پر دونوں بھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھیں۔

”اتنے سالوں میں تم کبھی مجھ سے ملنے نہ آئیں اور ربیعہ سے دوستی ہوئی تو اس سے ملنے آئی ہو۔“ انقہ نے

”یہ منہ بولتی ہو۔“ درہ نے جواب دیا۔ ”میں اپنی غلطی مانتی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ربیعہ بھی تو مجھ سے ملنے آئی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کبھی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”چلو بھئی۔ تم نے تو بدلہ ہی چکا دیا۔“ انقہ بے بسی سے بولی۔ سب ہی ہنس دیے۔

”یہ ربیعہ نے ہی ایسی۔“ منیزہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کو اپنا بنا لیتی ہے۔ سب ہی گرویدہ ہو جاتے ہیں اس کے۔“

”ربیعہ جیسی گراہی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔“ درہ نے تکیہ کیا۔ ”ہمارے گھر میں بھی سب اس کے دیوانے ہیں۔“

”سب ہی اس کا زور کوڑتے ہیں۔“ منیزہ بیگم نے جواب دیا۔ ”سب کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھو گئی۔ دو مہراں

ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔ ”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھو گئی۔ دو مہراں

تکا ہیں اسے کتنے لگی تھیں۔ لا مسکراتے لب اپنا دیکھ رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکیں۔

”ہمارے ماموں سلوک حسن کے بڑے صاحبزادے رافع حسن ان کے منگیتر ہیں۔ ان کی پسند سے ہی رشتہ۔“

ناعمل کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

”ربیعہ! انقہ نے اسے دو سری مرتبہ آواز دی تھی۔

ربیعہ چونک کر اپنے آپ میں لولی۔ ایک ایک کر کے اس نے سب کے چہرے دیکھے پھر وحیرت سے مسکرائی۔

”کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“ انقہ نے مسکرا کر دیکھا۔

”بس یونہی ایک خیال اٹھیا تھا۔“ وہ اپنے خیال کی حدت سے گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ ”آپ لوگ گپ شپ کریں میں اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”میں چائے پی کر آئی ہوں ربیعہ!“ درہ کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ ربیعہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

”آئی۔! میں دراصل آپ کے پاس آئی تھی۔“ درہ نے منیزہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”ہاں بیٹا ابولوس۔“ وہ شفقت سے بولیں۔ ”میں اگر آپ کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”آئی! عبا بھائی کے ایک دوست ہیں فراز احمد۔ ہیں نا؟“

”ہاں ہاں۔ فراز تو ہمارے گھر کے ایک فرد کی مانند ہے۔ ہمارے لیے تو وہ عبا جیسا ہی ہے۔“

”چھ! درد خوش ہو گئی۔“ میں دراصل یہی جانتا چاہ رہی تھی ”ان کا فیملی بیک گراؤنڈ“ خاندان کے

وغیرہ سب کیسے ہیں؟“

”سب بی بہت اچھے ہیں۔ وہ بہنیں اور وہی بھائی ہیں۔ سب ماشاء اللہ سلجھے ہوئے پڑھے لکھے افراد ہیں۔“

”ہمت کھانا پیتا کھرانہ ہے۔“

درد کے چہرے پر چمک آگئی تھی۔ منیوہ بیگم کے الفاظ اور انداز بہت حوصلہ افزا تھے۔

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ بات کیا ہے؟“ انیقا نے اسے گھورا۔

”بات یہ ہے کہ فراز کی بہن فریحہ ہمارے گھر آئی تھیں ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ناعمہ میں انٹرا

”دوری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ انیقا بھی خوش ہوئی۔ ”ان دونوں کی جوڑی تو خوب ہے۔“

فراز بھائی تو جیسے رستم نکلے۔ آنے والے نہیں سمجھتی ہوں ان سے۔“

”ارے نہیں انیقا! پلیز۔“ درد التجائی انداز میں بولی۔ ”بہن تو ان لوگوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یہ

محض میرا اندازہ ہے۔ ابھی تم ان سے کچھ مت کہنا ورنہ وہ ہمارے متعلق کیا خیال کریں گے۔“

”تم نے فکر یہ ہو رہی ہے!“ منیوہ بیگم نے اسے تسلی دے کر کہا۔ ”ہمارے گھر سے ایسا کوئی ذکر نہیں ہو گا اور جہاں

تک ان لوگوں کا تعلق ہے وہ بہت اچھی فیملی ہے ہر لحاظ سے اچھی۔ اگر رشتہ آئے تو قبول کرنے میں تامل نہ

کریا۔“

”بہت شکریہ آئی!“ درد منونیت سے بولی۔ ”میرا ابو جی کا کہنا ہے کہ“

”یہ ناعمہ تمہارا ابو جی کب سے ہو گئی؟“ انیقا حیرت سے اسے گھورتی رہی۔

درد نے اس کی بات پر غور کیا پھر خود بھی اس کی ہنس میں شریک ہو گئی۔ چائے لے کر اندر داخل ہوتی رہی۔

نے دھیان سے اسے دیکھا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں والی بلی کی طرح کی حامل درد واقعی پُرکشش تھی اور ہنسی اس

کے چہرے پر ملکوتی تاثر لے آتی تھی۔ ربیعہ نے دل سے اس کے لیے یہی مسکراتے رہنے کی دعا کی۔ نجانے کیوں یہ

لڑکی اسے بہت اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

کو لڑ سے پانی لے کر وہ جیسے ہی پلٹی لمحہ بھر کے لیے ٹھک کر رک گئی تھی۔ سر نہ گاہیں لیے وہ مقابل تھا۔ ایقان

ان نگاہوں میں دیکھنا نہ چاہتی تھی سو پانی لے کر سائیڈ سے نکلنے لگی۔ عاشر نے اس کا رستہ روکا۔

”یہ کون سا کھیل کھیل رہی ہو تم میرے ساتھ ایقان!“ نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی پتا پتا سا تھا۔

ایقان نے بھی سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کھیل؟ کھیل کا مطلب جانتے ہو تم عاشر صاحب؟ میں ایک کمزور عورت بھلا کون سا کھیل کھیل سکتی ہوں؟“

کھیل تو تمہارے جیسے مرد کھیلتے ہیں۔ ہم عورتوں سے۔“

”یہ کیا الفاظی ہے!“ وہ چہنما رہا۔ ”میرے واپس جانے میں محض تین دن رہ گئے ہیں۔ محض تین دن۔ اور

تم۔ تم اپنی ہر ذمہ داری ہر تعلق کو پس پشت ڈال کر کمرہ بند کیے نجانے کس ماتم میں مصروف ہو۔“

”ذمہ داری۔ تعلق۔“ ایقان نے بھرا ہوا گلاس سنک میں دے مارا۔ ”میں یاد رکھوں اپنی ذمہ داریوں کو۔“

ہر تعلق بنا ڈالے۔ اور تم! اس نے انکی سے عاشر کی جانب اشارہ کیا۔ ”تم آزاد پنجھی بن کر ڈال ڈال پھرتے

رہو۔“

”کیا کیا ہے میں نے ایسا؟“

”تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

ڈسے تھا۔ اس نے دو پہر بہت مزے سے سونے میں بتادی تھی۔

اس نے اپنے برابر خالی جگہ پر نگاہ کی۔ عمر کو اس نے اپنے ساتھ ہی سلایا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا نجانے کونسا وقت وہ اسے سوتا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

شہلا نے اپنے بال سمیٹے اور اٹھ کر لائٹس آن کیں۔ پھر وہ واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی منہ دھو کر پر سکون اعصاب کے ساتھ چائے کی طلب لیے وہ کمرے سے نکلی تھی کہ میز دھویوں پر پہنچ کر وہ ٹھک گئی۔

”یہ چھو کر اتو جان کو آگیا ہے۔ اتنا شیطان اتنا شریر۔“ فردوس بیگم کا بارہ نہایت ہائی ہو رہا تھا۔

شہلا کی نظر پام کے گملے پر پڑی جو اونڈھا ہو کر ٹوٹ گیا تھا اور عمر اس کے قریب کھڑا منہ بسور رہا تھا۔

”مجھے کیا پتہ آپ لوگوں نے رستے میں گملے رکھے ہوئے ہیں۔“ وہ اپنے انداز میں بولا۔ ”یہ کوئی جگہ تو نہیں پوچھوں گی۔“ انہیں باہر رکھیں ٹالان میں۔ آپ لوگوں کا لان کتنا بڑا ہے۔“

”اے ہے۔ اپنی زبان قابو کر لڑکے۔ اے لگام کہیں کا۔“ انہوں نے اس کی کمر پر ایک دھپکڑی دھپکڑی کر دی۔

شہلا کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا وہ لمحہ بھر میں میڑھیاں اتر گئی۔

”آئی پلیز۔“ اس نے عمر کو کھینچ کر خود سے لپٹا لیا۔ ”آپ اسے اپنی طرح ٹرسٹ نہ کریں بچوں۔“ غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔“

اس کا لہجہ ضبط کے باوجود تلخ ہو چلا تھا۔

”بی بی! ہمارے گھر میں بچوں کو والوک کا تیر نہیں پڑتا۔“ سمجھیں تم۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ ”اتنا ہی لاہ کا لڈو ہے تو رہے ثانی اماں کے گھر۔ ہم نے تو پہلے دن بھی صاف کہہ دیا تھا کہ ہم بہو تو لے جا رہے ہیں۔ پوچھا ہمارا اپنا خون ہی ہو گا۔ یہ پھر بھی ہر دس برسے دین نہیں مونگ دیتا ہے۔“

”میری عریضہ کتنے شوق سے لائی تھی۔ سب ستیا ناسی کر دیا۔“ وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ شہلا انکھوں میں آنسو بھرے لب کاٹ رہی تھی۔ عمر نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”آئی ایم سوری ماما! انہوں نے میری وجہ سے آپ کو ڈانٹا مہیا نونے تو آپ کو کبھی نہیں ڈانٹا۔ ہے نا۔!“

”چلو بیٹا! ہم تانوں کے گھر چلتے ہیں۔“ اس نے بے حد ضبط سے خود کو قابو پایا تھا۔

”ٹھیک ہے!“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں واپس نہیں آؤں گا ماما۔“ انہوں نے ان کا گھر پسند نہیں ہے۔ آپ واپس آئیں گی؟“

شہلا لب کاٹ کر میز دھویوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو ایقان تم۔“ عذرا بیگم خوف سے پیلی پڑ گئی تھیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھابھی بیگم!“ اس کے لہجے کی استقامت سے انہیں مزید خوف محسوس ہوا۔ ”اور آپ جانتی ہیں میں کس قدر ضدی ہوں۔“

”لیکن ایقان! اماں! تمہارے بھائی۔“ وہ جھٹکا کر رہ گئیں۔ ”تم نے اماں سے ذکر تک نہیں کیا اور اب مجھے بتا رہی ہو۔“

ایقان نے گہری سانس بھری وہ اپنا ضروری سامان اور بچے لے کر دہلیز میں ہی ”حیات ولا“ چلی آئی تھی۔ سارا دن عجب بے کلی میں گزرا تھا۔ دل کو پچھلے لگے ہوئے تھے۔ اماں کے سو جانے کے بعد وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

عذرا بیگم سے اس نے سب احوال کہہ ڈالا تھا۔

”اماں کو میں بتا دوں گی۔ بھائی کو آپ بتا دیں۔ دنیا کو خود ہی پتا چل جائے گا۔“

”ایقان! وہ رونے کے قریب ہو گئیں۔“ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کر رہی ہو۔ ارے کچھ سوچ سمجھ تولو۔“

”اتنا طے ہے بھابی بیگم! کہ میں پلیٹ کر اس شخص کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ بولی ”آپ جانتی ہیں نا۔ ابا مرحوم نے ”حیات ولا“ کے حصے اپنی زندگی میں ہی کر ڈالے تھے۔ وہ بڑے حصے دونوں بھائیوں کے لیے اور وہ چھوٹے حصے ہم دو بہنوں کے۔ ہے نا۔ میرے حصے کا پورشن اب تک دیران اور خالی پڑا ہے۔ میں وہیں رہوں گی۔“

”ہمیں تمہارے رہنے کی نہیں۔ تمہارے آباد رہنے کی فکر ہے۔ ایقان! انہوں نے آنسو پونچھے۔“

”میرے لیے تم ہانیہ اور سردی کی طرح ہو۔ میں کبھی نہیں جاؤں گی کہ تمہارا ہنسا بستا گھر برباد ہو۔“

”آپ نے کیا پتہ کیا ہے کہ چاہئے نہ چاہئے کیا ہوتا ہے بھابھی جان!“ وہ گہرے دکھ میں ڈوب کر بولی۔ ”تقدیر کا وار چل چکا۔“

”خدا نہ کرے۔ کچھ نہیں ہوا۔ تم تو بونہی باؤلی ہو رہی ہو۔“

”شاید آپ سب لوگ ایک آواز ہو کر یہی کہیں گے۔“ اس نے پلک براترا مہوتی توڑا۔ ”لیکن میری سوچ میرا دل اپنی ہی بات کہہ رہے ہیں۔ چاہے کوئی اس بات کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ اگر کسی نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی تو میں خود کو آگ لگا لوں گی۔ مادر گھسے گا۔“

عذرا بیگم ہونٹ ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ ایقان اٹھ کر چل دی تھی۔

بے حد تھکا ہارا عاشر دروازے کی جانب بڑھا تھا۔ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ کر اس نے کافی دیر تک نہ ہٹائی۔

چند لمحوں تک کوئی جواب نہ آنے پر اس نے پھر کال بیل کا بٹن ہٹا دیا۔ ہی سانسے والا دروازہ کھول کر اس کے پرہیزگار فضل صاحب نکلتے تھے۔

عاشر غیر متوقع آواز پر چونک کر کھڑا۔ فضل صاحب نیند سے سرخ آنکھیں لیے کھڑے تھے۔

”جالی؟“

”آپ کی کھڑکی کھلی تھیں۔ آپ کے لیے۔ آپ تو بڑی دیر سے لوٹے۔“

”اوہ۔“ وہ شرمندہ ہوا۔ ”آپ کو زحمت ہوئی فضل صاحب۔ معذرت بہت معذرت۔“ وہ سر ہلا کر مڑ گئے۔

عاشر جالی لیے سوچ میں گم کھڑا رہا۔ صبح کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے۔ اس نے ڈیڑھ بجائی گھڑی کو دیکھا۔

دروازہ کھول کر وہ گھر میں داخل ہوا پھر سیدھا فون کی جانب بڑھا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

سورامین کی سخت بائیں سنسن لر رہیہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک ہیں سمی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل غین کو قلع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عباد کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منزہ بیگم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنالیتی ہیں۔
شمار شملہ کی شہین کی تقریب میں بی نافع اور عریشہ کا نکاح برہموا بیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔ شادی کی اولین رات ابرار جیلانی کا فون شملہ کو پریشان کر دیتا ہے۔ شملہ شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ غین موقع پر ہاشم شملہ کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔
فراز جو در حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے فراز کی آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز یہی سمجھتا ہے کہ فون بر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔
رائع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا غلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

لڑا عاشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شملہ سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سر دروہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلا سادے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شملہ ربیعہ کے ہاتھ ہوا البیہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ دورہ کے مشورے سے ایم ایچے سویا لوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔
عاشر لڑا سے ملنے ہوئے ہوتا ہے تو لڑا اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً ”صدے سے تنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ دورہ سے واپس آتی ہے تو اس کے گھر آتی ہے۔ لڑا کی سگنی رائف سے پہنچتی ہے۔ یہ خرافات سے صدے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رائف بھی اسے جلد بازی میں کیا لیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ دورہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

۲۶

عزرا بیگم

بیل ایک تو اتر سے جی تھی۔ عزرا بیگم افقاں و خیزاں فون تک پہنچی تھیں۔

”ہیلو“ انہوں نے بھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

عاشر چند لمحوں کے لیے خاموش رہا تھا پھر ان کے دوبارہ ”ہیلو“ کہنے سے قبل ہی وہ آہستگی سے بولا۔

”السلام علیکم بھابی جان۔ عاشر بات کر رہا ہوں۔“

اب چند لمحے خاموش رہنے کی باری عزرا بیگم کی تھی۔ پھر وہ بھی مزید مدہم آواز میں بولیں۔

”ہاں عاشر میاں! کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں بھابی جان۔ یہ ایقان کہاں ہے؟“ اس کی زبان اٹکنے لگی تھی۔ عجب شرمندگی کا احساس دامن گیر ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی دل کی تہوں سے غصہ بھی اُٹ رہا تھا۔

”ایقان۔۔۔ عزرا بیگم بھی جیسے اس کے جیسی کیفیات کا شکار تھیں۔“ ایقان تو۔۔۔ شاید سو رہی ہے۔“

عاشر نے گہری سانس بھری۔ اسے نجانے کیوں ایک وہم سا تھا جیسے وہ اسے وہاں نہیں ملے گی جیسے وہ کہیں اور

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا احسن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے خردی سے محفوظ رکھیں۔

یہ بات نہیں بھولوں گی۔

عاشر کا جی چاہا ریسپور مار کر اپنا سر پھوڑے۔

ایقان! یہ ایقان! تم کوئی سولہ سترہ سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کام لو۔ یہ کیا اول فول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ کہنا سننا ہو رات بھر میں کہہ لینا تاکہ صبح تمہارا یہ پاگل پن اترے۔

عاشر صاحب! وہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ مجھے آپ کی طرح نہ کسی کے حسن کا نشہ چڑھا ہے نہ ہی غم غلط کرنے کے لیے میں نے شراب کا سہارا لیا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ بقا کی ہوش و حواس کہا ہے۔ آپ کو نہ اس وقت زحمت کرنے کی ضرورت ہے نہ صبح میں یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔ تمہاری صورت دیکھنا اب میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

ایقان! وہ تنگ ایقان! زار بنی اوقات میں رہو۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔ بدتمیز جی کی کوئی حد ہوتی ہے۔

آپ کے نزدیک تہذیب کیا ہے جس جان چلی ہو!

مروت! وہ بلبلا گیا۔ اور اور میں صبح آؤں گا کائنات کروں گا تمہارے گھر والوں سے۔ کیا سمجھا ہوا ہے تم نے میں تو اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں۔ قانونی بیوی ہو میری کوئی معشوقہ نہیں ہو جو یہ دھمکیاں دے رہی ہو۔ خناس چڑھ گیا ہے تمہیں۔

بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسپور کریڈل پر دے مارا تھا۔ ایقان چند لمحوں کے لیے سن سی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں برسات اتر آئی۔ پیاز کی طرح تہہ در تہہ اترتے روپ کے متعلق اس نے کئی بار سنا اور پڑھا تھا دیکھ کر بے پروا ہو کر بیٹھ گیا۔

عاشر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے قدرے فاصلے پر چہرے پر خاصے تناؤ کی کیفیت لیے فاروق حسن بیٹھے تھے۔ ایک طرف شفیقہ حیات بیٹھی بار بار سفید دپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف سلوٹ حسن اور دوسری جانب عذرا بیٹھ گئے تھے۔

کمرے کی کھڑکی کے قریب ایقان کھڑی تھی۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کتنا ہی وقت اسی خاموشی کے عالم میں گزر گیا۔ پھر عاشر نے سر اٹھا کر سب کی جانب دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سب ہی اس سے نظر چار رہے ہوں۔ اس نے پتھر کا بت بنی ہوئی ایقان کو دیکھا۔ پھر جیسے زچ ہو کر گویا ہوا تھا۔ کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟

چلی گئی ہوگی۔ اب اس کی وہاں موجودگی کا علم ہو جانے پر وہ قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

”نہیں بھابی جان۔ وہ سو نہیں رہی جاگ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ آپ پلیز میری اس سے بات کروا دیں۔“

”عاشر! وہ ایسا ہے کہ کیا ہوسکتا ہو گا کہ تم صبح فون کرو۔“ عذرا بیگم اب کے قدرے شرمندگی سے گویا ہوئیں۔ ”ایقان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“

عاشر نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”بھابی جان۔۔۔“ آپ اسے بلائیں! وہ قدرے نرم گئے انداز میں بولا ”میں اس سے ابھی بات کروں گا۔“

”اچھا! وہ دم صدم پڑیں۔“ میں دیکھتی ہوں تم ہولڈر کھنا۔“

ریسپور ایک طرف رکھ کر وہ پریشانی کے عالم میں اس کمرے کی جانب بدھ تھیں جہاں شفیقہ حیات اور ایقان لیٹی تھیں۔ انہیں خوف تھا کہ رات گئے شفیقہ حیات کی نیند اگر خراب ہوئی تو شاید ان کی طبیعت بھی بگڑ جائے۔ وہ گولیاں کھا کر سویا کرتی تھیں۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھنک گئیں۔ ایقان دیوار سے ٹیک لگا کر دونوں بازو سینے پر باندھے باہر ہی کھڑی تھی۔ نیم اندھیرے میں بھی وہ اس کے متورم پوٹوں کو دیکھ چکی تھیں۔

ایقان!

”مجھے خبر ہے بھابی جان! وہ ہولے سے بولی۔ میں نکل کی آواز سن رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں کمرے میں جا رہی ہوں تم بات کر لو۔“

ایقان چپ رہی۔ عذرا بیگم پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ایقان کوئی سیٹے بازو لپیٹے کھڑی ہوئی۔ کتنی رہی۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ فون کا ریسپور یونی ایک طرف رکھا رہے اور دوسری جانب وہ انتظار اور غصے کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ لیکن عقل کہہ رہی تھی کہ آج یا کل اسے بات تو کرنا ہی تھی۔ سو کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی فون تک آئی۔

”ہیلو۔“ اس نے بالکل بے تاثر انداز میں کہا۔

”کیا طریقہ ہے یہ۔۔۔“ وہ دوسری جانب اپنا غصہ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چھوڑ کر بغیر کسی اطلاع کے یوں چلے جانے کا کیا مقصد ہے؟“

”مقصد صرف ایک ہے۔“ وہ مضبوط لہجے اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”وہ یہ کہ میں تمہارا گھر اور تمہیں دونوں کو چھوڑ آئی ہوں ہمیشہ کے لیے۔“

”وہاٹ؟“ اسے جیسے کرنٹ لگا۔ اس بات کا تو اس کے دھم گماں میں کہیں سایہ تک نہ تھا۔

”ایقان؟ تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ جانتی ہو کہ کیا رہی ہو؟“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی۔ ”اتنے سالوں میں تم شاید مجھے نہ جان پائے۔ اور شاید اتنے سالوں میں بھی تمہیں نہ سمجھ سکی۔ شاید اتنے سال علیحدہ رہے اس لیے لیکن کیا اچھا نہیں ہو کہ بہت جلد میں نے تمہیں پہچان لیا؟ اوزیہ بھی اچھا ہی ہو گا کہ اب تم مجھے بھی جان لو میرے نزدیک محبت میں ہر خطا قابل معافی ہے ماسوائے بے وفائی اور ہرجائی پن کے۔ تم نے میرے جذلوں کی توہین کی ہے عاشر۔! میں مر کر بھی

ایقان نے سرخ پھیر کر اسے فٹیل ایک نظر دیکھا۔

”نہیں!“ وہ بے حد محسوس انداز میں بولی۔

کمرے میں موجود نفوس میں سے زیادہ تر نے بے اختیار مہربانی سانس بھری تھی۔ عاشر نے ایقان کی بے پناہ ضدی طبیعت کے مقابلے میں ان سب کی بے بسی محسوس کی۔

”آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ چلا ہی اٹھا۔ اور اگر کچھ کیا ہے تو تو ٹھیک ہے دنیا میں بے شمار مرز ہیں جو کبھی نہ کبھی رستے سے ہٹک جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے ہٹک بھی جاتے ہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ان کی بیویاں اس سرکشی پر اتر آئیں۔ اس طرح تو اس طرح تو کتنے گھر ٹوٹ جائیں برباد ہو جائیں۔ آپ آپ سب لوگ اسے سمجھاتے کیوں نہیں آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اس سے کہیں یہ سامان اور بچے لے لے اور میرے ساتھ چلے۔ میں اسے لینے آیا ہوں ایک طرح سے معذرت خواہ ہی ہوں اور یہ ہے کہ اور اکثر رہی ہے آپ لوگ بھی اپنی خاموشی سے اسے شہم دے رہے ہیں۔“

اس کے لفظ لفظ سے بے بسی اور دبا دبا غصہ جھلک رہا تھا۔ ایقان کو ایک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ عاشر نے اس سے قبل ہی اس نے اپنی ماں اور بھائیوں پر واضح کر دیا تھا کہ فی الحال وہ اس کے ساتھ چلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور یہ کہ اگر کسی نے اسے مجبور کرنے کی کوشش کی تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ وہ ماں اور بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ سب سے چھوٹی تھی اور ہمیشہ سے اپنی ہنوائی آئی تھی۔ اس وقت بھی اس کی دھمکی نے جیسے سب کے لب سی لیے تھے۔ یوں بھی ان کا گھراؤن اخلاقی قدروں کی اہمیت کو بچانے اور ان پر زور دینے والوں میں سے تھا۔ فاروق حسن اور سلجوق حسن کو ایقان کی ناراضی کی وجہ جان کر حقیقتاً ”دھچکا لگا تھا۔ انہیں عاشر سے اس بے راہروی کی امید نہ تھی۔ دل ہی دل میں وہ ایقان کو درست جان رہے تھے۔

فاروق حسن نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر وہ جیسے انداز میں بولی۔

”دیکھیں عاشر میاں! آپ کہتے ہیں کہ آپ کا یہاں آپ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ معذرت خواہ ہیں۔ حالانکہ اب تک جو کچھ آپ نے کہا اس ساری گفتگو میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کو معذرت خواہ ثابت کرتا ہو۔ آپ دنیا کے سارے مردوں کے ایک ہی صف میں گھر دھونے پر اصرار کر رہے ہیں جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے کئے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں اس روش میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا بھائی میاں!“ وہ بھی قدرے نرم پڑا۔ ”میں تو بار بار یہی کہہ رہا ہوں کہ ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس ذرا سی بات کے پیچھے اپنا گھر خراب کیا جائے۔ میں اسے چاہتا ہوں۔ اپنے بچوں کو چاہتا ہوں۔ پھر یہ مجھے کس بات کی سزا دینا چاہ رہی ہے؟“

فاروق حسن نے اس کی بات مکمل ہونے پر سوالیہ نظروں سے ایقان کی جانب دیکھا تھا وہ اب ہونٹ چباتے ہوئے جیسے خود کو بہت کچھ کہنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

”بولو ایقان!“ فاروق حسن بولے۔

”بھائی میاں!“ وہ سیکٹے لہجے میں بولی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اگر معذرت خواہ ہیں بھی تو مجھے ان کی معذرت پر رتی برابر بھی یقین نہیں ہے۔ چور اگر چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے اور اسی وقت معافی مانگ لے تو کون ہے جو یہ یقین کرے گا کہ آئندہ یہ چور مزید چوری کا ارتکاب نہیں کرے گا؟ اس نے تو پکڑے جانے پر ایک رسمی کارروائی کے طور پر ہی معذرت کی ہے نا؟ یہی حال ان کا بھی ہے۔ یہ چکر کتنا پرانا ہے کب سے چل رہا ہے اور بات کہاں تک جا پہنچی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ میں نے ان کے رویے میں

کھنچاؤ اور فرق محسوس کیا لیکن یہ مجھے جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ میں نے کئی بار ان سے وقت کی کمی کا رونا رویا یہ ہر بار کچھ نہ کچھ کہہ کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے اور جب میں نے ایک واضح ثبوت ملنے پر انہیں یہ باور کرایا کہ میں بہت کچھ سمجھ چکی ہوں تب انہوں نے اعتراف جرم اس انداز میں کیا جیسے سر سے بلا اتارتے ہیں۔ میرے نزدیک جو بات زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے کھنچ و تھن کھیل جسے بہت سے لوگ کھیلتے ہیں انہوں نے بھی کھیل لیا تو کیا برائی؟ معذرت اس کو کہتے ہیں؟ شرمندگی اس کا نام ہے؟ کیا گارنٹی ہے اس بات کی کہ کل کو یہ کھیل دوبارہ شروع نہ ہوگا؟ وہ حسین بلا وہاں جاپان میں ان کی دو روزہ جدائی برداشت نہ کر پائی۔ ان کے پیچھے وہ یہاں تک پہنچ گئی۔ یہ اسے لیے لیے پھرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہونٹوں میں عیاشیاں کرتے رہے۔ مجھ سے جھوٹ بولتے کہ آئندہ شروع کرنے والے بزنس کے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہیں یا شاید یہی تھا ان کا ”آئندہ“ ہونے والا ”بزنس“ وہاں جاپان میں انہیں کس کا ڈر ہوگا؟ وہ حسینہ ہوگی۔ اور یہ ہوں گے میں۔ یہاں ان کے بچے پالتی ہوں اپنی جان جلاتی رہوں کھل کھل کر رہ جاؤں یہ ہر سال دو سال بعد تشریف لائیں اور اپنا ”ہنسٹا بستا گھر“ دیکھ کر خوشی خوشی اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ بس! ان کی معذرت خواہی کے پیچھے یہی خواہش کار فرما ہے۔“

ایقان کے لفظوں میں سچائی گونج رہی تھی۔ کمرے میں کافی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر عاشر نے مہربانی سانس بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اپنا دل کھول کر تمہیں دکھا نہیں سکتا۔ تم میری کسی بھی بات پر تشویش نہیں کرو گی۔ لیکن چلو یہ تو بتاؤ کہ تم اس مشکل کا کیا حل نکالتی ہو؟ اب جو ہوا سو ہوا لیکن آئندہ کیا کیا جائے؟ ہمیں شرف ایجاب ہے؟ تو کسی چھوٹے گھر میں بیٹھا رہوں؟ کیا کروں میں؟ کیا چاہتی ہو؟“

”میں تم سے عین سچی چاہتی ہوں۔“ وہ قطعاً سچی بولی۔ ”ایک بجلی سی سب پر گری گئی۔ حقیقتہً حیات نے پھر رونا شروع کر دیا۔ دونوں بھائی بھی سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے رو گئے تھے۔“

”اس غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں کبھی تمہیں طلاق دوں گا۔“ عاشر غصے سے تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری حماقت اور تمہارے باطل بن کی سزا میں اپنے بچوں کو کبھی نہیں دوں گا۔ سمجھیں تم!“

”میں طلاق نہیں چاہتی!“ وہ اطمینان سے بولی۔

”میں اپنے بچوں سے تم سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ ایک برو کن فیملی کا حصہ بن جائے۔ لیکن یہ سب کچھ ہے کہ مجھ پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ قانونی طور پر تم سے وابستہ ضرور رہوں گی لیکن۔ لیکن عملی طور پر تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔“

وہ جھجک سی گئی تھی۔ بھائیوں کی موجودگی نے اسے بہت کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔ لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم بے حد واضح تھا۔ عاشر ششدر رہی رہ گیا تھا۔

”ایقان!“ وہ قدرے بے بسی سے بولا۔ ”کیا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”دوسرے یہ کہ میں اب تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی میں یہاں رہوں گی۔“ حیات ولا“ میں نے اپنے پورٹن میں، لیکن اپنے بچوں کا ماہانہ خرچ تم مجھے دو گے کیونکہ بہر حال تم ان کے باپ ہو، ان کے کفیل۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن تم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں رہنا کیوں چاہتی ہو؟ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تمہیں وہاں رہنے میں کیا قیامت ہے؟“ وہ بالآخر ضبط کھوئے ہوئے اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

ایقان چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس کی نظروں کی بے بسی، جھنجھلاہٹ اور کچھ نہ کر پا سکنے والی کیفیت سے وہ غجب مسرت سے ہنسنار ہوئی۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کارڈ لیس اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔
 ”تمہاری کسی دوست کا فون ہے۔“
 ربیعہ نے قدرے اچھٹے سے فون تھامنا۔
 ”ہیلو۔“

”ربیعہ! دو سہری جانب سے نہایت خوش و جذبے سے کہا گیا۔
 ربیعہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس کی تمام حسات بیدار ہو گئیں۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”ہاں ربیعہ! میں ہوں ترانہ، کیسی ہو تم ربیعہ؟ ٹھیک تو ہونا تم، تم خوش تو ہونا ربیعہ۔“ ترانہ بھی اس کی آواز
 سن کر اس سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں بے پناہ جوش تھا۔
 ربیعہ کی ہلکی سی ہنسی چمکنے لگی۔ کتنے عرصے بعد اس نے ترانہ کی آواز سنی تھی۔ کسی خونی رشتے کی مہک کو
 محسوس کیا تھا۔ نئی محبت کو محبت قریب محسوس کیا تھا۔

”ترانہ میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ تم میرے لیے بالکل فکر مند مت ہونا تم، تم کیسی ہو گھر میں سب
 لوگ کیسے ہیں؟“

”بس ربیعہ۔ کیا بتاؤں تمہیں۔“ ترانہ دکھ سے بولی۔ ”یہ عرصہ کس طرح گزارا ہے میں نے۔ میرا دل
 ہی جانتا ہے اور اور گھر والوں کا کیا پوچھتی ہو وہ سب ویسے ہی ہیں جیسا تم چھوڑ گئی تھیں۔“

”ترانہ! ربیعہ کو اس کی آواز سے گہرے دکھ کا اندازہ ہوا تو وہ بھی بے تحاشا دکھی ہوئی۔
 ترانہ نے اسے لپٹ لیا۔ ”میرا دل جانتا ہے کہ میں نے تم سے کتنی دُور ہو گیا۔“ اس کی آواز زندہ لگتی تھی۔

”ارے نہیں۔۔۔ نہیں ربیعہ۔“ ترانہ جلدی سے بولی ”تم جانتی ہونا۔ اتنی کمزور میں بھی نہیں ہوں کہ ہر کسی
 کی بری بھلی سہ جاؤں اور جتنی محبت مجھے تم سے ہے اسی کے مقابلے میں یہ تھوڑی سی تکلیف اور پریشانی کوئی
 حقیقت نہیں رکھتی ہے۔ ہر کسی کو اس کے لیے کچھ ملنا ہے ربیعہ۔ جیسے ابا کو ان کے کیے کا پھل ملنا ہے۔“

”پچھو کو؟ کیا ہوا انہیں؟“
 ”پچھو کبھی بتاؤں گی ربیعہ۔ یہاں پہلی اتنا وقت نہیں ہے۔ میں اپنی دوائی کا بہانہ بنا کر گھر سے تھوڑی دیر کے لیے
 نکلتی ہوں۔ پچھو اور قیوم دونوں ہمہ وقت میری پرے داری کرتے ہیں تاکہ مجھ سے انہیں کسی طرح تمہارا سراغ مل
 سکے۔ میں صرف تمہاری خیریت جانتا چاہتی تھی۔ تم تم خوش ہونا ربیعہ؟“

”ہاں ترانہ! میں ٹھیک ہوں بالکل۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے میں نے اور عباں بھائی کے گھر والے بہت
 اچھے لوگ ہیں۔ میرے ساتھ بالکل اپنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ ترانہ نئی خوشی سے معمور ہو کر بولی تھی۔
 ”اور تم ترانہ؟“ ربیعہ نے جلدی سے پوچھا۔

اسی وقت لائن منقطع ہو گئی۔ ربیعہ نے گہری سانس بھر کر فون کی جانب دیکھا پھر عقیدت و محبت سے اسے چوم
 لیا۔



شہلا نے ایک نگاہ چاروں جانب ڈالی تھی۔ دو کمرے، چھوٹا سا لاونج اور اس سے ملحقہ کچن! وہ ایک چھوٹے

”تمہارے گھر میں رہوں گی تو تم سے وابستہ رہنے کا احساس مجھے شکست و ریخت میں مبتلا رکھے گا۔“
 مسلسل اسی کیفیت میں گہری رہوں گی کہ میں یہاں رہ کر تمہارے گھر کی دیکھ دیکھ ایک باندی کی طرح کر رہی ہوں
 اور تم! تم وہاں کسی اور کی زلفوں کے سائے میں زندگی کی خوشیاں کشید کر رہے ہو۔ نہیں! میں اپنے گھر میں رہوں
 گی اس احساس کے ساتھ کہ میں اور میری زندگی ہر قید و بند سے آزاد ہیں۔ کسی کو میری پروا نہیں اور مجھے کسی کی
 پروا نہیں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ پہلا اور آخری۔ کسی رد و بدل کی توقع کے بغیر تم سے میرا تعلق صرف اور صرف
 ہمارے دو بچوں کی زندگی کے اہم معاملات تک محدود رہے گا۔ جب بھی پاکستان آؤں سے ملنے آجانا اور بس
 جا بھر کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے جیسے دھند سی اتری۔ پھر اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ وہ بولا تو اس کے لہجے میں دکھ کی گہری پرچھائیں کے ہمراہ سرکشی کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ ”نہ
 ساری زندگی ایک بیوہ۔ یا ایک مطلقہ کی سی محرومی میں مبتلا رہنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن جیسے ہی تمہاری
 کی رات میسر ہو تو یہ سوچنا کہ کس کو کتنا فرق پڑے گا۔“

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ پھر لمحہ بھر کے لیے رک کر اس نے اپنے کمرے میں
 موجود افراد پر ایک نظر ڈالی۔

”صبح میری فلائٹ ہے۔ اب کب لوٹوں گا نہیں جانتا! میری طرف سے خدا حافظ۔۔۔ الوداع۔“
 وہ کمرے سے نکل گیا۔ سب ہی نے دکھ کی گہری کیفیت میں ڈوب کر قدرے ملا متی نظروں سے ایقان کی جانب

دیکھا جو پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ سب کی نگاہوں کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے آپ میں لوٹی تھی پھر جیسے ان نگاہوں
 میں موجود سوالوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بھی تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

”میری بچی۔۔۔“ شفیقہ حیات زار و قطار رونے لگیں۔ ”ٹھیک ہی تو کہہ گیا ہے وہ۔ شو ہر دلی ہو کر بھی یہ
 یا طلاق یافتہ کی سی زندگی گزارے گی۔۔۔ ارے کوئی اسے کچھ نہ بولے۔“

”کچھ نہیں ہوتا اماں!“ فاروق حسن نے کسی سوچ سے نکلتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ ”یوں سمجھیں کہ ایک
 طوفان تھا جو ٹل گیا۔ آج کی اس ملاقات میں ان دونوں کے لیے ہی اس انتہائی قدم کو اٹھانے سے گریز کیا جس سے میں

خوف زدہ تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں یہی چاہت انہیں ایک دن پھر قریب لے
 آئے گی۔ ایقان نا سمجھ ہے لیکن میں بھی چاہتا ضرور ہوں کہ عاشر کو اگلے کیسے کی کوئی نہ کوئی سزا ضرور ملے

چاہے ایقان کا فیصلہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے۔ آخر مرد کے لیے بھی خدا کی جانب سے مقرر کردہ حدود ہیں
 جن کا اسے پاس کرنا چاہیے۔ عاشر نے ایقان کو زمانہ قدیم کی کوئی بے بس ناخواندہ عورت کو سمجھا دیا۔ غلطی کی تھی

اس کے نرم رویے اور وابستہ آجانے کے وعدے پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ ساری عمر کی جدائی چاہتی ہے یہ بھر
 غلط! لیکن بہر طور جلد یا بدیر ان دونوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گا۔ تب تک انہیں علیحدہ علیحدہ اپنی سوچوں سے

نبرد آزما رہنے دیں یہی دونوں کے لیے بہتر ہے۔“
 شفیقہ حیات کے آنسو ٹھہم گئے تھے۔ سلجوق حسن اور عذرا بیگم نے بھی مطمئن انداز میں ایک دوسرے کو دکھ

فاروق حسن ماں کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔



وہ سر جھکائے بے حد اٹھماک سے اپنی آنکھوں کا جائزہ لے رہی تھی جب انہیں کمرے میں داخل ہوئی۔
 ”ربیعہ۔۔۔“

سے رقبہ پر بی ہوتی انیکسی یا ایک قدرے بڑے گیسٹ روم کی مانند تھا۔

”تو تم نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟“ اس کی نگاہ ہر جانب سے ہو کر سامنے بیٹھی ہوئی ایقان کے چہرے پر آئی۔

”تمہارے خیال میں یہ ایک غلط فیصلہ ہے؟“ ایقان نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے سوال کیا۔

”پتا نہیں ایقان۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ”ہر مسئلہ ایک دائرے کی مانند ہوتا ہے۔ دائرے کے

اندر موجود شخص کو وہ اور طرح سے دکھائی دیتا ہے اور دائرے سے باہر موجود شخص کو اور طرح سے۔ اور دائرے

کے باہر جو لوگ موجود ہوتے ہیں وہ دائرے کے اندر موجود شخص کی کیفیت کو پوری طرح سے نہیں سمجھ پاتے۔“

”پھر بھی۔۔۔“ ایقان نے اصرار کیا۔ اپنا اپنا نقطہ نظر تو ہوتا ہے نا۔ تم کیا کہتی ہو؟“

”ایک عورت ہونے کے ناتے میں اس انا کو سمجھ سکتی ہوں ایقان! جس نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا لیکن

ایقان ایک دن اپنی اسی انا کا گلا عورت اپنے ہاتھ سے گھونٹتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔“

”تم مجھے بھی اچھی طرح سے جانتی ہو شہلا!“ ایقان ضدی پن سے بولی۔

”ہاں!“ اس نے گہری سانس لی۔ ”تمہیں بھی جانتی ہوں۔ اسی لیے کچھ بھی کہنے سے گریز کر رہی تھی۔

تمہاری انا کی سطح عام انسان کی سطح سے بلند ہے میں سمجھتی ہوں۔“

”شہلا، شہلا تم جانتی ہو گواہ ہو تم میں نے اتنے سالوں سے کتنا بے تحاشا چاہا ہے۔ ہر لمحہ ہر مل اس کا خیال

دل و دماغ میں اس طرح پیوستہ رہا کہ اور کچھ سوچنے یا غور کرنے کی میں ہینے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس کی

جدائی میں اس کی قربت اور اس کی قربت میں اس کی جدائی کے بارے میں سوچتی رہی اور اس نے اس نے

میری محبت میرے اعتبار و اعتماد کی دھجیاں اس قدر آسانی سے بکھیر دیں؟ وہ عورت کتنی ہی جھپٹتی ہو لیکن وہ

ایقان تو نہیں تھی۔ وہ اس کی محبت تو نہیں تھی۔ کیسے اس کا دل مانا کہ وہ اس کے قریب جائے۔ کیسے اس کے ضمیر

نے گوارا کیا کہ وہ اسے چھوئے؟ اس سے وہ باتیں کیے جو جو اس کی انا میں نے سمجھ سکتی تھیں۔“

”ہو سکتا ہے ایقان یہ تمہاری غلط فہمی ہو۔“ شہلا نے ضرور سے کہنے میں کہا تھا۔ ”اس عورت نے عاشر بھائی

کو مجبور کر دیا تھا۔“

”نکن پوائنٹ پر؟“ ایقان نے طنز سے اس کی بات کاٹی۔ ”دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بات پر قائل نہیں کر سکتی

کہ کسی عورت نے کسی مرد کو مجبور کر دیا۔ یہ صرف اور صرف مرد کے اندر چھپا شیطان ہے جو مخالف کو راضی برضا

دیکھ کر کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس نے مجھ سے جب دفائی کی ہے بی بی یہ بات روستی کی مانند عیاں ہے مجھ پر اور

اور میں اب اس کے قریب نہیں جاسکتی۔ مجھے ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے اپنے جذبوں کے خون کی بو آئے گی۔ مجھے

مجھے اس کی سانسوں سے کسی دوسری عورت کے وجود کا۔“

وہ بات مکمل نہ کر پائی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رو دی۔ شہلا متاسف نظروں سے اس کی جانب

دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ایقان کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

”نمت رو ایقان۔۔۔ مضبوط فیصلے کرنے والوں کو پہلے اپنے آنسوؤں جیسی کمزور شے کو مات دینی پڑتی ہے۔ اگر تم

واقعی یہی سمجھتی ہو کہ تمہارا فیصلہ درست ہے اور اٹل ہے تو پھر اپنے آنسوؤں کو یہ یاد کرو اور نہ یہ ہمیشہ تمہارا

اور تمہارے فیصلے کا منہ چراتے رہیں گے۔ تمہیں جتانے رہیں گے کہ تمہارا فیصلہ غلط تھا۔“

”کبھی نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

”اور ایقان! کوشش کرنا تمہارے معصوم بچوں کے ذہنوں میں قبل از وقت وہ سوال نہ اٹھیں جو انہیں بھی

پریشان کر دیں اور تمہیں بھی۔ انہیں یہ احساس مت دلا نا کہ ان کے باپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی پاداش

میں انہیں یہ ہجرت کرنی پڑی ہے۔ میں معصوم سوالوں کے درد سے آشنا ہوں اسی لیے تمہیں یہ مشورہ دے

رہی ہوں۔

”میں سمجھتی ہوں۔“ ایقان نے سر جھکا لیا۔

”میں اب چلوں۔“ شہلا گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اسپتال سے سیدھی تمہارے پاس ہی چلی آئی تھی۔

”سب ہی تمہارے مسئلے سے ڈسٹرب ہوئے ہیں ہیں نا۔“

”ظاہر ہے۔۔۔“ وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ”میرے اپنے ہیں۔۔۔ میرے دکھ پر لازماً“ دکھی ہوں گے۔ ہر کوئی تسلی اور دلاسا دینے آیا ہے۔ شام بھی آیا تھا ہاشم تو تم جانتی ہو مجھ سے کچھ زیادہ ہی اٹیچ ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ شہلا ہلکا سا مسکرائی۔

ایقان نے اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ دیر دیکھتی رہی۔

”شہلا۔۔۔ ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ چونکی ”ضرور۔“

”وہ تمہیں ہاشم سے میرا مطلب ہے ڈیو لوو ہم؟“ اس نے پھپھکی ہوئے پوچھا۔ شہلا لمحہ بھر کے لیے حیران ہوئی جیسے اسے ایقان کی جانب سے اس سوال کی امید نہ تھی۔ پھر وہ کھل کر مسکرا ڈی گئی تھی۔

”ہی ازریلی الڈ میں!“ وہ شگفتگی سے بولی۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ ایقان نے قدرے خفگی سے آگے دیکھا۔

”تمہارے سوال کا جواب کیا ہے مائی ڈیئر فرینڈ۔۔۔ یہ شاید میں خود بھی نہیں جانتی۔“ اس نے ایقان کا سر ہلایا۔

”جس دن مجھے مل گیا۔ اس دن تمہیں بھی ضرور ملے گی۔“ ٹھیک ہے؟“

ایقان اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

کوشش کر رہا ہوں۔“

”تمہیں کس فرشتے نے خبر کی کہ میں افسردہ ہوں؟“ وہ مزید جھلایا۔

”سچیدہ اور خاموش تو ضرور ہو۔۔۔ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے نا؟“ وہ مسکرایا۔

نافع خاموش ہو گیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اس کی تردید چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ منظر کی شگفتگی اور خوشی سے اس کے اندر عجب ملال سے اتر آئے تھے۔ وہ بہت سے سوالوں کے درمیان گھر گیا تھا اور یہی اس کی خاموشی کا سبب بھی تھا۔

”میں سوچ رہا تھا۔“ اس نے یونہی گھبرا کر بات بتانی چاہی۔ ”کہ تم تم آج بہت خوش نظر آتے ہو۔“

”ہاں تو میں ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”وجہ محض کل کی تقریب ہی ہے یا کچھ اور بھی؟“ وہ روکھے پن سے بولا۔

”اے۔۔۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”منظر نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔“ ”یہ وجہ تمہارے نزدیک محض ہے؟ میری منگنی ہوئی ہے یا ز میری پسند سے کتنی بڑی وجہ ہے خوشی کی۔ جسے تم محض قرار دے رہے ہو۔ ویسے بالی دادے تمہارا بھی تو نکاح ہو گیا ہے نا۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ اس نے بے دلی سے ہنکارا پھر۔

”خوش نہیں ہو شاید؟“ منظر نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں نے تو سبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔“

”اب بناؤ مت یا ر تم کوئی فرشتہ ہو؟ انسان ہو یا فرشتہ جیسے اور یہ رشتہ تو ہوتا ہی انوکھا ہے۔ دنیا کے ہر رشتے

”پتا نہیں۔۔۔“ نافع نے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں نے کبھی اس طرح کی محبت کو محسوس نہیں کیا۔“

”کیوں؟“ گدھے ہو گیا؟“

نافع نے خفگی سے اسے دیکھا تو وہ دھڑکنے سے بے خبر رہا۔

”کمال آوی ہو یا ر! محبت کی لطافت اور ندرت سے انکاری ہو۔ خیر شاید ابھی ہم اتنے کلوز نہیں ہوئے کہ تم اپنے اندر کی باتیں آشکار کرنے کے لیے میرا انتخاب کرو لیکن اتنا ضرور ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے ضرور کوئی غبار، کوئی جس زہ سوچ۔“ پھر اس نے سوچ میں ڈوبے خاموش بیٹھے ہوئے نافع کے کاندھے پر ہتھکی دی۔

”جس دن مجھے مل گیا۔ اس دن تمہیں بھی ضرور ملے گی۔“ ٹھیک ہے۔“

نافع نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔

ہاتھوں میں کتابیں تھامے وہ بے حد مصروف سے انداز میں باہر نکلا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ سامنے سے آتی ہوئی دروازے پر پڑی۔ دروازے نے بھی رافع کو ٹھکرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ پھر وہ رافع کے سامنے آرکی۔

”آپ یونیورسٹی جا رہے ہیں نا؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ بولا ”آج پینتیس جمع کروانا ہے۔ تم؟“

”میں آج نہیں جاؤں گی۔“ وہ سست سے انداز میں بولی۔ ”ایقان خالہ کی وجہ سے کچھ بھی اچھا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ آپ پلیز ایک پیغام پہنچا دیں گے؟“

”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”ہاں ضرور رولو۔“

”وہ ربیعہ میرا انتظار کر رہی ہوگی ہم دونوں ساتھ ہی نکلتے ہیں نا۔۔۔“

”ربیعہ؟“ رافع کے لب و دھیرے سے پہلے اور چہرے سے نئی رنگ بدلی۔

وہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

”آپ کو دیر ہو رہی ہو تو کوئی بات نہیں یہ میں خوب چلی جاتی ہوں اسے بتانے۔“

”ارے نہیں۔“ رافع مسکرایا۔ ”میں تمہارا مصیبت زدے دیتا ہوں ڈونٹ وری۔“

”مفتنک یو۔“ وہ ممنونیت سے مسکراتے ہوئے کرپٹ گئی۔

راقع مرکزی گیٹ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سیاہ سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے وہ نجانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔

کیسے رستے تھے یہ جولاہ گریز کرنے پر بھی ایک ہی سمت کو جانتے تھے۔ کتنے دن لگتے تھے دل کو سمجھانے میں اور

پل بھر میں وقت پھر اسے اس کے سامنے لا کھڑا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر لفظ سے لفظ جڑنے لگتے تھے۔ تخیل کا سیل

رواں بہا کر کہاں سے کہاں لے جایا کرتا تھا اور اس کی سوچ ایک کمزور تنکے کی مانند بھٹکتی پھرتی تھی۔

یکدم رافع ٹھٹک کر رک گیا۔ سفید بنگلے کی دیواروں پر چڑھتی ہری بیلوں نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ وہ

آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔

لکڑی کے چھوٹے پھاٹک سے قریب ریچہ کھڑی تھی۔ لیمن کمرے کے کچنوں پر بڑا سا سفید دھبہ اور سفید

اس کا ر ف لیے وہ سو م ہے بی ہونی گڑیا لگ رہی تھی۔

اس کا وہیلان رائج کی جانب نہ تھا۔ وہ سڑک کے پار گھنے درختوں کے عقب میں چھپے پارک کی سمت دیکھ رہی تھی۔

نہیں۔ نجانے اس قدر انہماک سے کیا سوچ رہی تھی۔

رائع اس جنگے قریب پہنچ کر ہوا سے کتنا کھارہ۔ زمین بڑی طرح سے تھوکتا اٹھی۔

”آپ! میں نے لبِ بحرِ لبی سے یوں بے گئے تھے جیسے رافح کا سامنے ہونا۔ اس کے گالے بے حدِ اعانتِ حیرت تھا۔

رافع کو نجا پانے کیوں خوش فہمی سی ہوئی۔ شاید وہ اسی کو سوچ رہی تھی تب ہی اسے سامنے کیا کڑواؤں خیران کی ابو

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بے حد غصہ ہوئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ دیر سے مسکرایا۔

”و علیکم السلام۔“ ربیعہ بھی ایسی کیفیت پر قابو پا کر شگفتگی سے مسکرا دی۔

رافع کو یوں لگا تھا جیسے وہ صبح مزید خوب صورت، مزید چمکیلی ہو گئی تھی۔

’نیونیورسٹی جانے کی تیاری میں ہیں؟‘ اس نے ہلکے ہلکے انداز میں پوچھا۔

”ستیا ری تو کب کی ہو چکی“ میں وردہ کا انتظار کر رہی ہوں وہ اب تک نہیں آئی

”دورہ کا ہی میسج ہے آپ کے لیے، وہ آج لونینور شی نہیں جائے گی۔“

”اگر وہ“ رجبہ یکدم پریشان سی ہو گئی۔ ”لیکن کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا شاید ناسازی طبع اس کی وجہ ہو۔“

”اچھا!“ ربیعہ مالوس سی ہوئی۔ ”پھر میں بھی نہ حاوکل۔“ ”اگر

”مشورہ مانگ رہی ہیں؟“ رافع شوخی سے مسکرایا۔

سورہ مائدہ راقی ہیں! راج سوئی سے سرایا۔
ربیعہ جو کئی پھر دھیرے سے ہنسکا۔

”نہیں۔ بلند آواز میں سورج راز“

”دیر لے کر لاؤ نیورسٹی، ہا جا رہا ہوں۔ مجھے

دیکھیں یونیورسٹی ہی جابر ہوں۔ نہ تھے۔ سس کے مسئلے میں ٹھوڑا نام ہے۔“

ربیعہ اس کا مطلب سمجھ کر چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر وہ لکڑی کا پچانک کھول کر باہر نکل آئی۔

”جب ایڈیشن لے ہی لیا ہے تو کبھی کبھار اکیلے کلاس اینڈ کرنے کی عادت بھی ہونی چاہیے۔“ وہ بولی۔

دونوں صاف ستھری سڑک پر ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ رافع نے ایک مرتبہ پھر صبح کی تازگی اور خوب صورتی کو پوری طرح سے محسوس کیا۔ سورج ابھی ٹھیک طرح سے طلوع نہ ہوا تھا۔ آسمان کا رنگ نظروں کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔ پارک کی جانب سے آتی ہوا اپنے سنگ مختلف درختوں کی ملی جلی خوشبو کھینچ لاتی تھی۔

”کئی دنوں سے آپ پارک میں نہیں آئیں۔ کیا صبح کی سیر سے جی بھر گیا؟“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں چل قدمی تو کرتی ہوں لیکن گھر کے لان میں ہی شوق پورا کر لیتی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔“ رافع ہنسا۔ ”میں بے وجہ ہی منتظر۔“

وہ اچانک ہی خاموش ہوا تھا۔ بے خودی میں گھر کر نجانے زبان کیا کہنے چلی تھی۔ لیکن قابو پا رہے تھے۔ دیر ہو گئی تھی۔ لفظوں کا مفہوم پوری طرح سے عیاں ہو گیا تھا۔ رافع جی ہی جی میں ہنسنے لگا۔ شرمندہ ہوا۔ اس سے پھر کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔

دوسری جانب ربیعہ بھی سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کو اپنے چہرے پر ہونے والی گری محسوس ہوئی تھی۔ ان ادھورے انگوٹوں کا مفہوم کیا تھا؟ وہ سمجھ کر بھی نا سمجھی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ تب ہی مین سڑک پر آتے ہوئے پوائنٹ کو دیکھ کر دونوں کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

”خدا حافظ! ربیعہ نے رسمی سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ! رافع کے لب ذرا سا ہلے۔

وہ اب تک اپنے کپے پر شرمندہ تھا۔

وہ راؤنڈ مکمل کر کے لوٹی تھی۔ ڈیوٹی روم کی الوقت خالی پڑا تھا۔ شہلا نے انٹر کام پر چائے کے لیے کہا اور بیٹھ کر ضروری فائلز دیکھنے لگی۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ شہلا نے جھپکی اسکرین پر دیکھی۔ کال انویس کی تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو آپ!۔“ دوسری جانب لہجے سے فکر مند ہی جھٹک رہی تھی۔

”ہاں اینتہ بولو۔ کیا بات ہے؟“ وہ یکدم متفکر ہوئی۔

”وہ میں عمر کو لینے اسکول گئی تھی۔“

”تو پھر؟“ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”وہاں ابراہیمائی موجود تھے وہ عمر کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

شہلا کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ساتھ۔۔۔ کیا مطلب ساتھ لے گئے ہیں۔ کیوں لے گئے۔ تم نے عمر کو جانے کیوں دیا۔“

”اوہ آپ! اتنی زیادہ فینشن نیلیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔ ”آپ تو جانتی ہیں عمر مسلسل ان سے کانٹھیکٹ میں رہتا ہے عمر نے ان سے فرمائش کی تھی مگر انہوں نے پھر انے اور شاہجنگ کروانے کی اس نے مجھے خود بتایا کہ وہ یہاں کے ساتھ جانا چاہتا ہے میں پھر کیا کہہ سکتی تھی۔“

”اوہ اینتہ۔۔۔! تم نہیں جانتیں یہ شخص مسلسل عمر کی برین واشنگ میں لگا ہوا ہے۔ نجانے کیا کر کے رہے گا یہ۔“

وہ بے حد پریشان ہو چکی تھی۔

”اور عمر۔۔۔ یہ لڑکا تو میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ میں اسے کتنا سمجھاتی ہوں لیکن۔۔۔“ اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی رہ گئے۔ اس کی ہاتھی ڈاکٹر ذرا دوا نہ کھول کر انستی مسکراتی اندر آرہی تھیں۔

”واپسی کے متعلق کیا کہا اس نے؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“

”جی ہاں یوں بھی ویک اینڈ ہے۔ عمر کی چھٹی بھی ہے اسکول سے۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں آپ! عمر تو بے حد خوش تھا۔ اس نے مجھے بالکل لفٹ نہیں کرائی۔“

”خوش تھا۔ اس نے مجھے بالکل لفٹ نہیں کرائی۔“

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”اوپاں یاد آیا پہلے بھی آپ نے بتایا تھا“ وہ خوش ہوا۔ ”پھر تو میرا گھر یہ ہے ناپایا؟“
 ”ہاں میری جان! میں نے کہا تائی کی تمہارا گھر ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا۔
 ”لیکن بابا! یہاں تو صرف آپ رہتے ہیں اکیلے۔ میں تو نانو کے ساتھ سوتا ہوں یا پھر ربیعہ خالہ کے ساتھ۔ میں
 یہاں کیسے سوؤں گا؟“

ابرار نے اس کی جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔
 ”میرے ساتھ سوتا۔۔۔“

”ہاں بابا!۔۔۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔ ”لیکن مجھے کہانی سنے بغیر نیند نہیں آتی نا۔“
 ”میں تمہیں ڈھیر ساری اسٹوری بکس دلوں گا۔۔۔ روز بڑھا کر نا۔“
 ”ایسا کیوں نہ کریں بابا!۔۔۔ نانو ربیعہ خالہ اور خالہ جانی کو بھی یہاں لے آئیں۔“ اسے نئی ترکیب سوچھی تھی۔
 ”کتنا مزہ آئے گا سب لوگ مل کر رہیں گے۔“
 ”مما کا نام نہیں لیا تم نے۔۔۔؟“ ابرار نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ ”تمہاری ممما کو یہاں لے آئیں تو کیسا
 رہے؟“

عمر ایک دم خاموش ہوا تھا۔ وہ دوست پیس کاٹنے سے توڑنے لگا۔ ابرار نے اس کے انداز کو بطور خاص دیکھا۔
 ”بولو عمر۔۔۔؟“ اس نے اصرار کیا۔ ”تم نے جواب نہیں دیا۔“
 ”بابا!۔۔۔ مجھے تھوڑے بہتے چاول دیں نا۔۔۔“
 ابرار نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے اور اپنا چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر وہ چاول کھاتے عمر
 کو غور سے دیکھنے لگا۔

”عمر!“
 ”جی بابا!“

”آپ اپنے بابا کی بات کو انور کر رہے ہو جانو؟“
 ”نہیں بابا یہ بات نہیں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔
 ”پھر کیا بات ہے؟ مجھے سچ بتاؤ۔۔۔“
 ”وہ۔۔۔ ممما کہتی ہیں اپنے بابا نے میری باتیں بالکل سب کرنا۔ اگر بابا کوئی بات کہیں بھی تو تو تم خاموش رہنا۔“
 ”ہوں!“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اصل میں جانو بات یہ ہے کہ آپ کی ممما ہم سے ناراض ہیں اسی
 لیے۔۔۔“

”انہوں نے ہاشم انکل سے شادی کر لی؟“ وہ بے ساختہ ہی بولا تھا۔ ابرار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
 ”لیکن بابا!۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ہاشم انکل کی دلہن بن کر ان کے گھر چلی گئی ہیں۔ اگر آپ نے
 انہیں یہاں لانا تھا تو آپ ان سے شادی کرتے۔ اب وہ یہاں نہیں آسکتیں۔“
 ابرار گم صدم سا ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
 ”اور آپ بھی ان کی باتیں نہ کریں بابا! ممما ناراض ہوتی ہیں۔“ اس نے بے حد مدبرانہ انداز میں گویا اسے
 سمجھایا تھا۔

ابرار دھیرے سے مسکرایا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔
 ”دوستو! عمر! تم دیکھنا ایک دن ہم تمہاری ممما کو منالیں گے۔“
 ”ریلی؟“ اس کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ممما ممما مان جائیں گی بابا؟“

”جی ممانی جان! کیسے کچھ چاہیے آپ کو؟“ وہ کیتلی کوئی کوزی لے کر دھانچتے ہوئے بولی۔

”اے ہٹو! کچھ نہیں چاہیے۔ یہ بتاؤ یہ لوگ پہلے بھی آئے ہیں کیا؟“

”سب تو نہیں البتہ فریحہ ایک مرتبہ آئی تھی۔ ثانیہ! پلیریز برتن ٹرائی میں لگا دو۔“ ورد نے ان کی بات کو جواب دیتے ہوئے ثانیہ کو ہدایت بھی دی۔

”دیکھنے آئے ہیں یا باقاعدہ رشتہ ہی ڈال رہے ہیں۔“

”مجھے خبر نہیں ممانی جان!“ وہ مسکرا دی۔ ”میں تو تب سے کچن میں ہوں۔ اندر کیا بات چیت چل رہی ہے مجھے خبر نہیں۔ لیکن آپ تو اندر سے ہی آ رہی ہیں نا!“

”اے ہٹو! ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آیا ان کے انداز تو ایسے ہیں جیسے منتقلی ہوئے بھی مدت گزر گئی ہو۔ اب تم لوگ کچھ چھپاؤ تو ہمیں کیا خبر!“

وردہ تنہا رہ گئی۔ وہ اپنی بات کہہ کر پھر پلٹ کر ڈرائنگ روم کی سمت چل پڑی تھیں۔

”دیکھا تم نے۔“ وردہ ثانیہ کی جانب مڑی۔

”برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے کباب پلیٹ میں رکھتی رہی۔ ”میں اپنا کام کرو۔“ وردہ گہری سانس بھر کر ٹرائی کا جائزہ لینے لگی تھی۔

اس چھوٹے سے گھر کے لیے وہ ایک بے حد خوشی کا دن تھا۔ انہی کی پیشی نے وقت رخصت اپنے نفیس سے پرس سے ایک مٹھلیں ڈھیا نکالی تھی اور رابعہ بیگم کی جانب سے اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا تھا اور رابعہ بیگم سوائے مسکرائے کے کچھ نہ کہہ پائی تھیں۔

تب انہوں نے ڈائمنڈ رنگ ناعمہ کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ڈال کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

”یہ صرف شکر ہے۔“ وہ بولی تھیں ”باقاعدہ رسم، شہزادہ صاحب کی مرضی کی تارن خبر کر رہی ہوں۔“

”اور رسم کیسے ہوئی ہے۔“ فردوس بیگم نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔ ”مٹھلیں اور پھولوں کے بوکڑوں کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ ان کی برور ہاٹ صرف ان کے پہلو میں کھڑی ثانیہ ہی سن پائی تھی۔“

ان کے جانے کے بعد سب ہی ہنسی خوشی رابعہ بیگم اور ناعمہ کو مبارکباد دینے لگے تھے۔ رابعہ بیگم کا پتلا چہرہ ان کی کچی خوشی کا منظر تھا۔ ناعمہ ہونٹوں سے محض سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ خود پر سے گزرنے والی افاد نے جیسے اس کے حواس متلون کیے ہوئے تھے۔

”رائمہ کو فون کر کے بلاؤ ورد۔“ رابعہ بیگم کو بڑی بیٹی کی یاد ستائی۔ ”اس غریب کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“

”اے میں بھی چلوں!“ فردوس بیگم انھی تھیں۔ ”ماہین کو اطلاع کروں جیسے ہمیں اپنی پھولی بات چیت چاہیے۔“

اسے بھی بتا دیں ہاں!“

کئی افراد انہیں جاتا دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

ماہین دوڑی دوڑی چلی آئی تھی اور اب بے حد دلچسپی اور اٹھناک سے ماں کی گفتگو سن رہی تھی۔

”یہ بڑی گاڑیاں اور دونوں میں ڈرائیور موجود یوں جیسے کہیں کے رئیس زادے ہوں۔ اے ماہین! یہ بوگی ناعمہ تو بڑی ہوشیار نکلی۔ نجائے کہاں سے اس نے ایسا ر میں زادہ قابو کیا۔ ہمیں نہ آئیں ایسی ہوشیا ریاں اور بیٹیاں ہم سے زیادہ بھولی۔“

”کچھ بتا نہیں چلا آپ کو یہ رشتہ آیا کیونکر؟ انہوں نے ناعمہ کو کہیں دیکھ کر پسند کیا یا لڑکے اور لڑکی کی باہمی

پسند ہے؟“

”اے ہٹو! ہمیں کوئی کچھ بتائے تو ہمیں پتا بھی چلے۔“ وہ مایوسی سے بولیں۔ ”کن سوئیاں لینی تو ہمیں آج تک نہ آئیں۔“

”وہاں موجود افراد کی باتوں سے اندازہ نہ ہوا آپ کو؟“ ماہین قدرے خفگی سے بولی۔ ”ایک تو آپ کی سمجھ بھی ایسی ہی ہے نا۔“

”اب تمہیں بلایا ہے تم پتہ کرو ماجرا کیا ہے۔“ وہ سرگوشی میں گویا ہوئیں۔ ”اے ہٹو! ہم نے بھی بس جلد بازی سے ہی کام لیا۔“

”کس معاملے میں؟“ اس نے نا سمجھی سے ماں کو دیکھا تھا۔

”اپنی عریشہ کے معاملے میں اور کس معاملے میں۔“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

فریحہ نے مانی کی بوتل نکالتی عریشہ کے ہاتھ اپنا نام سن کر سست پڑے تھے۔

”وہ تو اب تنگ نا لڑ رہی ہے آپ لوگوں کے اس غیر منصفانہ فیصلے پر۔ نہ لڑکی کی رضا مندی ڈھنگ سے لی نہ کسی اور کی رائے کو کوئی اہمیت دی۔ اب دیکھ لیجئے باغ میں رکھا ہی کیا ہے؟ یہاں ہماری بہن برتن مانجھے گی اور وہاں ہنسی ناعمہ راج کرے گی۔“ ماہین نے بھی پھپھوسے لے پھوڑے تھے۔

”بس ماہین! غلطی ہی ہوئی!“ انہوں نے کف افسوس ملے۔

عریشہ فریحہ کے پاس ہی کھڑی نجائے کیا سوچنے لگی تھی۔

”کر کیا ہے لڑکا؟“ ماہین پھر اپنے تفتیشی انداز میں بولی۔

”نعمہ! کیا جانوں۔“ انہوں نے تپا تپا تو ہوئے۔

”لیجئے! چھوٹا لڑکا نکلا۔“ انہوں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”فراز نام ہے لڑکے کا۔ تصویر وردہ نے مجھے دکھائی تھی اس کی۔ اے! ماشاء اللہ ایسا خوبہ جوان کہ نظر بھر کر نہ دیکھے کوئی۔“

”اچھا۔ واقعی؟“ ماہین کو حسرت ہوئی۔

”گھر والے ایسے عمدہ لوگ اور ہمیں ایک سے بڑھ کر ایک۔ بڑی شادی شدہ ہے۔ لیجئے اور چھوٹی والی بڑبچہ کی ابھی کہیں بات نہیں ہوئی۔“

”عمریشہ نے دیو لڑکا سارا لیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔ ان سب ناموں سے وہ بخوبی واقف تھی۔“

”مجھے تو لگتا ہے ماہین! یہ ناعمہ کا ہی کام ہے۔ اسی نے کہیں سے یہ لڑکا پیچھے لگایا ہے۔ کیسی گھنی نکلی ہے یہ اور صورت دیکھو تو فرشتوں کی سی۔“

”کیا خبر ای۔“ ماہین بے دلی سے بولی۔ ”بغیر جانے بوجھے کیا کسی پر الزام دھرتا ناعمہ اور وردہ ایسی لڑکیاں نہیں ہیں۔“

عریشہ سکتے کی حالت میں اب تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔

بقیہ اسی شمارے میں

انراہمن کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن تراز اس کی ایک نہیں سہتی۔ جس پر ربیعہ کو براہ راست سے گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عہد کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منہرہ بیگم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔

تمدد شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریشہ کا نکاح پر عروا دیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

ایک اور رات ابرار جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس

وقت ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

ابراہیم اور حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے

نئی اندریشالی کا باعث بنتی ہے۔ فرازی بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔

ایک اور ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا غلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

ایمان شری کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر سے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایمان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک

ہوتا ہے۔

شہلا کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فریوس بیگم کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے

دے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا ربیعہ کے بھانجے راہجہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ شہلا ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے

ربیعہ دورہ کے مشورے سے ایمان اپنے شو شیاو جی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔

عراشہ سے ملنے ہوٹل پہنچتا ہے تو لڑا اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایمان

کا ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایمان

بھلا ہوا صدمے سے گنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ دورہ سے ملنے اس کی کھلائی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑا کی دشمنی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے صدمے

کا شکار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ دورہ کے لیے اپنے دل میں

بجائے محسوس نہیں کرتا۔

۲۷

ستائیسویں قسط

انڈی ڈائری میں دیکھ کر اس نے نمبر ملایا تھا پھر دوسری جانب ہوتی ہوئی بیل کی آواز سننے لگی تھی۔ جلد ہی فون

پہلے۔ ”حسن اتفاق سے وہ دورہ ہی تھی۔“

”پہلو دورہ۔ ربیعہ بول رہی ہوں۔“

”اور وہ کی آواز میں خوشی در آئی۔“ کیسی ہو ربیعہ۔ سچ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ کل یونیورسٹی نہیں آئیں۔“ ربیعہ نے پوچھا۔

”میری طبیعت؟“ وہ قدرے گڑبڑا سی گئی تھی۔ ”اوہ۔ ہاں۔ میں تھیک ہوں ربیعہ! بس یونیورسٹی کچھ موڈ

ہم تھا اور پھر شام کو اچانک ہی وہ لوگ چلے آئے۔“

”وہ لوگ؟“ ربیعہ کچھ نہ سمجھی۔

”ہاں! وہ فراز کے گھر والے۔ میں نے تم لوگوں سے ذکر کیا تھا تاہم پہلے بھی۔ بس وہ اچانک ہی آگئے۔ بنا کسی پروگرام کے۔ اور افراتفری میں ہی ناعمہ کو انگوٹھی بھی پہنا گئے۔ مصروفیت ایسی ہو گئی تھی کہ میں تمہیں فون بھی نہ کر پائی۔“

”ارے۔“ ربیعہ خوش ہو گئی۔ ”پھر تو مبارک ہو بہت بہت۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے تمہیں۔ ناعمہ کو میری طرف سے بہت مبارک بادوں۔ فراز بھائی تو اتنے اچھے ہیں کہ کسی شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں بنتی۔ ناعمہ واقعی خوش قسمت ہے۔“ ورنہ دیکھتے سے ہنس دیتی۔

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ ویسے تم مبارک باد دینے خود کیوں نہیں آ جاتیں؟ تم سے ملنے کو بہت اہل چاہ رہا ہے۔“

”یعنی منگنی کی مٹھائی کھانے بھی میں خود چل کر آؤں؟“ ربیعہ مسکرائی۔

”مٹھائی یہاں بھی کھلائیں گے اور گھر بھی دینے آئیں گے۔ تم بے فکر رہو۔“ ورنہ بھی ٹھانگنی سے بولی۔

”اچھا میں کوشش کرتی ہوں۔ امی سے پوچھ لوں۔“ ربیعہ بولی۔

”اوکے۔ میں منتظر ہوں۔“

ربیعہ نے ریسیور رکھ دیا پھر وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ”حیاتِ دلا“ کی سمت جاتے ہوئے رستے میں جو مانوس سی خوشبو اپنی جانب بلانے لگتی تھی وہ خوشبو ایک طالعیم کی مانند تھی اور ربیعہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس طالعیم کا شکار ہونا نہ چاہتی تھی۔ ورنہ کی زندگی میں بے حد خلوص تھا۔ ورنہ خود بہت معصوم اور پر خلوص لڑکی تھی۔ ربیعہ گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل دی۔ اس نے ”حیاتِ دلا“ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

”ربیعہ آ رہی ہے۔“ ورنہ نے ناعمہ کو مطلع کیا۔ ”وہ تمہیں بہت مبارک باد دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہاں آکر مبارک باد دے لے۔“

ناعمہ نے سستی سے بس رکھا جانب دیکھا اور ایک بڑی سی جمالی کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھی۔

”آپ ان کے لیے چائے تو ضرور بنائیں گی۔ ایک کپ مجھے بھی دے دیجئے گا۔“

ورنہ نے اچانک ہی بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔

”تھوڑی سی شرم کسی سے ادھار ہی لے لو ناعمہ! امی ویسے ٹھیک ہی فکر مند ہوتی ہیں تمہاری طرف سے۔“

بے وجہ انہیں طفلِ تسلیم دیتی رہتی ہوں۔ دو گھنٹے سے بستر میں تھمتی ہوئی ہو اور بجائے اس کے کہ ربیعہ کے آنے پر تم ہمیں چائے وغیرہ سرو کرو! الٹا فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ کیا بے گناہ تمہارا۔ اب تو عقل کرو! سرال والی ہو گئی ہو۔“

”اف آپ! پلیز نہ۔“ وہ بھٹکا کر اٹھ بیٹھی۔ ”آپ تو امی کی زبان استعمال نہ کریں۔ سچی میں تو پہلے ہی بے حد کوفت کا شکار ہوں۔ کیا مصیبت سر پہ پڑ گئی ہے بیٹھے بٹھائے۔“

”ناعمہ! عقل کرو! لٹی سیدھی باتیں وقت بے وقت منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ خدا نے تمہیں اتنی بڑی نعمت بن مانگے دی ہے۔ لڑکیاں تو ایسے رشتوں کے لیے وظیفہ بڑھا کرتی ہیں۔“ ورنہ سنجیدگی سے بولی۔

ناعمہ زور سے ہنس دی۔ ورنہ نے پھر اسے گھورا تھا لیکن وہ اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر ہنسی رہی۔

”میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں؟“ وہ چڑ گئی۔

”اور کیا۔“ لطیفہ ہی ہو گیا یہ تو۔ یعنی دنیا جہان کے پند و نصائح سننے کا لڑکیوں کو اس قدر شوق ہوتا ہے کہ وہ وظیفے کرنے لگتی ہیں۔ سچی آئی! جب سے یہ بلا میری انگلی میں آئی ہے میں نصیحتیں سن کر مرنے والی ہو گئی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے دس پندرہ اقوال امی کی جانب سے عطا ہوتے ہیں۔ سوتے جاتے چھ سات آپ بھی ساتھ لگا دیتی ہیں۔ ابھی تو ذرا رات تھی آپلی کو آنے دیں سب سے زیادہ خطرہ تو مجھے ان سے ہے۔ وہ تو مجھے حالتِ نیند میں بھی نہ بخشیں گی۔ جگا کر کہیں گی۔ ناعمہ! تمہارا منہ کھلا ہوا ہے۔ اسے بند کر کے سونے کی عادت ڈالو۔ سرال والے کیا کہیں گے۔ ماں نے سونا بھی نہیں دکھایا۔ آپلی! یہ سرال والے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں؟“

ورنہ نے خود پر بہت ضبط کرنا چاہا لیکن مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آئی گئی تھی۔

”بے وقوف۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

اسی لمحے ابنِ دونوں کو ہی کمرے کے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

”ارے۔“ ناعمہ کے لبوں سے یہی الفاظ نکلے۔ ”عریضہ! تمہیں۔“ وہ خوش ہو کر بستر سے نکل کر اس کی جانب بڑھی۔

”دکھو! ناخدا! ناخدا کر کے۔ تو آخر تمہیں ہماری یاد آئی گئی۔“

اس کے قریب پہنچ کر ناعمہ قدرے ٹھٹکی سی گئی تھی۔ عریضہ بے حد بے تاثر سے انداز میں کھڑی تھی۔ ناعمہ دیکھتے مگر جوش اور دلالتِ انداز نے بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری واضح تھی۔ ناعمہ لکھتے ہی قدرے پیچھے ہٹ گئی۔

”او عریضہ! ورنہ نے بھی خوش مزاجی سے اسے مخاطب کیا۔ ”اندر آکر بیٹھو نا! وہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے کیا؟“

عریضہ نے ناعمہ سے نظریں ہٹا کر ورنہ کی جانب دیکھا پھر وہ ایک ایک قدم بڑھاتی اندر چلی آئی اور بستر کے کونے پر بے حد تکلف سے ٹک گئی۔ ناعمہ بھی اس کے قریب آ بیٹھی۔

”تم دونوں باتیں کرو میں تیلے تنگ چائے بنا لاؤں۔“ ورنہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”ہم نے بھی شام کی چائے اب تک نہیں پئی ہے۔“

عریضہ نے اسے گھرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر دوبارہ ناعمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی نظریں بے حد نیچتی ہوئی تھیں۔ جس نے ناعمہ کو نبھانے کیوں خوف زدہ سا کر دیا۔

”کیا بات ہے عریضہ؟“ وہ بالآخر بول اٹھی۔ ”تم مجھے اتنے عجیب سے انداز سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”سنا ہے تمہاری منگنی ہو گئی ہے۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔

”بالنسہ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ ناعمہ نے سر ہلایا۔

”بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں زہر سا گھلایا۔ ”کہاں کھلی ہے قسمت؟“

ناعمہ کا منہ حیرت سے کھلا۔ اسے لگا یہ وہ عریضہ ہی نہیں تھی جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔

”ایک بات بتا دوں تمہیں۔“ اس سے پیشتر کہ ناعمہ کچھ بول پاتی وہ پھر اسی لہجے میں گویا ہوئی۔ ”دوسروں کے لئے بڑا دکھ ڈالنے والے کبھی خوش نہیں رہا ہے۔ سو قتی طور پر انہیں خوشیاں راس آ بھی جائیں تو بھی ایک دین کسی کا بائیس لے دو جاتی ہے۔“

”عریشہ۔۔۔“ ناعمہ کے لب کانپے۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کس کے حصے پر ڈاکہ ڈالا ہے میں نے کس کے ساتھ زیادتی کی ہے؟“

اس سے قبل کہ عریشہ کچھ بولتی، رابعہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔
”ماشاء اللہ۔۔۔ بھی آج تو ہماری عریشہ بیٹی آئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔“ عریشہ بادل خواستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ جیسے زیر لب بولی۔
”وہ ایکم السلام۔ جیتی رہو۔ کیسی ہو بیٹی؟“ رابعہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
”ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنوز سرواندا ز میں بولی۔

”ناعمہ کی منگنی کے بارے میں پتا چلا تمہیں؟“ رابعہ بیگم خوش دلی سے بولیں۔
عریشہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”مجھے تو چل گیا ہے۔۔۔ ناعمہ کو بھی چل جائے گا۔ چلتی ہوں۔“

وہ مڑ کر اچانک ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رابعہ بیگم نے از حد حیرت سے ناعمہ کی سمت دیکھا۔ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”کیا مطلب! اس بات کا؟“ وہ بڑبڑائیں۔

”پتا نہیں امی جی۔۔۔“ ناعمہ منمنائی۔

اسی لمحے دروازے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ہاں امی جی۔۔۔ عریشہ کہاں گئی؟“ اس نے از حد حیرت سے دیکھا۔

ناعمہ کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیں تھیں۔



وہ دوسرے کھانے کی تیاری کر کے کچن سے نکلی تھی۔ سامنے بیٹھی منہ ڈال بیگم کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھک سی گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”امی جی۔۔۔“ ربیعہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”کیا بات ہے۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ جب سے ان کی طبیعت ایک مرتبہ بگڑی تھی تب سے نجانے کیوں اس کے دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ وہ اب انہیں کچھ بھی نہ کرنے دیتی تھی۔ یونیورسٹی جانا ہوتا تو وہ اگلے دن کے کھانے کی زیادہ تیاری رات میں ہی کر لیا کرتی اور اگر آف ہوتا تو نہ صرف ناشتہ بلکہ دوسرا اور رات کا کھانا بھی وہی بناتی تھی۔
منہ ڈال بیگم اپنی سوچ سے نکل کر اب محبت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔

”ہاں ربیعہ۔۔۔“ پھر وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ تمہاری جیسی خدمت گزار بیٹی جس ماں کو مل جائے۔۔۔ اسے کچھ ہو سکتا ہے بھلا؟“ ربیعہ کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی ان سے لپٹ گئی۔

”امی جی۔۔۔ آپ کی بیٹیاں واقعی بہت خوش قسمت ہیں۔ اتنی اچھی، اتنی پیاری، شفیق ماں قسمت والوں کو ملتی ہے۔“

”تم بھی میری بیٹی ہو ربیعہ! یقین جانو۔ مجھے شہلا، انیقہ اور تم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ انہوں نے

”آپ سے بات ہو رہی ہے جناب!“ وہ شرارتاً بولا۔ ”موڑ تو خود بخود ہی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ مابدولت کا سوال ٹال گئی ہیں۔“

”نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کا دل چاہ رہا ہے تو ضرور چلتے ہیں۔“ وہ چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک آئی تھی۔ ”آپ گویا بات اب تک محض ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“ اس نے قدرے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔ ”خیر۔۔۔ پھر کچھ دیر سا دیکھ کر گویا چلیں؟“

”چائنا ٹاؤن۔۔۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”دوری ٹاؤن۔۔۔“ اس نے فوراً اتفاق کیا۔ ”چلو پھر گھر پہنچو، تھوڑا ریسٹ کر کے فریش ہو کر نکلیں گے۔“

”عمر کو بھی لے لیں گے نا۔ میں اسے بتا دیتی ہوں۔“ ہاشم کی جانب سے لمحہ بھر کا توقف ہوا۔ ”جی۔۔۔“ چند لمحوں بعد وہ بولا تھا۔ ”خدا حافظ۔۔۔“ شہلا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ ہاشم کی جانب سے وہ لمحہ بھر کا توقف اسے دُسترب کر گیا تھا۔ نجانے اسے عمر کو بھی ساتھ لے جانے کی بات کرنا چاہیے تھی یا نہیں۔ پھر وہ سر جھٹک کر گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ عمر کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کینسل کر چکی تھی۔ نجانے کیوں اس نے محسوس کیا تھا کہ ہاشم ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ فی الوقت صرف شہلا کی ہر ای کا خواہش مند تھا اور شہلا نے شاید اس کی تمنا کو پوری پوری سمجھ لیا تھا۔ ہاشم نے شہلا کی ہر ای کو ہمیشہ ہی انجانے میں اسے دکھ دے دیا کرتی تھی۔ ”گویا بات اب تک محض ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“

اسے ہاشم کے الفاظ یاد آئے۔ گاڑی سے نکل کر وہ اپنے خد مضمحل سوچوں کا شکار اندر پہنچی تھی۔ بلاؤنچ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی عریضہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شہلا کو قدرے حیرت ہوئی۔ وہ لڑکی اسے اب تک اپنے کمرے میں محدود ہی سمجھتی تھی۔ ہاشم کی مرکزی جگہ پر وہ کم ہی ملا کرتی تھی۔ عریضہ نے نگاہ اٹھا کر اسے لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور پھر اسے اپنی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

”کیسی ہو عریضہ!“ شہلا نے اس کے قریب ٹھہر کر ملائمت سے پوچھا۔ ”جی؟“ اس نے بادل خواستہ سرا اٹھایا۔ ”ٹھیک ہوں۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی تھی۔ ”آئی کہاں ہیں؟“ اس نے اصرار و ہرنگہ ڈالی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔ ”نجانے اس لڑکی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ شہلا نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ پھر وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ پورچ میں اس نے اپنی گاڑی ہاشم کی گاڑی کے

پچھلے پارک کی تھی لہذا اسے علم تھا کہ ہاشم اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اس نے دل میں ارادہ کیا کہ وہ ہاشم سے کہے گی کہ آج دُور پر وہ دونوں ہی جائیں گے۔ عمر کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بعد میں بھی رکھا جاسکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور پھر جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔

ہاشم بستر پر لیٹا ہوا تھا اور عمر اس کے پیٹ پر بیٹھا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ ہاشم نے اسے کوئی بہت مزے کا

محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔ ”جی۔۔۔“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔ ”جی۔۔۔“ وہ کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں ہی نے مڑ کر دیکھا۔

”مما! ماما! آگئیں!“ ہاشم پر سے اتر کر دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

ہاشم بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر بے حد خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی ابھی پہنچا تھا۔

شرٹ اتار کر اس نے ایک طرف ڈالی ہوئی تھی اور پینٹ اور بنیان میں بے حد فراغت سے بیٹھا تھا۔

وہ اس قدر پرکشش نظر آ رہا تھا کہ شہلا چند لمحے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی۔

”کس بات پر یہ آئینہ محو حیرت ہے؟“ ہاشم گنگنایا۔

شہلا چونکی پھر عمر کو خود سے لپٹا لے ہوئے آگے بڑھ آئی۔

”یہ عمر؟“ وہ بیڈ کے کنارے آگئی۔

”نہیں اسے پک کر تا ہوا آگیا تھا۔“ ہاشم نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”کیوں؟“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

ہاشم نے قدرے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”کیوں؟ کیا مطلب کیوں؟“ بھی میرا دل چاہ رہا تھا اس سے ملنے کا۔ ہاشم نے کرنے کا اور پھر صاحبزادے ہمارے

ساتھ ڈنر کے لیے بھی تو چل رہے ہیں نا۔“

اس کے لہجے میں بے ساختہ تھی۔ شہلا ایک بار پھر جی جی میں شرمندہ ہوئی۔

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ۔“

پھر اس کی نگاہ عمر پر پڑی جو بے حد دل چسپی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

”عموماً“ شہلا نے اس کے بال بگاڑے۔ ”مما کے لیے پانی لے کر آؤ۔“

”جی ممما۔“ وہ فریق کی جانب چلا گیا۔

شہلا نے ہاشم کو دیکھا جو دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

”میں میں سوچ رہی تھی اگر آج ہم دونوں ہی چلتے“ عمر کے ساتھ پھر کسی دن اچھا سا پروگرام بنالیں گے۔“

”لیکن تم نے ہی کہا تھا کہ ہم عمر کو۔“ ہاشم کی نظریں میں الجھن در آئی تھی۔ ”اچانک تبدیلی کیسی؟“

”سوری ہاشم۔ میں شاید آپ کے احساسات سمجھ نہیں پاتی تھی۔“

ہاشم چند لمحے اس کی جانب دیکھا رہ گیا۔

”کم آن شہلا تم تم نے مجھے اس کی بابت یاد دلایا تو میں تو بے حد شرمندہ ہو گیا تھا۔ یہ بات تو مجھے خود کہنی چاہیے

ہی اہم بلکہ جب تم نے مجھے اس کی بابت یاد دلایا تو میں تو بے حد شرمندہ ہو گیا تھا۔ یہ بات تو مجھے خود کہنی چاہیے

تھی کہ ہم عمر کو بھی ساتھ لیں گے۔“

شہلا سے کچھ بولا نہ جاسکا تھا۔ ہاشم کے جذبات نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔

”مما! ممما! آج ہم کہاں جائیں گے؟“ عمر بانی کا گلاس بھر کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ شہلا نے چونک کر اس کی

سمت دیکھا تھا۔

”آج ہم چائنا ٹاؤن جائیں گے اور پھر جہاں عمر بابا کہیں گے وہاں چلیں گے۔“ ہاشم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا۔

”کہاں جاؤ گے؟“

”جہاں پہالے کر گئے تھے۔“ وہ جوش سے بولا۔ ”وہاں بہت سارے جھولے تھے۔ پہالے مجھے سارے جھولوں پر بٹھایا تھا پھر انہوں نے مجھے ڈھیر سارے ٹوئرز بھی لے کر دیے تھے۔ آکس کریم بھی کھلائی تھی۔ پتا ہے ہاشم انکل! میرے پہا بہت گریٹ ہیں۔“

”عمر! شہلا نے قدرے غصے میں اسے پکارا۔ ”کیسے کو اسٹ ناؤ!“

عمر سم کر ایک دم ہی خاموش ہو گیا تھا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

”بولنے دو یا۔“ ہاشم آہستگی سے بولا۔ ”بچہ ہی تو ہے۔“

شہلا نے محسوس کیا ہاشم کے انداز میں قدرے سنجیدگی آگئی تھی۔

”میں ذرا چیخ کر لوں!“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔



”مما! ہم یہاں کیوں آ گئے ہیں؟“ موسن بسور رہا تھا۔ ”مجھے یہاں رہنا زیادہ پسند نہیں ہے۔“

ایقان نے لحظہ بھر کے لیے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”اچھا! تو گویا اس عمر میں بھی آپ کی پسند ناپسند کی بہت اہمیت ہے۔ بڑے ہو کر تو جانے کیا حال ہو گا۔“

”مما! یہاں کبھی کبھی آتا تو مجھے اچھا لگتا ہے لیکن آپ تو یہاں رہنے لگی ہیں۔ اپنے سارے کپڑے بھی لے

آئی ہیں۔ وہاں میرے فریڈز میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہم سب شام کو کرکٹ کھیلتے تھے، کتنا مزہ آتا تھا۔“

”موسن! میرا دماغ مت کھاؤ۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”فریڈز یہاں بھی بن سکتے ہیں اور عمر بھی تو ہے یہاں!“ اس

کا ساتھ کھلا کر۔ شام کو ایک چلے جانا۔“

”نہیں، ممما! مجھے اپنے آپ کو چھوڑنا ہے۔“ ایقان نے ہاتھ پیرے کھلونے ہیں اور وہ گھر رہا ہے۔ یہ تو بالکل چھوٹا سا ہے

یہاں کھیلنے میں مزہ نہیں آتا۔“

ایقان خاموش ہو گئی۔ بچے سے بحث کرنا فضول تھا۔ وہ اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی۔ لیکن وہ پیچھے ہی چلا آیا

تھا۔

”آپ سامان رکھ لیں ہم شام کو چلیں گے۔“ ایقان نے مڑ کر خفگی سے اسے دیکھا۔

”موسن! تمہیں میری بات سمجھ نہیں آتی؟“

”آپ کو کبھی ممما! میری بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ اس نے منہ بگاڑا۔ ”مجھے تو ہر وقت پہا یاد آتے ہیں وہ

میری ہر بات سمجھتے ہیں۔“

غصے کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

اسی لمحے بجنے والی فون کی بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ غصے میں چلتی ہوئی فون تک

آئی۔

”ہیلو۔“

”عنا شربات کر رہا ہوں۔“

دوسری جانب سے آئی ہوئی آواز نے اسے سر سے پیر تک سن کر دیا تھا۔ اس سے چند لمحوں کے لیے کچھ بولا نہ

جاسکا۔ پھر کا ایک اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔

”تم؟ تم؟ تمہیں یہ نمبر کس نے بتایا؟“ وہ پھنکاری تھی۔

”بھابی بیگم نے سہ ”وہ بولا۔ ”اور زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے محض یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے پچاس ہزار کاڈرافٹ بھیج دیا تھا اپنا اکاؤنٹ چیک کر لیتا۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے بچوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا!“

ایقان چند لمحے خاموش کھڑی ہوئی مگر اس نے ریسیور سائیڈ میں پٹختا تھا۔

”مومن۔! یہاں آؤ۔“ وہ چلائی۔

مومن دوڑتا ہوا آیا تھا۔

”جی مماسہ!“

”فون پر بات کرو۔“ وہ وہاں سے جانے لگی۔

مومن نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تھا پھر اگلے ہی لمحے اس نے بے ساختہ مسرت اور اشتیاق سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”یہاں! السلام علیکم میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

ایقان کمرے میں چلی آئی۔ ایمان بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ضبط محال تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کئی قطرے اس کے گریبان میں جذب ہوئے۔ کس سنگ دلی سے اور بے مہری سے اس نے بات کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہی لہجہ پھول پر سنا تھا۔ مومن بات ختم کر کے کمرے میں آیا تو وہ اچھا خاصا رو چکی تھی۔ پوٹے متورم ہو چکے تھے وہ اسے دیکھ کر جلدی جلدی چہرہ صاف کرنے لگی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”مماسہ! اچھا ایمان کا پوچھ رہے تھے وہ بھی ہم لوگوں کو مومن کو کہہ رہے ہیں۔“

”اچھا!“ وہ کاڈرافٹ بھیج دینا چاہتی تھی۔

”اور مماسہ! یہاں ہمارے لیے پارسل بھی بھیج رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے شاپنگ کی ہے!“

”اچھا بیٹا! ٹھیک ہے۔“ اس کا دل پھر بھر آنے لگا تھا۔

”مماسہ! آپ پہاڑ کو نہیں نہیں کرتیں؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

ایقان گہری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔



شہلا چہرے پر کلنزنگ ملک لگا کر اب ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز پر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ یقیناً ”ہاشم ہی تھا۔ شہلا آئینے کے سامنے سے ہٹ کر دروازے تک چلی آئی۔

لاک کھولنے تک اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ باہر یقیناً ”ہاشم ہی ہے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ یکایک اوٹ میں ہو گئی۔ باہر فاروق حسن ہوں گے اس کے تو وہم و گمان میں نہ تھا۔

شہلا بیٹے! آپ کا فون ہے۔“ وہ باہر سے بولے۔ ”کارڈ دروازے ایکسٹینشن سے بات کر لیں۔“

”جی۔ جی انگل۔!“ وہ ہکا کر رہ گئی تھی۔

پنک نیٹ کی ٹانگیں میں بنا شمال کے ان کے سامنے آجانے پر وہ حد درجہ خفت کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے خود کو سخت سست سنائیں۔ دروازے پر کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اسے خود شمال یا گاؤں وغیرہ لینا چاہیے تھا۔

خود سے لڑتی جھگڑتی برا بھلا کہتی وہ فون تک چلی آئی تھی۔ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا تھا کہ اس وقت بھلا کس کا فون ہو سکتا تھا۔

لباس تبدیل کر کے وہ ڈریسنگ روم سے باہر آ رہا تھا۔ شاید جس وقت وہ فون سننے کمرے سے باہر گئی تھی تب ہی ہاشم کی واپسی ہوئی تھی۔ موبائل کزن سے لگائے وہ عائبہ باغی سے ہاشم کو تکنے لگی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ دونوں ہی بولی تھیں۔

ربیعہ نے محسوس کیا اور وہ کے گالوں پر ہلکی سی سرخی آگئی تھی اور لب مسکرانے لگے تھے۔ ربیعہ بھی بشارت سے مسکرا دی۔

”کلاس بنک ہو رہی ہے؟“ رافع نے انہیں چھیڑا تھا۔

”جی نہیں۔ ہم بہت ریگولر اور پینکچرل اسٹوڈنٹس ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی ”آپ اپنی سنائیے کلاسز ختم ہو جانے کے بعد بھی یہاں نظر آ رہے ہیں۔“

”مجھے ذرا لائبریری میں کام تھا۔“ وہ ہنس دیا۔ ”اور یوں بھی یہاں سے جس کا رشتہ ایک بار جڑ جائے وہ اتنی آسانی سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔“

”لائبریری!“ ربیعہ کو اچانک ہی خیال آیا تھا ”وہ بکس نکلاؤں اگر زحمت نہ ہو تو۔“ آپ کے توانے خاصے تعلقات بنے ہوئے ہیں!“

”مائی ہلیو بس۔“ اس نے ذرا سا سر خم کیا۔

ربیعہ نے بیگ سے نوٹ بک نکال کر اسے کتابوں کے نام لکھ دیے۔ رافع نے ایک نگاہ ان ناموں پر ڈالی۔

”اوکے ربیعہ! میں یہ بکس نکلاؤں گا مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔ میں شام کو آپ کے گھر دے جاؤں گا۔“

”بہت مہربانی ہوگی آپ کی۔“ ربیعہ خوش ہو گئی۔

”اب پلینز تکلف سے گریز کریں!“ وہ ہنسا ”میں اب چلتا ہوں۔ مجھے چند ایک ضروری کام ہیں۔ اونسے۔ خدا حافظ!“

وہ ایک سمت کھڑے اپنے منتظر دوستوں کی جانب بڑھ گیا۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے ورنہ کی جانب نگاہ کی اور پھر چونک سی گئی۔ ورنہ کے رخساروں پر آجانے والی وہ چمک غائب تھی اور لبوں پر لڑختہ ہنسکاوی کا شائبہ نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ خالی خالی نظروں سے دو سری جانب دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کو سب کچھ سمجھنے میں لمحہ بھر لگا۔

رافع اس مختصر عرصے میں محض ربیعہ سے محو کلام رہا تھا۔ ورنہ سے مخاطب ہونے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ دو سری جانب ربیعہ بھی اس کی اندرونی کیفیت کے لیے خرابی ہی کہے گئی تھی۔ شاید ان دونوں نے ورنہ کو نظر انداز کیا تھا۔ ربیعہ نے اپنے اندر شرمندگی کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ لیکن اس کے پاس ایسا کچھ نہ تھا جس کے لیے ورنہ سے معذرت ہی کر سکتی۔

”چلیں!“ ورنہ نے اسے سوچا دیکھ کر خود ہی کہا تھا ”سرنیر کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔“

”ہوں؟“ ربیعہ چونکی ”ہاں چلو۔“

جی ہی جی میں شرمندہ ہوئی وہ اس کے ساتھ چل دی تھی۔

”آئی بس!“ ناعمہ نے کمرے میں جھانکا تھا ”جائے بیس گی؟“

نوش بناتی ہوئی ورنہ چونک اٹھی۔

”ہاں ضرور۔ میں تو خود ابھی چائے بنانے کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔“ وہ مصروف سے انداز میں گویا ہوئی۔

”پکوڑے بنالوں ساتھ میں؟ پودینے کی چٹنی کے ساتھ؟“

ورنہ نے اب کی بار خاصی حیرت سے اس کی جانب نگاہ کی۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی محاورات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے خنثی سے محفوظ رکھیں۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات؟ نیکی اور پوچھ پوچھ؟“

ناعمہ کچھ تھینپ کر مسکرائی اور غائب ہو گئی۔ ورنہ پین دانٹوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاید اس کی اور رابعہ بیگم کی نصیحتیں اثر کر رہی تھیں۔ سر جھٹک کر اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہوئی۔ پھر یکدم ایک لمبندی سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی۔

”نجانے کیا بات تھی ایسی! کتابوں میں دل نہ لگ رہا تھا۔ نجانے کیسا احساس تھا جو مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔“

وہ کس سوچ سے چیخا چھڑانا چاہتی تھی! اسے خود سمجھ میں نہ آ رہا تھا! ناعمہ جلد ہی آگئی تھی۔ اس نے رُے میں قرینے سے برتن سیٹ کیے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ میں گرم گرم پکوڑے، چینی کی پیالی میں خوش رنگ چٹنی اور ساتھ میں دم کی ہوئی چائے۔

ورنہ نے بے حد حیرانی سے ہر چیز ملاحظہ کی۔

”یہ اتنی جلدی؟“ اس نے کھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”آپ سے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں تم نے یہ سب کچھ کر لیا؟“

”کیا کرنا تھا آئی؟“ وہ بے حد اطمینان سے تھی۔ ”پکوڑا بکس سے پانچ منٹ میں پکوڑے بن جاتے ہیں۔ یہ گڑ گڑ چٹنی بھی پختل والوں کی کراہت ہے۔ ہاں چائے میں کچھ دیر لگی ہے۔ اس میں میرا کمال کیا ہے؟“

”اور وہ“ ورنہ نے لمبندی سانس بکھری۔ ”لڑیں نے کہا، میری بہن سکھائیے میں مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی ہے شاید۔ ویسے پیاری بہنا! یہ ریڈی میڈ چیزیں کھانے کی دینی ہوئی چیزوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتیں۔ خیال رکھنا!“

”میں تو بس اتنا ہی کر سکتی ہوں۔“ وہ گرم گرم پکوڑوں سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔ ”اور اس سے پہلے کہ یہ پلیٹ میں اکیلی ہی صاف کر جاؤں اور آج صبح خود صولی کر لیں!“

”امی کو بھی بلا لو نا۔“ ورنہ نے اسے گھورا۔

”جنا اب! امی بانی امی کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ وہ اور ثانی اماں آج کل ایقان خالہ کے مسئلے پر روزانہ پرزور گفتگو کرتی ہیں۔“

”ہاں!“ ورنہ کے چہرے پر ملال ابھرا ”ایقان خالہ!“

”آئی!“ ناعمہ نے روئے کے پلو سے ہاتھ صاف کیے ”ایک بات کہنی تھی آپ سے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے کروں؟“

”ہاں۔“ ورنہ کو حیرت ہوئی ”تمہارے منہ پھٹ پن سے مجھے یہ امید تو نہیں ہے کہ کوئی بات کہنے میں تم کوئی دن لگاؤ اور وہ بھی مجھ سے؟ مجھ سے تمہارا کیا پردہ ہے؟“ ناعمہ کے چہرے پر کش مکش کے رنگ ابھرے تھے۔

”آئی! فریجہ کافون آیا تھا کچھ دن پہلے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فراز سے فون پر بات کروں۔ میں نے اسے پہلے تو منع کر دیا لیکن اس کے اصرار پر میں نے کہا کہ میں آئی سے پوچھ کر تاؤں گی۔“

ورنہ کے ہاتھ میں پکوڑا تھا جسے وہ منہ میں ڈالنا بھول گئی۔ وہ ناعمہ کو دیکھ گئی۔ جو جھکی جھکی نظروں سے بات کر

راہی تھی۔
 ”پھر بتائیں آئی۔! مجھے کیا اس سے بات کر لینی چاہیے؟ یا پھر امی سے بھی پوچھ لوں؟“
 ”ناعمد! نہ ہولے سے مسکرائی۔“ مجھے امید تو نہیں تھی کہ میری بدھوسی بہن میں اتنی عقل بھی ہو سکتی ہے!
 ”آپ تو ہمیشہ مجھے انڈر اسٹیمٹ کرتی ہیں!“ اس نے شکایتی نظروں سے بہن کی جانب دیکھا ”اب میں اتنی بھی کم عقل نہیں ہوں۔“

”تبی بھی؟“ وردہ کو ہنسی آئی ”سچ کہا تم نے۔۔۔ بس تھوڑی سی کم عقل ہو اور مجھے لگتا ہے کہ یہ خامی بھی دور ہوتی جا رہی ہے۔ خیر جہاں تک فراز سے بات کر لینے کی بات ہے، میرا خیال ہے کہ ایک حد اور تمیز کے اندر رہ کر بات کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں امی سے بھی دس کس کر لوں گی، مجھے نہیں لگتا کہ انہیں کوئی اعتراض ہو گا۔ رافع کے حوالے سے انہوں نے کبھی مجھ پر کوئی معمولی سی پابندی بھی نہیں لگائی۔ اسی لیے مجھے کبھی اس پر رشہ کے خاص ہونے کا اتنا احساس بھی نہیں ہوا اور پھر ان کی فیملی آپھی جھلی ماڈرن ہے۔ جب ہم نے ان سے رشتہ جوڑا ہے تو پھر ہمیں ان باتوں کو بھی بد نظر رکھنا ہو گا۔ اب اگر فریحہ کا قانون آپنے تو ہم بے شک فراز سے بات کر لیتا لیکن اخلاقی تقاضوں کو بد نظر رکھتے ہوئے سمجھ رہی ہوں تا میری بات کو سمجھیں۔“

”جی آئی۔“ ناعمدہ کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اسے وردہ سے یہ ٹاپک ڈسکس کرتے ہوئے جو جھینپ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا عکس اس کے چہرے پر واضح تھا۔
 ”نچلو اب تم مجھے چائے کا کپ دو اور اپنے یہ ریڈی میڈ پکوانے لے کر بھاگو یہاں سے۔۔۔ مجھے بہت سارا کام کرنا ہے۔“

وہ اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ ناعمدہ اس کے لیے چائے بنانے لگی۔ ناعمدہ کے جانے کے بعد وردہ ایک مرتبہ پھر سوچوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ فراز اس نئے رشتے کے حوالے سے ناعمدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کہیں کسی گوشے میں اس احساس کو ڈھونڈنے کی ناکام سعی کی۔ پھر ایک سالس بھر کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا تھا!

رات کا شاید آخری پہر تھا۔ سوئے کی کوشش میں ہر طرح سے ناکام ہو کر شملہ نے بے چینی سے ایک مرتبہ پھر۔۔۔
 گھڑی کی جانب دیکھا تھا۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔ شملہ نے بے قرار ہو کر گرو شبدلی۔
 ”میں عمر کو اپنی کسٹڈی میں لینا چاہتا ہوں قانونی طور پر۔“ اس کے کانوں میں ابرار کے الفاظ گونجے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ بستر سے اتر کر بے قراری سے کمرے میں گھلنے لگی۔
 ”جب تک تم اس کمرے میں نہیں تب تک بات دوسری تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب کہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے!“ شملہ نے بے بسی سے لب کاٹے ابرار کی بات کسی صورت بھی غلط نہ تھی۔ عمر اپنے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی نانی کے گھر رہا تھا۔ وہاں سے بھی دور ہو گیا تھا اور باپ سے بھی۔ ایسی صورت میں اگر واقعی ابرار قانون کے ذریعے اسے حاصل کرنا چاہتا تو اسے پہلی کوشش میں ہی کامیابی مل جاتی۔ یوں بھی شملہ بخوبی جانتی تھی کہ قانونی طور پر عمر ابرار کا ہی تھا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کے حلق میں کانٹے آگے آئے ہوں۔ عمر سے جدا ہونے کا تصور جان لیوا تھا۔ عمر تو اس کے سینے میں دل کی جگہ دھرتا تھا۔ وہ کیسے اسے نظروں سے دور کرنے کے بارے میں سوچ سکتی تھی بھلا؟
 ”میں نے غلطی کی ہے۔“ وہ زیر لب بربرائی ”شادی کر کے میں نے اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ اگر عمر کو لے گیا تو کیا رہے گا میرے پاس؟“ یہ درست تھا کہ وہ شادی کر کے ہاشم کے ساتھ چلی آئی تھی لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس کا عزیز از جان بیٹا چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔ وہ جب چاہے اس سے ملنے کے لیے جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ خود روزانہ ہی چلا آتا تھا، فردوس بیگم کے نامناسب رویے اور غصیلی نگاہوں کی پروا کیے بغیر۔ پھر شروع سے ہی وہ ہنترہ بیگم کے بے حد قریب رہا تھا۔ ماں سے زیادہ اسے نانی کے قرب کی عادت تھی۔ ابرار کے ساتھ جا کر وہ مینٹلی طور پر کس قدر دسترب ہو سکتا تھا، شملہ کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتی۔

”میں نے اپنی تمام دُوریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔“ اسے پھر ابرار کی بات یاد آئی ”یونہی ایک مختلف خانوں میں بنی ہوئی زندگی جیسی رہی ہو یا پھر یہاں آجائے۔ جہاں زندگی مکمل ہے، گھر مکمل ہے، ہر چیز تمہاری ہے، مکمل تصرف کے ساتھ!“

شملہ نے لب بھینچتے ہی ایک تکلیف دہ احساس نے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ وہ اس شخص کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ جب اس نے ساری دنیا کو چھوڑ کر اس کا انتخاب کیا تھا تب یہ مکمل زندگی، مکمل گھر اور مکمل تصرف کہاں تھا؟ تب کیوں اس نے اسے ایک ایسے گھر میں لے جا چھوڑا تھا جہاں کچھ بھی اس کا نہ تھا بلکہ جہاں ابرار کی دعوے دار ایک عورت پہلے سے موجود تھی۔

وہ عورت اب کہاں تھی؟ وہ کجاں آتے؟ وہ کجاں آتے؟ سوال پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسے ایسا کرنا ذہن بندہ دیتا تھا۔ ان سوالات سے وہ کوئی بھی مطلب اخذ کر سکتا تھا۔ شملہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو جاتی اگر اس کے الفاظ کوئی اور معنی اختیار کر لیتے۔ لیکن اب بھی کوئی راستہ بچھا کر دیتا تھا۔ اب بھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ بے بسی کے احساس تلے دب کر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے وہ بستر تک چلی آئی۔

اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے اسے اچانک ہی دوپچ کا ساگ! ہاشم کھلی آنکھوں سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ شملہ نے بے اختیار ہی ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں صاف کرنا چاہی تھیں۔ ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو چھوا اور اپنی انگلیوں سے اس کے آنکھوں کو خشک کیا۔

”شملہ!“ وہ گہمیر آواز میں بولا۔
 ”جی بس۔“ وہ اپنی جگہ چوری بن گئی تھی۔
 ”رات کے اس پہر۔۔۔ یوں اکیلے میں اس طرح رونے کی وجہ جان سکتا ہوں؟“
 ہاشم کے لمبے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے شملہ کے اعصاب کو پتھر کی طرح منجمد کر دیا تھا۔

باقی (شدہ سہ ماہی) ۱۷

ماشر کی اجانگ پاکستان آمد پورے غاندان کو سرور کرتی ہے۔ تاہم ایقان اس کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی ہے۔ منور مہین کی سخت باتیں سنیں کر بیحد گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا خیال ہے کہ گھر میں خسر مقدم کیا جاتا ہے۔ منور، بیگم، ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔ ہاشم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریضہ کا نکاح پڑھوا دیا جاتا ہے جس پر عریضہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

شادی کی اڑبیس رات ابراہیم جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابراہیم سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم، شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

فراز جو درحقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریضہ کے لیے فراز کی آمد پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔ فراز بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔ راقع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ دل کی جھلک نظر آتی ہے جس کا قلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

لڑا، ماشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے۔ ماشر اسے لینے ایرپورٹ جاتا ہے۔ ایقان، ماشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سر دروہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلاسا دے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا، ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ درود کے شور سے ایم اے سوشالوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔

ماشر لڑا سے ملنے ہوٹل آتا ہے تو لڑا اسے پتہ لگتا ہے کہ وہ لڑا کی پیش کش رد کر رہا ہے۔ تاہم لڑا کا رد مال، ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ ماشر سے جھگڑت پونہتی ہے۔ ماشر لو کھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً صدمے سے گنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ درود سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے بتا جاتا ہے کہ درود کی سنگی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے ہلکا سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ درود کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

ایقان، ماشر کا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اٹھکے آجاتی ہے اور ماشر کی تمام تر تعلیم دہائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے تعلق کر لیتی ہے۔ وہ ماشر کی بے وفائی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یہ صورت حال گھر کے تمام افراد کے لیے بے حد پریشان کن ہے۔ ماشر چاپان جاتے ہوئے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

۲۸

رکھائی شہلا کی قید میں

”شہلا گھبرا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ بظاہر سویا ہوا محسوس ہوتا ہاشم نہ صرف جاگ رہا ہو گا بلکہ اس کی بے چینی اور بے قراری کا عینی شاہد بھی ہو گا۔ شہلا کو یوں لگا جیسے ہاشم کی آنکھوں میں اس کے سوال سے بڑھ کر بے اعتباری تھی۔ ہاشم نہایت آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ تکیے سے ٹیک لگا کر اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیے تھے اور اب سوالیہ نظروں سے شہلا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ خوب صورت ٹائٹ لیمپ کی مدد ہم درودھیار روشنی میں شہلا ان آنکھوں کو بخوبی پڑھ سکتی تھی۔ اس نے غیر شعوری طور پر اپنے گالوں پر آئے آنسو کو ایک بار پھر صاف کرنا چاہا۔ ہاشم پورے حواسوں کے ساتھ اس کی جانب متوجہ تھا۔

”شہلا!“ اس نے بے حد دھیمی آواز میں پکارا۔ ”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ شہلا سے کوئی جواب بن پڑا نہ ہی نظریں اٹھائی گئیں۔

”کیا ان آنسوؤں کی آمد میں میری کسی کوتاہی کا عمل دخل ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ اب کی بار وہ بے اختیار ہی بولی تھی۔ ”ایسا ہرگز نہ سوچیں ہاشم! آپ سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی یہ تو بس یونہی میں کچھ ڈپریشن تھی!“

”وہی تو پوچھ رہا ہوں وجہ ڈپریشن؟“ اس نے سر ہانے رکھے ٹائم پیس کی جانب دیکھا۔
”آخر ایسی کون سی بات ہے جو رات کے اس پہر تمہیں یوں رلا رہی ہے۔ یہ وقت تو اللہ والوں کا ہوتا ہے پھر دل والوں کا۔“

شہلا نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔
”نہیں۔۔۔ سچی نہیں؟“

ہاشم کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔
”جیسے میں نہیں سمجھا۔ میرے سوال کا جواب ابھی تک ادھار ہے۔“ شہلا بے طرح جزبہ ہوئی۔

”ہاشم! میں شاید عمر کو مس کر رہی تھی۔ مجھے یونہی رونا آگیا ہے وجہ بے اختیار۔ آپ پلینز پریشان نہ ہوں۔“

”عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس نے جیسے خود کلامی کی۔ ”عمر کو تو ہم نے رات بارہ بجے گھر ڈراپ کیا ہے۔ کتنے دیر تک ہم نے ساتھ وقت گزارا ہے اور تم عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر وہاں سے غائب ہو جائے۔

”پلینز ہاشم! وہ لیٹ گئی۔“ میں سوتا چاہتی ہوں بہت دور ہو گئی ہے۔“

اس نے آنکھوں پر یوں بازو رکھا جیسے اب مزید گفتگو کے لیے کچھ بچانہ ہو۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نیند تو اب بہت دیر کے لیے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے ہاشم کی سائیڈ ٹیبل کی درواز کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر اس نے ہاشم کو اپنی طرف سے اٹھ کر جاتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ گیلری کا دروازہ کھول رہا تھا۔

شہلا سمجھ گئی تھی۔ جب کبھی اسے سگریٹ کی طلب ہوتی تھی تو وہ گیلری میں چلا جاتا تھا۔ رات کے اس پہر اسے سگریٹ کی طلب کیوں ہوتی تھی؟ شہلا کا دل معمول سے ہلکا کر دینے لگا۔ شہلا کی حرکت سے نجانے اس نے اپنے طور پر کیا اخذ کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا کہ وہ جا کر اس سے صاف تصانیف پوچھ لے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی رہی۔ گیلری میں کھڑا ہاشم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

باہر گاڑی کا ہارن بجتے ہی وہ تینوں پر جوش انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ عمر سب سے پہلے شور مچاتا ہوا باہر کی جانب دوڑ گیا۔

”ماموں آگئے۔۔۔ ماموں آگئے۔“

ربیعہ ”انیقہ اور منیہ بیگم بھی لاؤنچ کا دروازہ کھول کر بیڑھیوں تک آگئی تھیں۔ فراز اور عباد لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر آ رہے تھے۔ عمر کو دیکھ کر عباد نے اپنا پیچی کیس نیچے رکھ دیا اور اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”بھئی۔۔۔ بھانجا تو ماشاء اللہ شیریں گیا ہے!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”اب تو جم کر ریلنگ ہوگی۔“

”ہراووں گا۔“ اس نے مکالمہ کیا۔

”مائی ہلز جانو۔!“ عباد نے قہقہہ لگایا۔

پھر عمر کو تار کر وہ ان تینوں کی جانب بڑھا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔“ وہاں سے لپٹ گیا۔

”عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس نے جیسے خود کلامی کی۔ ”عمر کو تو ہم نے رات بارہ بجے گھر ڈراپ کیا ہے۔ کتنے دیر تک ہم نے ساتھ وقت گزارا ہے اور تم عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر وہاں سے غائب ہو جائے۔

”پلینز ہاشم! وہ لیٹ گئی۔“ میں سوتا چاہتی ہوں بہت دور ہو گئی ہے۔“

اس نے آنکھوں پر یوں بازو رکھا جیسے اب مزید گفتگو کے لیے کچھ بچانہ ہو۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نیند تو اب بہت دیر کے لیے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے ہاشم کی سائیڈ ٹیبل کی درواز کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر اس نے ہاشم کو اپنی طرف سے اٹھ کر جاتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ گیلری کا دروازہ کھول رہا تھا۔

شہلا سمجھ گئی تھی۔ جب کبھی اسے سگریٹ کی طلب ہوتی تھی تو وہ گیلری میں چلا جاتا تھا۔ رات کے اس پہر اسے سگریٹ کی طلب کیوں ہوتی تھی؟ شہلا کا دل معمول سے ہلکا کر دینے لگا۔ شہلا کی حرکت سے نجانے اس نے اپنے طور پر کیا اخذ کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا کہ وہ جا کر اس سے صاف تصانیف پوچھ لے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی رہی۔ گیلری میں کھڑا ہاشم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

اللہ تمہیں ہر طرح سے کامیاب کرے بیٹے! وہ کچھ متفکر نہیں۔
 میں بینک سے کافی بڑی رقم بھی نکلاؤں گا امی! ان کی پلکوں پر نمی چمکنے لگی۔ ”تم جانتے ہو۔۔۔“
 میرے بچے سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ عباد نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بس اب کہیں نہیں جانے دوں گی۔ یاد رکھنا! بہت پردھانیاں ہو گئیں۔ اب ماں کے ساتھ رہو۔ نجاب زندگی میں اب کتنی سانسوں کی مہلت باقی بچی ہے!“
 ”امی۔۔۔“ وہ سیدھا ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”ایسی باتیں کریں گی تو میں سچ مچ کہیں دو دروازے کے ملک میں مشکل سے کورس کے لیے ایڈمیشن لے لوں گا۔ خدا نخواستہ آپ کو کیوں کچھ ہونے لگا۔ ابھی تو ہم نے بہت خوشیاں ساتھ مل کر دیکھنا ہیں۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔“ وہ کچھ مطمئن سمجھ آزرہ سی ہو کر بولی تھیں۔
 ”سب سے پہلے انیقہ اور ربیعہ کے لیے رشتے دیکھنے ہیں تاکہ ان کی پردھائی مکمل ہوتے ہی ان کے فرض سے سبکدوش ہوا جاسکے۔“
 ”بے فکر رہو۔۔۔“ انہوں نے اس کا کان کھینچا۔ ”وہ کہتی ہیں کہ اب تمہارے لیے اچھی سی لڑکی ڈھونڈنا ہے۔ تمہا شاء اللہ پردھائی سے بھی فارغ ہو چکے ہو۔ اور عباد اچ پوچھو تو میری اپنی خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد تمہارے سر پر سہرا سجا ہوا دیکھوں۔“

”اوہو امی!“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئیں ابھی تو میری ڈھیر ساری پلاننگز ہیں جن پر مجھے عمل کرنا ہے۔ پردھائی سے فارغ ہوتے ہی سر پر سہرا باندھنے کا مجھے بالکل شوق نہیں ابھی تو میدانِ عمل میں قدم رکھنا بھی ہے اور جمانا بھی۔“
 ”تمہارے ابو اتنی زمین چھوڑ گئے ہیں تمہارے لیے۔“ وہ خفا ہو کر بولی۔ ”تمہیں ابھی سے یہ فکر کیا کرنے کی ضرورت؟ اچھا بھلا گزارا ہو رہا ہے ہمارا۔“

”اوہ میری بھولی ماں۔۔۔!“ اس نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ ”یہ دو باب دادا کی جاگیر پر عیش کرنے والا نہیں ہے یہاں اپنا زور بازو دکھانا پڑتا ہے تب انسان کی لگائی پیلو بنتی ہے۔“
 ”ہاں چاند پر کتہ ڈالو گے۔۔۔“
 ”کوشش تو ضرور کریں گے۔“ وہ ہنسا پھر قدرے سنجیدگی سے بولا ”امی! میری ہلاکت پچھلے دنوں امیر حسن سے ہوئی ہے۔“

”امیر حسن؟“ وہ تعجب سے بولیں۔ ”یہ کون ہے؟“
 ”ہے تو میرا ہم عمر۔۔۔ لیکن پردھائی اور تجربے میں مجھ سے کہیں آگے ہے۔ اس کا بزنس لندن میں ہے اب اسے وسعت دینے کے لیے وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ وہاں لندن میں اس کے کاروباری پارٹنرز بزنس سنبھال رہے ہیں بہت بڑے پیمانے کا کام ہے جس کے لیے اسے یہاں بھی پارٹنرز کی ضرورت ہے جو پیسہ بھی لگائیں اور کام میں بھی مدد دیں میں نے امیر حسن کے ساتھ بزنس شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چند ایک روز میں ہم پرد جیکٹ سائن کر لیں گے اس کے بعد کچھ عرصے تک لندن رات کی مصروفیت ہوگی۔“

”عباد۔۔۔!“ وہ کچھ پریشان ہوئیں۔ ”تم نے سب کچھ دیکھ بھال لیا ہے؟“
 ”آپ بے فکر رہیں۔۔۔ ہاں لیکن ہر نماز کے بعد کامیابی کے لیے دعا کرتا نہ بھولیں۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے آپ کی دعا اور اپنی محنت کی قبولیت کا پورا یقین ہے۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ کتنی ہی دیر سے وہ عجب کش کش کا شکار تھا۔ مشکل تھی کہ سنبھلتی ہی نہ تھی۔ حل تھا کہ نکلنا ہی نہ تھا۔ دل کسی طور ایک بات پر راضی نہ ہوتا تھا! وہ لا بھری سے کتابیں ایشو کروا کر لایا تھا۔ دماغ کہتا تھا کہ یہ کتابیں وہ دورہ کے حوالے کر دے۔ دورہ اس کی

دوست تھی وہ اسے کتابیں پہنچا دیتی لیکن دل! دل کہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، بھول بھال کر اسے کتابیں پہنچانے چل دے۔ آنکھیں ایک مرتبہ اس کے دیدار سے سیراب ہو جائیں پھر جو ہو سو ہو۔
”تم واقعی اچھی لڑکی ہو
یا مجھ کو اچھی لگتی ہو!“

اس نے آنکھیں موند کر سوچا تھا۔ پردہ ذہن پر لمحے کے ہزاروں حصے میں وہی موہنی صورت مسکرانے لگی تھی۔ رافع بے بسی سے آنکھیں کھول کر پیشانی پر ہلکے ہلکے مکے مارنے لگا، اسے ہاشم یاد آنے لگا تھا۔ کتنا مذاق اڑا کرتا تھا وہ اس کے جذلوں کا، اس کی محبت کا، اس کی بے بسی کا۔ آج وہ خود اسی مقام پر کھڑا تھا اور اس کے اپنے جملوں کی بازگشت اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

”یار شاعر!“ اسے ہاشم کا انداز مخاطب یاد آیا۔ اس کے لبوں پر اداسی بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یار! بندر کا جانے اور ک کا مزہ!“

”چلو ہم بندر ہی سہی!“ وہ مزے سے کہا کرتا۔

”تو گویا عشق نے انسان بنا دیا!“ اس نے سوچا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔
”عشق؟“ کسی نے چپکے سے سرگوشی کی تھی۔ ”عشق کرنے لگے ہو؟ واقعی؟“ رافع گھبرا سا گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے چوری پکڑ لیے جانے کا ڈر ہو۔
”ہاں۔۔۔ شاید!“ پھر اس نے بھی دل میں چپکے سے کہا تھا۔
”انجام جانتے ہو؟“

”آغاز پر انجام کب سوچا جاتا ہے۔۔۔“ دل ضدی ہوا۔

”جو عقل کہتے ہیں وہ سوچ کر جلتے ہیں۔“
”عشق اور عقل؟“ اس نے پوچھا۔ ”دل استہزائیہ ہنسنا۔“ عشق کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر تو عقل کا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا ہے!“

”اچھا!“ کوئی اور بھی ہنسا۔ ”عشق تو جرات و بے خودی سے معمور ہوتا ہے۔۔۔ جرات ہے تو اٹھاؤ کتابیں اور چل بڑو اس کے گھر کی راہ پر۔۔۔“
”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ بے کل ہوا۔۔۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ دوسری جانب سے زبردست قہقہہ پڑا۔

رافع نے بے بسی سے اپنی پیشانی میز پر ٹکادی تھی۔



رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ ربیعہ نے ایک نگاہ اپنے برابر سوئے ہوئے عمر پر ڈالی پھر اس نے فرط محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

انیقہ کے امتحان ہو رہے تھے سو اس نے اسٹڈی روم کو ہی اپنا بیڈ روم بھی بنالیا تھا۔ ربیعہ عمر کے ساتھ سو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج نجانے کیوں غیند آنکھوں سے روٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑکی تک چلی آئی۔ پردہ ہٹا کر اس نے سلائیڈنگ ڈور کھول دیا اور باہر دیکھنے لگی۔ لان میں رات کی رانی کا مکمل راج تھا۔ ربیعہ نے گہری سانس بھری تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈھیر سی خوشبو اس کے اندر اتر گئی۔

”ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کل کے دور میں نایاب ہے۔ اگر تم راضی ہو تو کیوں نہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے ساتھ رکھ لیں۔“

اس کے کانوں میں منیوہ بیگم کی آواز کی بازگشت لہرائی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بے کل ہوئی تھی۔ پھر عباد کی بات یاد آنے لگیں تو اس نے سکون کا سانس بھرا۔

”سچ تو یہ تھا کہ یہ گھرا سے بھی بے حد پسند تھا۔ یہاں کے مکیوں کے لیے اس کے دل میں بے حد فطری اور بے حد سچی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی تھی لیکن جس حوالے سے منیوہ بیگم نے یہ بات سنا لی تھی ربیعہ کے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔ عباد نے ٹھیک کہا تھا۔ ربیعہ کے لیے اب اپنے پرانے حقیقی حقیقی کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے عباد بھائی تھا صرف بھائی۔ منیوہ بیگم ماں تھیں اور انہما اور شہلا بہن۔ اسی گھر میں رہتے ہوئے ان رشتوں کے بدلنے کا خیال قطعاً ناقابل قبول تھا۔ لیکن طمانیت کی بات یہ تھی خود عباد بھی اس کا ہم خیال تھا۔ ربیعہ وہیں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا۔

”کیا اس کی بے کلی بے قراری کی وجہ محض یہی تھی؟“

اس سے پرے اس سے سوا بھی کچھ تھا جس نے اس کی آنکھوں سے نیوٹرو کو دور کیا ہوا تھا۔ کیا تھا وہ؟ ربیعہ انگلیاں چٹانے لگی۔ عجب مشکل میں دل آن پہنسا تھا۔ آخر کیا تھا؟ میں جو اسے یوں بے چین کر گیا تھا؟ کیوں ناچاہتے ہوئے بھی اس کے متعلق سوچتی تھی؟ وہ کیوں اپنے دیکھنے کی متمنی رہتی تھی۔ ان مسکراتی آنکھوں کے سر کو کیا نام دیا جاسکتا تھا؟

دوبار سے لگ کر کھڑے کھڑے اس نے خود سے لاتعداد سوالات کر ڈالے تھے جن میں سے کسی کا بھی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

”کیا تم اس سے محبت کرنے لگی ہو؟“ اچانک ہی ایک سوال اس کے اندر سے اُبھرا تھا۔

ربیعہ اس سوال سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس جواب سے تو وہ سجانے کب سے نظریں چرا رہی تھی۔

”شاید ہاں۔“ اس نے سوچنا چاہا۔

تب ہی ایک معصوم مسکراتی صورت اسے یاد آئی۔ وہ روز کا چہرہ تھا۔ پر خلوص اور سچی وردہ کا۔

”نہیں۔“ اس نے بے چین ہو کر کہا ”نہیں بالکل نہیں۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی مجھے نہیں پتا وہ کون ہے۔“

اس نے سلائیڈنگ ڈور بند کیا اور ایک ٹینک سے پردہ برابر کر دیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بستر تک آئی تھی۔

تیکے کے سہارے نیم دراز ہو کر اس نے آنکھیں موندیں۔ تب اسے احساس ہوا اس کے اندر کوئی چپکے چپکے اس پر ہنس رہا تھا۔ ربیعہ نے بے بسی سے اپنا سر ہینڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔

”ناعمہ۔۔۔ ناعمہ!“ رابعہ بیگم اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ وہ کپڑے استری کر رہی تھی۔ یونہی اٹھ کر باہر چلی آئی۔

”جی امی!“ اس نے وردہ کے کی جو کھٹ سے ہی پوچھا تھا۔

”تمہارا فون ہے۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔ ”بات کر لو۔“

”کس کا ہے؟“ وہ فون کی جانب بڑھنے لگی۔

”فریحہ کا!“

ناعمہ کے قدم ایک لخت ہی سست پڑے چہرے پر پریشانی سی نمایاں ہوئی۔ اس نے تنکھوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

وہ جانتی تھی فون فریحہ کا ہی تھا لیکن فریحہ کے ساتھ کون موجود تھا اسے اس بات کی بھی خبر تھی۔ پر چند کہ وردہ اسے اجازت دے چکی تھی بلکہ شاید اس نے اب تک رابعہ بیگم سے بھی یہ بات نہ مکس کر لی تھی لیکن پھر بھی ایک حجاب تھا جسے اٹھانا ناعمہ کے لیے بے حد مشکل امر تھا۔

”ہیلو!“ اس نے ریسور اٹھا کر حتی الامکان آہستہ آواز میں کہا۔

”ہائے!“ دوسری جانب سے فریحہ کی شوخ کھٹکتی ہوئی آواز آئی ”کیا ہو رہا ہے جناب؟“

”کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی۔“

”وہ جلدی سے بولی۔“ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے آپ سنا نہیں کیسی ہیں؟“

”نہیں نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہ ہم عمر مند بھانج ہیں آپ جناب نہیں چلنے والا۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”میری اور تمہاری تو بہنیں۔“ یہ ہم عمر مند بھانج ہیں آپ جناب نہیں چلنے والا۔ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”میری اور تمہاری تو خوب لڑائیاں ہوا کریں گی۔ میں بہت لڑا کا طبیعت کی ہوں۔ خیال رکھنا۔“

ناعمہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”مجھے ہونے اے عصاب قدرے ڈھیلے پڑے تھے شاید فریحہ نے ہی گس شب لگانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ غلط سمجھ بیٹھی تھی۔“

”تو تو نہیں بھی نہیں ہوں۔“ وہ اپنی جون میں آئی۔ ”مقابلہ تو پھر کانٹے کا ہی ہو گا!“ فریحہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

”اچھا۔۔۔ بھائی سے خوب شکایتیں لگایا کرو گی میری؟“ ناعمہ جھینپ سی گئی۔

”نہیں خیر لگائی بھائی کی عادت تو نہیں ہے مجھے۔“ وہ تو وردہ آپلی ہی مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ انہوں نے ہی کہا ہو گا تم سے۔“

”لو بہنیں۔“ چور کی داڑھی میں خنک۔ ”ایک اور قہقہہ لگا“ اچھا خیر ہمارا نام تو پورا ہوا۔ یہ بھائی مجھے خوب خوب گھور رہے ہیں اور اب تو انہوں نے تار کھینچنی شروع کر دی ہے۔ تم اب ان سے صفائیاں پیش کر دے میں تو چلی!“

ناعمہ کو اچانک ہی پرگوں میں خون خشک ہونے کا احساس ہوا اسے لگا اس کی آواز بیٹھ گئی ہے۔

”دوسری جانب سے قدرے سنجیدہ لیکن خب ضرورت مردانہ آواز ابھری تھی۔ ناعمہ خاموش رہی۔ اس نے کن اکھیوں سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ماں کی جانب دیکھا تھا جو کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ یہ نہیں وہ اس کی جانب متوجہ تھیں یا نہیں۔

”ہیلو!“ دوسری جانب سے پھر کہا گیا۔

”جی۔“ وہ کسی مجرم کی طرح مری مری آواز میں بولی تھی۔

”یہ میری آوازیں کر سناں کیوں سو گئے کیا ہے تمہیں؟ آواز پہچانی نہیں یا پھر آواز پہچان کر یہ حال ہوا ہے؟“

نہایت سنجیدہ اور قدرے سخت انداز میں کہا گیا تھا۔ ناعمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”جی۔“ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیسی بات؟ کھل کر بتاؤ۔ آواز پہچانی ہے یا نہیں پہچانی؟“ فراز قدرے طنز سے بولا۔

”آواز میں بھلا کیسے۔“ اسے پھر قریب بیٹھی ماں کا خیال آیا۔

”ہوں!“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”زیادہ لوگوں سے باتیں کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ آوازیں آپس میں گڈھ ہو

جاتی ہیں۔ یہ سچ کہوں تو مجھ سے بھی تمہاری آواز نہیں پہچانی جا رہی ہے۔ تمہارے انداز بڑے بدلے بدلے ہیں۔ تم کیا ٹکٹ قیل کر رہی ہو؟

”جی؟“ اب کی بار وہ حقیقتاً پریشان ہوئی۔ ”میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ فراز دھیرے سے ہنسا تھا۔

”بہت خوب۔۔۔ بانی راوے یہ نیا نمبر کیوں لیا گیا ہے؟ وہ پچھلا نمبر اب کس کے پاس ہے؟“

”پچھلا نمبر؟“ وہ گم صم سی ہوئی۔ ”آپ؟ آپ؟“

”ناعمہ! رابعہ بیگم اچانک ہی زور سے بولی تھیں۔

”جی امی جی! وہ پہلے ہی ہراساں تھی۔ زور سے ریسیور زلہ کر پٹی۔

”کیا جل رہا ہے؟ تم استری کھلی چھوڑ آئی ہو؟“

ناعمہ تیزی سے اندر کی سمت دوڑی تھی۔ رابعہ بیگم بھی اس کے پیچھے آئیں۔ کچن سے نکل کر دروازہ بھی آگئی تھی۔ ناعمہ نے واقعی استری بند کیے بغیر اپنی نئی قمیص پر چھوڑی ہوئی تھی۔ قمیص جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

وردہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر مٹن بند کیا اور استری اٹھا کر جگہ پر رکھی۔ ناعمہ صدمے سے اپنی قمیص کا حشر دیکھ رہی تھی۔

”یہ لڑکی اپنے حواسوں میں کبھی ہوتی ہے؟ نجانے دھیان کیا ہے؟“

رابعہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ناعمہ ان کا مطلب سمجھ کر خفت سے سرخ ہو گئی تھی۔ وردہ نے اس کی صورت دیکھی۔ اسے بے اختیار ہی اس پر تڑپ آگیا۔

”چلو کوئی بات نہیں یہ کپڑا تو بہت ہے مارکیٹ میں، تمہیں کل ہی نئی قمیص کا کپڑا لا دوں گی۔“

”ہوں؟“ اس نے چونک کر بہن کو دیکھا۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

وردہ نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ اس نے سرسری سا پوچھا۔ ”فریحی؟“

”جی۔۔۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

وردہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ناعمہ اسی پوزیشن میں کھڑی اپنی جلی ہوئی قمیص کو گھورتی رہی۔

دل قدموں کو اور قدم اسے یہاں تک لے تو آئے تھے لیکن بیل بجا کر اب وہ خفت کا شکار تھا۔ نجانے کیوں اس کے جی میں پلٹ جانے کا خیال آیا۔ تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر عبادا باہر آیا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے ٹیٹ کے اوپر سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ کا تبادلہ کیا تھا۔

”رافع بھائی! عباد نے پر جوش انداز میں باتیں مالدیا۔ ”آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”یہ تو تم سناؤ!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”کبھی ملتے ہی نہیں۔۔۔ چھٹیوں میں آکر بھی چپ چاپ سے نکل جاتے ہو۔“

”بس آپ کی شکایتیں ختم“ وہ ہنسا۔ ”اب مستقل طور پر یہیں ڈیرہ جمالیا ہے ہم نے۔ اب خوب محفلیں جما کریں گی اور ہم آپ کی غزلیں سنا کریں گے۔“ رافع دھیرے سے ہنسا تھا۔

”آئیں نا اند۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں!“

رافع نے ایک نگاہ سفید سنگ مرمر سے مزین دیواروں پر ڈالی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری۔

”نہیں یا۔۔۔ بس چلوں گا میں۔ یہ کتابیں ربیعہ کو دینا تھیں، یہ پلیز اسے پہنچا دینا۔“

”اچھا! عباد نے کتابیں لے کر ان کے نام دیکھے۔ ”لا بھری سے لائے ہیں؟“

”ہاں نسہ ربیعہ اور وردہ نے نوٹس وغیرہ بنا دیے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن چاہئے پے بغیر تو آپ جانتیں سکتے۔۔۔ کچھ تو ہمارے جذبہ میزبانی کا خیال کیجیے۔“

”پھر سہی۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”اچھا۔۔۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ ہمارا دل توڑ کر خوش ہوتے ہیں تو یونہی سہی!“ عباد اٹھانٹکی سے بولا

تھا۔

”میں پھر آؤں گا عباد ابھی زرا ضروری کام سے جا رہا تھا۔“

”اوپر کے رافع بھائی۔!“ عباد نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”نافع سے کہیے گا مجھ سے ملے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اسے ایک نظر دیکھ لینے کا خیال کس قدر فرحت بخش تھا۔ رافع نے اس خیال کو کس مشکل سے مات دی تھی۔ وہی جانتا تھا دل اس ہو گیا تھا پوچھ آؤر وہ ہوئی تھی لیکن وہ جانتا تھا یہی ٹھیک تھا۔

گاڑی اسکول کے سامنے رکتے ہی وہ گیٹ سے بھاگا بھاگا چلا آیا تھا۔ شہلانے جھک کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آ بیٹھا۔

”اسلام علیکم مہما۔۔۔“ اس نے جھجک کر اس کے کان چومے ”ہاؤ آریو؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”مما کو تنگ کرنے لگے ہونا۔۔۔“ اس نے گاڑی سے اتر کر بڑھائی۔

”نہیں ممما۔!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”بس رافع میرا موڈ ہو رہا تھا کہ آپ مجھے پک کریں۔ اسی لیے آپ کو فون کیا۔۔۔ آپ تنگ ہوئیں؟“

شہلانے ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے سچ تو خیر میری ٹانگ تنگ بھی کی ہیں لیکن روز روز یہ نہیں چلے گا۔ سمجھے؟“

”جی۔۔۔“ اس نے سمجھ داری سے سر ہلایا۔

پھر وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگا تھا۔

”پر دھالی کیسی جا رہی ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”فرسٹ کلاس منتھلی ٹیسٹ میں میری رپورٹ سب سے اچھی ہے۔“

”نزد دست۔۔۔“ شہلانے خوش ہو کر اس کے بال سلوائے ”اب آئندہ بھی یہی کارکردگی ہونی چاہیے۔“

”جی ممما۔۔۔ ممما!“ اس نے اچانک ہی پکارا۔ ”اس روڈ پر اگر ٹرن کریں نا تو آگے جا کر ایک اور روڈ ہے۔ وہاں میرا گھر ہے۔“

شہلانے متعجب ہو کر اس رستے کی جانب دیکھا جو شہر کے پوش ایریا کی طرف جاتا تھا۔

”کس کا گھر ہے؟“

”میرا! وہ مزے سے بولا۔

”تمہارا؟ وہ کیسے؟“

”میرے پیہا نے بنوایا ہے میرے لیے۔“

شہلا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”پیہا تمہیں یہاں لائے تھے؟ اس گھر میں؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”جی ہاں! بہت شاندار گھر ہے۔ پایا بولے یہ تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے بنوایا ہے۔ میں نے کہا کہ میں

اتنے بڑے گھر میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ تو وہ بولے۔۔۔“ اچانک وہ زبان دانتوں میں دبا کر خاموش ہو گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ وہ قدرے خالی الذہنی سے بولی۔ ”کیا بولے؟“

”وہ بولے۔۔۔ تمہاری ماما کو بھی اس گھر میں لے کر آئیں گے۔“

شہلا خالی خالی نظروں سے سامنے سرک کو دیکھتی رہی۔ قریب گزرتی گاڑی نے زور سے ہارن دیا تب وہ چونکی

تھی۔ اس نے عمر کی جانب دیکھا جو اب مزے سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

”ماما! کچھ دیر بعد وہ پھر بولا تھا۔

”ہوں۔۔۔ بولو۔“ وہ دمھم آواز میں بولی۔

”بچوں کا گھر کون سا ہوتا ہے؟ ان کے پیہا کا یا ان کی ماما کا یا پھر ان کی نانو کا؟“

شہلا خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔ اس کے معصوم بیٹے کے لیے واقعی یہ ایک بڑا سوالیہ

نشان تھا کیونکہ ہر بچے کی طرح اس کے ماں باپ کا گھر ایک نہیں تھا۔ ان دونوں کے گھر علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے۔

اس پر ستم یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک تیسرے گھر میں رہتا تھا جو کہ اس کی

ثانی کا تھا۔

UrduPhoto.com

”بیٹا میں ناممنا! اس نے اصرار کیا۔

شہلا نے ایک گہری سانس بھر کر پلکیں جھپکیں اور نمی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”بچوں کے تو سارے ہی گھر ہوتے ہیں بیٹے! پیہا، ماما، نانو سب ہی پیار کرتے ہیں بچوں سے۔۔۔“

”لیکن پیہا کہتے ہیں کہ نانو کے گھر رہنا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں پیہا کا گھر ہی بچوں کا اصل گھر

ہوتا ہے۔“

شہلا کے اندر ملال اترنے لگے۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”ماما! میں اب اپنے پیہا کے ساتھ رہوں گا۔۔۔ ان کے گھر میں۔“ وہ اچانک ہی منہم انداز میں بولا۔

شہلا کی گرفت اسٹیرنگ پر کمزور پڑنے لگی۔

”کس نے کہا تم سے؟“

”پیہا نے کہا ہے۔۔۔ لیکن مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی ہے۔ میں نانو سے ملنے جاؤں گا روز، لیکن رہوں گا

اپنے پیہا کے ساتھ ٹھیک ہے نا ماما!۔“

شہلا نے مضطرب سی ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا۔

”اور اگر آپ ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو آپ بھی آجائیں۔۔۔“ پھر وہ آہستگی سے بولا۔

”ہا شتم انگل بہت اچھے ہیں ماما! وہ آپ کو ضرور پریشاں دے دیں گے۔“

شہلا کی اب سمجھ میں آیا تھا کہ عمر آج اس سے ضد کیوں کر رہا تھا کہ وہی اسے اسکول سے واپسی پر لینے آئے۔

اس نے بے حد صراحت سے ابرار کا پیغام اس تک پہنچا دیا تھا۔ یہ بات ابرار کی زبان سے سن کر وہ جھلا جاتی تھی

لیکن آج عمر کے ہونٹوں سے یہی سب کچھ سن کر اس کا ذہن جیسے دور کہیں خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس نے اپنی کیفیت پر قابو نہ پایا تو وہ ضرور گاڑی کہیں مار بیٹھے گی۔ سر جھٹک کر اس نے سڑک پر نگاہ جمائی اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

رات کے کھانے پر وہ نے حد خاموش خاموش سی تھی۔ ورنہ نے کئی مرتبہ اس کی کیفیت نوٹ کی لیکن رات کی موجودگی میں اس نے کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا۔ ناعمہ نے بمشکل چند لمحے لیے بھر وہ کھانا چھوڑ کر انڈیا کھڑی ہوئی تھی۔

ورنہ جب ٹیبل صاف کر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چائے کا کپ لیے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ ورنہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

ناعمہ!۔۔۔

”جی ہاں۔۔۔“ وہ چونک گئی۔

”کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ مجھے تم کچھ پریشان معلوم ہوتی ہو۔“

”نہیں آپ! ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ تو مجھے ویسے ہی بھوک نہیں تھی شام کو فروٹ چاٹ کھائی تھی نا۔۔۔“

”اچھا! آس نے غور سے اسے دیکھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے فراز کا فون آنے سے تم کچھ ڈسٹرب ہو گئی ہو۔“

”فراز کا؟“ ناعمہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ فون۔۔۔“

”خیر۔۔۔ تمہاری طرح بدھو تو ہوں نہیں میں۔۔۔ وہ آگے آگے لوگوں کا بہترین نمونہ ہے۔۔۔“

”سے ان کا استعمال بھی کرنا آتا ہے مجھے۔“

ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”لیکن میں اتنی بدھو کیوں ہوں آپ!؟“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔ ”مجھے تو کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔“

”مثلاً کیا؟“

”پتا نہیں۔۔۔ یہ فراز کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں پڑی۔ عجیب اشاروں اشاروں میں باتیں کر رہا تھا۔ مجھے تو ایسے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ یہ آپ لوگوں کے پیچھے میرا رشتہ کہاں طے کر دیا ہے۔“

ورنہ اس کی بات سن کر پریشان سی ہو گئی۔

”کیسی عجیب باتیں؟ کیا کہہ رہا تھا؟“

”مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ پھر کہنے لگا تم شاید گلٹ فیل کر رہی ہو۔۔۔ بھلا میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب؟ جب میں پہلی مرتبہ اس کی آواز سنوں گی تو پہچانوں گی کیسے اور مجھے گلٹ کیوں ہونے لگا میں نے کون سا جرم کیا ہے؟“

”فون پر نہ سہی عام زندگی میں تو تم نے اس کی آواز سنی ہوگی نا؟“

ناعمہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بھائی کی شادی میں اس نے دو ایک مرتبہ مجھے مخاطب کیا تھا۔ لیکن تب بھی اس کا رویہ عجیب سا ہی تھا۔ اور وہاں!“

اسے یکدم ہی یاد آیا۔

”ایک مرتبہ وہ ہمیں شائینگ سینٹر میں بھی ملا تھا۔۔۔ میں سی ڈیزو دیکھ رہی تھی اور وہاں آگیا تھا جی آپ! تب تو میں اسے کوئی پائل بھی بھیجی تھی اس کا رویہ بالکل بھی نارمل نہیں تھا!“

ورنہ کے چہرے پر اب اس کی پریشانی کھل کر ظاہر ہو چکی تھی۔ ناعمہ نے اس کا چہرہ دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گئی۔

”ہائے آپ!۔۔۔ اب کیا ہو گا۔ آپ لوگوں نے ایک پائل سے میری منتہی کر دی ہے۔ میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔“

”اچھا جب کرو۔۔۔“ ورنہ نے اس کی بلند دہائی پر اسے جھڑکا۔ ”امی کو ہرگز یہ فضول باتیں پتہ نہ چلیں ان کا بلڈ پریشر فوراً ہائی ہو جائے گا۔ مجھے تو تمہاری بات کا زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ میں بھی اس سے ملی ہوں میں نے بھی اس سے بات چیت کی ہے۔ مجھے تو وہ ہر طرح سے ایک معقول بندہ لگا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عباد کا دوست ہے۔“

ورنہ نے اس کی بات کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ آنکھیں بند کر کے یہ رشتہ کرنے کا مشورہ نہ دیتے۔ میں منیرہ آئی کی طبیعت سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔“

”اور میری بات پر آپ کو یقین نہیں؟“ وہ آزدگی سے بولی۔

”نہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔“ ورنہ نے سمجھانا چاہا۔

”مثلاً کیا؟“

”چل جائے گا پتہ تم خود کو پریشان مت کرو۔“

وہ اسے تسلی دے کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

عذرا بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو شفیقہ حیات کو گری سوچ میں گم پایا۔ ان کے چہرے پر از حد رنج و غم کے آثار تھے۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھیں۔

”کیا بات ہے اماں بیگم۔۔۔ ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔“

انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر سوچی جھانک کر دیکھا۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں۔۔۔ ایتنا وقت قدم کے فاصلے پر ہو کر بھی شکل نہیں دکھائی۔ پہلے گھر دور تھا تو ہر دو سرے دن بیا کرتی تھیں اور اب۔۔۔“

عذرا بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں۔

”دراصل وہ ہماری نصیحتوں سے چڑنے لگی ہے۔ یا تو آپ کوئی بات چھیڑ کر بیٹھ جاتی ہیں یا میں۔۔۔ کچھ عرصے تک اس موضوع پر بالکل بات نہیں کرنا چاہتی۔ ہمیں بھی اس کے جذبات کا خیال کرنا چاہیے۔“

”اے کیا خاک خیال کریں ہم۔ اس نے اپنی اور بچوں کی زندگی کا خیال نہیں کیا۔“ ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

”اماں! سارا قصور اسی کا تو نہیں ہے نا۔“ انہوں نے دلی آواز میں منہ کی حمایت کرنا چاہی۔

”اے چپ رہو لی۔“ انہوں نے بہو کو ہولے سے جھڑکا۔ ”ہم نے بھی اسی دنیا میں زندگی گزار رہی ہے۔ ہر طرح کے حالات سے گزر رہے ہیں تجربات بھی حاصل کیے ہیں اور مشاہدے بھی۔ ارے مرد بچہ ہے چلو دیکھو کیا کسی کھیل تماشے میں چار روز کو وہ ایسی کانچ سی نازک نکلیں، ہلکی سی چوٹ نہ برداشت کر پائیں چور چور ہو گئیں غم سے۔ ارے عورتیں تو شرابی بکباں، جواہری مروہوں کو زندگی بھر ہنس کھیل کر برداشت کرتی ہیں کہ گھر نہ ٹوٹے بچے

بے گھر نہ ہوں۔

عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔۔۔“ انہوں نے دل میں سوچا تھا۔ ”ظلم، جبر، بے ایمانی، فریب عورت ہنسی خرابداشت کرتی رہے تو عورت! ان کے خلاف آواز اٹھائے فریب دینے والے کا گریبان پکڑے، اپنے جذلوں توہین کی سزا دینا چاہے تب سارے الزامات کا رخ اس غریب کی طرف۔ اس نے گھر توڑا، اس نے بچوں کو بے گھر کیا۔ خاموش بے زبان گائے جیسی زندگی گزار کر دنیا سے چلے جانے والی عورتوں کو مثال بنانا کر پیش کیا جاتا۔

”میں کہتی ہوں عذرا! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔۔۔“ شفیقہ حیات نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر دئی تھی۔

”اس کو سمجھاؤ اب بھی وقت ہے معافی مانگ لے اس سے۔ اپنا گھر پھر سے آباد کرے۔ ارے یہاں بیٹھ اچھی لگ رہی ہے بھلا؟ اپنے گھر کو تالا ڈال کر چلی آئی ہے، تالا ڈال کر چلے آئے سے کیا ہو گھر پر آیا اور یہ وہیں کا جائے گا؟“

”آپ جانتی ہیں اماں! وہ کس قدر ضدی ہے۔۔۔“ انہوں نے دھیمے دھیمے چپکے کہا۔

”اور یہ ضد انسان کو تباہ کر دیتی ہے تم بھی جانتی ہو گی۔“

”خدا نہ کرے۔۔۔“ وہ برزرا میں۔

”ارے بد دعا نہیں دے رہی اسے ماں ہوں اس کی لیکن ماں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے جیباتوں میں اس کا ساتھ دوں۔ اسے اتنے برے کی تمیز نہ سکھاؤں، آئینہ نہ دکھاؤں۔۔۔ میرا تو جی کرتا ہے اچھی طرح سن رہی ہے۔“

”جلدی نہ کریں اماں!۔۔۔“ انہوں نے بولے سے ان کا ہاتھ دبا دیا۔ ”وہ ابھی رخم تازہ ہے۔“

”ارے میرے جی پر بیٹھا رہتا ہے اس کا خیال۔“ وہ سسکیں۔ ”کچھ اور نہ ہو جائے عذرا!“

”سب ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔ عاشر اچانک بھٹک نہیں رہا۔۔۔“ انہوں نے ساس کو تسلی دی تھی۔
 دنوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر اپنی اپنی سوچ میں گم ہوئی تھیں۔ تب ہی سدرہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے ایک نگاہ ماں اور دادی پر ڈالی پھر اصرار و عہد کیا۔

”پچھو کہاں گئیں؟“

”پچھو؟“ وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔

”ہاں۔۔۔ ایقان پچھو آئی تھیں نا ابھی۔۔۔ میں کچن میں تھی۔“

”ایقان آئی تھی؟“ شفیقہ حیات حیران سی ہوئیں پھر جیسے بہت کچھ سمجھ گئیں۔

”اس نے یقیناً ہماری گفتگو سنی ہے۔“ عذرا بیگم متفکر ہوئیں۔ ”بے چاری اسے قدموں لوٹ گئی ہے۔“
 شفیقہ حیات کچھ سوچنے لگی تھیں۔

ہاشم نے گاڑی گھر کے اندر کھڑی کی تو دیکھا شہلا کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اس نے رستہ واپس پر نگاہ ڈالی۔ اس کا ڈیوٹی ٹائم آف ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منیوزہ بیگم کی طرف چلی گئی تھی۔ اپنا بریف کیس اٹھائے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گھر کے اندر دلی جھبھے میں داخل ہوا۔ لاؤنج میں فاروق

سن اور فردوس بیگم موجود تھے۔

”اسلام و بیگم۔“ وہ بریف کیس میز پر رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

”وہ بیگم اسلام۔“ فاروق حسن نے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔

”شہلا ہمیں آئیں اب تک؟“ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”دھمکے وہ طے تو کر لیں کہ ان کا گھر ہے کون سا۔۔۔“ فردوس بیگم کو گویا اس کے سوال نے تیلی ہی دکھادی تھی۔

”چک کر لیں۔“ ہاشم چونک سا گیا۔ اس نے باری باری ماں کاٹنا ہوا اور باپ کا سپاٹ چروہ دیکھا۔

”کیا مطلب۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”مطلب یہ بیٹے جی۔۔۔ کہ کچھ ہمارا اور ہماری عمروں کا خیال کرو۔ ہمیں ہو چاہیے تھی ہماری خدمت کے لیے۔ وقت پر کھانا وقت پر دوا دار۔۔۔ یہاں تو ہو بیگم کو ڈیوٹی اور پھر میکے سے فرصت نہیں۔ فارغ اوقات میں سیر

لے۔ وقت پر کھانا وقت پر دوا دار۔۔۔ یہاں تو ہو بیگم کو ڈیوٹی اور پھر میکے سے فرصت نہیں۔ فارغ اوقات میں سیر

سپاٹ۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔“ شہلا کے لیے کچھ بھی غلط سننے پر اس کا دل آمادہ نہ ہوتا تھا لیکن ماں ہاشم خاموش سا ہو گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شہلا کے لیے کچھ بھی غلط سننے پر اس کا دل آمادہ نہ ہوتا تھا لیکن ماں

آخر کو ماں تھی۔ اس کی بات رد کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ وہ شہلا کی طرف داری کرتا۔

”ہاشم بیٹے!“ فاروق حسن نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ ”تمہاری امی کی بات میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ ہو کو اب کچھ عرصہ گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔“

”ہاشم بیٹے!“ فاروق حسن نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ ”تمہاری امی کی بات میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ ہو کو اب کچھ عرصہ گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔“

”جی۔۔۔ جی بابا جان!“

وہ آستکی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدم سست پڑ چکے تھے۔

آج کئی دن کے بعد وہ پارک میں آئی تھی۔ شام کی تازہ ہوا میں چل قدمی کرتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں کے رنگوں پر غور کرتے ہوئے وہ کافی آگے تک چلی آئی تھی۔

تب ہی اسے عمر کا دھیان آیا۔ وہ اسے سوتا چھوڑ کر آئی تھی۔ اٹھ کر وہ یقیناً ”اسے تلاش کرتا۔ شہلا کے اس گھر سے چلے جانے کے بعد وہ رنج سے بہت زیادہ اٹھ بچ ہو گیا تھا۔ اکثر وہ اسی کے ہاتھ سے کھانا کھانے کی ضد کرتا تھا۔ منیوزہ بیگم یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ رنجہ نے ان کی تقریباً ”سب ہی ذمہ دار یاں بانٹ لی تھیں۔“

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ پارک سے نکل کر سڑک پر چلی آئی۔ عین اسی لمحے ایک سیاہ ویتا نجانے کہاں سے نکل کر دوڑتا ہوا اس کی جانب آیا تھا۔

رنجہ کے منہ سے بے اختیار ہی چیخ نکلی۔ وہ بنا دیکھے بھالے سڑک کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ خوف کے عالم میں وہ نہایت قریب آئی گاڑی بھی نہ دیکھ سکی۔ ڈرائیور نے حتی الامکان اسے بچانے کی کوشش کی تھی مگر رنجہ گاڑی سے بری طرح ٹکرا کر نیچے گر پڑی۔

ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھا شخص گھبرا کر باہر نکلا تھا۔

عاشق کی اچانک پاکستان آمد پورے خاندان کو سرور کرتی ہے۔ تاہم ایقان اس کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی ہے۔ منور ایمین کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ربیعہ کو بارہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عینی موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خود فرود ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عہد کے گھر میں ختم ہونے کا کیا جاتا ہے۔ منترہ بیگم، ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔ انتم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریضہ کا نکاح پڑھوا دیا جاتا ہے جس پر عریضہ سخت کیندہ خاطر ہوتی ہے۔

شادی کی اولین رات ابراہیم جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی سے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کا ملاقات ابراہیم سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم، شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

فرز جو درحقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عریضہ کے لیے فرزند کا آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فرزند بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔

رافع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ دل کی جھلک نظر آتی ہے جس کا قلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔ لڑا، عاشق کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے۔ عاشق اسے لینے ایرپورٹ جاتا ہے۔ ایقان، عاشق کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سرور و قہر اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم مایہن اسے دلا سادے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا، ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ،

وردہ کے شور سے ایم ایس سویٹس لابی میں داخلہ لیتا ہے۔ وہاں فون کرتی ہے۔ تاہم لڑا کا وہ مال ایقان کے ہونٹ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشق سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشق کو کھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ ایقان حقیقتاً صدمے سے گنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ، وردہ سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے بتا چلتا ہے کہ وردہ کی منگنی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے صدمے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا کیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ وردہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات کوئی نہیں کرتا۔

UrduPhoto.com

ایقان، عاشق کا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے میکے آ جاتی ہے اور عاشق کی تمام تر یقین دہانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے ہٹا تعلق کر لیتی ہے۔ وہ عاشق کے بے وفائی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یہ صورت حال گھر کے تمام افراد کے لیے بے حد بیان کن ہے۔ عاشق جاپان جا چکے ہوئے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

انٹرویو

قریب آکر اس شخص نے ربیعہ کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔

ربیعہ جھجک کر خود کھڑی ہونے لگی لیکن اس کے لیے اس کے لبوں سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اسے اپنے پہلو لپکا میں بازو میں درد کا احساس ہوا۔

”میں بے حد معذرت خواہ ہوں میڈم۔“ وہ شخص بے طرح شرمندہ اور ہراساں ہو رہا تھا۔

تب ہی ایک بایک ان دونوں کے نہایت قریب آکر رکی۔ بایک پر بیٹھا ہوا رافع تیزی سے اتر اور ان لوگوں کی جانب بڑھا۔

”ربیعہ! ربیعہ آریو آل رائٹ؟“ وہ ربیعہ سے پوچھنے لگا۔

”میں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ ربیعہ نے رسائییت سے بوسنے کی کوشش کی۔ نجائے کیوں رافع کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ سرک پر اچھا بھلا تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔

رافع اب اس کارڈ رائیور کو کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔ اس کا ہر نہ چلتا تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ لیتا۔

”اتنی بڑی گاڑی لی ہے تو اس کو استعمال کرنے کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھیں مسٹر!“ وہ نہایت غصے سے اس شخص سے مخاطب ہوا ”کوئی نشہ وغیرہ کر کے گھر سے نکلے تھے آپ؟“

”دیکھیں سرسید! میں معذرت چاہتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں میں قصور وار نہیں ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا۔

”جی ہاں۔۔۔ بھلا آپ قصور وار کیوں ہونے لگے۔“ رافع طنز سے بولا ”ان معاملات میں اکثر ہی گاڑیوں والے بے قصور ہوتے ہیں۔“

”رافع۔۔۔ رافع پلیز۔“ ربیعہ درد کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعی بے قصور ہیں۔ دراصل میں ہی بغیر دیکھے بھالے سڑک کر اس کر رہی تھی۔“

”میرا خیال ہے ہمیں باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں ہاسپتال لے کر جانا چاہیے۔“ وہ شخص ربیعہ کا زبردست چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ رافع نے اب ربیعہ کا جائزہ لیا تھا۔

”نہیں نہیں۔۔۔“ ربیعہ مزید زبردستی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں میں اب گھر جاؤں گی۔“

اس نے قدم بڑھانے کی کوشش کی تو ایک مرتبہ پھر چیخ اٹھی۔ اس نے احساس ہوا کہ اسے واقعی چوٹیں آئی تھیں۔

”ربیعہ۔۔۔!“ رافع نرمی سے بولا۔ ”میرا خیال ہے یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ تمہیں چیک آپ کروالینا چاہیے۔ یہیں قریب ہی میرے دوست کے بھائی کا کلینک ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔“ وہ اٹھ اٹھی۔ ”میں شملہ بھالی کو فون کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ رافع مزید نرم ہوا۔ ”میں شملہ بھالی کو فون کرتا ہوں۔“

وہ شخص عجیب کش کش کا شکار ہیں کھڑا تھا۔ رافع نے اپنی بائیک سائیڈ میں کھڑی کی پھر وہ ربیعہ کے قریب چلا آیا۔

اگر تمہیں سہارے کی ضرورت ہے تو میں۔۔۔ وہ قدرے جھجکا تھا۔

ربیعہ کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ خود کو چلنے سے قائل نہیں بارہی تھی لیکن وہ رافع کا بازو تھامتھی یا رافع اس کا ہاتھ پکڑتا اس خیال نے ہی اسے شرم سے پالی پالی کر دیا تھا۔

”اگر آپ ہانڈ نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں مس ربیعہ!“ عجیب سی صورت حال۔ شکارا بن گئی تھی۔

نے مداخلت کی۔

رافع نے ایک نظر اس کے جھل چہرے پر ڈالی پھر اس کی گاڑی کو نہ دیکھا۔

”یہ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ رافع نے ربیعہ کو قائل کرنے والے انداز میں دیکھ کر کہا۔ ”تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“

میرا نہیں خیال کہ تم گھر تک آرام سے چل پاؤ گی۔“

اتنی بات ربیعہ بھی سمجھ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ گاڑی کا ہی سہارا لے کر بچھلے دروازے کی جانب رہہ گئی۔

اجنبی نے اس کے لیے لپک کر دروازہ دیا کیا تھا۔ ربیعہ کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے رافع کو دیکھا۔

”پلیز۔۔۔ آپ بھی بیٹھیں۔۔۔“

”نہیں میں بائیک پر آجاتا ہوں۔ آپ انہیں گھر تک پہنچا دیں۔ بے حد نوازش ہو گی!“ وہ اپنی بائیک کی جانب

برہہ گیا۔

ربیعہ کو آتا دیکھ کر منہ زہ بیگم اور انیقہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔ ان کی آوازوں سے پریشان ہو کر عباد بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔

”دیکھا ہوا ہے ربیعہ! خیر تو ہے زیادہ جوش تو نہیں آئی۔“

سب کے سب اس سے مختلف سوالات کرنے لگے۔ ربیعہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی انیقہ نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کا بازو چیک کرنے لگی۔

ایسے میں عباد کی نگاہ ایک لخت سامنے کھڑے اس شخص پر گئی۔

”ارے امیر حسن۔۔۔ آپ!“ وہ بے ساختہ ہی آگے بڑھا۔

”جی ہاں۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا ”میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا کہ آپ کب متوجہ ہوتے ہیں!“ عباد گرم جوش انداز میں اس سے ملنے لگا۔

”میں اس سے ملنے لگا۔“ وہ مسکرا رہا تھا ”میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا کہ آپ کب متوجہ ہوتے ہیں!“ عباد گرم جوش انداز میں اس سے ملنے لگا۔

”امیر حسن! میں نے آپ کے متعلق بات کی تھی۔ شاید آپ کو یاد ہو!“

”امیر حسن!“ منہ زہ بیگم سوچنے لگیں۔ ”ہاں شاید یہ وہی ہیں نا جن کے ساتھ تم اپنا بزنس اشارت کرنا چاہتے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔“ عباد مسکرایا۔

امیر حسن نے بے حد احترام سے منہ زہ بیگم کو سلام کیا۔

”جی ہاں۔۔۔“ وہ ملاحت سے بولیں ”میرا تو خیال تھا کوئی بڑی عمر کا شخص ہو گا۔۔۔ تم تو بالکل میرے عباد جیسے لگتے ہو۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”در اصل بزنس میرے پاپا اور بھائی سنبھالتے ہیں۔ میں یہاں پاکستان میں اس کی پروموشن کے سلسلے میں آیا ہوں۔ یہاں عباد صاحب سے ملاقات ہو گئی تو ہم نے سوچا کیوں نہ مل کر کام کیا جائے۔ آج بھی میں اس سلسلے میں عباد سے ہی ملنے یہاں آیا تھا۔“

”اور ہمارے گھر کے ایک بڑے سے آپ سڑک پر ہی مل لیے۔“ انیقہ نے مزاحاً شکایتی انداز میں کہا۔ سب لوگ ہی ہنس پڑے۔

”یہ گواہی تو آپ کے گھر کا بندہ ہی دے گا جناب!“ امیر حسن اب بشارت سے گویا ہوا تھا کہ اس حادثے میں میرا ہاتھ سرمو نہیں ہے کیوں مس ربیعہ!“

”جی ہاں۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ربیعہ آہستگی سے بولی تھی ”در اصل میں ایک کتے سے خوف زدہ ہو کر دوڑی تھی۔ بنا دیکھے ہی سڑک کر اس کرنے لگی۔ آپ نے تو پھر بھی حاضر دماغی سے کام لیا ورنہ شاید یہ حادثہ خطرناک ہو سکتا تھا۔“

”بچانے والی ذات خدا کی۔“ وہ مسکرایا۔ ”ہم انسان تو خطا کے پتلے ہیں۔“

ربیعہ نے اب کی بار پہلی مرتبہ اسے نظر بھر کر دیکھا۔ خوب صورت بھاری آواز رکھنے والا وہ شخص خود بھی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ آف وہائٹ شلوار سوٹ میں اس کا قد و قامت بے حد جاذب نگاہ نظر آتا تھا۔ اس کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز بھی بہت خوب صورت تھا۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مفسر آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”ایسا! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں ہرگز ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ بین پھینک کر قدرے ضدی پن سے بولی تھی۔

دورہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔
”ناعمہ! یہ نیا دور ہے، اس کے کچھ مختلف تقاضے ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی کہیں کہیں دنیا داری بنا ہونا پڑتی ہے۔“
”اگرچہ میں اس کا اعتراف کرتی ہوں، لیکن میں یہ نہیں سمجھتی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا لباس بدل دوں۔ اسٹیکس بھی تیار کر دیتی ہوں، لیکن میں یہ نہیں سمجھتی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا لباس بدل دوں۔“
”آئی! وہ رو ہانسی ہو گئی، اس کا دل کس نے کھاتھا آنے کو۔“

اس کے انداز میں ہار ماننے کا اشارہ تھا، دورہ کو اس کی بات اور اس کی سب سے بڑی پر ہنسی آگئی۔ وہ ہنسی چھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ناعمہ کچھ دیر پریشان صورت بنائے بیٹھی سوچتی رہی۔

پھر وہ تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گئی۔
”کیڑے تبدیل کر کے لائٹ بنک لپ اسٹاک کے چہرہ سجائے جب وہ کچن میں داخل ہوئی تو دورہ کی تیاری بھی دیکھ کر مسکرا دی۔

”دیکھ گڈ!“ اس نے مطمئن نظروں سے اس کا سر پایا دیکھا۔ ”چلو، یہ جائے لے کر جاؤ اور سلیپے اور تمیز سے سرو کرو۔“
”یہ کام آپ کر لیں نا آئی!“ دورہ نے جھرتی انداز میں بولی۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ مجھ سے قہرے اور دورہ کا تعلق سب ٹھیک نہیں رہتا۔“

”نہایت پرہیزگارانہ کی ضرورت نہیں ہے۔“ دورہ پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ”چلو، سنبھالو!“ اس نے زالی کھینچ کر ناعمہ کے آگے کر دی۔ مزید بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر زالی لیے آگے بڑھ گئی۔ دورہ بھی اس کے پیچھے تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر اس نے نگاہ اٹھائے بغیر ہی سلام کیا تھا۔ جواب میں فریج کی گرم جوش آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ کون کہاں بیٹھا ہے، سو وہ اسی جانب بڑھ گئی۔

”ناعمہ! بیٹا پہلے سب کو چائے دو۔“ رابعہ بیگم نے اسے دھیمے سے پکارا۔
وہ صوفے پر بیٹھنے لگی تھی، لیکن اسے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ناچار وہ زالی رابعہ بیگم کے ساتھ بیٹھے ہوئے فراز کے قریب لے آئی۔

”میں صرف چائے لوں گا۔“ بنا دیکھے پلیز!“ اس نے سرونگ پلیٹ واپس زالی میں رکھ دی۔
”جینی؟“ ناعمہ نے دھیمے سے پوچھا۔
”بغیر جینی کی چائے دیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تیش تھی۔

”ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں ای۔! ذرا چائے وغیرہ بھیج دیں۔“ عباہ نے منہ زہ بیگم سے کہا پھر وہ امیر حسن کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہو تم!“ انیقہ نے اس کے بازو وغیرہ اچھی طرح ہلا کر دیکھ لیے تھے ”میں بین کمر دیتی ہوں۔ گرم گرم دودھ سے کھا کر تھوڑی دیر آرام کرو۔ کل تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

”میں اسے گرم دودھ میں بلدی ملا کر دیتی ہوں۔“ منہ زہ بیگم بولی تھیں ”کسی اندرونی چوٹ کا خطرہ نہ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ انیقہ نے سر ہلایا ”ہم دونوں اپنے اپنے ہنر اس پر آزمائے ہیں!“
ربیعہ مسکرا دی۔ منہ زہ بیگم کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ انیقہ اس کے لیے گولیاں لانے کے لیے اپنے کمرے کی سمت چل دی۔ اس نے گہری سانس بھر کر صوفے کی پشت سے سر نکالیا۔ اس کا ذہن رافع کے متعلق سوچ رہا تھا۔

وہ اسے چھوڑنے گھر تک تو آیا تھا۔ پھر نجانے کیوں اندر آنے کے بجائے باہر سے ہی لوٹ گیا۔ لوٹتے سے اس کا چہرہ اس کی آنکھیں ربیعہ کے لیے فکر مند تھیں۔ ربیعہ کا دل فکر میں ہی آگئی اس دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ان نگاہوں سے پھوٹا ”اپنا خیال رکھنا“ کا پیغام اس کے پردہ ذہن پر سایہ کیے گھر آتا تھا۔ وہ بہت دیر کے لیے کہیں کھوی گئی تھی۔

اس نے کال بیل کی آواز سنی ضرور تھی لیکن سنی آن بولی کہ کچھ بیٹھی اپنے نوٹس مکمل کرتی رہی۔ تب ہی دورہ غصے سے مسکراتی ہوئی چلی آئی۔ ناعمہ نے ایک مصروفیت کی نظر اس پر ڈالی۔
”کون ہے آئی؟“

”ایسے بنی بیٹھی ہو جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔“ اس نے اچھے گھورا ”گھنٹی ہوتی جا رہی ہو!“
”جی؟“ ناعمہ نے حیران نظریں اٹھائیں۔ ”میں سمجھی نہیں کہ کس بات کی خبر ہوئی ہے مجھے؟“
”فریج نے تمہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی؟“ دورہ نے سوال کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی غور سے دیکھا۔

”فریج نے؟“ ناعمہ مزید حیران ہوئی۔ ”فریج آئی ہے کیا؟“
”جی ہاں۔ نہ صرف فریج بلکہ آپ کے وہ ”مجنوں“ بھی ساتھ ہیں۔“ دورہ مسکرائی ”فائٹ کپڑے تبدیل کر کے آجاؤ۔“

”میں؟ میں آجاؤں؟“ ناعمہ کی جان خشک ہونے لگی۔ ”نہیں ایسا۔! میں ہرگز ان موصوف کے سامنے نہیں آؤں گی۔ کہہ دیں آپ جا کر انہیں۔“

”ای ڈرائنگ روم میں ہی موجود ہیں اور تمہیں بلارہی ہیں۔“ دورہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اور کوئی تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ حالات کو نہیں کرنا سیکھو۔ چلو اٹھو، کپڑے بدل لو۔ بال بناؤ سلیپے سے۔ قسم سے اگر وہ لوگ تمہیں اس حیلے میں دیکھ لیں نا۔“

”تو شوق سے منتظر توڑ دیں۔“ ناعمہ جل کر بولی تھی۔ ”میں تو دودن سکون کی نیند سوتی رہوں گی!“
”بکو مت!“ دورہ ناراضی سے بولی ”شکل اچھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے۔“

ناعمہ نے گھبرا کر نظر اٹھائی۔ تب اس نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لہجے سے بھی برہہ کر تیش تھی۔
 ”ہائے! کیا ہو گیا بھائی آپ کو۔۔۔“ فریحہ شوخ انداز میں بولی تھی ”گھر میں تو آپ آدھا کپ چینی سے بھر لیتے
 ہیں اور یہاں چینی کی بچت کر رہے ہیں۔“
 ”کبھی کبھار لکھی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

ناعمہ نے اسے واقعی بغیر چینی کی چائے تھما دی پھر وہ ٹرائی فریحہ کے قریب لے آئی۔
 ”بھئی! اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔۔۔“ فریحہ نے پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا ”میں تو دل بھر کر انصاف کروں گی۔
 ویسے سچ بتاؤ ان میں سے کیا کچھ تم نے بنایا ہے؟“
 ”کچھ بھی نہیں!“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی ”سب کچھ وردہ آپی کا کمال ہے!“ وردہ اسے گھورنے لگی تھی
 لیکن ناعمہ چونکہ یہ بات جانتی تھی سو اس نے وردہ کی جانب دیکھنے سے گریز ہی کیا۔
 ”ویل سیڈ!“ فریحہ مسکرائی۔

نہ جانے کیوں ناعمہ کی نگاہ ایک مرتبہ پھر اس کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں ہنوز وہی تیش برقرار تھی۔ ناعمہ کو
 الجھن ہونے لگی۔

چائے کا کپ خالی کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ فریحہ بھی جلدی جلدی پلیٹ صاف کرنے لگی پھر دونوں بھائی بہن
 کے درمیان نظروں ہی نظروں میں کسی بات کا تبادلہ ہوا تھا۔ فریحہ نشوونما سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے رابعہ بیگم
 کی جانب بڑھی۔

”آئی۔۔۔ ایک فرمائش کر سکتی ہوں۔“

”ضرور بیٹا!“ رابعہ بیگم مسکرا دیں۔ ”اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے۔۔۔ بولو۔“

”مجھے امینہ صاحبہ کی بیکم فریج میں رکھنے کی اجازت ہے۔“ وہ لاؤ بھرے انداز میں بولی۔

”کیوں نہیں۔۔۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں ”تم کہو تو سہی!“

”آئی۔۔۔ انہیں لوگ کچھ دیر کے لیے ناعمہ کو باہر لے جائیں؟“

اس کی بات سن کر رابعہ بیگم دفعہاً ”خاموش سی ہو گئیں۔ وردہ کا چہرہ بھی یکایک سختیدہ ہوا تھا اور ناعمہ پر تو جیسے
 بجلی ہی گری تھی۔ وہ تو ہر اس کی ہی کھڑی سب کے چہرے دیکھنے لگی تھی۔

فراز دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے یوں لا تعلق سے کھڑا تھا جیسے اس کا اس بات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو
 حالانکہ ناعمہ کو پورا اندازہ تھا کہ اس فرمائش میں فریحہ کی صرف زبان ہی استعمال ہوئی ہے۔ اسے یہ خیال
 بے طرح ستا رہا تھا کہ کہیں رابعہ بیگم اسے ان دونوں کے ساتھ جانے کے لیے نہ کہہ دیں۔ ایسی صورت میں یقیناً
 فریحہ درمیان سے ہی کہیں غائب ہو جاتی اور وہ اس کی تیش بھری نظروں کا سامنا کرنے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار
 رہی رہ جاتی! رابعہ بیگم نے ہنوز فریحہ کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھیں۔

”بولیں نا آئی!“ فریحہ اٹھلائی ”ہم آئیں کریم کھا کر لوٹ آئیں گے۔ زیادہ دور ہرگز نہیں جائیں گے۔ آپ
 بالکل بے فکر رہیں۔“

”دیکھو بیٹا!“ رابعہ بیگم دھیمی آواز میں بولیں ”میں جانتی ہوں کہ یہ نیاز مانہ ہے اس کے کچھ اور ہی تقاضے
 ہیں۔ نئے رنگ ڈھنگ ہیں لیکن ہمارے خاندان اور ہمارے گھر میں اب تک ان ہی پرانی قدروں کا رواج ہے
 ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کے آپس میں ملنے یا ساتھ باہر آنے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تم
 لوگ یہاں آئے مجھے بے حد خوشی ہوئی بلکہ میں نے خاص طور پر ناعمہ کو بھی سامنے بلوایا کیونکہ میں اس بات
 میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن بیٹا! جہاں تک تمہارے ساتھ باہر جانے کی بات ہے اس کی اجازت میں نہیں

دے سکتی کیونکہ ہمارے مشترکہ نظام میں اسے نہ صرف برا سمجھا جائے گا بلکہ میری بیٹی ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کی نگاہ میں بے باک قرار پائے گی۔ اللہ نے مجھے بیٹا نہیں دیا لیکن میرے بھائیوں کے بیٹے ان لوگوں کو بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا سامنا ہو گیا تو ناعمہ کبھی ان سے نظر ملا کر بات نہ کر پائے گی۔ اس لیے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور برا مت ماننا لیکن میں معذرت خواہ ہوں!"

فریحہ سے کوئی جواب نہ بن رہا۔ وہ قدرے خفت کا شکار نظر آرہی تھی لیکن فرائز چند قدم آگے بڑھ آیا۔ "آئی! آپ کو معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!" وہ بولا۔ "معذرت تو ہمیں کرنا چاہیے کہ ہم نے آپ سے ایک غلط فرائش کی۔ آپ کا لفظ لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے آپ کی باتیں سن کر۔ آپ پلیز ہم لوگوں کو معاف کریں۔ آئندہ ہماری طرف سے ایسی کوئی فرائش نہ ہوگی۔"

والدہ بیگم کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فرائز کی پیشانی چومی۔ "ماشاء اللہ جیتے رہو بیٹا! بیٹی کی ماں ہوں۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے دل میں خوف بھی تھا کہ بچانے والا سب کچھ سن کر کس رویے کا مظاہرہ کرے۔ لیکن تم نے میرا دل ہلکا کر دیا۔ اللہ تمہیں اور سچائی سے نوازے۔ خوش رکھے۔"

ناعمہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ اس لمحے فرائز اپنی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ والدہ بیگم کی دعاؤں پر دیکھے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس لمحے اس کا وہ انداز ناعمہ کے دل میں اتر آیا چلا گیا۔ ان نگاہوں کی وہ پیش غائب تھی ہونٹوں پر وہ تلخ ہنسیاؤں نہ تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ نرمی اور محبت تھی اور خوب صورت مسکراہٹ سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

"اب اجازت چاہیں گے آئی!" وہ بولا۔ "آتے رہا کرو بیٹا! تمہارا اپنا گھر ہے نیسے۔ اس میں اپنی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" "اور آئیں کریم میں بہت اچھی بنالی ہوں۔" "دورہ شوخی ہے بولی۔" پہلے سے بتا کر آئیں گے تو آئیں کریم کھانے کے لیے باہر جانے کی اجازت نہیں لینا پڑے گی۔" "وہ ہنس دیا۔"

فریحہ اور ناعمہ بھی مسکرا دیں۔ چند لمحوں پہ مباحول میں جو کھینچا اور کیا تھا اب کہیں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ فریحہ اور فرائز باہر جانے کے لیے بڑھے تو والدہ بیگم اور دورہ انہیں رخصت کرتے ہوئے ارادے سے باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ ناعمہ نے سکون کا سانس لیا تھا!

اس کے ہاسپٹل سے ڈیوٹی انچارج کا فون آیا تھا۔ شہلا سوتے اٹھی تھی۔ اس نے قدرے غائب دماغی سے فون ریسیو کیا۔

"ہاں ڈاکٹر شہلا! آپ کو آنا ہو گا۔" وہ کہہ رہے تھے "ایمر جنسی ہے اس وقت!" "لیکن سو! میں تو ابھی وہ بیگے واپس آئی ہوں۔" اس نے پریشانی سے گھڑی کی سمت دیکھا جو چار بج رہی تھی۔

"آئی نو ڈاکٹر شہلا! لیکن مجبوری ہے! ڈاکٹر رضوانہ اور ڈاکٹر ارم دونوں کے ساتھ کچھ پر اہم ہو گئی ہے اور ہاسپٹل میں چار کیس موجود ہیں جبکہ ڈیوٹی پر صرف ڈاکٹر ناصری ہیں۔ آپ اس وقت ڈیوٹی دے لیں۔ کل آپ کو ریسٹ دے دیں گے۔" وہ نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

"اوکے۔ سر! وہ بولی "میں آجاتی ہوں۔"

"مختصیک بوڈا کٹر شہلا!" انہوں نے ممنونیت سے کہا۔ "اٹس اوکے!" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

چند منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سامنے کھڑی فردوس بیگم نے بے حد بڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

تیز گلابی شرٹ کے ساتھ سفید شلوار پہنے میں کھلی کھلی سی ہوا انہیں ذرا متاثر نہ کر سکی تھی۔ سفید پرس بڑھے پر لٹکائے وہ ان کے قریب آ کر۔

"آئی! میں ذرا ہاسپٹل جا رہی ہوں۔"

"نہ جانا مریضی ہاں جا چکی ہے۔" وہ نخوت سے بولیں "اجازت کی تو تم نے کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔ یہ اطلاع کی تو اس کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے۔"

"آئی! ایمر جنسی ہے۔ ہاسپٹل سے فون آیا تھا۔" وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "ورنہ آپ اتنی ہیں میں ابھی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی کر کے آئی ہوں۔"

"ارے ہم سب جانتے ہیں۔ تم کیا سمجھا رہی ہو۔" وہ ہنسا کر بولی "تمہیں "وہاں سے آٹھ گھنٹے بعد لوٹو تو اپنے میکے لے جانا۔ یہ تو تمہارا بیس آؤ ہے کھانے پینے کا ٹھکانا!" شہلا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"آئی! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔"

"جتنے اوپر تھے گھر سے آئی ہو اس سے اونچا جانتے ہیں تمہیں ہم اور تم خود۔"

"آپ سے بات کرنا فضول ہے۔" شہلا کا ضبط جواب دے کر گیا تھا۔

"کیا کہا؟" وہ چلا آئیں۔ "تم نے وہاں شرم کو۔ پوچھتی ہوں میں یہ کیسی ہو میرے سر پر لا بٹھائی ہے۔ ڈاکٹر نہ ہوئی! سڑ ہوئی کیس کی۔ ہم کوئی باز پرس بھی نہیں کر سکتے۔ لگتا ہے کہ ماں باپ نے کبھی کوئی تربیت کی ہے۔" شہلا کو اپنے پیچھے سے مسلسل ان کی آواز مل رہی تھی۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر کے چلتی چلی گئی۔ اسے اپنے داغ لہجہ کے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے اپنے گھر کا ماحول اس قدر شائستہ اور سلجھا ہوا تھا کہ ایسی کی ہر لچلی کا اس نے سوچا تھا۔

گاڑی کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے وہ چند لمحوں کے لیے یونسی بیٹھی رہی۔ کچھ بھٹائی نہ دے رہا نہ کچھ دیر کے بعد اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی تھی!

”ایسی کوئی بڑی بات ہوئی نہیں جسے خاص طور پر یاد رکھا جاتا یا اس کا ذکر کیا جاتا!“ ربیعہ ہلکے پھلکے شگفتہ سے انداز میں بولی۔

”شکر ہے خدا کا کہ کوئی بڑی بات نہ ہوئی!“ وردہ نے اس کا بغور جائزہ لیا پھر اس کے قریب پڑی اسٹک کو دیکھا۔
”اور یہ اسٹک کیسی؟“

”تخنے کی ہڈی میں ذرا سی تکلیف ہے۔۔۔ جلتے وقت سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بس اسی لیے۔“
”کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا تھا ربیعہ!“ وردہ فکر مندی سے بولی۔ ”ایسی باتوں کو معمولی نہیں لیا کرتے۔“
”ہاں۔ انہی مجھے لے گئی تھی زبردستی۔ ایک سرے وغیرہ بھی کروالیا ہے سب ٹھیک ہے!“
”کل سے یونیورسٹی بھی کھل رہی ہے کیا ارادے ہیں؟“

”ایک دو دن تو نہیں جاسکتی!“ ربیعہ بے چارگی سے بولی ”جیسے ہی اس اسٹک سے جان چھوٹے گی۔ میں تیار ہو جاؤں گی۔ لیکن پلیرز وردہ! میرے لیے نوٹس وغیرہ بنالینا لیکچرز کے ذریعہ میرا بہت حرج ہو گا!“
”تم بے فکر رہو ربیعہ! یہ بھی بھلا کہنے کی بات ہے۔“ وردہ نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ربیعہ چند لمحوں کے لیے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وردہ کے چہرے پر جو روشنی تھی وہ اس کی بہترین طبیعت اور بے پایاں خلوص کا مظہر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت وسیع جلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور لبوں کا تبسم جاوہری کیفیت رکھتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس قدر محویت سے؟“ وردہ نے اس کا ایک ٹک دیکھنا محسوس کر کے کہا۔
ربیعہ چونکتی اٹھی پھر وہ ایک گہری سانس بھر کر مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں!“ وہ دھیرے سے بولی ”سوچ رہی تھی بہت خوش قسمت ہو گا وہ شخص جس کے نصیب میں اللہ نے تمہاری سبب پائیاں محبت درج کی ہوگی!“
وردہ نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا پھر مسکرا کر سر جھکا لیا۔ ربیعہ نے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دبایا۔ اس دن وردہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں مسہلیمیاں آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر وہ وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب چلوں گی ربیعہ!“
”بہت اچھا لگا تمہارا آنا۔“ ربیعہ خلوص اور محبت سے مسکرائی۔ ”آئی رہا کرو نا۔“
”چلو باریاں لگا لیتے ہیں اب کے تمہاری باری ہے!“ وردہ شوخی سے ہنسی۔
”منظور ہے۔“ ربیعہ بھی ہنس دی۔

”میں منیہ آنٹی سے دعا سلام کر لوں پھر چلوں گی۔“ وردہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ تب ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ منیہ بیگم کی ہمراہی میں فریش سارا فچ آ رہا تھا۔ سفید بے داغ شرٹ اور مسٹرڈ کلر جینز میں وہ بے حد خوب نظر آتا تھا۔ وردہ اپنی جگہ پر کھڑی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ رافع کے ہاتھوں میں سفید گلابوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔
”ارے!“ رافع اسے دیکھ کر رک گیا ”وردہ۔۔۔ تم!“

”نجانے کیوں وردہ نے محسوس کیا کہ اسے دیکھ کر رافع کا روشن چہرہ قدرے بجھ سا گیا تھا۔“
”جی۔۔۔ میں ربیعہ کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔“ وہ دھیمے سے بولی ”ٹانہ سے پتہ چلا تھا کہ ربیعہ کا معمولی سا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا مل آؤں!“
اس کی نگاہ رافع کے ہاتھوں میں موجود گلدستے پر تھی۔ سفید گلاب بے حد تازہ اور بہت خوب صورت محسوس ہو رہے تھے۔ وردہ کا جی ان پر ہاتھ بھرنے کو چاہا۔

”ہاں۔ اچھا کیا۔“ رافع قدرے غائب دماغی سے بولا ”میں بھی سوچا۔ دراصل اس دن میں بھی ادھر سے ہی گزر رہا تھا۔“

”اچھا آئی! میں اب چلوں گی!“ ورنہ نے اپنی توجہ گلدستے پر سے ہٹا کر منہ زہ بیگم کو دیکھا۔

”آئی رہا کرو بیٹی۔! ربیعہ کا بھی دل لگ جاتا ہے۔ انیقہ کو تو اپنی پرہاکی سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ گھر میں رہ کر بھی اس کا پتا ہی نہیں چلتا میں اور ربیعہ ہی ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی ہیں۔“

”جی!“ ورنہ مسکرائی۔

نہ جانے کیوں رافع کو اس کی مسکراہٹ بے حد بخشنی تھی سی محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ گئی تب وہ چونکا۔

”ربیعہ۔! منہ زہ بیگم اس کے کمرے کے دروازے پر اسے پکارنے لگیں ”یہ رافع آیا ہے تمہاری طبیعت کا پوچھنے۔“

اندر بیٹھی ہوئی ربیعہ بری طرح سے چونکی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا دپٹہ ٹھیک کیا۔

”اندر آجائیں رافع۔!“ رافع کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولی۔

”کیسی ہیں آپ!“ اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”شکر ہے اللہ کا۔ بالکل ٹھیک ہوں۔“

رافع نے گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔ ربیعہ نے اسے تقابم کیا۔

”اوم۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”کتنے خوب صورت پھول ہیں۔ ابھی ورنہ بھی میرے لیے بہت اچھے پھول لائی تھی۔“

رافع نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہی پھولوں پر اپنے لیے کوئی ایک دو تھیں۔ ربیعہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے پھول لے لے۔

”آپ کو جوٹ وغیرہ تو نہیں آئی تھی زیادہ۔“ رافع خون کو قدرے غائب دماغ محسوس کر رہا تھا۔

”آئی تو تھی لیکن بچت ہو گئی۔“ ربیعہ دھیسے سے ہنسی۔ ”پڑیوں پسلیوں کی۔“

”آپ۔۔۔ روڈ ہمیشہ ایسے ہی کراس کرتی ہیں؟“

”اگر ایسا ہوتا تو میری کوئی ہڈی سلامت نہ ہوتی۔“ ربیعہ شگفتگی سے ہنسی۔ ”سب میں کریک ہوتے۔ دراصل میں ایک کتے سے ڈر کر بھاگی تھی۔ جو شاید مجھے کانٹے کے ارادے سے بڑی تیزی سے میری سمت آ رہا تھا۔ مجھے تو اب پارک کے خیال سے ہی خوف آ رہا ہے۔“

”تنہا کیوں جاتی ہیں۔“ وہ بے خیالی سے بولا۔ ”کسی کو ساتھ لے لیا کریں۔“

اس نے نجانے کس سوچ کے تحت کہا تھا لیکن ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

”اپنا خیال رکھا کریں۔“ وہ پھر اسی انداز سے بولا۔

پھر ایک ایک وہ چونک کر کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیسوں میں ڈال کر اس نے گہری سانس بھری اور جیسے جواسوں میں آتے ہوئے خوش دلی سے مسکرا دیا۔

”میں اب چلوں گا۔“

”ارے۔“ ربیعہ بھی چونک اٹھی۔ ”اس طرح کیسے جاسکتے ہیں آپ۔ میرا خیال ہے اسی جائے بناری ہیں۔“

”میرا مقصد آپ کی عیادت کا تھا سو پورا ہوا چائے پینے پھر کسی دن حاضر ہوں گا!“ وہ شرارتاں بولا۔

”پھر آنے کا ہانا؟“ نجانے کس رو میں ربیعہ کہہ بیٹھی۔

رافع حیران سا ہوا۔ ربیعہ بے حد خفت زدہ ہو گئی تھی۔ جو کچھ لبوں سے بے اختیار اور بے سبب ہی نکل گیا تھا۔

”میں میں کہیں اس کا نشان نہ تھا نجانے کیسے وہ کہہ بیٹھی تھی اور اب جی بھر کر شرمندہ ہو رہی تھی۔“

”خدا حافظ!“ وہ دھیسے سے کہہ کر نکل گیا۔

”خدا حافظ!“ ربیعہ کے بھی ہونٹ ہلے تھے۔

کمرے کی لائٹ آف کر کے اس نے بے حد مدھم آواز میں ریڈیو لگایا ہوا تھا۔ ریڈیو پر لیٹ اور ز کا غزل پروگرام چل رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ کام اس کی طبیعت اور مزاج سے میل نہ کھاتا تھا پھر بھی نجانے کیوں آج ناعمہ کا دل آدھی رات کو موسیقی سے لطف اندوز ہونے پر آمادہ تھا۔ کھلے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ مسلسل زندگی کے نئے اور نئے حالات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ واقعات میں اتنا الجھاؤ اور اتنی گتھیاں تھیں کہ انہیں سلجھانا اسے اپنے بس کی بات نہ لگتی تھی۔

آج اس نے فراز کا بے حد خوب صورت روپ دیکھا تھا۔ اس کی بہت اچھی باتیں سنی تھیں۔ اب تک وہ اس سے جس انداز سے مخاطب ہوتا آیا تھا اور جس نظر سے اسے گھورا کرتا تھا اس سے ناعمہ کے دل میں اس کی طرف سے گریں پر گئی تھیں لیکن آج اس کا آج کا وہ بیگم، مسکراتا روپ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا وہ۔۔۔ رابعہ بیگم سے بات کرتے ہوئے۔ ناعمہ کے دل نے اس کی پچھلی سب خطائیں بخش دی تھیں۔ آج پہلی مرتبہ دل نے اسے اس کی بات پر پچھانا تھا جو تقدیر نے ان دونوں کے درمیان قائم کیا تھا۔

ناعمہ کا جی چاہا ”آج وہ اسے فون کرے۔ اس سے بات کرے۔ اس سے پوچھے کہ وہ کیوں اس کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔“

ناعمہ کو علم تھا کہ اس کی ممکن ہوئے میں فراز کے فیصلے کا عمل دخل تھا۔ اس کے باوجود وہ اس سے بات کرتا تھا تو اس کے لیے سے تپش پھوٹی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنے فون پر بلواتا ہے، کبھی اپنے ساتھ باہر لے جانے کا متمنی ہوتا ہے، اس کے باوجود وہ بات نہ کرتی تھی۔ عجیب طرز پر انداز روا رکھتا تھا۔ اسے عجیب لگا ہوں سے ٹھورتا تھا جیسے کسی مجرم کو دیکھ رہا ہو۔

بھلا ایسا کیوں تھا؟

وہ بے طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ شخص کیا چاہتا تھا کیا سوچتا تھا کیا جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لفظوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

”آواز پہچانی نہیں۔ یا پھر آواز پہچان کر یہ حال ہوا ہے؟“

”تم کیا گلٹ فیل کر رہی ہو؟“

”یہ نیا نمبر کیوں لیا گیا ہے؟ وہ پچھلا نمبر اب کس کے پاس ہے؟“

ناعمہ کو عجیب سے احساس نے آگیرا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

نور جہاں کی آواز ریڈیو سے ابھری تھی۔ بے حد خوب صورت غزل بے حد خوب صورت انداز میں گائی جا رہی

تھی۔ ناعمہ سب کچھ بھول بھال کر غزل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

آخری شعر ناعمہ کی آنکھوں میں نجائے کیوں آنسو بھر آئے۔ شاید یہ نور جہاں کی آواز کی گہرائی کا اثر تھا یا پھر لفظوں کی سچائی کا۔ اس نے انگلی کی پور سے آنسو صاف کیے۔

یگانگ اسے کچھ یاد آنے لگا۔ کوئی بات بے چین کرنے لگی۔ اس نے سوچا، غور کیا۔ کیا بات تھی؟ اسے اس غزل سے عریشہ کیوں یاد آنے لگی تھی؟

تب ایک ایک کر کے بہت سی باتیں بہت سی یادیں کسی البم کی طرح اس کے ذہن میں کھلنے لگیں۔ اسے بہت سے پرے واقعات تفصیل سے یاد آئے۔

عریشہ کا اس سے یہ غزل مانگنا۔ اس کا ہر روز کھویا کھویا سا انداز۔ کبھی اداسی، کبھی بے پناہ خوشی۔ اس کا نافع سے منگنی ہو جانے پر شدید احتجاج۔ ہر شخص ہر شے سے روٹھ جانا۔ ناعمہ کا سانس تیزی سے جلنے لگا تھا۔ اس کا ذہن آج شاید ہر راز سے پرہیز کر رہا تھا۔ اپنے ذہن کی ایسی مثالی کارکردگی سے وہ خود ناواقف تھی!

وہ تو اسے نہایت کم عقل اور بے پروا سمجھتی تھی۔ یہ سب محض عین سادگی کا کرتی تھی۔ ثانیہ اسے کوئی عقل کی بات کہتا دیکھتی تو قریط حیرت سے دانتوں میں انگلی دبائی کرتی تھی اور آج ناعمہ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے کسی بڑے راز سے پرہیز کر رہا تھا۔ جیسے اس نے وہ سمجھ لیا تھا جواب تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ سمجھ کر کس رد عمل کا مظاہرہ کرے؟ لیکن کیا جو کچھ اس نے سمجھا تھا وہ واقعی درست تھا؟ سچ تھا؟ یا پھر لوگوں کی اس کے بارے میں رائے بے حد وثیق تھی۔ جو ربط اس نے بنایا تھا۔ وہ اس کی کم عقلی کا مظہر تھا؟ اس کی استہوار ہے؟ کن حقائق کا گریز ہے؟

ناعمہ کو اب بھی اس گتھی کو بکھانا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ارادے باندھنے لگی تھی۔



چہرے پر پانی کے چھپٹائے پارتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس کے لیے تو بے حد واضح تھا لیکن فریق ثانی کا رد عمل کیا ہو سکتا تھا اور کیا نہیں۔ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی!

واش روم سے نکل کر وہ تولیہ سے چہرہ تھپکتی ہوئی بیڈ پہ آ بیٹھی۔ ہاشم اپنی جگہ پر نیم دراز تھا۔ ایک بازو اس نے آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔

شہلا کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ آج ہاشم ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ اس نے شہلا کی چند باتوں کے جواب میں سنجیدگی سے چند الفاظ ہی استعمال کیے تھے اور خود سے کوئی بات اب تک نہ کی تھی۔ شہلا اور ہاشم کمرے میں ہوتے تو ہاشم کی توجہ مسلسل اس پر مرکوز رہا کرتی تھی اور موڈ بے حد خوشگوار ہوتا تھا۔ وہ شگفتگی سے اکثر اس کی بے توجہی پر فقرے کسا کرتا تھا۔ آج معاملہ بے حد برعکس تھا۔ شہلا اس کی جانب متوجہ تھی اور وہ آنکھوں پہ بازو رکھے نجائے سو رہا تھا یا کچھ سوچ رہا تھا۔

شہلا نے ہونے سے کھنکھار کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن نتیجہ حسب توقع برآمد نہ ہوا۔

”ہاشم! اس نے پکارا۔

”ہوں!“ وہ اسی انداز میں لیٹے لیٹے بولا۔ بازو ہٹا کر اس نے شہلا کی جانب نہ دیکھا تھا۔ شہلا کے دل کو کچھ ہوا۔

چوٹ سی لگی۔

”آپ سو رہے ہیں؟“

”نہیں! واضح جواب آیا تھا۔“

”پھر یہ ایسے کیوں لیتے ہیں؟“

”بس۔ یونہی۔“

شہلا کچھ سوچنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے غور کیا پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”آپ سے۔ کسی نے کچھ کہا ہے میرے بارے میں؟“ ہاشم نے بازو ہٹایا اور اسے غور سے دیکھا۔

”مثلاً۔ کس نے؟“

”آپ کی امی نے؟“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔

ہاشم اس کی بات پر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”شہلا۔۔۔“

”جی؟“

”تم صرف ”امی“ بھی کہہ سکتی ہو ”آپ کی امی“ کہنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ شاید تم انہیں اپنی ماں نہیں سمجھتیں۔“

شہلا خاموش ہو کر انگلی سے بستر کی چادر پر لائنیں کھینچنے لگی۔

”انہوں نے شاید آپ سے میری شکایت کی ہے۔“ پھر وہ بولی تھی ”اور آپ مجھ سے کچھ بھی پوچھتے، ناکوئی بھی وضاحت مانگے بغیر یوں خفا ہو کر لیٹے ہوئے ہیں۔ اس بات پر ہاشم!۔“

”تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے خفا ہوں۔“ وہ سمجھنے لگے انداز میں بولی اور کیا وضاحت مانگواؤں تم سے؟

میں نے تو تم سے کبھی کسی بھی بات کی وضاحت نہیں مانگی۔ شاید مجھے وضاحتیں طلب کرنے کی عادت نہیں ہے۔“

”خفگی کا اظہار صرف لفظوں سے نہیں ہوتا ہاشم! اگر آپ نے بھی کہیں تب بھی میں سمجھ سکتی ہوں۔ اور آپ کو وضاحت طلب کرنے کی عادت نہیں ہے تو مجھے بھی صفائیاں پیش کرنے کی عادت کبھی نہیں رہی لیکن

میاں پیوی کو دل کی باتیں کہانی چاہئیں ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔“

ہاشم اس کی بات پر اسے بہت دیر تک دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔

”یہ تم کہہ رہی ہو شہلا؟“

”آپ کے انداز میں شکایت کیوں ہے؟“ شہلا نے ابرو چڑھایا۔ ہاشم نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

”کیا آپ کے دل میں بھی میرے لیے شکایت ہے؟“ شہلا نے پوچھا تھا۔

ہاشم خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہے۔

”بتائیں ہاشم؟“ وہ جانے پر مصر تھی۔

ہاشم کو بہت پہلے رافع سے کی گئی اپنی گفتگو یاد آئی۔

”واکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ رافع نے پوچھا تھا۔

”او نہیں یا۔۔۔! شکایت تو جب بھی ہوئی اپنے آپ سے ہوگی!“ اس نے کہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر خود میں

لوٹا۔ وہ شاید اپنے کسے سے پھر رہا تھا۔

شہلا اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر اب سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے سراٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔

”ہاشم میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں“ آپ سے امید ہے۔ آپ میرا مسئلہ برامانے بغیر حل کر دیں گے۔“

”ہاں کہو کیا بات ہے ایسی۔۔۔؟“ وہ سب کچھ بھول کر اب اس کے مسئلے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

”میں علیحدہ گھر لینا چاہتی ہوں۔“ وہ قدرے رک کر بولی۔

”علیحدہ گھر؟“ ہاشم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔۔۔ میں میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہاں سب لوگوں کی ٹیبلٹی مختلف ہے۔ میری سوچ بے حد

مختلف ہے۔ میں میں یہاں رہوں گی تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ آپ، آپ پلیز میرا مسئلہ سمجھنے کی کوشش

کریجیے۔“ ہاشم ایک ٹک ایسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آرہا تھا کہ شہلا آخر اس سے کہہ کیا رہی ہے۔

”شہلا۔ کیا کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ اٹکتے ہوئے بولا تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ میں اور آپ علیحدہ الگ گھر میں رہیں اور اور عمر ہمارے ساتھ رہے۔“

”وہ! ہاشم! ہاشم! گھر اس لیا“ تو یہ بات ہے!“

”پلیز ہاشم! میری اس درخواست کو ٹیبلٹی نہ لیجیے گا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی پرابلم بنتی جا رہی ہے

اسے سولو (Solve) کرنے کی کوشش کریں پلیز!“

وہ ملجیانہ انداز میں بولی تھی۔ ہاشم سر ہٹا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

وہ بے حد خاموش خاموش سی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ دورہ نے چپکے سے آکر ان کے گلے میں بائیں ڈال

دیں۔ اور انہوں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”اگے بیٹھو میرے پاس۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔“

دورہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

راجہ بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر انہوں نے دورہ کی جانب نگاہ کی۔

”دورہ بی! ایک بات کہوں۔“

”لیجیے۔۔۔ اب یہ اجازت دے دوں درکار ہوئی۔ ایسی کیا بات ہے؟“

مشق محمد علی محمد علی کے حوٹے

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

یگور نے کہا: ہمارا دور ہمارا ہے

یگور نے کہا: ہمارا دور ہمارا ہے

یگور نے کہا: ہمارا دور ہمارا ہے

یگور نے کہا: ہمارا دور ہمارا ہے

یگور نے کہا: ہمارا دور ہمارا ہے

خانوں کا
دسترنوائ

شائع ہوئی

”وہ فوج“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”امی! پلیز ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ کہیں کیا کہہ رہی تھیں؟“

”دور رس بیٹی! میں سوچتی ہوں جس طرح فراز فریحہ کو سامنے لا کر بھی ناعمہ سے بات کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے، کبھی اسے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتا ہے تو کیا یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے اس سے یہ بہتر نہیں کہ ہم جلد از جلد ناعمہ کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں؟“

”واہ۔۔۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی!“
 ”لیکن بیٹی! تم ناعمہ سے بڑی ہو۔ پہلا حق تمہارا بنتا ہے۔“ وہ اچکچاتے ہوئے بولی تھیں۔ ”کیا یہ بات تمہارے لیے ناگوار نہ ہوگی؟“

”ارے جانے دیں امی! یہ پرانے زمانے کی باتیں۔“ وہ برا سامنہ بنا کر رولی ”مجھے شادی کی نہ کوئی خواہش ہے نہ ہی جلدی۔“

”یہی رافع کہتا ہے۔۔۔“ وہ فکر مندی سے بڑبڑائیں ”آخر بات کیا ہے؟“

”آپ! آپ! کہیں تو میں ناعمد ہوتے بات کروں۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔ ”آخر ہمیں اس کی رائے بھی معلوم کرنا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے میں عذرا بھالی سے بات کروں۔۔۔“ رابعہ بیگم کا ذہن اب دوسری جانب پھرتی جا نکلا تھا۔ ”میں تم دونوں کے فرض سے ایک ساتھ سبک دوش ہو جاؤں یہ بہت بہتر رہے گا۔ نجانے کل کونسی پتا نہیں کیوں میرا دل خوف زدہ سا رہتا ہے!“

”بے وجہ شے تو کمالات کا شکار نہ رہا کریں! اسی بات کو امام غزالی سے بولانی۔ ”جو تقدیر میں رقم ہو اسے ملا نہیں جا سکتا۔ انسان کو اپنے معاملات خدا کے حوالے ہی رکھنے چاہئیں، خود کو خدشات کے حوالے نہ کرنے سے محض پریشانیوں ہی حاصل ہوتی ہیں!“

”بہت سمجھ دار ہے میری بیٹی! وہ محبت سے بولی تھیں۔“ خوشنوار ہوئے اللہ تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دکھائے۔ آمین!“

دروہ نے پھر اپنے بازو ان کے گلے میں جمائل کر دیے تھے!

فون کی گھنٹی دیر سے بج رہی تھی۔ ربیعہ نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ منیر فریم شاید نہا رہی تھیں۔ وہ اسٹک کے سہارے چلتی ہوئی فون تک آئی تھی۔
 ڈبیلو۔۔۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب سے خوب صورت بھاری آواز ابھری تھی ”مس ربیعہ بات کر رہی ہیں؟“
 ”جی ہاں!“ وہ قدرے الجھی۔ ”ربیعہ ہی بات کر رہی ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟“
 ”امیر حسن مخاطب ہوں“ آپ کا مجرم!“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

ربیعہ نے قدرے غائب دماغی سے چند لمحوں کے لیے غور کیا تھا۔ فوری طور پر اسے وہ نام شناسا تو محسوس ہوا لیکن مکمل طور پر کچھ یاد نہ آسکا۔
”امیر حسن؟“ وہ بڑبڑائی۔

”شاید آپ پہچانی نہیں، حالانکہ میں اپنا تعارف ایک مجرم کی حیثیت سے کروا بھی چکا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔
تب ہی اچانک اسے امیر حسن بھی یاد آگیا اور اپنے ننھے کا در بھی۔
”اوہ۔ کیسے ہیں آپ۔“ وہ نجانے کیوں شرمندہ سی ہوئی۔

”یہی پوچھنے کے لیے تو میں نے فون کیا ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”یہ بتائیں کہ آپ کیسی ہیں، آپ کا پیر ٹھیک ہو گیا؟
عبادت گزار تھا کہ آپ کو چلنے میں کچھ پر اہم ہو رہی ہے۔ میں تو یہ سن کر بے حد پشیمان ہوا۔ بس ربیعہ! ایک بار پھر
بے حد معذرت چاہتا ہوں۔“

”ارے امیر حسن صاحب! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ ربیعہ فوراً بولی تھی۔ ”میں بھی جانتی ہوں کہ
آپ بھی کسے قصور صرف اور صرف میرا تھا۔ میں ہی اندھا دھند بھاگتی ہوئی آپ کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔“
”آپ خواہ مخواہ الزام اپنے سر لے رہی ہیں۔“ وہ ٹھنٹکی سے بولا۔ ”حالانکہ اصل قصور وار تو وہ پارک کا کتا
ہے۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا؟“

ربیعہ کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکی۔
”میں نے کتے کا نام بھی بتایا تھا؟ شاید میرے اوسان پر کچھ زیادہ ہی خطا ہو گئے تھے۔“ دوسری جانب امیر حسن
بھی ہنسنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی میں ٹھنٹکی اور دوستانہ پن تھا۔ ربیعہ کو احساس ہوا کہ وہ ایک متوازن اور خوبصورت
شخصیت کا مالک ہے۔

”اوسان تو آپ نے میرے خطا کر دیے تھے۔ عین
گواہی دینے کے لیے آپ ہوش و حواس میں تھیں۔“
ربیعہ قدرے جھینپ گئی۔

”مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ اب جانے بھی دیں اس ذکر کو۔“
”چلیں جانے دیتے ہیں۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”اب اجازت دیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن حاضر ہوں گا۔ آنٹی
کو میرا سلام کہیے گا۔“

”جی ضرور۔“ ربیعہ بولی۔
”خدا حافظ۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
ربیعہ ریسور تھا کہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ریسور رکھ دیا تھا۔

ہاشم بھائی۔۔۔ میں نے آپ سے سیمسٹو کی فیس کے لیے کہا تھا۔“
بریف کیس بند کرتا ہوا ہاشم چونک اٹھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ حمزہ شاید یونیورسٹی جانے کے لیے ہی تیار کھڑا
تھا۔ ہاشم کو یاد آیا کہ اس نے دو دن پہلے ہاشم سے اپنے سیمسٹو کی فیس کا ذکر کیا تھا۔

ہاشم کو قدرے شرمندگی ہوئی۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی بھائی کو اپنی کسی ضرورت کا ذکر
دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہو۔ وہ اپنے گھروالوں کی ضروریات پوری کرنا اپنی پہلی ترجیح سمجھتا تھا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے
وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب سا تھا۔ اسے بہت سی باتیں بھول جاتی تھیں۔

”سوری حمزہ۔۔۔ یار! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ پشیمانی سے بولا۔
پھر اس نے اپنی چیک بک نکالی اور چیک کاٹ کر حمزہ کی جانب بڑھا دیا۔
”اصلی کو بھی تو فیس جمع کروانی ہوگی؟“

”اس نے بابا سے لے لیے تھے۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے تو آپ ہی سوٹ کرتے ہیں ان کاموں کے لیے بہت
غیر دلچسپ سوالات کے جواب نہیں دینا پڑتے۔“ ہاشم بھی مسکرا دیا۔
”میں بھی کسی دن بابا جانی کا روپ دھار سکتا ہوں۔ ہشیار رہنا۔“

”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرائنگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔

”ہاشم نے گہری دیکھی۔“ میں پتھر لیٹ ہو جاؤں گا۔ تم ساتھ چل رہی ہو تو میں چائے آفس میں ہی
کے لیے چائے پھرے بنا دوں۔“
”نہیں۔“ ہاشم نے گہری دیکھی۔ ”میں پتھر لیٹ ہو جاؤں گا۔ تم ساتھ چل رہی ہو تو میں چائے آفس میں ہی
کے لیے چائے پھرے بنا دوں۔“

”پہلے گا۔“
”مگر ایسا ہے تو میں اپنی گاڑی میں غلی جاتی ہوں۔“ شہلا فوراً بولی۔ ”آپ خالی پیٹ نہ جائیں، آرام سے
ہیٹ لائے۔“
”آپ کی وجہ سے تو میں غلی جاتی ہوں۔“ ہاشم ہلکا سا مسکرایا۔ ”چلیے اب اتنا تکلف نہ برتا
کر س کہ بیوی کے بجائے پردن معلوم ہوں۔“

شہلا نے حیران ہو کر اس کی صورت دیکھی۔ اس کے الفاظ میں ٹھنٹکی لیکن لہجہ ہلکا سا طنزیہ لیے ہوئے تھا۔ شہلا
کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہاشم مذاق کر رہا ہے یا طنز۔
وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ہاشم کے پیچھے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا ذہن اب تک اس کے لفظوں
میں الجھا ہوا تھا۔

”آپ کی وجہ سے تو ہم غلی جاتی ہوں۔“
شہلا کو خوشگوار سا احساس بھی ہوا۔ کتنے ہی دن سے وہ کچھ سنجیدہ اور اداس سا تھا۔ اس نے شہلا سے کوئی
محبت بھری بات، کوئی دل لہاتا جملہ نہ کہا تھا۔ آج اس کے لبوں سے ایسی بات سن کر اسے اچھا لگا تھا۔ ہر چند کہ
ذہن میں اس کے لطیف طنز کا احساس بھی پھانس بن کر چبھتا تھا۔

گاڑی آگے بڑھی تو شہلا نے کسکھار کر جیسے کسی بات کے لیے خود کو تیار کیا تھا۔
”ہاشم۔۔۔ میں نے۔۔۔ آپ سے ایک درخواست کی تھی۔“ وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔
ہاشم نے کچھ دیر اس کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ شہلا نے گردن گھما کر اسے
دیکھا۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں ہاشم!“
ہاشم نے گہری سانس بھرتے ہوئے موڑ کاٹا تھا۔
”اسی کا جواب دینے کے لیے مناسب لفظوں کا چناؤ کر رہا تھا۔“ وہ بولا۔

”مناسب لفظ؟“ شہلا چونکی۔ ”مناسب لفظ تو کسی معذرت یا انکار کے لیے ڈھونڈے جاتے ہیں۔“ ہاشم پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نرم لہجے میں بولا۔

”تم نے جو فرمائش کی تھی شہلا! میں اس کے جواب میں معذرت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں پاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ”ہیلو۔“ رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے وہی شناسا آواز سنائی دی تھی۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی۔ ”میں۔۔۔ ناعمہ بات کر رہی ہوں۔“

”علیکم السلام۔“ وہ چند لمحوں کے بعد بولا تھا۔ ”میں ہنڈرڈ پر سنٹ شیور تھا کہ فون ورنہ نے کیا ہو گا۔ زہے تھی۔“

”آپ اگر معاشی مسائل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں ہاشم! تو میں نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ

آپ اپنے گھر والوں کی معاشی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں نہ ہی میں نے اپنے اخراجات میں اضافے کی بات کی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک علیحدہ رہائش کی بات کی تھی لیکن میرا مقصد آپ کے مسائل میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ خدا کا فضل و کرم ہے میرے اخراجات کے لیے میری اپنی آمدنی کافی ہے۔ میں صرف اپنے ذہنی سکون اور بے شکار ہوں۔ ایک ماں ہوتے ہوئے میں اپنے بیٹے کی آمد پر ایک خفت سے دوچار ہو جاتی ہوں۔ آپ مجھ سے محبت کا دعو کرتے ہیں لیکن اتنی معمولی سی بات نہیں سمجھ پارہے ہیں۔ اگر ہاشم قریب ہی کوئی گھر لے کر وہاں شفٹ ہو جاتے ہیں تو اس میں کون سی برائی ہے؟“

”میں نے سہ ورنہ آئی سے ہی نمبر لیا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”فراز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ناعمہ، وہ اس کے بے وجہ ہنسے پر حیرت ہوئی۔

”کیوں ہنسے آپ؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”تجربہ کار فنانس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مس ناعمہ۔“ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ”میرا موبائل نمبر آپ نے ورنہ

”ناعمہ کا دل ایک مرتبہ پھر اسی اجنبی انداز سے دھڑکا تھا۔ اندازوں کی تصدیق ہونے لگی تھی۔ وہ ایک ایسا راز

”میں نے۔۔۔ پہلے آپ سے کب بات کی تھی؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”کتنا عرصہ ہو گیا اس بات کو؟“

”عرصہ کتنا ہوا یہ تو مجھے یاد نہیں۔ مجھے تو صرف پچیس گ اور دھوکے کا مطلب پوچھنا ہے تم سے۔“ وہ قدرے

”سوختے کی حد تک تو سب ٹھیک ہے شہلا! لیکن ایک بات سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ تم بھی میری بات سمجھنے کی

کوشش کرو۔ میں اس گھر کا بڑا بیٹا ہوں۔ صرف معاشی مسائل کی بات نہیں ہے اور بھی کئی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو علیحدہ ہونے کی صورت میں میں احسن طریقے سے نہ نبھا پاؤں گا۔“

”مثلاً۔۔۔“ شہلا نے چڑ کر اسے دیکھا۔

”مثلاً۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ دھیسے سے بولا۔ ”تم اس وقت ایسے موڈ میں ہو جب صحیح بات بھی غلط لگتی ہے۔ اس

موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ تمہارا ہاسپٹل بھی آگیا ہے۔“

شہلا خاموش ہو کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ ہاشم کے انکار نے اسے زہی کا سا لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم اس

مطالبہ پر زیادہ اعتراض نہ کرے گا اور ہنسی خوشی اس کی بات مان لے گا لیکن ہاشم کا فیصلہ کن انداز اسے حیران بھی

کر گیا تھا اور برہم بھی۔ ہاشم نے گاڑی ہاسپٹل کی پارکنگ میں روکی تو شہلا اپنا بیگ ہینسلے ہوئے قدرے آف

موڈ میں اترنے لگی تھی۔

”خدا حافظ۔“ ہاشم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”خدا حافظ۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔

فون نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس

گھبراہٹ کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ اپنے منگیتر سے بات کرنے جا رہی تھی۔ وہ بہر حال پڑھی لکھی، باشعور،

ایک سوئس صدی کی لڑکی تھی۔ البتہ حیا دار اور اپنی حدود میں رہنے کی قائل ضرور تھی۔

مگر اس عجیب سی گھبراہٹ کی اصل وجہ وہ نامعلوم سا احساس اور وہ اندازہ تھا جو اس نے نجانے کیسے ایک

کے جاوٹی لمحے کے طفیل قائم کیا تھا اور اب وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہتی تھی۔ دوسری جانب بیل جا رہی

”میں۔۔۔ میں اگر نہ بتانا چاہوں۔۔۔“ وہ گھبراہٹ سے بولی۔

”تب تو سزا میں کسی نرمی کی گنجائش نہیں نکلے گی۔“ وہ بے رحم انداز میں بولا تھا۔

ناعمہ کو اس لمحے اس سخت گیر شخص سے عجب خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

ماہنامہ شعاع 250 جنوری 2007

کردی جائے۔

بات کرتے کرتے انہوں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر یکدم حیران سی ہوئیں۔ رافع کا چہرہ یوں بچھتا جیسے کسی نے شمع دان کو ہوا دکھادی ہو۔ وہ بالکل گم سم سا ہو گیا۔ عذرا بیگم پریشان ہو گئیں۔

”رافع...“ انہوں نے پکارا۔

”جی...“ وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ ”جی ای... کہیے۔“

”کیا کہوں میں تو اپنی بات مکمل کر چکی۔“

”کون سی بات؟“ وہ غائب دماغی سے بولا۔

”شادی کی... اور کون سی... یہ تم اتنا پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی الجھن ہے؟“

”جی... نہیں... نہیں... امی... کوئی الجھن نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو مجھے کچھ جواب تو دو۔“ وہ اسے جانے کے لیے تیار دیکھ کر قدرے خفاسی ہوئیں۔

”میں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کر رہی تھی اور تم یوں ہو گئے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔“

”جائے کو پر تو لے لے لے۔“

”امی... میں ایک انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔“ اس نے ریسٹ ورائج پر نگاہ کی۔ ”دعا کیجئے گا اللہ کامیاب کرے۔“

”اچھا۔“ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بیٹا! میرا تو رونا روناں تم ہی لوگوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ کسی نوکری ہے؟“

”بہت اچھی جاب ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنی ہے، اچھی تنخواہ دیں گے دیگر مراعات علیحدہ۔“ کہتے ہوئے چل پڑا۔ عذرا بیگم اس کے پیچھے آرہی تھیں۔

”پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ تم اگر خیر سے کامیاب ہو جاؤ گے تو میں رات بھر بات کر لوں گی۔“ وہ بھی اپنی تیاری رکھے۔

”امی...“ وہ اچانک ہی پلٹا۔ ”میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ زندگی میں ابھی کربے کو بہت کچھ باقی ہے۔“

”سوچیں۔“ شادی میرے مسائل میں اضافہ کر دے گی۔ آپ سچے سچے ابھی کچھ بھی نہ کہیں، صرف ثانیہ کے لیے

”ہائیں۔“ عذرا بیگم کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟“

”یانی باتیں پھر کریں گے امی! میں پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ چمپا کی بجائے باہر نکل گیا۔

”خدا حافظ۔“ وہ بڑبڑاتا تھا۔ ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھنے لگا تھا۔

”سیاں بنا گھر سونا سونا... سیاں بنا گھر سونا... چاند بنا جیسے سونی زیتیاں... سن خوشبو جیسے سونی گھیا... سیاں بنا گھر سونا...“

”بچن میں کھڑی ایقان لمحہ بھر کے لیے سُن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ گانا جو کبھی جنون کی حد تک پسند تھا، آج اس کے بولوں نے اس کا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ دوبارہ کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی چھری ایک طرف پھینک کر وہ باہر نکل آئی۔

”سامنے ہی ایمان بیٹھی تھی۔ سی ڈی پلیئر آن کر کے وہ اپنے کمرے پر بے حد خوش نظر آتی تھی۔

”مماسہ مماسہ... آپ کا فورٹ سانگ۔“ اس نے تالیاں بجا کر اس سے بھی داد وصول کرنا چاہی۔

ایقان نے آگے بڑھ کر پلیئر آف کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

”کیوں مماسہ... یہ سانگ اچھا نہیں لگا؟“ ایمان اس کے آنسوؤں سے خوفزدہ سی ہو گئی۔ ”میں دوسرا سانگ

”باروں؟ بلورے گھر۔“

”آپ نی وی پر کارٹون لگا لو بیٹا! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ گانے کی آواز اچھی نہیں لگ رہی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ ماں کی کیفیت سے پہلے ہی گھبرا گئی تھی۔ سعادت مندی سے اٹھ کر بیڈروم میں چلی گئی۔

ایقان وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ رات بھی کتنے ہی عجیب و غریب خوابوں سے گھبرا کر اس کی آنکھ کئی مرتبہ کھلی تھی۔ اس کے بعد اسے نیند ہی نہ آئی۔ اب دکھتا ہوا سراور بھتے ہوئے آنسو لیے وہ سوچ رہی تھی کہ مومن کے اسکول سے آنے سے قبل کھانا کیسے بنائے؟

”یہ گانا میرے دماغ میں سرنگ بنا چکا ہے۔“ ایک تھنجلائی ہوئی آواز تھی۔ ”آخر کیا جادو ہے اس میں جو تم

”یہ گانا اور اس کے بول میرے دل میں سرنگ بنا چکے ہیں اور جو چیز ایک بار دل کو چھو جائے، وہ ہمیشہ یونہی بے خود کرتی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی تھی۔ ”آپ کو آخر کیا اعتراض ہے اسے سننے میں؟“

”اچھا...“ وہ قریب ہوا تھا۔ ”تب ہی تم ہمیشہ مجھے یونہی بے خود کر دیتی ہو۔ آخر ایک بار دل کو چھو چکی ہو۔“

”ایک بار؟“ وہ ابرو تان کر بولی تھی۔ ”کیا مسئلہ ایک بار؟“

”پہلے ایک بار... پھر بار بار... بار بار...“

ایقان اس کی ہنسی کی آوازیں سے کمرہ بھر گیا تھا۔

ایقان چونک کر اپنے آپ میں سوچا تھا۔ کسی نے کال بیل بجائی تھی۔ اس نے دوبارہ بارہ بجائی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا۔

”اماں ہیں شاید۔ اس وقت وہی ہوتی ہیں۔“ اسے خوشی سی ہوئی۔

”شفیقہ حیات اس سے خفا تھیں۔ وہ بس کبھی کبھار ہی اس کی خیریت پوچھنے یہاں تک چلی آتی تھیں، ورنہ اکثر ایقان ہی ان سے مل آتی تھی۔ ایک ہی گھر میں آجانے کے باوجود ماں بیٹی میں ایک نادیدہ سی دوری ہو گئی تھی۔

ایقان تیزی سے دروازے کی منت بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ کچھ دیر کے لیے پتھر کی سی ہو گئی۔ باہر اختر میاں کمرے تھے۔

”اماں... اماں... میں بہت پریشان ہو کر رہ گئی ہوں۔“ صبح سے دیوانوں کی مانند ادھر سے ادھر پھرتی عذرا بیگم

بمشکل دوپہر تک ہی ضبط کیائی تھیں۔ کوئی چار دنہ پانچ گھنٹہ سانس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”پہلے سوچا تھا کہ سبقت سے کہوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر وہ انہیں غصہ آگیا تو کیا ہوگا۔ گھر میں کوئی بڑا

فساد نہ گھڑا ہو جائے۔ میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔“

”خدا خیر کرے بس۔ ایسا کیا ہو گیا؟“ شفیقہ حیات بھی گھبرا سی گئی تھیں۔ ”دیکھو مجھے کوئی الٹی سپدھی خبر نہ

سناتا۔ میرا دل تو پہلے ہی بہت کمزور ہو چکا ہے۔“ عذرا بیگم خاموش سی ہو کر سانس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ انہیں الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے بھی وقت سی محسوس ہو رہی تھی۔

”اماں! میں نے صبح رافع سے شادی کی بات کی تھی۔ ثانیہ اور رافع کی شادی چونکہ ایک ساتھ ہی کر دینے کا

”ہاں۔ شاید۔ لیکن اتنا زیادہ نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔“ انہوں نے اس کا دھواں دھواں ہوتا ہوا چہرہ دیکھا۔
 ”کوئی میڈیسن دوں آپ کو؟“ ربیعہ کو اچانک خیال آیا۔ ”اس دن شہلا آئی نے جو ٹیبلٹ دی تھی آپ کو۔ وہ ہے میرے پاس۔“
 ”ٹیبلٹ سے نہیں اس انجکشن سے آرام آیا تھا لیکن تم ابھی ٹیبلٹ ہی دے دو۔ میں کھا لیتی ہوں۔ شاید اسی سے آرام آجائے۔“

ان کا چہرہ مزید پیلا ہوتا تھا۔ ربیعہ ڈری گئی۔
 ”ای۔ میں شہلا آئی کو فون کر دیتی ہوں وہ ابھی گھر پر ہی ہوں گی۔“
 ”نہیں ربیعہ۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”اس کی ساس اس کا یہاں روز روز آنا پسند نہیں کرتی۔ یہ میرا سن کر رو ڈی چلی آئے گی۔ خواہ مخواہ کوئی ناچاتی نہ ہو۔“

”لیکن امی! طبیعت۔۔۔“
 ”انیقہ آتی ہی ہوگی۔“ انہوں نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ ”تم تب تک وہ گولی دے دو مجھے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ ناچار وہاں سے اٹھ کر لاؤنج میں آئی تھی۔
 میڈیسن بکس سے گولی لا کر اس نے انہیں کھلائی پھر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں انہیں قدرے آرام آگیا تھا۔

”انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔“
 ”جی آئی! وہ ان کا اٹھا ہوا ہے ہوسکے داری تھی۔“

”جاؤ بیٹا! ماموں ہیں آپ کے۔“ ایقان قدرے طنز سے بولی۔ ”ماموں سے ملو۔“
 اختر میاں کھیانے ہو کر عجیب سے انداز میں کھی کھی کرنے لگے۔ ایمان اب تک ان کے قریب نہ گئی تھی۔
 ”بھابھی بیگم کو سلام کہیے گا۔“ ایقان نے انہیں دھڑا پیر پا کر کہا۔
 ”اچھا۔“ انہوں نے مائع داری سے سر ہلایا۔ ”ابھی جائیں گے تو ضرور کہہ دیں گے اور کوئی کام ہو تو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ اب ہم یہیں رہیں گے باجی کے پاس۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔“
 ”آپ کے لیے تو اتنا کام ہی کافی ہے اختر میاں! یہ بھی اگر آپ سہولت سے کر سکیں تو۔“ وہ جل کر بولی تھی۔
 اختر میاں کے چہرے پر گہرے دکھ کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک آہی بھری۔
 ”آپ نے ہی کسی قابل سمجھا ہوتا ایقان بیگم تو ہم تو دنیا فتح کر لیتے۔ یہ سبے کار بے مصرف زندگی آپ کی میرانی تو ہے۔“

”اب آپ جائیں اختر میاں!“ ایقان کا ضبط جواب دینے گیا تھا۔ ”مجھے ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ میں آپ کی ان عجیب و غریب باتوں کو قابل جواب نہیں سمجھتی ورنہ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔“
 ”اچھا۔ ہم جائیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے پیاسی نظروں سے دیکھا۔ ایقان گولہ بھر کے لیے بے حد خوف سا محسوس ہوا۔ اختر میاں کا ذلیل ذلیل کسی بھی نازک اندام عورت کو خوف میں مبتلا کر سکتا تھا۔
 ”رافع۔“ وہ ایک دم ہی بولی تھی۔ ”رافع آنے والا ہے۔ اسے آپ کی یہاں موجودگی اچھی نہیں لگے گی۔“
 ”اچھا۔“ وہ قدرے مایوسی سے بولے۔ ”پتہ نہیں ہم اپنے بڑے کیوں ہیں۔ کسی کو ہماری کہیں بھی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔ آپ غصہ نہ کریں ایقان بیگم! ہم تو یونہی آپ کو ایک نظروں سے چلے آئے تھے اب ہم چلتے ہیں۔“

”جی ہاں۔ ضرور۔“ اس کی جان میں جان آئی۔
 اختر میاں دروازے کی جانب بڑھے۔ ایقان دروازہ بند کرنے کے خیال سے ان کے پیچھے ہی لپکی۔ یکایک وہ رک کر پڑے تھے۔ ایقان کے لبوں سے جھنجھٹے نکلے تھے۔
 ”اگر آپ برائہ مائیں تو۔۔۔ ہم کبھی کبھی آجایا کریں۔“ وہ پوچھ رہے تھے۔
 ”کیوں؟“ وہ بھٹائی۔
 ”یونہی۔ آپ کو دیکھنے۔“

”خدا حافظ۔ بھابھی کو سلام کہیے گا۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔
 ”اچھا۔ خدا حافظ۔“ وہ مایوس سے ہو کر باہر نکلے تھے۔

”ای۔ آپ کے لیے چائے بنا دوں۔“ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔
 پھر یکایک وہ رک کر بیڈ پر جمی منیوہ بیگم کے چہرے پر درد کے آثار نمایاں تھے۔ ربیعہ تیزی سے ان کے قریب پہنچی۔

”ای۔ ای۔ کیا ہوا ہے؟“
 ”پتا نہیں ربیعہ۔ پیٹ میں ایک گولہ سا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے تکلیف سے نڈھال ہوتے ہوئے کہا۔

”پھر وہی درد اٹھا ہے نا آپ کو۔“ ربیعہ نے ان کے برف ہوتے ہوئے ہاتھ تھامے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے تحفہ کا تحفہ

بے خوبصورت و مقبول ناول

بے خیر خوبصورت و مقبول ناول 300/ * لاماسٹیل * عبداحمد 180/

* اک دیا جلائے کھنا ماما ملک 300/ * شہر دل کے دروازے شادی چوہڑی 250/

چادوں ناول ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ فوری

خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفسٹ پیپر

شائع ہو گئے ہیں

آج ہی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں

37 آرڈو بازار، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون 2216361

”ہست اچھی بیٹی ہو تم۔ خدا کا احسان ہے مجھ پر جو اس نے تمہیں یہاں میرے پاس بھیج دیا۔“
 ”میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی ای۔ جی۔ اس نے مجھے ماں بھائی بہنیں۔ سب ہی کچھ دے دیا ہے۔“

منیوہ بیگم کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔

”تمہارا بھائی۔۔۔ کبھی تمہیں فون بھی نہیں کیا اس نے۔۔۔ کون سے ملک گیا ہے وہ؟“

انہوں نے اچانک ہی پوچھا تھا۔ ربیعہ کو تھوڑی دیر کے لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

”جی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی تب ہی فون کی بیل بجنے لگی۔ منیوہ بیگم چونک اٹھیں۔“

”دیکھو تو کس کا فون ہے۔۔۔ اور سنو۔ عبادیہ انبیقہ کا ہو تو میرے درد کے متعلق کچھ مت کہنا۔ وہ اپنے کام و ام چھوڑ کر چلے آئیں گے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”جی اچھا۔“ ربیعہ ناچار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کرنے سے نکلی تھی۔

”ہیلو۔۔۔ اس نے فون اٹھایا۔“

”ہیلو۔۔۔ دوسری جانب دروہ تھی۔“ ربیعہ! کیسی ہو تم؟“

”ارے دروہ تم۔۔۔ وہ خوش ہو گئی۔“ میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ۔ پھر پھر ہی نہیں لگایا تم نے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا۔ اب تمہاری باری ہے۔“ وہ بولی۔

”پتا۔۔۔ چاد میں ضرور آؤں گی۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”یوں بھی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”ربیعہ! تم نے اس دن یونیورسٹی میں رافع سے بکس کا کہا تھا نا۔؟“

”ہاں رافع دے گئے تھے مجھے میرے پاس ہی ہیں۔ تمہیں چاہیے تو یہ فون میں بنا رہی ہوں۔ تم مجھ سے لے لیتا۔“

”ہوں۔“ دروہ جیسے چونکی تھی۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔ میں پھر دروہ سری بکس ایڈوکیٹروں کی۔ اچھا خدا حافظ۔“

اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا تھا۔ ربیعہ کو بے حد حیران ہوئی۔ اس نے ریسور کو حیرانی سے دیکھا اور کریڈل پر رکھ دیا۔

”چو لے پر کچھ چڑھایا ہوا ہو گا منیڈم نے۔ وہی یاد آگیا ہو گا۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

ہوا میں خنکی برہ گئی تھی۔ گیلری میں کھڑی شہلا کو سردی سی محسوس ہوئی لیکن وہ پھر بھی کھڑی رہی۔ باریک پنک ٹائی خنکی کا بردھتا ہوا احساس دبانے میں ناکام ہو رہی تھی لیکن شہلا کو وہاں کھڑے ہو کر بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔

رات کے دوسرے پہر کی گہری خاموشی ٹھنڈی ہوا اور ہر طرف پھیلا ہوا اندھیرا تاروں سے اپنے مسائل ڈسکس کرنا سے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ صبح اسے جلدی ہاسپٹل پہنچنا تھا پھر بھی وہ سونا نہ چاہتی تھی۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلنے کی تھوڑی سی آواز ہوئی اور ہاشم نے باہر جھانکا۔

”شہلا۔۔۔ اسے شہلا کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔“

”جی۔۔۔ اس نے چند لمحوں بعد مڑے بغیر کہا۔“

”تم یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو۔؟“ وہ بھی باہر ہی چلا آیا۔ ”اتنی رات گئے!“

”بس۔۔۔ یونہی۔۔۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ”نیند نہیں آ رہی تھی تو میں۔۔۔ کچھ دیر کے لیے یہاں آئی۔۔۔ تازہ ہوا۔ اچھی لگ رہی ہے۔“

ہاشم اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ شہلا کے مخصوص پرفیوم کی مدھم سی مہک اس نے سانس کھینچ کر اپنے اندر اتاری پھر اس نے آہستگی سے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

”نیند نہیں آئی تو کسی کے ساتھ مل کر بھی جاگ سکتے ہیں۔ تم ہمیشہ اکیلے ہی جا گئے پر اصرار کرتی ہو۔“

اس کی آواز میں محبت، نرمی اور پیار بھرا بلاوا تھا۔ شہلا کے لیے یہ بے حد مانوس انداز تھا۔ اس نے ہاشم کو ہمیشہ اتنا ہی نرم اور محبت سے بھرا ہوا پایا تھا۔

لیکن نجانے کیوں اس وقت دل تنہائی مانگ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاشم کا ہاتھ بٹایا۔

”ہاشم۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔“

ہاشم کچھ دیر خاموش رہا۔

”او۔۔۔ پھر وہ بولا۔“

چند لمحوں بعد وہ مڑ کر اندر چلا گیا۔ شہلا کا دل عجب خجالت میں مبتلا ہوا۔ شاید اس نے ہاشم کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ وہیں کھڑی چند لمحے پیشتر والی صورت حال پر غور کرتی رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے واقعی ہاشم کے نرم جذبوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ گفٹ کا احساس برہماتو وہ مڑ کر اندر چلی آئی۔

یہ ایک ہی دیر کی گئی تھی۔ ہاشم بیڈ کی اس سائیڈ پر بیٹھا ہوا تھا جہاں شہلا سوئی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول دی تھی۔

شہلا کو اندر آتا دیکھ کر اس نے دروازہ بند کر دی۔ شہلا آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے قریب جا بیٹھی۔

UnPhoto.com

”ہاشم۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”ہوں۔“ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

سائیڈ ٹیبل کی دودھیا روشنی میں ہاشم کی بے ریا شفاف نگاہوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ شہلا کا دل مزید دکھ گیا۔ اس نے ہاشم کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

”ہاشم۔۔۔ آئی ایم ویری سوری۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں۔۔۔ میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔۔۔ لیکن ہر مرتبہ زیادتی کر جاتی ہوں۔“

ہاشم اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”شہلا۔۔۔ وہ عجیب انداز میں بولا تھا۔“

”جی۔۔۔“

”یہ کیا ہے؟“

اس نے اپنی نڈ مٹھی کھول کر اس کے سامنے پھیلائی۔ شہلا کا دل لمحہ بھر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ گولیاں۔۔۔ یہ تم کھاتی ہو؟“

شہلا خاموشی سے شیشی دیکھ رہی تھی۔ مانع حمل گولیاں وہ اوپری دراز میں ہی رکھتی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں

اس کی جھکی ہوئی نظریں پھر اٹھ نہ پائی تھیں پھر بھی اس نے ہاشم کی نگاہوں سے برستی شکایت اور بے اعتباری کو محسوس کر لیا تھا۔

”شہلا! کافی دیر خاموش رہ کر وہ بالآخر بولا۔ ”تمہیں تم اگر۔۔۔“

شہلا نے گھبرا کر نظریں اٹھا لیں۔ ہاشم کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

”فکر مت کرو شہلا!“ وہ ایک بار پھر بولا۔ ”آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”ہاشم! نہ جانے کیوں اس کا دل جیسے رکا تھا۔

ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے رویں رویں میں ایک اضطراب کی کیفیت پنہاں تھی۔

”ہاشم!“ شہلا نے بے تاب ہو کر اسے پکارا۔

وہ کھٹکے کھٹکے قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”ہاشم! میری بات سن۔ فار گاؤں تک۔“ شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاشم رکنا نہیں تھا وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ شہلا مضطرب ہو کر دروازے تک گئی پھر واپس

ٹھہر گئی۔ ہاشم اس وقت غم و غصے کی جس کیفیت میں تھا اسے نہ چھوڑنا ہی بہتر تھا۔ وہ اس وقت اس کی بات نہ

دھنک سے سن سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے بے بس سی ہو کر بیڈ پر

گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اپنا چکراتا ہوا سر اس کے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ تقدیر کے برزخ شور مچانے

دریا کی لہروں پر وہ خود کو بے آسرا تنگے کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک انتظار درجے کی بے چینی بے بسی اور

اضطراب کا مقابلہ کرنے کے بعد اس نے خود کو ٹوٹا ہوا ٹکڑا کر تھام لیا۔ کیونکہ اس کی دماغی کھول کرینڈر کی کھول کی تیش

نکالی۔ وہ گولیاں پانی کے ساتھ نکل کر اس کے دل کے اندر لپکتی رہیں۔ تب ہی اس کی نگاہ سامنے

کارپٹ پر گری اس تیشی پر پڑی جو ہاشم وہاں پھینک کر گیا تھا۔

”فکر مت کرو شہلا! آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

اس کے الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ شہلا نے جھک کر تیشی اٹھائی۔ کچھ دیر اسے دیکھ

رہی پھر اس نے وہ تیشی ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

وائٹ ٹریک سوٹ میں ملبوس، تمہما تا چہرہ لیے وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ پاس سے گزر گئے ہوئے ملازم کو دیکھ

تھا کر اور بجوس لائے کا کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نہاں ہو کر جس وقت وہ واش روم سے برآمد ہوا، بیڈ پر بے نیازی سے بیٹھی ہوئی فریحہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

”آپ کا اور بجوس۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔

”بڑی تکلیف کی آپ نے۔“ اس نے شرارتاً اس کے کاندھوں پر تولیہ ڈال دیا۔

”چھوٹی مولیٰ تکلیف تو آپ دیتے نہیں ہیں نا۔“ اس نے بھائی کو گھورتے ہوئے اٹھ کر تولیہ جگہ پر ڈالا۔

”ڈیش ڈائنٹ۔“ وہ بیڈ کمرے سے جوس پینے لگا۔ ”آرمی کو کام بڑا ہی کرنا چاہیے۔“

”اچھا۔ تو یہ فرمائیے کہ ایک بے حد بڑا اور اہم کام کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟ اسی چاہتی ہیں

جلد از جلد آپ کے فریضے سے سبکدوش ہوں یا کس۔“

اس نے بات اور چھوڑ دی اور مسکرائی۔

”آں۔۔۔ گہری سوچ میں ڈوبا فراز چونکا۔ ”ناکہ کیا؟“

”ناکہ میری باری آئے۔“ اس نے بیٹھی رکھائی۔

”شرم کرو لڑکی!“ فراز نے مسکراہٹ روک کر اسے گھورا۔ ”بڑے بھائی کے سامنے ایسی باتیں۔۔۔ اور پھر مسکرا

بھی رہی ہو؟“

”جیسے بڑے بھائی جب فتنیں کر کے پسند کی لڑکی دکھائے اس سے زیادہ فتنیں سما جتیں کر کے منگنی رچائے۔

منجھتر کو یون پر بلوانے کے لیے آئیں کریم اور سوپ کی پیش کش کرے تب کچھ نہیں اور میں نے صرف امی کا پیغام

صراحت سے پہنچا دیا تو بے شرمی کا لیبل فنانٹ فٹ کر دیا تو بے پروائی سے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

”ویسے اصل بات آپ گول کر گئے یہ کہہ سکتے تھے کہ شادی کے لیے کون سا مہینہ اور تاریخ رکھی جائے؟“

اس نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے بھائی کا چہرہ غور سے دیکھا۔

”ہوں؟“ وہ پھر چونکا۔ ”تم۔۔۔ ننھی فاختہ زیادہ فکر مت کرو۔ اس موضوع پر میں امی سے خود بات کر لوں

”کیا بات کریں گے؟“ وہ اب بھی۔ ”اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہیں؟“

”اب تم جاؤ۔“ وہ ریموٹ سے ٹی وی پر آن کر تے ہوئے بولا۔

”سوچ لیں۔ اب میں فون پر ناعمہ کو نہیں بلواؤں۔“ وہ تب کر کھڑی ہوئی۔

”ڈونٹ ڈری۔ اب ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ مطمئن تھا۔

”ہائیں آپ کو ہوا کیا ہے؟“

”ناعمہ! اگر مجھے آپ امی کی سخت ضرورت ہے اور بھائی کی بھی۔ تاؤ۔۔۔ پلیز۔۔۔ لیوی الون۔“ اس کے پرسکون

نستلے سے سچے سچے پھر وہ سیدھے نکل۔ فریحہ کا اٹھا ہوا

”اچھا۔ پھر امی سے بات کر لیں۔ میں چلی۔“

”تھینکس۔“ وہ بڑبڑایا۔

Ph

چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے وہ کسی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ورنہ کمرے میں داخل ہوئی پھر چند لمحوں

کے لیے غم سی گئی۔

”آپ سوچ رہی ہیں؟“ ناعمہ بہت معصوم اور سادہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کا تاثر تھا اور

آنکھوں میں قدرے اداسی۔ ورنہ کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی تھی۔ ناعمہ کے اشتغراق میں فرق نہ آیا۔ ورنہ

مسکرائی اور کشمکش داری۔ تب وہ چونکی۔

”اڑے آپ۔۔۔ دھل گئے آپ کے کپڑے؟“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

”صرف میرے نہیں آپ جناب کے کپڑے بھی دھل گئے ہیں۔“ ورنہ نے طنزاً کہا۔

”جب آپ کی شادی ہو جائے گی تب تو مجھے ہی دھونا پڑیں گے کپڑے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”جیسے آپ سے پہلے رائے آلی کی ڈیوٹی تھی۔“

”ہاں۔“ ورنہ نے فراغت سے بیٹھتے ہوئے ہنڈلوں اور ہاتھوں پر ملنے لگی۔ ”ویسے محترمہ۔ ناعمہ علی

خانم۔ آپ کو نوید ہو کہ مجھ سے پہلے امی آپ کو سسرال بھیجنے کی فکر میں ہیں۔ سنا ہے پچھلے دنوں آپ کی ساس

صاحبہ کا فون آیا تھا وہ اس سلسلے میں امی کا عندیہ لینا چاہ رہی تھیں۔“

”اگر عرشہ کی بات متنی سے نکاح تک نہ پہنچی ہوتی آپ! اتوا بھی بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا لیکن اب۔۔۔ اب کچھ ہو سکتا۔“

”آخر اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔“ ورہ سے رہانہ گیا۔ ”ناعملہ! تم کئی دنوں سے بہت ڈسٹرب ہو۔ کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ کوئی مشورہ ہی دے سکوں۔“

”ماموں اور نمانی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا آلی!“ ناعمہ نے سرد آہ بھری۔
 ”والدین بھی کبھی کبھار کیسے کیسے غلط فیصلے کر جاتے ہیں۔“ اگلی آدورہ نے بھری تھپی پھروہ چونک اٹھی۔

”لیکن۔۔۔ لیکن ناعمدیہ ہمیں فراز کی غلط فہمی ضرور دور کر دینی چاہیے۔ کہیں وہ سزا کے چکر میں پڑ کر کچھ ایسا نہ کر بیٹھے۔ اسے بتا دو کہ تمہارے لڑکی نہیں ہو۔“

”نہیں بے لیں، پہلے میری سوچا ہے“ ”آپ!“ پھر وہ بولے۔ ”اگر میں اس سے یہ کہتی ہوں، تب وہ یہ جاننے پر اصرار

ہاں تو بتا دے۔ ”ناعمہ نے وردہ کو غور سے دیکھا اور دھیمے سے مسکرا دی۔

نماں ہے۔ اتنا عرصہ آپ سب لوگ مجھے بید ہو، کم عقل اور نجانے کیا کچھ کہتے رہے میرا خیال ہے کہ اچھی بھلی عقل مند ہوں آپ! عریضہ نافع کی بیوی ہے، اس کی عزت اس کے حوالے سے ہمارے پورے

ان کی عزت، نافع عباد اور فراز کا دوست ہے۔ میں نے انفراد کو یہ بات بتادی تو اس کی نگاہ میں نافع کی بیوی کی کیا

پھر ناعمہ؟“

”نعم!“ ویرود و تھک سے رہ گئی۔ ”وہی وہی ہے؟“

وہ ناعملہ ناعملہ "وہ رویت غریبہ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ رَفَعَ رَأْسَهُ فِي حَقِّهِ فَقَدْ كَفَرَ" (جو شخص اپنے آپ کو بڑھاتا ہے، وہ کفر کا مرتکب ہو گیا)۔

”تو واقعی بہت عقل مند ہو۔“ ورد نے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ”تمہارے سامنے یہ خاکسارزانوئے ادب

دل بہنیں کچھ شوخی، کچھ اداسی سے مسکرا دی تھیں۔

بابا بات ہے؟“ ربیعہ نے پیار سے عمر کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھا۔ ”آج تم نے نہ نوڈلز ک

ی نہ فکری کی۔ لان میں سائیکل بھی نہیں چلائی۔ یوں منہ لٹکا کر کیوں بیٹھے ہو۔“

بات ہے کہ یہ جلیعت تو بھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے خالہ جانی۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔

”اور اس ہو؟“

”ہاں ہوں تو۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”مما یاد آ رہی ہیں؟“ ربیعہ نے آہستگی سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں یکایک ہی آنسو ابھرے وہ انہیں پینے کی کوشش کرنے لگا۔ ربیعہ کو اس چھوٹے سے معصوم بچے پر بے حد پیار آیا۔ اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”عمریہ“

”خالہ جانی! مجھے ممایا د نہیں آ رہی۔“ وہ اس سے علیحدہ ہوا۔ ”میں اب مما کو بالکل یاد نہیں کرتا۔ مما مجھے چھوڑ کر ہاشم انگل کے گھر چلی گئیں۔ اب وہ مجھ سے روز ملنے بھی نہیں آتیں۔ حالانکہ انہوں نے مجھ سے پراس کیا تھا۔“ ربیعہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”میں تو اب صرف پیما کو یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے لینے آئیں گے۔ ابھی تو وہ اپنے ضروری کاموں سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”آپ کو ہم لوگ اچھے نہیں لگتے؟“ عمریہ نے پوچھا۔ ”آپ کی نانہ؟“ خالہ نے جواب دیا۔ ”ہم سب کتنا چاہتے ہیں آپ کو۔“

وہ اس کے بالوں کو سلاتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں۔“ اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ ”میں بھی آپ سب سے بہت پیار کرتا ہوں اور۔۔۔ اور مماس بھی۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر رہا تھا۔

”پچھلے آپ ہم سب کو چھوڑ کر جانے کی بات کیوں کرتے ہو؟“

”اس لیے خالہ جانی! کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ یہ گھر نانہ کا ہے۔ میرا گھر وہ ہے جو میرے پیما کا ہے۔“

ربیعہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”اتنی سی عمر میں اتنی بڑی باتیں کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے بڑے ہو کر تم ضرور سائنس دان بنو گے یا کوئی بڑے فلسفی۔“ وہ لہجہ بذل کر بات بھی بدلنے لگی۔

عمر پر اس کی بات کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا وہ پھر سے کچھ سوچنے لگا۔

”اچھا۔۔۔ ایسا کرتے ہیں۔۔۔ سامنے پارک میں چلتے ہیں۔۔۔ میں تو بہت دنوں سے نہیں گئی اور میرا خیال ہے کہ بھی گھر میں بور ہو رہے ہو؟“ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں میں تو بور نہیں ہو رہا۔۔۔ ویسے اگر آپ کو اسی کتے سے ڈر لگ رہا ہے تو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔“

ربیعہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو روکا تھا۔ کتا تو گویا باہر اسی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

”ہاں سچ عمریہ۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے واقعی اکیلے جاتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ تم پلیز میرے ساتھ چلو نا۔“

”چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اپنا بیٹ لے آؤں۔ وہاں میرے دوست کرکٹ کھیل رہے ہوں گے۔ میں بھی تھوڑا سا کھیل لوں گا۔“

”تھوڑا سا کیوں اتنا سارا کھیلنا۔“ ربیعہ نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلائے تھے۔

پارک میں واقعی عمر کے کئی ہم عمر بچے کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے انداز ہی بدل گئے۔ وہ ایک چھوٹے سے بچے کی ساری خوشی اپنے چہرے اور مسکراہٹ سے چھلکا تاں کی طرف لپک گیا تھا۔ ربیعہ مسکراتے ہوئے ایک سچ پر جا بیٹھی۔

”ہیلو۔“ دوستانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ ربیعہ بے طرح چونکی۔

”ارے آپ۔۔۔“ رافع کو دیکھ کر اس کے اندر کون سا جذبہ ابھرا تھا وہ سمجھ نہ پائی یا شاید اس نے جان بوجھ کر اس جذبے سے نظرس چرائی تھیں۔

”کئی دن کے بعد دیکھا۔۔۔ اک شخص۔۔۔“ وہ منہ ہی منہ میں گنگنایا۔

ربیعہ سمجھ کر بھی نا سمجھی سے مسکرائی۔ رافع بچ کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

”آپ تو بہت ڈر پوک نکلیں ربیعہ۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”آنا ہی ترک کر دیا اس جاذبہ کے بعد۔۔۔“

”جی۔۔۔“ اس نے سر جھکا دیا۔ ”سمجھ دار لوگ حادثات سے بچ کر چلتے ہیں۔۔۔“

رافع چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے جیسے نہ معنی بات سمجھ سکے۔ اصل معنی پر غور کیا تھا۔

”آپ کا خیال خیال ہے ربیعہ!“ پھر وہ بولا۔ ”جو لوگ حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب ہے جان بوجھ کر غلطی نہ کی جائے تو عقل مندی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بے سوچے سمجھے دل غلطی کر رہے ہیں۔“

”جی؟“ اس نے حیران ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

”آپ۔۔۔ دل کی غلطیوں پر یقین رکھتی ہیں ربیعہ؟“ رافع اسے اتنی گہری اور بھرپور نظر سے دیکھ رہا تھا کہ ربیعہ چند لمحے بھی ان آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔ اس کی پلکیں بے اختیار اس کے رخساروں پر آگری تھیں۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ رافع اس چہرے کی دلکشی کے سحر میں گرفتار ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا۔۔۔ کیا جواب دوں؟“ اسے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

”ایک غلطی کی ہے دل نے۔۔۔ جاننا چاہتا ہوں کہ واجبِ تعزیر ہوں یا بے اختیار قرار دوں۔“

گاہ کہہ رہے۔۔۔ جو بھی آپ کہنا چاہیں۔۔۔“

ربیعہ دور کھینچے عمر کو دیکھنے لگی تھی۔

”بڑا یا سزا کا اختیار مجھے نہیں ہے رافع! غور کیجئے، جرم اگر ثابت ہو جائے تو کس کے گناہ گار ٹھہریں گے؟“

آپ۔۔۔ پھر وہ گہرے لہجے میں بولی۔

رافع بہت دیر تک کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا۔

”دل۔۔۔ اپنی پسند کا کھرا چاہے تو؟“ پھر وہ قدرے آزر دگی سے بولا۔

”کھڑے اور منصف دل کی پسند کے تابع تو نہیں ہوتے نا۔“ وہ مسکرائی۔

رافع کو اس کی مسکراہٹ ڈوبے سورج کی آخری کرن کی مانند لگی تھی۔

عمر نے رافع کو وہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ وہ بیٹ گھماتا، دوڑتا چلا آیا۔

”آہا۔۔۔ رافع انکل۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔“

”و علیکم السلام۔۔۔“ نتیجہ۔۔۔“ رافع نے اسے چوما۔

”اب آپ خالہ جانی سے شادی مت کر لیجئے گا۔“ اس نے منہ بنایا۔

ربیعہ اس کی بات پر دھک سے رہ گئی تھی جبکہ رافع بے حد حیران۔

”کیا۔۔۔ کیا مطلب؟“ وہ اسی حیرانی سے بولا۔

”مطلب یہ کہ جب بھی میں اور مہیا پارک میں آتے تھے، ہمیں یہاں ہاشم انکل مل جاتے تھے پھر انہوں نے مہیا سے شادی کر لی۔ اب خالہ جانی آتی ہیں تو آپ ملتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ آپ بھی خالہ جانی سے شادی کر کے انہیں اپنے گھر لے جائیں۔“

”عمم۔۔۔“ ربیعہ کھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم بہت عجیب باتیں کرنے لگے ہو۔ چلو گھر۔۔۔“

”یہ نہ سمجھو۔۔۔“ رافع کی گنگناہٹ ہر چند کہ بہت مدھم تھی پھر بھی ربیعہ نے اسے بخوبی سنا تھا۔

اس نے جلدی سے اسے چاہنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

”بیٹے! چلو میرے ساتھ۔۔۔“ رافع نے عمر کو پکارا۔ ”اپنی مہاسے مل لو۔“

عمر کی نگاہوں میں چمک اے اتری تھی جیسے اندھیرے میں جگنو چمکے پھر یک لخت وہ مرجھا سا گیا تھا۔

”نہیں انکل!“ وہ بولا۔ ”مجھے تو کل کے میسٹ کی بیٹیا پر بھی کرنی ہے اور۔۔۔“

”اور کیا؟“

”اور مہیا کی ساس مجھے پسند نہیں ہیں۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کر ربیعہ کی انگلی تھام لی تھی۔ ربیعہ جزبز ہوئی۔ رافع زور سے ہنس رہا تھا۔

UrduPhoto.com

وہ آئینے کے سامنے کھڑائی کی ٹاٹ باندھ رہا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ہاشم نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”ہاشم! میں۔۔۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔“ شہلا کی زبان اٹکنے لگی۔

ہاشم کی نظر نے ایک ساعت کو اپنے دلکھا پھر وہ ہیر ریش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔

”ہاشم! جو آپ سمجھ رہے ہیں۔۔۔ بالکل غلط ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ چاہتی ہوں کہ آپ میری بات سن لیں۔“

شہلا افسوس کے عالم میں انگلیاں چٹکاتے ہوئے بولی۔

”دراصل ہاشم! میں صرف عمر کے لیے فکر مند تھی۔ میں ایسا نہیں چاہتی ہاشم! کہ میں دوبارہ ماں نہ بنوں۔ بخدا میں ایسا نہیں چاہتی۔“

ہاشم آئینے کے سامنے سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سامنے رکھے بریف کیس کو کھول کر وہ اپنی فائل اور ضروری کاغذات اس میں رکھنے لگا۔ شہلا اس کے قریب آ بیٹھی۔

”ہاشم! میں عمر کی حیثیت کا تعین چاہتی تھی اور بس۔۔۔ میں۔۔۔ میں سوچتی تھی کہ ایک بار عمر کو ایک گھر۔ ایک جائز مقام مل جائے تب۔۔۔ تب میں دوبارہ ماں بنوں۔ بصورت دیگر وہ بہت کا پیلیکسڈ ہو جاتا۔ آپ۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔“

”شہلا!“ وہ بریف کیس بند کرتے ہوئے بے حد نرم لہجے میں بولا۔ ”میں نے آپ سے کسی بات کی وضاحت نہیں مانگی۔ آپ کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں ہاشم! آپ کے دل میں بدگمانی ہے۔“ وہ روبانسی سی ہوئی۔

”گناہ دل میں ہو تو گناہ نہیں ہوتا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”عمل میں در آئے تب اس پر بات ہو سکتی ہے۔“

اس نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ شہلا اس کے پیچھے لپکی۔

”میں نے جو کچھ آپ سے کہا“ آپ کو اس پر یقین نہیں ہے ہاشم؟“

ہاشم کھڑکیا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا اور دھیس سے مسکرایا۔

”یقین تو آپ نے میرا نہیں کیا شہلا! دکھ تو صرف اس بابت کا ہے۔ اپنی وسوسے۔ طے شدہ بات پر مزید کیا باز

کی جائے؟ میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ خدا حافظ۔“

وہ باہر نکل گیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ ہاشم کا انداز مخاطب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ ”آپ“

”تم“ تک کا فاصلہ اس نے خوش رنگ تمناؤں کے سہارے طے کیا تھا اور اب وہ واپس پلٹ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔“

شہلا کو چکر سا آیا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ ہاشم اس سے بدگمان ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا نہ تھا لیکن اب

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ واقعی ایک طے شدہ بات تھی۔

”مممم“ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ”میں آسکتا ہوں۔“

ریحانہ بیٹھ گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں پر رکھا ہوا بازو ہٹایا۔

”ہاں! آؤ فرانسہ اندر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی“ اس لیے نیند بھی نہیں آئی۔ ”فراز نے تلے قدر

اٹھا تا اندر آیا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ریحانہ نے ہاتھ لگا کر کہا۔ ”فراز! میں نے ناعمہ کی ماں سے

شادی کی بات کی تھی کہ آیا وہ درود سے پہلے ناعمہ کی رخصتی کر دیں گی یا پھر ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے خوش

ہے کہ وہ ایک سچے وار خاتون ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ناعمہ کا ہاتھ ہمیں دے دیں گی۔ سب بھی ہم چاہیں

تم سن رہے ہونا؟“

فراز جو کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا ایک لخت چونکا۔

”جی۔ سن رہا ہوں۔“

”دراصل بیٹا! میری طبیعت تمہارے سامنے ہے۔ کبھی دن کی طرح بالکل تازہ اور روشن ہوتی ہے تو کبھی رات

رات سی تاریک۔ مجھے خود اپنا اعتبار نہیں۔ میں چاہتی ہوں جلد از جلد تمہارے سر پر سہرا سجا دیکھ لوں۔ کیا باز

ہے فراز! تم کہاں کھوئے ہوئے ہو۔ میں اتنی اہم بات کر رہی ہوں اور تم دھیان ہی نہیں دے رہے ہو۔“

”نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سب سن رہا ہوں لیکن بات یہ ہے امی کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا

ہوں۔“

”ہوں۔ یہ مت کہنا کہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کو۔“ وہ سائیڈ میز

سے اپنا چشمہ اٹھا کر نرم کپڑے سے صاف کرنے لگیں۔

فراز نے ایک نظر اپنی بہت عجیب محبت کرنے والی لیکن قدرے سخت گیر ماں کو دیکھا۔ اپنی اولاد میں سب

زیادہ وہ اسے چاہتی تھیں لیکن ان سے بات کرتے ہوئے ایک حد فاضل قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا تھا۔ البتہ

فریح سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے اس چیز سے مستثنیٰ تھی۔ وہ ان کی لاڈلی تھی اور ان سے ہر بات شیئر کر

کرتی تھی۔

”وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”اس وقت سے ڈرجب وقت سمجھانے پر اتر آئے۔ ابھی تو ماں بد نصیب ہی سمجھا رہی ہے۔“

”چھوڑیں آپ میرے حال پر چھوڑیں مجھے۔“ اس نے گالوں پر اتری نمی صاف کی۔
 ”یہ بتائیں چائے بناؤں آپ کے لیے۔ کتنے دن کے بعد آپ کو میرا خیال آیا ہے۔ آپ تو مجھے ماں کم اور ساس زیادہ لگتی ہیں۔“

”میں نہیں پتی چائے۔“ انہوں نے خفگی سے سر جھٹکا۔ ”ماں کی ممتا پر تو شک مت کر شوہر پر تو جو کیا سو کیا۔“
 ایقان نیم دلی سے مسکرائی۔ اسی لمحے فون کی بیل بجی۔ ایقان کا دل دھڑکا۔ یہ وقت تو عاشق کے فون کا تھا۔ مومن کے اسکول سے آ جانے کے بعد وہ کبھی کبھار فون پر اس سے اور ایمان سے بات کرتا تھا۔ مومن نہار ہا تھا اور نہ وہ بیل سن کر دوڑتا بھاگتا چلا آتا تھا۔ ایقان ٹھس سی بیٹھی رہی۔

”فون کیوں نہیں اٹھاتیں؟“ شفیقہ حیات نے ناگوار سی پوچھا۔
 ایقان نے سانس بھری۔ بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا۔
 ”ہیلو۔“ اس نے اپنے دل کی دھڑکن اپنی سانسوں میں محسوس کی۔
 ”ہیلو۔“ دوسری جانب عاشق ہی تھا ”عاشقیاں کر رہا ہوں۔“
 ”ہوں۔ مومن نہار ہا ہے۔“ وہ شفیقہ حیات پر طاہر نہ کرنا چاہتی تھی کہ فون کس کا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ایقان کی پتیلیاں بھگنے لگیں۔ دل کی حالت اسے بتا رہی تھی کہ اس شخص سے کیسے کیسے باتیں تھیں۔ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔
 ”کچھ دیر بعد کر لیتا۔“ وہ استغنی سے بولی۔
 ”نجانے کیا بات تھی شفیقہ حیات کے سامنے بات نہ کرنا ہی بہتر تھا۔“
 ”ہوں، ٹھیک ہے۔“ وہ جیسے سمجھ گیا۔

لائسنس کنکٹ ہوئی تو ایقان نے بے جان ہاتھوں سے ریسور رکھ دیا۔ وہ مڑ کر واپس آئی تو اسے احساس ہوا کہ شفیقہ حیات پوری طرح چوکنی تھیں۔
 ”کس کا فون تھا؟“ انہوں نے بے تالی سے پوچھا۔
 ”مومن کے دوست کا۔“ وہ بستر کی چادر ٹھک کرتے ہوئے اپنے تاثرات چھپانے لگی۔
 ”اچھا۔“ وہ مایوس ہو کر کچھ سوچ میں ڈوب گئیں۔ ”عاشقیاں! کبھی فون تو کرتے ہوں گے؟“
 ”جی؟“ ایقان چونکی۔ ”ہاں کرتے ہیں کبھی کبھار۔“
 ”اچھا۔“ انہیں جیسے خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ ”کیا کہتے ہیں؟“
 ”کیا پتا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”مومن اور ایمان سے ہی بات ہوتی ہے۔“
 ”کبھی تم سے بات نہیں کی؟“
 ”نہیں۔“ وہ بے رخی سے بولی۔
 شفیقہ حیات مایوس ہوئی تھیں۔



منیزہ بیگم کو دو آئی دے کر وہ کمرے سے نکلی تھی تب ہی باہر گاڑی کا ہارن بجا اور چند لمحوں بعد ہی ڈور بیل

”کیونکہ بیٹا!“ منیوہ بیگم بولی تھیں۔ ”میں جانتی ہوں کہ قانوناً تم ہی عمر کے اصل حق دار ہو۔ ہم لوگ تمہیں کسی طور اسے یہاں سے لے جانے سے نہیں روک سکتے لیکن اگر تم ہم پر ترس کھا کر دماغ کے بجائے دل سے سوچو۔ تو تمہارے لیے تمہارا فیصلہ تمہیں نامناسب لگے گا۔ وہ ہم لوگوں سے بہت اچھا ہے۔ نہیں رہ پائے گا ہمارے بغیر اور۔ اور ہم سب عمر کے بغیر۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”آئی۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”کیا شہلا کی شادی سے پہلے کوئی سوچ سکتا تھا کہ عمر شہلا کے بغیر وہ پائے گا یا شہلا عمر کے بغیر رہے گی؟ نہیں نا۔ یہ تصور ہی بے معنی لگتا ہو گا خصوصاً ”شہلا کو لیکن اب آپ دیکھیں“ دونوں نے اس جدائی کو ایک زندہ حقیقت کی مانند قبول کر لیا ہے۔ یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں۔ سو کھنا یہ ہے کہ بیچ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے بیٹے کو میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ ثانی اور راموں کے پاس رہنا مناسب نہیں جبکہ ماں باپ حیات ہوں، بچے کو ان باتوں کا احساس نہیں ہو سکتا لیکن آہستہ آہستہ وہ یہ سب اکورڈ فیل کرے گا۔ لوگوں کے سوالات اس کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیں گے اور ایک دن وہ ہم سب سے یہ سوال کرنے میں آئے گی۔ ”ابا، آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کے باپ کے ہوتے ہوئے وہ آخر اپنی نانی کے گھر کیوں رہتا ہے؟ ابھی اسے آپ لوگوں سے پیچھے رہنے میں تھوڑی تکلیف تو ہوگی لیکن آخر کار وہ اس تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول کرے گی۔“

منیوہ بیگم خاموش رہ گئیں۔ دکھ کی گہری پرچھائیں ان کے چہرے پر تھیں۔ وہ عمر کو اس طرح چاہتی تھیں جیسے وہ ان کا نواسہ نہ ہو۔ سب سے چھوٹا بے حد ڈرنا بیٹا ہو۔

”میں جانتا ہوں آئی! اس کی جدائی وقتی طور پر آپ سب ہی کو شاق گزرے گی لیکن اس میں عمر کا مستقبل اس کی بھلائی پوشیدہ ہے“ اس لیے اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لیں پلیز۔“

”ابا، اگر آپ جانتی ہوں۔“ وہ آنرز دی گئی۔ ”تمہاری باتوں کی نفی بھی نہیں کر سکتی لیکن اپنی محبت سے کیا توں؟“

”آئی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے یقیناً نانی نہیں ماں بن کر پالا ہے اسے لیکن یقیناً جانیں میں اسے آپ سے جدا نہیں کروں گا۔ وہ اسی طرح آپ سے ملا کرے گا۔ اس کا صرف گھر تبدیل ہوگا۔“

اس کے لہجے میں نجانے کیسا اطمینان تھا۔ ربیعہ کو کسی گہرائی کا احساس ہوا۔

”اور جب آپ داوی نہیں گی تو ان بچوں کی قلقاریوں میں ساری اداسیاں کھو جائیں گی۔ آپ کو یہ سب یاد بھی نہ رہے گا۔“ وہ شائستہ لہجے بولا۔

منیوہ بیگم اور ربیعہ خاموش تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں کل تمام اگر اسے لے جاؤں گا۔ اب اجازت دیجئے۔“

وہ کمرے سے نکل گیا۔ منیوہ بیگم نے صوفے کی پشت سے سر نکا دیا ”ان کی آنکھوں سے آنسو تو اتارے بہہ رہے تھے۔ ربیعہ نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ لیے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تسبیح کرتی شفیقہ حیات نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھا۔

”جلد ہی سارا اثر میری پیشانی میں داخل کر دیجئے پھر آپ کو خوش خبری سناں ہوں۔“

شفیقہ حیات نے اس کی پیشانی پر دم کیا پھر پیشانی چوم لی۔

بھی۔ ربیعہ نے لاؤنج میں لگی دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ یہ وقت ایسا تھا جب شاوہ نادر ہی کوئی آیا کرتا تھا۔ لاؤنج کا مرکزی دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی تب اس نے دیکھا۔ لکڑی کے گیٹ کے دوسری جانب ابرار جیلان کھڑا تھا۔ ربیعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مڑ کر اندر چلی آئی۔

”آئی!“ اس نے دھیرے سے منیوہ بیگم کو آواز دی۔

”ہوں۔“ وہ غنودگی کے عالم میں تھیں۔

”باہر عمر کے کیا آئے ہیں؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکیں اور بیٹھ گئیں۔ ”کون ابرار؟“

”کیا کہتا ہے؟“ ان کے چہرے پر از حد پریشانی نمودار ہوئی۔

”پتا نہیں کس مقصد سے آئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں اندر نہیں بلایا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے سوچتی رہیں پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”دیکھتی ہوں بات تو کرتی ہی ہوگی ربیعہ۔“

ربیعہ نے ابرار کے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اور لا کر بیٹھا دیا۔

”آپ کی تعریف؟“ وہ پوچھے بنا رہ نہ سکا۔ ”پہلے کبھی دیکھا نہیں آپ کو۔“

”ربیعہ۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اوس۔“ اس نے یاد آ کر مجھے عمر نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

ربیعہ نے لہجے کی شائستگی سے متاثر ہو کر قدرے غور سے اسے دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں اعتراف کے بنانے لگی۔

شہلا نے اگر اتنا برا قدم اٹھایا تھا تو یقیناً بے حد مجبور ہو کر اٹھایا ہو گا۔

ابرار ایک حد درجہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ وہ شاوہ نادر کے باوجود وہ نہایت کم عمر تو جوان نظر آتا تھا۔

براؤن جدید تراش خراش کے ٹوپس سوٹ میں وہ بہت جاذب نظر اور ہنڈ سم لگ رہا تھا۔ اس کے بالوں کا اسٹائل اس کی رست و راج اور بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی تھیں۔ ہر شے سے امارت اور جدید انداز نمایاں تھا۔

وہ ہولے سے کھنکھار ا۔ ربیعہ چونک اٹھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کھینچنے لگا ہے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ شائستگی سے بولی۔ ”میں آئی کو بھیجتی ہوں۔“

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے سوچا تھا۔ اتنا جاذب نظر منہ اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اپنے مگن ہو کر اسے دیکھنے کے خیال سے وہ شرمندہ بھی ہوئی اور اسے ہنسی بھی آئی۔

یہ سن میں اگر اس نے چائے کے لیے پانی لینے کو رکھا اور برتن نکالنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کتنا اچھا ہوا جو اس وقت عباد اور انفقہ دونوں ہی گھر پر نہیں تھے وہ دونوں قدرے جذباتی ہو کر سوچتے تھے۔ ان کی موجودگی سے کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔

چائے کی ٹرے لے کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ابرار اور منیوہ بیگم دونوں ہی خاموش تھے۔ ابرار کی خاموشی میں اطمینان تھا جبکہ منیوہ بیگم کے چہرے کا نقش نقش ان کے اضطراب کی داستان سنارہا تھا۔

ربیعہ نے چائے بنا کر دونوں کو دی۔

”تھنکس۔“ ابرار شائستگی سے بولا۔

UrduPhoto.com

”تمہیں دیکھنا ہی بڑی خوشی ہے بچے! ماں باپ کی نظر تو اپنے بچوں کو صرف دیکھنے سے ہی راضی رہتی ہے۔“ کوہا
کیا بات ہے؟“

رافع نے ان کے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگائے۔
”دادی جان! آپ بہت اچھی ہیں۔ خوشی کی خبر یہ ہے کہ میری نوکری پکی ہو گئی۔ اپائنٹ منٹ لیٹر لے آیا
ہوں۔“

”اے واہ! مبارک ہو بہت بہت۔“ ان کی ساری خوشی ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔
”تمہارے باپ کا بھی بوجھ ہلکا ہوا۔ بڑے بیٹے کے روزگار سے لگنے کی تو خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیکھ
پکواؤں گی۔ کیسی نوکری ہے؟“

”نوکری بہت اچھی ہے اماں۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”اس سینی میں پہلے بھی ایک مرتبہ ٹرائی
کر چکا ہوں تب کامیابی نہ ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں یہ میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا۔“
”ماشاء اللہ۔ تب ہی تو خوشی ایک ایک اواسے چھلک رہی ہے۔“ وہ ہنسیں۔ ”ماں کو بتایا؟“
”امی شاید پھپھو کی طرف گئی ہیں۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی بتایا۔
”راجہ کی طرف؟“

”جی ہاں۔“ اسے جیسے دادی کی گود میں نیند آنے لگی تھی۔
”اچھا رافع! باپ! سنو۔ یہ تمہارا ورہ سے شادی کے متعلق کیا ارادہ ہے؟ تمہاری ماں کچھ فکر مند ہو رہی
تھی۔“

انہوں نے بنا کسی پیش لفظ کے اچانک ہی اصل بات کا آغاز کیا تھا۔ رافع اس اچانک حملے پر چونک اٹھا۔
”امکھیں کھول کر دیکھو! کیا کہنا؟“ وہ عیناٹ ہو کر پوچھنے لگا۔
”امی! فکر مند کیوں ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ عیناٹ ہو کر پوچھنے لگا۔
”اے بچے! ماؤں کے دل تو یوں بھی بہت دھیمی ہو جایا کرتے ہیں۔ خصوصاً بیٹوں کے معاملے میں۔ ذرا
ذرا سی باتوں سے انداز میں لگایا کرتی ہیں۔ تم سے اس کی کیا بات ہوئی۔ یہ تو میں جانتی نہیں۔ تاہم وہ فکر مند ضرور
ہے۔ شاید تم نے ایسا کچھ کہا ہو۔“
وہ بات مکمل کر کے بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رافع نے اپنے تاثرات چھپا کر شوار ہونے لگا۔

”بھولنے کی! اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو مجھ سے کہو اپنی پریشانی؟“
”نہیں دادی!“ وہ مدھم مدھم سا گویا ہوا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ میں ابھی
شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی کرنے کو بہت کچھ ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا جلدی کس بات کی ہے؟“
”بڑے لڑکے ہوتے۔ جب باپ بنو گے تو یاد کرنا ان دنوں کو۔ ماں باپ کو کیسی آرزو ہوتی ہے ان لمحوں کو دیکھنے
کی۔ بہر حال تمہاری بات رکھ کر تم کو کچھ مہلت دے دیں گے ہم لیکن ہمیں اتنا اطمینان تو دلا دونا کہ ورنہ سے
شادی کرنے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

رافع نے ایک گہری سانس بھری۔ ایک نظر پورے دادی کی جانب دیکھا پھر لب چبائے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگا
تھا۔
”اگر میں آپ سے کہوں دادی!“ پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

”نہ جانے کیوں میرا دل اور دماغ کسی بھی بات پر متفق نہیں ہو رہے ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس وقت زندگی سے کیا چاہ رہا ہوں اور زندگی مجھ سے کیا چاہ رہی ہے؟ شاید یہ دونوں علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں اور میں اس چیز سے ذہن سرب بھی ہوں اور خوف زدہ بھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس صورت حال میں میں کسی سے بھی انصاف کر سکوں گا۔ اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فی الوقت میں شادی جیسی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا۔“

اس نے سر اٹھا کر شفیقہ حیات کی جانب دیکھا جو نظروں میں بے تحاشا تشویش اور الجھن لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی ہندلی بوڑھی آنکھوں میں بہت گہرائی تھی۔ رافع زیادہ دیر ان سے نگاہیں نہ ملا سکا۔

”رافع!“ انہوں نے کچھ دیر بعد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ”میرے بچے تو نے اس وقت میرے دل کا سب چین سارا قرار مجھ سے چھین لیا ہے۔ دیکھ بیٹے! دادی کو سچ سچ بتادے کیا تجھے کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے؟“ رافع خاموش بیٹھا رہا۔ چین اور قرار کی بات کر کے جب وہ یہ بات پوچھ رہی تھیں تو وہ کچھ بھی کہنے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔

”رافع!“ ان کی آواز بھیک گئی۔ ”میری بیٹی رابعہ بہت ظریف دلی، بڑے صبر والی بچی ہے، زندگی کی کھنکھنایوں کا اس نے بہت پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ خدا نے اسے تین بیٹیوں سے نوازا اس نے بہت خوش دلی سے اپنی بھول سی بچیوں کی پرورش کی۔ وہ دادی کی بہت عزت و محترم رہی لیکن کبھی کوئی حسرت کوئی شکوہ اس کے لبوں پر نہ آیا۔ شوہر کی بھرپور ثقافت اس سے چھوٹی۔ ہا۔۔۔ آہ! اس خدا کی بھڑکی نے بہت جلد خود پر اور حالات پر قابو ہانے کی اپنی پہچان کی۔ ایقان پر تو اس کے حوصلے اور صبر کا سایہ تک نہیں پڑا۔ خیر۔۔۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا! تم جو بوجھ خون ہو۔ ذہن کے بجائے زیادہ تر دل سے سوچتے ہو گے۔ یہی تمہاری عمر کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن میرے بچے۔ جو بھی فیصلہ کرو اپنی صبر والی پھپھی کے صبر اور حوصلے کو مت آزمانا اور پھر وردہ بہت پیاری بچی ہے۔ بات تین لڑکیوں میں سے اپنی ہان پر گئی ہے۔ اس میں بھی وہی ظرافت اور وسایا ہے اور اس کی عورت میں یہ دو خوبیاں جرم کہ ہوں وہ مرد کی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم میری بات سمجھ رہے ہوں یا نہ؟“

”جی! رافع جو نکا پھر اس نے ایک گہری سانس بھری۔ ”سن رہا ہوں دادی! سب سن رہا ہوں سب سمجھ رہے ہیں۔ آپ کیا سوچتی ہیں؟ ان میں سے کوئی بات ایسی بھی ہے جو میرے علم میں نہ ہو؟ شب جانتا ہوں میں۔ سب ب فکر رہے۔ میں اپنا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس سے کسی کو کوئی دکھ پہنچے۔ بس مجھے وقت درکار ہے دادی۔ زندگی اور زندگی کے مطالبات کو سمجھنے کے لیے وقت چاہیے۔ خود کو سمجھانے کے لیے وقت چاہیے۔“

”رافع!“ شفیقہ حیات نے اچانک ہی سرگوشی کی۔ ”وہ کون ہے؟“

”وہی لڑکی جسے تو شاید چاہنے لگا ہے۔“

”اوہ!“ وہ یک لخت ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”بہت۔۔۔ خوبصورت ہے کیا؟“

”کم آن دادی جان۔۔۔“ وہ ہنس دیا۔ پھر اس نے جھک کر ان کا سر جو م لیا۔ ”کہہ رہا ہوں نا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”سب گمانیوں کو دل میں جگہ نہ دیں۔“

”بیٹا! اپنی وردہ بھی بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تم نے تو کبھی اسے غور سے بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ کب سے تمہاری سنگیتر ہے وہ۔ لڑکیوں کو ایسے رشتوں نا توں سے بہت توقعات وابستہ ہو جایا کرتی ہیں۔ بہت نازک جذبے ہوتے ہیں ان کے۔ ان باتوں کا کبھی خیال نہیں کیا تم نے۔“

”یا اللہ۔۔۔“ رافع بے حد گھبرا گیا۔ ”میں چلوں دادی۔ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔“

”اٹھاؤ۔۔۔ چائے پیو۔۔۔ فریش ہولو۔ لیکن میری باتوں کو ذہن میں دہرا ضرور لینا۔“
 رات کو رات اندہ نیال محسوس کرتا ہوا وہاں سے نکلا۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

”جانتی ہیں بھابھی جان! امی کے مشورے سے زیادہ میں آپ کے مشورے کو صائب جانتی ہوں۔ آپ لی
 میرے نزدیک بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے فراز کی امی کا فون آتے ہی میں نے آپ کو کھلا بھیجا۔
 ہے کیا رائے ہے آپ کی؟“

”نعم نے ایک نظر قدرے خاموش اور سنجیدہ نظر آتی عذرا بیگم کو دیکھا۔
 اور آپ کا نند بھانج کا کم اور بہنوں والا معاملہ زیادہ ہے۔ اس لیے اپنی رائے دینے میں کوئی تردد نہ کریں
 جیسی بھی آپ کی آسانی ہو ہم دیا ہی کر لیں گے۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آپ ثانیہ اور رافع کے
 تفرغ ہو جائیں میں درود اور ناعمدہ کے فرض سے سبکدوش ہوں۔ کیسی آسانی ہو جائے گی ہماری۔“
 میں عذرا بیگم کے لیے چائے بناتی ہوئی درود کے ہاتھ سست ہو گئے تھے۔ وہ بے دلی سے چائے کی پیالیاں

”جی و تم بالکل درست ہو رہے۔ تمہاری بات سن کر میں کوئی شک شبہ نہیں ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ
 جیسے سے بڑا ہے اور درود ناعمدہ کے بڑی ہے۔ پہلا حق بھی ان دونوں کا ہی بنتا ہے۔ لیکن۔“ وہ قدرے

”میں کیا بھابھی جان؟ آپ کھل کر کیسے اگر کوئی پریشانی ہے تو ہم مل کر اس کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔“
 ”یہ ہے کہ رافع۔ رافع ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ نظر میں جھجکا کر آہستگی سے یوں بولی کہ جیسے
 ”اقرار کر رہی ہوں۔“ وہ دیکھ کر اسے یا اعتراض ہے بھابھی جان؟“ ان کے اچھو ہم و گمان
 ”نہ کہ اس چھاپے میں رافع کی جانب سے بھی کوئی گریز ہو سکتا ہے۔“

”میں رافع۔“ وہ بھڑک کر اس بات کو۔ دراصل وہ اپنے کیرئیر اپنے مستقبل کے حوالے سے کہتا ہے یہ
 ”جانتی ہو آج کل کے لڑکے ایک جست میں ہی آسمان چھو لینا چاہتے ہیں۔“
 ”وہ شادی، پاؤں کی زنجیر سمجھتا ہے۔“ وہ درود پر ہنسی مٹا کر ہنسنے لگا۔ ”وہ تو الناس کی بددگرے
 ”یہ بات ہے۔“

”میرے رافع سے بات کروں گی۔ تم خاطر جمع رکھو۔“ عذرا بیگم نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر جیسے

”جی۔۔۔ چائے لے کر اٹھی تو۔۔۔ دونوں ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ درود نے بسکٹ ان کے سامنے کیے تو
 ”ایک بسکٹ اٹھا لیا۔ پھر کوئی خیال آنے پر انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔“

”جی۔۔۔ ثانیہ کب سے یا کر رہی ہے تمہیں۔۔۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام ہے اور اپنی ایک
 ”پہلے تو تم اکثر چکارا گالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھاتیں۔“

”نہاں!۔۔۔“ وہ سوں تک۔۔۔ ”وہ!۔۔۔“

”جی۔۔۔“ وہ ایک دو احوال کے سٹ تیار کر اہوں۔ کیا پتہ اس کی ساس کا کب ارادہ بن

مرد بیگم۔ پارس مسکراتے ہوئے۔

"اور اگر تیسرا ہی سانس ہارا وہ بھی سن گیا پھر؟" مسروں سے اس کی ہنسی اور اسرار شرات۔ پوچھا۔
درو۔ قدرے۔ بیگم کی گئی۔ راجہ بیگم اور عذرا بیگم ہنس دی تھیں۔

۔۔۔

عہدے کے قرار سے منسلک رہی تھی۔ کل سے وہ اسی بے چینی اور بے کلی کا شکار تھی۔ ناشر کے فون نے
سے بہت فیس گزریا تھا۔ شفیقہ حیات کی موت، بگ کے باعث وہ اس سے بات نہ کر پائی تھی۔ اس نے دوبارہ فون کیا
عذرا بیگم اس کی خیریت دریافت کرنے آئی۔ بولی تھیں۔ ایتان نے فون کا تار ہی نکال دیا تھا اور تب سے اب تک وہ
ایک ناقابل بیان کیفیت کا شکار تھی۔ ناشر نے اسے کیوں فون کیا تھا۔ وہ آخر کون سی ضروری بات کرنا چاہتا تھا
اس سے؟

شاید تنہا زندگی کے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے وہ تھک گیا تھا۔ شاید جھکنا چاہتا تھا۔ اپنی ہار کا اقرار کرنا چاہتا تھا۔
تھا۔ اور ایتان اس کی ہار کا اعتراف سننے کی بے حد شدتوں سے مستعد تھی۔ اس نے والی کھانک کی جانب دیکھا۔
مہمن کے اسکول سے آئے کا وقت ہو چکا تھا۔ یہی دو وقت تھا جب ناشر عموماً فون کیا کرتا تھا۔

ایتان نے اپنے سر کی تیز تیز ہنسی کی اور تب ہی نکل ہوئی تھی۔ وہ اپنی ہی پڑی پھر تیزی سے
پہنچ گئی۔ فون تک پہنچی تھی۔

نیلو۔ "اس کا سانس غیر معمولی ہو رہا تھا۔"

نیلو۔ ناشر بات کر رہا ہوں۔ "اس کے انداز میں بے حد سنجیدگی تھی۔"

"بائے۔ کیا بات ہے؟" ایتان نے اپنے بچے کے زمانے بھر کی بے رخی سمجھ کر کہا۔ اس کی ہار کے اعتراف کے
موجہ پر وہ خود کو بہت بے نیاز اور بے پروا ثابت کر رہی تھی۔ وہ اپنے اچھے دوست کو دانا چاہتی تھی۔
اتنی کی پی پی مظلوم اور طالب نہیں ہوتی جتنا کہ اس کا۔ جتنا چاہتی تھی اسے وہ یاد رکھتی تھی۔
نیلو۔ "میں نے اپنے بچوں۔ مستقبل اور خوشیوں کے لیے بھی کبھی ہار مڑا۔" ایتان نے کہا۔

"میں نے ایک بے حد ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔" وہ قدرے رکا تھا۔
"میں سن رہی ہوں۔"

"ایتان۔ میں۔" ایتان سانس روک۔ دم بخود سننے لگی۔

"ایتان! میں اسے شادی کر رہا ہوں۔" بالآخر کہنے لگا۔

"یا؟" اس سے اس سے بڑی شگفتگی۔ آواز اٹکی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں آنسو اٹھ اٹھا تھا۔ اس نے فوری طور پر دیوار کا سہارا لیا ہوتا۔
شاید وہ ہی جانتی۔ اس کی جانب خاموشی تھی۔ شاید وہ اس کے جوابی رد عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ذہنی ہلکا
سیاق و سباق۔ ایتان خود بخود خاموش رہی تھی۔

"نیلو!؟" پوچھا۔ عذرا بیگم۔ اس نے اپنے میں طنز تھا۔

"پھر وہی نہیں؟ تمہاری خمد اور ہٹ دھرمی تو ایک منطقی نتیجہ ہے سو خود کو شاباش و ایتان بیگم۔"

ایتان۔ "بہت سادہ نکالوں سے وہ ار کہہ رہی تھی۔"

"زندگی کی دشواریاں۔ انہوں نے تم اپنی چل سکتی ہو۔ میں تمہاری بہت وسعت سلام کرتا ہوں۔ تاہم میرے
لیے یہ سب چند بہت مشکل تھا۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک ساتھی کی ایک ہمارے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے

خبر فیلہ لڑیا ہے۔ اب شخص اس پر عمل درآمد کرتا ہے۔ سوچا تھا کہ میں نہایت تیز رہا ہوں۔
بہت سی لیکن میاں دیوی کا رشتہ قائم ہے اور یہ رشتہ تقاضا کرتا ہے کہ تمہیں یہ بات بتائی جائے۔"
آئی بیٹ یو۔ "بالآخر اس کے کیوں سے سرسرائی آواز میں اٹھا اور ماتھے کی آنکھوں سے۔"

آئی بیٹ یو عاشر۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔ تمہارے ساتھ جڑے ہر رشتے سے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔
مجھے طلاق چاہیے۔ ابھی۔ اسی وقت۔"

رشتہ رکھنا نہیں چاہتی
اور بیورو کمان سے لگائے پاؤں کی مانند پٹخ رہی تھی۔ عاشر کا کئی دیر خاموش رہا۔ اس کی ہنسی میں دو تھم۔

"تمہاری حماقت جذباتیت اور جلد بازی نے ہی تمہیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے ایتان! لیکن بہر حال میں اتنے
اپنی ادلم عقل نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر ہی فیصلے کرتا ہوں۔ تمہیں طلاق دینے میں مجھے عار نہیں۔ تاہم میں

تمہاری حماقت جذباتیت اور جلد بازی نے ہی تمہیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے ایتان! لیکن بہر حال میں اتنے
اپنی ادلم عقل نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر ہی فیصلے کرتا ہوں۔ تمہیں طلاق دینے میں مجھے عار نہیں۔ تاہم میں

بے کلمے شخص کے ساتھ ایک ہی جڑی رہنا نہیں چاہتی۔"

نم و غصے سے وہ دیوانی ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ لوہان ہو رہی تھی۔

نیلو۔ "اس کا چہرہ لوہان ہو رہی تھی۔"

"سوچ لو ایتان۔! اچھی طرح سوچ لو۔ میں چند دن بعد فون کروں گا۔" وہ سری جانب اس نے لائن ڈس
کنکٹ کر دی تھی۔

"نیلو۔ سوچو۔ ذہن۔ باجی۔ بات کر۔" وہ کریڈل پر ہاتھ مارنے لگی۔ حالانکہ ڈس

کنکٹ کر دی تھی۔

بے آنسو صاف کرنے لگی۔ "تم طلاق نہیں دے گے تو میں عدالت جاؤں گی۔"

آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ سسکیاں تھیں کہ قسم کر نہ دیتی تھیں۔ وہ بمشکل کمرے میں آئی در بدر

رکڑا رد و قطار رونے لگی۔

وہ بالکل گم صم بیٹھی ہوئی تھی اس کے ایک جانب منیو بیگم بیٹھی تھیں اور دوسری طرف انیندہ تھی۔ قدرے

اگلے پر کھڑکی کے قریب عبادہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک اچھی کیس میں عمر کا سامان رکھ رہی تھی۔ وہ ان سب کی

حالات سے بہت پر جوش اور خوش نظر آ رہا تھا۔ شہلا کی خاموش نظریں بار بار اس کا طوائف کرتی تھیں پھر اس

کے اندر سے ایک سنسکی سی نکلتی تھی۔

"نم۔ آپ کے کھلونے بھی رکھ دوں؟" وہ یہ نہ قدرے آزر دگی سے پوچھا۔ "یا انہیں میس چھوڑ جاؤ۔"

بہاں آیا کرو گے تو کھیلا کرنا ان سے۔"

"تھک ہے۔" اس نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ "وہی بھی پاپا نے پر اس کیا ہے کہ دو بجھے بہت سے نواز

دائیں تھکے کالی سارے انہوں نے لے کر بھی رکھے ہیں۔"

پھر وہ اٹھا ہوا شہلا کے قریب آیا اور اس کے گلے میں بازو ڈال کر لٹک گیا۔

"نم۔ آپ کو بتا رہا ہے میرا روم سیٹ کروا دیا ہے۔ اتنا اچھا اتنا اچھا۔ پپا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے۔"

کاسب سے خوبصورت کمرہ میرے لیے سیٹ کر دیا ہے۔ مہما! آپ کبھی آئیں گی۔ بھجھو سے ملنے؟ میں آپ کو انہی چیزیں دکھاؤں گا۔ پلیز مہما۔ آپ آئیں گی نا؟" شملہ کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر اس کے بالوں میں گم ہو گئے۔ اس نے سر اٹھ کر شملہ کا چہرہ دیکھا۔

”مما پلینے۔ آپ روئیں مت۔ میں مگنی فیل کرنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ میری وجہ سے رو رہی ہیں۔ دیکھیں نا۔ آپ بھی وہاں انکل کے ساتھ مگنی تھیں۔ میں تو نہیں رويا۔ آپ سے پراس جو کیا تھا میں۔ اب میں جا رہا ہوں تو آپ کیوں رو رہی ہیں۔“

نے اپنے ہاتھ سے شملہ کا چہرہ صاف کیا۔ شملہ اسک پر ہی۔ اس نے عمر کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ منیو د
بیمہ دل سا دینے والے انداز میں اس کے شانے پر بازو پھیلا یا تھا۔

بچے کو خوشی خوشی بھیج دیا۔ کسی غیر کے نہیں اپنے باپ کے ساتھ جا رہا ہے۔ دل مضبوط رکھو میٹا پھر اس نے وعدہ کیا ہے کہ بیس محسوس نہیں ہونے دے گا کہ عمر کہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ روز عمر کو بھیجے گا۔ ہم روز اس سے ملیں گے۔ اسے پیار کریں۔ اگر دماغ سے سوچو تو یہی تمہیک ہے۔ عمر کو باپ کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ تمام کی ضرورت ہے۔“

”نہیں سوچ سکتی دماغ۔“ اس کے بوں نے سرگوشی کی۔ ”نہیں سوچ سکتی۔ محبت کے پاس صرف دلی ہوتا ہے ای۔ دماغ اسے ملا ہی نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا الجھا ہے گیل برا۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں عمر کے بغیر نہیں رہتی سکتی۔“

”مما۔“ تم مجھے انداز سے رو بانسا ہو گیا۔ ”آپ ایسے بی ہیونہ کریں پلیز نہ روئیں میں بھی روؤں گا۔ مجھے آپ کے آنسوؤں سے رونا آ رہا ہے۔“

اس نے غصا اور پیار کیا۔ شملانے اسے دیوانہ وار لپٹا لیا تھا۔ عجب منظر تھا۔ سب ہی کی ہلکی گونج غم تھیں اور دل

آزاد تھے۔

UrduPhoto.com

باہر پڑی تھی ہارن۔ جلاؤ شب۔ چونک کر ایک لاد سڑنے کی جانب دیکھا۔ معمار تھمکے تھمکے دوڑ سوں سے پاہر کی جانب بڑھ گیا۔ چھوٹے چھوٹے اندر آیا تھا۔

انی۔ "وہ منیو" پیٹیم سے مخاطب ہوا۔ "ابراہیم صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ چائے وغیرہ بھیج دیں،
وہ بے جلدی میں ہیں، فوراً کھانا جا رہے ہیں۔ بہر حال میں انہیں چائے کے لیے اندر لے آیا ہوں۔ آپ بھی
مل لیں اور وہ دوسرے کونے میں بیٹھے ہیں۔"

نہر کو چند محبوں بے شتر والی خوشی شہلا کے آنسو دیکھ کر بھول چکی تھی۔ وہ خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا۔ شہلا نے اس کی صورت دیکھی تو اس کا دل چلنے لگا۔

”عمم۔“ بوسہ لاشی میں بولی۔ ”تم سارے پیہا۔ آگئے ہیں۔“

”ممناء“: وہ یوں ناسا سہا کہ۔ ”یہ بھی چلیں نا میرے ساتھ۔ پھا کہہ رہے تھے اگر آپ جاہیں تو۔“

”نہ۔“ انیقہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”ڈونٹ ٹاک مان ہیمنس۔“ نما کو تنگ نہ کرو جانو۔ وہ

پہلے ہی پریشان ہیں۔ چاہہاں تمہارے بہا سے ملتے ہیں۔ کم آن۔ ”شہلا نے لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ انہی وقت نری سے اسے چہمڑانے کی کوشش کی۔

”انیقہ میں مرجا،ں لی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اے!۔۔۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”انیتھ میں مرغابوں کی۔“ وہ پھر سکی۔ ”اں سے جا کر کوئی پر یہ ظلم نہ کر۔۔۔ پلیز۔“

ماہنامہ عمان 273 مارچ 2007

”ایسا ہی ہے تو عریشہ کو لے آؤ۔“ وہ اطمینان سے بویں۔

”بائیں۔“ عذرا بیگم حیرن گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایسا کیسے ہوا ہے کہ بڑا بیٹا کیرر بنانا چاہتا ہے اور پھونکا جوتا بھی نوکری پر بھی نہیں لگا اس کی شادی کر دوں؟ پھر رابعہ کیا سوچیں گی؟“

”تمہیں رابعہ کی فکر کیوں ہے بسو؟ رابعہ میری بیٹی ہے میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ کچھ نہیں سوچے گی۔ دراصل یہ مشورہ میں نے اس لیے دیا ہے کہ فردوس بیگم عریشہ کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ کچھ بیمار رہتی ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کا علاج جلد از جلد شادی ہے۔ نافع نوکری پر نہیں ہے تو کیا ہوا؟ ہم خدا نخواستہ بھوکوں نہیں مرتے۔“

”عریشہ؟“ عذرا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔

”پتہ نہیں۔“ پھر وہ بے دلی سے بویں۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ جب صحیح ہے نہیں تو کیا خاک لگے گا اور آپ اماں! آپ رافع کی بے جا حمایت کر رہی ہیں۔ میں سبوتوں سے کہوں گی کہ وہ خود رافع سے بات کریں۔ بعض معاملات گھر کے آدمیوں کے بس میں ہی ہوتے ہیں۔ وہی نمٹائیں۔“

”تم بے فکر رہو بسو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری مانو تو نافع سے بات کرو۔ فردوس نے کہلوایا نہ ہوتا تو میں زبان نہ کھولتی۔ ایسا کرنے میں حرج کیا ہے؟ عجب! ٹاٹا سیلا وہ عریشہ کی سہیلیاں ہیں بچپن سے اچھا ہے تینوں ساتھ رہتے رہتے ہوں خیر ہے۔“

”اور بے چاری وہ؟“ وہ شکایت سے بویں۔

”اللہ مالک ہے۔ اگلے برس سی۔“

”آپ اماں بالکل نہیں سمجھ رہیں بالکل رافع کی طرح۔“ عذرا بیگم ان سے بالکل مایوس ہو گئیں۔

UrduPhoto.com

وہ سخت غم و غصے کی کیفیت کا شکار تھا۔ کسی بھرے ہوئے سیر کی مانند کمرے میں ٹھہر رہا تھا۔ فریجہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے انداز دیکھ کر قدرے سہم سی گئی۔

”ایسا بات ہے؟“ عذرا بیگم نے بے رخی سے پوچھا۔

”فراز بھائی۔ مجھ سے کیوں ایسی طرح بات کر رہے ہیں۔“ وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم خرابی۔ سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔“ عذرا بیگم نے فریجہ سے کہا۔ ”وہ بن کا چہرہ دیکھ کر قدرے نرم پڑا۔“

”ای آئی آن تک ہماری ہر بات کو سمجھتی آتی ہیں۔ ہماری بات مانتی آتی ہیں پھر زندگی کے اتنے اہم فیصلے لگے

متعلق ان کا رویہ اس طرح کا کیوں ہے؟“

”آپ بے شک خفا ہوں بھائی جان! لیکن برحق اور جائز بات یہی ہے کہ اس معاملے میں سراسر قصور آپ کا

ہے جو پتہ نہ پکڑ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ آپ خود ہی سوچیں کہاں کا انصاف ہے یہ؟“

”فریجہ۔ فریجہ۔“ عذرا بیگم نے فریجہ سے کہا۔ ”وہ اس کے دونوں بازو تھام کر بولا۔“ وہ لڑکی فراڈ ہے چپٹو ہے۔ یہ

سات ہے۔ میں اس کا معہم اور بھلا بھالا چہرہ دیکھ کر اس کی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ فرسٹ ٹائم میں نے ہی

اپنی بیٹی تھی اس لیے اس نے میری پذیرائی کی۔ میری محبت کو خوش آمدید کہا۔ وہ کھنٹوں مجھ سے فون پر باتیں

کرتی تھی۔ بار بار میری محبت کا اظہار کیا اس نے اور۔ اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے شادی کا

نہیں ہوا تو وہ یہاں تک پہنچے مٹ گئی۔ اس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی۔ میرے فون ریسو کرنا چھوڑ

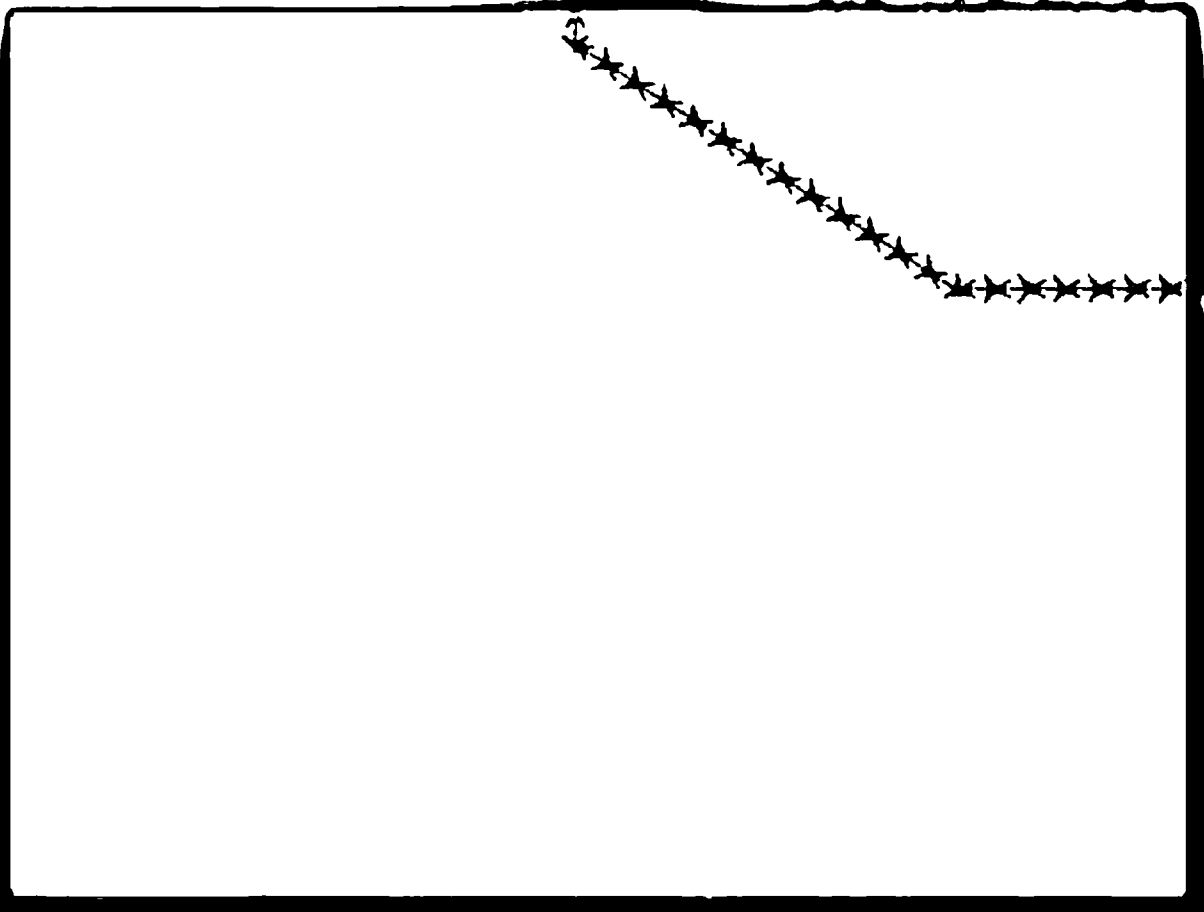
دیا۔ پھر اپنا یہی تبدیل کر لیا۔ میں۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ دیوانہ، لیا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر میں وہ نمبر

مجلس اعلیٰ ہندوستان
مجلس اعلیٰ ہندوستان

مجلس اعلیٰ ہندوستان
مجلس اعلیٰ ہندوستان
مجلس اعلیٰ ہندوستان

مجلس اعلیٰ ہندوستان

مجلس اعلیٰ ہندوستان
مجلس اعلیٰ ہندوستان
مجلس اعلیٰ ہندوستان



یہ وہی ہے جس نے ہمیں یہ سب کچھ سکھایا ہے۔

سب بادشاہ تانہ بند کی تہہ بند سے بند بند سے ہیں
بند بند کو پھر رخصت بند سے بند سے بند سے کام ہے جو
میں سے پائی ہے
اور بادشاہ سے

[illegible]

مذکورہ بالا پر تبصرے سے واضح ہے کہ سرائیہ اور ان کے متعلقہ اداروں نے خوشنما پرنٹس ان کی اکیڈمی میں جھلی مچا دی تھی۔

”ہاں شہید۔۔۔ ایک مشورہ دیتا چاہتا ہوں اسی لیے آگے دی ہے تجھے۔“
 ”اول۔۔۔ اس نے سر ہلایا۔۔۔“ خوراک مشورہ۔ لیکن یہ معاملات میں مشورے صرف کئے جاتے ہیں اول
 صاف اپنی کروا تا ہے۔
 انجمن نے چونکہ اسے دیکھا۔
 تر بھول۔۔۔“

”نہاں ہے اس سنج سے خیر، خرابی، راہوں، ٹیکن رافع یا ہوابہ دل بہت بے کاری چیز ہے کم بخت کو نکال کر باہر پھینک دے۔“

میں یہ اسلوب؟" انھوں نے ابھرا۔
 "نہیں۔" وہ تیز رفتاری سے بولا۔ "یہ نہیں ایک خیال تھا اسے پیش کر دیا۔"
 "ہاں شک۔" انھوں نے دہرایکھتے ہوئے بولا۔ "یار! پہلے صرف ایک احساس تھا پھر وہ احساس قدرت و افق بن گیا۔"
 خیال بننا جو حقیقت، وہ اب حقیقت نے شدت اختیار کر لی ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے ہاشم! اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں: وہ تو۔ اب جہاد کیا کروں؟ اس بل کی بس ایک رٹ ہے۔ اسے پانا ہے اسے پانا ہے اسے پانا ہے۔"
 اس نے گہری سانس لی۔ اپنا سر جھکی پست سے نکال دیا۔

”دوسری جانب ح میں ثانیہ کی شادی کے ساتھ ہی میری اور درون کی شادی کی بھی بات چھڑ گئی ہے۔ انی چاہتی ہے کہ دونوں فرمائشیں ساتھ ادا کر دیے جائیں۔ میرے پاس انکار کے لیے کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے ہاشم! میں کھر دلی کادل توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ میں درون کا دل توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”ہاں شرم!“ قد غصے سے بدک گیا۔ ”جی ہاں۔“

ا.ب.شون (278) م.ب.ق 2007

میرا دل چاہ رہا ہے رابع! میں خوب ہنسون، مذاق کروں۔ تم دونوں مل کر سگنٹ بنیں۔ میں ہنستا ہوں۔

ان اے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اسے ہاشم کی رمانی حالت پر شک گزرا۔
 "ہاشم! تیرا آل رانٹ۔"

”میرا خیال ہے ہاشم! وہ دوسرے بھی پسند کرتی ہے مجھے۔“
”میرا خیال ہے؟“

”نہا ہے، اقرار و غیور کی نوبت تو کبھی آئی نہیں۔ خیال ہی پیش کر سکتا ہوں۔“

”اگر ایسا ہے تو وہ بندہ کون سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ بڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہے۔ اسے وقتی طور پر دھجکا ضرور ملے گا۔ لیکن پھر جلد ہی سنبھل جائے گی۔ لیکن پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ رنجہ کیا چاہتی ہے۔ کیا وہ تمہارا ساتھیہ دینے پر آمادہ ہے۔“

”وہ درہ کی بہتر بہت سی ملی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ آسانی سے اس بات پر رضامند ہوگی۔“
 ”ہوں۔“ یاشم سوچنے لگا تھا۔ ”پھر اس کا ایک اور حل ہے۔“
 ”وہ کیا؟“ رابع نے اسے دیکھا۔

”تم ڈائریکٹ دروازے سے بات کرو۔ یہ مسئلہ اس لئے ٹکس کرو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔“ رافع اسے بری طرح

”باسمِ ایاں میرا خیال ہے تجھے گھر وٹ پینے کی ضرورت نہیں تھی لگتا ہے کہ تو پکچہ اور پی کر آیا ہے۔ یہ آج کیسے
 بائیں کر رہا ہے۔ تو۔۔۔ یعنی میں ورنہ سے پوچھوں کہ وہ کتنا کتنی ہے؟ آیا اسے میرا اپنی سہیلی سے انظہار محبت پسند
 آئے گا یا نہیں؟ اور وہ، خوشی ہمیں شادی کی اجازت دے گی یا نہیں؟“ باسمِ کان سمجھانے لگا۔

”تم۔ تم۔ شہلا بھائی! تم کیوں نہیں کہتے۔“ رافعہ مدھم سا بولا تھا۔

”نفس نہ میری بھیک بھیک مدد کر سکتی ہیں۔ رہیہ کیا چاہتی ہے کیا نہیں۔ شہلا بیٹھا بھی اس کے دل کا دھڑلہ کر کے بتا سکتی ہیں مجھے۔“

"اے! ہمارے دل میں سوچا۔" اور شہلا کیا چاہتی ہے، مجھے کون بتائے گا۔"

"کیا سوچنے لگے؟" رافع نے اسے ٹوک دیا تھا۔

بہارِ ابدیہ

”ہمیں۔“ وارڈ نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”میں شہلا بھاگھی سے
دیکھیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا
اپنے دل میں دلی جذبات رکھتی ہے، جو کہ میرے دل میں ہیں، تب تو
معاملے پر کھردراؤں، بات کر سکتا ہوں لیکن اگر ریجہ۔ ریجہ۔
پر بات تک کرنا نہیں چاہتی تب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں خاموشی سے
”دور سے شاہی پر لڑیں گا۔“ پاشہ نے غلغلہ مچا دیا۔

”ہمیں۔“ دارلے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں شہلا بھابی سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ ریبہ سے بات نہ دیکھیں کہ اس کے ان میں کیا ہے۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا یہ صرف میری خام خیالی ہے۔ اگر وہ اپنے دل میں وہی جذبات رکھتی ہے جو کہ میرے دل میں ہیں تب تو باتیں کر سکتی ہیں۔ میں۔ میں۔“ دارلے معاملے پر گہرا ہلن سے بات کر سکتا ہوں لیکن اگر ریبہ۔ ریبہ۔ ایسا بالکل نہیں چاہتی۔ اگر وہ اس پر بات تک کرنا نہیں چاہتی تب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں خاموشی سے۔“

”وہ نہ سے شاید بر لوں گا۔“ ہاشم نے بظاہر نکل کیا۔

”ضمیمہ“ رافضی زندگی سے بولا۔ ”ضمیمہ ہاشم! اپنی نہیں میں ایسا کر سکتی گا یا نہیں۔ یا رافضی! انہی نزل ہے کہیں اس کے سجدہ انصافی نہ ہو، بے ایمانی نہ ہو۔ میں ساری زندگی اس کی آنکھوں میں کسی اور ان نظریں تلاش کروں میں۔ میں شاید خاموشی سے کہیں چلا جاؤں گا۔ مزید پر حساسی کہہ دے گا یا پھر دیکھوں گا۔“

”پاکل ہو سچے“ اشم حیران ہو گیا۔ ”لئے جذباتی ہو رہا ہے۔“
 ”ہاں۔ کچھ دغلی سے بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔ جس دُور سے ہندوستان میں جا رہا تھا، اسی میں بری طرح الجھ رہا ہوں۔ جتنا الجھ رہا تھا، یہ چلنا ہوں، مجھے ہی پختہ چاہا جاتا ہوں۔ یاد میں آ رہا ہے۔“

باسمِ افسردہ کی ہے مگر کیا تھا اسے نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا۔
 "یارِ رافع کچھ کہیں کا تو تجھے ایسا لگے گا جیسے تجھے جس سے چھین کر رہا ہوں، راہِ کھولی مگر راہِ بول
 تیری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے رافع کہ دل کا سکون انسان کی کسی چیز سے نہیں ملتا۔ بلکہ انسان کی کسی چیز سے نہیں ملتا۔ بلکہ انسان کی کسی چیز سے نہیں ملتا۔ بلکہ انسان کی کسی چیز سے نہیں ملتا۔
 بس! باقی سب دل کے بھلا دے ہیں۔ یہ محبت، بلکہ انظارِ محبت، جس سے دل جلد ایسا بے خوف و شہت
 ہوتا ہے انسان فرشتے سے پھر انسان بن جاتا ہے۔ اس کا چاہ میں فرق آتا ہے۔ تمنا کا رنگ بدل جاتا ہے
 پھر۔ پھر اکثر تمنا، عملی پراثر آتی ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ یہ تمنا، جو دماغ میں جیسی تمنا تو ایک سراب تھی۔ محراب
 بھلاوا بھی۔"

رائع سب کچھ یکسر بھلا کر باشم کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ باشم نجانے کس رو میں مبتلا ہوا تھا۔ رائف کی موجودگی سے
نیاز بس بوٹا چلا جا رہا تھا۔

”تو بس اور رانج! پتا ہے صحرانگیزی دھن کیا ہے؟ پیاس۔ پیاس ہے صحرانگیزی پتہ کیا ہے؟ تو بس رانج۔ تنہا انجام ہے پیاس۔ چاہے وہ آسمان میں کر یا گوس درخشن کر چکے، چاہے تیل پر آئے، چاہے انسان ہاں کے پیچھے بھاگے، چاہے آگے۔ بس پیاس ہی پیاسی مقدر رہے۔ تو بیا رہے۔“

اس نے رانج کے اندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کنامت کہہ رکتی تھی۔ یہ محبت بن کر فریب دیتی ہے۔ خوشی کے منتائے معنی سمجھا لیا۔ بے سکوئی کے ڈاؤن دیتی ہے لیکن انت اس کا پیاس۔ جو زندگی خود سے دے رہی ہے خوشی خوشی۔
نہ مڑے مڑے گئے۔“

”ہاشم! سرائع نے اسے اس کی سہیلی سے نکال کر اندر چمکا رکھا۔
 ”کیا بات ہے میرے یار! سرائع نے نرمی سے پوچھا۔“ تو مجھے بہت دھڑک رہا تھا۔
 ”میں نے سب کچھ بتا دیا۔“

میں چلو میرا ہی ہو گا۔" رافع مسکرایا۔
 "میں چلوں گا۔" ہاشم اٹھ کھڑا ہوا۔
 رافع بھی اس کی تقلید میں اٹھا۔

”تو پھر مجھے یہ پایا کہ میں شہلا سے رہنے کے بدلے
میر میں یہ ایسا ٹوٹا ہوا جانے کلا ہسپورٹ پر چمکتا خامو
”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ رابع نے خفگی سے ا
”لیکن میں ایسا ہی کہہ رہا ہوں کیونکہ میں یہی ا
نہا۔ ہر شخص کہ یہ ایک خاص بات تھی۔“

۱۰۰ یوں یہ ایمان نہیں ہے۔ یہ بھی۔ آگ میں کھ

۴۱ "اے ابا! میرے بچے...
 ۴۲ "میں نے مانع لے گیا ہے، یاد رکھو۔ تیری بھینجی...
 ۴۳ "اے ابا! میرے بچے...
 ۴۴ "میں نے مانع لے گیا ہے، یاد رکھو۔ تیری بھینجی..."

”ایک کشتی میں آپ“ وہ بھی مطمئن ہو میں

”اماں! اماں! اماں! میں نے معاف نہیں کیا۔“

یادہ کیا میری پاس۔“

"میری زندگی بے مقصد ہے۔"

"کیونکہ؟" "شعبہ حیات اس پر جھکیں۔" "میری

سب کچھ میں ہیں۔"

”ابا۔۔۔ میں۔۔۔ میں خالی رہ گئی۔ وہ ایسے کا
 لہجہ اور ہم سر تپا بدل گئے۔“

دروازے بند کر کے میں اُلی بھال دے گا میں بھراؤں نیکی بھی نہی۔

”ناعمدہ! میں اور امی ایقان خالہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ تم روٹیاں،“
”قیرہ میں نے پکا لیا ہے۔ سو پر رکھا ہے۔ چو لہا یاد سے بند کر دیتا۔“
”جی اچھا۔ آپ جائیں۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولی۔
”جیسے میں ہر ادھیان بھی ڈال دیتا۔“
”ٹھیک ہے۔“

دروازہ نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی پھر ہر نکل گئی۔ ناعمدہ دروازہ بند کرنے کے خیال سے چند لمحوں تک ٹھہری۔

دروازہ بند کر کے وہ کمرے کی طرف آ رہی تھی جب فون کی بیل بجی۔ اس کا دل دھڑکا تھا۔ آج کل ہر بیل کا دل دھڑکا تھا۔ خواہ وہ دروازے کی ہو تو یا فون کی۔ فون تک اگر وہ مزید پریشان ہوئی۔ یہی ایل آئی تھا۔ کہ فون کس کا تھا۔ ناعمدہ چند لمحے کھڑی ہاتھ ملتی رہی لیکن بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اس آگے بڑھ کر ریسور اٹھایا۔

”ہیلو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”فراز بات کر رہا ہوں۔“ وہ حرا نے بے جا ہنسی بھری۔

”جی جی کہیے۔“

”میں نے وہ جواب دینے کے لیے فون کیا ہے جو آپ پر ادھا رہا تھا۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”آج آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ نے میرے ساتھ چیکنگ کیوں کی تھی۔ کیا آپ نے پیش نظر مجھے

بیوقوف بنانا مقصد رکھتا تھا؟ یا پھر آپ کے لیے وہ دو تین تفرق کے لیے تھے؟ یا پھر آپ ایک ہی وقت میں مختلف نمبر

بات کرتی ہیں۔“ وہ نے اس کی طرف سے اس نے سوال کا جواب دیا۔ ہر بیل میں سچا اور کرا

جواب کیونکہ آپ کے جواب پر میری زندگی کے بے حد اہم فیصلے کا دار و مدار ہے۔“

ناعمدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس قدر مشکل صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ با

بنانا کار و شوار تھا۔

”میں نے کہا تھا نا۔۔۔“ وہ نے تھوڑی سی ہنسی بھری۔

”وہی مجبوری جانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ مجھے ایسی کیا مجبوری تھی تمہارے ساتھ کہ تم مجھے تسلی کے دو لفظ تک

کہہ سکیں۔ تمہارے گھر سے وہ نمبر ختم کر دیا گیا۔ تم نے وہ سرا نمبر لے لیا پھر بھی پلٹ کر کبھی مجھے فون نہیں کیا۔

بولو کیوں؟ جواب دو؟“

”میں نے نہیں بتا سکتی۔“ وہ روپائی سی ہو گئی۔

”تمہارے اس جواب سے میں کوئی بھی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں اور ناخنشی ناخن پر سنٹ سناج تمہیں دھوکہ د

ثابت کرتے ہیں۔ وہ نمبر لڑکی۔“ وہ غرایا۔

ناعمدہ نے بے بسی سے سانس بھری۔

”نہیں، بخیر انہیں میں نے میں نے دھوکا نہیں کیا۔“

”محبت کی تھی مجھ سے؟ جیسی میں نے کی؟“

”ہاں۔“ وہ شکستہ سے بولی۔ ”کی تھی لیکن۔۔۔ لیکن جیسی آپ نے کی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر۔“

اس کے ذہن میں عرشہ کی متورم آنکھیں تھیں، مگر لب احتجاج تھا جو سوائے لبوں کے رو میں رو تھیں۔

ظاہر ہو گا۔
 "اے! وہ طہرے نہ دیا۔" رینکی: "وہاں آجوک مس ناعمہ!"
 "یہ مذاق نہیں ہے فراز! حقیقت ہے۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔"
 فراز چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔
 "مسلّم میں یہ نتیجہ منطوقاً چاہتا ہوں ناعمہ" بکھرہ ہوا تھا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ رینکی
 کھیل کا جواب سچی دیکھنے میں میرے ساتھ کھیلنا۔ ہر چند کہ تمہارا اصرار ہے کہ تم فتنہ نہیں۔ تاہم میں
 سے انکار کرتا ہوں۔ تم چھوٹے ہو۔ وہ فہرنگی اور میں۔ میں تم جیسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔"
 ناعمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔
 "میمی آپ کی مرضی۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "میں ایک نمبر ہونے پر اصرار نہیں کرتی۔ آپ
 ہو جائیں۔"
 فراز نے غصے سے سانس بھینی تھی۔
 "تھک تھک آئی دل شوٹ ہو۔"

ناعمہ خاموش کھڑی رہی۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
 "تمہیں۔۔۔ تمہیں خود اس شکلی سے انکار کرنا ہو گا مس ناعمہ۔" بولے گھر والوں سے کہو۔
 اس شادی کے لیے میرے گھر والوں سے مہذرت کر لیں۔"
 "میں۔۔۔" وہ کھڑکی۔ "میں بھلا کیسے کہہ سکتی ہوں؟"
 "جیسے مجھ سے محبت کے اقرار کیے تھے۔" وہ طہرے بولا۔ "ان ہی لمحوں سے کہو جن سے تمہیں بھوت ہونے
 کی بات ہے۔"
 "لیکن۔۔۔ لیکن میرے پاس کیا جواز ہے اس انکار کے؟"
 "جواز کھینچنے تو تمہیں خوب آئے ہر۔۔۔ اے۔۔۔ کہ۔۔۔" وہ جبروری کا دروازہ کھولا۔
 "دیکھیں فراز! پلیز۔"
 "تب یاد رکھنا۔ میں تمہاری زندگی عذاب بنادوں گا۔ ساری عمرات سے قبر کی رات تک۔ تم ہر رات
 کی یہ میرا تمہیں۔"
 "فراز! فراز! پلیز! ناعمہ کی روح تک کانپ گئی تھی۔
 "مجھے بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے" اسے استمال کرو۔ مجھ سے شادی سے انکار کرنا۔۔۔"

انکار۔۔۔
 "لیکن۔۔۔ لیکن آپ مجھ سے ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" اس کے ہاتھ کھپکھپا رہے تھے اور تواز بھی۔
 "میں لے لے کہ میں نے تمہارے لیے یہی سزا تجویز کی ہے اور تم نے کیا تھا کہ تم ہر سزا کے لیے تیار ہو۔ ہاؤ۔
 پلے یور درؤز۔"
 "فراز۔"
 دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ ناعمہ کھلی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتے ہوئے اپنے دل کی آواز سن
 رہی تھی۔

 "مجھے یہ کسی ذہنی شک کے دیر اثر لگ رہی ہیں۔" ڈاکٹر نے رافع کے کاندھے پر ہانڈ رکھ کر اسے کمرے کے

اس سے کچھ دور رکھ کر۔ "کوئی مسئلہ ہے ان کے ساتھ؟"
 "مسئلہ۔۔۔" رافع دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "مسئلہ تو ہے ڈاکٹر صاحب! پچھو کے اپنے
 ہنڈ سے کچھ اختلاطات چل رہے ہیں لیکن۔۔۔ کوئی بہت نئی یا اچانک نئے والی خبر نہیں ہے جو شک ثابت ہو۔"
 ڈاکٹر صاحب نے۔۔۔
 "پھر بھی۔۔۔ ان کی ذہنی کیفیت یہی کہہ رہی ہے۔ ہر حال انکیشن میں نے لگا دیا ہے ان کے اعصاب قدرے
 خون۔۔۔ وجہ اس کے۔ سو کر انھیں کی تو بہتر محسوس کریں گی۔ بخار تو ویسے بھی اتنی ہی گیا ہے پھر بھی دو اور دن کئی تیر
 کریں گے۔"
 "انی ڈاکٹر صاحب! تعذیب ہو۔"
 "میں اب چلا ہوں۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ شاید انہوں نے بہت ٹینشن سہلی ہے۔"
 "تھک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔
 ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ ہیں کھڑا کچھ سوچا رہا۔
 "اس نے۔۔۔" وہ خیالات کی تواز پر دوچٹکا۔
 "نی ڈاکٹر جان!۔۔۔" وہ کھڑکی کی جانب بھاگا تھا۔
 "کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر! تمہیں باہر نکالنے لے گیا؟" نہیں تشویش تھی۔
 "کچھ نہیں وادی جان! پچھو یا انکل تھک ہو۔ صرف ٹینشن ہے اور کچھ نہیں۔" وہ کمری پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
 ایسا انکیشن کے زیر اثر اب کمری خند سوچنے لگی۔ اس کے نفس کا وہ جزو اس کی ہر سکون خند کا نماز تھا۔
 "میرا خیال ہے بہت ہو چکا۔" رافع "جان کا دور بھٹکتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں اس مسئلے کے نتیجہ حل کے

پتہ لگانا ہے۔"
 "میں۔۔۔" وہ کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر! ہم نے آمیزگی۔" ذرا اسی منہ کے پیچھے اپنا کھر
 خراب کر دی ہے۔ رافع اہم غامضیوں سے بات کرو۔ دیکھو یہ کیا کہتے ہیں۔ اگر وہ مسئلہ سلجھانا چاہتے ہیں تو ہم
 سب مل کر ایمان کو مجبور کرنے کی کوشش کریں۔"
 "نہیں ای! ہم نے سر ہلایا۔" رافع "جان کا دور بھٹکتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں اس مسئلے کے نتیجہ حل کے
 پتہ لگانا ہے۔"
 "تم ناشر سے بات کرو۔"
 "جی۔۔۔ رات کو کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ حیرت ہوا اس کے علم میں نہیں تھا کہ وہ وہ بھی دواں ہوگی۔
 "تھک ہو۔" اس نے نظریں چرا کر آہستگی سے کپ اٹھا لیا۔
 وہ نہ لے لے کر آگے چلے گئی۔ رافع کا نظریں اتنا اس نے بے حد واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک عرصے
 سے ان نظریوں کو پڑھ رہی تھی۔ پہلے ان میں ایک خوش دلی میناسا کی اور اپنا نیت کا جو جذبہ ہوتا تھا عرصے سے اس
 کی جگہ اجنبیت اور بے دلی نے لے رکھی تھی۔ وہ وہ جیسی حساس لڑکی کے لیے۔ تبدیلی اتنی غیر اہم نہ تھی کہ وہ
 اسے محسوس ہی نہ کرتی۔ سب کو چاہئے کہ وہ وہ کی جانب بڑھ رہی تھی جب چانک رافع نے اسے پکار لیا۔
 "کو۔۔۔"
 وہ تھک کر رہی۔ اس آواز میں اپنا نام اس نے بہت عرصے بعد سنا تھا۔
 "جی۔۔۔" وہ مڑی۔

"تمہے ہونے رشتی نہیں جا رہی آج کل؟"

"خیر، رشتی کی چھٹیاں ہیں۔ تو آج کل سے بولی۔"

رائع نے ہنر کوئی سوال نہ کیا تھا اور درود جانتی تھی کہ اب اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور سوال نہ تھا۔

نجانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے ذرا سا اٹھ کر دیکھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے مین سامنے جو کمرہ تھا اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ابراہان اپنے بیڈ پر تباہ آسمانی مہرہ بیڑہ دیکھ رہا تھا۔

اس نے دیکھا "عمر اپنے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ نکیہ گود میں رکھ کر اس پر کنٹیناں نکا کر اس نے ہاتھوں کے پیالے میں چور کھا ہوا تھا۔

ابراہم کے کمرے میں ٹنٹ بلب کی مدھم مدھم روشنی تھی لیکن عمر نے کمرے کی لائٹس آن کی ہوئی تھیں وہ بستر سے اتر کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا تھا۔

"عجب بلی بن۔" وہ اس کے قریب آئیندا "کیا بات ہے جان! سوئے نہیں تھکے؟"

"خیر نہیں آری ہے بھیا! تو آج کل سے بولا۔"

"کیوں؟ کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا ہوگا۔ بھوک لگی ہے؟"

"نہیں کل دنوں سے دودھ دیا تھا وہ ٹین ڈال کر۔ میں نے پی لیا تھا۔"

"پھر بیڈ کیوں نہیں آری؟" ابراہان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"بھیا! میں اکیلا نہیں سوتا ہا۔" وہ مجبوری سے بولا۔

"اوہ! ابراہان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تو میں نے سوچا کہ تمہاری جلدی تھی۔"

جیسے اپنے کمرے میں سوئے کی جلدی تھی۔

"کیونکہ میں بڑا ہونا چاہتا ہوں۔ بڑے لوگ اپنے کمرے کے آگے بڑھتے ہیں جیسے آپ۔"

ابراہان شرارت سے مسکراتے ہوئے "میری جان! تمہارے بھائی بھائی بڑے نہیں ہیں۔ وہ بھی اکیلے سونا چاہتے ہیں۔"

اس نے عمر کو ہاتھوں میں بھر لیا۔

"اور جب تک تم بڑے ہو گے تب تک ہم تمہاری دلہن بھی بنے آئیں گے۔" عمر نے ہنسنا شروع کیا۔

چل کر سو گیا۔ "اس نے کمرے سے نکل کر عمر کو بازوؤں میں اٹھایا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔"

"یہاں لیٹ جاؤ بھیا کے برابر۔" عمر نے کہا "تمہاری آنکھیں بند آئی ہیں۔ کو تو بھیا تمہیں ریڈ رائیڈنگ پڑ بھی سکتا ہے۔"

ابراہان جانتا تھا کہ اسے گروہ والوں کی یاد ہے۔ یہ ساری ہے تب ہی وہ اس کا دھیان ہانپنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسے لگتا کہ اس نے اپنا کیک بھی اس کے کیک سے جوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس کے قریب لیٹ گیا۔

"ہاں تو جادو میری جان! گونگ سی کمانی سٹاکس! بالی داوے تمہارے بھیا کو صرف دو کنٹیناں ہی یاد ہیں۔ ریڈ رائیڈ ٹیکس اور ٹوٹا ہوا۔"

"میرے پاس بہت سی بکس ہیں بھیا! یہ خالہ کتنی ہیں کہ مجھے اب کمانی پڑھ کر سونا چاہیے۔ میں اتنا چمڑا نہیں ہوں کہ کمانی سٹاکس پڑھنے میں زیادہ مڑا آتا ہے۔"

"ہوں۔" اس نے چند لمحے غور کیا۔ "میرے پاس اتنی ملدی ہوئے ہو کر کیا کرو گے یا رہا کرو گے؟"

رہنے کی بہت جلدی ہے۔ تمہیں؟ ہم آجے دفن کی آس میں بیٹھے ہیں اور تم ہو کہ باور بخوان ہوئے کاڑواوا دیتے۔"

"آپ کیسے بوڑھے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو اتنے شاندار ہیں! اتنی اچھی باڈی ہے آپ کی۔"

"اوہ! ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" وہ ممنونیت سے بولا۔ "ایسی ہی باتیں کیا کرو جن میں بھیا کی تعریف اور تمہارا بچپنا نظر آئے۔"

عمر پھر خاموش ہو کر چمت کو گھورنے لگا۔

"بھیا! آپ نے مہارے شادی کیوں کی تھی؟"

ابراہان نے عمری سانس بھر لی۔

"آپ کی مہارے اچھی لگتی تھیں! ہم نے شادی کر لی۔" وہ ہنسکتی سے بولا۔

"پھر آپ کی ڈاکی دوس کیوں ہوئی؟"

ابراہان نے عمر کی آنکھوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ "بس بیٹا! کبھی کبھار بوئے ٹالنے آجاتے ہیں زندگی میں۔"

انسان ناز دھما بھرا ہوا جاتا ہے۔ وہ ایسا ہی ایک لمحہ تھا۔ شبیطان غالب انسان مغلوب۔"

وہ اسی کے دھند لگوں میں گھومتا تھا۔

"پھر آپ نے مجھے بھی مہارے سے بچھڑا دیا؟"

"تم۔" وہ چونکا۔ "نہیں تب تک تم۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس بات سے بے پروا ہو کر آیا۔

"بھیا! اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

ابراہان نے عمر کی آنکھوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ "ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ہم سے ملتا ہو اس کی سچ کر لیں۔ سو کر سنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بھیا! تو سوچتے ہوئے بولا۔" عمر نے کہا "مہارے بھیا کی؟"

"بالکل آئیں گی۔" وہ بے حد یقین تھا۔

"تو بھیا! اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

ابراہان نے عمر کی آنکھوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ "ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ہم سے ملتا ہو اس کی سچ کر لیں۔ سو کر سنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بھیا! تو سوچتے ہوئے بولا۔" عمر نے کہا "مہارے بھیا کی؟"

"بالکل آئیں گی۔" وہ بے حد یقین تھا۔

"تو بھیا! اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

ابراہان نے عمر کی آنکھوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ "ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ہم سے ملتا ہو اس کی سچ کر لیں۔ سو کر سنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بھیا! تو سوچتے ہوئے بولا۔" عمر نے کہا "مہارے بھیا کی؟"

"بالکل آئیں گی۔" وہ بے حد یقین تھا۔

"تو بھیا! اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

”کل۔ مجھے ہونے لگا ہے کہ جانا ہے آپ کا دوسرا۔“

”ہاں میری جان مجھے اچھی طرح یاد ہے اور تمہیں اپنی مہمات کیا کہتا ہے یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔“

”نہ نہ تھا! آج آہستگی سے بولا۔“

”تم آخر کس دھیان میں رہتی ہو؟ تم تو بڑے بہت مسئلے تو سب ہی کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن اس کا۔ ظاہر نہیں ہے کہ اس میں بالکل ہی اپنے سر پر سوار کر لیا جائے۔“ وردہ سخت غصہ ہو رہی تھی۔ ناعمدہ خاموش بیٹھی رہی۔

”دو دنوں کا تو ایک طرف“ کہہ کر یہ چوہا تک بند نہ ہو سکا۔ سارا قیام لگ گیا ہے۔ دل تو چاہ رہا ہے اسی شہادت کر کے سخت سناؤ اس کہیں۔“ ناعمدہ نے اسے کہا۔

”سنو ادیں۔“ اس نے توقف کیا۔ آہستگی سے بولی۔ ”ہاں نہیں ابھی کیا کچھ متناہی ہے۔“

”یہاں مطلب؟“ وردہ نے فحاشی سے اس کی جانب دیکھا پھر گہری سانس بھری۔ ”کیا یہ شکل ایسی بنا کر رہے ہو کہ کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا۔ خیر دنیا میں پناہی ہوں، تم جا کر امی کا سر دیکھو۔“

”آئی ہیں ان کے سر میں دو۔“

”اچھا۔ مگر کس بھی لگا رہی ہوں۔“

ناعمدہ راجہ نیکم کا سر کر جلدی سے اٹھ گئی۔ دوسرے کے گرد ان کے کمرے میں پہلی آئی تھی۔

”ای! آپ کے سر میں دو ہے؟“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”ہاں۔“ انہوں نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔ ”دو اور تھوڑے۔“

ناعمدہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے ساتھ پروکس لے گئی۔

”یقیناً خالہ کی ٹینشن لگی آپ نے؟“

”یقیناً کی؟“ انہوں نے بولیں جیسے کسی خیال میں تھیں۔ ”ہاں یقیناً ہے چاری پر بھی ترس آتا ہے لیکن“

ناعمدہ جب حالہ اپنی اولاد کا ہر توان کو کسی اور کی ہاتھی ٹکر نہیں ہوئی۔ ”جی کی بھی نہیں۔“

”میں سمجھی نہیں امی۔“ وہ اچھٹ گئی۔

”ناعمدہ میں۔ میں دورہ کے لیے سخت فکر مند ہوں۔“

”وردہ کے لیے۔“ اس کے ہاتھ رک گئے۔

”ہاں ناعمدہ رانج کے طور ٹھیک نہیں لگتے میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ اسے وردہ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے اور۔ اور آج تو۔ شاید یہ میرا دہم ہو۔ خدا کرے کہ یہ میرا دہم ہی ہو۔ آج تو رانج نے اسے دلچسپ کر لیا ہے۔“

”جیسے امی!“ ناعمدہ یقین انداز میں بولی۔ ”یہ شخص آپ کا دہم ہے۔ رانج بھائی بہت اچھے ہیں۔ بالکل ہی ایسے نہیں ہیں۔“

”تم نہیں جانتیں ناعمدہ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ مہرواٹ کے دل میں کتنے چور خانے ہوتے ہیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے، اتحاد کیہ کر لیں کی شکوہ کا پتہ نہیں جاتا ہے اور۔ اور عذر اچھا بھی نہیں کی کہہ رہی تھیں کہ۔“

”خاموش ہو نہیں۔“ ناعمدہ بھی ٹھہر گئی۔

”کیا۔ کیا کہہ رہی تھیں ماما۔“

”وہ کہہ رہی تھیں کہ رانج۔ شادی کے لیے رضامند نہیں ہے۔“

ناعمدہ کو اور پریشانی سے خاموش ہی رہ گئی۔

”لیکن۔ لیکن کیوں؟“ پھر اس نے بہ دقت پوچھا۔

”وہ تو یہی کہہ رہی تھیں کہ رانج ابھی اپنا کیریئر بنا چکا ہے لیکن ناعمدہ آج میں نے رانج کا چہرہ دیکھا ہے۔“

اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ وہ ایک موٹی آنکھیں تھیں بالکل ایک موٹی آنکھیں۔ بے مروت، سرد مزاج۔

”انہی۔“

ان کی آنکھوں سے آنسو بہا۔ ناعمدہ نے جلدی سے ان کے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لیے۔

”امی۔ امی۔ آپ رو نہیں نہیں۔ اللہ بڑے کرے گا۔ وردہ آپ کی آنکھوں میں ایک ہیں۔ انہیں رشتوں کی یاد“

”نہیں۔“

”وہ غصے کی شدت سے کانپنے لگی۔“

”لیکن وہ لیکن کچھ نہیں سمجھتی رانج بھائی نے ہم سے آنکھیں بھیڑیں تو۔ تو۔“ وہ غصے کی شدت سے کانپنے لگی۔

”مجھے تمہاری طرف سے بہت اطمینان ہے۔“ راجہ نیکم اچانک ہی بولنا تھیں۔ ”فراز بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایسا لڑکا کہ ہاں بایں بیٹوں کی تنہا کریں اور بیٹوں والی ہائیں ایسا دلا دیا ہیں۔“

ناعمدہ کے ہاتھ بالکل جاگرت ہو گئے تھے۔

”جی۔“ اس نے ہتھ لگا لیا۔

”تم بھی ان لوگوں کو کبھی شکایت کا موقع نہ دینا ناعمدہ اس خاندان نے ہم سے تانا جو ڈکڑہاری قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ تم بھی ان کی عزت بنی رہنا۔ عزت بنائے رکھنا۔“

”جی۔“ اس نے سر کر گئی۔

”میرا دل تمہاری طرف سے بہت ٹھنڈا اور مطمئن ہے۔ اللہ ہر نبی کی ماں کا دل ایسا ہی ٹھنڈا اور مطمئن“

ناعمدہ کی آنکھیں جیسے خلا میں جھٹکنے لگی تھیں۔

وردہ ان کے باہر کھڑی دو دنوں سے لب کاٹنے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

”دیکھیں جاری ہو؟“ منیڈر نیکم ٹھٹک کر روک گئی تھیں۔

”وارک کر کے لانا کے کپڑوں میں کھلی کھلی سی رہیہ۔ ان کے دل میں اتار گئی تھی۔“

”جی۔“ میں آپ سے اجازت لینے ہی آ رہی تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ سے ملنے جاری تھی۔ کافی دن ہوئے۔“

”اس کا فون آیا نہ ملا تو۔“ میں نے سوچا۔ دل تو کھن۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں ضرور جاتا۔ تم تو بہنوں باہر نہیں نکلتی ہو۔ میں خود سوچتی ہوں۔ تمہارا دل گھبراتا ہو گا۔“

”جی۔“ میں آپ سے اجازت لینے ہی آ رہی تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ سے ملنے جاری تھی۔ کافی دن ہوئے۔“

”اس کا فون آیا نہ ملا تو۔“ میں نے سوچا۔ دل تو کھن۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں ضرور جاتا۔ تم تو بہنوں باہر نہیں نکلتی ہو۔ میں خود سوچتی ہوں۔ تمہارا دل گھبراتا ہو گا۔“

”جی۔“ میں آپ سے اجازت لینے ہی آ رہی تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ سے ملنے جاری تھی۔ کافی دن ہوئے۔“

UrduPhoto.com

میں اکی: "میرا دل اس وقت جبراً ہے جب تمہیں آپ میں ہو میں۔ آپ کے لئے۔
 روٹن کا احساس رہتا ہے۔"
 "جیسی ہوں۔" وہ مسکرائیں۔ "بہت پیاری بیٹی ہو۔"
 "میں جاؤں گی؟"
 "میں لیکن ذرا کھو میں آیت انگریزی پڑھ کر تم پر دم کھوں۔ بہت پیاری لگ رہی ہو ان کپڑوں میں۔ کئی ل
 نظر نہ لگ جائے۔"
 وہ اس کے قریب آکر کوسٹ انگریزی پڑھنے لگیں۔ اس پر دم کر کے انہوں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ "ریجہ کو یوں کا
 جیسے ان کی خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔"
 "بہت جاؤ۔"
 "جی۔" وہ چونکی پھر مسکرا کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

سیڈ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ اپنے ہی دھیان میں تھی۔ چونکی اس وقت جب کولی میں اس نے
 قافلے آکر کھڑا ہوا تھا۔ ریجہ اسے دیکھ کر ڈری گئی۔
 "ہاں کی اس کے لب کی کیا کہیے
 ہنگامی اک گلاب کی ہے
 انہوں نے بے حد جذب سے شعر پڑھا ریجہ حواس باختہ ہو گئی۔
 "آپ کی تحریف؟"
 "جی۔ میں۔ میں ریجہ ہوں۔" وہ سخت حیران تھی اس کے دیکھ کر۔ لیکن آپ آتے ہیں۔
 "خادم کو سب میاں اختر میاں کے نام سے جانتے ہیں۔" مسکرائے۔ "جب کبھی خیالوں کے آسمان۔
 ٹوٹیں۔ یہیں گرتے ہیں۔"
 "جی؟" وہ مزید پریشان ہوئی۔ "میں دور سے ملنے آئی ہوں۔" اختر نے اس طرح کھڑے تھے کہ اس کے نظ
 کار اسے مسدود تھا۔
 "دور۔ کون دور؟" چھا۔ کب شاید راجہ باجی کی بیٹی کا ذکر کر رہی ہیں۔"
 "جی ہاں۔"
 "آپ کہاں قیام پذیر ہیں؟"
 "جی۔ میں۔ میں۔ قریب ہی۔" ریجہ اس انوکھے انداز پر سخت حیران پریشان تھی۔
 "م کٹر آتی ہیں؟"
 "نہیں۔ نہیں۔ تو نہیں۔ کبھی کبھار۔"
 "ہم تو آپ کو اکثر دیکھنے کے منتظر ہیں۔" وہ مسکرائے۔
 ریجہ عاجزی ہو گئی۔ "جائے کون شخص تھا وہ کہاں سے نکلا۔ اس نے تو آج تک اس گھر میں ان کا
 شخصیت نہ دیکھی تھی۔
 "اوسے اختر۔ کیا کر رہے ہو وہاں۔" فریوس بیگم اتفاقاً ہی لیرس پر چلی آئی تھیں۔ "یہ لڑکی کون

اچھا۔ اچھا یہ تو شہلا کی بہن ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔
 اختر میاں بہن کو دیکھ کر کھجور سے گئے تھے۔ وہ بے لب و لہجہ بھرتے ہوئے ایک طرف کو چل دیے۔ ریجہ گم
 سم ہراساں سی اور وہ کے پورشن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"اے ریجہ تم۔" وہ اسے دیکھ کر دھیس سے مسکرائی۔ "تو تانا۔ بیٹھ۔ کتنے دنوں بعد آئی ہو۔"
 "کیسی ہو دور۔" ریجہ نے اسے گرم جوشی سے ساتھ لگایا۔ "مجھے تم بہت یاد آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا آج
 ضرور مل کر آؤں۔"
 "بہت اچھا لانا۔" دور مسکرائی۔ "آؤ بیٹھے ہیں۔"
 وہ دونوں دور کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
 "میں کچھ دیر سے کئی بول چالے تانا۔" دور اسے بھا کر باہر نکل گئی۔
 ریجہ کا ٹیڈ دیکھنے لگی لیکن دور چند لمحوں میں ہی لوٹ آئی تھی۔
 "یہ کبھی سے مجھے بھی یاد رہا ہے۔" دور نے بھی فون سے تانوس کی۔
 "میں ضرور۔" وہ قریب بیٹھ گئی۔
 "تم۔ خود ہی ایڈیٹ کر دیتی ہو؟"
 "ہاں۔" دور سم سا مسکرائی۔ "مجھے کس نے پتہ کیا کہ یہ بیٹی ہیں۔"
 "جی۔" ریجہ نے اسے دیکھ کر انہوں نے اسے بھا کر باہر نکل گئی۔
 "جی۔" ریجہ نے اسے دیکھ کر انہوں نے اسے بھا کر باہر نکل گئی۔

UrduPhoto.com

دور و خاموشی رہی۔ ربیبہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم کچھ خاموش خاموش سی ہو رہی ہو، آخر تو ہے نا؟"

"ہاں خیر ہے۔ ربیبہ! ایک بات بتاؤ، تم نے کبھی کسی کو پسند کیا ہے؟" دور نے اچانک ہی پوچھا۔

ربیبہ گھبرا کر رہ گئی۔

"نفس نہ پڑے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"تمہیں کبھی کوئی اچھا نہیں لگا رہا ہے؟"

ربیبہ خود پر قابو پا کر ہنسنے لگی۔

"اب تک تو کوئی نہیں لگا، آئندہ کی خبر نہیں۔ جب بھی یہ ماجرہ ہوا، تمہیں ضرور بتاؤں گی۔"

"پراس؟" دور نے جلدی سے ہاتھ آگے کیا تھا۔

ربیبہ نے چونک کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔

"پراس؟" پھر اس کی ہنسی پر ہنسا تھا کہ کہہ کر ہنسی سے بولی تھی۔



"عجب۔ عجب۔" شملہ نے اس کے چہرے کے کئی پوسٹ لے لیا۔ اس کے بالوں کو چومے۔ "میرا بیٹا۔ میری

"آپ مجھے یاد کر رہی تھیں ماما!"

"ہاں! میری جان۔ بہت مست یاد کر رہی تھی میں تب کہ۔"

جیس بھی آپ کو یاد کر رہا تھا ماما! آپ کو ایسا لگا ہو گا جیسے میں آپ کو اس گھر میں گر رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا تب مجھے مس کر رہی ہیں۔"

"میں بہت مس کر رہی تھی آپ کو، میں سب آپ کو مس کر رہی تھی۔"

دو لڑکیاں بیٹا ساتھ ساتھ کھڑے کھڑے مسکے کہہ رہے تھے۔

"آپ خوش ہو عمر؟" پھر شملہ نے آہستگی سے پوچھا۔

"جی ماما! میں وہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں بہت اچھے ہیں۔ ان کا گھر بھی بہت اچھا ہے۔"

"آپ چاہا۔" وہ آزدی سے بولی۔

"ماما! آپ باشم اکل سے کہیں وہ آپ کو چھوڑ دیں۔"

"عمر! شملہ کو یکدم ہلکے سا شاک سا لگا۔ "کیا کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماما! پلیز۔ ہمارا گھر پھر سے بن جائے گا۔ مجھے ماما بھی مل جائیں گی اور بہا بھی۔"

"آپ کب پلیز ہمارے پاس آجائیں۔"

"عمر! خدا اس کے لیے سب کو آئندہ۔"

"ماما! اگر تب کہیں تو میں باشم اکل سے بات کرتا ہوں وہ ضرور میری بات سمجھ جائیں گے، وہ بہت اچھے۔"

"مہ۔" وہ مست تھا۔ جس میں کوئی شک نہیں ہے اور بیٹا! اچھے لوگوں کو دیکھ نہیں دیا کرتے۔

وہ نے ہلکی ہلکی جھپکا جھپکا کر آنسو روکے۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ غلطی سے منہ پھٹا کر بولا۔ "آپ کو میرے لیے یہ سب کچھ کرنا ہو گا ماما! مجھے آپ چاہئیں،

مائی! میں چاہیے۔ پلیز ماما۔"

شملہ دم خود بخود۔

"مہ۔" تمہارے یہاں یہ سب کچھ سکھایا ہے نا۔ اتنی جلدی؟ تم ان کی باتوں میں ڈکرتے مجھ پر

کرت کر بیٹا۔ میں ساری زندگی خود سے نظر نہیں ملایاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ماما! پھر آپ مجھے بھی فورس مست کرنا کہ میں یہاں آکر آپ سے ضرور ملوں۔" اس کی آواز زندہ

ہوئی۔

شملہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسے لگا اس کا دل مطلق کے رستے باہر آنا چاہتا ہے۔ اس مرتبہ کی

گھر بہت دور کی تھی۔ شملہ اس کا تکیہ مہیے مہیے کرتی۔



دل دماغ بالکل سن ہو رہے تھے۔ وہ بہت آہستہ چلتے چلتے لان کے آخری کونے تک آگئی تھی۔ اسے داخل

ہونے لگا کہ اگر اس کے ساتھ اس کے بچے نہ بیٹھتے تو اس داہنی کیفیت میں وہ یقیناً صرف اور صرف خود کشی کے

نتیجہ ہی سوچتی۔ کچھ ایسا کرنے کا بھی چاہتا تھا کہ ساری دنیا میں ایک ذرا وار گونج اٹھے۔ ہر کوئی چونک اٹھے اور

اسے دیکھ کر دھچک دھچک کر رہ جائے۔ تو آواز سے وہ چونکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اندھیرے میں آنے والے

لے آئے۔ اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی آ رہی تھی۔

"کون۔؟" اس نے پکارا۔

"ہم ہیں۔ اختر میاں۔" وہ قریب آگئے۔ "آپ۔" ایتان بیکھ۔ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں۔ اتنی

رات۔

"خاک چھانک رہی ہوں تمہیں کوکھیا۔" وہ تنہی سے بولی۔ "آپ کہیے۔ آوارگی کو فب تک گزار نہیں آیا۔"

اختر میاں بافسرہ سا ہنسنے لگا۔

"دلعنا! ایتان نے ان کی جانب دیکھا پھر وہ دیکھتی ہی رہی۔ اندھیرے میں اختر میاں کی ناامید لہجہ آئیں

افسرہ لگتی تھیں۔

"اختر میاں۔"

"جی۔"

"آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ اگر میں عاشرہ سے طلاق لے لوں تو؟"

اختر میاں سن کر رہ گئے۔

مائی! یہ دنیا بیکھ رہی ہے

اختر میاں یوں کھڑے تھے گویا مٹی کا بے جان بت ہوں حتیٰ کہ ان کے وجود میں سانس کی جنبش تک محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایقان نے اپنی بات کہہ تو ڈالی تھی لیکن اب اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا پورا وجود ایک آگ کے گولے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اس کی سانس دھونکی کی مانند چل رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ بس چند ہی لمحوں میں وہ پوری کی پوری دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گی۔

”ایقان بیگم! اختر میاں کے بت میں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی ”نہیں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ہم ایک بے توقیر ذرے سے درخشاں ستارہ بن جائیں گے ہم نے تو اب سنے میں بھی یہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے اور آپ ہمیں حقیقت میں نہیں۔ شاید آپ ہم سے مذاق کر رہی ہیں آپ آج بھی وہی ایقان ہیں شوخ، زندہ دل، غصیلی، کالنج سے بنی ہوئی اور سب کالنج کی طرح توڑ دینے والی ایقان۔“

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ایقان جواب گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی چونکہ بنانہ وہ سکی۔

”اختر میاں! آپ کی ہی بد دعا لگی شاید۔“ وہ آہستگی سے بولی جیسے غیند میں محو کلام ہو۔ ”دور نہ لو کہی کا تو دل کبھی نہیں دکھایا میں نے۔“

”ہم نے تو ہمیشہ آپ کے لیے دعا کی ہے۔“ وہ جیسے منمنائے ”اور ہمیشہ کھڑے رہیں گے۔ لیکن ابھی کچھ دیر قبل جو آپ نے کہا اسے سن کر تو ہر غم کا نشہ اتر گیا ہمارے سر پر۔ ہم سمجھ نہیں پاتے کہ ہم حواسوں میں لوٹنے ہیں یا حواسوں سے حقیقتاً بے گانہ ہو گئے ہیں۔ آپ کتنے ایسا کیوں کہا؟ یہ میری ہمارے نصیب پر؟“

”پتا نہیں۔“ وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ ”یہ آپ کے نصیب پر میرانی ہے یا پھر اپنے نصیبوں سے بے مری کی انتہا جو کچھ بھی سمجھ لیجیے اسے۔ لیکن اتنا یقین کر لیں کہ میں نے آپ سے مذاق کیا ہے نہ خور سے۔ میں نشے میں بھی نہیں ہوں اور غیند میں بھی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے پورے غم و غوش و حواس کے ہما نشہ یہ بات کہی ہے اور سب اور اب آپ کے جواب کی منتظر ہوں میں۔ بتائیے ایک مطلقہ کی حیثیت سے اپنائیں گے مجھے؟“

”ہم۔ ہم کیا اپنائیں گے آپ کو ایقان! اختر میاں جو پیش جذبات سے پھٹی ہوئی آواز میں بولے تھے۔ ”ہم تو سر سے پاؤں تک آپ کے بن جائیں گے۔ پھر ٹھوکر بھی ماریں گی تو آپ کی چوکھٹ سے نہ اٹھیں گے ہم۔ قسم لے لیں ہم سے۔“

”قسموں وعدوں کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”آپ نے کہہ دیا نہیں کافی ہے۔ اب آپ جائیں اور ہاں پھر منہ اٹھا کر کہیں چل مت پڑیے گا۔ پتا چلے کہ عین موقع پر آپ کے نام کی دھونکی ہو اور آپ حواسوں سے بے گانہ کسی گلی میں پڑے سو رہے ہوں۔“

”طغنت ہو ہماری صورت پر اگر ہم ایسا کریں تو۔“ وہ جذباتی ہوئے ”ہم تو آج سے ہی گھر سے نکلنا چھوڑ دیں گے۔“

”جی ہاں۔“ وہ کھول اٹھی تھی۔ ”میں عدت میں بیٹھتی ہوں۔ آپ بایوں بیٹھ جائیں۔“ اختر میاں لرزے گئے تھے۔

”ایقان بیگم! ایک۔ ایک بات پوچھیں آپ سے۔ یہ اچانک آپ کو کیا ہوا؟ ایک ہنسی بستی زندگی سے منہ موڑ کر آپ ہم سے دیوانے سے یہ کیا مانگ رہی ہیں؟ ہم تو اپنا دیوانہ پن ہی دے سکتے ہیں آپ کو۔ آپ کی زندگی کو کسی بہار کی نوید نہیں سنائیں گے ہم۔“

ایقان نے زخم زخم نظروں سے اندھیرے میں ان کے اجاڑ نقوش کو دیکھا تھا۔

”میری زندگی کو کسی بہار کی ضرورت نہیں رہی اختر میاں! یہاں تو بس ہر شے کو جلا کر راکھ بنا دینے کی تمنا

میں اپنے جلنے کا تماشا آپ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہنسنا چاہتی ہوں اپنی راکھ پر۔“

”پچھو! پچھو!“ وہ غصتا ”کنیں قریب سے ہی آواز بھری تھی۔“

ایقان اور اختر میاں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ پھر یکدم ہی رافع سامنے آگیا تھا۔

”پچھو! آپ یہاں ہیں؟ اس وقت؟“ وہ سخت حیران تھا اور اختر میاں! یہ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

اختر میاں کی مٹی گم ہو گئی لیکن ایقان کے جاہد انداز میں فرق نہ آیا تھا۔

”غیند نہیں آ رہی تھی رافع۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”ایک جگہ سی پرپا تھی وجود میں کچھ دیر ٹھلنے کے لیے یہاں آگئی۔ اور یہ۔ اختر میاں ان کی اختر شمار یوں سے کون واقف نہیں ہے۔“

”پچھو! رافع نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ”چلیں اندر۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ پھر ڈاکٹر نے خاص طور پر آپ کو ٹینشن سے دور رہنے کے لیے کہا ہے۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر سوائے ٹینشن کے کیا حاصل ہوتا ہے بھلا؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے اس کے پورشن کی طرف جانے لگا۔

”بچوں کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں؟ اگر سوئے تھے تو؟ آپ کو گھر میں نہ پا کر وہ کس قدر ڈسٹرب ہو سکتے ہیں کچھ انداز ہے آپ کو؟“

”رافع۔“ وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ ”اگر میں مراؤں رافع! تو شہلا سے کہنا میرے بچوں کو وہ

”ایقان! آپیں عاشر کو بہت دانا۔“ ایقان نے کہا تھا ”میں نے کہا تھا آپ صرف آرام کریں۔ فضول مت سوچیں۔ نیند نہیں آئی تو ٹیبلٹ لے لیں۔“

”ایک دو گولیوں سے فرق نہیں پڑتا رافع! وہ بچوں کی طرح بولی۔ ”پھر دل چاہتا ہے کہ روز نیند کی منت حاجت کرنے سے بہتر ہے کہ آدھی پوری شیشی کھالو ایک بار موت کی دعوت ہی کر ڈالے۔“

”خدا کا واسطہ ہے پچھو! وہ اپنی جگہ دروازے کے سامنے رک گیا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کو میں نے کبھی ایسا تصور نہیں کیا تھا۔ اس قدر جذباتی پن۔ شادی شدہ زندگی میں بڑے بڑے متحرکے مر کرنے پڑ جاتے ہیں ڈیر پچھو! آپ تو بہت دو ٹولیں۔“

”تم نہیں سمجھو گے۔“ اس نے گہری سانس بھری تھی۔ ”جاؤ۔ سو جاؤ۔ اتنی رات کو تم کس لیے جاگ رہے ہو؟ ابھی تم تو کسی معرکے سے دوچار ہونے کی یوزیشن میں بھی نہیں ہو۔“ رافع دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

”ہر میدان کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ڈیر پچھو! ایک مصرعہ انک گیا تھا ذہن میں سو بھانسن نکالنے کی کوشش میں تھا اور اب میں آپ کو یوں چھوڑ کر جانے والا نہیں ہوں۔ چلیں میرے سامنے دو آئی کھائیں گرم دودھ پیئیں اور اپنے بچوں کے ساتھ سکون سے لیٹیں۔ پھر میں جاؤں گا۔“

”دو آئی میں کھانوں گی۔ دودھ بھی پی لوں گی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”بچوں کے ساتھ لیٹ بھی جاؤں گی لیکن سکون؟ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے تم جاؤ۔ اپنا وقت مجھے کم نصیب کے لیے خراب مت کرو۔ مجھے تو اب اس کی عادت ہے۔ صبح ہوتے ہوئے غیند بھی آئی جائے گی۔ آخر کو انسان ہوں۔“

”اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ لیکن پلینز پچھو! کوئی الباسیدھا کام مت کیجیے گا۔ کچھ بھی نہیں بگڑا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھروسہ کیجیے۔“

”جانتی ہوں رافع! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

”اب میں چلوں؟“ وہ مشکوک سا تھا۔
 ”ہاں تم جاؤ۔ شب بخیر۔“ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔
 رافع پریشان سا کافی دیر وہیں کھڑا رہا تھا۔

”ای جی۔۔۔! درد کافی گھبرائی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ ”یہ ان لوگوں کا ہر کام ایسے جلد بازی اور افراتفری میں ہی کیوں ہوتا ہے بھلا؟ انہیں سکون و اطمینان کے معنی نہیں آتے کیا؟“
 ”کیا ہوا؟ خدا خیر کرے۔“ رابعہ بیگم گھبراہٹ میں کہیں۔ ”کس کی بات کر رہی ہو؟“
 ”فراز کے گھر والوں کی۔۔۔ اب ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ان کے سروں پر ریوالتا ہے۔ کھڑا ہے۔ ابھی فریج کا فون آیا تھا۔ کہنے لگی ہم لوگ آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ضرور آؤ سر آٹکھوں پر تب بولی۔ ہم شادی کی تاریخ رکھنے آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس موقع پر بہت خاص قسم کے لڈو بنوائے جاتے ہیں بیگم چونکہ وہ بھی فریج کا وقت کم ہے اس لیے کس مٹھائی کے نوکرے بنوائے ہیں۔ آپ لوگ پسند کر لیں گے یا؟“
 ”ہاں! رابعہ بیگم بھی چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ ”تاریخ رکھنے؟ یوں اچانک؟“
 ”جی ہاں! وہ تپتی ہوئی تھی۔ ”ہے کوئی تک ہتھیلی پر سرسوں جمائے کی؟ اب شام تک دعوت کا بندوبست کرنا آسان کام ہے بھلا؟ اس نے کہا ہے کہ قریباً آٹھ دس افراد ہوں گے۔“
 ”لیکن ہم بھی تو اپنے سب ہی رشتے داروں کو بلا میں گے۔ اس طرح پچاس ساٹھ افراد تو بن جاتے ہیں۔“
 رابعہ بیگم کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔

”بخیر آپ نیشن نہ لیں۔“ درد نے ان کی صورت دیکھ کر فوراً انہی پر سکون انداز اپنایا۔ ”سب ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ ہم بازار سے پکایا کھانا منگوا لیتے ہیں۔“
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”میں رافع جیسے کہتی ہوں وہی انتظام سنبھالے گا۔“
 ”ای جی۔۔۔! درد آہستگی سے بولی تھی۔ ”ہاشم بھائی بھی تو ہیں گود چڑھ اور علی بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ میں بڑے ماموں کے یہاں جا رہی ہوں۔ انہیں شام کی دعوت بھی دے دیتی ہوں اور کھانے کے متعلق بھی سارا کچھ ڈسکس کر لوں گی۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ ابھی سب گھر پر ہی ہوں گے۔ وہ میزوں پر کرسیاں بٹھال لیں گے۔“

”اچھا! جیسے تمہاری مرضی۔“ رابعہ بیگم چپ سی ہو گئیں پھر جیسے انہیں خیال آیا تھا۔
 ”آج چھٹی ہے۔۔۔ بینک سے پیسے بھی نکلوانے ہوں گے۔“
 ”کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ اے ٹی ایم سے نکال لوں گی میں۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں سب بالکل خیریت سے ہو جائے گا۔“

وہ پلٹ کر جانے لگی تھی۔
 ”بات سنو درد! رابعہ بیگم نے اسے پکارا۔
 ”جی ای۔۔۔! وہ اگلے قدموں پلٹ آئی۔
 ”وہ لوگ۔۔۔ کب کی تاریخ رکھنے کا کہہ رہے ہیں؟“ وہ قدرے فکر مندی پوچھنے لگیں۔
 ”میرا خیال ہے اگلے چاند کی کوئی تاریخ نہ ہو۔“
 ”ہائیں۔۔۔! وہ سچا نکلیں۔“ اس قدر افراتفری؟ تم ٹھیک کہہ رہی ہو ان کا کوئی کام بھی جلد بازی سے خالی

نہیں ہے۔ یہ ناعمہ ہے کہاں؟“
 ”سورہی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”اٹھاؤ اسے۔۔۔“ وہ جھلا میں۔ ”ہم یہاں دبلے ہوئے جا رہے ہیں اور وہ ٹھانڈے سے بستر کی سر کر رہی ہے بلکہ تم جاؤ میں خود جگاتی ہوں اسے۔“
 ”بستر کی سر؟“ درد کو ہنسی آگئی۔ ”تب ہی اکثر پٹنگ سے نیچے گر جاتی ہیں محترمہ۔ فراز کو کھنا پڑے گا کہ اس کے سائیڈ میں تکیہ لگا دیا کرے۔“
 رابعہ بیگم بھی ساری فکر بھول کر ہنس پڑی تھیں۔

شیشے کا پیرونی دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ فردوس بیگم سامنے ہی صوفے پر براجمان ہرے پتے ”السلام علیکم ممانی جان! درد ان کے قریب جا بیٹھی۔
 ”و علیکم السلام۔“ انہوں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے نوکری پرے کی۔ ”آؤ بھئی عرصے بعد شمل دکھائی ہے تم نے لگتا ہے کوئی خاص کام ہے آج ہم کو کوئی سے۔ کیوں؟“
 درد دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

”ٹھیک سمجھی ہیں آپ۔ بہت ذہین ممانی ہیں آپ میری۔“
 ”جی ہاں۔۔۔ یہ تو سب سامنے کی بات ہے۔ توں تو ہم بہت کوڑھ مغز ہیں ذہین تو تمہاری چھوٹی ممانی ضرور ہوں گی۔ سارا جوتہ لڑکی تمہاری۔“
 اپنی بات سے محفوظ ہو کر انہوں نے خود ہی قہقہہ لگایا۔ درد بھی دھیسے سروں میں ان کی بے تکلی ہنسی میں شریک ہوئی تھی۔

”اچھا! کوسے کیسے آتا ہوا؟“ انہیں فوراً ہی اصل بات یاد آگئی۔
 ”آج شام ہمارے ہاں آپ سب کی دعوت ہے۔ اصل میں ابھی ابھی فریج کا فون آیا تھا۔۔۔ وہ لوگ ناعمہ کے لیے تاریخ لینے آ رہے ہیں۔ اس موقع پر آپ سب لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔“
 ”ناعمہ کی تاریخ؟“ ان کا منہ کھل گیا۔ ”شادی کی تاریخ؟“

”جی ہاں۔۔۔“ وہ ان کے انداز سے قدرے گھبراہٹ ہو گئی۔ ”شادی کی ہی تاریخ رکھنا ہے ممانی!“
 ”اور تم اب بتا رہی ہو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”بخیر۔۔۔ شکوہ بے جا ہے۔ پہلے کون سا تم لوگوں نے کسی بات میں شریک کیا ہے جواب کرو گے۔ سہانوں کی طرح وقت سے ہلاتے ہو۔ ہم بھی سہانوں کی طرح ہی آئیں گے۔“
 انہوں نے ذہن نہ نوکری اپنے آگے کر لی اور چپے نکالنے لگیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے ممانی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ابھی فریج کا فون آیا ہے اور میں ابھی آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔ بلکہ آپ یوں یقین کریں کہ اگر جنٹ نوٹس پر کھانا بھی پکا ہوا منگوانا ہے اور مجھے اس سلسلے میں ہاشم بھائی اور حیرت سے بھی مشورہ کرنا ہے۔“

”مگر مشورہ۔۔۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔ ”ہم نے کب روکا ہے۔“ پھر دفعہ ”ان کے ہاتھ رکے تھے ان کے انداز میں یکدم ہی اپنا سیت در آئی۔“
 ”بات سنو درد! یہ عذرا کا کیا خیال ہے رافع اور تمہارے بارے میں؟“

”خیر تم فکر مت کرو۔ رائہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی سمجھا دے گی تمہیں سب کچھ۔ اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ موقع تو خوش ہونے کے ہوتے ہیں بیٹا۔ لڑکیاں تو انجوائے کرتی ہیں ان چھوٹی چھوٹی رسموں کو۔ تمہارا تو رنگ یوں اڑ گیا ہے جیسے کپڑے پر بلیچ ڈال دو۔“

”امی! اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔“ پتا نہیں مجھے ڈر بہت لگ رہا ہے!

راجہ بیگم کو بے اختیار ہی اس پر پیار آیا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”آپ۔ آپ۔ آپ ان لوگوں کو منع کریں۔“

”ناعمہ! وہ حد درجہ حیران ہوئیں۔“ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ خوشی کے موقعوں پر ایسی بے سروبا باتیں منہ سے نہیں نکالتے بیٹی!“

پھر وہ قدرے اداس ہوئی تھیں۔

”تمہارے والد اگر زندہ ہوتے۔ تو کیسی تسلی ہوتی مجھے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ایک کار دشوار ہے۔“

راجہ بیگم کا بوجھ تھا ناٹھنا۔ بہت کم حوصلہ ہو رہی ہوں میں اور تم ایسی صورت بنا کر اور ایسی فضول باتیں کر کے مجھے مزید بے حوصلہ کر رہی ہو۔ خدا کے لیے سب اچھا بولو۔ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکلے۔“

”لیکن امی جی! پہلے درد آتی کا کچھ تھا!“ وہ کچھ اور سمجھ میں نہ آنے پر احتجاجا بولی۔

”یہ سب تو اللہ کو بتا ہے بیٹا جی! یہ لکھا ہوا ہے اس کا۔ اس نے اگر تمہاری خوشی درد سے پہلے لکھی ہے تو اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ باتیں ایسی نہیں کہ انہیں زیادہ سوچا جائے۔ پھر وہ مطمئن ہے تو تمہیں کاہے کی فکر؟“

درد میری بہت پیاری بچی ہے مجھے فخر ہے اس پر۔“

”میں پلا رہی نہیں ہوں!“ اس نے منہ بسورالیا۔

”یہ میں نے کہا تھا!“ وہ کچھ اور سمجھ میں نہ آنے پر احتجاجا بولی۔

راجہ بیگم سے پوچھو اس کے ساتھ کتنی شہنی کی تھی میں نے۔ اب کبھی سوچتی ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔“

وہ نبھانے کیا کچھ سوچنے لگی تھیں۔ پھر کچھ خیال آئے پر چونک اٹھیں۔

”اچھا خیر۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ وقت شائع مت کرو کپڑے ایک مرتبہ پہن کر فنگ وغیرہ چیک کر لو! کہیں عین وقت پر کچھ کام نہ نکل آئے تو اس کے ساتھ مل کر فائٹ گھر کو سدھار لو۔ میں ذرا ماں جی کی طرف جاتی ہوں۔“

”جی! اس نے منہ بسورالیا۔“

راجہ بیگم کے جانے کے بعد وہ بے کلی سے ٹھننے لگی تھی۔ شادی کی رات سے قبر کی رات تک رونے کا تصور انتہائی لرزہ خیز اور جان لیوا قسم کا تھا لیکن وہ اپنے بارے میں بھی جانتی تھی۔ اس سلسلے میں اس کی لبوں سے کوئی بات نکلنے والی نہ تھی۔ اپنی ماں کے دکھوں سے وہ بخوبی واقف تھی اور اس میں رتی بھر اضافہ اسے کسی طور گوارا نہ تھا۔ خواہ اس کے لیے اسے حقیقتاً شادی کی رات سے قبر کی رات تک روٹنا ہی کیوں نہ پڑتا۔

وہ کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ساری رات نیند پلوں کے قریب نہ پہنچی تھی۔ اب سردرد سے پٹنا عار ہا تھا اور طبیعت بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ یکدم موبائل کی لرزش سے اس کی غنودگی ٹوٹی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسکرین پر نام دیکھا پھر موبائل آن کیا۔

”ہیلو۔“

”جی! میں کچھ سمجھی نہیں ممانی جان!“ وہ الجھ سی گئی۔

”ممانیہ کی بھی تاریخ رکھی جانی ہے چند دنوں میں۔“ تو کیا تمہاری اور رافع کی بھی۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ گھبرا سی گئی۔ ”مجھے تو ایسی کوئی بات نہیں نکلی۔ پھر ناعمہ کے جانے سے امی کے پاس میرا ہونا ضروری ہے۔ میں خود اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں ہوں۔ امی بہت اکیلی ہو جائیں گی۔“

”سنا ہے رافع بھی ٹال مٹول کر رہا ہے۔“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”مجھے تو اس کی خبر نہیں ممانی جان!“ اس کے چہرے کی خوت بچھ گئی تھی۔

”کیا خیال ہے تمہارا۔“ وہ اچانک ہی پراسرار ہو گئیں۔ ”اگر ہم رافع اور عریشہ کی بات چلائیں تو ٹھیک ہے؟“

”ضرور۔“ وہ مختصراً بولی۔

”تم حمایت کرو گی ہمارے مطالبے کی؟“

”کیوں نہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”جیتتی رہو۔“ وہ یکا یک ہی خوش ہوئیں۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ ایک ہی فخر کے تین بوجھ اتر جائیں گے۔“

عریشہ، ممانیہ اور ناعمہ۔ تین سہیلیاں تینوں ساتھ ہی دکن نہیں گئی کیوں درد؟“

”بالکل ٹھیک ہے ممانی! وہ مسکرائی۔“

”تم تو تینوں سے بڑی ہو ورو۔“ انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”تمہارا دل تو خراب نہ ہو گا؟“

”کمال کرتی ہیں ممانی جان۔! یہ تو نصیب نصیب کی بات ہے۔“ وہ رسائی سے بولی۔ ”جس کا جیسے لکھا ہو۔“

”آپ میری فکر نہ کریں میں اتنی چھوٹی باتوں پر دل خراب نہیں ہوتی۔“

”تم کھانے کی بات کر لو ہاشم اور حمزہ سے۔“ انہوں نے اسے دو گزین شکل دکھایا۔ ”دونوں آپریشن سے بچ دیکھ رہے ہیں۔“

”جی اچھا۔“ وہ سیرھیوں کی جانب برہم ہوئی تھی۔

اسے آنا دیکھ کر عریشہ آڑ میں ہو گئی تھی۔

اس کا رنگ سفید بر لگتا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

”لیکن امی! اتنی جلدی سے کیوں؟“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”ممانی! کیا کریں۔ جلدی تو لگتا ہے ان لوگوں کی کٹھی میں شامل ہے۔ ہر کام جلدی دوڑھاگ میں۔“

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جلد یا بدیر۔ کام تو بہر حال ہونا ہی ہوتا ہے۔ تم اس روز ممانیہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں تو ایک ہرے رنگ کا سوٹ لائی تھیں نا؟ وہی جس پر شاید سفید کام تھا؟“

”وہ۔ بالکل گرین سوٹ موتیوں کے کام والا؟ وہ تو۔۔۔ درد آتی کے لیے لائی تھی۔“ وہ اب تک ہم صم سی کیفیت کا شکار تھی۔

”ہاں تو تمہارا ٹاپ تو تقریباً ایک سا ہے۔ وہ سوٹ پہن لو۔ ساتھ میں میرا موبیل والا سیٹ بھی پہن لو۔ ہاں پھلکا میک آپ ضرور کر لینا۔ لڑکیاں تو ایسے موقعوں پر خوب جی جان سے تیار ہوتی ہیں تمہیں تو کسی بات کی تمیز ہی نہیں ہے بالکل۔“

وہ ایک دم خفاسی ہوئیں پھر اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر نرم پڑ گئیں۔

کرنے سے بچائیں۔ عاشق بھائی سے رابطہ کرنا ناگزیر ہے۔ ”وہ سوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔
 ”تم اماں کے سامنے ہرگز ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔“ عذرا بیگم نے اسے ٹوکا۔ ”وہ پہلے ہی ایقان کے بارے میں
 در درجہ فکر مند رہتی ہیں۔ ایسی باتیں سنیں گی تو بیمار پڑ جائیں گی۔“
 ”جانتا ہوں۔“

”اب کیا کرو گے؟“ عاشق کا نمبر کہاں سے لو گے؟
 ”آپ اپنے طور پر پچھو سے پوچھنے کی کوشش کریں شاید وہ بتا ہی دیں۔“
 ”لیکن کیوں؟ کیا انہوں اس سے...؟“ وہ جزبز ہوئیں۔
 ”کوئی بہانا بنا دیں۔ کہہ دیں ان کا کوئی دیرینہ دوست ملا تھا؟ وہ مانگ رہا تھا۔“
 ”تو پھر تم ہی کہو نا۔“ وہ بھننا میں۔ ”عاشق کا دیرینہ دوست مجھے کہاں مل جائے گا؟“ رافع چونکا پھر مسکرا دیا۔
 ”ٹھیک ہے۔ میں ہی کہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

تقریب کا اہتمام لان میں کیا گیا تھا۔ ہاشم نے انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔ ہر چیز میں ”بینجمنٹ“ خاص
 طور پر نظر آ رہی تھی۔

”راجہ! سن! یہ سب بہت زیادہ کر لیا آپ نے۔“ راجہ بیگم ان کا ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔
 ”جی آئی۔“ فریجہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ ”ہم نے تو خاص طور پر کوشش کی تھی کہ بالکل گھریلو انداز میں
 تقریب کو منایا جائے۔“ جب ہی ارجنٹ ٹوٹس دیا تھا آپ لوگوں کو لیکن آپ لوگوں نے تو بہت عمدگی سے سب
 کچھ مناج کر لیا۔“

”اللہ سلامت رکھے بچوں کو۔“ راجہ بیگم مسکرائیں۔ ”ان ہی کے دم سے ساری رونق ہے اور رہی بات
 تقریب کی تو ان بچیوں کے سوا میرا کون ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر اگر اپنے ارمان نہ نکالوں گی تو پھر کب
 ڈسٹیاں اتریں گی یہاں۔“

”آئی! میں ناعمہ کے پاس چلی جاؤں؟“ فریجہ کھڑی ہوئی تھی۔ ”وہ اندرا سیلی بیٹھی ہوگی۔“
 ”ہاں ضرور۔“ لیکن ابھی اصل کام تو باقی ہے اور تم اندر جا رہی ہو۔“
 ”ماتن! آپ لوگ بیٹھ کر اس یہ اپنا ڈپارٹمنٹ نہیں۔“ وہ ہنسی تھی۔ قریب بیٹھی دور کو ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ
 در کی جانب بڑھ گئی۔

سفید موتیوں کے کام سے مزین بائبل گرین کلر کے کپڑوں میں ملبوس وہ بہت معصوم اور شگفتہ نظر آ رہی تھی۔
 از رنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ کر وہ قدرے محویت سے خود کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے آئینے میں
 ایک اور عکس کو اپنے عکس کے پیچھے ابھرتا ہوا دیکھا۔ ناعمہ چونک کر مڑی۔
 ”عزیز! تم۔“

وہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ ناعمہ کے پکارنے پر وہ چند
 قدم بڑھا کر اندر چلی آئی۔ سیاہ کپڑوں میں اس کی رنگت زرد اور مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔
 ”مبارک ہو۔“ اس کے لب ہلے۔ ”فراز کا ساتھ ملنا کس قدر خوشی کی بات ہے۔ ہے نا۔ تمہارا یہ دیکھنا روپ
 کار ہے۔“

”شہلا! ہاشم بات کر رہا ہوں۔“ وہ گہیر آواز میں بولا تھا۔
 ”جی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ڈسٹرب تو نہیں کیا تمہیں؟“ وہ محتاط انداز میں بولا تھا۔
 شہلا کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔ ہاشم کے انداز میں پچھلے کچھ دنوں سے در آنے والی اجنبیت اس کے لفظ
 لفظ سے ٹپکتی تھی۔ نجانے کیوں۔ شہلا کے دل کو نہیں سی لگتی تھی۔
 ”ایسی باتیں نہ کیا کریں ہاشم! بہت اجنبی سے لگتے ہیں۔“

”اجنبیت تو احساس ہے شہلا! باتوں سے در آئے رویوں سے یا پھر دو افراد کی قسمت میں ہی رقم ہو۔ خیر۔ میں
 کہہ رہا تھا کہ تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“

”خیریت؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔
 ”کیا بات ہے شہلا! کیا تم یہاں آنا نہیں چاہتیں؟“ ہاشم الجھ سا گیا تھا۔ ”اپنے گھر واپس آنے کے لیے بھی
 تمہیں اور مجھے ایسے سوال جواب کی ضرورت ہے؟ بہر حال بات یہ ہے کہ ناعمہ کے بے خیال والے اس کی شادی
 کی تاریخ رکھنے آرہے ہیں۔ امی کا خیال ہے کہ ہم لوگ اس موقع پر عریشہ اور بٹاخ کی تانت بھی ساتھ ہی رکھ لیں۔
 اسی سلسلے میں چچا جان کی طرف جارہے ہیں۔ میرا خیال ہے اس موقع پر تو تمہارا یہاں ہونا ضروری ہے؟“
 ”جی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میں خود آجاتی ہوں۔ کون سا زیادہ رستہ ہے۔ آپ خواجواہ تکلیف کریں
 گے۔“

ہاشم چند لمحے خاموش رہ کر دھیرے سے ہنس دیا تھا۔
 ”اور ابھی تم میرے الفاظ سے ٹپکتی اجنبیت کی شکایت کر رہی ہیں۔“ فریجہ نے کھنکھہاتے ہوئے کہا۔
 آپ کی ہمراہی عین راحت و سعادت ہے۔ تم تیار رہو۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ شہلا اس کے
 لطیف طنز کے متعلق سوچتی رہ گئی۔

یہ حد پریشانی کے عالم میں اس نے فون بند کیا تھا۔ ریسور پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت استغراق کی کیفیت میں نظر آیا۔
 عذرا بیگم اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔
 ”رافع! انہوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
 وہ چونکا اٹھا۔

”جی! امی۔“ اس نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کے ساتھ کیا گیا ان کا مائٹریکٹ ختم ہو گیا
 ہے۔ اب وہ کہاں گئے ہیں؟“ نہیں خبر نہیں ہے۔“

”یا خدا۔“ وہ پریشان ہو گئیں۔ ”یہ کیا ماجرا ہے۔ ایقان تو کہتی ہے کہ وہ اکثر وہ بستر بچوں سے بات کرنے کے
 لیے فون کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ایقان کو نہ سنی بچوں کو تو ضرور بتاتا۔“
 ”ہو سکتا ہے پچھو کو اس کا علم ہو۔“ رافع نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن ہم اسے تو نہیں کہہ سکتے ناکہ ہمیں عاشق سے رابطہ کرنا ہے۔ اس کی فطرت سے تم بخوبی واقف ہو۔“
 عذرا بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

”کچھ بھی ہو امی جی! میں کل رات کے واقعہ سے سخت خوفزدہ بھی ہوں اور پریشان بھی۔ پچھو کو قطعاً اندازہ
 نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہی ہیں؟ کچھ بھی غلط کر سکتی ہیں۔ ایسے میں ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ انہیں کسی کھالی میں
 نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہی ہیں؟“

ناعمہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔ اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں اس کے انداز میں وحشت کا راج تھا۔ عریشہ آکر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں ناعمہ کو اس دیوانی لڑکی سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔

”بہت خوش ہو ہوں؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے سر جھکا کر قدرے اداسی سے کہا تھا۔ ”بالکل خوش نہیں ہوں۔ محض مجبوری ہے۔“
 ”اوہ۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”مجبوری۔۔۔ مجبورا شادی کر رہی ہو اس سے؟ جانتی ہو ناعمہ! مجبورا شادی کیسے کی جاتی ہے؟ جیسے میں کر رہی ہوں ایسے۔“
 ”جانتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم کیا جانو گی۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”تمہارے دل پر تو ان عذابوں کا سایہ تک نہیں اترا جو میری ذات کے اندر پر پھیلائے کھڑے ہیں۔ صرف اتنا جان لو جو تمہارا بننے جا رہا ہے اس نے کبھی میری محبت کا دم بھرا تھا۔ میرے فراق میں آہیں بھرتی تھیں، میرے لیے راتیں جاگی تھیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ جب میں زنجیروں میں جکڑی گئی، تب وہ تمہارے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ جانتی ہو کیوں؟ صرف اور صرف مجھے جلانے کے لیے، میرا تماشا بنانے کے لیے۔ یہ جتانے کے لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف دل کا بہلاؤ اور تفریح تھی اور تم۔۔۔“ اس نے نفرت سے ناعمہ کو دیکھا۔ ”تم بھی خوشی خوشی اس کے ٹھیل میں شریک ہو گئیں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں ان ساری باتوں کا علم ہے یا نہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن اتنا جان لو کہ میرے قاتلوں کی فہرست میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ مجھے تم سے بھی نفرت ہے مجھے سب سے نفرت ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی تھی ناعمہ آسف سے اسے دیکھتی رہی۔

”مت رو دو عریشہ!“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”تم رو کوئی تمہارا یا تمہاری خوشیوں کا قاتل نہیں ہے یہ سب نصیبوں کے پھیر ہیں۔ دل کسی کا ہوتا ہے وجود کسی اور کا ہو جاتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔“
 ”مت بہلاؤ مجھے ان جھوٹے لفظوں سے۔“ وہ پھنکارنی۔ ”ابھی تم بہت خوش ہوئے تھے پانے جا رہی ہو اسے آسمان کا چاند سمجھتی ہو لیکن یاد رہے چاند صرف چند لمحوں کے لیے اپنا ہوتا ہے پھر پل گزرتے ہیں اور وہ دوسری چھت پر نظر آتا ہے۔ وہ جو کل مجھے مجھ سے محبت کرتا تھا۔۔۔“

”وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“ ناعمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”فرق اتنا ہے کہ محبت نے روپ بدل لیا ہے اور اسے اس کی خبر نہیں ہے۔“
 عریشہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔
 ”کیا مطلب؟“ پھر وہ بولی تھی۔

”تمہیں یاد ہے عریشہ!“ ناعمہ آہستہ آہستہ بولنے لگی تھی۔ ”جب ہم اپنی اسکول میں پڑھتے تھے تب ہمیں انگریزی کے استاد گھر پر رکھانے آتے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ یاد ہے۔۔۔ لیکن یہاں ان پرانی باتوں کا کیا ذکر؟“

”تب ہم اکثر ان کے گھر فون ملا کر انہیں مختلف طریقوں سے تنگ کیا کرتے تھے۔ ہے نا؟“

”ہاں۔“ وہ قدرے اکتاہٹ سے بولی۔ ”پھر؟“

”انہیں کبھی اندازہ نہ ہوا تھا کہ ہم ایک نہیں دو مختلف لڑکیاں ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلا تھا کہ ہماری آوازیں اور ہمارے بولنے کے انداز میں بے تحاشا مماثلت ہے۔ تب ہم نے تنوں کو ایک لڑکی بن کر بے وقوف بنایا تھا۔ آدھی بات تم کیا کرتی تھیں آدھی میں اور کبھی کوئی ہماری چوری نہ پکڑ پایا تھا۔ ہے نا؟“

عریضہ یوں چونکی تھی جیسے اسے کرنشلنگا ہو وہ ششدر سی اسے دیکھے گئی۔

”تم تمہارا تمہارا مطلب ہے کسے؟“
”ہاں۔“ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔ ”فرز کو بھی کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے ایک نہیں دو مختلف لڑکیوں سے بات کی ہے۔“

عریضہ یکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور یوں تم نے میری محبت، ہتھیالی اور اسے اور اتنے اطمینان سے مجھے بتا رہی ہو۔“
”نہیں عریضہ! ناعمہ بات کو بننے کے بجائے بگڑا دیکر گھبرا گئی۔ ”تم میری بات تو سمجھو۔“
”تب ہی تم نے کہا کہ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ تم نے سچ میں آکر نجانے کس طرح اس کی راہ کھولی کر دی۔ اسے اپنی جانب کھینچ کر لے گئیں۔“
”نہیں عریضہ! تم جانتی ہو تمہارا نکاح نافع سے ہو گیا تھا۔“

”ہاں ہوا تھا نکاح لیکن میری نظر میں صرف اور صرف میرے دل کے رشتے کی ہی بات تھی۔ وہ مجھے چاہتا ہے اور میں اسے۔ اسی بات پر میں عمر گزار سکتی تھی لیکن۔ لیکن تم بے ایمان لڑکی! تم نے ہمیں ایک عجیب انجانی کسک میں مبتلا کر ڈالا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو میں اس بات کو آسانی سے بھٹول جاؤں گی؟ نہیں تمہیں تمہاری اس بے ایمانی کی پوری سزا ملے گی۔ نہ میں نافع کی بنوں کی اور نہ فرار کو تمہارا بیٹنہ دوں گی۔ سنا تم نے۔“

”آہستہ بولو عریضہ! ناعمہ کا کلیجہ کانپ گیا۔ ”کوئی سن نہ لے۔“
”جس کو سننا چاہیے وہ سب ضرور سنے گا۔“ وہ ایک عزیمت سے بولی۔
پھر وہ بچی اور کمرے سے نکل گئی۔ ناعمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔
”محسوس ہو رہے تھے۔ حلق میں کانٹے کانٹے لگے تھے۔ نجانے تقدیر اس کے ساتھ کیا کرے والی تھی۔“
”بھابھی! کسی نے یکدم قریب سے کہا۔“

ناعمہ بری طرح چونک اٹھی۔ اس کے پاس فریحہ کھڑی ہوئی تھی۔

تارکول کی سیاہ سڑک تاحد نگاہ نظر آتی تھی۔ اس سے پرے سیاہ بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے سے جڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ گویا کسی کارستہ روکنے کی تیاری کر رکھی ہو۔ مغرب سے پرے کا وقت تھا۔
”نے سر اٹھا کر دیکھا تو سرمئی آسمان اپنا رنگ بدلنے لگا۔ اس کے کناروں پر جیسے بدلیوں میں آگ سی لگ گئی۔ پل بھر میں آسمان گلابی ہو گیا تھا۔“

ربیعہ کو احساس ہوا دور دور تک محض ویرانہ تھا۔ کہیں آبادی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ ربیعہ گھبرا سی گئی۔ ایسے سنسان پہر میں وہ تنہا وہاں کھڑی تھی۔

”ربیعہ! اسے کسی کی سسکی سنائی دی۔ ”ربیعہ! میں۔ میں۔ میں۔ یہاں ہوں۔ یہاں۔“
ربیعہ نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں پھر میں۔ وہاں کوئی نہ تھا تب ہی ایک شور کے ساتھ ہوائیں چل پڑی تھیں جیسے سارے بادل ابھی برسنے والے ہوں۔ ربیعہ کا جی جاہا وہاں سے بھاگ جائے۔

”ربیعہ! ربیعہ! کوئی رو رہا تھا۔ ”ربیعہ! یہاں آؤ۔ میں۔ میں۔ میں۔ تمہارے قریب۔ آؤ۔“
”دیکھو تو۔ دیکھو تو۔“

ربیعہ کو خوف محسوس ہوا پھر وہ یکایک بھاگی۔ تارکول کی سیاہ سڑک جیسے اس کے پیر تھانے کے لیے اس کے

ساتھ ساتھ بھاگی تھی۔ ربیعہ اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ!“ آواز اس کے قریب تر آئی جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔
تب ربیعہ نے دیکھا تارکول کی سیاہ سڑک کے آخری کونے پر کوئی کھڑا تھا۔ ربیعہ ٹھہر گئی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا جیسے ربیعہ کے انتظار میں ہو۔

”ربیعہ! اس نے بائیں پھیلائیں۔ ”آؤ۔ آؤ۔ میرے پاس۔“
ربیعہ اپنی جگہ رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔
”ربیعہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب بولا تھا۔ ربیعہ کو اپنی گردن پر کسی کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ اس کے لبوں سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔

تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس نہایت تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور پورا جسم ہلچل مچھل رہا تھا۔

”ربیعہ!“ منہ ذہن یکدم تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ ”ربیعہ! کیا ہوا؟“
”امی جی۔“ وہ ان سے پلٹ کر رو پڑی۔ ”امی۔“
”ربیعہ! میری بچی کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

چند لمحوں میں ہی عباد اور انیقہ بھی چلے آئے تھے۔ وہ سب اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ان سب کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کے اوسان اس کے قابو میں آئے تھے۔ انیقہ نے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس بھر کر دیا تو ایک ہی سانس میں پی گئی۔
”دور آؤ نا خواہ! کیا تھا؟“ عباد اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا۔

”بہت دن بعد۔“ اس نے لرزئی آواز میں کہا۔ ”بہت دنوں کے بعد مجھے پھر۔ پھر سے۔۔۔“
”کیا مطلب پھر سے۔“ انیقہ حیران ہوئی۔ ”کوئی تیریز ہے خوابوں کی؟“

ربیعہ نہ چاہتے ہوئے بھی بدھم سا مسکرائی تھی۔
”پتا نہیں انیقہ! سیریز ہی لگتی ہے۔“ عباد کی بات کے انتقال کے بعد سے ایک عجیب سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میں ہر دوسرے دن ایسا ہی کوئی خواب دیکھتی تھی۔ کبھی دادی نظر آتیں، کبھی ایک نادیدہ شخصیت کا واضح احساس ہوتا۔

”خوف اور خوف۔ صرف خوف محسوس ہوتا۔“
وہ بیٹوں حیران سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ لوگوں کے پاس آنے کے بعد ان خوابوں میں کی آگئی تھی پھر یہ سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا تھا لیکن آج پھر اتنے دن کے بعد۔“

”تم کو تو میں تمہیں ہا پر نفسیات کے پاس لے چلوں گا؟“ عباد ہمدردی سے بولا۔
”ارے نہیں عباد بھائی!“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ”جو کچھ آپ لوگ کرتے ہیں، میں اسی کا احسان نہ آتا پاؤں گی ساری عمر۔“

”احسان؟“ عباد ناراض ہوا۔ ”تم ہماری محبتوں کو احسان شمار کرتی ہو ربیعہ! ہم سب تو بھول چکے ہیں کہ تم کوئی آؤٹ سائڈر ہو۔ امی کے لیے تم تیسری بیٹی ہو اور میرے لیے تیسری بہن۔“

”عباد ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ منہ ذہن یکدم نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”اور یہ بات تم بھی جانتی ہو بلکہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم بھی ہمارے لیے ایسے ہی سچے جذبات رکھتی ہو۔“

”آئندہ یہ احسان وغیرہ کی بات میں نہ سنوں۔“ عباد بولا۔ ”اور کل شام میں تمہارے لیے کسی ڈاکٹر سے

ایمانٹھنٹ لول گا میرے ساتھ چلنا۔
 ”نہیں عباد بھائی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ گھبرا کر بولی۔
 ”ہم سب جانتے ہیں کہ تم ٹھیک ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”لیکن خواب ذرا غلط قسم کے دیکھ رہی ہو۔ علاج تمہارے خوابوں کا ہونا ہے تمہارا نہیں۔“
 منیوہ بیگم اور انیقہ، ہنس دی تھیں۔ ربیعہ بھی مسکرا دی۔
 ”چلو اب سو جاؤ، اب یقیناً تمہیں پُر سکون نیند آئے گی۔“ عباد کھڑا ہوا۔ ”بلکہ انیقہ تمہارے ساتھ ہی سو جائے گی یہاں۔ کیوں انیقہ؟“
 ”ضرور۔“ انیقہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ عباد اور منیوہ بیگم باہر نکل گئے تھے۔

رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر جب وہ تھک گئی تو اس نے کمرٹ لے کر منیوہ بیگم کی پشت کی جانب دیکھا۔ اس کا جی چاہا وہ عمر کی آواز سے پھر وہ ڈر گئی۔ اس خواہش کے بجائے جد خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ کچھ دیر وہ یونہی لیٹی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر میں درد سے ٹپٹپٹانے لگی تھیں۔ بستر سے پیر لٹا کر اس نے اپنے سلیپر ٹولے پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر لڑائی میں زیر و پاؤں کے تین چار بلب روشن تھے۔ شہلا سیدھی چلتی چلی گئی پھر بیڑھیاں اتر کر وہ بچن میں چلی آئی تھی۔
 لائٹ جلا کر اس نے ساس پین میں پانی ڈالا اور برز جلا کر ڈھونڈ چائے کی پتی نکالنے لگی۔
 ”کیا بات ہے؟“ منیوہ بیگم کی طرف سے بری طرح چونکی۔
 اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔ بچن کے دروازے پر فردوس بیگم کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ پر چوڑی تیریاں اور ہنسی نظر آتی تھیں۔

”کچھ نہیں امی جی! میرے سر میں درد تھا۔ میں چائے بنا کر لے کر آئی تھی۔“ وہ بولی۔
 ”سارا گھر سو رہا ہے اور تم کھڑے پیر کر کے ساروں کی نیند خراب کرنے پر تکی ہو۔“ وہ سختی سے بولیں۔ ”اتنے دن ماں کے گھر رکنے سے سونے جاگنے کی عادتیں یونہی بگڑ جاتی ہیں۔“
 شہلا کے ہاتھ رک گئے۔ وہ کبھی بھی اتنی تلخ نظر نہ کی عادی نہ رہی تھی۔
 ”امی جی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”کچھ دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے رات ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا تو چھت معذرت۔“

”طبیعت۔۔۔ طبیعت تو ہماری خراب ہو گئی لی بی! جب سے ہم اپنے لڑکے کے مطالبے پر تمہیں لے آئے۔ بتاؤ ایسی ہوتی ہیں ہوس۔ آدھی رات کو چائے بنانی نظر آتی ہیں۔ بقیہ دن کمرے میں غائب۔ کسی بال بچے کا کوئی اتاپا کچھ خبر نہیں۔ ایک پیدا کیا اس کی بعد توبہ کر لی۔ ہم ترستے ترستے مرجائیں۔ بیٹا کچھ کتا نہیں لیکن اس غریب کی آنکھیں اپنی غلطی پر شرمسار لگتی ہیں۔“
 وہ بڑبڑاتے ہوئے پلٹ گئی تھیں۔ شہلا اپنی جگہ پر سن کھڑی تھی۔ اتنی تلخ کھلائی کا تو اس کی شائستہ طبیعت نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس نے ابلتے ہوئے پانی کی شاں شاں سنی پھر رز آف کر دیا۔ طبیعت سخت مکدر ہوئی تھی۔ وہ چائے بنائے بغیر پلٹ گئی۔ بیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ عجیب سی ذہنی حالت کا شکار تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ ہاشم کی جانب بڑھی۔

”ہاشم! اس نے بے حد سخت سے انداز میں اس کا شانہ ہلایا۔
 ہاشم گھبرا کر اٹھا وہ بے حد تھک کر بالکل غافل سو رہا تھا۔
 ”کیا کیا کیا ہوا؟“ وہ حیران سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”میاں بیوی کے درمیان جو سیکرٹس ہوں انہیں میاں بیوی کے درمیان ہی رہنا چاہیے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ ایسے معاملات پر بھی اپنے گھر والوں سے بات کر سکتے ہیں۔“
 ہاشم پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا پھر اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔
 ”جو کچھ تم کہہ رہی ہو کیا اس کی تفصیل مجھے خواب میں بتائی جا چکی ہے؟“ وہ بے جا رہی سے بولا تھا۔
 ”آپ نے۔۔۔ آپ نے۔۔۔ اپنے گھر والوں کو کیا بتایا ہے؟ ابھی آپ کی والدہ نے مجھے کہا کہ میں نے ایک بچہ پیدا کر کے توبہ کر لی اور یوں آپ کو اور سب گھر والوں کو ترس رہی ہوں۔“

”امی جی! میں نے ہاشم کی بھنویں حیرانی سے چڑھ گئیں۔“ وہ یہ کہنے یہاں آئی تھیں؟ اس وقت؟“
 ”وہ یہاں نہیں آئی تھیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔ ”میں چائے بنانے نیچے گئی تھی۔“
 ”اوس۔۔۔“ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔
 ”میں سمجھتی ہوں میاں بیوی کے درمیان جو سیکرٹس ہوتی۔۔۔“
 ”کس سیکرٹس کی بات کر رہی ہو شہلا تم۔“ وہ ڈیپٹ کر بولا۔ ”ہمارے درمیان کبھی ایسا کوئی سیکرٹ ڈسکس نہیں ہوا۔ تم نے یہ سیکرٹ کسی ”اُور“ سے ڈسکس کیا ہو تو علیحدہ بات ہے۔“

شہلا ان کو کھڑی ہوئی تھی جسے اسے شاک لگا ہوا۔
 ”کیا کیا کیا ہوا؟“ وہ بولی۔
 ”میں اپنے گھر والوں سے کیا کہتا ہوں تمہاری بات یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ”میاں بیوی“ کے حوالے سے تم ایسی بات کیسے کر سکتی ہو۔ ہمارے درمیان ”میاں بیوی“ والی کون سی بات ہے شہلا؟“

وہ چڑ کر بول رہا تھا۔
 ”ہاشم! شہلا ایک تجربے کے عالم میں اسے دیکھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔
 ”جو کچھ تم نے کیا شہلا! وہ صرف تمہارا سیکرٹ تھا۔ میں اتفاقاً اسے پابین تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے اس لیے مجھ پر یہ پابندی عائد نہ ہو کہ میں اسے خود تک محدود رکھوں۔ کیوں کروں میں ایسا؟“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے جو کچھ امی نے تم سے کہا۔؟“
 شہلا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ہاشم کے دل کو کچھ ہوا۔
 ”میں نے آپ کو بتایا تھا ہاشم۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ صرف عمر کے لیے۔“
 ”بات ایورڈ ریزن وائز مجھے اس سے غرض نہیں۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔
 ”ہاشم! آپ۔۔۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“ شہلا نے سرخ موڑا تھا۔
 ”ہوں۔۔۔ تو تم تیار ہو۔ کیا میں یہ سمجھوں؟“ ہاشم نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ ”ہاتھ کنگن کو آرس کی کیا۔“
 شہلا اس کا مطلب سمجھ کر جیسے بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔
 ”ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں پلیز۔“
 ”نہ ذہنی طور پر نہ دلی طور پر۔ یہی حقیقت ہے۔“ ہاشم کے چہرے پر جیسے ہار کے آثار نظر آنے لگے۔

”پارک جانے میں احتیاط کیا کریں۔ کیا خبر کتنے کو اب تک یاد ہو۔“

ربیعہ اور عباد بنس دسے تھے۔ ربیعہ کو اندازہ ہوا کہ وہ بے حد شگفتہ اور دل چسپ شخصیت کا حامل نوجوان تھا۔ کچھ دیر اور دھڑکے کی باتیں کرنے کے بعد امیر حسن اور عباد اپنی بزنس کی باتوں میں لگن ہو گئے۔ ربیعہ آفس کی اشیاء پر نگاہیں دوڑاتی رہی۔

اچانک ہی اس کی نظریں امیر حسن کی سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر جا چکی تھیں۔ وہ تصویر ایک جوان شخص کی تھی۔ نجانے اس کے چہرے میں ایسی کیا بات تھی ربیعہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ ایک ٹک وہ اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ اس چہرے اور ان نگاہوں میں ایک مقناطیسی کیفیت تھی۔ ربیعہ اس مقناطیسمیت کا شکار ہو گئی۔ اس کے سامنے رکھی کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ امیر حسن اور عباد کی گفتگو اختتام کو پہنچی۔ ربیعہ اسی کیفیت میں بیٹھی وہ تصویر دیکھتی رہی۔

عباد اور امیر حسن اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں نے الوداعی مصافحہ کیا پھر عباد نے چونک کر ربیعہ کو دیکھا۔ امیر حسن کی نگاہ اس کے سامنے رکھے ہوئے کافی کے بھرے کپ پر پڑی۔

”ربیعہ!“ دونوں کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا۔
ربیعہ بری طرح چونکی۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“
”کہاں کھولی ہوئی ہو تم؟“ عباد حیران تھا۔

”تصویر!“ اس نے غائب راغی سے تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ شہر لاہور ہے۔ شہر لاہور میں امیر حسن۔۔۔ امیر حسن بولے۔“
”آپ کو اس تصویر میں کیا بات نظر آئی؟ کیا آپ نے اس سے پہلے اسے دیکھا ہے؟“

ربیعہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ وار)

تھے۔ ”ٹھیک ہے شہلا! مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں مجبوری کا قائل نہیں ہوں۔ مجبوری کا بار بس محبت میں اٹھانا ٹھیک ہے۔ تم جب کسی منطقی نتیجے پر پہنچو مجھے صرف آگاہ کر دینا اور ہاں میں کسی راز کو خفیہ رکھنے کا پابند نہیں تھا لیکن میں نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو کہ میں یہ سب کسی سے کہہ سکتا ہوں۔ دل کی شکست کا اظہار اتنا آسان نہیں ہوا کرتا۔“

تھکے تھکے انداز میں کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ شہلا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سر کا درد اب اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بستر پر گر سی گئی۔

”تیار ہو ربیعہ؟“ عباد نے دستک دیتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔

ربیعہ جوا پنا دہیٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھ رہی تھی چونک اٹھی۔

”جی عباد بھائی! میں تیار ہوں۔ ویسے آپ بے حد تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مجھے ان نفسیات کے ماہروں پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں ہے۔“

”تم خود جو بہت بڑی ماہر نفسیات ہو۔ چلو فائنٹ باہر آ جاؤ۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہوں۔“ وہ باہر نکل گیا تھا۔ ربیعہ نے ایک نظر آئینے پر ڈالی پھر اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

فرنٹ ڈور کھول کر وہ بیٹھی تو عباد نے گاڑی اشارت کی۔
”ہمیں رستے میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرنا ہو گا۔“ عباد بولا۔
”ڈاکٹر کا ٹائم آٹھ بجے سے ہے اور ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔“

”لیکن ہم اتنی جلدی کیوں نکلتے؟“ وہ حیران ہوئی۔
”کیونکہ مجھے امیر حسن سے ملنا تھا۔ وہ آفس میں میرا منتظر ہو گا۔ آدھے گھنٹے کی میٹنگ ہے پھر ہم سیدھے ڈاکٹر کی طرف چلیں گے۔ ٹھیک؟“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ وہ نیم دلی سے بولی۔
امیر حسن کی کمپنی کا آفس شہر کی مشہور و معروف بلڈنگ میں تھا۔ ربیعہ اس کا آفس دیکھ کر متاثر ہوئی۔ امیر حسن یقیناً فنکارانہ مزاج کا بندہ تھا۔ اس نے اپنا آفس بہت دلکش انداز میں سجایا گیا تھا۔ دیواروں کا ریٹ اور فرنیچر کی ٹکرا سٹیم ہی بہت زبردست اور نہایت جدید تھی۔ جگہ جگہ انڈور پلانٹس ایسی ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ ہر چیز میں ایک خاص تناسب اور حسن نظر آتا تھا۔ ربیعہ ہر چیز کا بہت محو ہو کر جائزہ لے رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“
ربیعہ چونکی۔ امیر حسن پر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کر رہا تھا۔

عباد نے رنجوش انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔ ربیعہ نے بھی مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

”آئیں پلیز۔“ وہ انہیں لے کر اپنے کمرے کی جانب برہہ گیا تھا۔

انہیں بٹھا کر اس نے انٹرکام پر کافی کا آرڈر دیا پھر ان کو گول کی جانب متوجہ ہوا۔

”اور مس ربیعہ! آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔۔۔ چوٹ کا کیا حال ہے؟“ وہ شگفتگی سے اس کا احوال پوچھنے لگا۔

”اومے آپ کو اب تک وہ حادثہ یاد ہے۔“ ربیعہ دھیمے سے ہنس دی۔ ”میں تو اسے بھول بھی چکی ہوں۔ چوٹ کا احوال کیا ساؤں۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ

4 خوبصورت و مقبول ناول

★ میر خواب ریزہ ریزہ ماہامک 300/- * لامامیل عیدہ احمد 180/-

★ اک دیا جلانے کھنا ماہامک 300/- * شہر دل کے دروازے شادی چودری 300/-

چاروں ناول ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ فری

• خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفسٹ پیپر

شائع ہو گئے ہیں

آج ہی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیے

37 اردو بازار، کراچی

مکتب عمران ڈائجسٹ

فون 2216361

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے بے حد گہری نگاہ سے اس کے ہر انداز کو دیکھا۔ ”بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔“

”جی امی۔“ ہاشم نے آنکھوں کو بازو سے ڈھانپ لیا۔ ”آفس میں اتنا کام ہے کہ لپچ کرنے کا نام بھی نہیں مل پاتا۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو جاتی ہے لیکن گھونٹ بھرنا مشکل لگتا ہے۔“

”اے ہے۔ کیا وزیر اعظم لگ گئے۔“ وہ تشویش سے بولیں۔

”بتاؤ۔ ناشتہ بھی نہیں کر کے گئے تھے۔ خالی پیٹ کیا خاک کام کرتے ہو گئے۔ اس طرح تو آدمی کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اے ہاں۔ یونہی تو نہیں کہتے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سیانے لوگوں نے بھی سوچ سمجھ کر یہ کہا دیکھیں گھڑی ہیں۔ بیگم کا حال دیکھ لو صبح سے رات ہونے کو آئی ہے۔ انہوں نے شکل نہیں دکھائی۔ کیا پکا ہے کیا نہیں۔ کس نے کھایا کس نے نہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہے۔ اور کسی کا نہیں اپنے شوہر کا تو خیال کریں۔ اسے تو دیکھیں۔ پر یہاں کسے پروا ہے۔ نہ بی بی کو نہ شوہر کو۔ ایک کولوہ ہے جس کے گرد گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی گرہستی ہے۔“

ہاشم نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا سامنے ہی ماہین کا بیٹا اپنا بیٹ اٹھائے بھاگا پھر رہا تھا۔

”ماہین آئی ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”ہاں بلایا ہے ہم نے۔ ناعمہ کے ساتھ حشریہ کی تاریخ تو رکھ دی ہے۔ لیکن عذرا بیگم نے نہ تو شگون کی مٹھائی ہی بھجوائی نہ مزید کوئی پیش رفت کی۔ اب ماہین سے مٹھائی کی جانچ کرواتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ہاشم نے بیٹھ کر بریف کیس نزدیک کیا۔ میری اس سلسلے میں رافع سے بات ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تانیہ کے سسرال والوں سے تمام معاملات طے کر کے پھر ہماری طرف آئیں گے۔ تاریخ وہی ہے جو ناعمہ کی رکھی گئی ہے۔

اس نے بریف کیس کھول کر جیک بک نکالی۔ پھر جیک لکھ کر کاٹا اور ان کی جانب بڑھایا۔

”فی الحال تین لاکھ کا چیک دے رہا ہوں۔ ماہین اور حشریہ مل کر زیور اور کپڑوں وغیرہ کی تیاری کر لیں۔ فرنیچر کا آرڈر میں خود دوں گا۔“

اس نے بریف کیس بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

”جیتے رہو۔“ وہ نہال نظر آنے لگیں۔ ”اب کہاں چل دیے۔ کھانا لاتی ہوں۔ صبح کے بھوکے ہوں۔“

”میں ہاتھ لوں گا پہلے۔ سخت مشکل محسوس ہو رہی ہے۔“

اس کے بڑھتے ہوئے قدم کا ایک لمحہ تھمے تھے۔

”شہلانے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا؟ آپ اس سے پوچھ تو لیتیں۔“

”ہم سے پوچھنا اس کا کام ہے۔ اس سے پوچھنا ہمارا کام نہیں۔“ وہ بے نیازی سے چیک دیکھ رہی تھیں۔

”ایسے بے جالاؤ ہم نے بیٹیوں کے نہیں اٹھائے کبھی۔“

”بہت اچھا کیا۔“ اس نے ہڑبڑا کر سرد آہ بھری تھی۔ پھر وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

کرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو اسے جس اور کھٹن کا احساس ہوا تھا۔ نیم اندھیرے یا حول سے ٹھاسا ہونے میں اس کی آنکھوں کو چند لمحے لگے پھر اس نے دیکھا۔ شہلا تکیے میں منہ دیے اونڈھی لیٹی تھی۔

”کم از کم اے سی تو آن کر لیتیں۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ریموٹ اٹھا کر اے سی آن کیا۔

”امی بتا رہی ہیں۔ آج کرے سے نکلیں ہی نہیں۔“ وہ بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ ”کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ربیعہ! عباد نے اسے ملازمت سے نکال دیا۔ ربیعہ چونکی۔

پھر وہ ان دونوں کو دیکھ کر غائب و غای سے تسکرائی۔

”چلیں۔“ اس نے عباد سے پوچھا۔

”آپ نے بتایا نہیں ربیعہ! امیر حسن نے تجس سے جسکتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیا؟ کیا نہیں بتایا؟“ وہ حیران سی ہوئی۔

”یہی کہ شیر کی تصویر میں آخر آپ کو اپنی کون سی غیر معمولی بات محسوس ہوئی؟ آپ اس طرح گرو؟“

پیش سے بے خبر کیسے ہو گئیں؟“

ربیعہ چند لمحے غور کرتی رہی پھر اس نے بے جا رنگی سے کاندھے اچکا دیے۔

”میں خود نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس چہرے میں ایک مقناطیسی محسوس کی میں نے۔ ایک عجیب سی کشش۔“

”شیر کی۔ کبھی پاکستان نہیں آیا۔“ امیر حسن مدھم سا مسکرا کر بولا۔

”آپ کبھی پاکستان سے باہر گئی ہیں؟“

”نہیں۔ کبھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بس پھر اتنا تو طے ہے کہ آپ لوگوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ باقی اگر دور پرے کی کوئی رشتہ داری نکل آئے تو الگ بات ہے۔“

”میں ہی اس لیے تھمے۔“

”یہ ربیعہ۔“ دیکھے بھی کچھ۔“ عباد نے انگلی کو کپڑے کے پاس لا کر گولائی میں گھمایا۔ ”اس کی باتوں پر اتنا دھیان مت دو۔“

امیر حسن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر وہ ان دونوں کو سی آئیٹ کرتے باہر نکل گیا۔

”آپ جاب وغیرہ میں انٹرنلڈ نہیں ہیں؟“ عباد پارکنگ آریا سے گاڑی لینے گیا تو امیر حسن نے گلہ سز کے پیچھے چھپی نظروں سے اسے دیکھا۔

”جواب؟“ ربیعہ حیران سی ہوئی۔ ”میرا ایم اے ابھی مکمل نہیں ہوا۔“

”اگر اسے ضروری نہ سمجھا جائے تو؟“ وہ مدھم سا مسکرایا۔

”تو۔“ ربیعہ سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ”تو شاید میں اپنا کام اچھی طرح سے نہ کر سکوں گی۔“

”خوبصورت معذرت ہے۔“ اس نے خوش دلی سے سر ہلایا۔

”آپ کی گاڑی آگئی۔“

”ربیعہ نے دیکھا۔ عباد اس کے انتظار میں تھا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ دیکھتے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

امیر حسن کے لب۔ آہستگی سے ہلے تھے۔

لاؤنچ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو فردوس بیگم کو سامنے ہی بیٹھا ہوا پایا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بریف کیس میز پر رکھ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں حد درجہ تھکاوٹ تھی۔

شہلا کی جانب سے کسی رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ ہاشم ڈریسنگ روم میں کھس گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنا گاؤن پہنے برآمد ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا تھا، ایک اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ شہلا کی پوزیشن میں رتی بھر تبدیلی نہ آئی تھی۔ ہاشم بے ساختہ اس کی جانب بڑھا۔

”شہلا!“ ہاشم نے اسے کاندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

شہلا کا جسم تیز بخار میں پھنک رہا تھا وہ تقریباً ”تیم بے ہوش“ تھی۔

”شہلا، شہلا! آنکھیں کھولو۔“ ہاشم نے اسے زور سے ہلایا۔

پھر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا، شہلا کو بازوؤں میں اٹھا کر وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھا۔

”ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ کئی دنوں سے حالت فاقہ میں تھیں۔ انہوں نے کب سے کچھ کھایا یا نہیں ہے؟“ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے شہلا کی اس حالت کا ذمہ دار وہی ہے۔

”آپ کے درمیان کوئی کشیدگی ہے؟“ ڈاکٹر سلطان نے اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”جی؟“ وہ بری طرح چونکا ”کشیدگی؟“

پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے؟ ”ہاں شاید۔“

ڈاکٹر نے اس کی کیفیت سے از خود ہی کوئی مطلب اخذ کیا پھر اس کا شانہ تختہ پھرایا۔

”میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی سیدھا راستہ نہیں ہوتا بیٹے۔ یہ ایک زگ زگ ہے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ بے تحاشا توقعات بے تحاشا سببات۔ لیکن۔۔۔ بہت سی محبت اسی لیے ہر زگ زگ کے بعد ایک خوبصورت موڑ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

ہاشم گو گو کا شکار اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑا تھا۔ اس نے ہیشکل ڈاکٹر سلطان کی جانب دیکھا۔

”جی۔۔۔“

”آپ اتنا گلی فیل منت کرو۔ خواتین کو ذرا سی بات پر کھانا پینا چھوڑ دینے کی بیماری بہت پرانی ہے۔“ وہ مسکرا رہے تھے۔

”ڈاکٹر شہلا بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے انجکشن بھی دیا ہے۔ یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ٹھیک ہو، ٹھیک ہو۔ سوچ۔۔۔“ وہ بہت ممنونیت سے بولا۔

وہ اس کا شانہ تختہ پھیر کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ ڈاکٹر سلطان اس کے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے گھرانے کی ان سے پرانی شناسائی تھی۔ اسی لیے ہاشم شہلا کو ان کے کلینک لے آیا تھا۔ اس نے شہلا کے گھر کسی فرد کو بھی اس بات کی خبر نہیں دی تھی۔ اس کے اپنے گھر میں بھی کسی نے اسے شہلا کو لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا وہ شہلا کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ ہر سکون انجکشن کے زیر اثر غنودگی میں تھی۔ ہاشم نے اس کے پہلو میں رکھے ہوئے نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”آپ اتنا گلی فیل مت کرو۔“

ڈاکٹر سلطان نے اسے کہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہاشم اس وقت سخت پیشانی محسوس کر رہا تھا۔ کتنے دن

ہوئے اس نے شہلا کے خال سے واقف رہنا چھوڑا ہوا تھا۔ عمر کے چلے جانے سے اس کے دل پر قیامتیں بیت گئی تھیں۔ وہ غم سے نوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لیکن ہاشم نے اس کے دکھے دل پر اپنی محبت کے اظہار کا مزہم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اسے وہ منظر صرف ابرار کی فاتحانہ مسکراہٹ کے حوالے سے یاد آ رہا تھا۔ اسے شہلا کی آنکھیں یاد نہ آتی تھیں۔

پچھلی رات جب شہلا نے اسے جگایا تھا تب وہ کس قدر شکستہ دل لگتی تھی۔ اس نے فردوس بیگم کے خراب رویے کی شکایت کی تھی تب ہاشم نے اس سے کتنا خشک رویہ رکھا تھا۔ اسے سب یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

وہ بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اس نے شہلا کی بند پلکوں کو دیکھا۔ اس کے زرد چہرے کو دیکھا۔ وہ کتنی کمزور ہو رہی تھی۔ نجانے اس نے کب سے کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ وہ اکثر شدید سر درد کی شکایت کرتی تھی۔ اس نے اسے قابل توجہ نہ جانا تھا۔

”شہلا!“ شہلا نے آئی ایم سوری۔ آئی ایم ویری سوری۔ ”وہ بڑبڑایا۔ ”محبت کرنے والے یقیناً ایسے نہیں ہوتے۔ تم نے میری دعوت کو چھوٹا پایا ہو گا۔“ نجانے کس بات پر یقین کر کے تم میرے ساتھ چل پڑی تھیں۔ اور۔۔۔ میں نے دکھ کے سوا تمہیں کچھ نہیں دیا۔“ اس نے شہلا کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔

”میں۔۔۔ اپنے ہی اندیشوں کا شکار بدگمانی کی دھند میں رستہ ڈھونڈتا رہا۔ تمہارے رستے میں بڑے پتھروں کو چٹنا بھی میرا فرض ہے میں نے نہیں سمجھا۔ میں میں وہ نہیں نکلا شہلا جس کا میں نے تم سے دعوا کیا تھا۔ یقین جانو۔ اتنا یقین رکھنا کہ میری محبت میں تمہارے کلیے آج بھی وہی شدت ہے۔ وہی حدت ہے۔ وہی خلوص ہے۔ وہی سچائی ہے۔ سارے رستے صرف تمہاری جانب آتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں سے آنسوؤں سے شہلا کا ہاتھ نم ہو گیا تھا۔

”مما۔۔۔ ممما۔۔۔“ مومن نے زور سے اس کا شانہ پھلایا۔ تب وہ چونکی۔

”جی بیٹا۔۔۔ بولو۔“ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

”مما۔۔۔ میرا پروگریس کارڈ ہے۔ اس پر مسکنیہ جو کریں۔“ اس نے ایقان کی سمت کارڈ اور پین بڑھایا۔

ایقان نے دونوں چیزیں تھامیں اور کارڈ کھول کر ”پیرنٹس مسکنیہ جو“ کے خالی خانے میں دستخط کر دیے۔

”بیٹا بولو۔۔۔“ اس نے مومن کو کارڈ واپس کرنا چاہا۔

مومن نے کارڈ نہیں تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”آپ نے۔۔۔ مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ دم سم سا بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ اب بھی پھر اگلے لمحے ہی سمجھ گئی۔

اس مرتبہ اس نے کارڈ دوسری ہی نظر سے دیکھا تھا۔ پورے کارڈ پر نظر دوڑاتے ہی اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔

”مومن۔۔۔ مومن۔۔۔ وہاٹ از دس؟ یہ۔۔۔ یہ پروگریس ہے تمہاری۔ اتنا خراب کاہ۔ اتنے برے ریمارکس۔“

وہ خاموش کھڑا لب کاٹا رہا۔ ایقان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”میں اتنی ذہنی ٹینشن میں بھی تمہیں پڑھاتی ہوں۔ تمہارا کام چیک کرتی ہوں۔ تمہیں یاد کرواتی ہوں۔ پھر بھی تم نے اتنے خراب ٹیسٹ دیے کیوں۔ کیوں مومن؟ باپ نے کیا کم احسان کیے ہیں میری ذات پر جو تم بھی مجھ ناتواں کو جلاسنے پر تل گئے ہو۔“

”آپ اب اس طرح نہیں پڑھاتیں جیسے پڑھایا کرتی تھیں۔ وہاں اپنے گھر میں۔“

”وہ گھر اب اپنا نہیں ہے۔ اپنا گھر یہ ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔ سمجھے تم؟“

”جی نہیں، میرا گھر وہی ہے۔ میرے پیار والا۔ یہ گھر آپ کے پیار کا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ وہ ہٹ

دھری سے بولا۔

ایقان نے غور سے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھا۔

”ٹھیک ہے“ پھر وہ ٹھنڈے سبجے میں بولی۔ ”اپنی ماما کو چھوڑ کر چلے جاؤ وہاں دیکھو تمہیں وہاں اپنے پیار ملتے ہیں یا نہیں۔“

”جا بھی سکتا ہوں۔“ وہ بے خوفی سے بولا۔ ”عمر بھی اپنی ماما کو چھوڑ کر اپنے پیار کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ وہاں بہت خوش ہے۔ اس کے پیار بھی بہت اچھے ہیں۔ میں بھی اپنے پیار کے پاس خوش رہ سکتا ہوں۔“

ایقان کا غصہ سے برا حال ہو گیا اس نے کھیچ کر ایک پھیڑا اس کے گال پر جڑا پھر دو سرا پھیڑا دو سرے گال پر مارا۔ ”تم سب کے پیار بہت اچھے ہیں، تمہاری مائیں ہی خراب ہیں۔ ان کے نصیب جو خراب ہیں، اپنے لہو کی بوندوں سے تمہارے جسم پر آئے۔ تمہیں جنم دیا۔ تمہارے لیے راتوں کو جاگے۔ سچے چوہن جگر پلا کر تمہیں اتنا کیا ہے ہم نے۔۔۔ اچھے جاؤ اپنے باپ کے پاس جو ان ہو کر بھی تم نے یہی کہنا اور یہی کرنا ہے۔ اٹھ لیے ابھی چلے جاؤ تو بہتر وہاں جس گوری ڈائن کو اس نے سر پر بٹھایا ہوا ہے نا وہ تمہیں تمہاری اوقات کا پتا دے گی۔“

وہ خود بھی چیخ کر رونے لگی تھی۔ مومن جو بار کھا کر بڑی طرح رو رہا تھا اب اس کے رونے سے سم کر خاموش ہو گیا اور اٹھ کر گھٹنے لگا۔

ایمان اندر سو رہی تھی ان کی آوازوں سے ڈر کر جاگی اور بھاگتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اب ایقان کی آواز میں اس کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے رافع کے لیے یہ منظر ناقابل یقین اور ناقابل پروا نشست تھا وہ انتہائی تیزی سے اندر آیا۔

”پھپھو۔۔۔ پھپھو کیا ہوا ہے؟“ اس نے بلکتی ہوئی ایقان کو کاندھے سے لگایا، دو سرایا زور بٹھا کر ایمان کو سمیٹا۔ ”رافع! رافع! میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں، وہ بے ایمان شخص کسی اور کا ہو گیا۔ میری اولاد بھی اسی کی ہے۔ یہ بچے اسی کے ہیں رافع، اسی کو دے آؤ۔ مجھے زہر لاؤ۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے تھوڑا زہر لاؤ۔“

”پھپھو۔۔۔ پلینز۔۔۔ سنبھالیں خود کو۔ خدا کا واسطہ میں آپ کو دیتا ہوں۔ اتنی کم ہمت نہ بنیں میں تو آپ کو بہت اسٹرانگ سمجھتا تھا پھپھو۔ بہت برابر اور نڈر۔ آپ اتنی کمزور کیسے ہو گئیں؟“

”کوئی عورت بہادر نہیں ہو سکتی۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیسے ہو سکتی ہے بہادر۔ مٹی سے نہیں جذبات سے بنی ہے عورت۔ ذرا سی تپش سے پکھلنے لگتی ہیں۔ چاہے تپش غم کی ہو، غصے کی ہو یا محبت کی، اسی لیے تو اتنی آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہے کم بخت۔“

”مت ہنومیری بے چارگی پر۔ میں اس وقت بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔ سیسہ سیسہ مومن جس کی آواز سے میری صبح میری شام ہوتی ہے یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہاں اپنے باپ کے پاس کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ باپ کے پاس بہت کچھ ہے۔“

وہ پھر ہلکی مومن اب سخت نام نظر آتا تھا۔

”ٹھیک ہی کہتا ہے اب میرے پاس بچا کیا ہے۔ اسے دینے کے لیے جنم میں اسے دے چکی ہوں اپنی خوبصورت فیند سے بھری راتیں۔ اس کی دیکھ بھال میں گزار دیں میں سنب اس کے پوتے سے وجود تو کرنا تھا چھل گئے تھے میرے۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ اب یہ بڑا ہو گیا ہے اسے اب میری ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ دے چکی ہوں میں اسے۔ اب اسے وہ چاہیے جو اس کے باپ کے پاس ہے۔ اسی لیے اب یہ وہاں جانا چاہتا ہے۔“

مومن خاموش کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو جھرنے جھرنے رہے تھے ایمان رافع کے بازو میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھیں۔

رافع نے مومن کو اشارے سے قریب بلایا۔ جیب سے رومال نکال کر اس کا چہرہ صاف کیا۔ ایمان کو چہرہ کر کے اس کے بال سنوارے پھر ایمان کا ہاتھ مومن کو تھمایا۔

”جاؤ بیٹا! ہن کو لے کر جاؤ سرد رہا جی کے پاس بہت سارے چاکلیٹ ہیں ان سے کھو وہ آپ دونوں کو مزے دار چاکلیٹ دیں گی۔ چاکلیٹ لے آؤ پھر میں آپ دونوں کو گھمانے لے کر چلتا ہوں۔“

بچوں کا موڈ لمحہ بھر میں بحال ہو گیا تھا دونوں اپنی پسندیدہ چیز کا کام سن کر فائز ڈھنگے۔ رافع نے ایمان کا تانا سا چہرہ دیکھا۔

”پچھو! بہت افسوس ہوتا ہے مجھے کتنا خوش حال گھرا تھا آپ کا ہنستا مسکراتا۔ غم و فکر سے دور آپ کو دیکھ کر شوخی اور مسکراہٹ کے معنی سمجھ میں آتے تھے۔“

”عورت کی مسکراہٹ اور شوخی مرد کی دین ہے۔ رافع! آؤ اور ہمیں بھی اسی کی سوغات دیں۔“

”عورت مرد سے سب کچھ لے سکتی ہے پچھو۔ اپنی مرضی سے جو لینا چاہے۔“ وہ آہستگی اور نرمی سے بولا۔

”ہو نہ ہو مرد ہوس کی کو گے۔“ وہ پھنکاری۔

”مرد ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”تب ہی اس قدر وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ میں یہ نہیں کہتا پچھو کہ اس سارے معاملے میں سراسر آپ ہی قصور وار ہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ غلطی آپ کی بھی ہے۔ کیا آج اپنے بچوں کو اس طرح رو یا بلکنا دیکھ کر بھی جو کچھ ہوا اس پر آپ نظر ثانی نہیں کریں گی؟“

”ہر شخص کے کچھ اصول ہوتے ہیں رافع! کوئی ایک متاع ایسی ضرور ہوتی ہے جس پر سوئے باز دی ہوگی۔“

ہوتی۔ میری متاع میری محبت تھی۔ وہ محبت جو میں نے عاشر سے کی اور عاشر نے مجھ سے کی۔ بس اس محبت پر میں سو بے بازی نہیں کر پائی۔ باقی جو کچھ ہوا جو کچھ ہو رہا ہے۔ ثانوی ہے۔“

”آپ کے بچے بھی ثانوی ہیں پچھو؟“

”بچے! وہ آہستگی سے بول کر رہ گئی۔“ بچے۔ مجھے تو آج احساس ہوا ہے رافع کہ بچے بھی اس کے ہیں۔ جتنے عرصے کا بھی تعلق تھا۔ وہ امرتیل کا تعلق تھا۔ ایک کے لیے صرف لینا ہی لیتا۔ دوسرے کے لیے بس دینا ہی دیتا۔“

”ایسی بات نہیں ہے پچھو۔ آپ کی سوچ غلط سمت میں بھٹک گئی ہے۔ اسے سیدھا راستہ دکھائیے۔ انصاف پسندی سے سوچیے۔ آپ وہ منصف ہیں جو غلطی کی سزا بھی موت دیتا ہے۔“

”میں نے کہا نا رافع تم مرد ہو۔ مرد کا ساتھ دو گے۔ عہدا کو بھی سوا“ کو گے۔ ورنہ ایک اعتماد اور محبت سے

بھرے دل کے قتل کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک عورت سے پوچھو۔“

”آپ سب بہت لکھو رہے ہیں۔ پچھو! وہ گہری سانس لے کر بولا۔“ مومن کو اس طرح رو تا دیکھ کر میرے دل پر کیا جیتی ہے۔ میں آپ کو تان نہیں سکتا۔ آپ سمجھتی ہیں وہ آسانشات کے لیے اپنے باپ کے پاس جانا چاہتا ہے؟ نہیں پچھو ایسا نہیں ہے اس عمر کے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اگر اپنے باپ کے پاس ہوتا تو آپ کے پاس آنے کے لیے یونہی بے قرار ہوتا۔“

”تو میں کیا کروں رافع؟ کیا کروں؟ اس کے باپ کے سامنے روؤں۔ گڑاؤں؟ اپنے بچوں کے لیے شفقت پوری کی بھیک مانگوں؟ کیا کروں؟ وہ وہاں دو سری شادی رچا کر بیٹھ گیا ہے۔ اب اس کے پاس اتنا بھی وقت نہیں ہے کہ فون کر کے میرا بچوں کا حال پوچھ لے۔ اور تم سب مجھے مورد الزام ٹھہراتے ہو۔ کیوں؟“

وہ چیخی تھی۔ رافع سن ہو کر رہ گیا۔

”پچھو! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں اس نے خود فون کر کے یہ اطلاع دی تھی مجھے۔“ وہ سسکی۔

”پھر آپ نے کیا کہا؟“ رافع کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔

ایقان چند قہقہوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔

”میں نے اس سے طلاق مانگی ہے۔“ پھر وہ ٹوک انداز میں بولی۔ ”میرے پاس وہ سزا کوئی آپشن نہیں ہے۔“

رافع نے سانس بھری تھی۔ اسے اسی بات کا اندیشہ تھا۔

”پچھو! بچوں کے سر سے ان کے باپ کے نام کی چادر نہ کھینچیں۔ پلینز۔“ وہ ہلکی ہوا۔

”انکھوں نے لکھ دیے وہ تو بولی کر کے تو کم از کم آپ تو عقل کریں۔ انھیں جانیں ایک دن انہیں ضرور اپنی ٹانگیوں کا احساس ہوگا۔ یہ بچے ان کے دل کو اپنی جانب ضرور موڑیں گے۔ وہ لوٹ آئیں گے۔“

”تب یہاں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ وہ چیخی سے بولی۔ ”میں بھکارن بنی اس کے نام کی چوکھٹ پر کبھی نہیں بیٹھوں گی۔ ہر روز اذہ بند کر لوں گی۔“

”آپ مجھے ان کا کنٹیکٹ نمبر دیں۔“ رافع نے بالآخر مایوس ہو کر کہا۔

”میں وہی لینے آیا تھا۔“

”کیوں؟ کس لیے؟“ اس نے آہستہ آہستہ پوچھا۔

”میں نے ایک بار ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بہر حال ایسا نہیں چاہتی۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اور تمہیں مجھ سے نمبر مانگنے کی ضرورت پیش ہی کیوں آ رہی ہے۔ پہلے تو تم اکثر اس سے بات کیا کرتے تھے۔“

”وہ اس نمبر پر نہیں ہیں۔ جب چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ رہائش کا نمبر بھی تبدیل ہو چکا ہے یا شاید رہائش ہی تبدیل کر لی ہے۔ موبائل نمبر بھی نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی دوسرے شہر یا شاید دوسرے ملک شفٹ کر چکے ہیں۔“

ایقان کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ اس نے رافع کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

”کہاں؟ کہاں چلا گیا وہ؟“

رافع جو مزید کچھ کہنا چاہتا تھا رک گیا وہ ایمان کی پھیلی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر وہ دھک سے مسکرا دیا۔

”ان نگاہوں میں تو اب تک ان کے نام کا شہر آباد ہے پچھو۔ آپ کیوں خود سے ان سے سب سے جھوٹ

بول رہی ہیں؟

ایقان نے یکدم نگاہیں چرائی تھیں۔

”شراب تو نہیں ہے رافع۔“ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”برابر ہو چکا ہے۔“

”نہیں۔ پچھنوں۔ ایسا نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”میرا یقین مجھے بہت کچھ کہہ رہا ہے۔“ وہ جانے کے لیے آگے بڑھا۔

”رافع۔“ ایقان کی سرگوشی نے اس کے قدم روکے تھے۔

”جی۔۔۔؟“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”دیکھ۔ کہاں چلا گیا؟“

رافع چند لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ڈونٹ وری۔ لیکن اتنا ہے کہ خود کو سمجھانے کی کوشش کریں۔“ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

”یہ لیجئے ایسا۔“ انیقہ نے اسے پائسن ایبل جوس کا گلاس تھماتے ہوئے دیا۔ ”بالکل فریش فرام دی فارم ہے۔“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

شہلا نے گلاس لبوں سے لگایا۔ ساتھ ہی اس کی نظر دورے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہاشم سے ٹکرائی۔ نجانے ان نظروں میں کیسے جذبات پوشیدہ تھے۔ شہلا جھینپ سی گئی۔

”انیقہ!“ ہاشم کے لیے بھی جوس لے آؤ نا۔“ وہ اپنے اچھا سا کٹ چھلانے کے لیے انیقہ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ہاشم بھائی نے چائے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ربیعہ ان کے لیے چائے بنا رہی ہے۔“ وہ محبت سے اس کے چہرے پر تائے بال ہٹانے لگی۔ ”اور آپ نے اپنا گلیا حال بنایا ہوا ہے؟ یوں لگ رہا ہے جیسے برسوں سے بیمار ہوں ہاشم بھائی! آپ انہیں کچھ بھی نہیں کہتے نا؟“ انیقہ ہاشم کی جانب متوجہ ہوئی۔ ہاشم نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”بہت بری بات ہے۔ کہا کریں نا۔ بلکہ ڈانٹا کریں۔“

”یہ تو اپنے بس کی بات نہیں۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”بہت مشکل کام ہے؟“ انیقہ شرارت سے پوچھنے لگی پھر زور سے ہنس دی۔

ماحول قدرے شگفتہ ہو گیا تھا۔ ہاشم بھی یہی چاہتا تھا وہ ہسپتال سے شہلا کو یہیں لے آیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے گھر کا ماحول شہلا کو مزید شینس کر سکتا تھا۔

منیوہ بیگم نماز پڑھ کر آئی تھیں۔ وہ شہلا پر دم کرنے لگیں۔ ربیعہ بھی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا میری بچی کو؟“ منیوہ بیگم پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں ای! بس یونہی ذرا ویک نیس ہو گئی تھی۔“ شہلا نجانے کیوں اس ذکر سے شرمندہ سی ہو رہی تھی۔

”مت سوچا کرو اتنا۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”اتنا اچھا شریک سفر ملا ہے خدا کا شکر ادا کرو۔ سب کچھ تمہارے پاس ہے۔ کچھ بھی تمہاری دسترس سے دور نہیں ہے۔“

شہلا قدرے خاموش سی ہوئی تھی۔ ہاشم ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے ہر انداز کو، ہر رنگ کو

سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاشم بھائی۔ چائے۔“ ربیعہ کی نرم آواز پر وہ چونکا۔

”آپ ہی کی بیگم ہیں۔ اتنا غور پھر کبھی کر لیجئے گا۔“ ربیعہ کو بھی شرارت سو جھی۔

سب ہی ہنس پڑے تھے ہاشم قدرے شرمندہ ہوا۔ شہلا بھی جھینپ سی گئی۔

”مہما۔“ خوشی سے چمکتی ہوئی آواز پر سب ہی چونک اٹھے تھے۔

سب نے ایک ساتھ دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ وہاں عمر کھڑا تھا۔

”عمر۔ میری جان۔۔۔“ شہلا کے وجود میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب لپکی۔ دونوں ماں بیٹا بے

ابلی سے کپٹے تھے۔ شہلا نے بار بار اسے چوما۔

”میرا بچہ۔۔۔ میری زندگی۔۔۔ کہاں چلا گیا تھا۔ ایک ہفتہ ایسے گزرا ہے جیسے روح کے بغیر جسم ہو۔“ وہ مسلسل

بل رہی تھی۔

”مہما۔۔۔ آپ کو پتا ہے میں نے مجھے پہلی کاپڑ لے کر دیا ہے۔ وہ بہت اوپر تک فلائی کرتا ہے۔ ریموٹ سے چلتا

ہے۔ میں لے کر آیا ہوں۔ آئین آپ کو دکھاؤں۔“

شہلا کے انداز سست پڑے۔ عمر اس کا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔

”آئیں نا مہما۔۔۔“

”بعد میں دیکھیں گے بیٹا! پہلے سب سے مل تو لو۔ تاکہ سے ملو۔ خالہ جانی سے۔“

عمر نے کمرے میں موجود افراد پر غور کیا پھر خوشی سے کھل اٹھا۔

”آپا! ہاشم! انکل۔“ وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔

ہاشم نے اس سے ہاتھ ملا کر پھر اسے اٹھا کر گود میں لے لیا۔

”کیا رابیہ بیٹی کا پیر کیول لے آئے؟“ وہ شگفتگی سے پوچھ رہا تھا۔

”ارادے تو نیک ہیں؟“

شہلا بزل سی ہوئی۔ ہاشم نے یونہی بے ارادہ کہہ دیا تھا یا اس کے دل میں کچھ تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی۔

”آپ دیکھیں گے میرا پہلی کاپڑ؟“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”میں آپ کو اڑا کر دکھاتا ہوں۔“ وہ ہرجوش ہو کر بھاگا تھا۔

ہاشم اس کے پیچھے چل دیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ منیوہ بیگم ربیعہ اور انیقہ ایک دوسرے کی

ہنس دیکھنے لگیں۔

”یہاں سب کچھ سیٹ ہے۔ بالکل پرفیکٹ! بس اب بہت اسیو تھلی اشارت لینا ہے۔ بہت اچھے طریقے

وہ باتھ روب لیٹے، بالکنی میں کھڑا بہت نیچے نظر آتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کان پر کارڈ لیس لگا تھا جب کہ کافی کا

کرم کپ بالکنی کی زلیوار پر رکھا ہوا تھا۔

”میں بہت پرامید ہوں شیری۔ یہاں کی مارکیٹ میں بہت مارجن ہے ہمارے لیے۔ پھر خدا کے فضل سے

ہرگز بھی بہت اچھا ملا ہے۔ عباد بہت عمدہ انسان ہے۔ میں بہت پسند کرنے لگا ہوں اسے۔“

ماں ہوں اس کی۔ بہت خفا ہے وہ ہم سب سے۔ کچھ کہتا نہیں لیکن دل ہی دل میں کڑھ رہا ہے۔
 ”کس بات پر؟“ سردہ حیران تھی۔

”ایک تو بے چارے کے سر زبردستی کا سہرا بندھ رہا ہے۔ صرف رافع کی ضد کی وجہ سے۔ اگر رافع راضی ہو جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ دوسرے عریشہ کے رویے کی سب سے شکایت کرتے ہیں۔ وہ بھی سنتا رہتا ہے۔ نافع بہت ٹینس ہے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں لیکن کچھ بولوں گی تو ایک پینڈورا بکس کھل جائے گا۔ جو میں نہیں چاہتی۔“ وہ پیکنگ چھوڑ کر افسردہ سی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

”عریشہ کو صرف فینٹسی تنگ کر رہی ہیں۔ شاوی کے بعد خود سیٹ ہو جائے گی۔“ ثانیہ بے فکری سے بولی۔
 رہی بات نافع کی تو ابھی اسے اس بات سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ چھوٹا ہونے کے باوجود پہلے اسے دولہا بنایا جا رہا ہے۔ وہ دن بعد دیکھنے گا باجپیس کھلی جا رہی ہوں گی۔“

”چپ کر۔ بد تمیز!“ سردہ ماں کے سامنے ایسی بات سے جھینپ گئی۔

”ثانیہ پھر نہیں دی تھی۔ آج کل اسے بات بے بات ہنسی آتی تھی۔“

عذرا بیگم فکر مند تھیں۔ نافع جس طرح فحاشی سے اٹھ کر گیا تھا۔ انہیں سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔ ثانیہ اور سردہ عریشہ کے لیے شکون کے جواڑے اور دیگر سامان کی پیکنگ کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ وہ لاؤنج سے باہر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ عذرا بیگم اس کے قریب آئیں۔

”کیا سوچ رہا ہے میرا بیٹا!“ وہ محبت سے پوچھنے لگیں۔

”میں کیا سوچ سکتا ہوں امی!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اور مجھے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“

”کیوں؟“ عذرا بیگم نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میرے بارے میں سوچنے والے کچھ متعلق فیصلہ کرنے والے مجھے ہر فیصلے سے آگاہ کرنے والے بہت لوگ ہیں یہاں۔ میں۔ میں۔ میں۔ کچھ سوچ کر لیا کروں گا۔“

”نافع! تم ناراض ہو ہم سب سے؟ مجھ سے؟“

”نافع نے بے اختیار ہی اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔“

”نہیں امی۔ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں آپ سے ناراض ہو بھی نہیں سکتا۔ بہت کچھ کر گزرتا میں۔ لیکن آپ کا خیال کتاب کی محبت مجھے بے اختیار رکھتی ہے۔“

”بھئی! خیر چاند!“ انہوں نے جبک کر اس کے بالوں پر بوسہ دیا۔ ”ماں کو خوش رکھنے والے۔ ماں کو خوش دیکھنے کے متنی ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ نافع۔ یاد رکھنا، میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”لیکن اندیشے تنگ کرتے ہیں امی!“ وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔ ”آپ نہیں جانتیں۔۔۔ متنی سے نکاح اور نکاح سے اب تک کا وقت بہت بے چینی اور بے اعتباری سے گزارا ہے، میں نے۔“

”میں سب جانتی ہوں نافع!“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ”ماں ہوں تمہاری، کیا پوشیدہ رہ سکتی ہے تمہاری بے چینی مجھ سے؟ لیکن میرے بیٹے! مشترکہ خاندان کو جوڑے رکھنے کے لیے بہت سے دریا پار کرنا ہوتے ہیں۔“

”بہت سی ان چابی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ ہونٹ سے رہنمائی عقل مندی ہے۔“

”عقل مندی؟ زندگی ہی برباد کر دے ماں؟ پھر نہ؟“ اس نے قدرے طنز سے کہا۔

”نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہوتا۔ صبر کا پھل میٹھا ہی نکلتا ہے۔ بس امید اچھی رکھو۔“

”وہ میرا ساتھ پا کر بہت ناخوش ہے امی۔“ وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔ ”کیا امید رکھوں؟“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا۔ امیر حسن نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا تھا۔
 ”اوہ! میں۔ نوڈاؤٹ۔ بابا! تو تمہیں یاد ہے؟“

وہ مسکراتے ہوئے دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

”شی ازناٹ اونٹنی پر بیٹھ بیٹھ ڈفرنٹ۔ کچھ الگ سا ہے اس میں۔“ وہ اپنا کپ اٹھا کر اندر لاؤنج میں چلا آیا۔
 ”تو جانتا ہے یا؟ میں بہت دیریں گھوما ہوں۔ ہزار بار لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن کچھ کہتی ہوئی کچھ چھپائی ہوئی آنکھوں کی بات ہی اور ہے۔ یہ میں نے اب جانتا ہے۔“

وہ نرم لیدر کے گداز صوفے میں دفھنس گیا اور کافی کے سب لینے لگا۔

”ہاں یا۔ اب تو کچھ سیریس ہی لگتا ہے معاملہ صاف گوئی سے بتا رہا ہوں۔ میں کبھی کبھار بہت سنجیدگی سے سوچتا ہوں اس کے بارے میں۔“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تھا۔

”کوئٹہ یا۔ ابھی اس سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی ملا ہی کتنی بار ہوں۔ کیا؟ بابا! عریشہ کے لیے۔“

ایک ہی وار کافی ہوتا ہے بالکل۔“

لاؤنج میں اس کی بے فکر ہنسی گونجنے لگی تھی۔

”ضرور آفس۔ میں تو بے چین ہوں تمہیں دیکھنے کے لیے۔ تم بے ملنے کے لیے۔ اے۔ یہاں۔ ایک بات بتانا بالکل بھول گیا۔ جانتے ہو شیری! میرے آفس میں تمہاری تصویر دیکھ کر مس رہیجہ نجانے کیوں بہت گم ہنسم سی ہو گئی تھیں۔ جیسے وہ تمہیں جانتی ہوں۔ حالانکہ وہ کبھی پاکستان سے باہر نہیں گئیں۔ اور تم کبھی پاکستان آئے نہیں۔“

وہ کپ خالی کر کے میز پر رکھنے لگا۔

”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں جنہیں میں جانتی ہوں۔“

جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سنو! بابا کیسے ہیں؟“

پھر جیسے وہ مایوس ہوا تھا۔

”چلو! اللہ بہتر کرے گا۔ میرا سلام کہنا انہیں۔ اوکے۔ اللہ حافظ۔“ اس نے فون آف کیا پھر کچھ سوچ کر مسکراتے لگا تھا۔

وہ بالکل خاموش بیٹھا ماں اور بہنوں کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ سب کی سب بے حد اہمک سے سب چیزیں چمکتے کاغذوں میں پیک کر رہی تھیں۔

”جوڑے لے تو لیے ہیں اب اللہ کرے عریشہ کو پسند آجائیں۔ اس کی طبیعت بھی عجیب ہے۔ وہ ہی لگتا ہے۔“ ثانیہ نے بے لاگ بھڑک دیا۔

عذرا بیگم نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نافع کی وہاں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ ثانیہ کھلکا لائی۔

”اسے کیا بتا نہیں ہے اور اگر نہیں ہے تو سب سے پہلے اسے ہی پتا چلنا ہے۔ میم صاحبہ کا۔“

نافع ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ثانیہ اور سردہ حیران سی ہو کر عذرا بیگم کو دیکھنے لگیں۔

”اسے کیا ہوا؟“

”میں تمہیں منع بھی کر رہی ہوں لیکن تم باز نہیں آئیں۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”تم نہیں جانتیں میں جانتی ہوں۔“

ماں کی تھوڑی سی محبت ڈر اسی ہمدردی نے جیسے کسی آبلے کا منہ کھول دیا تھا۔

”وہ بے عقل ہے۔ ابھی زندگی کو دیکھا ہی کہاں ہے اس نے؟ دلہن بنتی ہے تو عورت عورت بن جاتی ہے نافع۔ اس کی آنکھوں پر دور اندیشی کی عینک خود بخود لگ جاتی ہے۔“

”جانے دیں امی۔! ایسا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی گھر نہ بگڑتا! ایقان پھپھو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“

”پھر بھی نافع۔ کوئی ایک فریق اگر اپنا گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور بسا رہتا ہے۔ میں خود بھی اس سلسلے میں بہت فکر مند ہوں۔ اکثر اس بارے میں سوچتی ہوں۔ لیکن پھر تمہارے بارے میں سوچ کر بہت مطمئن۔ اور پرسکون ہو جاتی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں عریشہ کم عقل اور جذباتی ہسی۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“

”آپ نے کہا امی! کہ ایک فریق اگر گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور رہتا ہے۔ لیکن اگر ایک فریق گھر اجاڑنے پر آمادہ ہو جائے پھر کیا ہو؟“

”ایسی باتیں مت کرو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”مرد ہو۔ مرد بن کر دکھاؤ۔ محبت کی لواتنی تیز رکھنا کہ ناخوشی موم بن کر پگھل جائے۔ بیٹا! میں تم سب کو ہمیشہ ہنستا ہوتا دیکھنا چاہوں گی۔ رافع کی جانب سے مجھے بہت خوف ہے۔ اس کے انداز مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں۔ لیکن تم میرے بہت پیارے بیٹے ہو۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“

نافع نے ان کا ہاتھ پکڑ کر عقیدت سے چومایا۔

”میں آپ کے یقین پر پورا اترنے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“

عذرا بیگم بے فکر ہو کر ہنس کر اوی تھیں۔



”یہ کیسلا گٹ ہی دیکھ کر کچھ بھوٹ دو منہ ہے۔“ عریشہ کی سب سے بڑی ماہن بیٹی بھی اٹھی۔

”میں یہاں تمہاری شادی کی شاپنگ کروا لے آئی ہوں۔ تمہاری اس جلد خاموشی سے اڑنے نہیں آتی۔“

”آئی۔! آج آپ کرنے آئی ہیں، کیجئے شاپنگ کرنے آئی ہیں تو شاپنگ کریں۔ ہر بات میں میری رائے اور میری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”لو۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟ بھی شادی تمہاری، پہننا اوڑھنا تمہیں۔ پسند بھی تمہاری ہو تو اچھا ہے۔ چلو ڈیزائن میں پسند کرتی ہوں۔ یہ بتاؤ ڈیزائننگ ڈریسنگ کا رنگ کیا ہو؟“

وہ اس کا تباہ کن موڈ دیکھ کر مصالحانہ انداز میں بولی۔

”سیاہ! عریشہ سکون سے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ اسے جھٹکا لگا۔ ”سیاہ؟ عروسی لباس؟“

”کیا حرج ہے؟ شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ جب خوشی کا کوئی رنگ ہی نہ چمکے دل میں تو پھر سیاہ رنگ ہی مناسب ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو عریشہ! ماہن پریشان ہو گئی۔ ”تم اب تک اس ناراضی سے باہر نہیں نکلیں۔ اگر یہی معاملہ کرنا تھا تو اس وقت بولتیں، چیختیں، چلاتیں۔ اسٹینڈ لے لیتیں۔ اب ان فضول باتوں سے کیا حاصل؟“

عریشہ نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔

”اسٹینڈ؟ اسٹینڈ تو پھر کسی وقت بھی لیا جاسکتا ہے۔“

”کیا کیا مطلب؟“ ماہن ڈر گئی۔ ”دیکھو عریشہ! خاندانی لڑکیوں کے یہ اطوار نہیں ہوتے، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب خود کو سمجھا لو۔“

”سمجھانے کی بات کرتی ہیں۔ میں نے تو خود کو ماری لیا تھا لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“

”کسی نے ایسی آگ لگائی ہے اس مرد وجود میں کہ راکھ بننے کے بجائے شعلہ بن گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے جلا ڈالوں سب کچھ۔“

”کس نے آگ لگائی ہے۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ ماہین پریشان ہو گئی۔ ”خدا کے لیے عریضہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جس سے اس گھر کو اس گھر کے مکینوں کو کوئی صدمہ ہو۔ کوئی دکھ اٹھانا پڑے۔“

عریضہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں بھی تو اس گھر کی مکین تھی۔ کسی نے میرے بارے میں نہیں سوچا۔“ پھر وہ دکھ سے بولی۔ ”مجھے ایک اکائی ایک ذات نہیں سمجھا کسی نے کیوں آبی؟“

”میں جانتی ہوں عریضہ! تمہیں نافع دل سے قبول نہیں تھا۔“ ماہین نے افسردگی سے اس کے کان پر ہاتھ رکھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو ہر چند کہ تم نے کبھی اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن عریضہ! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے ان معاملات میں وقت کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وہ وقت نکل جائے تو پھر صبر ہی کرنا اچھا ہے۔ تمہارے ہاتھ میں اب کچھ نہیں ہے۔ جب تم منگتی ہو تو وقت خاموش رہیں ٹکاج پر مرہ لب رہیں تو اب کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اب کچھ کہو گی۔ کچھ کہو گی تو سوائے زلت کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

مت سوچو بری باتیں۔ اچھی باتیں سوچو۔ یہ وقت انجوائے کرو۔ خوشی خوشی اپنی شادی کی خریداری کرو۔ ثانیہ کو دیکھو ناعمہ کو دیکھو۔ وہ دونوں انجوائے کر رہی ہیں یہ ناٹم پیر پڑے اور تم! آگ راکھ اور شعلوں کی باتیں کر رہی ہو۔“

عریضہ نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں تھی۔

”ناعمہ۔۔۔ ناعمہ انجوائے کر رہی ہے۔ یہ ناٹم پیر پڑے۔“ وہ بولتی ہے۔ ”اے اے کرنا چاہیے۔“

جاری ہے۔ فراز اس کا بن جائے گا۔ فراز اور چاند جس کی پچھو بن کر تمنا کی میں نے۔ وہ فراز اس کا ہونے جا رہا ہے۔ جھوٹ سے دھوکے سے فریب سے ناعمہ اسے خالص کر لے گی۔ اپنی جیت پر فتح پر مسکرائے گی۔ اور مجھے نافع کے ساتھ دیکھ دیکھ کر ہنسے گی۔“

اس کا تخیل تیز تر ہونا لگا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ناعمہ! میں تمہیں ہنسنے نہیں دوں گی۔ میں روؤں گی تو تمہیں بھی روونا پڑے گا۔“

ماہین اسے خاموش بالکل خاموش پا کر بے دلی سے اٹھ گئی تھی۔

درد نہا کر بال سکھارہی تھی۔ کال بیل بجی تو اس نے کھوجتی نظروں سے ناعمہ کی تلاش کی پھر اسے غائب پا کر ٹھنڈی آد بھر کڑوا زے کی سمت بڑھی تھی۔

”آپ۔۔۔! دروازہ کھول کر اس نے بلند ناصت کو سامنے پایا تو بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”آپ۔۔۔! رافع نے اس کے صبح چہرے پر ایک نگاہ کی پھر اس سے پرے دیکھنے لگا۔

”پچھو۔۔۔ پچھو ہیں اندر؟“ انہیں بھیج دو۔“

”نہیں۔۔۔ ائی تو نہیں ہیں۔“ درد کو حیرانی ہوئی۔ ”آپ اندر آجائیں کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔“

”پچھو نہیں ہیں۔“ رافع کو حیرانی ہوئی۔ ”کہاں گئی ہیں؟“

”مارکیٹ۔“

”لیکن انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ جائیں گی۔ وہ اکیلی کیوں چلی گئیں؟“

”شاید دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے۔“ درد اتنا ہی کہہ سکی۔

رافع نے سوچ کے عالم میں چند لمحے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں رکھا تھا۔ درد پر زل سی ہوئی۔ شانوں پر تولیہ پھیلائے لیے سیاہ بالوں کے حصار میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ دھیمے سے بولا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

وہ پلٹا پھر جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اس کے عین عقب میں ربیعہ کھڑی تھی۔ رافع نے اپنے جذلوں میں اس تیزی سے تبدیلی محسوس کی تھی کہ وہ خود ہی خوف زدہ ہو گیا۔ ربیعہ جو ابھی ابھی وہاں پہنچی تھی رافع کو دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے رافع کی آنکھوں میں اترتے رنگوں سے نظریں چرا کر کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ رافع کی آواز میں خوشی کی آمیزش تھی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”شکریہ خدا کا۔“ وہ مختصراً بولی۔

مود اور فیروزی کا جی ٹیشن کے سوٹ میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ آنکھوں میں شام کے سب ہی رنگ مسکرا رہے تھے۔ نرم لبوں پر وہی انہی مسکان تھی جو ان لبوں کا خاصا تھی۔

ایکایک رافع کو عقب میں کھڑی درد کا اظہار ہوا۔ وہ درمیان سے ہٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ ربیعہ نے بے ارادہ ہی گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر وہ چونک کر درد کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”کیسی ہو درد؟“ وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ درد نے اسے راستہ دیا۔ ”آپ۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ میں میرے ساتھ آؤں۔“ اس نے مسکرائی۔ ”میں اس وقت کام سے آئی ہوں۔“

”اچھا لیکن کام کیا ہے؟“

”شہلا آپ کے کمرے سے ان کا کچھ ضروری سامان لینا ہے۔ دراصل ہاشم بھائی شہلا آپ کو اچانک ہی لے آئے تھے۔ بنا سامان کے۔ پھر شہلا آپ کی وہیں رک گئیں ہمارے پاس اب انہوں نے مجھے بھیجا ہے ان کے وارڈ

روپ سے کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ تم پلیر میز پر لے کر ساتھ چلو میں ان کی ساس سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ میں یہ تولیہ رکھ دوں۔“ درد پٹی تھی۔ ”اور ناعمہ کو بھی بتا دوں۔“

فردوس بیگم نے خاصی خطرناک نظروں سے ربیعہ کو دیکھا تھا۔

”ہاشم نے تو ہم سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ ہم کیسے اس کا کمرہ کھول دیں۔“

”جی۔۔۔! ربیعہ سٹپٹا گئی۔ قدرے نجل بھی ہوئی۔ ”آپ۔۔۔ آپ ہاشم بھائی سے پوچھ لیجئے۔ یا شہلا آپ

”تمہاری آپ کی پیروں میں شاید مہندی لگی تھی۔ جتنا رستہ تم نے طے کیا اتنا وہ بھی تو کر سکتی تھیں۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی انہی تھیں۔ ربیعہ ایک مرتبہ پھر پانی پانی ہوئی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو تو علم ہو گا۔“

”اے ہاں۔۔۔ ہم نے تو انہیں بیمار ہی پایا ہے۔“ انہوں نے کسی گوشے سے چابیاں برآمد کر کے ربیعہ کے ہاتھ پر رکھیں۔ ”یہ لو۔ کمرے کی اور الماری کی سب ہی چابیاں ہیں۔ ہمارا تو خیال ہے سب ہی سامان ایک باری لے جاؤ۔ بار بار چکر لگانا پڑیں گے تمہیں۔“

”جی...!“ ربیعہ کامنہ حیرت سے کھل گیا۔

ان شعلہ بیانیوں کا ذکر بھی کبھی شہلانے نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتی اور ادب سے ان کا ذکر کرتی تھی۔ ربیعہ کو شہلا سے عقیدت سی محسوس ہوئی۔

”تائی امی!“ وردہ نے انہیں تنبیہ کرنا چاہی پھر خاموش ہی ہو رہی۔

وہ دونوں مزید گفتگو سے بچنے کے لیے تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھیں۔ تب ہی کسی گوشے سے نکل کر اختر میاں چلے آئے۔

”آپ! یہاں!“ وہ ربیعہ کو دیکھ کر کھل سے اٹھے۔

ربیعہ بے طرح پریشان ہوئی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ کافی پریشان ہو چکی تھی۔

”آپ کی تعریف؟“ وہ وردہ سے پوچھنے لگے۔

”یہ میری دوست ربیعہ ہے۔ شہلا بھالی کی بہن!“

”بہت خوب۔۔۔ ایسے لوگوں کو خدا نہ جانے کتنی محبت سے بناتا ہو گا۔ کیوں باجی؟“

”اوہر آکر بیٹھو اختر میاں!“ فردوس بیگم بھنا کر بولیں۔ ”انہیں ان کا کام کرنے دو۔“

ربیعہ اور وردہ سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ اختر میاں مسکراتے ہوئے بہن کے پاس آ بیٹھے۔

”جانتی ہیں باجی!“ اس لڑکی کو دیکھ کر ہمیں کیا یاد آتا ہے؟“

”کیا یاد آتا ہے؟“ انہوں نے ابرو چڑھائے۔

”ایقان کی جوانی۔۔۔“ ان کی آواز انداز میں عجب حسرت تھی۔ ”وہی سوندھا پن۔۔۔ وہی خوشبو وہی روشنی۔“

”خدا کی تیار تم۔۔۔ آہستہ بولو۔ یہ بھی شریف لوگوں کے کمرچنے کی باتیں ہیں۔ برائی لڑکیوں کے بارے میں

اور ایقان کی یاد آ رہی ہو گی۔ جو اس کی جوانی یوں رہے ہو۔“ وہ افسانہ جھڑکنے لگیں۔

”ہا۔۔۔ وہ پندرہ برس پہلے کی بات تو نہیں باجی۔“

فردوس بیگم نے انہیں غور سے دیکھا۔

”بیابا کروا دیں تمہارا لڑکی سے؟“ وہ ان کے قریب جھک کر سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

”باجی؟“ اختر میاں کامنہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔



ہاشم نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور گہری سانس بھر کر فائل بند کی۔ آج پھر اسے آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے کمر سیدھی کرنا چاہی۔

تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی تھی۔ ہاشم نے اسکرین پر کالر کا نام دیکھنا چاہا لیکن وہاں اجنبی فون نمبر تھا۔

”ہیلو۔۔۔!“ وہ تھکن کے احساس کے ساتھ بولا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ مسٹر ہاشم۔!“ دوسری جانب کسی کی گہبھر خوبصورت آواز تھی۔

”جی۔۔۔ آپ کون؟“

”ہاشم! میں ابرار بات کر رہا ہوں ابرار جیلانی!“

ہاشم کی تھکن لمحہ بھر میں ہوا ہو گئی۔ وہ سیدھا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

”فرمائیے۔“ وہ بے حد محتاط انداز میں بولا تھا۔

دوسری جانب ابرار نے کھٹکھٹا کر اپنا گلا صاف کیا تھا گویا کسی اہم بات کی تمہید باندھ رہی تھی۔
”بات قدرے لمبی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ اگر بہت مصروف نہ ہوں تو کچھ وقت لوں گا آپ کا۔ اور اگر اس وقت آپ بات کرنے کے موڈ میں نہ ہوں تو۔ میں پھر کسی وقت۔“
”نہیں میں مصروف نہیں ہوں۔“ ہاشم نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ”آپ کو جو کہنا ہے کہیں۔ میں بغور سن رہا ہوں۔“

اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل بند کی تھی۔ ابرار کے فون نے جیسے اس کے دماغ میں کسی علاقہ غیر پر ممنوعہ کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کی سوچ نے مختلف سمتوں میں پرواز بلند کی تھی۔ پہلے تو میں ایک اہم سوال پوچھنا چاہوں گا ہاشم۔ ایسا سوال جس کا جواب مجھے میرے بہت سے اندازوں کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ دے گا۔

”پوچھیے۔“ ہاشم نے محسوس کیا کہ وہ ٹینشن کا شکار ہونے لگا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنی بات کی پائیداری کی گنجائش کی تھی۔

”آپ کے اور شہلا کے درمیان کبھی میرے متعلق گفتگو ہوئی ہے؟“ ابرار نے پوچھا۔ اس کے انداز میں بے حد اعتماد تھا جیسے اسے یہ سوال پوچھنے میں کوئی عار نہ ہو۔ ہاشم نے اپنے منہ پر قابو پالیا کہ اسے احساس ہوا کہ ابرار کے لبوں پر شہلا کے نام نے اس کی شائستہ روی کو کھینچ لیا ہے۔
”نہیں۔ کبھی بھی نہیں اور میرے اور میری بیوی کے درمیان کبھی آپ کا ذکر آئے بھی کیوں؟“ وہ سیات لہجے میں بولا تھا۔

دوسری جانب لمحہ بھر کے لیے سکوت سا طاری ہوا۔ ابرار نے سنبھل جانا۔
”اس لیے کہ میں آپ دونوں کے لیے اس قدر اچھی یا۔ بد خیال نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ دونوں کو میری یاد دلانا ہو گا۔“

”جی نہیں۔ اپنے متعلق میں بے حد وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے لیے عمر آپ کا حوالہ نہیں ہے۔“
”اور نہ شہلا کے متعلق؟“ دفعتاً ابرار کے لہجے میں چین کی آواز آئی۔ ”اس کے متعلق بھی آپ اپنا یہی وثوق استعمال کریں گے؟ آپ سمجھتے ہیں مسٹر ہاشم کہ شہلا مجھے بھول چکی ہے؟ بھول سکتی ہے؟“
”آپ اپنا سوال کر چکے۔ جواب آپ کو مل گیا۔ اب اپنی بات کہیے۔“ ہاشم نے اس کا یہ سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے آپ کے موڈ کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اس لیے زیادہ تمہید نہیں باندھتا۔ ہاشم! میں جانتا ہوں آپ ایک بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہنڈرڈ پرمینٹ آجنٹل مین۔ آپ کی اچھائی نے ہی آپ سے یہ بات کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ورنہ شاید میں یہ طریقہ نہ اپناتا ہاشم! عمر کے پھلے کے لیے۔ میرے پھلے کے لیے۔ اور سب سے بڑھ کر شہلا کے پھلے کے لیے۔ شہلا کو دوی دوس دے دیں۔“

ہاشم کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے پورے بدن میں ایک ظالم تناؤ ابھرا تھا۔ اس کی ایک ایک نرس کھینچ کر رہ گئی تھی۔
”آپ کو یہ بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی مسٹر ابرار۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کہا آپ مجھے اپنے جیسا ایک کہنہ خیال کرتے ہیں؟ میرے لیے عورت رومال نہیں ہے مسٹر ابرار۔ میری بیوی میری ہم نفس ہے۔ آپ نے مجھے اتنا شریف خیال کیا کہ مجھے ہنسی آتی چاہیے جو کہ نہیں آ رہی۔ مجھے اس قدر شدید غصہ آ رہا ہے کہ اگر میں نے اس کا مکمل اظہار کیا تو میرے متعلق آپ کی رائے قطعاً تبدیل ہو جائے گی۔ میں اتنا بھی ”جنٹل مین“ نہیں

ہوں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔“

اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ابرار نے اس کا لفظ لفظ بغور سنا تھا۔

”آپ کو یقیناً غصہ آنا چاہیے۔“ وہ بے حد نرم لہجے میں بولا ”میں آپ کی جگہ ہوتا تو مجھے بھی آتا۔ لیکن پلیر ہاشم۔ پلیر۔ آئی بیک یو۔ اس وقت اپنے جذبات پر کنٹرول کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہ بہت اہم گفتگو ہے۔ جس میں بہت حقیقت پسند ہونے کی ضرورت ہے۔“

”ریشٹل؟“ ہاشم طنزاً بولا۔ ”گویا ابھی جو ”مشورہ“ آپ نے مجھے دیا۔ وہ آپ کے حقیقت پسند ہو کر سوچنے کا ثبوت ہے؟“

”ہاشم۔ یہ بہت سے لوگوں کی زندگی کا۔ ان کی خوشیوں کا۔ ان کے آئندہ کا سوال ہے۔ آپ غصہ نہ کیجیے پلیر۔“ ابرار مزید نرم ہوا۔ ”یہ بات آپ کے احساسات پر ایک کوڑے کی مانند برسی ہوگی۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بتائیے کہ میں اور عمر۔ جو کہ ایک مثلث کے دو کونے ہیں۔ اور اپنے تیسرے کونے کو۔ جسے حساس، زوردار اور قدرتی بڑبڑیل ہے۔ ساری عمر کڑھتے ہوئے گزار دے گی لیکن خود اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہے گی۔ وہ عمر کو مس کر رہی ہے۔ اپنی اہم شیوہ کہ وہ مجھے بھی مس کر رہی ہے۔ ایسے میں کیا یہ اچھائی کی ایک صورت نہ ہوگی کہ اتنے لوگوں کی اداسی کا بار ایک کندھا اٹھالے اور بہت سے دل کھل جائیں۔ غموں کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں۔“

”کندھے کا انتخاب اچھا کیا ہے آپ نے۔“ ہاشم خشک انداز میں بولا۔ ”دادرتا ہوں۔“
”ہاں ہاں ہاں۔ ہاشم! کہ یہ واحد انتخاب ہے۔ اس کے سوا چار نہیں۔“

”دیکھیں! ابراہیم! ہاشم نے خود کو ایک بے پناہ تھکا ہوا محسوس کیا تو کرسی پر بیٹھ گیا۔ بات آپ محض اس رخ سے کر رہے ہیں۔ جہاں آپ خود کھڑے ہیں۔ اس ساری پتویشن کے بہت سے رخ ہیں۔ اچھائی اور بہتری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ عمر کو واپس ہمارے پاس بھیج دیں۔ وہ یہاں خوش تھا۔ اس معصوم بچے کو آپ نے ڈسٹرب کیا اس کے شفاف ذہن کو آپ نے کرا آئندہ کیا۔“

”جسٹ اے منٹ ہاشم۔ آپ نے کیا کہا؟ عمر کو واپس آپ کے پاس بھیج دیں؟ آپ کے پاس؟ وہ آپ کے پاس کب تھا؟ آپ تو صرف شہلا کو لے کر گئے ہیں ہاشم۔ عمر کو تو آپ وہیں چھوڑ گئے تھے اس کی نانی کے گھر۔“
ہاشم کا ایک جیسے لہجہ ابھرا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ فاروق حسن اور فردوس بیگم کے بھرپور دباؤ کے باعث وہ کبھی بھی عمر کو واپس کے سارے ساز و سامان سمیت اپنا بیٹا بنا کر اپنے گھر نہ لے جاسکا تھا۔ اسے اس بات کی خواہش ضرور تھی لیکن شادی سے قبل ہی اسے یہ بات باور کرا دی گئی تھی کہ ”حیات ولا“ میں صرف وہاں کے کینڈوں کی نسل ہی پروان چڑھ سکتی ہے کسی اور کی نہیں۔“

ہاشم اس بات پر رضا مندی کا اظہار کر کے ہی شہلا کو حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں کبھی بھی حالات ایسی کسی خوشگوار رچ بچ نہ آ سکے تھے کہ وہ اور شہلا عمر کو وہاں لے آتے۔ خود شہلا بھی فردوس بیگم کے رویے سے نالاں تھی وہ اپنی اس خواہش سے دستبردار ہی ہو چکی تھی۔

”آپ خاموش ہو گئے؟“ ابرار کو جیسے اس کی خاموشی سے مسرت ہوئی تھی۔ ”اب تو میں آپ کے رخ سے پتویشن کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں مسٹر ہاشم۔ کیا کہتا ہے یہ رخ؟“ اس ازرائش یا کہیں یہ کچھ غلط بھی ہے؟“
”اگر کہیں یہ کچھ غلط بھی ہے تو یہ آپ کی وجہ سے ہے ابرار!“ اب کے ہاشم کے لہجے میں بھی وہ پہلے والی سرد مہر نہ تھی۔ وہ جیسے بات کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔

”بات وہیں سے غلط ہے جہاں آپ نے غلطی کی۔“ اس نے اپنے الفاظ پر زور دیا۔ ”آپ نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی خراب کی۔ اسے بچ منجھدار میں لا کر تھما چھوڑا۔ اور اب جبکہ اسے ایک کنارہ میسر ہے۔ آپ پھر الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے اپنے ماضی پر از حد شرمندگی ہے ہاشم! سب کچھ غلط کیا۔ سوائے ایک بات کے۔ میں نے اس سے جو محبت کی وہ سچی تھی۔ اور آپ کو برا محسوس ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شہلا نے بھی مجھے ٹوٹ کر چاہا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ہاشم! آپ نے کبھی اس کی محبت کی ہلکی سی رمت بھی محسوس نہ کی ہوگی۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ آج بھی جب وہ مجھ سے بات کرتی ہے تو اس کے لہجے میں اس پرانی محبت کی خاموش خوشبو ہوتی ہے۔ وہ خوشبو صرف میں محسوس کر سکتا ہوں۔ صرف میں۔“

ہاشم کو یوں لگا جیسے اس کا موی دل کسی تیز شعلے پر ٹھہرا ہو۔ قطرہ قطرہ۔ لڑکی بوندیں اس کے مساموں سے پھوٹ نکلیں۔

”ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا ہاشم! میرا اب بھی دعوا ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں وہ بھی یقیناً میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہے۔ ہمارا ایک بیٹا ہے جسے ماں کی بھی ضرورت ہے اور باپ کی بھی۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جو خوبصورت ہے۔ مکمل ہے لیکن ایک حادثے نے اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر آپ کی قربانی سے یہ تصویر پھر سے جڑ جائے۔ پھر سے ویسی ہی خوبصورت اور مکمل ہو جائے۔ تو کیا آپ یہ قربانی نہیں دیں گے ہاشم؟“

ہاشم کے لب سختی سے باہم ہوسٹ تھے۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔

”میں نے شہلا سے کہا تھا کہ اگر وہ میرے پاس لوٹ کر آتا جاتی ہے تو کسی صورت پر یکنیمیں بیٹا ہوئے۔ وہ میری بات پر عمل کر رہی ہے۔ وہ اب تک پر یکنیمیں نہیں آئی۔ کیا یہ بات اس کا ثبوت نہیں ہے؟“

شہلا بھی اسی ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی تصویر میں زندہ ہے؟ پلینز ہاشم! آپ اس سے محبت کے دعوے دار ہیں۔ میں اس میں کسی قسم کا شک نہیں پاتا لیکن محبت کبھی کبھی ثبوت کے طور پر بہت کچھ مانگ لیتی ہے۔ کیا آپ شہلا کو خوش رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک بچہ اپنی ماں کو دے دے؟ ہاشم کی محبت کے سائے میں پروان چڑھے؟ یا۔ پھر آپ صرف اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے اس خوبصورت تصویر کے ٹکڑوں کو بے رحمی سے منہ کر دیں گے؟“

ہاشم اتنا کچھ سن چکا تھا کہ مزید کی گنجائش ہی نہ تھی اس نے سیل آف کر کے ٹیبل پر ہیمنک دیا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ابرار کا کہا ہوا لفظ لفظ اپنی بازگشت بنا رہا تھا۔

”ربیعہ!“ منیزہ بیگم کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

تندہ سے اٹھنے پر پھینٹے ہوئے ربیعہ چونک کر رہی۔

”جی امی؟“ اس نے پتھر آف کیا۔

”بہت مصروف ہو؟“ وہ ایک لمحہ گوا سے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔

”میں عمر کے لیے ماربل کیک بنا رہی ہوں۔ بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔ آپ بتائیے۔ کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے؟ کوئی کام ہے؟“

”میں سوچ رہی تھی کہ گھر کی کتنی ہی چیزیں بے کار اور فرسودہ سی ہو گئی ہیں۔ کیوں نہ ایک چکر مارکیٹ کا

لگا لیں۔ انیقا کہتی ہے وہ مصروف ہے۔ میں اور تم مارکیٹ چلیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ”میں کیک کا بیڑ تیار کر لوں پھر اسے ادون میں رکھ کر نہالیتی ہوں۔ تب تک آپ بھی تیار ہو جائیں۔“

منیزہ بیگم نے دیکھا۔ وہ پسینہ سے بھیگ رہی تھی۔ انہوں نے دم پر رکھے چاولوں پر نگاہ کی پھر وہ اس کے قریب آئیں اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”میری بیٹی! میرا ہے ہیرا۔ جس کی زندگی میں شامل ہوگی اس کی قسمت کو جگمگا دے گی۔“

ربیعہ شرمندہ ہوئی اسے ایسی باتوں سے جھینپ آتی تھی۔

”جیتتی رہو۔ خوش رہو ہمیشہ۔“ انہوں نے محبت سے دعا دی۔

پھر وہ کچن سے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ چند لمحے ان کی بے لوث محبت پر غور کرتی رہی پھر مسکرا دی۔ ایک مزیدہ پھر وہ جلدی جلدی کام نمٹانے لگی۔

کیک کا آمیزہ ادون میں رکھ کر ٹیمپریچر سیٹ کر کے وہ کمرے میں چلی آئی۔ مارکیٹ جانا تھا سوالماری سے اپنا استری شدہ جوڑا نکال کر وہ واش رووم میں گئیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ نہادھو کر بالکل فریش ہو کر بالوں میں برش پھیرتے ہوئے منیزہ بیگم کے کمرے کی جانب بڑھی تھیں۔

”ای جی!“ اس نے دستک دی۔

پھر کوئی جواب نہ آنے پر اس نے ہینڈل پر ذرا سا باؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

”ای جی۔“ اس نے اندر جھانکنا پھر اس کے اوشان خطا ہو گئے۔

منیزہ بیگم اپنے کپڑوں کی التاری کے قریب گری ہوئی تھیں۔ وہ بے ہوش معلوم ہوتی تھیں ربیعہ کے لبوں سے چھ لگی تھی۔

ہاسٹیل میں سب ہی ان کے قریب موجود تھے۔

عباد شہلا! ”انیقا“ عمر ہاشم اور ربیعہ۔ منیزہ بیگم نے دھیمے سے مسکر کر ان سب کے چہرے دیکھے۔

”یہ مجھے یہاں کیوں لگے؟“ وہ قدرے نقاہت سے بولیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ عباد۔ بیٹا۔ مجھے گھر لے چلو۔“

”ضرور چلیں گے ان شاء اللہ۔“ وہ بشارت سے مسکرایا۔ ”آپ فٹ فاٹ ہو جائیں تو ابھی چلتے ہیں۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

”ہمیں بھی تو پتہ چلے۔“ وہ بھی مصر ہوا۔

”تمہیں میں بستر سے اتر کر چل پھر کر دکھاؤں؟“ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے کہے پر نہیں۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اعتبار آئے گا؟“

انیقا بولی تھی۔ کب سے ٹال رہی ہیں بیماری کو۔ کسی سے کچھ کہتی نہیں۔ درد ہوتا ہے چپ چاپ سے جاتی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے امی جی! بس اب آپ بالکل صحت یاب ہو کر یہاں سے اٹھیں گی۔“

منیزہ بیگم نے اس کا خفا خفا سا انداز دیکھا اور بے بسی سے مسکرائیں۔

”مجھے ان اسپتالوں سے سخت خوف آتا ہے انیقا! اسپتال کے بستر پر لیٹنا مجھے خوفزدہ کرتا ہے۔ میں نہیں لیٹ سکتی۔“

”خیر سے کسی کام سے آئی ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے ناراضی سے بولیں۔ ”ہم سمجھے ہماری محبت نے بالآخر جوش مارا۔۔۔؟“

”اماں۔۔۔“ ایقان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اتنی بدگمان ہیں مجھ سے؟ میں نے کہا تھا آپ تو جیسے میرے خون میں رواں ہیں۔ ہر وقت آپ کی محبت کا احساس رہتا ہے مجھے۔ ماں سے بڑھ کر دنیا میں چاہے جانے کسے لائق کون ہے؟ میں بھی ماں ہوں پورا اندازہ ہے مجھے۔“

”ٹانہ اور نافع کی تاریخ ٹھہر گئی۔ کتنے چکر کاٹنے عذرا اور بچیوں نے بازاروں کے۔ تو نے نہ پوچھا اگر کسی بات کا۔ ایسی ہوتی ہیں پیو پھیاں۔“

اب نموں نے واضح اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”اب رہتے بھی دیں نا اماں!“ عذرا بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ”وہ بے چاری آئی تھی ہے تو اسے پریشان تو نہ کریں۔ اور وہ چھوٹے بچوں کی ماں۔ اسے کہاں اتنا نام کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا دن بازاروں میں خوار ہو۔ تم

ایقان مدھم سا مسکرائی تھیں۔ ”سکراہٹ اس کے چہرے پہ بجتی نہ تھی۔“

”مجھے اپنی کوتاہیوں کا اندازہ ہے بھلا کبھی بیگم۔“ وہ لڑکتیلی سے بولی۔ ”بکھی بہت شوق تھا ان سارے کاموں کا۔

بہت بے تابیوں سے سوچا کرتی تھی کہ ”جیسا کہ ہلا“ میں خوشیاں اتریں گی تو ہر کام میں بھرپور حصہ لوں گی۔ ساری

تیا ریاں کرواؤں گی۔ بھاپ کی طرح اڑ گئیں ساری تمنا میں پتے ہوئے دل پرستے۔“

اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔ اس نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

”پھر کبھی پھانسی جان کوئی بھی کام ہو۔ آپ مجھے خود سے کہہ دیا کریں۔ کم از کم میری کوتاہیوں کا احساس دلائی

دیا کریں۔“ ایقان نے بھری آنکھیں دھوئی۔ ”وہ لڑکی اور بچہ۔“

”میں نے آپ کو بھلا نا چاہا اور آپ مزید زور دینے لگیں۔“ رافع بولا۔ ”کیسے کیا کام تھا؟“

”مجھے نیٹ پر میرے اکاؤنٹ کی کرنٹ پیویشن دیکھ کر بتاؤ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شفیقہ حیات نے تولی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا جیسے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو۔

”چلیں پھر میرے کمرے میں آجا میں بتا کر ارفع بھی کھڑا ہوا۔

”ہاں ٹھیک ہے چلو۔“

وہ دونوں کمرے سے نکلے۔

”ایقان اکاؤنٹ چیک کرنے آئی ہے؟“ شفیقہ حیات نے قدرے رازدارانہ انداز میں عذرا بیگم سے پوچھا۔

”جی اماں۔ اب نیٹ پر ساری تفصیل مل جاتی ہے اپنے اکاؤنٹ کی کب کتنے جمع ہوئے۔ کب کتنے

نکلے۔“ عذرا بیگم کسی دپٹے کی تہ لگا رہی تھیں۔

”ہمارا شر بیچتا ہے ناپیرا اسے؟“

”بھیجتا ہو گا پیسہ۔ تو خرچا چلا پاتی ہے۔ بچے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں باپ کے دم سے

ہی ہوتا ہے یہ سب کچھ۔“

”اللہ اس بچے کو سلامت رکھے۔ اس کی بے وقوفیاں بڑداشت کرنے کا حوصلہ دے۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”آمین۔“ عذرا بیگم مسکرا دی تھیں۔

رافع نے کمرے میں آکر کمپیوٹر آن کیا تھا۔

”تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟“ ایقان نے ایک نظریہ لے ہوئے فریخ پر رڈالی۔

انہوں نے اچانک ہی اٹھنے کی کوشش کی۔

”مجھے بس گھر لے چلو۔ میں اچھی ہو جاؤں گی۔“

”پلیز ای جی۔۔۔“ شہلا نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں لٹا دیا۔ ”ہم ضرور گھر چلیں گے۔ بس چند ایک ضروری

ٹیسٹ ہیں جن کے لیے آپ کو ایڈمٹ کیا ہے۔ ٹیسٹ ہو جائیں تو ہم چلتے ہیں۔ تب تک صبر کر لیں۔“

وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئیں۔

”مجھے خبر ہے۔ آپ کو مارکیٹ جانے کی جلدی ہے۔“ ربیعہ نے ماحول کو شکستہ کرنا چاہا۔ ”بے فکر رہیں۔ وہ

پروگرام بالکل میٹ ہے۔ ہم گھر جاتے ہی مارکیٹ چلیں گے۔“

”گھر جانے کی ضرورت کیا۔“ عباد بولا۔ ”رستے میں ہی اتر جانا۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے سر ہلایا۔

سب مسکراتے لگے تھے۔

”آپ لوگ میری نانہ کو تنگ نہ کریں۔ دفعہاً“ عمر بدترانہ انداز میں بولا۔ ”وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں اور

آپ لوگ انہیں ایسی باتوں سے تنگ کر رہے ہیں۔ وہ بیمار ہیں وہ نہیں جائیں گی مارکیٹ۔“

سارے ہنس دیے تھے۔ منہ زور بیگم بھی سب کچھ بھول بھال مسکرا دیں۔

”مکسلاام علیکم۔“ وہ سنجیدہ سنجیدہ سی اندر داخل ہوئی تھی۔

شفیقہ حیات اور عذرا بیگم چونک اٹھیں۔

”و علیکم السلام۔“ دونوں ہی قدرے پر جوش انداز میں بولی۔

عذرا بیگم نے اٹھ کر اس سے محبت سے معاف کیا۔ وہ ان کے بل کمرہ کی جانب آئی۔ بچی انہوں نے اس

کی پیشانی چومی۔

”شکر ہے تیری صورت نظر آئی۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”ایقان! تو ماں کو بھی بھول گئی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں!“ وہ تھکے تھکے انداز میں ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ”آپ تو میرے خون میں گھلی ہوئی

ہیں۔“

”پھر تو یقیناً شوگر ہوگی آپ کو۔“ اندر آتا ہوا رافع شرارت سے ہنسا تھا۔ ”اتنی سوچیں سوچیں سی رادی جان

جس کے خون میں گھل جائیں۔ کیوں رادی! دادا ابو کو شوگر کبھی؟“

”کیا الناسد حا بول رہے ہو؟ عذرا بیگم خفا ہوئیں۔ ”بیاریوں کو مذاق میں بھی یاد نہیں کرتے۔“

”آپ سنائیں پیچھو کیا حال چال ہیں؟“ وہ ایقان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”خفنگوں کو کچھ افاقہ ہے یا اب بھی

سارے جہاں سے نالاں ہیں۔“

”اتنے شوخ ہو رہے ہو۔“ ایقان نے اسے گھر کا۔ ”خیریت؟ بھابی بیگم۔ کہیں اس کی ڈیٹ بھی تو فکس نہیں

ہو گئی ٹانہ کے ساتھ ہی؟“

”تم اسے سمجھاؤ۔“ شفیقہ حیات بولیں۔ ”شاید تمہاری ہی سن لے۔“

”پہلے تو سب مل کر پیچھو کو سمجھائیں۔“ رافع نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ کسی کی سنیں گی؟“

ایقان قدرے جزبزی ہوئی۔

”مجھے تم سے ایک کام تھا رافع!“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میں اسی لیے آئی تھی۔“

”زبردست اندازہ نہیں ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ نیٹ کنکٹ کرتے ہوئے شوخی سے مسکرایا۔

”ہاں ہو رہا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنس دی۔ ”تب ہی پوچھ رہی ہوں۔“

رافع نے اب اس کی اکاؤنٹ انفرمیشن کھولی تھی۔ ایقان بھی قدرے جھک کر دیکھنے لگی۔

پھر ایک دو نوٹوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”اتنے پیسے؟“ رافع نے حیران نظروں سے ایقان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچیس لاکھ روپیہ پچھلے ماہ جمع کروایا

کیا ہے۔“

”عاشق نے اتنے پیسے۔“ ایقان متحیر و پریشان تھی۔

”کوئی فون آیا تھا ان کا؟“ رافع نے پوچھا۔

”نہیں۔ اور میں اسی لیے اکاؤنٹ چیک کرنا چاہتی تھی میں سمجھ رہی تھی کہ عاشق نے روپے بھی نہیں

بھجوائے ہوں گے لیکن اس نے تو۔“

”کہاں چلے گئے ہیں وہ؟“ رافع متفکر سا برہنہ پایا۔ ”اتنا روپیہ انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ میں اسی لیے ڈلوایا ہوگا

تاکہ بعد میں آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔“

”بعد میں؟“ ایقان جیسے خوف زدہ ہوئی تھی۔ ”کیا مطلب بعد میں؟“

رافع چونکا پھر ہلکے سے مسکرا کر اس نے کرسی گھمائی۔

”میرا مطلب ہے جب تک وہ پاکستان نہیں آجاتے تب تک آپ کو یہاں کوئی مشغلہ نہ ہو۔“

”پاکستان؟“ اس نے کھولی کھولی نظروں سے رافع کا چہرہ دیکھا۔ ”وہ۔۔۔ یہاں کیوں آئے گا رافع! مجھے سچ بتاؤ۔“

کیا اتنے سارے روپے بھجنے سے اس کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت وہ ہم لوگوں سے کوئی سلسلہ کوئی رابطہ نہیں رکھنا

چاہتا ہے؟ اپنے بچوں کے اسی لیے؟

رافع نے نظرس چرائیں پھر وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں پھپھو! ان سے کوئی رابطہ ممکن ہو تب ہی صحیح صورت حال کا علم ہو سکتا ہے۔ میں نے

امریکہ میں مقیم اپنے ایک دوست کو ان کا پتہ بھیجا ہے۔ وہ معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع کرے گا۔ ان سے

ایک مرتبہ تفصیلی بات کرنا بہت ضروری ہے تب ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔“

ضروری ٹیسٹوں کے بعد منیوزہ بیگم گھر آگئی تھیں۔ رپورٹس چند ایک دن میں ملنا تھیں۔ ہاشم ان کی خیریت

لے کر اٹھا تھا۔ عباد سے مصافحہ کر کے وہ باہر کی جانب بڑھا۔

یکن کے دروازے پر کھڑی شہلا نے حیرت سے جاتے ہوئے ہاشم کی پشت دیکھی تھی۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ

ہاشم اسے الوداع کہے بنا ہی چلا جائے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئی۔ تب تک وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر چکا

تھا۔

”ہاشم! شہلا نے اسے پکارا۔“

وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ چند قدم اوپر کھڑی شہلا کو اس نے نجانے کن نظروں سے دیکھا تھا شہلا کو عجیب سے

احساس نے گھیرا۔

”آپ۔۔۔ جارہے ہیں۔۔۔؟“ اس نے بے معنی سوال کیا۔

”شاید نہ۔“ وہ شے جارہی سے بولا۔

ماہنامہ شعاع 272 اگست 2007

میں کھا ہی لیتی ہوں لیکن پھر مارکیٹ چلتے ہیں۔ اس دن بھی نہیں جاسکے تھے۔
ربیعہ کو بہت زور سے ہنسی آئی تھی۔

”یا اللہ۔ امی جی۔۔۔ آخر ایسی کون سی اہم شاپنگ کرنا چاہتی ہیں آپ۔ کچھ دن آرام کر لیں، مارکیٹ کون سا کہیں بھاگی جا رہی ہے۔“

”یہ کچھڑی میں اسی شرط پر کھاؤں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولیں۔

ربیعہ نے دلچسپی سے انہیں دیکھا اور پھر ہنس دی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ اگر عباد بھائی پر تیش دے دیتے ہیں تو پھر چلے چلیں گے۔“

”ہمیں عباد کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں ماں ہوں اس کی۔ وہ میری ماں نہیں ہے۔“

ربیعہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔

”آپ اسپتال میں رہ کر بہت بزدلہ سنج ہو گئی ہیں۔“

”وہ ہم ہو گئی ہو، میں تو بہت چڑچڑی ہو کر آئی ہوں۔ یہ تمہارا حوصلہ ہے کہ مجھے برداشت کر رہی ہو۔“

ربیعہ ان کے قریب بیٹھ گئی اور اپنا سر ان کے شانے سے ٹکا دیا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ساری عمر آپ کے ساتھ گزار دوں۔ آپ نے مجھے کیا دیا ہے۔ میں لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میرے اندر ایک پتھر چھپی ہے جسے آپ کی محبت نے میرا ب کیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں امی جی۔“

منیزہ بیگم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”اب اسے صرف تمہارے اندر نہیں تھی ربیعہ! اب اسے تو میرے اندر بھی تھی۔ اسے تم نے بچھایا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے ہی وجود کا اکٹھا گشتہ ہو گیا ہو۔ تم نے ان باتوں نے ربیعہ کا چہرہ تھام کر غور سے دیکھا۔ ”بارہا پوچھا تم

اسی لمحے عباد اندر داخل ہوا۔

”امی جی۔۔۔ امیر حسن آئے ہیں۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں سن کر عیادت کے لیے آئے ہیں۔ ویسے بابی

واوے۔ یہاں کون سا جذباتی سین چل رہا ہے۔“

اس نے ربیعہ اور انہیں یوں سا جھٹکا تھا کہ ہنسنے لگیں۔

”اس سے تمہیں کیا۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”یہ ہم ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔ امیر حسن سے ہمارا کوئی پردہ تو

نہیں ہے۔“

”میں کچن میں جاتی ہوں۔“ ربیعہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے وغیرہ تیار کر لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ عباد نے سر ہلایا۔ ”میں امیر کو پیس لے آتا ہوں۔ ڈرائنگ روم تو زرا تکلف ہے۔“

ربیعہ کچن میں چلی آئی پھر وہ دفعیاً ”چونکی تھی۔ ڈرائنگ ٹیبل کی کرسی پر شہلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اسی اور فکر کی انتہائی گہری لکیر تھی۔ ربیعہ اس کے قریب چلی آئی۔

”شہلا آئی۔۔۔“

”آں۔“ شہلا جیسے نیند سے جاگی۔ ”ربیعہ۔۔۔ کہو؟“

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ ”بس یونہی۔۔۔ یہاں بیٹھ گئی تھی۔“

”آپ کچھ پریشان لگتی ہیں۔“ ربیعہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”خیریت ہے نا؟“

”تمہاری بہن بہت بدل گئی ہے ماہین!“ نوین نے تبصرہ کیا۔

”اچھا۔“ ماہین پھینکی سی ہنسی ہنس دی۔ ”ہاں، یہ کچھ سنجیدہ مزاج ہو گئی ہے۔“ وہ ان دونوں کو چائے دینے لگی۔

”وہ جو تمہاری کزن ہے، کیا نام ہے اس کا؟“ نوین سوچتے ہوئے بولی۔ ”ناعمہ! وہ کیسی ہے؟ اس کی منگنی تو بہت اچھی جگہ ہوئی ہے۔“

عریشہ نے نگاہ اٹھائی اس کے لب بھینچ گئے۔

”ہاں، وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔“ ماہین نے تائید کی۔

”پسند کی شادی ہو رہی ہے؟“ انہیں تجسس لاحق تھا۔

”شاید۔۔۔ ہمیں تفصیل نہیں دیتا۔“

”کزنز میں بھی پردے ہوتے ہیں کیا؟ وہ بھی ہم عمر کزنز میں؟ عریشہ کی تو دوست ہے ناعمہ! اسے تو خبر ہوگی؟“

”تمہیں کیا دلچسپی۔۔۔ اس قصے سے؟“ ماہین نے جیسے برا مان کر طیبہ کو دیکھا۔

”میں جانتی ہوں تا فریحہ کو اس لیے تجسس ہے۔ برا مت ماننا لیکن وہ تو بہت ہائی فائی قسم کی فیملی ہے۔ وہ لوگ

یہاں رشتہ لینے آئے تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی کہانی ہوگی۔“

”ہونے دو۔“ ماہین عریشہ کی صورت دیکھ کر بیزار ہو رہی تھی۔ ”تم لوگ چائے پو۔ یہ بتاؤ عریشہ کے کپڑے اور جیولری کیسی لگی گی؟“

”زبردست۔ بہت اچھی ہیں ساری چیزیں۔“ طیبہ نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”بڑی کیسی بنائی ہے تمہاری چچی

نے؟“

”پتا نہیں۔ جب دیکھیں گے تو پتہ چلے گا۔“

”اے نہیں کہنا، بڑی ایسی ہو کہ فراز والوں کی بری کے سامنے پھینکی نہ لگے۔ ویسے ان کا مقابلہ مشکل نہیں، ناممکن

ہے پھر بھی۔“

”خدا کے لیے نوین۔“ ماہین نے اسے جھٹک دیا۔ ”یہ مقابلہ بازی ہمارے ذہنوں میں نہیں ہے۔ ایسی باتیں

نہ ہی کرو تو اچھا ہے اور یہاں نہ ہیں، تین شادیاں ہیں۔ ثانیہ کی بری بھی آئی ہے۔ مقابلہ کس کس سے کیا جاسکتا

ہے۔ یوں بھی عریشہ، ناعمہ، ثانیہ، بہنیں ہی ہیں۔ بہنیں مقابلہ بازی نہیں کرتیں۔“

نوین اور طیبہ، ماہین کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر خاموش ہی ہو گئیں۔ چائے پی کر ان دونوں نے رخصت چاہی تھی۔

عریشہ دنیا دانیہا سے گم اپنی جگہ بیٹھی سوچے چلی جا رہی تھی۔

”ارے بھئی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ تم لوگوں نے کیا ولیہ اور کچھڑی کھانا شروع کر دیا ہے مجھے۔“ منیزہ بیگم

کچھڑی کی پلیٹ دیکھ کر بولی تھیں۔

ربیعہ ہنس دی۔

”ہم نے مانا کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہفتہ بھر کی صفائی منائی جا رہی ہے پیٹ کی۔ لہذا ولیہ اور

کچھڑی ہی کھانا ہوں گے۔“

”یہ پٹیاں تمہیں شہلا اور انیقا پر دھا رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“ وہ روہانے انداز میں بولیں۔ ”خیریت۔ یہ تو

”ارے سب خیریت ہے۔“ اس نے بشارت سے مسکراتے کی کوشش کی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں دراصل ہاشم کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ کل میں نے کہا تھا کہ مجھے بھی لے جائیے گا۔ شاید بھول گئے۔ آج۔ آج بتا رہیں۔“

وہ متذبذب سی ہو کر خاموش ہو گئی۔
 ”اوہ۔“ ربیعہ شوخی سے مسکرائی۔ ”تو یوں کہتے میاں جی یاد آ رہے ہیں اور بے فکر رہیے۔ وہ زمانے کو بھول سکتے ہیں لیکن آپ کو نہیں۔“
 ”آجھا۔“ شہلا نے جیسے بھل کر اسے دیکھا تھا۔ ”یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟“
 ”کتنی دقتوں سے تو آپ کو حاصل کیا ہے انہوں نے۔ بھلا بھول سکتے ہیں وہ۔“ ربیعہ کو اذیت پہنچ رہی تھی۔

شہلا جیسے اس کی کم عقلی پر تاسف سے مسکرائی۔
 ”بھولنا اسے مشکل ہوتا ہے ربیعہ! جولا حاصل ہو۔ حاصل کو بھلانا نہیں یاد رکھنا مشکل ہے۔“ ربیعہ نے جلدی کی۔
 ”اس کی بات پر غور کیا پھر نہیں پڑی۔“
 ”آپ ہاشم بھائی کی محبت پر بھی شک کر سکتی ہیں ایسا؟ بہت بری بات ہے۔ ہم شک تو آپ پر رشک کر سکتے ہیں کہ اتنا محبت کرنے والا جیون سا بھی ملا آپ کو۔“
 شہلا نے گہری سانس بھری۔

”زیادہ محبت بھی ایک مشکل ہے ربیعہ! پر تم نہیں سمجھو گی۔ میں تو دراصل سوچ رہی تھی کہ ماہین آئی ہوئی ہے کیا سوچے گی وہ۔ ایک نئی بھابی ہے وہ بھی اسے میکے بھاگ گئی۔“
 ”تو فون کر لیں ہاشم بھائی کو وہ آفس سے انہیں گے تو آپ کو بھی ریلے خانہ میں گئے۔“
 دفعہ ”ربیعہ کو بچن میں اپنی آمد کا مقصد یاد آیا تو وہ چائے بنانے لگی۔“
 شہلا کچھ سوچتے ہوئے بچن سے باہر نکلی تھی۔

چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ٹرائی سجا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو منیوزہ بیگم کے ساتھ گفتگو میں مصروف امیر حسن اسے دیکھ کر بے ساختہ ہی کھڑا ہوا تھا۔
 ”سلام علیکم۔“ ربیعہ نے شگفتگی سے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ ”تشریف رکھیے نا۔“
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیسی ہیں مس ربیعہ آپ۔ اور۔۔۔ یہ اتنا کچھ آپ اسی کے لیے آئی ہیں۔ امیں پر ہیز کرائیں بھی۔“

ربیعہ دھیرے سے ہنس دی سوہ یقیناً دل چسپ شخصیت تھا۔
 ”یہ ”منا کچھ“ نہیں ہے۔“ وہ منیوزہ بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ہنسی سے بولی۔ ”اور یہ امی کے لیے نہیں آپ کے لیے ہے اور آپ بالکل بھی تکلف نہیں کریں گے۔“
 ”چلیں جناب ٹھیک ہے۔ سزا ہے تو سزا ہی سہی۔“

”اس سزا میں میں بھی برابر کا شریک ہوں۔“ عبادت حشر بولا تو سب ہنس دیے۔ ربیعہ چائے بنانے لگی۔
 ”چینی؟“ اس نے اچانک نگاہ اٹھا کر امیر حسن سے پوچھا۔
 اور تب جیسے امیر حسن کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ اسے بے حد جذب اور لگن سے دیکھ رہا تھا۔ شوق، جستجو اور

دلچسپی سے بھرپور وہ نظریے اختیار جھک گئی۔ وہ اپنی چوری پکڑ لیے جانے پر شرمندہ تھا۔
 ”چینی۔“ ربیعہ کو احساس ہوا کہ اس کی آواز گانہ پی گئی۔

”آپ کی مرضی۔“ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے قدرے اعتماد سے بولا۔
 ”آدھا کپ ڈال دو۔“ عبادت نے رس ملائی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نکل اگیا تھا۔
 ربیعہ بھی دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے چائے بنا کر اس کے ساتھ بڑی کارنر ٹیبل پر رکھ دی۔
 ”یار امیر! یہ رس ملائی لو نا۔ یہ اپنی ربیعہ آج کل اچھی بھلی شیفت بنی ہوئی ہے۔ روز کوئی نہ کوئی نئی چیز ہم پر آزماتی ہے لیکن آج کی ڈش واقعی اچھی ہے۔ ٹرائی کرنا۔“
 امیر حسن بھی ٹرائی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ ربیعہ چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔



رات کا آخری پہر تھا۔ عریشہ نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور برابر میں سوئی ہوئی ماہین کو دیکھا۔
 ”خوش نصیب ہو آپ! اس نے دل میں اٹھتی ہوئی ہوک کو دبا کر سوچا۔“ ”نیند سے لطف اندوز ہونا قسمت والوں کا کام ہے۔ ہم سے حرام تعجب تو دن کو رات اور رات کو دن کرنے کے چکر میں ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔“
 آج پھر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج پھر وہ رتہ کر لیس سی اٹھتی بھی دل میں۔ ماہین کی مندریں پھر دل کے دکتے ہوئے تاروں کو چھیڑ گئی تھیں۔

فرانس۔ فرانز۔ فرانز۔ یہ نام اس کے لیے جیسے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنے خال پر صبر کرنا چاہتی تھی کسی بے بسی کے لبوں سے اس نام کا گورن کر رداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی تھیں۔
 ”ماہین! اسی وقت اس سب سے بے بسی کے لبوں سے اس نام کا گورن کر رداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی تھیں۔“
 ”اس سب سے بے بسی کے لبوں سے اس نام کا گورن کر رداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی تھیں۔“

اسے اپنا جواب ابھی تک یاد تھا۔ وہ اپنی بات پر قائل تھی سچ کہا تھا اس نے اور اب ہر گزرتا دن اسے کہتا تھا کہ ابھی وقت ہے۔ ابھی وقت ہے۔ وہ ابھی کسی کاغذ بننا اور تو کسی کی بن کر بھی نہ بنی۔ بن بھی نہیں سکتی۔ یہ بے کار کا زبردستی کا ناٹھ کبھی کسی کو خوش نہیں دے سکتا۔
 ”وہ تعجب ہو جھن جاتے تو اس کو توڑنا آچھا۔“ دل نے سفاکی سے کہا۔
 وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی پھر اس نے ماہین کو دیکھا۔

یہ ناعمل۔ یہ کیسے پہنچی اس تک۔ وہ میرا تھا۔ میرا ہے۔ میں اس کی بھی میں اس کی ہوں۔“
 وہ بیڈ سے اتر آئی پھر کسی ردوٹ کی مانند چلتی ہوئی لاؤنج میں آگئی۔
 ”کسی کا ڈر نہیں ہے مجھے ہر خوف سے آزاد ہو چلا ہے یہ دل۔ بس ایک ہی لگن ہے وہ میرا نہیں بن سکتا تو ناعمل بھی اسے نہ پاسکے۔ ناعمل نے اسے عریشہ بن کر بھانسا ہے میں اسے بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔“

وہ صوفے پر بیٹھی اور برابر میں رکھا فون سیٹ اٹھا لیا۔ فراز کا سیل نمبر اب تک یادداشت میں اسی آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔

بانی امت مسلمہ ﷺ

ہنستارہا۔

”او گاؤ۔“ پھر وہ بولا۔ ”آپ کی معصوم کم عمر شخصیت بندے کو احساس نہیں ہونے دیتی کہ آپ اتنی برجستہ اور ذہین ہیں۔ ویسے جناب سفید فاموں کو ہم نے کبھی اتنا حاوی ہی نہیں کیا خود پر کہ ہم بھول جائیں کہ ہماری جڑیں دلی میں بھی ہیں۔“

ربیعہ اس کی بات کے پہلے جیلے پر کچھ محتاط سی ہوئی تھی۔

”ارو تو ہمیں خاص طور پر پرہیزگاری تھی تاکہ ہم اپنی تہذیب سے دور نہ ہو جائیں۔ شہر یار سے مل کر بھی آپ کو یہی احساس ہو گا۔ انگریزی ہم بولتے ضرور ہیں لیکن اردو بولنے پر آپ کو سننے والے سنتے ہیں اور کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے بڑی شائستہ شائستہ باتیں کریں جیسے اس وقت دل چاہ رہا ہے۔“

وہ بہت موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔ عموماً ”اتنی بے تکلفی سے اتنی زیادہ باتیں نہ کرتا نہیں تھا۔

ربیعہ ہولے سے کھنکھاری۔ اس نے ہتھیلی پر رکھی کباب کی ٹکیہ کو دیکھا جسے وہ گولائی میں تراش کر اس فرائنگ بین میں رکھنا ہی چاہتی تھی جب تیل کی آواز پر اسے کچن سے نکلنا پڑا تھا۔

”کوئی کام تھا۔ آپ کھینچیں۔“ اس نے امیر حسن کو یاد دلانا چاہا اور نہ وہ تو بہت فراغت سے معلوم ہوتا تھا۔

”آں۔“ وہ چونکا۔ ”نہیں۔“ اس نے کورس۔ ”غائب۔“ عباد سے بات کرنا ویسے۔ ”وہ پھر معمول کے انداز پر آگیا۔

”عباد بھائی تو گھر پر نہیں ہیں آپ نے ان کا سیل نمبر ڈالی نہیں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”تو کچھ سنا۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اپنے عباد سے بات کرنا ہو تو پہلے گھر کا نمبر ہی ڈالی کرتا ہوں۔“ وہ جیسے شرارت سے مسکرایا۔ ربیعہ پھر محتاط ہوئی تھی۔ امیر حسن کے انداز پر اسے تبدیل شدہ تھے۔

”میں ذرا بڑی تھی کچن میں۔“ اس نے جیسے معذرت اور خفت چاہی تھی۔

”بڑی تو میں بھی تھا جناب اپنے آس میں پھر تو میں نے وقت نکال کر نجانے کیوں۔ مصروفیت کے لمحات سے کبھی کبھی چوری کرنے کا جی چاہتا ہے۔“ وہ جیسے جیسے جرات سے دیکھ رہی تھی۔

یکدم باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ربیعہ چونک اٹھی۔

”میرا خیال ہے عباد بھائی آگئے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”آپ ہولڈ کریں گے؟“

”نہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”اس اوسکے خدا حافظ۔“

”آں۔“ ربیعہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ فون بند کر چکا تھا۔ ربیعہ نے قدرے حیرانی سے ریسیور کو دیکھا پھر فون بند کر دیا۔ اسی لمحے لاؤنچ کا دروازہ کھول کر عباد اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جسے اس نے صوفے پر رکھ دیا اور خود کچن میں چلا گیا۔ ربیعہ اس کے پیچھے گئی۔

”امیر حسن صاحب کا فون تھا آپ کے لیے۔“ اس نے کباب فرائنگ بین میں رکھا اور آؤنج تیز کی۔

عباد کو لڑ سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ لحد بھر کر کا۔

”امیر حسن سے تو میری ابھی بات ہوئی ہے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ قبل۔ میں رستے میں ہی تھا۔“

ربیعہ سٹٹائی گئی اسے یہ تو مع نہ تھی۔

”پتا نہیں۔ شاید انہیں کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔ آپ پوچھ لیجئے گا۔“

”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

رات کے گھرے سنانے میں ٹیلی فون سیٹ گود میں دھرے وہ اپنے اندر اترے ہوئے بناٹوں کو سننے میں محو تھی۔ ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا جو ذہن کے پردے پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جلنے، گڑھنے، سوچنے اور پھر کر گزرنے میں فرق تھا۔ اس کی ایک فون کال محض ایک فون کال نہ تھی۔ یہاں یہ ایک سوڈ تھا جس سے آگے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اندھا کنواں گھری کھائی خوشیوں سے بھری رہ گزری۔ جو کچھ بھی تھا اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہ تھا۔

وہ اندھیرے میں بیٹھی لب کاٹتی رہی۔ کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ اسے فون کر لے۔ اسے فون نہ کرے اسے حقیقت بتا دے۔ اسے لاعلم ہی رہنے دے۔ زندگی کو نیا موڑ دینے کی کوشش کرنے یا پھر جو کچھ بھی ہے اسے اندر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لے۔ اس نے اپنے اندر آوازوں کو ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ آوازیں ہی آوازیں۔ شور ہی شور۔ اس کے باپ کی آواز۔ اس کے سر پر ٹھہرا وہ بھاری ہاتھ۔ اس کی ماں کی آواز۔ اس کا رونا۔ تسکنا۔ رابعہ بیگم کی آواز۔ نافع کی آواز۔ اس کے بھائیوں کی آوازیں۔ ناعمہ کی آواز۔ ناعمہ کی آواز۔ ناعمہ کے قہقہے اور پھر یہ آہستہ آہستہ ساری آوازیں اس ایک آواز میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔ ناعمہ کے بلند آہنگ قہقہوں نے اس کی ہستی کو پر خچوں میں بانٹنے کی کوشش کی۔

سر پریش نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کے وجود کے مہیب سمندر میں دل کسی بے آسرا کشتی کی مانند ڈول رہا تھا۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ براہ مہربانی کچھ دیر بعد کوشش کیجئے۔ شکریہ۔“ شائستہ آواز میں ریکارڈ شدہ پیغام سنتے ہی اس کی بہت دیر سے رکی سانس آواز ہوتی تھی۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، فراز کا سیل آف تھا۔ یقیناً وہ صبح تک آف ہی رہنا تھا۔ عربیہ کو احساس ہوا کہ وہ صرف بلکہ خود قسمت کی آواز ہے۔ مصروف جنگ تھی۔ بے حد مایوسی کے عالم میں اس نے ریسیور پر بات آگئی تھی۔ ”کریڈل پر رکھ دیا۔“ اس وقت جس عالم جنون میں وہ یہ حرکت کر گزری تھی بچانے پھر کبھی اس پر طاری بھی ہونا تھا یا نہیں۔ وہ وہیں بیٹھی لب کاٹتی رہی۔

”نہیں۔“ پھر اس نے سوچا۔ ”آج نہیں تو پھر سہی۔“ میں اپنی آخری سانس تک یہ کوشش کروں گی۔ یہ وقتی جنون نہیں ہے ایک آتش نشان ہے جو نیند سے جاگے۔ اسے ہنسا ہی ہو گا۔

شیشوں سے باہر۔ بیگلی ہوئی رات۔ مدھم مدھم جلنے لگی تھی۔

تیل کی آواز پر وہ کچن سے نکلی تھی۔ ایک ہاتھ پر کباب کی ٹکیہ رکھے دوسرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آتے بال ہناتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔“ نہایت مصروفیت کے عالم میں اس نے کہا تھا۔

”تسلیمات۔“ شائستہ انداز میں کہا گیا۔

ربیعہ کو آواز پہچاننے میں لمحہ بھر لگا۔

”وہ امیر حسن صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟“

”بجیریت ہیں جناب۔“ وہ بشارت سے انداز میں بولا۔ ”آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔“

ربیعہ ہنس دی۔ ”لگتا نہیں آپ سفید فاموں کے ملک سے آئے ہیں۔ آپ تو دلی کے لگتے ہیں۔“

امیر حسن نے اس کی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ربیعہ کی بات اسے دلچسپ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر

ربیعہ نے بغور اسے دیکھا وہ کچھ پریشان سا لگتا تھا۔

”آپ کے لیے کھانا لگا دوں عباد بھائی؟ ناشتہ بھی بہت لائٹ سا کیا تھا آپ نے۔“

”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”نہیں ربیعہ! بھوک نہیں ہے۔“

”میں نے مٹر چاول اور چکن کباب بنائے ہیں۔ آپ کافیورٹ کبھی میٹن۔ ساتھ لوکی کا راستہ بھی ہے۔“

”میں۔۔۔ کچھ دیر لیٹوں گا ربیعہ۔“ اس نے جیسے معذرت کی۔

”آپ۔۔۔ ٹھیک تو ہیں؟“ ربیعہ کو وہ بہت تھکا ہوا مست سا معلوم ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”یہ کہاں ہیں؟“

”سو رہی ہیں۔ بس اب اٹھتی ہی ہوں گی۔ آج میں ضرور انہیں مارکیٹ لے جاؤں گی۔ کب سے ضد کر رہی

ہیں ٹھیک ہے نا عباد بھائی؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ بچھے بچھے سے انداز میں بولا۔ ”لیکن رات کو ان کے چند ایک ٹیسٹ اور ہوں گے۔ میں

انہیں اسپتال لے کر جاؤں گا۔ ان کی پچھلی رپورٹس کچھ اتنی ٹھیک نہیں آئیں۔ چند ایک ٹیسٹ کروا دیتے ہوں

گے۔“

”اللہ خیر کرے۔“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں کچھ دیر سوؤں گا۔“ عباد نے ایک گہری سانس بھری۔ ”تم لوگ تیار ہو جاؤ تو مجھے جگنا دنا۔ میں چھوڑ آؤں

گا۔“

”آپ ریسٹ کریں۔ ہم تو ٹیکسی میں بھی چلے جائیں گے۔“

عباد شکر سے انداز میں چکن سے نکل گیا تھا۔ ربیعہ بھی پر سوچ انداز میں کھڑی رہی۔

”آپ تیار ہیں امی؟“ سب کاموں سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کر کے اس نے ان کے کمرے میں جھانکا۔

مینزہ بیگم چونک اٹھیں۔

”ہاں ربیعہ! میں تو تیار ہوں۔ ذرا یہاں آؤ۔“ ربیعہ کمرے میں چلی آئی۔

مینزہ بیگم ایک چھوٹی صدو بیگی کھول کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ربیعہ ان کے قریب بیٹھتے بیٹھتے اچانک چونک سی

گئی۔ صدو بیگی میں سونے کے زیورات بھرے ہوئے تھے۔

”یہ دیکھو ربیعہ۔“ انہوں نے صدو بیگی اس کے آگے کی۔ ”یہ زیورات شہلا کے والد نے میرے جواہرے

کے تھے۔ اس میں ان کے کئی خاندانی زیورات ہیں اور یہ۔ یہ سونا میرا حق مر ہے۔“

انہوں نے چند چھوٹی چھوٹی نکلیاں اسے دکھائیں۔

”یہ تو۔۔۔ لاکھوں کا زیور ہے امی!“ ربیعہ حیران تھی۔

”ہاں۔۔۔ قریباً“ پچاس لاکھ مالیت ہوگی اس کی۔ میں اسی لیے مارکیٹ جانا چاہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے سارے پاس

جانا ہے۔ یہ تین نکلیاں میں نے تمہارے نام کی رکھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں میں اپنی اور تمہاری مشترکہ پسند سے

تمہاری شادی کا زیور بنواؤں۔ رہے یہ خاندانی زیورات۔ تو ان پر شہلا، انیقہ اور عباد کا حق ہے۔ یہ ان کی دادی

پر دادی کے زیورات ہیں۔ جو سونا میرا ہے وہ میں نے سارے کا سارا تمہارے نام کر دیا ہے۔“

ربیعہ سے کچھ بھی بولا نہ جاسکا۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھتی رہی۔

”اتنا زیور ٹیکسی میں لے جانا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ تم عباد کو جگاؤ۔ اس سے کہو ہمیں صرف مارکیٹ تک

چھوڑ آئے۔ رہی کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ تو وہ ہم خود چلے جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”لیکن امی جی!“ وہ بھٹکتی ہوئی۔ ”جیسے سونا آپ کا ہے اس پر بھی میرا نہیں شہلا آپنی اور انیقہ کا حق ہے۔

بخدا مجھے محبتوں سے اتنا زیر بار نہ کیجئے۔ میں کیسے اتنا بوجھ اٹھاؤں۔۔۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ مینزہ بیگم نے چند لمحے

اسے تنگنی باندھ کر دیکھا۔

”ربیعہ۔۔۔ پھر وہ جسے سرگوشی میں بولی تھیں۔“ مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ تم کسی اور کو کھ سے پیدا ہوئی ہو۔ میری

مسا کو تمہاری صورت دیکھ کر کیوں قرار آتا ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتی۔ تم مجھ سے ایسی پرانی باتیں مت کرو۔ جو

جس کا حق ہے وہ اسے ہی ملنا چاہیے۔ میں شہلا اور انیقہ کا حق تمہیں نہیں دے رہی۔ اپنا حصہ دے رہی ہوں

کیونکہ میرے دل نے تمہیں ہی مانا ہے۔“

ربیعہ کو جانے کیا ہوا تھا وہ ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔

”ربیعہ۔۔۔“ وہ دھیرے دھیرے اس کے بال سہلانے لگیں۔ ”جب ہم لوٹیں گے تب مجھے اپنے بارے میں

سب کچھ بتا دنا۔ میں نے بہت انتظار کیا کہ شاید تم خود سے کچھ کہو۔ اپنا بوجھ بانٹنا چاہو۔ دل ہلکا کرنا چاہو لیکن شاید

تمہیں ہم پر۔“

ربیعہ نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اس کی آنکھیں موتی بہا رہی تھیں۔

”عباد بھائی نے ہی مجھے منع کر دیا تھا امی! صرف ان کی زبان کا بھرم رکھنے کے لیے میں نے بھی آپ سے کچھ کہا

نہیں ورنہ کتنی راتیں صرف اس سوچ میں مبتلا رہ کر گزار رہی میں نے کہ میں آپ سے جھوٹ بول کر اس چھبب

کے نیچے موجود ہوں۔“

”میں نے تمہیں تنگ کیا ہوں امی! اب یہی خالصتہ رہی۔“ انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔ ”لیکن اب سوچتی ہوں کہ

جانے انکئی سالوں اور مقدار میں لگتی ہیں۔ تمہارے اور انیقہ کے فرض سے جلد از جلد سکدوش ہو جاؤں تو

بتر۔“

ربیعہ کو عباد کی بات یاد آئیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مضطرب سی ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔

”میں آپ کو چھوڑ کر کبھی بھی کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔“ وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ انیقہ اور عباد

بھائی کی شادی کی تیاریاں کریں مجھے شادی وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔“

مینزہ بیگم محبت سے مسکرائیں۔

”تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”آپ نے کہاں جانا ہے؟“ ربیعہ ان کے سارے لہجے میں کسی گئی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھی۔

”جہاں ایک دن سب نے جانا ہوتا ہے جہاں جانے سے پہلے ما میں اپنی اولاد کے فرض سے سکدوش ہو جانے

کی اپنی سی کوشش تو ضرور کرتی ہیں۔ آگے ان کی قسمت۔“

”ایسی باتیں نہ کیا کریں امی جی!“ ربیعہ دل گرفتہ ہو گئی۔ ”آپ کو کوئی خوشی ملتی ہے مجھے یوں دکھی کر کے؟“

مینزہ بیگم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جوم لیے۔ ربیعہ نے محبت سے انہیں دیکھا۔

”آپ اکثر میرے ہاتھ جو متی ہیں۔ میں نے بھی آپ کو شہلا آپنی یا انیقہ کے ہاتھ جو متے نہیں دیکھا۔“

”تمہارے ہاتھ دیکھ کر مجھے کچھ یاد آتا ہے اس لیے۔“

”کیا۔“ ربیعہ محبت سے ان کے سلونے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھنے لگی۔

”امی جی۔۔۔“ عباد اندر آیا۔ ”میں کچھ زیادہ ہی سولیا شاید آپ لوگوں کو دیر تو نہیں ہو گئی؟“

وہ دونوں چونک اٹھیں۔

”نہیں دیر نہیں ہوئی ابھی۔“ منیوہ بیگم معنی خیزی سے مسکرائیں۔ ”بچلو، چلیں۔“



ربیعہ کے بہتیرا منع کرنے کے باوجود منیوہ بیگم نے وہی کیا جو انہوں نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنے حصے کا سارا سونا ربیعہ کے زیورات تیار کرنے کے لیے جیولر کے حوالے کر دیا تھا۔

”تم مجھ سے بار بار مذاق میں پوچھتی تھیں کہ میں مارکیٹ آنے کے لیے اتنی بے چین کیوں تھی۔“ انہوں نے ربیعہ سے کہا۔ ”تو یہی وجہ تھی۔ میں یہ کام نمٹانے کے لیے از حد بے چین تھی۔ آج میں مطمئن ہوئی ہوں۔“ وہ دونوں جیولری شاپ سے نکل رہی تھیں۔ ربیعہ خاموش ہو گئی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ تھی۔ اس کے خیال میں منیوہ بیگم کی ملکیت پر ان کی بیٹیوں کا حق تھا۔ اسے انیقا اور شہلا سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیوں نہ کچھ گرم کپڑوں کی شاپنگ کریں، سردی بس پہنچنے ہی والی ہے۔“ منیوہ بیگم نے مسرور سے انداز میں کہا۔ وہ اپنا بوجھ اتر جانے سے بہت خوش لگتی تھیں۔

”آپ نے اپنی ضروری پوری کر لی۔“ وہ ہار مانے والے انداز میں بولی۔ ”اب جو چاہے سو کریں۔“

”اچھی بیٹیاں باؤں کی باتیں مانتی ہیں۔“ وہ بردبار انداز میں بولیں۔

پھر وہ دونوں ایک شاپنگ پلازہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ منیوہ بیگم ایک کپڑے کی دکان میں داخل ہوئیں تو ربیعہ وندو میں لگے ڈیزائن دیکھنے لگی۔ تب ہی کسی نے بے حد مسرت، جوش اور حیرت کے طے پہلے جذبات سے اسے پکارا تھا۔

UrduPhoto.com

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا پھر لمحہ بھر کے لیے جیسے پتھر کی ہو گئی۔

”ترانہ!“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے عالم میں نکلا۔ ”ترانہ... تم... یہ تم ہو؟“

ترانہ نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ عالم جوش میں وہ جیسے بولنا پھول گئی تھی۔ بس ربیعہ کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

”اوه خدا... آج میں کچھ اور مانگتی تو وہ بھی ملتا۔ آج وقت قبولیت تھا ربیعہ!“ پھر وہ گلو گئے لہجے میں بولی۔ ”آج گھر سے نکلنے وقت میں نے نجانے کیوں شدت سے تمہیں یاد کیا تھا۔“

دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ چند لمحوں بعد انہیں آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کا احساس ہوا تو وہ علیحدہ ہوئیں۔

”ایک منٹ ترانہ!“ ربیعہ بولی۔ ”میں ابھی آئی۔“

ترانہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے دکان میں داخل ہوئی تھی۔ منیوہ بیگم کاؤنٹر کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دکاندار انہیں مختلف کپڑے دکھا رہا تھا۔

”امی جی...“ ربیعہ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”میں باہر ہوں، آپ اطمینان سے شاپنگ کریں۔“

”خیریت؟“ وہ چونکیں۔

”میں بعد میں بتاؤں گی۔“ وہ اسی تیزی سے باہر نکلی تھی جیسے اسے پھر سے ترانہ کے کھوجانے کا خدشہ تھا۔ ترانہ وہیں کھڑی تھی۔ ربیعہ اسے لے کر قدرے کم رش والے حصے میں چلی آئی۔

”اب کو تم یہاں کراچی میں کیسے؟“

”ایک لمبی داستان ہے۔“ ترانہ کی مسکراہٹ عجیب سی تھی۔ ”سننے کے لیے کم از کم بورا دن چاہیے ہوگا۔ بس مختصراً یہ کہ میں نے اور عبدالباری نے کورٹ میرج کرلی اور یہاں آگئے۔ خدا کے فضل سے باری کو اچھی نوکری مل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔“

”اوسے اوسے پیچھے والے لوگ سب کیسے ہیں؟ منور پھینکا۔ مینا آئی۔ صولت۔ تصور اور تمدن بھائی۔ سب سب لوگ کیسے ہیں۔ میرے چلے آنے کے بعد کیا گزری وہاں۔“

ترانہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر مسکرائی۔

”بہت محبت سے بنایا ہے خدا نے تمہیں۔ تمہارے اندر کتنی محبت ہے ربیعہ! بونہی تو نہیں تم اتنی خوبصورت ہو۔ وہاں شاید ہی کبھی کسی نے تمہیں اس انداز میں یاد کیا ہو اور تمہیں اس طرح ان سب کے نام لے رہی ہو جیسے جیسے۔ کوئی بہت اپنوں کو یاد کرے۔“

ترانہ کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

”ہاں۔ کیا شک ہے اس میں۔ روئے زمین پر شاید اسی ایک گھر سے میرا خونی رشتہ ہے۔ ترانہ اور نہ تو مجھے کہیں اپنی جڑیں نظر نہیں آتیں۔“

”نی زمانہ خون پانی سے کم قیمت ہے ربیعہ!“ ترانہ دھیمے سے ہنس دی۔ ”میرے معتبر جانوان خونی رشتوں کو۔“

”ایسے نہ کہو ترانہ!“ ربیعہ کو دکھ سا ہوا۔

”خیر۔ تم اپنی سناٹے عباد بھائی کے ساتھ آکر کوئی مشکل تو نہیں پڑی؟ کبھی کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ تم سوچتی ہوگی کہ ایک آدھ مرتبہ فون کے بعد میں نے کبھی تم سے رابطہ نہیں کیا تو میری بہن! جب ساری داستان تمہیں سناؤں گی تب تمہیں حقیقت کا علم ہوگا۔“

”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں مجھے سب کچھ پتا ہے۔ غرض محبت مظلوموں کا احترام کرو جانی سرخوشی۔ سچے گھرے رشتے جن میں کوئی غرض نہیں کوئی کپڑا نہیں۔“

”شکر ہے خدا کا۔ میرے دل سے آج ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتی تھی نہ بنجانے تم کس حال میں ہوگی۔ تم ہمارے خاندان کا حصہ تھیں۔ تمہاری حفاظت ہمارا فرض تھا لیکن جب رکھوالے ہی دشمن بن جائیں تو۔“

وہ دل گرفتہ سی خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے مگر ترانہ نے جلدی سے خود پر قابو پایا۔

”میں تمہیں اپنا ایڈریس دیتی ہوں۔“ وہ اپنا پرس کھول کر پین نکالنے لگی۔ ”تم کل ہی مجھ سے ملنے آؤ۔ مجھے احساس ہوا ہے کہ دنیا میں میرا اپنا بھی کوئی ہے۔ ہم دونوں جی بھر کر باتیں کریں گے۔ اف خدا! میں کس قدر خوش ہوں۔ باری بھی تم سے تمہیں مل کر بہت خوش ہوگا۔“

وہ پتہ لکھنے کے دوران بھی بول رہی تھی۔ پتہ ربیعہ کو تھا کہ اس نے گرم حوشی سے اس کے ہاتھوں کو دبایا۔

”اوہی نارہیجہ!“

”یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ میرا تو بنجانے وقت کیسے گزرے گا کل تک۔“

”تم سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں کرنا لیکن میں چند ضروری چیزیں لینے نکلی تھی۔ باری کے آنے سے پہلے مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔“

”کل میرے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر لینا۔“ ربیعہ شرارت سے ہنسی۔

”ضرور۔“

”اچھا۔ خدا حافظ۔“ ربیعہ نے محبت سے ہاتھ ہلایا۔

ترانہ مڑ کر چل دی تھی۔ ربیعہ وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جب وہ ہجوم میں گم ہو گئی تب وہ مڑ کر سینہ بیکم کی طرف آگئی تھی۔

”کوئی مل گیا تھا؟“ انہوں نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھا۔

”جی۔ میری پھپھی زاد بہن۔“

”پھپھی زاد بہن؟“ وہ تعجب سے بولیں۔

ربیعہ کو یاد آیا۔ عباد نے سب سے اس کے متعلق یہی کہا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔

”میں۔ میں گھر چل کر آپ کو بتاؤں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہوں۔“ انہوں نے جیسے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”اچھا۔ یہ رنگ دیکھو۔ یہ سوٹ تمہارے لیے لیا ہے۔“

”بہ انقید کے لیے۔ تمہیں کون سا زیادہ پسند ہے؟“

ربیعہ ان کا دل رکنے کے لیے ان سے شاپنگ ڈسکس کرنے لگی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ترانہ سے ملنے کے بعد اب اس کا کسی بات میں ہلکی سی دلچسپی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سچ کا عرصہ پلک جھپکتے ختم ہو اور وہ اڑ کر ترانہ کے پاس جا پہنچے۔ اس کا ذہن اندرون لاہور کی پرچہ گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

شہلا نے آٹھ مرتبہ بجنے پر وال کلاک کی جانب دیکھا اور پر سوچ انداز میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر وہ اٹھی اور جا کر ڈسٹنگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنا عکس دیکھنے لگی۔

آج صبح وہ خود ہی اگلے چل آئی تھی بنجانے کیوں ہاشم اسے لینے نہیں آیا تھا۔ شاید وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ اتنا مصروف کہ اب اسے شہلا کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔

شہلا نے آئینے میں خود کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ قدرے کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے میرون رنگ کے لباس پر چڑنی کا زرد دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ کبھی ان گہرے رنگوں میں اس کا چہرہ بہت پرکشش لگتا تھا لیکن آج شہلا کو اپنے چہرے پر ایک اداسی، ایک بے رنگی کی کیفیت محسوس ہوئی۔

اس نے دراز کھول کر لباس نکالتا نکالتا اور ہونٹوں پر لگانے لگی پھر اس نے آنکھوں میں گہرا کاہل لگایا۔ چند لمحوں خود کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جیولری باکس میں سے اپنے ربی اور زرد قون کے آویزے نکالے اور کانوں میں ڈال لیے۔

نیچے گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ شہلا بے قراری ہو کر کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں پھر باہر کی جانب چل دی۔ حقیقت یہ تھی کہ اتنے عرصے میں اس نے کبھی دروازے پر جا کر ہاشم کا استقبال کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن آج وہ اپنی کیفیات سمجھنے سے خود قاصر تھی۔

تیزی سے سیڑھیاں اترتی وہ نیچے چلی آئی۔ ماہین اور فردوس بیگم عذرا بیگم سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ عریشہ اپنے کمرے میں تھی۔ خنزہ اور علی بھی گھر میں موجود نہ تھے۔ شہلا نے لاؤنج کا دروازہ کھولا۔ ہاشم عین اس کے مقابل تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حکم سے گئے۔

”السلام علیکم۔“ شہلا آہستگی سے بولی۔

”وعلیکم السلام۔“ ہاشم کو اسے گھر میں دیکھ کر یقیناً چیرانی ہوئی تھی۔

شہلا نے ہاتھ برہا کر اس کا برف کیس لینا چاہا۔ ہاشم نے چونک کر ہاتھ پیچھے کیا۔

”اٹس اوکے۔“

”نہیں دے دیجئے۔“ اس نے اصرار سے کہا۔

”رہنے دو یہ کافی فزنی ہے۔“

”دے دیں نا۔ میں کمرے میں رکھ دیتی ہوں۔“

ہاشم نے از حد حیرانی سے بادل خواستہ بریف کیس اسے تھمایا۔ شہلا نے سر جھکا کر اسے اندر داخل ہونے کا رستہ دیا تھا۔ ہاشم قدم بڑھاتا بھول گیا تھا۔ وہ اس کے آویزے دیکھنے لگا جو شاید اس نے پہلی بار پہنے تھے۔ شہلا مڑ کر چل دی، تب اس نے بھی چونک کر قدم بڑھائے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ اس کے قدم گنتا اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر ہاشم کو خوش گوار سا احساس ہوا۔ اس کے پسندیدہ ایئر فریشر کی دھیمی مہک میں بسا صاف ستھرا کمرہ سجا ہوا تھا۔ شہلا نے بریف کیس الماری میں رکھ دیا پھر مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”کپڑے چینج کر لیں۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔“

”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

شہلا کو یاد آیا وہ جب بھی خوش ہوتا تھا اسے باہر کھانا کھانے کے لیے کہتا تھا۔

”قیمہ کر لیے بنے ہیں۔ آپ۔ آپ شوق سے کھا لیں گے؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”جو بھی ہو۔“

شہلا الماری سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہاشم کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے ٹالی کی ٹاٹ ڈھیلی کی پھر آستین کے بٹن کھولنے لگا۔

”کپڑے ڈرنگ روم میں لٹکائے ہیں میں نے استری کر دیے۔“

ہاشم نے اس کا سراپا دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“

اس نے ٹالی گردن سے نکال کر پھیٹکی پھر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

”آپ مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟“

ہاشم نے چونک کر سر اٹھایا۔ شہلا نظریں جھکائے قالین کو گھور رہی تھی۔

”میں۔ میں آتا۔ آتا ابھی۔۔۔ دراصل کل مجھے بائیم نہیں مل سکا۔“ وہ ہٹلایا۔

شہلا نے اب کی بار قدرے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھے فون کر کے کہہ سکتے تھے لیکن آپ نے ایک مرتبہ فون تک نہیں کیا۔“

ہاشم کے ہاتھ میں اس کے موزے تھے وہ انہیں جوتوں میں رکھنا بھول گیا۔ ایسی شکایتیں تو اس نے خواب میں بھی ان کیوں نہیں سنی تھیں۔

”اُمی ایم سوزی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ ”میں نے شاید خیال نہیں کیا۔“

”جی ہاں اب آپ کم ہی خیال کرتے ہیں۔“ اس نے پھر نگاہیں جھکا دیں۔

ہاشم کھڑا ہوا تھا چند قدم بڑھا کر وہ اس کے قریب آگیا۔ شہلا کو اپنے گالوں پر دوڑتی سرخی کا احساس ہوا۔ اس کا دل کسی نئی رفتار سے چلا تھا۔ ہاشم نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ قدرے سمٹ سی گئی۔ ہاشم نے وارڈروب کا دروازہ کھولا۔

شہلا نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ بیگر میں اپنی شرٹ لگا رہا تھا۔ شہلا خفیف سی ہو گئی۔

”کھانا۔۔۔ کھانا۔۔۔ اوپر لے آؤں؟“ وہ ہلکی سی آواز میں اتنا ہی پوچھ سکی۔

”نہیں، نیچے سب کے ساتھ کھاتے ہیں۔“

”نیچے تو۔۔۔ ابھی کوئی نہیں ہے۔۔۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔ ”میں نما کر فریش ہوتا ہوں تب تک سب آجائیں گے لیکن پہلے ایک کپ چائے پلا دو تو بہتر ہو۔“

”میں ابھی لے آتی ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔

ہاشم ایک بار پھر حیران ہونے پر مجبور ہوا تھا۔

”یہ لو۔“ رابعہ بیگم نے ایک سفید لفافہ وردہ کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے امی جی؟“ اس نے اشتیاق سے لفافہ کھول کر اندر دیکھا پھر حیران ہوئی۔ ”یہ تو اچھی بھلی رقم ہے۔“

لفافہ کے نیچے اندر نیلے رنگ کے کئی نوٹ تھے وردہ نے رقم نکالی۔

”کتنے ہیں؟“

”پتا نہیں، ممکن لو۔ یہ اماں نے دیے ہیں۔ ان کی جانب سے ناعمہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس رقم سے فرنیچر وغیرہ بنوا لیا جائے۔“

وردہ رقم گننے لگی۔

”پورے پچاس ہزار ہیں لیکن ٹالی امی نے اتنے زیادہ کیوں دیے؟“

”میں نے بہت منع کیا تب عذرا بھی ناراض ہو گئیں اور اماں بھی۔ مجھ پر ان کا تحفہ قبول کرنا پڑا۔ اماں

بہتے لگیں کہ وہ خود بھی آرڈر کر سکتی تھیں لیکن صرف ناعمہ کی پسند شامل ہونے کے خیال سے رقم دے رہی ہیں

تاکہ ناعمہ خود اپنی پسند کا فرنیچر بنوائے۔“

”چلیں خیر ہے وہ بھی ہمارے اپنے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچنا ہی تھا۔ آپ کا بھی بوجھ ہلکا ہو گیا۔“

”فراز کی والدہ جینز وغیرہ کے خلاف ہیں۔ وہ شاید یہ سب کچھ پسند نہ کریں۔“

وردہ خاموش سی ہو کر سوچنے لگی۔

”ایک مرتبہ فریڈ تیار ہی تھی کہ فرراز بہت سلیم کٹو ہے۔ اسے ہر چیز پسند نہیں آتی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس نے

اینا کمرو بہت عکدہ انداز سے فیکٹ کیا ہوا ہے۔ یونیک ڈیزائن کا فرنیچر خاص طور پر صرف کمرے کی بناوٹ کو مد نظر

رکھتے ہوئے بنوایا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں فرنیچر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ یہ رقم ناعمہ کے اکاؤنٹ میں

ڈال دیں۔“

”ایسا کیوں نہ کریں کہ تم باتوں ہی باتوں میں فراز کا عندیہ لے لو۔ ہو سکتا ہے وہ فرنیچر تبدیل کرنا چاہے۔“

”اچھا۔“ وردہ نیم رضامندی سے بولی۔ ”چلیں یہ بھی کر لیں گے۔ ثانیہ کہہ رہی تھی کہ اس نے سینڈلز لیتا ہیں

تو ساتھ ہی ناعمہ کی سینڈلز بھی لے لی جائیں۔ آپ سے اس نے کہا نہیں؟“

”کہا ہے۔“ وہ فراغت سے بیٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”ابھی رافع آفس سے آجائے تو ثانیہ اور ناعمہ کو مارکیٹ

لے جائے گا۔ تم بھی ساتھ جانا۔ اس ناعمہ کو تو کوڑی کی عقل نہیں ہے۔ صرف میچنگ چلیں لے آئے گی۔ تم

اسے ایسی سینڈلز دلوانا جو ایک سے زیادہ جوتوں پر چل جائیں۔“

وردہ متاثر سی نظر آنے لگی۔ ہر چند کہ ماں کی بات رو کر اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

”رہنے دیں امی!“ پھر وہ بولی۔ ”ثانیہ اور ناعمہ کو ہی جانے دیں۔ جو چیز بھی ہو وہ ان کی ذاتی پسند کی ہونا

لاؤنچ کے دروازے پر رافع کھڑا تھا۔ رابعہ بیگم بھی اُسے ساختہ کھڑی ہوئی تھیں۔ رافع کی نظریں دروازے کی نظریں سے ملیں۔ دروازہ مڑ کر کمرے میں چلی گئی۔
 ”اور رافع!“ رابعہ بیگم نے سنبھل کر اسے پکارا۔
 وہ چند قدم اندر چلا آیا۔

”السلام علیکم۔ باہر کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا میں نے سوچا لاؤنچ میں دستک دے دوں گا۔“
 ”وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں ابھی تمہاری طرف سے آ رہی تھی۔ دروازہ میں نے ہی کھلا چھوڑا کیونکہ ثانیہ نے کہا وہ بھی پیچھے آ رہی ہے۔ بیٹھو۔“ انہوں نے رافع کا چہرہ بغور دیکھا لیکن کچھ اخذ کرنے سے قاصر رہیں۔

”میں ناعمہ کو لینے آیا ہوں پچھو! ثانیہ گاڑی میں بیٹھی ہے۔“
 ”اچھا۔ میں ناعمہ کو بھیجتی ہوں۔“

”وہ کون ہے؟“ رافع نے پوچھا۔ ”وہ بھی ساتھ چلے۔“ وہ قدرے جھجک کر بولا۔
 ”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”وہ نہ سنے۔ کچھ نہیں لیتا۔“

پھر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”وہ کل ماہین کے ساتھ باریکٹ جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”بہتر پھر آپ ناعمہ کو بھیج دیں۔ میں اور ثانیہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“ وہ اٹھ کر چل پڑا۔ رابعہ بیگم نے اس کے چوڑے شانوں اور دراز قامت کو دیکھ کر دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا تھا پھر وہ کوئی خیال آنے پر ورنہ اور ناعمہ کے کمرے کی جانب پرہیز۔

”میں نے کہا نا آپ! آپ جو بھی لے آئیں گی مجھے قبول ہو گا۔“ ناعمہ بے دلی سے کہہ رہی تھی۔
 ”نا بابا! میں کیوں لے آؤں؟ تم خود جاؤ اپنا کام کر لیں۔“

”آپ میرے سارے کام کر دیتی ہیں۔ اس میں کیا تامل ہے؟ ثانیہ بھی تو ساتھ ہے۔ آپ اور ثانیہ اچھی شاپنگ کریں گی۔“

”پلیز ناعمہ۔“ وہ زچ ہوئی۔
 ”پلیز آپ!۔“

”ناعمہ۔“ رابعہ بیگم قدرے سختی سے بولیں۔ ”کیا مذاق ہے یہ؟ چلو اٹھو، چادر لو اور جاؤ۔ وہ لوگ گاڑی میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

ناعمہ نے ماں کے تیور دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اب ایک لفظ مزید کہنا محال ہے۔ وہ چپکے سے اٹھی اور الماری کھول کر چادر نکالنے لگی۔ دروازہ کچھ کمرے سے نکل گئی تھی۔ رابعہ بیگم بیڈ پر بیٹھ گئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔



”تم یونہی مجھے تنگ کر رہے ہو۔“ وہ جھلائی تھیں۔ ”جانتے ہو ماں کو ستانا کتنا بڑا گناہ ہے۔“
 ”جی جی۔ جانتا ہوں۔ آپ مجھے یہ گناہ کر لینے دیجئے۔ چلیں انھیں شہابش۔“ عباد نے چپیل لا کر ان کے قدموں کے قریب رکھ دیں۔

”دیکھو میرے زندگی کے جتنے دن ہیں وہ یہ ٹیسٹ کروانے سے بڑھ نہیں جائیں گے۔“
 ”صلاح لازم ہے۔ شاید آپ نے سنا نہیں اور مجھے یہ جذباتی باتیں نہ سنائیں۔ میں نے آپ کے لیے نام لیا

چاہیے۔ ناعمہ کو سچنگ سینڈلز کا کریر ہے تو چند سینڈلز زیادہ ہی سہی لگے گی نا۔ کیا فرق پڑتا ہے میں نہ جاؤں تو بہتر ہے۔“
 ”چلو۔ کوئی بات نہیں۔ لیکن تم اپنے لیے شاپنگ کر لینا۔ شادی سر پر ہے تم نے ابھی تک اپنے لیے کچھ نہیں خریدا۔“

”میں ماہین کے ساتھ جاؤں گی کل پاپا سوں۔“

رابعہ بیگم نے قدرے غور سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ دروازہ نگاہیں چرانے لگی۔

”درد۔ بیٹی۔ کیا تم رافع کے ساتھ جانے سے انکاری ہو؟“

”جی؟“ وہ چونکی۔ اس کے کمان میں بھی نہ تھا کہ رابعہ بیگم ایسی بات کہیں گی۔

”جی نہیں۔“ اس کے لبوں سے بے سوچے سمجھے نکلا۔

”مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“ اس کی نظریں میں گہری تشویش اتر آئی۔ ”درد۔ بیٹی! یہاں آؤ۔ یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

درد آہستگی سے اٹھی تھی۔ مدھم چال چلتے وہ ان کے قریب چلی آئی۔ رابعہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

”درد۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا رشتہ جو گیا ہے۔ وہ تم سے کڑیاں ہیں۔ تم اس سے خفا۔“

”نہیں میں تو کسی سے خفا نہیں ہوں۔“ اس نے غلٹ میں ماں کی بات کالی۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”پھر یہ گریز کیسا؟ یہ تو محض دلوں کے میل کو ظاہر کر رہا ہے۔ کیا تمہارے دل میں اس کی جانب سے کوئی بدگمانی ہے؟“

”نہیں ای! کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی پھر ان کی جانب دیکھا۔ ”میرے دل میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ بات محض اتنی سی ہے۔“

رابعہ بیگم تھیرے اس کا چہرہ دیکھ گئیں۔
 ”بس یہ اتنی سی بات ہے؟ اس بات پر تو زندگی کی خوشیوں کا وہ بددعا کر رہا ہے درد! تم اسے اتنی سی بات کہہ رہی ہو۔“

درد نے سر جھکا لیا۔ رابعہ بیگم متفکر بنی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

”اور اس کے دل کی کو؟ کچھ خبر ہے؟ وہاں تمہارے لیے کتنی جگہ ہے؟“

”میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”غلط۔ یہ بات رافع کے علاوہ صرف تمہیں معلوم ہوگی۔ ایسے جذبے گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ نظرنہ آئیں تو ان کی خوشبو ان کی موجودگی کی خبر دیتی ہے۔“

درد کو لگا جیسے وہ روہنے والی ہے۔ ماں نے دل کے نازک گوشے کو نشتر سے چھیڑا تھا۔

”بولو درد! کیا تم دونوں ایک دوسرے سے بندھ جانے والے دو مختلف سمتوں کے نشان ہو؟“

”اس بات کی کیا اہمیت ہے امی؟“ وہ خم ناک لہجے میں بولی۔

”بہت اہمیت ہے۔ جی! میں اولاد کی خوشی کے لیے زمانے سے بغاوت کر سکتی ہوں۔ اگر تم اپنے دل کو رافع کے لیے آمادہ نہیں یا تم تو کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔ زبردستی جانوروں کے ساتھ کی جاسکتی ہے انسانوں کے ساتھ نہیں۔ کیا تمہیں رافع پسند نہیں؟“

درد نے نظریں اٹھا میں پھر دھک سے رہ گئی وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

”میر حسن کے کزن ہیں شہیار احمد! وہ بوکے سے آئے ہیں۔ میں نے کل ان لوگوں کو کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کھانا بہت سی آئی لی قسم کا ہو۔ ویسے تو تم بہت ماہر ہو کوکنگ میں لیکن کل کمال ہی کر رہے تو اچھا ہے۔ امیر حسن تو خیر بہت سادہ مزاج آدمی ہے لیکن یہ شہیار صاحب کیسے ہیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ پہلا امپریشن اچھا پڑنا چاہیے۔ کیوں؟“

”جی ہاں۔ ٹھیک ہے عباد بھائی! اس نے سر ہلایا۔
”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟“

”کمال کرتے ہیں۔“ اس نے برا مانا۔ ”آپ صبح ناشتے کے وقت ڈشیز ڈیسائڈ کر لیجئے گا۔ ایک مرتبہ مینیو سیٹ ہو جائے تو میں سامان بھی منگوا لوں گی اور اشارت بھی جلدی لے لوں گی۔“ عباد نے پیار سے اسے دیکھا۔
”یہ انہی کے ایک نمبر کی کام چور اور بے ڈھنگی ہے۔ اسے تمہاری ہیلپ کے لیے کہا تو شاید تمہیں مزید پریشان ہی کرے۔“

”اس کی بدھائی زوروں پر چل رہی ہے اسے تنگ نہ کریں۔ میں خود اپنی ہیلپ کر سکتی ہوں۔ سات آٹھ ڈشیز ہی ہوں گی نا۔ کوئی اتنا برا پرو جیکٹ نہیں بنے گا جو آپ میرے لیے پریشان ہوں۔“

”مختصک یو سوچ۔“ وہ ہلکا ہلکا ہو گیا۔

”عباد بھائی! آج مجھے بازار میں ترانہ ملی تھی۔“

”رنگی۔“ عباد کو حیرت ہوئی۔

”جی ہاں۔ وہ بیاری سے شادی کر کے نکلا ہے۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا ہے۔“

”تو بار بار اسے یہاں بلا لینا چاہنا۔“

”میں نے تو اسے اپنا ایڈریس نہیں دیا، غلطی ہوئی۔“ عباد نے ترانہ کے گھر جھوڑ آئیں گے نا؟“

”میں کل رات ہی چھوڑ آؤں گا۔“ وہ ہنسا۔ ”جانتا ہوں تمہارے پیٹ میں کتنے تل پڑ رہے ہوں گے۔ میں نے شاید کل دعوت کا کہہ کر غلطی کی۔“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”ہے اور ہم ہاسٹل جا رہے ہیں۔“
”ربیعہ ان کی باتیں سن کر مسکرا دی۔“
”آپ ماں بیٹے کی نوک جھونک میں تو ناظم ضرور ہی نکل جائے گا۔“ وہ بولی۔
”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ پر عزم انداز میں بولا۔ ”اب اگر انہوں نے ذرا سے پس و پیش سے کام لیا تو میں انہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

وہ بازو چڑھانے لگا۔ منیوہ بیگم اٹھ کر چھیل پھیل پھیل گئیں۔

”پچلو جیسے کہو۔“ وہ بار بار مان کر بولی تھیں۔

عباد نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔

”شک کرنے پر معذرت۔ لیکن یہ گناہ نہیں ہمیں کارِ ثواب ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر اس کے سر پر ایک چیت لگا لی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد انیقہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ ربیعہ سوچ و غور سمیٹنے کے لیے کچن میں چلی آئی تھی۔

کام کے دوران وہ ترانہ کے متعلق سوچتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ کل شیخ انس نے ترانہ سے فون نمبر بھی لے لیا

ہو تا تو اس وقت وہ اس سے فون پر ہی تھوڑی بہت بات کر لیتی۔ وقت گزرتا کرتا مشکل رنگ رہا تھا پھر اسے خیال آیا

کہ اس کے پاس ترانہ کا صرف تحریر شدہ ایڈریس تھا جسے ڈھونڈنے میں وقت ہو سکتی تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا

کہ اس نے عباد سے ترانہ کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اسے وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ ابھی آیا تھا اور

آتے ہی منیوہ بیگم کو ٹیسٹ کے لیے لے گیا تھا۔

ربیعہ نے ارادہ باندھا کہ وہ ان لوگوں کے آنے پر عباد کو ترانہ کے متعلق بھی بتائے گی اور اس سے کہے گی کہ کل وہ

اسے ترانہ کے گھر ڈراپ بھی کر دے۔

”قربا“ وہ گھٹنے کے بعد ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ منیوہ بیگم اس قدر تھکی ہوئی تھیں کہ وہ کوئی بھی بات کیے

بغیر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ عباد تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھا تھا۔

”جائے بنا دوں عباد بھائی!“ ربیعہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔

”اگر تکلیف نہ ہو تو۔“

”تکلیف تو بہت ہوگی لیکن میں پھر بھی بنا دیتی ہوں۔“ وہ برا مان کر بولی۔

پھر وہ چائے بنا کر اس کے پاس چلی آئی۔ عباد آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس کی آہستہ پا کر بیٹھ گیا۔

”امی کو کیا براہم ہے عباد بھائی؟“ ربیعہ اس کی سنجیدگی سے ڈر سی گئی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”ابھی تو ٹیسٹ چل رہے ہیں۔ تم دعا کرو ربیعہ!“

”یہ بھی کہنے کی بات ہے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔“

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ!“ وہ ممنونیت سے مسکرایا۔

”اپنوں کے لیے تو سب ہی دعا کرتے ہیں۔ آپ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”بے شک۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

ربیعہ اسے ترانہ کے متعلق بتانے کا سوچنے لگی۔ تب ہی عباد بولا تھا۔

”ربیعہ کل ذرا سا کام ہے۔“

”جی؟“ وہ چونکی۔ ”کہیے؟“

ہی باتیں نہیں ہیں۔ خود ہی جلتے، کلتے رہتے ہیں۔ آج بے کلی حد سے سوا تھی۔ سو میں یہاں چلی آئی شاید نا سوچے سمجھے ہی۔

شہلا نے اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔
”یہ بے کلی۔ اس کی فرقت کا دسرا نام ہے ایقان! تم سمجھتی کیوں نہیں؟“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ وہ بڑبڑاتی۔
”پھر اسے آواز کیوں نہیں دے لیتیں؟ بلاتی کیوں نہیں؟“

”وہ میری پکار کا منتظر نہیں ہے شہلا! وہ بے نیاز ہو چکا ہے۔ اب چاہے میں اسے پکاروں خواہ اس کے اپنے بچے۔ نئی دنیا کھونچنے چلا ہے۔ دیکھو یہ سفر کب ختم ہوتا ہے۔“
شہلا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”تو انہوں نے وہاں شادی کر لی؟“ ایقان کی باتوں سے وہ یہی سمجھی تھی۔
”کر لی ہوگی، یقیناً۔ مجھے اس نے کچھ عرصہ پہلے یہ اطلاع دی تھی۔ ہر چند کہ وہ جانتا ہے کہ اسے میری اجازت کی ضرورت نہیں۔“ وہ طنزاً ہنسی۔

شہلا کو حقیقتاً افسوس ہوا تھا کہ خاموش بیٹھی رہ گئی۔
”یہ تو برا ہوا ایقان۔“ پھر وہ بولی۔ ”تمہاری ضرورت میں تمہارے بچوں کا نقصان ہوا ہے۔“

”بچوں کے پاس تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ صرف اس کی بھیجی ہوئی آسانشات تھیں۔ سوا ب بھی ہیں۔ جانتی ہو شہلا! پچھلے ماہ اس نے پورے بیس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ شاید عقد ثانی کی خوشی میں۔ پیسے کو تو ہمیشہ سے انسانی جذبوں کا بل ہے۔“

ایقان نے اس کے سر کو دھکا دیا اور اس کی رقم اس کے منہ پر مار لی۔ ”کیمنسہ ذلیل۔“
شہلا کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ اس کا وجود ایک بھیٹا ہوا تھا جس میں اس کے سارے جذبے جل رہے تھے۔

”اپنے بچوں سے بات تو کرتے ہوں۔“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔
”بات؟“ ایقان کی آنکھیں پھلکیں۔ ”بات کیسے ہو؟ وہ تو۔۔۔ وہ تو جانے کہاں چھپ گیا ہے۔ وہ غائب ہو گیا ہے۔“

سلیمانی ٹوٹی پسلی سے اس نے جانتی ہوں وہ صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے مجھے جھکانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور میں ٹوٹ جاؤں گی لیکن جھکوں گی نہیں۔ مراؤں گی لیکن اسے نہیں پکاروں گی جس نے میری جگہ اتنی آسانی سے کسی اور کو دے دی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کے دیتی ہوں۔“

شہلا بری طرح سے چونکی۔
”ایقان۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے بھارت میں بھجور رہی ہو۔ صاف صاف کہو نیما جڑا ہے۔ غاشر بھائی کہاں چلے گئے ہیں اور۔۔۔ اور تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“

ایقان نے دفعہً ”ہی خود پر قابو پالیا تھا۔“
”وہ لڑا سے شادی کر کے کسی اور سرے ملک شفٹ ہو گیا ہے شہلا!“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”اور شفٹ ہونے سے قبل اس نے مجھے یہ رقم بھیج کر شاید اگلے پچھلے حساب برابر کر دیے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے میں اس بھیک کے سارے پوری زندگی گزار لوں گی لیکن میں۔۔۔“

”اب سناؤ۔“ شہلا نے خود بھی ٹیک لگائی اور ایقان کو بھی ایک تکیہ فراہم کیا۔ ”کیسی گزر رہی ہے؟ ہم نے تو ایک دوسرے سے دل کا حال کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”دل کا حال کہنے کے لیے بھی یا تو بہت حوصلہ چاہیے یا پھر بالکل بے حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ دونوں

”خیر چاہتا تو بھیجتا ہو گا یا وہ بھی نہیں؟“
ایقان اس قسم کے سوالوں سے ناک تک بھری ہوئی تھی۔ وہ کوفت زہ انداز میں کھڑی ہوئی۔
”میں شہلا سے ملنے آئی ہوں بھابھی بیگم! کیا وہ اپنے کمرے میں ہے؟“

”اے ہاں۔ ہم بھی سوچیں یہ بھابھی بیگم کے لیے لڑوا کیسے پکا تمہارا؟ ہاں بھی۔۔۔ سبھی تمہاری اپنے کمرے میں ہی ہیں۔ سیکے کے علاوہ وہ زیادہ تر وہیں ہوتی ہیں۔ ہم تو اس عید کے چاند کو کم ہی دیکھتے ہیں۔“

”اچانک ہی بچن کے دروازے پر شہلا نمودار ہوئی تھی۔
”میں یہاں ہوں ایقان! روٹی پکا رہی رہوں۔ تم بیٹھو میں ابھی آئی۔“
فردوس بیگم بری طرح سسٹائی تھیں پھر انہوں نے خود پر قابو پالیا۔
”جانے کب چلی آئیں۔۔۔ بیگم کی طرح۔۔۔ وہ بڑبڑاتی۔“

ایقان بیٹھنے کے بجائے بچن کی جانب ہی بڑھ گئی تھی۔ ”جیسے اسے کچھ خیال آیا تھا اس نے مرکز دیکھا۔“
”بھابھی بیگم! یہ آپ کے برادر فخر تم کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“
”ہاں۔۔۔ کون؟“ وہ قطعاً نہ سمجھیں۔
”فخر میاں کا پوچھ رہی ہوں۔“
”خیر؟“ ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کک۔۔۔ کیوں۔۔۔ کچھ کیا اس نے تمہیں؟ اے ہاں۔۔۔ وہ تو ایسا ہی باؤلا ہے۔ تم تو جانتی ہو۔“

”میں تو صرف اتنا پوچھ رہی ہوں کہ وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟“
”یہیں کہیں ہوتا ہے۔ آجاتا ہے کبھی کبھار۔“
”ہوں۔“ اس نے ہنکارا پھر آگے بڑھ گئی۔
شہلا اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔
”بس پک گئی ہیں۔“ وہ روٹیاں رومال میں لپیٹ کر باٹ پیٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔
”تمہیں یوں کام کرتا دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ اچھی لگ رہی ہو۔“ ایقان مسکرائی۔ ”ہیپتال نہیں جانتی؟“
”میں نے لانگ لیو لے لی ہے۔“ وہ کھلے گل کے نیچے ہاتھ دیے ناخن اچھی طرح صاف کر رہی تھی۔
”کیوں؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”ہیپتال ہو گیا؟“
شہلا نے جیسے غم کر اسے دیکھا پھر ہولے سے ہنس دی۔
”ارے نہیں۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی تھی۔ ”بس یونہی دل بھر گیا تھا اس بو بھل رو میں سے۔ اپنے گھروالوں کے لیے وقت ہی نہیں نکلا۔ ہر کسی کو شکایت تھی مجھ سے۔ سوچا سب کی شکایتیں دور کی جائیں۔“
”نام غ ہو گئیں تو چلو تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“ ایقان بولی۔
”ٹھیک ہے۔“ شہلا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب سناؤ۔“ شہلا نے خود بھی ٹیک لگائی اور ایقان کو بھی ایک تکیہ فراہم کیا۔ ”کیسی گزر رہی ہے؟ ہم نے تو ایک دوسرے سے دل کا حال کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“
”دل کا حال کہنے کے لیے بھی یا تو بہت حوصلہ چاہیے یا پھر بالکل بے حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ دونوں

اس کی سانس شہج تھی۔ شہلا دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”کیا کرو گی دو بچوں کے ساتھ؟“

”کیوں نہیں جو وہ کر سکتا ہے کیا میں نہیں کر سکتی۔ مجھے تو صرف اتنا پتا کرنا ہے کہ وہ ہے کہاں پھر میں اس سے طلاق لوں گی ہر صورت ہر قیمت پر اور پھر۔۔۔ پھر اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کسے دیتی ہوں۔“
”ایقان۔۔۔“ شہلا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”خدا کے لیے۔۔۔ خدا کا واسطہ تمہیں۔۔۔ اتنی کم عقلی سے تو کام نہ لو۔ تم غم و غصے سے بالکل دیوانی ہو گئی ہو۔ اپنی ذات کوئی اتنی بڑی چیز نہیں ہوتی کہ اسے روک دے پر انسان دنیا کو روک دینے پر تیار ہو جائے۔ اس نے تمہاری جگہ اگر کسی کو دی تو اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے۔ تم مرد کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ تم سے بے تحاشا محبت کر کے بھی یہی سننا چاہے گا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ محبت ایسی خطا ہے جسے مرد ہمیشہ عورت کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا ہے۔“
”یہ اس کی غلطی ہے اسے ضرور دکھ اٹھانا ہو گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے خود کو پیٹرول چھڑک کر آگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔“

شہلا آنکھیں کھولے اس دیوانی کو تکتی رہ گئی۔ وہ محبت میں شدتوں کی قائل تھی۔ شہلا ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اس درجہ دیوانی کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔
ایقان جو دل ہلکا کرنے آئی تھی۔ اب اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی اور کی آنکھیں تھیں۔ شہلا کو اس سے خوف سا محسوس ہوا۔
اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ اپنا ستم کو ضرور ایقان کے ارادہ سے مطلع کرے گی۔

Urdu Photo



بھگی ہوئی رات نے پھر پھر پھر اسے عریضہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قسمت آزمائی کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس نے ماہین کے گہری نیند میں ہونے کا اطمینان کیا اور اٹھ کر بستر سے نکل آئی۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ لاؤنچ میں چلی آئی تھی۔

ٹیلی فون سیٹ گود میں رکھ کر وہ پھر وہی پچھلی باتیں سوچنے لگی اور جب ناعمہ کے قسموں سے اس کا وجود گونجنے لگا تب اس نے فراز کا سیل نمبر ڈائل کیا۔

اچانک ہی اس کے سب ہی حواس کام کرنے لگے تھے۔ دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔

”ہیلو۔“ پھر وہ آواز سنائی دی جس سے اس کا روم روم جاگ اٹھا۔

عریضہ کی آواز اس کے گلے میں پھنس سی گئی۔

”ہیلو۔“ وہ پھر بولا۔

”میں۔۔۔ میں عریضہ بات کر رہی ہوں۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔

”عریضہ! کیسے؟“ وہ سادہ لہجے میں بولا۔

ساتھی آئینہ شہلا ہے میں

اس نے یہ نظر غائر ایک مرتبہ پھر ڈالتا تھا۔ ٹیبل کی جانب دیکھا جسے اس نے بہت محنت اور شوق سے سنوارا تھا۔ سلیقے سے رکھے گئے۔ چمکتے برتنوں صاف ستھرے سفید فینکوز اور درمیان میں رکھے خوبصورت گلدستے نے میز کو بہت کشش بخش دی تھی۔

”ہوں۔ بہت خوب“ اپنے پیچھے عباد کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔
”آپ کب آئے عباد بھائی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”جب سے آپ اکیلے ہی اکیلے خود کو داد پیش کر رہی ہیں۔۔۔“ وہ ہنسا ”بھئی کچھ حصہ اس میں ہمارا بھی ڈال لو۔ ہمیں بھی ”بہت خوب“ تو کہنے دو۔“

”آپ کہہ چکے۔ وہ جینپ کر بولی ”اور قیہ داد کھانے کے بعد پیش کیجئے گا۔“
”کیا کیا بنا ہے اور کیا کیا اندر پر دس ہے؟“

”سب کچھ بن چکا ہے۔ اندر پر دس کچھ بھی نہیں، ماسوائے اس کے کہ پلاؤ دم پر رکھا ہے اور کباب فراہم کرنا ہے۔“

”وہ؟“ وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہی جو آپ نے ڈیسا لگا رکھا ہے۔ کوفتے وہ بھی نہ گھسی، پلاؤ افغانی، چرنہ پشوری، چکن چاؤمین اور فروٹ ٹرانکفل۔ کباب ہماری بھی ہیں اور شام بھی۔“ عباد اس کے پروڈیوشل انداز پر ہنسنے لگا۔

”کسم سے۔۔۔ کسی فائو اسٹار ہوٹل کی ویسٹرن لپ رہی ہو۔۔۔“
”جی ہاں!“ اس نے عباد کو گھورا ”بس یہی ایک ڈاڑھانی رہ گئی تھی۔ سو آپ نے پیش کر دی۔ بالی ڈاؤسے۔ میں شیف بھی ہوں۔ صرف ویسٹرن نہیں۔“

”پلاؤ کی جلدی ہے کان پڑے۔“ عباد نے پوچھا۔
”کسم صرف میری پیار کی سی ہوئی۔“ عباد نے پوچھا۔

”اکمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ رعبہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں سے خفت زدہ ہو کر مڑی۔
”امی کہاں ہیں؟“ عباد نے نظر دوڑائی۔

”نماز پڑھ رہی ہیں۔ میں نے ہی انہیں کہا تھا کہ مہمانوں کے آنے سے پہلے فارغ ہو جائیں ورنہ انہیں یہی فکر ستاتی رہتی۔“

”وہ چکن میں چلی آئی اور چاؤمین کے نیچے آج مزید دم کرنے لگی۔“
”وہ لوگ کب تک پہنچتے ہیں بول گے۔“ عباد نے گھڑی دیکھی ”تم بھی شاور لے لو اور فریش ہو جاؤ۔۔۔“

”میں۔۔۔“ رعبہ متاثر سی ہوئی ”عباد بھائی۔ میں۔۔۔“
”ہوں۔ کہو؟“ عباد نے جاتے جاتے اسے رک کر دیکھا۔

”مجھ سے وہاں کھانے کے لیے اصرار مت کیجئے گا۔ میں صرف سرو کر کے اپنے چلی جاؤں گی۔“ عباد نے ابرو اٹھا کر اسے قدرے حق سے دیکھا تھا۔

”دیکھیں؟“
”دوسرا صل میں تھک گئی ہوں۔“ اس نے معقول سی معذرت کرنا چاہی۔ ”میں کچھ دیر آرام کر لوں گی۔“

”ضرور کرنا۔ لیکن مہمانوں کے جانے کے بعد۔ جہاں اتنا کام کیا ہے وہاں تھوڑا سا صبر بھی۔“
”لیکن عباد بھائی۔۔۔“ وہ زنج ہوئی ”میں آخر۔۔۔ کروں گی کیا۔“

”سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاؤ گی۔“ وہ حتمی انداز میں بولا۔

عربشہ کو اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا اپنے کانوں میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فراز کی ٹھنڈی اور اجنبی آواز سن کر اپنے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہوا محسوس کیا تھا۔ نجانے کیوں اتنے عرصے سے ایک گمان اس کے ساتھ ساتھ جیتا تھا کہ برسوں بعد بھی وہ ایک دوسرے کو ویسے ہی پہچان لیں گے جیسے روز اول پہچانا تھا اس کی آواز سنتے ہی فراز کے کانوں سے ناعمد کے جھوٹ کا رُخ اٹھ جائے گا۔

اسے احساس ہوا کہ فراز اس کی جانب سے گفتگو کا منتظر تھا۔
”آپ۔۔۔“ اس کی آواز پھنسنے لگی تو وہ دھیمے سے کھنکھاری ”لگتا ہے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا!“

اس کے مدھم لہجے میں دیکھ بھی تھا۔ شکایت بھی تھی۔ بے یقینی بھی تھی۔
”ایسی بات نہیں ہے!“ وہ بولا ”میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔“

عربشہ بے طرح چونکی۔
”آپ نے خود بتایا کہ آپ عربشہ ہیں۔ اور میرے جاننے والوں میں صرف ایک عربشہ ہے۔“ وہ اطمینان سے

سادہ لہجے میں بول رہا تھا۔ عربشہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے، سانس روکے اس کے اگلے جملوں کی منتظر رہی۔
”آپ یقیناً شہلا آلی کی مندر ہیں۔ ہاشم بھائی کی سسر۔ نافع کی منکوحہ! نافع عباد کا بہت اچھا دوست ہے۔ اس

حوالے سے بھی میں آپ کو جانتا ہوں۔ ایم آئی رائٹ؟“ عربشہ کو لگا اس کے جملے میں اس کی اپنی سانس نے پھندا ڈال دیا ہے۔ جو نہ اوپر کو جاری تھی اور نہ نیچے کو صرف اس کے گلے کے گزروں کی بل دار سانپ کی مانند اپنا گھنجد کھینچ رہی تھی۔

”ہیلو۔“ اس کی جانب سے گہری خاموشی پا کر فراز بولا ”آپ خیریت سے تو ہیں؟ یوں آدھی رات کے وقت آپ

کانوں آٹا اور پھر کچھ نہ بولنا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔“
”جی۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ بمشکل بولی ”میں نے۔۔۔ میں نے شام کا عشاء کھا لیا۔“

اس سے مزید کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔ اس نے فون بند کر دیا اور کھل کر سانس لینے کی کوشش کرنے لگی۔
وہ چند لمحوں کے انتظار میں اس نے ایک طویل عرصہ اندھے غار میں بیٹھے ہوئے جوگی کی طرح گزارا تھا۔

وہ چند لمحوں کی تیزی سے گزرے تھے کہ اب ان پر کسی خواب کا گیان ہو رہا تھا۔ یوں جیسے لمحہ بھر کے لیے آنکھ لگی تھی اور کوئی سب سے رابطہ سا خواب بنا اور ٹوٹ گیا تھا۔ وہ حیران پریشان سا لگ رہا تھا۔

وہ تو اسے کئی حوالوں سے جانتا تھا اور وہ اپنی زندگی میں صرف ایک عربشہ کو جانتا تھا وہ عربشہ جو ہاشم کی بہن تھی۔ شہلا کی مندر تھی اور نافع کی منکوحہ تھی۔ بس اس سے آگے شناخت کا کوئی حوالہ نہ تھا اور جتنے حوالے اس نے گوائے تھے اس کے بعد کچھ بھی کہنے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ ضرورت۔

عربشہ کو لگا جیسے اس کے وجود پر دم گھوستے جس کا جو عالم چھایا ہوا تھا۔ وہ اب گھٹنا چاہ رہا ہے۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور لبوں سے آپہن نکلتے لگیں۔ اس کے پورے جسم پر ایک شدید کھینچا ہوا طاری ہوئی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ آگے کو جھکتے جھکتے وہ صوفے سے نیچے گر گئی تھی۔

بند روم سے ماہین گھبرائی ہوئی باہر نکلی تھی۔ اس نے لائٹ جلائی پھر عربشہ کو نیچے گرا ہوا دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

”عربشہ! ماہین نے اسے کاندھوں سے تھام کر سیدھا کیا۔
اس کا ہونٹ اس کے دانت سے رگڑ کھا کر پھٹ گیا تھا خون کی بوندیں اس کی تھوڑی پر سے پھسل رہی تھیں۔

وہ سبے ہوش، بے سندھ تھی۔

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ وہ یونہی ہار مان لیا کرتی تھی۔
”اب جلدی سے فریش ہوں۔ میں بھی پیٹینج کر لیتا ہوں۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“
وہ مصروف انداز میں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

”مجھے آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔“ ربیعہ متفکری ہوئی۔ ”انہی کو ملاؤں؟“
”نہیں۔“ وہ فوراً بولیں۔ ”کسی سے کچھ مت کہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کھانا لگا دو۔ بچے بھوکے ہیں۔“

ربیعہ ان کے پاس سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن ان کا دل ٹوک انداز دیکھ کر وہ کچن میں چلی آئی۔
تمام ڈشز ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا کر ان لوگوں کو ٹیبل پر آنے کا کہہ کر وہ پھر منیجر بیگم کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ
آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے سر نکالے بیٹھی تھیں۔

”امی جی۔“ ربیعہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”کھانا کھا لیجئے۔“
”مجھے بھوک نہیں ہے ربیعہ۔“ وہ روٹی روٹی سی آواز میں بولیں۔
”آپ وہاں کھانا نہیں کھائیں گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔“ ربیعہ بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے ان کے بعد میں کھالیں گے۔ ”پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر ربیعہ کو دیکھا۔ سنو ربیعہ۔
ان لوگوں کے جانے کے بعد ربیعہ عباد سے پوچھنا۔“
وہ رک گئی تھیں۔ ربیعہ نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”جی۔ جی امی۔ کیا پوچھوں؟“
”شہریار احمد کے والد کا کیا نام ہے۔“ وہ ٹکڑی ٹکڑی میں بولیں۔
ربیعہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

ماہین کے کہنے پر وہ عرشہ کا چیک اپ کر رہی تھی۔ بجائے کیوں اس کا نچلا ہونٹ زخمی تھا۔ اس کے پوٹے
تورم تھے اور اسے ہلکا مپیر پیر تھا۔
”کیا گر گئی تھیں؟“ اس نے ہونٹ کو انگلی سے چھوئے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”جی! وہ آہستہ سے بولی۔ ”گر گئی تھی۔“
”کہاں سے؟“
عرشہ نے نظر اٹھا کر شہلا کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔ شہلا کو اپنی شادی کے روز سے اب تک کبھی اس
لڑکی کی سمجھ نہ آ سکی تھی۔ ہر وقت چہرے پر ایک تاؤ اور انداز میں ایک سوگ کی کیفیت لیے۔ اس لڑکی کو اتنی سی
غمزینوں کے دکھ لائق تھے اسے کبھی علم نہ ہوسکا۔

ماہین زیادہ تر اپنے سرال میں ہی رہتی تھی۔ شادو نادر ہی دیکھے میں نظر آتی تھی۔ اس کے سرال والے ان
معاملات میں کافی سخت تھے پھر بھی شہلا عرشہ کی نسبت ماہین سے زیادہ قریب تھی۔ عرشہ سے تو اکثر ایک نامحسوس
ساخت آتا تھا۔

”کچھ گولیاں لکھ رہی ہوں۔“ اس نے سانس بھر کر ماہین کو دیکھا۔ ”اسی تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔
ہلکا سا بخار ہے۔ آنکھیں بتا رہی ہیں کہ۔۔۔ روٹی رہی ہے۔ یا پھر موسم کا اثر ہے۔ میں نے پر سکون نیند کے لیے
ٹیبلیٹ لکھ دی ہے۔ ہونٹ پر لگانے کے لیے ایک مرہم بھی لکھا ہے۔“

اس نے نسخہ ماہین کو تھمایا۔
”میں ابھی حنزو سے منگو آتی ہوں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔
شہلا نے مسکرا کر عرشہ کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو عباد صوفے سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔
”میرا خیال ہے وہی لوگ ہیں منیجر بیگم سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے انہیں۔ ربیعہ نے بھی ان کی تقلید
کی تھی۔“

عباد کی رہنمائی میں وہ دونوں اندر آئے تھے۔ ایک امیر حسن تھا اور دوسرا وہی نوجوان تھا جس کی تصویر ربیعہ نے
امیر حسن کے آفس میں دیکھی تھی۔
ایک مرتبہ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے قلم سی گئی تھی۔ وہ چہرہ اتنا ہی مقناطیسی اور پرکشش تھا جتنا وہ لوگوں کا

تعارف کروا رہا تھا۔
”امی۔ ان سے ملے۔ شہریار احمد! امیر حسن کے کزن بھی ہیں اور بہت اچھے دوست بھی۔“
”اور بزنس پارٹنر بھی۔“ امیر حسن مسکینی سے گویا ہوا۔ ”ہر چند کہ شہریار احمد سے چند برس چھوٹا ہے لیکن اس کا
ذہن کئی مقامات پر مجھ سے بہت تیز چلتا ہے۔“

شہریار مسکراتا ہوا منیجر بیگم کے سامنے ذرا سا جھکا تھا۔ منیجر بیگم بے حس و حرکت سی کھڑی رہیں۔
”امی جی۔“ عباد نے انہیں پکارا۔ تب وہ چونکیں۔
”جیتے رہو بیٹا! انہوں نے شہریار کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”اللہ عز و جل ان کو محفوظ فرمائے۔“

”امی جی۔ ہمیں بھی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ امیر حسن متفکری سے بولے۔ ”منیجر بیگم نے اسے بھی
پیارا دیا۔ پھر عباد نے شہریار کا تعارف ربیعہ سے بھی کروایا تھا۔ ربیعہ اسی کیفیت کا شکار تھی۔ وہ چہرہ ایک خاص
کشش کا حامل کیوں تھا؟ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

عباد ان دونوں کو ذرا تنگ روم میں لے گیا۔ ربیعہ منیجر بیگم کی جانب متوجہ ہوئی۔
”امی۔ آپ بھی چلیں اندر۔ میں تب تک کھانا لگاتی ہوں۔ کافی لیٹ ہو گیا ہے۔“ پھر اس نے رک کر منیجر
بیگم کو غور سے دیکھا وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں۔

”امی جی۔“ ربیعہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
”آل۔“ وہ چونکی۔
”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ربیعہ ان کا نہایت زور دیکھ کر ڈر گئی۔

”میری طبیعت؟“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔ ”یہ یہ لڑکا۔ کون ہے ربیعہ؟“
”یہ شہریار احمد ہیں۔ ابھی عباد بھائی نے آپ سے متعارف تو کروایا ہے نا۔ امیر حسن صاحب کے کزن اور
بزنس پارٹنر ہیں۔ عباد بھائی سے بزنس سے متعلق معاملات ہی تو طے کرنے آئے ہیں۔“

”یہ کہاں سے آیا ہے؟“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔
ربیعہ کو عجیب پریشانی نے آگھیرا۔ شہریار احمد میں آخر ایسی کون سی بات تھی جو ہر شخص کو ڈسٹرب کرتی تھی۔
”انگلینڈ سے آئے ہیں۔ اب آپ ذرا تنگ روم میں چلیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر بے شک اٹھ جائے گا۔“

”میں ادھر ہی بیٹھی ہوں ربیعہ۔“ وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ربیعہ ان کا نہایت زور دیکھ کر ڈر گئی۔
”میری طبیعت؟“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔ ”یہ یہ لڑکا۔ کون ہے ربیعہ؟“
”یہ شہریار احمد ہیں۔ ابھی عباد بھائی نے آپ سے متعارف تو کروایا ہے نا۔ امیر حسن صاحب کے کزن اور
بزنس پارٹنر ہیں۔ عباد بھائی سے بزنس سے متعلق معاملات ہی تو طے کرنے آئے ہیں۔“

”میں اپنے کمرے میں ہوں۔ ہاشم آجائیں تو کھانا لگاؤں گی۔ پھر سب اکٹھے مل کر کھانا کھائیں گے۔“ ٹھیک ہے نا۔“

ماہین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ عریضہ نے آنکھیں موند لی تھیں۔ شہلا باہر نکل آئی، بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے مخصوص رنگ سنائی دینے لگی تھی۔ کمرے میں اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ شہلا نے رفتار تیز کر دی اور لپک جھپک کمرے میں چلی آئی۔

آنے والی کال کا نمبر دیکھ کر وہ ٹھٹھکی تھی۔ پھر گہری سانس بھر کر اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“ وہ محتاط انداز میں بولی۔

”دوسری جانب عمر تھا۔“ ”مما۔ السلام علیکم۔“ ”وہ اسے چونے کے لیے بے تاب ہو گئی۔“ ”ٹیک ہے میرا جانو بیٹا۔ میری زندگی!“

”آئی ایم فائن۔“ ”مما۔ آپ کیسی ہیں۔؟“ ”میں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹا۔ آپ اس ویک اینڈ پر مماسے ملنے نہیں آئے۔“ ”ماہین نے بے ہوشی سے کہا۔“

”کوئی بات تھو۔ کسی تبرک کی طرح تھا، وہ تھا۔“ الفاظ بے تالی سے۔ لبوں سے ٹوٹ پڑتے تھے۔ ”بس۔ مماسے اس مرتبہ میں اور پچاس گاؤں چلے گئے تھے۔ آپ نے دیکھا ہے؟ پچاس گاؤں؟ پچاس ہزار ہے تھے کہ آپ بھی ادھر جا چکی ہیں۔ پچاس نے مجھے وہ کمرہ بھی دکھایا۔ جس میں آپ رہتی تھیں۔ مجھے وہ کمرہ بہت اچھا لگا۔ مماسے میں جب اس بستر پر سویا تو مجھے بہت اچھی نیند آئی۔ وہاں مزہ آیا۔ مماسے میں نے تو فرسٹ ٹائم گاؤں دیکھا۔ بہت اچھا لگا۔“

شہلا کی لبوں پر دھیمی افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا بیٹا شاید بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گفتگو میں ایک نمبر اوسا محسوس ہوتا تھا۔ اس بچکانہ پن میں واضح کمی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بچہ کی طرح ہنس مچھکے کی شخصیت کا حصہ تھی۔ ثانی اور خلاؤں سے کمائیاں سننے سننے سے سوجانے والا بچہ اب اسے اپنے لیے غریب کا تصور نہ لگا تھا۔

”آپ کو ممایا د آئیں؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”جی مماسے بہت یاد آئیں۔ آپ، نانو، عبادا ماموں، ربیعہ، خالہ۔“ ”مما نے سب کو بس کیا۔ پھر بھی میں نے بہت انجوائے کیا۔“

شہلا کی پلکوں پر کئی چپکنے لگی تھیں۔ اس کا بیٹا زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ ”اور آپ کی پڑھائی۔ اسکولنگ۔ وہ سب؟“ اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”پچاس نے مجھے بہت اچھے ٹیوٹر رکھ دیے ہیں۔ مماسے بہت جیٹس ہیں میرے سر۔“ ”ماہین نے کچھ تاج پھیرا۔“ ”خالہ خالہ بھی ان جیسا نہیں پڑھا سکتیں۔ پتہ ہے مماسے اس مرتبہ شیڈول ٹیسٹ میں میرے مارکس پوری ٹاس میں سب سے زیادہ ہیں۔ پچاس بھی خوش ہوئے۔ مجھے گفت بھی دیا ہے انہوں نے۔“

”اچھا!“ ”جی!“ ”مما۔“ ”جی۔“

”آپ کب تک آرہی ہیں یہاں؟“ ”عمر کے انداز میں قدرے تہذیبی آئی جیسے کوئی اسے کچھ سننے پر آمادہ کر رہا تھا۔“

”میں؟ میں وہاں کیوں آؤں گی عمر؟ وہ صرف آپ کا گھر ہے۔ میرا نہیں۔ میرا گھر یہ ہے جہاں میں رہتی ہوں۔ آپ کے ہاشم انکل کا گھر یہاں بہت خوش ہوں۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہو۔ زندگی جینے لگے ہو۔ انجوائے

کرنے لگے ہو۔ آپ۔ آپ۔ آپ۔“ الفاظ اس کے گلے میں چھننے لگے۔ ”تھ۔“ ”آپ مماکو کم یاد کیا کرو۔ بس کبھی کبھی۔ بہت دل چاہے تو ملے آجایا کرو۔ لیکن بیٹا ایسی بات مت کہو جسے پورا کرنا آپ کی مماسے بس میں نہ ہو۔“

”مماسے۔ آپ میرے بغیر بھی خوش ہیں؟“ ”وہ آزرہ سا ہو گیا تھا۔“

”نہیں۔ آپ کے بغیر کیوں۔ آپ تو اپنی مماسے کی جان میں اترے ہوئے ہو۔ ہر وقت ہر مل آپ کو یاد کر کے مماسے دل دھڑکتا ہے جیتا ہے لیکن بیٹا! ہمارے درمیان یہ جتنا فاصلہ ہے اب اہل ہے۔ اسے کم کرنا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ میرے۔ اب ہمیں اتنا فاصلہ رکھ کر اسے برداشت کر کے جینا ہے۔ سمجھے نا آپ؟“

دوسری جانب سے کوئی جواب نہ دیا گیا تھا۔ شہلا کو یکایک ہی احساس ہوا کہ فون عمر کے ہاتھ سے لے لیا گیا تھا۔ اس کی باتیں کوئی اور سن رہا تھا۔

”عمر کا خیال رکھنا بہت زیادہ ہے۔ ہمیشہ۔“ ”وہ بولی پھر اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔“

عباد نے کمرے کے اندر جھانکا تو بیٹہ منیوہ بیگم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گردن جھما کر عباد کی جانب دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چائے بنا دوں عباد بھائی؟“

”تم لوگوں نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“ ”وہ اندر چلا آیا۔“ ”ای کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ”نہیں۔ میں اسی کو اچانک ہی کیا ہوا تھا۔“ ”ربیعہ۔“ ”مما نے بتا دیا تھا۔“ ”ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا پی پی کو ہو گیا ہو۔ میں نے بہت کما کہ میں ان کو جگادیتی ہوں۔ لیکن نہیں مانیں۔ ای بہت ضدی ہو گئی ہیں عباد بھائی۔“ ”میرا تو بالکل نہیں مانیں۔“

عباد ماں کے قریب بیٹھ گیا اور پرتشویش نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ منیوہ بیگم دوائی کے زیر اثر سکون کی نیند سو رہی تھیں۔

”ربیعہ! تم ای کا اتنا خیال رکھتی ہو۔“ ”عباد کو اس کا خیال آیا۔“ ”میں چاہوں بھی تو تمہاری خدمتوں کا۔“ ”عباد بھائی پلینر۔ آپ نے ایک لفظ بھی مزید کہا تو میں۔“ ”وہ دہانسی ہو گئی۔“ ”آپ۔ آپ کیوں نہیں بھول جاتے کہ میں اس گھر کا حصہ نہیں ہوں۔“

”ربیعہ۔“ ”وہ ملازمت سے بولا۔“ ”تم میری سگی بہن بھی ہو تیں تب بھی میں ان ہی الفاظ میں اسی طرح تمہارا شکر گزار ہوتا۔ تم نے اپنی ناتواں ہستی پر اس گھر کے سب ہی بار بہت سہولت سے اٹھالے ہیں۔ اب دیکھو! انہیہ صرف پڑھائی سے تھک کر کیسی بے فکری سے سوئی پڑی ہے اور تم۔ تم صبح سے کچن میں کچھ موصوف تھیں۔

ای کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھیں اور اب بھی بے تکان ان کی خدمت کر رہی ہو۔ مجھے خیال آتا ہے ربیعہ۔ کہ ہم نے تم پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہوا ہے۔ تم کچھ کہتی بھی نہیں؟“

ربیعہ سادگی سے مسکرا دی۔

”یہ سب آپ کو محسوس ہو رہا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پُر سکون پُر عافیت چھت کے نیچے ہونے کا احساس اتنا قوی ہے کہ چھوٹے موٹے کاموں کی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ سب کی محبتوں نے اتنی آسودگی بخشی ہے عباد بھائی کہ کسی قسم کی تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔“

”تم اتنی زیادہ اچھی ہو تب ہی۔“ ”وہ پرتشقت سے انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔“

لڑکی کچھ خوبصورت ہے۔ تو بی! چاند بھی سیاہ آسمان پر ہی چمکتا ہے۔ سامنے سورج آجائے تو ماند پڑ جاتا ہے اور پھر شکل ہی شکل ہے۔ وہ تمہاری سگی بہن تو نہیں۔ نجانے کہاں سے ٹپکی بن بادل برسات کی مانند اور پھر ایسی جی کہ بٹنے کا نام نہیں لیا۔ برامت ماننا مگر ایسی لڑکیوں کے لیے رشتہ دینا بھی جگر والوں کا کام ہے۔ حوصلہ چاہیے بے نام کی بی بی کو اپنانے کے لیے۔

”تو آپ سے کس نے کہا یہ کار خیر کرنے کے لیے۔“ شہلا غم و غصے میں حفظ مراتب بھلا بیٹھی۔ ”ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی کے لیے وہ آپ کے نکھوٹن رسیدہ بھائی ہی رہ گئے ہیں؟ اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو آپ بہت غلط رخ پر سوچنے کی عادی ہیں۔ ربیعہ میری سگی بہن نہ سہی لیکن سگی بہنوں سے بروہ کر پاری ہے۔ شہلا میرا بھائی اگر اسے بہن نہ ماننا ہو تو اسے کسی باہر کے رشتے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور آج تو آپ نے یہ بات کہہ دی۔ آئندہ میں ربیعہ کا نام کسی ایرے غیرے کے ساتھ لینے پر حشر مچا دوں گی۔“

شہلا کے ہاتھ پیر غصے سے بری طرح کانپ رہے تھے۔ فردوس بیگم نکر نکر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے بے حد اطمینان سے اپنے اندر اس کے سامنے اس طرح پیش کیا تھا جیسے طوعاً و کرہاً ”شہلا کو یہ رشتہ منظور کرنا ہی ہو گا لیکن شہلا کی جانب سے جو رد عمل آیا تھا اس نے انہیں شذر کر دیا تھا۔“

”یہ تم کس طریق سے مخاطب ہو، ہم سے؟“ انہوں نے واویلہ بچانے کے انداز میں کہا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔“ وہ روکھے انداز میں بولی۔ ”لیکن آپ کی بات اتنی ہی غلط تھی۔ اپنے بھائی کے متعلق میں کم اور آپ خود زیادہ جانتی ہیں۔ درست فرمایا آپ نے کہ وہ سیاہ رات کی مانند ہیں۔ ایسی سیاہ راتوں کے لیے کوئی چاند نہیں ہوتا۔ بہن مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔“

وہ انہیں گہری چوٹی پر ہنسی سے دیکھتا تھا۔ ”ان کے دل کے قریب اگر بیٹھی تھی تاکہ دلوں کے فاصلے کسی طور کم ہوں لیکن انہوں نے آخر میاں کے لیے ربیعہ کا ہاتھ طلب کر کے اسے شذر اور سخت خفا کر دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، ہم اپنے بیٹے سے بات کر س گے۔ وہ خود سسرال میں یہ معاملہ اٹھائے گا۔“ وہ پیچھے سے بولیں۔

”اے ہاں جب خود ایک بیٹے کا دم چھلا لگا کر ہمارے گوارے جوان بیٹے کے ساتھ چلی آئی تھیں تب یہ فرق انہیں نظر نہیں آئے۔ اب آنکھوں میں چھڑ رہے ہیں۔“

وہ از حد جل کر بولی تھیں۔ شہلا نے خود پر انتہا درجے کا ضبط کیا اور ایک سانس میں بقیہ سیڑھیاں چڑھ کر چند قدم فردوس بیگم جلتی پر رہائی پر عیشہ کے کمرے کی سمت بڑھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔

”خیریت؟“ اس نے ماں کے بڑے تیور ملاحظہ کیے۔

”ایک دوسری خیریت۔ ایسے گھر کو جی چاہتا ہے آگ لگا دیں، جہاں ایسے جی کو جلانے والے نے۔“

”نے ایک خونخوار نظر عیشہ پر بھی ڈالی تھی۔“

”کیا ہوا؟“ ماہین بے زار سے انداز میں بولی۔

”تمہاری بہن بیٹی بیگم کے پاس سے آرہے ہیں ابھی۔ واہ وا۔۔۔ خوب اونچے گھرانے کی ہیں۔ تانے والی اس میں جیسا حقیر جانتی ہیں۔“

”شہلا بھائی؟“ ماہین نے بے اعتبار نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہاں دبی، طرم خاں ولد رستم خاں۔ اے میں نے ایسا کیا کہہ ڈالا جو بلند ہی اٹھیں۔ جان بچا کے کہنے کا ویرہ شاید مجھ کو بھی ڈالتیں ہاں۔“

”تب ہی۔“ اس نے دلچسپی سے عباد کو دیکھا۔ ”تب ہی کیا؟“

”تب ہی سب کو اچھی لگتی ہو۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”ربیعہ! آئی فیل کنسے۔“

وہ کچھ کہتے کہتے جھجک کر پھر سے رک گیا تھا۔ ربیعہ کو حیرت ہوئی۔

”کہہ بھی چکیں۔ یہ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں آپ؟“

”آئی فیل کہ مسٹر امیر حسن! تم میں انٹر سٹڈ ہو رہے ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”انہوں نے اتنی بار تمہارا پوچھا کہ میں حیرت زدہ اور وہ خود شرمندہ ہو گئے۔ تمہارے بنائے ہوئے کھانے انہوں نے اس قدر ذوق و شوق سے کھائے اور اتنی زیادہ تحریف کی کہ میرا جی چاہ رہا تھا باقی ماندہ کھانا بیک کر کے ان کے ہمراہ کر دوں۔“

ربیعہ عباد کے منہ سے ایسی باتیں سن کر شرم سے سرخ پڑ گئی۔ اس سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”ربیعہ! ہی از سونا کس کہ میں تم سے یہ ٹاپک ڈس کس کیے بغیر رہ نہ سکا۔“ عباد بولا۔ ”آئی ایم شیور کہ وہ چند ایک روز میں ضرور تمہارے لیے اپنا ہاتھ برھائیں گے اس لیے میں پہلے تم سے تمہاری بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بولور ربیعہ! ایسی صورت حال میں تمہارا جواب کیا ہو گا؟“

”مجھے نہیں پتا عباد بھائی! ربیعہ بے طرح گھبرا گئی۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے پلیز۔“

”مجھے بڑا بھائی سمجھتی ہو تو اتنے بچوں کی طرح بات کرو۔ ایسی باتیں نہیں اپنی آزاد رائے استعمال کرنے کا حق ہمیں ہمارے مذہب نے دیا ہے ربیعہ!“

اسی لمحے منیزہ بیگم نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”امی جی! عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔“ آپ ٹھیک ہیں نا۔“

”وہ لوگ سدا لڑکا۔“ وہ جیسے خواب میں بولی تھیں۔

”کون لوگ؟“ عباد کچھ نہ سمجھا۔ ”کون لڑکا؟“

”امی شہریار احمد کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔“ ربیعہ نے اپنے بتایا۔

”جی ہاں وہ جا چکے ہیں۔ کھانے پر آپ لوگوں کا بار بار پوچھ رہے تھے لیکن آپ کا شاید بی بی لو ہو گیا تھا۔ ربیعہ نے منڈھسن دے کر آپ کو سلا دیا تھا۔“ عباد ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نرمی سے بتانے لگا۔

”مجھے اس لڑکے کے باپ کا نام بتاؤ۔“ انہوں نے بچوں کی طرح عباد کا چہرہ دیکھا۔

”اس کے والد کا نام۔“ عباد سوچنے لگا۔ ”وہ یو کے میں ہوتے ہیں۔ بہت پیار ہیں۔ پیرالا نز ہیں بے چارے۔ میرا خیال ہے۔ ہاں یاد آیا۔ احمد جہاں زیب ہے ان کا نام۔“

”احمد جہاں زیب۔“ منیزہ بیگم کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا تھا۔ ”احمد جہاں زیب۔“

ربیعہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیسا عجیب اتفاق تھا؟ اس کے والد کا نام بھی تو احمد جہاں زیب ہی تھا۔

شہلا نے از حد حیرانی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس بیگم کو دیکھا۔

”یہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”اسے کچھ بہت اٹو کھا بول دیا ہم نے؟“ انہوں نے نظریں چراتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولنے کی کوشش کی تھی۔ ”وہ ستور ہے دنیا کا۔ لڑکے والے لڑکی کا ہاتھ مانتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ اخترمیاں کے مقابلے میں

”ای! ماہین دکھ سے بولی۔ ”کاش“ آپ نے سمجھا ہوتا کہ بیٹیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ان کے جذبات آئینوں کی مانند ہوتے ہیں ان کے تصورات میں سچی دنیا اتنی اہم ہوتی ہے کہ باقی ہر معاملہ غیر اہم ہو جاتا ہے لیکن افسوس آپ جیسے ماں باپ اولاد کو موم کی ٹاک سمجھتے ہیں اور اسی طرح موڑتے ہیں اپنے فیصلوں کے مطابق۔ نتیجہ اس صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔“ اس نے عریشہ کی جانب اشارہ کیا جس کی بند پیلوں پر موتی کرزنے لگے تھے اور ہونٹ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”کون سی گولی ماری ہم نے اسے؟“ وہ ابرو چڑھا کر پوچھنے لگیں۔ ”جو اس کا نصیب تھا اسے مل گیا۔ اب جا کر لڑے خدا سے نصیب تو وہی لکھتا ہے۔“

”درست لیکن ای! جی! اولاد کو اعتماد میں لے کر فیصلے کیے جائیں تو ایسی غلط فہمیاں کبھی نہیں ہوتیں۔ یہ کیا کہ فرد جرم پڑھ کر سنا لی اور مزا دے ڈالی۔ مجھے سخت افسوس ہوتا ہے اسے یوں کڑھتا دیکھ کر۔ نفسیاتی مریض بن گئی ہے یہ۔“

”فردوس جی! بیگم جینے ہی ہو گئیں۔ کچھ دیر تو وہ انہوں نے عریشہ کا چہرہ دیکھا۔ ”کیا بہت برا لگتا ہے آئینے پر؟“ پھر انہوں نے سرگوشی میں ماہین سے دریافت کیا۔

ماہین نے سانس بھر کر اپنی نا سمجھتائی کو دیکھا۔ ”ضروری نہیں کہ اسے نافع پائند ہو۔ کچھ بے چارے تو ایک اچھا سلجھا ہوا سیدھا سا انسان ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اسے کوئی اور پسند ہو۔“

”ہائیں۔“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”بہت خوب پھر جاؤ گی ہمیں اپنی پسند۔“

”کاش“ ان کے اعتماد ہمارے والدین اپنی اولاد کو دے سکیں۔“

وہ مومن اور ایمان کے دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے رکھنے کے لیے ان کے کمرے میں آئی تھی تب ہی وہ دروازے میں ہی ٹھنک کر رک گئی۔

مومن کان سے موبائل فون لگائے کچلے کچلے سے محو گفتگو تھا۔ دھیمی آواز میں وہ کیا باتیں کر رہا تھا ایتان کے لیے سننا ممکن نہ تھا۔ تب ہی اس نے اپنے ڈرائیو گروں موز کرماں کو دیکھا اور جلدی سے فون آف کر دیا۔ ایتان چند قدم آگے بڑھ کر آئی۔

”کس کا فون ہے تمہارے پاس؟“ وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ ”اور۔ اور کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

”اپنے دوست سے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”یہ موبائل کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔

”رافع بھائی نے دیا ہے۔“ وہ متامل ہو کر بولا۔

”رافع نے؟ لیکن کیوں؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”میں نے ان سے کہا تھا مجھے سیل فون کا شوق ہے انہوں نے مجھے گفٹ کر دیا۔ بس آپ کو بتانے والی اس میں کون سی بات ہے؟“

”مومن!“ اس نے تاسف سے بیٹے کو دیکھا۔ ”تم۔ تم روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہو۔ بڑے ہونے کا مطلب سرکش ہونا نہیں ہوتا۔“

”خدا کے لیے ای! ماہین نزع ہوئی۔“ کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کریں۔ شہلا بھابھی جیسی شائستہ خاتون سے کسی برے سلوک کی میں تو توقع نہیں کر سکتی۔“

”شرم کرو۔“ وہ اس پر الٹ پڑیں۔ ”ماں کو جھوٹا بتاتی ہو؟“

”معاملہ کیا ہے آخر؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔

پھر ساری بات سن کر اس کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو شہلا کی تھی۔

”غضب خدا کا۔ یہ بات کہتے ذرا لحاظ نہ کیا آپ نے؟“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”کہاں اختراموں کہاں وہ پھولوں سی لڑکی۔ ای! جان! آپ نے تو حد ہی کر دی۔ میری بہن کے لیے کوئی ایسے شخص کا رشتہ پیش کرنا تو میں نجانے کیا حال کرتی اس کا۔ کچھ تو سوچا ہوتا آپ نے۔“

”اے بی! یہ دیکھو۔“ انہوں نے پھٹ سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”یہ دیکھو۔“ پھر انہوں نے اپنے کان پکڑ کر کھینچے۔

”اب بولو تو ناک سے سولیکس کھینچیں۔ ارے بہن ہوں بہن۔ اس مردار کی۔ کچھ دیکھو تو آتا ہے اس کی حالت دیکھ کر۔ کیا یونہی رلتے رلتے مرجانے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے وہ۔“

”تو ای! جی! ان کے حساب سے بھی تو رشتہ دیکھا اور دعوے کا جاسکتا ہے۔ لانا بہن نرم پڑی۔“

”وہ جو مرا جا رہا ہے اس کم سن حسینہ کے عشق میں پھر ہم کیا کریں؟“

”کون اختراموں؟“ ماہین گنگ ہو گئی۔

”اور کون۔ ایک بار یونہی ہم نے ذکر کر دیا۔ وہ تو میرے بھائی ہو گیا۔ روز صبح صبح اپنا میلا منہ لے کر سامنے آ بیٹھا ہے۔ ہاتھ پیر جوڑتا ہے پھر ذکر کرتے شہلا سے تو اور کیا کر لیتے۔“

”اختراموں یا گل ہو گئے ہیں۔“ ماہین خفا ہوئی۔ ”ان کے کو مانع کا علاج ہونا چاہیے۔“

”اے اب تم کوس لو اس بد بخت کو۔“ انہیں برا لگا۔ ”ماہین نہ ہوا اگلے کا سودا لی ہو گیا۔ ارے بھلا چنگا ہے سلامت ہاتھ پیروں کا ہے نوکری نہیں کرتا تو کیا ہوا؟ ہم اس کے سر پرست ہیں اسے پال رہے ہیں اس کی آل کو بھی پال لیں گے۔ ہم تو اپنی محبت سے مجبور ہیں۔“

”دھلیس کسی سے تو محبت کا دعوا ہے آپ کو۔“ ماہین قدرے ناگوار لڑی سے بولی۔ ”اختراموں تو بہت خوش ہے۔“

”اس نے اپنے سے فردوس بیگم کا منہ کھل گیا۔“ یعنی ہم سب سے نفرت کرتے ہیں۔ بی! کون سی برائی چارے۔ میرا ذہن۔“

”احمد جمال نش۔“ ماہین نے ترشی سے کہتے ہوئے عریشہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ”دیکھیں اس کی اس حالت ربیحہ اپنی جگہ کون ہے ذمہ دار اس کا۔“

”ظہیران سے گویا ہوئیں۔“ اس کا غصہ اس کی بے جا ضد۔ ہمارے سرکس بات کا الزام لگاتی ہو

شہلا نے از حد یہ ضدی ہے غصہ دہے لیکن ماں باپ کا اور خصوصاً ”ماں کا فرض بنتا ہے کہ وہ ہر بچے کو اس کی نیکی سے آ رہے ٹریٹ کرے۔ آپ نے اپنے ہر بچے کو صرف اپنی طبیعت اور عادت کے حساب سے ٹریٹ کیا ہے۔“

”کی تھی۔ کیا ٹریٹ کیا ہم نے؟ ہمیں بھی بتاؤ؟“ وہ غصے سے بولیں۔ ”یہ ٹریٹ درمٹ کے ناز خرنے نہ کسی نے اٹھائے نہ ہم کسی کے اٹھانے والے ہیں۔“

وہ مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر مزید سرکشی سے بولا۔

”آپ کا بیٹا ہوں نا“ آپ پر ہی گیا ہوں۔“

ایقان کے قریب سے نکل کر وہ باہر چلا گیا۔ ایقان اپنی جگہ جیسے جم کر رہی رہ گئی تھی۔ حیرت، دکھ، تاسف اور غم غصے سے اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔

بو جھل قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مومن کی الماری کھولی اور اس کے کپڑے رکھ کر ان ہی قدموں سے واپس چلی آئی۔ اچانک ہی وہ رکی۔

لاؤنج کے بیرونی دروازے پر اخترمیاں کھڑے تھے۔ ایقان کا دل مزید غمگین ہوا۔

”تشریف لائیے۔“ وہ قدرے طنز سے آہستگی سے گویا ہوئی۔

وہ چند قدم آگے بڑھ آئے۔

”کہاں تھے آپ، پچھلے کئی روز سے نظر ہی نہیں آئے۔“ وہ آہستہ آہستہ بول کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم۔۔۔ ایقان بیگم! آپ سے معذرت کرنے آئے ہیں۔“ اخترمیاں قدرے بے مروت سے انداز میں دفعنا بولے۔

”معذرت؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”کس بات کی؟“

”ہم اس روز یونہی بڑا روٹی میں آپ سے وعدہ کر بیٹھے۔ ہم اپنا وعدہ وفانہ کر سکیں گے۔“

وہ کان کھجائے ہوئے بولے۔ ایقان نے حیرت سے پوری آنکھیں پھاڑ کر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”وہ اصل کچا بھی بیگم نے ہمارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔“ وہ دانت نکوس کر بولے۔ اور ہمیں وہ سمندر

پری جی جان بھیج رہے ہیں۔ ہم نے سوچا آپ ہادی آسٹریلیا میں رہ جائیں۔ اس دن کئی خیال میں جانے آپ سے کیا کرنا چاہیے۔“

ایقان کو ایسا لگا جیسے پورے سمندر کا پانی اس کے سر پر سے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ذلت اور تحقیر کے احساس

سے وہ پوری کانپنے لگی۔

”تم۔۔۔ تم گھٹیا۔۔۔ تم۔۔۔ ایک نظر کرم سے خود کو کوئی دیوتا خیال کر بیٹھے۔“ وہ دانت پیستے، مٹھیاں بھینچتے ہوئے

آگے بڑھی۔ اخترمیاں ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں۔

”ہمیں گالی مت دیں ایقان بیگم! ہم تو اپنا حق استعمال کر رہے ہیں۔ برسوں پہلے آپ نے بھی تو اپنا حق استعمال

کیا تھا۔ آپ اگر بھول گئی ہوں تو ہم نہیں بھولے۔“

ایقان نے جھک کر میز پر رکھی ایش ٹرے اٹھائی اور زور سے انہیں کھینچ ماری۔

”تم صرف اپنی اوقات بھلا بیٹھے ہو، زمینی کیڑے۔“

اخترمیاں اچھل کر ایک طرف ہوئے تھے۔ ایش ٹرے کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی گری۔

”تم سمجھے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔“ ایقان نے اب ایمان کا کھلوٹا بس اٹھایا تھا اس بار وہ

اخترمیاں کے سر میں جا لگا۔

”تمہارے جیسے کہنے کے لیے اپنی اوقات دکھانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔“

اخترمیاں پورے لاؤنج میں ناچتے پھر رہے تھے۔ ہمیشہ طاری رہنے والی حالت نشہ ہرن ہو گئی تھی۔ اخترمیاں

خود بھی ہرن بنے ہوئے لمبی لمبی چھلانگیں مار رہے تھے۔

ایقان کے ہاتھ اب سبزی کاٹنے والی چھری لگ چکی تھی۔ اخترمیاں یہ خطرناک نظارہ دیکھ کر زور زور سے

چلانے لگے۔

”تمہارے جیسے عاشقانِ دل کے لیے ایک ہی سیدر پری ہے۔ موت۔“ وہ دیوانوں کی طرح ان پر چبھی۔
”دفعاً“ وہ پوری کی پوری کسی کے شکم میں آگئی تھی وہ رافع تھا۔

”پچھو۔ پچھو کیا دیوانگی ہے یہ۔“ وہ اس کا چھری والا ہاتھ قابو میں کیے ہوئے تھا۔

”چھوڑو۔ میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے۔ اس کینے کو نہیں چھوڑوں گی میں۔ حساب برابر کرنے آیا ہے کتا۔

میں اس کے سارے حساب برابر کیے دیتی ہوں۔“

آخر میاں جان بچا کر بڑی مشکلوں سے نکل پائے تھے۔ رافع کو پھری شیرنی کو قابو کرنا مشکل لگ رہا تھا پھر دفعاً
ای وہ بالکل ہی بے حس و حرکت ہو کر رافع کے بازوؤں میں جھول گئی۔

”شدید منٹل شک۔“ ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا۔ ”یہ خوش قسمت ہیں جو اپنے حواسوں پر قائم رہیں اور نہ ان کی

کی باغی حالت بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن پر کوئی بڑا صدمہ برداشت کیا ہے۔“

”یہ صرف اپنی ضد سے لڑ رہی ہیں ڈاکٹر صاحب! اپنی شدید محبت کی نفی کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔“

رافع تاسف سے بولا۔ اس کے ساتھ ہاشم اور عذرا بیگم بھی ہاسپٹل میں موجود تھے۔

”آج رات یہ ہاسپٹل میں ہی گزاریں گی۔ اندر آبرو دینے کی کوشش آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔ ہاشم سینے پر بازو پیٹے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ کسی

گہری سوچ میں مغموم ہوتا تھا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔

”پچھو نہیں مانیں گی رافع! ہمیں ہی کوئی حل نکالنا ہوگا۔“

”دیکھتے ہیں۔ ابھی تو۔ ابھی تو ان کی حالت ایسی نہیں ہے۔“ ہاشم نے کہا۔

عذرا بیگم نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تھی۔

”ہاشم! رافع نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم بچوں! سلام آباد جا رہے ہو نا؟“

”ہوں! دون دن کا وزٹ ہے۔“

”پچھو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ آفس کے کاموں سے فرصت ملے تو انہیں مری اور بھورن لے جانا۔“

”پچھو کو۔“ ہاشم متال ہوا۔ ”لیکن۔۔۔“

”سمجھا کرو! انہوں نے اپنا اپنی مون وہیں گزارا ہے۔ ان کی ذہنی حالت پر اچھا اثر پڑ چکا ہے۔“

”لیکن رافع یا۔۔۔ میں اور پچھو۔۔۔“ وہ گڑبڑایا۔

”تو بھابھی کو بھی ساتھ لے کر جاؤ نا۔“ رافع اس کا مدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ”دون دن کا چھوٹا سا ہنی مون تم بھی

منالو۔“

ہاشم کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرا تھا۔ اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے ویران ہوئی تھیں پھر اس نے خود پر

قابو پایا۔

”شہلا اپنی مرضی کی مالک ہے۔ پتہ نہیں وہ جانا بھی چاہے یا نہیں اور۔۔۔ اور پچھو۔۔۔ پچھو کے بارے میں

تمہیں کیا گمان ہے؟ یہ صاف انکار کر دیں گی۔“

”نہیں کریں گی۔“ رافع دھیرے سے بولا۔ ”ٹوٹ چکی ہیں اندر سے اپنی کرجیاں سمیٹنے کے لیے انہیں بھی ستر

در کار ہے۔ تم اپنی کو۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر شہلا اور ایقان پچھو راضی ہوں تو میں ان کے ٹکٹس بھی کنفرم کروالیتا

ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم ٹکٹس کنفرم کروالو۔ شہلا بھالی نے اگر انکار کیا تو میں خود ان سے بات کر لوں گا۔ رہے

ایمان اور مومن تو وہ امی کے ساتھ دو دن گزار لیں گے۔“ اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں بالکل۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایقان کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔“ ہاشم نے

دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

منیوہ بیگم کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ عباد اور انقدا انہیں اسپتال لے گئے۔ ربیعہ پریشانی کے عالم میں گھری ان

کی صحبت کے لیے دیوانگی میں مانتی رہی۔

”اسے بار بار ترانہ کا خیال بھی آتا تھا۔ اس سے ملنے کا وعدہ کر کے وہ ایسی الجھنوں میں گرفتار ہوئی تھی کہ باوجود

کوشش کے چند گھنٹوں کے لیے بھی نہ جا سکی تھی۔

”نجانے ترانہ کیا سوچتی ہوگی۔ کاش ہم دونوں اتنی غلبت میں علیحدہ ہونے سے پہلے ایک دوسرے کے فون

نمبرز لی لیتے۔“

”ترانہ کے پاس عباد کا سیل نمبر تھا جس پر وہ لاہور سے ربیعہ کو چند مرتبہ فون کر چکی تھی لیکن اس روز ترانہ نے

اسے بتایا تھا کہ وہ کچھ ایسی مشکلات کا شکار رہی تھیں کہ بہت سی چیزیں اس سے مٹ ہو گئی تھیں۔

فون کی سیل بھی تو ربیعہ کی بیوی سے چاہہ نماز سے اٹھ کر فون تک گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فون ہاسپٹل سے عباد

لے کر آیا ہوگا۔“

”السلام علیکم۔“ دوسری جانب سے ٹھہری ہوئی، شکستہ آواز سنائی دی تھی۔

”السلام علیکم السلام۔ امیر حسن صاحب! کیسے ہیں آپ۔“ ربیعہ نے گہری سانس بھرے ہوئے کہا۔

”آپ کی دعاؤں سے خوش باش ہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”ہر چند کہ آپ سے کئی شکایتیں بھی ہیں۔“

”مجھ سے۔؟“ وہ متعجب ہوئی۔ ”میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں کسے کہیں۔ ایسا کیا قصور ہوا ہے مجھ

”آپ نے اس روز اتنے مزے دار کھانے کھلائے اور اس طرح کہ ہم آپ کی میزبانی کا شکریہ بھی ادا نہ

کپائے۔ کم از کم گھر آئے مہمانوں کو گیٹ تک سی آف ہی کر دیتیں۔“

”اوہ۔“ ربیعہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔ ”دراصل امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ان کے پاس

تھی۔“

”غیریت۔“ وہ چونکا۔

”عباد بھائی اور انقدا امی کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ان کی طبیعت کافی ڈاؤن ہو رہی تھی۔“

”لوہ۔ آئی سی۔ میں معذرت خواہ ہوں مجھے تو بالکل علم نہیں تھا۔ عباد بھی کمال کا انسان ہے۔ کم از کم بندہ

اتنی تو خیر خبر دیتا ہے اپنی۔ پھر پرو فیشنل ازم سے نکل کر بھی ہمارے درمیان دوستی اور خلوص کے کئی رشتے استوار

ہوئے ہیں۔ اور۔ اور۔ شاید مزید کچھ رشتے استوار ہو سکیں۔ اگر آپ چاہیں تو۔ مس ربیعہ! ”ربیعہ۔ اس کا مطلب جان کر خاموش کھڑی رہ گئی۔

”آئی ایم سوری کہ اس وقت آپ پریشانی میں ہیں آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن ایسا ہے کہ میں چند ایک روز میں یو کے جا رہا ہوں۔ پاکستان میں معاملات کوئی الوقت شہر یار ہینڈل کرے گا۔ سو جانے سے پہلے یہ معاملات خوش اسلوبی سے کسی حتمی نتیجے تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“

”ربیعہ چاہتی تھی کہ اسے اس موضوع پر مزید بات کرنے سے روک دے۔ وہ ہولے سے کھٹکھٹا رہی۔ امیر حسن اپنی جون میں تھا۔“

”مس ربیعہ! میں آپ کو اتنا بتا دوں کہ میں عباد سے پریشانی میں لے کر ہی آپ سے یہ گفتگو کر رہا ہوں۔ دراصل فرام داوریری فرسٹ ڈس۔ آپ نے۔ عجب سحر انگیزی کیفیت کا شکار کر رکھا ہے مجھے۔ پتا نہیں اس کیفیت کو کیا کہتے ہیں؟ کشش اثر انیسیت۔ یا پھر محبت! آئی ڈونٹ نوربیعہ۔ میں خود نہیں جانتا۔ میں نے کبھی آپ سے یہ بات نہیں کی تھی۔ اس طرح کہ پھر گردو پیش کا حساب کتاب نہیں رہتا۔ کبھی کبھی سخت مصروفیت کے عالم میں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ مکمل فراغت کے احساس کے ساتھ آپ سے گفتگو کی جائے۔ یا کسی اہم فائل پر کام کرتے کرتے میں نوٹ پیڈ نکال کر آپ کو اس کیج کیوں لکھنے لگتا ہوں۔ مجھے آپ کے گھر کو جاتے رستے کیوں اتنے پسند ہیں۔ آپ کے گھر کے سامنے وہ لپٹاؤ کی خالی جگہ دیکھ کر کیوں مجھے اپنا اور آپ کا خیال آتا ہے۔ کیوں ربیعہ کیوں؟ ازات لو۔“

ربیعہ ریسیور تھامے بے حس و حرکت کھڑی تھی اس کے ماتھے سے پسینہ ٹپک کر اس کی گردن میں سرسراہٹ کرنے لگا۔

”ربیعہ! اس ساری صورتحال کے بعد یہ غیر ممکن ہے۔ میں آپ سے یہ نہ پوچھوں کہ کیا آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند کریں گی؟ آپ۔ آپ شادی کریں گی مجھ سے؟“

ربیعہ نے بمشکل ٹھوک لگلا۔ گھر میں چھائے ہوئے پتھر سناٹے اور اکیلے پن کے درمیان ریسیور سے آتی ہوئی خواب ناک سی آواز اس کے دل میں کوئی ہلچل مچائے بنا اپنا مذاکرہ کر رہی تھی۔ ربیعہ کو اپنے پتھرے جذبات پر حیرت ہوئی اس نے اپنے دل کو ٹٹولا اور خوف زدہ ہو گئی۔

”ربیعہ! میں چاہتا ہوں کہ یو کے جانے سے پہلے میں اپنا مائنڈ بالکل سیٹ کر لوں ایسا ممکن ہے یا پھر ایسا ممکن نہیں ہے۔ وارنڈار آپ کی ہاں یا ناں پر ہے۔ ربیعہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ وہ خود کو ایسے بوڑھے پرستار کی طرح محسوس کر رہی تھی جہاں سے کہیں کسی اور کوئی رستہ نہیں جاتا۔

تیری ایک چپ میں جو ہے چھپی۔
وہ ہزار باتوں کی بات ہے

امیر حسن دھیرے سے ہنسا تھا۔

”شاید میں نے آپ کو کچھ زیادہ ہی ڈسٹرب کر دیا ہے۔ سو سوری ربیعہ! لیکن یہ حال دل ایسا ہے کہ ایک نہ ایک دن عیاں کرنا ہی پڑتا ہے۔ ٹیک یور ٹائم ربیعہ! آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ لیجئے۔ بس اتنا ہے کہ میرے یو کے جانے سے پہلے مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔ میں تب تک مگن مگن کر گھبراہٹا رہا ہوں۔“

شاید اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اور ہاں۔ ایک آخری بات! وہ بولا۔ ”اگر آپ کا جواب ہاں میں ہوا تو میں آپ کو ایک خوبصورت سی قانونی دُور میں باندھ کر جاؤں گا۔ کیونکہ مصروفیت نے اگر پلٹ کر آنے کی اجازت نہیں دی تو پھر آپ کو وہاں آنا ہو گا۔“

ربیعہ ہنوز گم صم تھی۔

”اللہ حافظ!“ امیر حسن نے فون بند کر دیا۔

ربیعہ نے سلسلہ منقطع ہو جانے پر خالی خالی سی نظروں سے ریسیور کو دیکھا جو ابھی کیسی انہونی داستانیں سن رہا تھا۔

وہ پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جاء نماز تک آئی اور اس پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ دل نے نجانے کسے پکارا تھا۔ ربیعہ نے سم کر آنکھیں کھول دیں۔

ناشم نے ہارن دیا تھا۔ شہلا نے شیزی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور دروازے کی سمت بڑھی۔ فلاٹ صرف ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر تھی اور ایئر پورٹ تک کچھ رستے میں خاصا ٹائم لگ سکتا تھا۔

گاڑی کی پیچلی سیٹ پر اجڑی سی اجڑی سی ایقان بیٹھی تھی۔ اگلی سیٹوں پر ہاشم اور رافع تھے۔ رافع ان کو گوں کو سی آف کرنے جا رہا تھا۔

شہلا اپنی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھی۔ ہاشم نے گاڑی اشارت کی۔

”شہلا! وہ تو ابھی تو ابھی ہی ہینڈ بیگ میں ہیں نا؟“

”اوہ گاٹ!“ شہلا کو اپنے حافظے پر حیرت اور سانس ہوا۔ ”تو تو اوپر۔ کمرے میں۔ میں ابھی ملائی۔“

نہ گاڑی سے اتر کر تقریباً دو رتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی کمرے میں آئی۔

”کہاں۔ کہاں رکھے تھے۔“ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ ”پتا نہیں ہاشم نے مجھے دیے بھی تھے یا پھر ان ہی کے برف کیس میں ہوں۔“

شہلا نے کمرے میں داخل ہوا برف کیس اٹھایا۔ دھلاک تھا۔ شہلا کو ہاشم کے مخصوص نمبروں کا علم تھا۔ دسرت برف برف کیس کھل گیا۔

اندروں کا براؤن الفاٹھ اٹھا کر اس نے اندر رکھے کاغذات نکالے۔ پھر جیسے وہ گنگ ہو گئی تھی بالکل شدرا! وہ ذاتی بورس پیر تھے بالکل تیار حالت میں ان پر صرف ہاشم کے دستخط کی ضرورت تھی۔

ہاشم نے اسے طلاق دینے کے لیے کاغذات نہ نوائے تھے شہلا کو درود دیوار کھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔

نیچے ہاشم نے ہارن پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

بقا آئندہ شہلا کے ہیں

یوسف نہ تھے مگر سر بازار آگئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آگئے
آواز دے کے زندگی ہر بار چھپ گئی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آگئے
اب دل میں حوصلہ نہ سکتا بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ مرے یار آگئے

دانتوں سے لبوں کو کاٹتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھی۔ نرم و ملائم سفید بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اور کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے لیکن دھیان کا پیچھی ان سے نہیں دور رہتا۔ بہت دور محو پرواز تھا۔ اس کے برابر والی نشست پر ایقان کم و بیش اسی کے انداز میں دنیا دہا فیما سے بے خبر آنکھیں بند کیے گویا مراقبہ کر رہی تھی۔ اگلی کوٹنے والی نشست پر ہاشم بیٹھا اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شملہ نے ذرا کی ذرا ہاشم کو دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اپنے لبوں کو کچلنے کی شق شروع کر دی۔

ایک تیر تھا جو دل میں یوں پیوست ہوا تھا کہ نہ آ رہا تھا پیار۔ جو کچھ نظروں نے دیکھا تھا اب دل کو ایک فسانہ معلوم ہوتا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا۔ سوالیہ نشان قطار در قطار اس کے اندر اتر رہے تھے۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ اس تکرار کا جواب اس کے اپنے پاس نہ تھا۔ جس کے پاس جواب تھا وہ ایک نشست کے فاصلے پر بیٹھا اخبار بنی میں مصروف تھا۔

زندگی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اب کس جانب رہا؟ دو دنوں کی شملہ نے ایک ہفتہ اپنے سفر والی اسے احساس ہوا یہ محض اعتبار کا سفر تھا۔ آنکھیں بند کر کے اخبار کرتے کا سفر۔ اسے دکھ ہوا ہر سفر کا انجام ایک سا کیوں تھا؟

وہ ابرار پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ ابرار کے لیے اس کے پاس محبت تھی، خلوص تھا، وفا تھی، انجام کار دکھ۔ بے اعتبار ہو جانے کا دکھ۔

ہاشم کے ساتھ سفر کی ابتدا کیا تھی؟ محض اعتبار۔ اس نے بالآخر اس کی بناموش محبت اور دل کو چھوتے جذباتوں پر اعتبار کر لیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہر اندیشے کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے چل پڑی تھی اور اس بار بھی سفر کا انجام مختلف نہ تھا۔

ہاشم کے برف کیس میں رکھے ہوئے پیرز کس جرم کی سزا تھے؟ شملہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کیا تھا اس نے؟

شملہ نے سوچنے کی کوشش کی۔ شاید کچھ جرم اس کے نامہ اعمال میں درج تھے۔ ہاں شاید اس کے تغافل برتنے کی ادا غلط تھی۔ شاید اظہار محبت محض سنہابی کافی نہ تھا۔ اظہار محبت کی جرات بھی ضروری تھی۔ شاید شاید لا شعوری طور پر وہ اس کی مہربانی سے بے مہری برت جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے نازک جذباتوں کا ادراک کیے بنا سنگ دلی کا مظاہرہ بھی کر جاتی تھی لیکن یہ سب کچھ تو اس کے روتے کو گزرے وقت کا بخشا ہوا انعام تھا۔ یہ ادائے بے مہری و سنگدلی اس کا اپنا مزاج نہ تھی۔ یہ تو یاد ماضی کا شاخسانہ تھی۔ ہاشم کو اس سے شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ ہاشم نے اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ زنگ آلود تالوں پر ہاشم ہونے سے کیا حاصل؟ وہ تو خود ایک ناقابل بیان الجھن و مشکل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی مسیحا کے منتظر۔ کسی اسم اعظم کے تمنائی اور محبت سے بڑا اسم اعظم کیا ہے؟

ہاشم نے اس کی محبت پر اعتبار نہ کیا اسے کم از کم اپنے جذباتوں کی پختگی پر تو یقین ہونا چاہیے تھا وہ اپنے ہی جذباتوں کو رسوا کرنے کیوں چلا تھا؟
سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہونے لگا، رگیں کھینچنے لگیں، وہ نہایت بے بسی کے عالم میں ایقان کی طرح نڈھال ہو کر نیم دراز ہو گئی۔

شام غم کی سحر نہیں ہوتی یا ہم ہی کو خبر نہیں ہوتی
ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں بے سکی اس قدر نہیں ہوتی
دوستو! عشق ہے خطا لیکن کیا خطا درگزر نہیں ہوتی
ایک جاں سوزو نامراد خلش اس طرف ہے اوجھر نہیں ہوتی
دل شملہ پالہ نہیں گدائی کا عاشقی در بدر نہیں ہوتی
ہاشم کے سینے میں ایک ہوک سیٹھی تھی۔ تہ شدہ اخبار آنکھوں پر رکھے وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر موجود نفس کے احساس کو خود پر کسی غلاف کی طرح لپٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

سنگ دل ہے وہ تو بچوں اس کا گلہ میں نے کیا
جبکہ خود پتھر کو بت، بت کو خدا میں نے کیا!
تصور وار اگر کوئی ہے تو میرا دل ہے شملہ! تم میرا الزام سے بری ہو۔ تمہاری آمادگی کو میں محبت سمجھا۔ تو کیوں سمجھا؟ تمہاری رغبت منہ کی کو بچوں کی سچائی جانا۔ کیوں جانا؟ تم سے شکایت کا کوئی حق میرے پاس نہیں ہے۔ تم نے مجھے اگر اپنی محبت تک پہنچنے کا راستہ بنایا تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تم سے گلہ نہیں ہے۔ میرے سینے پر سر رکھ کر تم نے کسی اور کی دھڑکن کو سننا چاہا تو بھی کوئی بات نہیں۔ محبت میں نے بھی کی ہے۔ اس کی منہ زوری سے میری ناتواں ہستی بھی ڈال ف ہے شملہ! یہ بہت ایمان دار بھی ہوتی ہے۔ بہت بے ایمان بھی۔ تمہیں میری ذات کا ریسہ بچا ہے تو میں تمہیں یہ رستہ دوں گا۔ تم جہاں تک جانا چاہتی ہو، میں تمہیں پہنچاؤں گا۔ تمہارا اضطراب تمہاری یہ کشمکش۔ کچھ کھنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پاتا۔ میری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہ تھوڑا سا انتظار تھوڑا سا صبر۔ ایک بار اور آخری بار میرے گھر کی خوشیوں میں شراکت داری کر لو پھر جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ میری منہ می میں تمہارا وجود نہیں ہے شملہ! صرف تمہاری آپٹل کا ایک کونا ہے۔ تمہارے آنکھوں کا اذن رخصت میری منہ می کھول دے گا۔ میرا یقین رکھنا۔
اخبار کے کونے نے اس کی آنکھ کی نمی جذب کی تھی۔ جہاز بازو پھیلائے محو پرواز تھا۔

سب مایا ہے، سب دھلق پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے
جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں

ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اس شر سے دور اک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اور اس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

آنکھیں موندے وہ اندر ہی اندر کہیں پگھل رہی تھی۔ کیا بچا تھا اس کے پاس؟ اک جھوٹی اٹاکا احساس تھا، سو وہ بھی نہ رہا۔ کسی رزم کے شکست خوردہ سپاہی کی مانند جس نے آخری دم تک ہتھیار اٹھائے رکھے اور پھر ہر راستہ مسدود پا کر خود کشی کر لینا چاہی۔ بچ جانے کے باوجود جس کے پاس جینے کا کوئی اخلاقی جواز تک نہ ہو، ایقان خود کو ایسا بار اہوا سپاہی محسوس کر رہی تھی زندگی نے جسے خود تک پہنچنے نہ دیا اور موت جس سے کتر کر رکھ گئی۔ بس سانس کی زنجیر میں بیڑی کی مانند پڑی تھی۔

آفس کتنی خوش نصیب تھی اس کے بائیں جانب بیٹھی ہوئی شہلا جس پر زندگی ہمتا کی مانند مہربان تھی جس کی ڈولتی ناؤ کو ہر بار محبت کا مہربان سہارا مل جاتا تھا جس کے سر پر تنی اعتماد کی چادر لمحہ بھر کو سرکتی تھی تو اگلے ہی پل یقین اور اعتبار کے رنگ پھر اسے گھیرے میں لے لیتے تھے۔

کتنا خوش قسمت تھا اس کے دائیں جانب بیٹھا ہوا ہاشم، اس نے زندگی سے جو مانگا زندگی نے اس کی خاطر سنبھال رکھا اور پھر اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ اور کتنی بد نصیب تھی وہ سب کچھ پا کر بھی کچھ نہ پاسکی۔ وہ گویا خوشبودوں پر پھولوں کی شیدائی تھی۔ اب سو نادل خالی ہاتھ لیے نجانے کس رستے کی مسافر تھی۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ہار گئی تھی وہ عاشر سے ہار گئی تھی وہ قسمت سے ہار گئی تھی وہ خود سے ہار گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے ہتھیار گرا دیے تھے۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جیسی بنائی ہے اسے ویسا ہی رہنا ہے اسے جتنی حد دی گئی ہے وہ بس وہاں تک ہی جاسکتی ہے۔ قسمت میں جو جیسا پیش آتا ہے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنا ہے۔

ہر کوئی شہلا جیسا نصیب لکھوا کر نہیں لاتا۔ ہر کوئی ہاشم جیسا پر خلوص اور قابلِ بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ شہلا نہیں ایقان تھی۔ عاشر ہاشم نہیں تھا۔ اس نے کیوں اس کی ذات میں ہر خوبی کو مجتمع دیکھنا چاہا تھا؟ جتنا اپنا وہ ایقان کو دے سکتا تھا اس نے دیا تھا اس سے زیادہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایقان نے کیوں اس سے زیادہ کی طلب کی؟ وہ قصور وار تھی اس نے اسے انسان سمجھنے سے انکار کیا اسے فرشتہ سمجھنے اور فرشتوں کا سا سلوک پانے پر مصر رہی۔ رتی بھر جھکنے سے انکار کر کے وہ اسے اپنے سامنے ٹیک دینے پر مجبور کرتی رہی۔

نتیجہ وہی تھا جو ایسی کسی بھی سر پھری ضد کا ہونا ہے۔ آج وہ تنہا تھی، شش طور پر خود کو بیمار پر مرنہ تصور کر رہی تھی۔ دوسرے اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ زندگی کو خود سے بھاگتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

صلیب وقت پہ میں نے پکارا تھا محبت کو
مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی ہنسا ہوگا

منیزہ بیگم اس طرح ہسپتال گئیں کہ پھر لوٹ کر گھر نہ آسکیں۔ انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ عباد گھر لوٹا تو اس کی

رنگت اڑی ہوئی تھی۔ وہ از حد پریشان معلوم ہوتا تھا۔ ربیعہ کا دل اس کی صورت دیکھ کر دھک سے رو گیا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گئی۔
”عباد بھائی!“

عباد نے مڑ کر ربیعہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں گہرا دکھ تھا۔
”ربیعہ! تیاری کر لو۔ تمہیں امی کے پاس ہاسپٹل جانا ہے۔ میں تمہیں ہی لینے آیا ہوں۔“ دکھ کے گہرے احساس سے اس کی آواز بو جھل ہو رہی تھی۔

”امی! امی کو کیا۔ کیا ہوا ہے عباد بھائی؟“ ربیعہ کو پوری دنیا اندھیر ہوتی محسوس ہوئی۔

عباد خاموش رہا پھر اس نے اپنی رسٹ واپس اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

ایک گلاس پانی لائے۔ پلیر۔ وہ اس کے سوال کا جواب دینے سے احتراز کر رہا تھا۔ ربیعہ دھڑکتے دل کے ساتھ

پانی لینے چلی ہوئی تھی۔

ایک مہربان سا بھان تھا جس کے نیچے وہ پناہ گزین تھی۔ ربیعہ کو نجانے کیوں اپنے سر سے وہ مہربان سایہ دور جاتا ہوا محسوس ہوا پانی لے کر وہ واپس لوٹی تو عباد ایک ہاتھ سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

”عباد بھائی! پانی۔“ وہ کچھ دیر کھڑے کھڑے بولنے کے بعد آہستگی سے بولی۔

عباد نے سر اٹھایا۔ ربیعہ بری طرح سے چوٹی۔ عباد کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”ربیعہ! وہ بولا۔“ وہی ہوا جس کا شک تھا۔ امی کو۔ بلڈ کینسر ہے۔ شاید۔ زیادہ غرصے تا۔

یہ سچ باتیں ہماری امی ہم سے بچھڑ جائیں گی ربیعہ نے

وہ کچھ بولتا پھوٹ کر رو دیا۔ ربیعہ کے ہاتھ سے اٹکائی چھوٹ گیا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی عباد کو روٹا دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو پڑی تھی۔

”کیوں فکر کرتی ہو؟“ وہ ربیعہ کو خود سے لپٹا کر گھٹینان سے بولیں۔ ”میں ٹھیک ہوں بالکل ٹھیک۔ کل ہم گھر چلیں گے۔“

ربیعہ نے بے بسی سے ان کے چہرے کی جانب دیکھا وہ ان سے کیا کہتی؟ وہ ان سے کیا کہہ سکتی تھی؟

”اے ربیعہ! کیا بول رہی ہو؟“ انہوں نے ربیعہ کے بال سمیٹ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”تم ایسی صورت بنا کر بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو تم مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ میری آنکھوں میں روشنی سی بھر جاتی ہے۔“

ربیعہ ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک دو دونوں میں ہی بالکل گھل سی گئی تھیں۔ ان کی رنگت پہلے بھی کملائی گملائی سی تھی لیکن آج ان کے چہرے پر مردنی کا اثر اتنا واضح تھا کہ ربیعہ بالکل گم صم سی ہو گئی۔

”شہلا نہیں آئی؟“ وہ اداسی سے بولیں۔

”آئی اسلام آباد گئی ہیں کھل پر سوں تک آجائیں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اتنی اداس کیوں ہو ربیعہ! وہ تھکے تھکے انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”کیا میری وجہ سے پریشان ہو؟ مت ہو پریشان۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش ہوں۔“

ربیعہ خاموش رہی عباد بھی بالکل خاموش سا صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ انیقہ ربیعہ کے آنے پر گھر جا چکی تھی۔ اسے بھی رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ کمرے میں ہلکی سی سردی اور بو جھل پن تھا۔

”عباد! منیزہ بیگم بولیں۔“

”جی امی! وہ چونکا اور جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔“ کہیے۔“

”تم اب گھر جاؤ آرام کرو۔“

”میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”ماں کی بات نہیں مانو گے تو ماں خفا ہو جائے گی۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

عباد نے بے بسی سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر اسے جیسے جانے کا اذن دیا۔

”لیکن... یہاں خدا نخواستہ کوئی ضرورت...“

”یہاں صرف مریض کی ضرورت ہوتی ہے سو میں ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”میرا خیال رکھنے کے لیے

ربیعہ ہے۔ تم اب جاؤ آرام کرو۔ انیقہ کا خیال رکھنا۔“

عباد ناچار اٹھا تھا چند قدم چل کر وہ ربیعہ تک آیا۔

”ربیعہ...! کوئی مسئلہ ہو تو فوراً...“

”جی ٹھیک ہے۔ آپ کے سیل پر کال کروں گی۔“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بولی تھی۔

رات کا سناٹا گہرا تھا، اتنا گہرا کہ آپ ہی بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کمرے میں خنکی کا احساس لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگا۔ سوئی ہوئی ربیعہ کو بچانے کے لیے کس احساس نے جگایا تھا اس نے گردن گھما کر برابر کے بلنگ پر سوئی ہوئی منیوہ بیگم کو دیکھا پھر اپنی نظر کھڑکی کے بند شیشے پر پڑی۔ ان کا کمرہ دوسری منزل پر تھا اور کھڑکی کے شیشے سے پرے ہاسپٹل کے لان کا سبزہ قریب کھڑے ہونے سے دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے صرف اندھیرا ہی باہر فضا میں پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

UrduPhoto.com

ربیعہ نے بچانے کیوں شیم غنودگی کے عالم میں اس اندھیرے کو گھورتی رہی جیسے کوئی اسے سناٹا احساس وہاں دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا پھر اس نے وہاں ایک ہیولہ نمودار ہوتا دیکھا اور ہیولے نے آہستہ آہستہ دادی کا روپ اختیار کر لیا۔

”ربیعہ... ربیعہ...! وہ اسے پکار رہی تھیں۔“

ربیعہ کو اپنی جگہ پر ان کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ اس کے قریب ہی بول رہی ہوں۔

”دادی... دادی...! آجائیں...! اندر آجائیں...! ربیعہ نے اندر نہیں پکارا۔“

استے دنوں کے بعد وہ دادی کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ دادی خوش نہیں لگتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اداسی

منجمد ہو چکی تھی۔ پریشان بالوں اور سوکھے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ بیمار لگ رہی تھیں۔

”دادی...! اندر آجائیں...“ ربیعہ نے پھر اندر نہیں پکارا۔

”وہ... وہ نہیں آنے دیتی۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”کون؟“ ربیعہ نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ”کون؟“

”وہ... وہ جو بستر لیٹی ہے۔“

ربیعہ نے دیکھا بستر پر منیوہ بیگم لیٹی تھیں۔

”یہ...؟ یہ تو میری امی ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”ہاں۔“ وہ بولیں۔ ”یہ مجھے اندر نہیں آنے دیتی۔ اس سے کہو ربیعہ! مجھے اندر آنے دے۔“ وہ لجاجت سے

بولیں۔ ”باہر سردی ہے اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

ربیعہ کو ان پر بہت ترس آیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا جسم

پتھر کا ہو گیا ہے وہ اٹھ نہ پائی۔

”ربیعہ! دادی اچانک ہی شیشے سے دور ہونے لگیں۔ ”ربیعہ! مجھے روک لو۔ اس سے کو مجھے اندر آنے دے۔“

”دادی! ربیعہ نے ہاتھ بڑھا کر انہیں روکنا چاہا۔ ”رک جائیں۔“

”اس سے کہو ربیعہ! اس سے کہو۔“ وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔

”ای۔ ای۔ ای۔“ ربیعہ نے بے ساختہ منہ پر ہیکم کو پکارا۔ ”ای۔ ای۔ ای۔“

دادی اب دور ہوتے ہوئے پھر سے ایک ہولے کا روپ اختیار کر چکی تھیں۔

”ای۔ ای۔ ای۔“

ایک سخت ربیعہ کی آنکھ کھل گئی وہ اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا گلا خشک تھا اور تنہا بے حد تیز ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کمرے کا ماحول بالکل وہی تھا جیسا وہ چند لمحوں قبل اپنے خواب میں دیکھ رہی تھی۔ وہی اندھیرا، وہی سناٹا، وہی خشکی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے کو دیکھا جس کے پار کھجور کے درخت ملتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس نے برابر میں سوئی ہوئی منیوہ بیگم کو دیکھا۔

پھر وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ دیر سے دیر سے چلتے ہوئے کھڑکی تک آئی اور باہر دیکھنے لگی۔ باہر ڈراؤنا، گھبرانا تھا۔ ربیعہ نے آہستگی سے کھڑکی کھولی پھر بیٹھ گئی وہ بری طرح سے کپکپاتی تھی۔ باہر سے ہوا کا اتنا سرد جھونکا اندر آیا تھا کہ ربیعہ کے ہاتھ سن ہو گئے۔ ہر جگہ سردی نے ابھی پوری طرح سے اپنے قدم نہیں جمائے تھے ربیعہ کو خوف محسوس ہوا۔ اس نے جلدی کر کے کھڑکی بند کی اور پلٹ کر بمشکل اپنی جگہ تک آئی۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کر کمبل اوڑھ کر وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔

”وہ مجھے اندر نہیں آنے دیتی۔“ اسے دادی کی بات یاد آئی۔ ربیعہ نے حیران سوچتی ہوئی نظروں سے بستر پر بیٹھی منیوہ بیگم کو دیکھا جو ر سکون دواؤں کے زیر اثر بے خبر سو رہی تھیں۔ ربیعہ اب تک کمرے میں ایک انجانا اثر محسوس کر رہی تھی۔ بالی کی رات ربیعہ نے یونہی بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی۔

باہر پھیلی ہوئی رات بہت خوبصورت تھی۔ اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی بیٹھلا نے بھورن کی ساری خوبصورتی اور دلکشی کو ایک ہی سانس میں اپنے اندر سمونا چاہا۔ نجانے زندگی میں پھر کبھی ایسی دلکش رات آئے گی یا نہیں۔ بھرپور وقت میسر آنا بھی تھا یا نہیں۔

”تم ہو ساتھ رات بھی خیس ہے۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“

لہا کی خوبصورت آواز نے یک لخت ہی جیسے ماحول کو مزید سحر انگیز کیا تھا۔ شہلا نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ شیشے کے دروازے کے پار بیٹھا ہاشم بیگم کی کھینچل بدل رہا تھا۔ شہلا کافی دیر سے ٹیرس پر کھڑی تھی۔ قریباً سورج کے ڈوبنے کے وقت سے۔ بھورن کی خوبصورتی سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ کبھی وہ طالب علمی کے زمانے میں کالج کی جانب سے آل پاکستان ٹور پر گئی تھی تب کالج کی دوستوں کے پورے ٹولے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔

تب وہ اور ایقان ہاتھوں میں ہاتھ دیے یہاں سڑکوں پر گھومتی پھری تھیں۔ مری پیریاہ، بھورن، نتھیا گلی۔ انہوں نے سب ہی کچھ ناپ چھوڑا تھا اور قصد کیا تھا کہ وہ لوگ ہر سال نہ سہی تو چند ایک سال بعد ضرور یہاں آیا کریں گی اور اب کتنے سالوں بعد قسمت چند روز کے لیے یہاں لائی تھی وہ بھی اس طرح کہ شہلا اکیلی ٹیرس پر

کھڑکی پر سی کے خوبصورت لان کو ایک گہری اداسی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور ایقان برابر کے کمرے میں لائنٹس آن کیے بستر پر لیٹی نجانے کیا سوچے جاتی تھی۔

شہلا نے ایک بار پھر مڑ کر کمرے میں اکیلے بیٹھے ٹی وی دیکھتے ہاشم کو دیکھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاشم بھی اس کے پاس وہاں ٹیرس پر چلا آئے۔ اسی التفات کے ساتھ جو اس نے شہلا کے لیے وابستہ کر رکھا تھا وہ نری بھری محبت جو دیر سے دیر سے دل کے دروازے پر دستک دیتی تھی، آج نجانے کہاں گم تھی۔ وہ بولتی آنکھیں، راز افشا کرتی مسکان، وہ سکون آمیز لمس، ہاشم نے اپنے سب ہی خزانے نجانے کہاں چھپا دیے تھے۔ ایک گہری خاموشی تھی جو اس نے خود پر طاری کر لی تھی۔

شہلا کو ایک مرتبہ پھر ڈائونورس پیپر زیادہ آئے۔ اس کی پلکوں پر نمی چمکنے لگی۔ ہاشم نے ایسا کیوں سوچا؟ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس نے شہلا سے کچھ بھی کیوں نہیں کہا؟ اوس۔ اوس۔ وہ کس بات کا انتظار کر رہا تھا؟

”تم ہو ساتھ رات بھی خیس ہے۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“ ہاشم کی چینل بدلتی انگلیاں ایک جگہ ٹھہم گئیں۔ کتنا خوبصورت گیت تھا۔ محبت کا کیسا درد آشنا احساس تھا وہ چینل بدلتا بھول گیا۔

کن اکھیوں سے اس نے باہر ٹیرس پر کھڑی بیٹھلا کو دیکھا جسے وہاں کھڑے کھڑے دھننوں سے زیادہ کاٹاٹم ہو چکا تھا۔

”کمرے سے بھاگ رہی ہو تم۔“ اس نے آواز دہرائی سے سوچا۔ ”جو خود تمہیں ہر غم، ہر فکر سے آزاد کرنے کی ٹھان چکا ہے شہلا! ایسے آدمی تو کون سے؟ کیوں اتنا جبر کیا خود پر۔ مجھ سے پہلے دن ہی آزادی مانگ لیتیں۔ میں زندگی کی پہلی اور آخری رات تمہارے ساتھ گزار کر بھی شیاوان رستا کہ محبت میں اتنا کام آنا فرض سے اہل دل پر۔ اگر ابراہیم سب کچھ نہ بتاتا تو میں ساری عمر بھارے شفر اور تمہاری بے مہری کو مسہا کر بھی کچھ نہ سمجھ پاتا۔ نہ جان بانا کہ تم نے میرا ساتھ کیوں قبول کیا۔ اپنا نام میرے نام سے وابستہ کیوں کیا۔ میں نہ جان پاتا شہلا! ابھی نہ جان پاتا تھیں اب میں تمہیں یہی یاد دلانے پر مجبور نہیں کروں گا۔ رستہ بدلنا چاہتی ہو میں تمہیں وہ سراسر تہ دوں گا لیکن یہ بے مہری، یہ جبر، یہ غلطی یہ اجنبیت۔ کچھ دن تو میری بن کر جیو، کچھ دیر کو تو پاس آؤ۔ چند لمحے تو ساتھ گزارو۔“

پچھلے دن کو سو میری آنکھوں میں پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔ ٹی وی پر نشر ہوتے او اس گیت دل کا درد مزید بڑھا رہے تھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی شہلا خود سے بہت دور محسوس ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر منیوہ بیگم کا چیک اپ کر رہے تھے۔ انیقا بھی وہاں موجود تھی۔ ربیعہ کمرے سے باہر نکل آئی، اس کا دل بے طرح اداس ہو رہا تھا۔ آنے والے سربان شامیں ابھی سے یاسیت اور احساس نشی سے بھری ہوئی تھیں۔

آہستہ آہستہ کاریڈور میں چلتے ہوئے وہ یکایک رکی۔ سامنے سے آتی، وہی ذاتیں آتا تھیں۔ ربیعہ بیگم، عذرا بیگم، اور وہ آ رہی تھیں۔ ربیعہ نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔ ”وہ بیگم السلام اب کیسی ہیں منیوہ بہن!“ رابعہ بیگم نے پوچھا۔

ربیعہ۔ اس سوال کا جواب نہ دیا جاسکا اس کی آنکھوں میں دانی بھر گیا۔

”آئیے نا آپ لوگ۔“ وہ انہیں لے کر کمرے کی جانب بڑھی۔

ڈاکٹر زبا ہر نکل رہے تھے۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئیں تو گم صم سی منیذہ بیگم قدرے سنبھل گئیں۔ سلام دعا کے مراحل سے گزر کر وہ لوگ ان کی خیریت دریافت کرنے لگیں۔ منیذہ بیگم اپنی اصل بیماری سے آگاہ نہ تھیں۔ وہ انہیں اپنی تکالیف کے متعلق بتانے لگیں۔

ربیعہ کا دل پہلے ہی پڑمردہ اور اس تھاؤں اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ بھی باہر نکل آئی۔

ربیعہ کمرے کے سامنے بنی بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جہاں سے ہسپتال کا لان نظر آتا تھا۔ دروازہ اپنی جگہ ٹھنک کر رک گئی۔ ایک ہاتھ دیوار پر دھرے وہ ربیعہ کو دیکھنے لگی۔ زور رنگ لباس پر سفید دھبہ پنے جس کے کناروں پر نہایت نفیس کیوشیہ بنا ہوا تھا۔ ربیعہ بے حد کم عمر اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ سیاہ آنکھیں دوسرے بھی نرم اور اس معلوم ہوتی تھیں۔ گلابی لب ایک دوسرے میں پوست تھیں۔ اس کی پشت پر بڑی سیاہ چولی اس کی شخصیت کی شش میں بے پناہ اضافہ کر رہی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر کشمکش آ رہی تو وہ چونک کر کہنے لگی۔

”ارے وردہ!“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ باہر کیوں چلی آئیں تم؟“

”بس یونہی۔“ وہ بھی دھیرے سے مسکرائی۔ ”تم کیوں چلی آئیں باہر؟“

ربیعہ نے گہری سانس بھر کر سر جھکا لیا۔

”آئی ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وردہ نے اسے تسلی دی۔

”ہاں ان شاء اللہ۔“ وہ آستکی سے بولی۔

دونوں دھیرے دھیرے کاریڈور میں چلنے لگیں۔

”اور تم سناؤ۔“ یونیورسٹی جاری ہو؟“ ربیعہ نے پوچھا۔

”ہاں لیکن تمہارے بغیر مزہ نہیں آتا۔“

”میں اب یونیورسٹی نہیں جاسکتی۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں ابی کو اس طرح چھوڑ کر ایک پل کے لیے بھی کہیں نہیں جاسکتی۔“

وردہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ قدرے دھیان سے دیکھا۔

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ۔“

”اور تم سناؤ۔“ ربیعہ نے موضوع بدلا۔ ”شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟“

”اگلے مہینے ناعہ، ثانیہ اور عریشہ تینوں ایک ساتھ مایوں بیٹھ رہی ہیں۔“ وہ اسی۔ ”بس یوں سمجھو، ہم خود کو بھول جائیں گے۔ اتنا ہنگامہ مچا ہوا ہوگا۔ تم ضرور آنا ربیعہ!“

”بس۔“ ربیعہ دھیرے سے بولی۔ ”میں کہاں آپاؤں گی وردہ! تم ہائز دست کرنا لیکن میں نہیں آسکتی۔“

”کسی ایک فنکشن میں تو۔“ پلیر۔ ”وردہ نے اصرار کیا۔

”تمہاری شادی میں آؤں گی ضرور۔“ ربیعہ مسکرائی۔

وردہ یک لخت ہی خاموش ہو گئی۔ دونوں کاریڈور کے کونے پر پہنچ کر رک گئی تھیں۔ ”میری مانو تو تم بھی ان تینوں کے ساتھ ہی مایوں بیٹھ جاؤ۔“ ربیعہ دل پر دھرا ہوجہ ملا کرنے کے لیے ہلکے ہلکے انداز میں بولی۔ ”سب لڑکیاں خیریت سے منت جائیں گی۔“ وردہ قدرے لختی سے مسکرائی تھی۔

”میرا فی الوقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“

”کیوں؟“ ربیعہ کی آنکھوں میں نیرت ابھری۔

”بس۔ ربیعہ میں۔ میں شاید۔“ وردہ نے اٹک اٹک کر کچھ کہنا چاہا۔

ربیعہ اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔

”میں شاید رافع سے شادی نہ کر پاؤں۔“ وہ بالآخر بولی تھی۔

”وردہ!“ ربیعہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”لیکن کیوں کیا برائی ہے رافع میں؟“

”بس۔ دل۔ دل آمادہ نہیں ہوتا۔“ وردہ نے اختیار اپنی انگلیاں اضطرابی انداز میں مروڑنے لگی۔

ربیعہ نے آنکھیں پھینکا کر اسے دیکھا وہ چند لمحے کچھ بھی بولنے کے قابل نہ رہی۔

”ربیعہ! میں اتنے عرصے سے دل کو یہی سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے جو فیصلہ کر دیا، ہمیں اسی کو قبول کر لینا چاہیے۔ خوش دلی سے یا بے دلی سے۔ بڑوں کی سوچ ہماری سوچ سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ ایسی بہت سی باتیں میں سوچتی رہی ربیعہ! خود کو بھلائی رہی لیکن آج میں اس نیچے پر پہنچی ہوں کہ زندگی کا انتخاب فیصلہ کرنے کا اختیار انسان کے اپنے پاس ہونا چاہیے۔“

ربیعہ حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”لیکن وردہ! تمہاری امی۔“

”امی نے یہ اختیار خود مجھے دیا ہے۔ امی منگنی کو رکھنے کا یا نہ رکھنے کا۔“

”تمہیں۔ تمہیں رافع سے۔ کوئی شکایت نہیں؟“ ربیعہ کے الفاظ اس کے گلے میں پھنس گئے۔

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے ربیعہ! کہ رافع میں کوئی برائی ہے وہ بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ ویل مینرڈ عزت کرانے والا۔ لیکن دل نہیں سمجھتی بہت کمزور انسان ہے۔ میرے لیے رافع کے پاس کچھ بھی منفرد نہیں ہے۔“

ربیعہ کو احساس ہوا کہ وردہ کی باتوں سے ایک ناقابل بیان دکھ میں مبتلا ہو رہی ہے۔

”ہو سکتا ہے رافع کو میرے فیصلے سے دکھ ہو۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی لیکن اس سلسلے میں میں خود کو بے بس پارہی ہوں۔ میں رافع کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اسے کوئی بہت ہی اچھی پیاری سلجھی ہوئی لڑکی مل جائے جو رافع کو محبت اور وفادے اور رافع اسے پورا اعتماد اور خلوص دے سکے۔ ایسی لڑکی۔ ربیعہ!“

ربیعہ نے چونک کر وردہ کو دیکھا۔

”وردہ! یہ تمہیں شادی کر لونا رافع سے!“

”وردہ! یہ ممکن نہیں ہے۔“ ربیعہ خفا ہوئی۔

”میں نے کہا نا وہ بہت اچھا انسان ہے وہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکتا ہے۔ بولو ربیعہ! کیا میں اس سلسلے میں شہلا آئی سے بات کروں؟“

ربیعہ خاموش ہوئی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے نظر اٹھا کر وردہ کو دیکھا۔

”نہیں وردہ! یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ جیسے حیرت سے چنچنی۔ ”کیوں ممکن نہیں ہے؟“

”کیونکہ میں کسی کو یہ اقرار دے چکی ہوں۔“ ربیعہ سر جھکا کر آستکی سے بولی۔

وردہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”پوچھ سکتی ہوں وہ خوش نصیب کون ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بڑا بھائی۔“

دورہ چند لمحے دانتوں سے لب کاٹتی رہی۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھارے بیچہ!“ وہ مایوسی سے بولی۔

”دورہ!“ ربیعہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔ تدریجاً معاملہ فہمی، دوراندیشی، بنیادوں میں ان سب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تم جو کچھ بھی سوچ رہی ہو، محض جذبات کے دھارے میں بہہ کر سوچ رہی ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس فیصلے میں جذبات کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہ فیصلہ تدریجاً اور دوراندیشی کے سہارے کرو۔ تم نے ابھی بالکل ٹھیک کہا کہ رافع کسی بھی لڑکی کو زندگی کی ہر خوشی دے سکتا ہے۔ وہ لڑکی کسی اور کو نہیں، تمہیں ہونا ہے دورہ۔ صرف تمہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود دورہ کے ہاتھ کو سرد تر اور بے جان سا ہوتا ہوا محسوس کیا پھر اسے تھپتھپا کر چھوڑ دیا۔

”او، کمرے میں چلیں۔ سب لوگ کہیں گے کہ ہم دونوں نجانے کہاں چلے گئے۔“ وہ دونوں کمرے کی جانب مڑ گئیں اور آہستہ آہستہ کاریڈور کے کونے سے دور ہونے لگیں۔ تب بہت آہستگی سے رافع وہاں سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے کونے پر نمودار ہو کر دورہ جاتی رہی اور دورہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی اور دکھ تھا۔ وہ خود کو بے تحاشا تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہا تھا۔

دورہ اور ربیعہ کمرے میں داخل ہو کر اس کی نگاہوں سے او جھل ہو گئیں تو وہ چلے جانے والے قدموں سے واپسی کے لیے مڑ آیا۔

UrduPhoto.com

ہسپتال کے لان میں ایک دورہ افتادہ لڑکی نے اپنی سبکی بیچ پر بیٹھ کر لڑکیوں کے خود کو بہت تھکا ہوا اس اور ادھورا محسوس کیا۔ اٹھاٹھانہ ہوا اور اس قدر پروردہ۔ اس نے خود کو کبھی پایا ہوسا اسے یاد نہ تھا۔ وہ صرف مسکراتے ہوئے کی مزاج پر سی کے لیے وہاں آیا تھا اس میں اس کی کسی اور چاہ یا تمنا کا دخل نہ تھا۔ لیکن یہاں آکر دل نے کیسا بوجھ سہا تھا وہی جانتا تھا۔

”میں سے شاید رافع سے شادی نہ کریاؤں۔“ دورہ نے کہا تھا۔

”بس۔ دل آمادہ نہیں ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔“

”میرے لیے رافع کے پاس کچھ بھی منفرد نہیں ہے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہ اقرار کسی اور کو دے چکی ہوں۔“ یہ ربیعہ کی آواز تھی۔

”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔“

”وہ لڑکی۔ کسی اور کو نہیں۔ تمہیں ہونا چاہیے دورہ۔“

رافع نے اپنا سر پیچ کی پشت سے نکایا اور آسمان کی وسعتوں کو کھوجنے لگا۔ کتنا حقیر، کتنا بے مایہ تھا اس لمحے اس کا وجود جسے کوئی بھی اپنانے کو تیار نہ تھا۔

اس نے لان میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ پودوں کو، پھولوں کو، سبکی بینچوں کو، فوارے کو، سبز گھاس کو، اس نے ہر شے کو ذریعہ نظروں سے دیکھا جیسے وہ سب اس کا بھید جانتے تھے جیسے وہ سب اسی پر مسکرا رہے تھے۔ اس پر طعنہ زن تھے۔ رافع کا جی چاہا کہ وہ ساری دنیا سے اپنا چہرہ چھپا لے۔

گہری سانس بھر کر وہ سیدھا ہوا۔ تب اس نے دور روش پر عباد اور امیر حسن کو اندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ لمحہ بھر میں وہ رخ موڑ گیا تھا۔ فی الوقت کسی کا سامنا کرنے کوئی آمادہ نہ تھا۔ جیب میں اپنی گاڑی کی چابی کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے وہ پارکنگ کی سمت بڑھنے لگا تھا۔



پی سی بھورن کے سرسبز و شاداب بلدان میں بیٹھی وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ نرم دھوپ اس کے پیروں سے ذرا پرے گلاب کی کیاریوں پر دمک رہی تھی۔ ایتان کی نظرس اس جگہ پر جم گئیں۔ کئی سال پہلے اسی جگہ بیٹھ کر اس نے کتنے شوق سے تصویریں بنوائی تھیں۔ وہ تصویریں اب تک اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

ایتان کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے۔ دل میں ایک ہوک انھی تھی جس نے سوئے ہوئے ہر جذبے کو جگا دیا تھا۔ خوابیدہ جذبے کسے سانس لگے تھے۔ اس کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ قدم قدم پر بڑھتی ہوئی یادیں اپنا

اچانک ہی سیاہ اسٹریپ والی چیلوں میں قید و نہایت گورے، حسین پیر اور بڑے قریب آکر رکے تھے۔ ایتان نے وہ گئی۔ وہ بھی بے حد غور سے ایتان کا نقش نقش دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہر لمحے سے وہ فارز لگتی تھی۔ ایتان اسے دیکھتی "پس؟" چند لمحوں بعد ایتان حیرانی سے بولی۔

"میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو تم ایتان ہو۔" وہ انگریزی میں بولی۔ ایتان نے نہایت حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں کچھ دیر یہاں تمہارے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ ایتان نے پھر سر ہلایا وہ محتاط سے انداز میں اس کے قریب بیٹھی۔ "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟" ایتان نے پوچھا۔

"یہاں کس کے ساتھ آئی ہوئی ہو؟" اس نے ایتان کا سوال نظر انداز کر دیا۔ "میں اپنے نتیجے اور اس کی بیوی کے ساتھ۔ اس کی بیوی میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔" ایتان نے اپنے سوال سے اس کا احتراز واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ "یہاں تو اپنے شوہر کے ساتھ آنا چاہیے۔" وہ مسکرائی۔

اس کی مسکراہٹ میں ایک واضح اداسی تھی جس نے اس کی پلکوں کو بھی غم کر دیا۔ ایتان لمحہ بھر کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

"وہ پاکستان میں نہیں ہوتے۔" پھر وہ آہستگی سے بولی۔ "پاکستان میں نہیں ہوتے؟" اس فارز لڑکی کو حیرت ہوئی۔ "پھر کہاں ہیں وہ؟" "وہ۔" ایتان لمحہ بھر کو رکی۔ "جاپان میں۔"

"نہیں۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔ "وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔" ایتان بے طرح جوگی۔ بے یقینی سے وہ اس فارز لڑکی کو گھورنے لگی۔ "تم۔ تم جانتی ہو میرے شوہر کو؟" "پس۔" آف کورس۔ بہت اچھی طرح سے۔ اسی لیے تو میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"تم کون ہو؟"

"الزبتھ۔" وہ حیرے سے مسکرائی۔

"الزبتھ؟" ایتان نے دہرایا۔ "لیکن عاشر سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"ایک کولیگ کا ایک اچھے دوست کا اور یک طرفہ محبت کا۔ میں اس سے محبت بھی کرتی تھی۔"

ایتان کے وجود کو ایک جھٹکا لگا۔

"لڑا؟" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ "تم۔ تم لڑا ہونا؟"

"ہاں، میں لڑا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

ایتان کے ہونٹ انترت سے سکڑ گئے۔ آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ اس کا جی چاہا تمام اخلاقیات بالائے طاق

رکھتے ہوئے وہ اس منحوس عورت کا گریبان پکڑ لے اور طمانچے مار مار کر اس کا چہرہ لال کر دے۔ یہی عورت اس کی

بربادی کا سبب بنی تھی۔ اس کی زندگی کی تمام تر خوشیاں دکھ میں بدل دینے میں اس عورت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے

انترت کی شدت سے اپنے ہاتھ میں جھٹکے لگتے محسوس کیے۔

"لڑا۔" کسی مرد کی بھاری آواز قریب سے آئی تھی۔ "لڑا ڈار لنگ۔"

لڑا چونک کر مڑی۔ ایتان نے بھی پلٹی تھی۔ آنکھوں سے آنے والے کو دیکھا وہ چہرے مہرے سے پاکستانی ہی

لگتا تھا۔

"مائی اسپینڈل۔ منیر۔ اور منیر یہ ایتان ہیں۔" پھر بے ہمت اچھے کولیگ عاشر کی دانت۔

لڑا ایتان کے جذبات سے بے خبرانہ دونوں کا تعارف کر دیا۔ منیر صاحب شائستگی سے سر ہلارہے

تھے۔ "ماکس تو میٹ یو مسزنا شری۔" پھر وہ اسی رسمی شائستگی سے مسکراہٹ کے درمیان بولے۔ ایتان نے بمشکل ذرا سا

سر ہلایا تھا۔

"ڈار لنگ۔" لڑکے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ لڑا سے مخاطب تھے۔

"سوری منیر! میں نے ناشتہ کالی ہوئی کیا ہے۔ اب میں شام تک کچھ نہیں کھاؤں گی۔ آپ لہجہ لینا چاہیں تو میں

یہاں مسزنا شری سے گپ شپنگ لگاؤں؟" لڑا نے مسکراتے ہوئے اجازت چاہی۔

"اوکے ڈیئر۔" لڑکے نے اپنے روم میں ملتے ہیں۔"

ایتان کا ذہن ان کی گفتگو کی جانب ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ تو مسلسل عاشر کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ عاشر نے

اس سے کہا تھا کہ وہ چند ہی روز میں لڑا سے شادی کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے کبھی ایتان سے رابطہ نہ کیا پھر اس

نے ایتان کو ایک خطیر رقم بھیج دی اور اس کے بعد سے اس کا کچھ اتنا پتا نہ تھا۔ یہاں لڑا کسی اور کے ساتھ موجود

تھی اور اسے اپنا شوہر بتاتی تھی، منجانب معاملہ کیا تھا۔ ایتان کا ذہن ایک جگہ سا پزل میں الجھا ہوا تھا۔

"یہ۔ یہ تمہارا شوہر ہے؟" منیر کے جانے کے بعد اس نے جلدی سے پوچھا۔

"یقیناً۔ میں نے ابھی بتایا ہے تمہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "شاید تم یہ نہ جانتی ہو مسزنا شری! میں نے عاشر کو

بروز کیا تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی، میں محبت کرنے لگی تھی اس نے۔ تم اس کی بیوی ہو، سمجھ سکتی

ہوئی کہ کوئی بھی عورت جو عاشر جیسے مرد کی قربت میں رہے وہ اسے چاہنے لگے گی۔ وہ نہ صرف ہینڈ سم بلکہ بہت

پیارا انسان ہے۔ کیوں، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟"

ایتان سے کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔ نہ اس نے لڑا کا گریبان پکڑا نہ اس پر تھپڑوں کی بارش کی نہ مغلظات کہیں

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اتنا ضرور تھا کہ عاشق کا ذکر اور وہ بھی ایسے الفاظ میں سن کر اس کا دل سینے میں یوں تڑپنے لگا تھا جیسے کسی نے اس پر چھری چلا دی ہو۔ عاشق کی بے پناہ محبت جو خون میں حل شدہ تھی جیسے ہر گرجاں سے چھن کر کاسٹل میں جمع ہو رہی تھی۔

”پھر تم نے مسٹر منیر سے کیوں شادی کر لی؟“ دھواں دھواں لہجے میں وہ اتنا ہی پوچھ سکی۔

”کیونکہ عاشق کے انکار سے میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسی جیسا مرد چاہتی تھی۔ اتنا ہی مکمل، اتنا ہی پیارا، اتنا ہی نائس۔“

”عاشق کے۔۔۔ انکار۔۔۔“ ایقان بس حیرت سے بدبدا کر رہ گئی۔

”پھر میں نے طے کیا تھا کہ اگر کبھی شادی کی تو کسی پاکستانی مرد سے کروں گی، کسی مسلمان سے۔ میں نے محسوس کیا تھا ایقان! کہ عاشق میں جتنی بھی خوبیاں تھیں جو کہ مجھے اٹریکٹ کرتی تھیں وہ اس کے مذہب نے عطا کی تھیں۔ تمہارا مذہب بہت عمدہ ہے ایقان! میں۔۔۔ میں پچھلے چند ماہ سے یہاں پاکستان میں ہوں۔ منیر کی جاب امریکہ میں ہے۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے سلسلے میں جاپان آئے تھے جہاں ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ تب سے ہم چھٹیاں لے کر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ یہاں آکر میں نے تمہاری مشرقی روایات کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ میں اس کے چند دنوں میں اسلام قبول کر لوں۔ میرا دل۔۔۔ میرا دل مسلمان ہو چکا ہے۔ پس انکار کی دیر ہے اور میں لڑا سے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

ایقان اس کی بات مکمل ہونے کے خیال سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”لڑا سے۔۔۔ ایقان بن جاؤں گی۔“ اس نے مسکرا کر اور قدرے جھینپ کر اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

”میں نے اپنا اسلامی نام بھی سوچا ہے۔“

دونوں نے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں پھر لڑا نے اسے دیکھ کر جھجکتے ہوئے کہا۔

”عاشق کہاں ہے؟ کیا اب وہ پاکستان میں ہے؟“

ایقان نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور خاموش رہی۔

”میں نے اسے پروپوز کیا تو اس نے انکار کیا جس سے میرے دل کو بہت ٹھیس پہنچی۔“ لڑا نے لگی۔ ”میں نے غصے میں اسے نجات دے دیا، وہ ناراض ہو گیا پھر اس کے بعد کبھی مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے جاپان جا کر اپنی جاب تبدیل کر لی۔ ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ میں نے اسے کئی بار دوستی کا پیغام بھیجا لیکن اس نے جواب نہیں دیا پھر نجانے وقت کی دھند میں وہ کہاں گم ہو گیا۔“

لڑا کی نگاہیں بھور بن کی پہاڑیوں پر چمکتی دھوپ دیکھنے لگیں۔

”ایک۔۔۔ بات پوچھوں لڑا۔۔۔؟“ ایقان نے ٹوٹے لہجے میں جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں ضرور مجھے خوشی ہوگی۔ یوں بھی میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔“

”تمہارے اور عاشق کے مابین کس قسم کے تعلقات رہے تھے؟“

لڑا کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ایقان کو دیکھتی رہی۔

”میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا ایقان! کہ مجھے تمہارے شوہر کی جس خوبی نے اٹریکٹ کیا وہ اسے تمہارے

مذہب نے دی۔ وہ یہی خوبی تھی یہی بات جو تم مجھ سے جانا چاہتی ہو۔ میں اس کے پاس جاتی تھی اسے اپنی قیامت کی آنچ سے پکھلانے کی کوشش کرتی تھی۔ اپنے جلوؤں کی بھرپور داد اس کی بے بسی اور بے چارگی سے وصول کرنا چاہتی تھی لیکن ایقان! نجانے یہ تمہاری محبت تھی یا اس کا ایمان۔۔۔ وہ پکھلتے پکھلتے بھی سنبھل جاتا تھا جیسے۔۔۔ جیسے اس کے اندر بیٹھا کوئی فرشتہ عین وقت پر اس کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارتا ہو۔ وہ یونہی چوٹتا تھا یونہی ہڑبڑاتا تھا۔

ہاشم نے بے اختیار شہلا کو اور شہلا نے بے اختیار ہاشم کو دیکھا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت کے سمندر تھے۔

”میں اپنا بیگ لے آؤں پھر نیچے چلتے ہیں۔ میرا انتظار کرنا۔“ وہ ان کی حیرانی سے قطع نظر مسکراتی ہوئی مڑ گئی۔

”یہ تو تم بالکل تبدیل ہو گئیں؟“ ہاشم کے بنانہ روکا۔ ”رافع ٹھیک کہتا تھا۔“ شہلا نے جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن ایقان کے جملے میں الجھا ہوا تھا۔ ”ہی ہاشم کیسا گزرا؟“ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ اپنے مختصر ”ہی مون“ کے متعلق سوچنے لگی تھی جس میں ہاشم نے مراقبے کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

”تم چاہتے ہو عباد کہ مرے وقت مجھے ذہنی سکون میسر نہ ہو؟“

عباد نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں اپنی بات کہہ کر اب شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”اے۔۔۔“ وہ رکھ سے بولا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟“

”تم نے مجھے یہاں اسپتال میں کیوں لا کر بسا دیا ہے عباد! میں یہاں نہیں مرنے چاہتی میرے بچے! میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر بہت سکون سے جاں دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے عباد! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ انہوں نے بچہ کی دو نون باتھ جوڑ دیے۔ آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے عباد تیزی سے ان کے قریب گیا اور انہیں سینے سے لگا لیا۔

دونوں باپ بیٹا اور بھتیجے بھتیجی اشکبار ہو گئی۔

ایک ایک کی طرف ان کی شناخت ان کی شناخت کے ساتھ۔ منہ زہ بیگم کے لیے یہ سب کچھ قابل برداشت نہ تھا۔ انہوں نے کبھی کسی بات کو اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا تھا۔ ہر تکلیف وہ خاموشی سے اندر ہی اندر اسی لیے سستی آئی تھیں کہ انہیں ہاسپٹل اور ان کمروں سے بچنا خوف محسوس ہوتا تھا۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتی عباد! تم اپنی بیوی بچوں کو آخری لمحوں میں خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے یہاں سے لے چلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔“

”میں نے تمہیں چند دن مزید کم ہو جائیں گے نا بیٹے۔ اچھا ہو گا۔“

عباد جذبات پر قابو پانے کے لیے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ ربیعہ انگلی سے آنسو صاف کرنے لگی۔

”شہلا نہیں آئی۔“ وہ اداسی سے بولیں۔

”آئی کی فلاٹ ایک گھنٹے بعد ایر پورٹ پہ اترے گی۔“ ربیعہ نے گھڑی دیکھی۔

”اے کسی نے کچھ بتایا تو نہیں؟“

”نہیں۔ لیکن ہاشم بھائی کو عباد بھائی نے بتا دیا تھا۔ وہ شہلا آئی کو آپ سے ملوانے لے آئیں گے۔“

”میں شہلا سے گھر پر ملوں گی۔“ وہ بغد ہوئیں۔ ”عباد سے کہو! بس ابھی چھٹی لے کر مجھے گھر لے چلے۔“

ربیعہ خاموش ہو رہی۔ اب ان کی ضد سے کچھ ممکن نہ رہا تھا۔

(ان شاء اللہ آخری قسط آئندہ ماہ)

اس کی مدد ہوشی اچانک ہی ہوش مندی میں بدل جایا کرتی تھی۔ وہ بے بس ہوتے ہوتے پھر سے توانائی حاصل کر لیتا تھا۔ تمہاری محبت سے یا اپنے ایمان سے۔ یہ دونوں باتیں اخلاقیات تمہارا مذہب سمجھتا ہے۔“

اس نے گہری سانس بھری۔

”اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ جب بھی شادی کی۔۔۔ کسی مسلمان مرد سے کروں گی اور اگر وہ پاکستانی بھی ہو تو کیا کہنے۔ خدا نے میری دونوں آرزو میں پوری کر دیں۔“ وہ مسکرائی۔

ایقان کو اس کی مسکراہٹ بھور بن گئی چمکتی دھوپ سے زیادہ خوبصورت محسوس ہوئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایقان کو خود پر بیک وقت رشک بھی آیا اور خود سے نفرت بھی محسوس ہوئی۔

”تم نے مجھے کیسے پہچانا تھا لڑا؟“ اب وہ قدرے دوستانہ سے انداز میں بولی۔

”عاشق اپنے والٹ میں تمہاری اور اپنے بچوں کی تصویر رکھتا تھا۔ بہت صاف گوئی سے بتا دوں کہ تمہارے بچے مجھے بالکل یاد نہیں لیکن تمہارا نقش میرے حافطے میں محفوظ رہ گیا۔ ویسے کیا اب میں پوچھ سکتی ہوں کہ عاشق کہاں ہے؟“

”عاشق۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں پاکستان میں ہیں۔“

”کیا کر رہا ہے آج کل؟“

”مجھے اور بچوں کو یاد کر رہا ہے۔“

”اسے یہاں کیوں نہیں لائیں؟“ لڑا حیرانی سے بولی۔

”اگلے ماہ لے کر آؤں گی۔“ وہ مسکرائی۔

photo.com

سوٹ کیس کولاک کر کے اس نے سر اٹھایا۔ شہلا اس کے بالکل قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دکھ اور بے اعتباری تھی۔ ہاشم جزبہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”ایقان پیچھو اب تک نہیں آئیں۔“

”بس آئی ہی ہوگی۔“

”اسلام آباد پہنچنے میں بھی دو گھنٹے لگ جائیں گے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”اب نہیں نکلنا چاہیے۔ کمپنی کا ڈرائیور بھی صبح سے گاڑی لے کر آیا ہوا ہے وہ ہمارا منتظر ہے۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ شاکی سے انداز میں بولی۔ ”میں اور میرا ہینڈ بیگ تیار ہے۔“

اسی وقت بیل ہوئی تھی۔ ہاشم نے برقعہ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایقان کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہاشم نے غور سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔

”چلیں؟“ وہ شادمان سی بولی۔

ہاشم کے ابو حیرت سے تن گئے۔ ایقان کے گزشتہ سارے انداز غائب ہو چکے تھے۔ وہ بالکل پہلے والی ایقان نظر آتی تھی۔

”آپ۔۔۔ تیار ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔ میرا بیگ بھی تیار ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”کیوں بھی شہلا! مختصر سا ہی مون کیسا گزرا۔ دیکھو میں نے تم لوگوں کو بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ گواہ رہنا کہیں جا کر سب سے کہو۔ پیچھو نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ کباب میں ہڈی بنی رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

جپانیسیوں میں قصہ

ترانا ربیعہ کو دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

صوفے پر بیٹھا ہوا عبد الباری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"اگر تمہیں اچھی طرح سے جانتی نہ ہوتی تو یہی نتیجہ ہی تھا کہ تم ماضی کے ساتھ مجھے بھی بھلا چکی ہو اور اب تمہیں مجھ سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن۔۔۔" ترانا گلوگیر لہجے میں بات اور سوری ہنسنے لگی۔

"لیکن میں اپنی ربیعہ کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اس لیے لمحہ بھر کے لیے بھی میرے دل میں کوئی شک کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوا۔ مجھے علم تھا کہ تم کسی مجبوری کے تحت ہی میرے گھر نہ آسکی ہوگی اور یہاں پہنچ کر یہ خیال ٹھیک ثابت ہو گیا۔ انہی دنوں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

ربیعہ نے نم آنکھوں سے ترانا کا پر خلوص چہرہ دیکھا۔

"ہم انہیں گھر لے آئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے وہ اب ٹھیک ہیں؟" ترانا مطمئن ہوئی۔

"ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔" وہ خود پر کمال ضبط کر کے بولی۔ "دل کی تسلی کے لیے ٹریٹ منٹ چل رہا تھا لیکن امی نے ضد کی کہ وہ ہسپتال میں مزید ایک گھنٹہ بھی نہیں رکھیں گی۔ مجبوراً۔۔۔"

"او۔۔۔" اس کے بازوؤں پر ترانا کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

"بہت افسوس ہوا یہ سب کچھ جان کر۔۔۔" عبد الباری بولا۔

"آپ کیسے ہیں باری بھائی۔" ربیعہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ "دکھ کی شدت سے دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔"

آپ سے سلام دعا تک نہ کی۔

"اٹس اوکے ربیعہ! وہ نرمی سے مسکرایا۔ "میں تمہاری کنیت سے مسحور ہو کر رہ گیا ہوں۔"

"آپ لوگ بیٹھیں نا۔"

"میں پہلے آنٹی کو دیکھنا چاہوں گی۔" ترانا بولی۔ "باتیں تو کبھی بھی کی جاسکتی ہیں ان کی عیادت ضروری ہے۔"

"او امی کے کمرے میں چلتے ہیں۔" ربیعہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں منیرہ بیگم کے پاس لے آئی۔ وہ دروازے کے زیر اثر نیم غنودگی میں تھیں۔ انہیں دیکھ کر قدرے ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"کیسی ہو بیٹی! ربیعہ کے تعارف کروانے پر وہ خوش ہو کر بولی تھیں۔

"جی میں ٹھیک ہوں آپ۔۔۔"

"اللہ کا احسان ہے۔" وہ مطمئن انداز میں بولیں۔

"ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو کہیں دیکھا ہو۔" ترانا نے جیسے حافظے پر زور دیا۔

"ہو سکتا ہے۔" وہ شفقت سے مسکرائیں۔ "تم ربیعہ کی ویسی بہن ہونا جو ایک مرتبہ بازار میں اسے ملی تھیں۔"

"جی ہاں لیکن تب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ آپ شاپ کے اندر تھیں۔ ربیعہ اور میں شاپ سے باہر تھے۔"

"مجھے ربیعہ نے بتایا تھا کہ اسے تم سے ملنے جانا ہے لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے بیٹی کہ ہم چاہتے ہوئے بھی اسے تمہارے پاس نہ بھیج سکے۔"

"جی میں جانتی ہوں۔ میرے یہاں تک پہنچنے میں سارا کمال باری کا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کے بعد کسی طرح عباد بھائی کا سیل نمبر اور پھر ایڈریس حاصل کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ربیعہ کے ساتھ کوئی براہِ علم ہو گئی ہوگی۔"

ترانا اور منیرہ بہت گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ربیعہ چائے بنانے کے خیال سے بچن میں چلی آئی تب

اسے حیرانی ہوئی تھی۔

انہی دنوں چائے تیار کر لی تھی اور اب ٹرائی میں چیزیں سیٹ کر رہی تھی۔

"تم کیوں چلی آئیں ربیعہ! وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ "میں چائے لا رہی ہوں نا۔"

"حیرت انگیز۔" ربیعہ مسکرا دی۔

"مظنر کر رہی ہو؟" وہ بھی مسکرائی۔

"بھڈا نہیں۔ تمہاری حرکت پر پیار آ رہا ہے۔ میں دو دن کے لیے ہسپتال گئی اور تم نے سب کچھ سیکھ لیا۔"

"تمہارے جانے سے احساس ہوا کہ تم اس گھر کے لیے اللہ کا کتنا بڑا انعام ہو۔ تم کس طرح سارے کام آسانی سے سرانجام دے لیتی ہو ربیعہ؟"

معصومیت سے پوچھتی ہوئی انہی دنوں ربیعہ کو بہت اچھی لگی۔

"جیسے تم نے اتنی جلدی اتنی آسانی سے یہ سب کچھ تیار کر لیا ہے۔" اس نے ٹرائی پر نظر دوڑائی۔

"تمہاری کنین آئی ہے۔ اتنی خاطر داری تو اس کا حق ہے۔" انہی دنوں دھکیلتے ہوئے بولی تھی۔ ربیعہ اس کے ساتھ چل دی۔

"آپ لوگوں کا بہت احسان ہے آنٹی! ربیعہ کو اس نے گھر کی مضبوط اور محفوظ چھانوں دے کر آپ نے جو احسان ہم پر کیا ہے اس کا بدل تو صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔" ترانا کہہ رہی تھی۔ ربیعہ کے قدم دروازے پر لمحہ بھر کے لیے رکے پھر اندر داخل ہو گئی۔

ایک عرصے سے وہ اپنا باغیچہ ایک جگہ پر چھائی رہی تھی۔ ہر چند کہ اس میں چھپانے والی کوئی بھی بات نہ تھی۔ وہ اکثر صبح کو اٹتی تھی کہ اس نے اور عباد کے گھر والوں سے حقیقت چھپا کر اچھا نہ کیا تھا۔ وہ سب کے سب اتنے کشادہ دل لوگ تھے کہ ہر بات جانتے ہوئے بھی اپنے گھر میں خندہ پیشانی سے جگہ دیتے۔ منیرہ بیگم نے ترانا کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔

انہی دنوں سب کو لوازمات کے ساتھ چائے پہنچانے لگی تھی۔ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔

چائے لی کر عبد الباری نے سب سے رخصت چاہی تھی۔ وہ کسی ضروری کام کے تحت جا رہا تھا۔ البتہ ترانا کا ارادہ رات گئے تک ان لوگوں کے پاس رکنے کا تھا۔

عبد الباری کے جانے کے بعد عباد بھی کچھ دیر آرام کرنے کے خیال سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیرہ بیگم کے پاس ترانا اور ربیعہ ہی بیٹھی رہ گئیں۔

"او۔۔۔" اچانک ہی ترانا کو کچھ یاد آیا تھا۔ "میرا ایک بیگ ڈرائنگ روم میں رکھا ہے ربیعہ! اس میں تمہاری کچھ امانتیں ہیں میں آج اسی خیال سے وہ ساتھ لے آئی کہ وہ سب کچھ جس پر صرف تمہارا حق ہے تمہیں سونپ دیا جائے۔ یہ زندگی تو قدم قدم پر ہمیں جدا کر دیتی ہے۔ جانے کل ہم دونوں پھر کہاں ہوں۔"

ربیعہ نے قدرے حیرانی سے ترانا کو دیکھا۔

"بھول گئیں؟" ترانا مسکرائی۔ "جب تم لاہور آئی تھیں تب تم نے اپنا کچھ سامان میرے پاس امانتاً رکھوایا تھا پھر عباد بھائی کے ساتھ جانے کے لیے جب تم گھر سے نکلیں تو غفلت میں سب ہی کچھ میرے پاس بھول گئیں۔"

اب ذرا ڈرائنگ روم سے وہ بیگ اٹھا کر لے آئی اس کے سامنے تمہارا سامان تمہارے حوالے کر دوں۔"

ترانا اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

ربیعہ مترددی ہو کر اٹھی۔ منیذہ بیگم کی طبیعت کے پیش نظر وہ انہیں کوئی ٹینشن دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اس بات کی مٹنی بھی تھی کہ انہیں اپنے متعلق ہر بات سے آگاہ کر دے۔ منیذہ بیگم سے اس کا جو دلی رشتہ استوار ہو چکا تھا وہ متقاضی تھا کہ ربیعہ اپنے اور ان کے مابین پڑا ہر پردہ اٹھا دے۔

چھوٹا سا بیگ اٹھا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ منیذہ بیگم کے پلنگ اور ترانہ کی کرسی کے بیچ پرڈی ٹیبل پر اس نے بیگ رکھ دیا۔

”تم خود ہی کھولو اسے اور اپنی چیزیں چیک کر لو۔“ ترانہ بے حد اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ربیعہ نے بیگ کھول کر اس میں سے سامان نکالنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ خود بھی ساکت رہ گئی تھی۔

ایک سرخ جوڑا تھا، سونے کے تاروں کے کام سے مزین۔ کام اب تک کالا نہ پڑا تھا، البتہ چمک ضرور مدھم پڑ گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا پاکس تھا۔ ربیعہ اسے کھولے بنا بھی جانتی تھی کہ اس پاکس میں کیا ہے پھر بھی اس نے وہ پاکس کھولا۔ اس میں طلائی زلیزات تھے، کندھن کے کام کا بھاری گلو بند اور جھمکے، دو خوبصورت نگین۔

ربیعہ ساکت ان چیزوں کو گھور رہی تھی۔ اس کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے تھے۔ اسے نچانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ اپنی داری اماں ان کے چھوٹے چھوٹے صندوق جن میں سے ایک برتال لگا رہتا تھا۔ اپنا چھوٹا سا گھر جس کے تختہ میں بار سنگھار کا درخت اپنی مہک پھیلانے رکھتا تھا۔ اپنا محلہ، محلے کے پرخلوں لوگ۔ اپنی سہیلیاں، اپنا کالج، اپنا بچپن، اپنی معصومیت۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جیسے تسبیح کے دانے ایک کے بعد ایک گرتے ہوں۔

دفعتا ”وہ بری طرح ہے چونکی تھی۔ اس نے منیذہ بیگم کو ان چیزوں کے پاس کھڑا دیکھا، وہ دیوانوں کی طرح انہیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ کسی دیوانے کا چہرہ محسوس ہوتا تھا، ان کے انداز میں حد درجہ وحشت تھی۔

”یہ سب کچھ یہ سب کچھ۔“
 ”یہ سب کچھ ربیعہ کا ہے آئی!“ ترانہ بھی قدرے گھبرا کر کھڑی ہوئی۔
 ”نہیں۔۔۔ وہ چلا میں۔“ یہ سب کچھ میرا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔“
 پھر وہ دیوانوں کی طرح ربیعہ کی جانب بڑھیں۔
 ”یہ بھی میری ہے۔“ وہ ربیعہ کو خود سے بچھین کر چلا میں۔ ”یہ بھی میری ہے۔ یہ میری ہے۔ یہ میری ہے۔“
 ”یہ میری ہے۔“
 ”یہ میری ہے۔“

عباد اور انقیہ گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
 ”امی۔۔۔ امی۔۔۔“ عباد ان کی جانب بڑھا۔
 تب تک وہ ربیعہ کے بازوؤں میں جھول چکی تھیں۔



میرا نام مونا تھا، مونا جوزف۔ میں ایک کر سچن فیملی کا حصہ تھی۔ مجھے اپنا بچپن کچھ یاد ہے۔ میری ماں ایک مڈوائف تھی، باپ ایک شرابی۔ میری ماں جو کچھ کمائی تھی میرے باپ کے تنے کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ ماں بیمار رہتی تھی، میرے باپ کا کہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر تاجلا گیا۔ اسے لی لی ہو گئی۔ اسے اپنا مستقبل نظر آ رہا تھا، اس لیے اسے میرے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ اس نے مجھے نرسنگ اسکول میں داخلہ دلوا دیا، خود زندگی کا گاڑی کو اپنا پورا زور لگا کر کھینچتی رہی۔ میں نرس بن گئی اور مجھے ایک چیری اسپتال میں نوکری مل گئی۔

پہلے دن ہی میری ماں اسی اسپتال کے ایک بستر پر گھری نیند سو گئی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ میرے اور اس نے کا گہرا اثر پڑا لیکن میرے باپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اس کے لیے کمانے والے دو تازہ دم ہاتھ میدان عمل اتر چکے تھے۔ زندگی یونہی بے یابی سے گزر رہی تھی، تب ایک روز کچھ زخمیوں کو ہسپتال لایا گیا۔ وہ لوگ کسی رگزار رستے سے گزر رہے تھے کہ ان کی بس گہرے کھڈ میں جا گری تھی۔ ان ہی بچ جانے والے زخمیوں میں ایک احمد جہانزیب تھا۔ ایک خوبصورت جوان جو اپنے آبائی شہر سے بہت دور کسی ناہم پرو جیکٹ پر کام کرنے ہمارے قریب میں آیا ہوا تھا، اس کی بس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور یوں وہ ہسپتال لایا گیا۔ شاید قسمت نے جنہیں جدا ہو اور جنہیں ملانا ہو ان کے لیے ہی حادثے تشکیل پاتے ہیں۔

میں جو کہ ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھی، احمد جہانزیب کو بھاگئی۔ نجانے اسے میری کیا بات ہو آئی۔ میرے نقش بہت خوبصورت تھے لیکن میرا رنگ سانولا تھا جبکہ وہ گورا چٹا، یونانی دیوتاؤں کا سا حسن نہ والا ایک خاندانی آدمی تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ پہلا نرہ اور اس ڈیڑھ ماہ میں ہم دونوں نے نظروں ہی نظروں میں اپنے تمام عہد و پیاں اٹھا لیے، جس روز اسے چھٹی ملی، اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ مجھے بھلا کیا چاہیے

میں نے اپنے باپ کو محض ایک دفعہ ہی سی اطلاع دی کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور ایک مسلمان نوجوان سے شادی کر رہی ہوں۔ اس دن میرا باپ بہت ڈھنگ پرست گڑ گڑایا۔ مجھے میری مری ہوئی ماں کے واسطے دیے لیکن احمد جہانزیب کی محبت ایک مقناطیس تھی اور میرا وجود ایک شہید، بس لوے کا ٹکڑا۔

اپنے اپنے باپ کی ایک نہ سنی۔ احمد جہانزیب اور میں نے شادی کر لی۔ میری ماں نے میرے لیے شادی کا جوڑا تیار کیا، ہوا تھا سفید لیس دار فراک۔ میں نے اپنی شادی کے دن وہی جوڑا پہنا۔ ہماری شادی مسجد میں ہوئی، ان دنوں میں شریف الاسلام ہوئی، پھر ہمارا نکاح ہوا۔ جوزف فرنانڈس مسجد کے باہر بیٹھا رو تارہا اور مجھے اور احمد جہانزیب کو بد دعا میں دیتا رہا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ شاید اس دن میرے باپ کی کسی بد دعا نے میرا نب شروع کیا تھا اور۔ اور تاویر میرے تعاقب میں رہی۔ تاویر۔ میرے اور میری خوشیوں کی راہ میں حائل بن گیا۔

غیر میں بتا رہی تھی کہ مونا جوزف سے منیذہ احمد بن کر میں وقتی طور پر بہت خوش تھی۔ احمد جہانزیب میرے ہونے سے شہر سے بھی دور دراز ایک پہاڑی علاقے میں ایک پرو جیکٹ پر کام کرنے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، شادی کے بعد بتایا۔ اس نے بتایا کہ دنیا میں اس کے خونی رشتوں میں اس کی ماں اور اس کی ایک بہن ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور ماں اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ جب سے ان کا ٹرانسفر دور دراز کے علاقے میں ہوا، ماں اکیلی ہو گئی۔ اسے اکیلا پن برا لگنے لگا، تب اپنی بیٹی بلقیس کے اصرار پر انہوں نے مل کر احمد جہانزیب کی منگنی بلقیس بانو کی نندینا بیگم سے کر دی۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی، افسوس بھی ہوا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ ایک منگنی شدہ شخص ہے، ورنہ شاید میرا فیصلہ مختلف ہوتا۔ احمد جہانزیب نے نوکری سے چھٹی لے لی۔ وہ مجھے اپنے شہر لے آیا، جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ ان دنوں اس کی بہن بھی اپنی ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں احمد جہانزیب کے لیے سخت پریشان تھیں کیونکہ جہان علاست اس نے اپنے گھر والوں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے اب تک وہ دن یاد ہے۔ میں احمد جہانزیب سے پیچھے کھڑی تھی۔ بلقیس بانو اور ماں۔ دونوں احمد سے لپٹ کر رو رہی تھیں، اسے پیار کر رہی تھیں، لپٹے سے صدقے واری ہو رہی تھیں۔ تب اچانک ان دونوں کی نظر مجھ پر پڑی۔
 ”آہ۔۔۔ میں آج تک اپنے آپ میں ان نظروں سے خوف زدہ رہتی ہوں۔ وہ نظریں۔۔۔ وہ تلوار تھیں، وہ آری

تھیں جو میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ ان میں اتنی نفرت تھی کہ اب تک اس نفرت کا سوچ کر میرا دل لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان میں اتنی تپش تھی کہ اس تپش کو آج اتنے سالوں بعد بھی میں اپنے رخساروں پر دیکھتا ہوں۔ محسوس کر سکتی ہوں۔

”یہ کون ہے؟“ اماں نے اسی تپش زدہ لہجے میں پوچھا۔
”میری سیجا!“ وہ مسکرایا۔ ”میری بیوی۔“ منہ زہ! میں نے اپنے خطوط میں اسی کا ذکر کیا تھا۔ ”دفعۃً“ بلقیس بانو نے اپنا سر پٹینا اور بین کرنا شروع کر دیا۔

اسی طرح احمد کی اماں نے بھی میرا استقبال اسی انداز میں کیا۔ وہ دونوں اس طرح رو رہی تھیں جیسے جیسے کسی کا انتقال ہو گیا ہو۔ میں ان کے انداز سے سخت خوف زدہ ہو گئی تھی۔
احمد نے بہت مشکلوں سے انہیں خاموش کر لیا، ان کی منت سماجت کی، ان کے آگے ہاتھ جوڑے ان کے پیر پکڑے۔ اماں اندر سے تو راضی نہیں تھیں لیکن احمد کی منت سماجت سے خاموش ضرور ہو گئیں۔ تاہم بلقیس بانو خاموش بھی نہ ہوئیں۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے برا بھلا کہتی رہیں۔ میرے پچھلے مذہب کو وہ میرا ناقابل معافی جرم گردان رہی تھیں، ان کے لیے میں جیسے ایک نجس، ناپاک شے تھی جسے وہ کسی طور قبول نہ کر سکتی تھیں۔

”کتنا سمجھایا تھا اماں! کتنا سمجھایا تھا میں نے آپ کو لیکن آپ کرا پیٹے بیٹھے بہت ماں بہت بھروسہ تھا۔“
جاتے جاتے اماں سے بولیں۔ ”دیکھ لیں، میری زندگی برباد کر ڈالی آپ کے بیٹے نے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں۔ مینا اور منور مجھے معاف کر دیں گے؟ کبھی نہیں، منور میری زندگی عذاب بنا دے گا میرے لیے۔“

وہ آنسو پونچھتی باہر کی جانب بڑھیں پھر لچہ بھر کے لیے میرے قریب رکیں۔
”کلموی! کلموی! کیا پڑھ کر پھونکا تو نے میرے معصوم بھائی پر؟ جاؤ گرنی! ہمیں برباد کر کے تو بھی خوش نہ رہے گی۔“

یہ دوسرے شخص کی بددعا تھی میرے لیے۔ پہلے میرا باپ اور پھر ساس اور منند۔ میرے دل کو اندیشوں اور دوسروں کی آندھی نے گھیر لیا۔

زندگی بہر طور شروع ہوئی۔ جہانزیب کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈپارٹمنٹ اتنی چٹھیاں برواشت نہ کر پایا۔ گھر میں مشکلات کا آغاز ہو گیا۔ اوھر بلقیس کا کہنا سچ ثابت ہوا کہ منور امین نے بلقیس بانو کو ہمارے جرم کی سزا بنا شروع کر دی۔ مینا بنے زہر کھا کر زندگی ختم کرنے کی کوشش کی، تاہم اسے بچا لیا گیا۔ میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا کہ مینا احمد جہانزیب کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔

کچھ دن اور نکلے، میں نے احمد جہانزیب سے نوکری کی اجازت مانگی۔ اس نے قدرے تردد کے بعد میری بات مان لی۔ میں نے ایک مقامی اسپتال میں نوکری کر لی۔ وہاں میری ملاقات رابرٹ سے ہوئی۔ رابرٹ میری رشتہ کی ایک خالہ کا بیٹا تھا۔ پوری دنیا میں وہ واحد شخص تھا جس کا میری آنجہانی ماں سے کوئی تعلق بنتا تھا۔ مجھے رابرٹ سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن جلد ہی یہ خوشی ایک ناقابل بیان الجھن میں بدل گئی۔ رابرٹ میرے گھر آنے جانے لگا۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن میں اسے منع بھی نہ کر پائی۔ شاید میری اسی خاموشی سے میری بد قسمتی کا آغاز ہوا۔ مجھے علم نہ ہوا یا کہ احمد جہانزیب کے دل میں کس وقت میری جانب سے بدگمانی نے جنم لیا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا، کچھ نہ پوچھا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی نہ بدلا۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔

رابرٹ کچھ دنوں کے لیے میرے آباؤی شہر گیا، وہاں سے واپسی پر اس نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کی حالت کتنے سے بھی بدتر ہے۔ وہ شہر سے دور ایک جھونپڑے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں صرف اس امید پر تھامے ہوئے ہے کہ میں ایک مرتبہ اس سے مل جاؤں۔

میں یہ سب کچھ سن کر وہ نہ پائی۔ احمد سے سرسری سی اجازت لے کر میں رابرٹ کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے گئی۔

میں ایک نو مسلم تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میں اس طرح ایک غیر مرد کے ساتھ بلا ضرورت سفر نہیں کر سکتی۔ وہ بھی کئی دن کا سفر لیکن مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا، مجھے کسی نے نہیں روکا۔

کہ احمد نے بھی نہیں۔ میں باپ کے پاس پہنچی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مجھے معاف کیے بنا بہت دور جا چکا تھا۔ سے دفنایا جا چکا تھا۔ میں اس کی قبر پر دو آنسو بہا کر واپسی کے لیے روانہ ہو گئی۔ گھر پہنچی تو ایک حیرت انگیز دل کو دھلا دینے والا انکشاف میرا منتظر تھا۔

احمد مجھے چھوڑ کر رہا۔ ”اٹھا“ ایک غیر معینہ مدت کے لیے۔ مجھے کچھ بھی بتائے بغیر مجھ سے ملے بغیر۔ وہ بائیسے کر سکتا تھا؟۔۔۔ جی سوچ کر میں یا گل ہو گئی لیکن کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آیا۔ آخر وہ اچانک تو نہیں گیا تھا۔

میں نے کوئی پلاننگ کی ہوئی۔ میں ایسا ہی کیا ہو گا، کوئی طے شدہ پروگرام ہو گا جس پر عمل درآمد کیا گیا تھا لیکن میری ہمت کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ بلقیس بانو تو میری صورت سے نفرت کرتی تھیں۔ اماں کی بے نیازی بھی بے عروج پر تھی۔ میں نہ زندہ بولی میں رہی تھی نہ مردوں میں۔ مارے باندھے نوکری پر جاتی تھی واپسی پر پورے گھر کا کام کرتی تھی پھر بھی کوئی مجھ سے خوش نہ تھا۔ مجھے کسی کی خوشی سے غرض نہ تھی، سوائے احمد جہانزیب کے بن اس ظالم نے تو مجھے اپنا کوئی فون نمبر کوئی آئیڈیا تک نہ دیا تھا جس پر میں اس سے رابطہ کر پاتی۔

پھر میرے اندر خوشی کی ایک کونیل پھولی۔ احمد جہانزیب سے جانگسمل جدائی کا اکیسواں روز تھا۔ میں نے اس شک سا ہونے پر اس کی تصدیق چاہی۔ ہسپتال میں دوران ڈیوٹی ہی مجھے یہ خوش خبری ملی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔

میں نے کچھ دنوں میں یہ خبر سنی تھی۔ میں خوشی سے مومنی بننا چاہتی تھی۔ میں احمد کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی

میں گھر پہنچی، اماں کو بتایا۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے

میری کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے ان سے احمد کا پتہ یا فون نمبر مانگا، ان کے تہموں میں جھک گئی لیکن ان کا ایک جواب تھا۔ انہیں بھی میری طرح کچھ علم نہ تھا، حالانکہ میں جانتی تھی کہ ان کا احمد سے فون پر رابطہ ہے۔ اکثر

اپنے سے بچہ انہیں بلانے آتا تھا۔ احمد ہرگز سر۔ بدن انہیں فون کرتا تھا۔

مجھے احمد کے رہنے پر حیرت کم اور افسوس زیادہ ہوتا تھا۔ اس نے جیسے میری زندگی کے ساتھ ایک بے رحم

خاک بھیل ڈالی۔ مجھے ایک دلدل سے نکال کر ایک صحرا میں لا کھڑا کیا تھا۔ میں نے خود کو تقدیر کے آگے

زنگوں کر دیا۔ حالات سے سمجھوتہ کر کے میں بالکل خاموش ہو گئی۔ دن گزرتے گئے۔ میں اس گھر میں تنہا اور

ان کی بے نیازی اور بے مہری کے ساتھ جیتی رہی۔ حتیٰ کہ میری ڈیلیوری کا مہینہ آ پہنچا۔ تب اچانک نجانے کیا

ہا۔ اماں اور بلقیس بانو کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ وہ دونوں میرے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔ مجھ سے اپنے سابقہ

سے کی معافی چاہنے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے دلاست دینے لگیں کہ بچے کی پیدائش پر وہ ضرور کسی نہ کسی

رح احمد کو اطلاع بجھوائیں گی اور وہ ضرور آئے گا۔ میں نے سمجھا کہ تقدیر کی بے مہری ختم ہوئی، آزمائش ختم

ہوئی۔ اچھے دن جن کی آس میں جیتی تھی، آگے کیا خبر تھی کہ یہاں سے ایک نیا امتحان، نئی آزمائش کا آغاز ہوا

بتا سب

اماں اور بلقیس بانو مجھے ہلا پھلا کر ایک دور افتاد علاقے میں بے ہسپتال میں لے آئیں، جہاں ان کے بقول

نرک پیدائش ہوئی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ احمد کا بچہ بھی اسی ہسپتال میں جنم لے۔ نجانے کیوں مجھے ان کی بات

سنیں نہ تھا۔ میرے دل میں ایک کھٹکا سا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے اور پھر وہ انہونی ہو کر رہی۔ دردزدہ

سے پہلے ہی مجھے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کروایا گیا اور جب مجھے ہوش آیا۔ آفس۔ میری کوکھ خالی تھی، میرے ہاتھ خالی تھے، میرا دل خالی تھا۔
آپریشن کے ذریعے ڈیوری عمل میں لائی جا چکی تھی۔ وہاں میرے پاس کوئی نہ تھا، نہ اماں، نہ بلقیس، نہ میرا بچہ۔

میں بہت روئی چٹی، بہت شور مچایا لیکن سب کے منہ پیسے دے کر بند کئے جا چکے تھے۔ پورا عملہ بیک زبان کہہ رہا تھا کہ مرہ بچہ پیدا ہوا تھا، جسے دفنا کر اس کی وادی اور پھونکی وہاں سے چلی گئی تھیں۔
جانے سے قبل وہ ایک لفافہ بھی میرے لیے دے گئی تھیں۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور مجھے علم ہوا کہ منیبت کبھی اکیلی نہیں آئی۔ اس میں احمد جہانزیب کا تحریر کیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ کیوں؟ کس لیے؟ کس جرم کی سزا؟ میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ طلاق نامے پر لکھی تاریخ آٹھ ماہ پرانی تھی۔ گویا آٹھ ماہ قبل اس نے مجھے طلاق مجھوادی تھی جسے مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا۔ یہ ایک گتھی تھی جسے میرے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں دن رات روتی اور اسے سلجھانے کی کوشش کرتی۔ ہسپتال کے کمرے میں رکھے اپنی کیس میں میرے سارے کپڑے اور میرا سب سا زوسا مان موجود تھا۔ گویا وہ مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کے لیے ہی وہاں لائی تھیں۔

آپریشن کے پانچویں دن مجھے فارغ کر دیا گیا۔ ہسپتال کے اخراجات کی ادائیگی کی جا چکی تھی۔ میرے مہر کی رقم بھی مجھے اپنی کیس میں مل گئی تھی لیکن مجھے اپنا بچہ چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے جسے پورے نو ماہ میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر محسوس کیا تھا جس کی کوئل انگڑائیوں کو اپنے اندر سمیٹے رکھا تھا جس کے ساتھ پھروں چھوٹی چھوٹی باتیں کی تھیں۔ اس کے باپ کی جفاؤں کی ساری شکایتیں میں اسی سے کیا کرتی تھی۔ اس بچے کو میں نے ایک نظر تک نہ دیکھا۔ میں نے اس کی لڑائیوں کو جو تھک نہیں لے سکتی تھیں، اس کے ماتھے پر بوسہ تک نہ دیا۔ میں نے اس کے نرم وجود کی خوشبو کو اس کے پس کی گرمی کو اپنی روح میں اترنا محسوس نہ کیا۔ مجھ سے زیادہ تھی اماں، مجھ سے زیادہ اجازت اور دیر، پوری دنیا میں کوئی نہ تھا۔
روتی، ہلکتی، سسکتی میں اپنا زخمی وجود لے کر ایک لبا سفر پہنچنے کے لیے صرف اپنا بچہ واپس لینے کے لیے گھر پہنچی تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ مکین وہ گھر بچ کر جا چکے ہیں۔ میں پوری دنیا میں اکیلی رہی۔

بہر طور سانس کی ڈور بندھی رہے تو بندہ بشریٹ بن کر ہر مشکل بھیل جاتا ہے۔ میں ہسپتال چلی آئی۔ ایک گہری جامد خاموشی کے ساتھ میں نے زندگی کا ننا شروع کی۔ احمد جہانزیب کوں تھا میں بھول گئی۔ ہمیشہ کے لیے بھول گئی لیکن ایک ننھے وجود کے بلکنے کی آواز مجھے نیند میں چونکا دیا کرتی تھی۔ پورا ڈیڑھ ماہ میری تپیں میرے سینے پر بھینکتی رہی اور میرے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہوتا رہا۔ میرا آجکل گیلا ہی رہتا تھا۔ میرے دل کا خون۔ میرے جگر کا لہو۔ دودھ بن کر چھاتی سے بہتا تھا، آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا تھا اور۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اماں اور بلقیس کو ہمیشہ پیا سارہنے کی بددعا دیتی تھی پھر میں کراچی چلی آئی۔

میں ایک ہنگامہ خیز زندگی کا حصہ بن کر اس رونے کی آواز کو فراموش کرنا چاہتی تھی جو میری راتوں کی بے خوابی کا سبب تھی۔ کراچی میں خوش قسمتی سے ایک اچھے ہسپتال میں مجھے نوکری مل گئی۔ وہاں میری ملاقات محسن علی صاحب سے ہوئی۔ وہ ایک ازحد شریف النفس اور بے تحاشا اچھے انسان تھے۔ چند ماہ قبل ان کی بیوی ایک بچی کو جنم دے کر انتقال کر گئی تھیں۔ اس بچی سے پہلے بھی ان کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ میری داستان غم نے محسن صاحب کے قلب پر گہرا اثر کیا۔ انہوں نے سیدھے سبھاؤ مجھ سے اپنی زندگی میں شامل ہو جانے کے لیے کہا تاکہ میری متاکو قرار مل سکے اور ان کی بچوں کو ماں کا پیار اور ان کے گھر کو ایک گھراں۔ سو اس طرح ایک بچہ کھو کر

مجھے تین بچے مل گئے۔

چند ماہ کی انیت۔ دو سال کا عباد اور ساڑھے تین سال کی شہلا۔ میں نے اپنے بچوں کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں لیکن کبھی ان سے یہ حقیقت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی اور میرے بچوں نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں اور ہمیشہ مجھے یہ بات بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں یہ بات بھول گئی، میں بھول گئی کہ یہ میرے اپنے وجود کا حصہ نہیں ہیں۔

لیکن۔۔۔ لیکن وہ آواز۔ میں وہ آواز نہیں بھول پائی جو میں نے حالت بے ہوشی میں سنی۔ میں ان ننھے ہاتھوں کا لمس نہ بھول سکی جو میرے اندر انگڑائیاں لیتے تھے۔ میری بے خوابی میں کئی ضرور آگئی لیکن اب بھی اکثر رات کو آنکھ بے وجہ ہی کھل جاتی ہے لیکن اب۔۔۔ اب جو سکون کی نیند سوؤں گی تو شاید روز قیامت ہی جاگوں۔

منیہہ بیگم کی کہانی مجھے میرے والد منور امین نے بستر مرگ پر سنائی۔ یوں تو مرتے دم تک انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کیا لیکن انہوں نے کسی سے بھی معافی مانگنا پسند نہ کی لیکن ان کی آنکھوں میں موت کا بے تحاشا خوف چخ چخ کر کہتا تھا کہ انہیں اپنی پچھلی پوری زندگی پر وقت ایک فلم کی مانند چلتی نظر آتی ہے۔ وہ مرنے سے سخت خوف زدہ تھے اور ان کی زندگی موت سے بھی بدتر تھی۔ ایسا صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے ساری زندگی حقوق العباد کو جی بھر کر ملیا میٹ کیا ہے جنہوں نے دو سروں کی بددعا میں سمیٹی ہوں، دو سروں کو لہو رنگ آنسو دلائے ہوں۔ میرے والد ایک ایسے ہی انسان تھے۔

نجانے کیوں مرنے سے چند گھنٹے قبل انہوں نے بتا میرے کچھ پوتے مجھے یہ کہانی سنائی۔ شاید انہیں اور اک

میرے ماموں نے احمد جہانزیب ایک خوبصورت فنکارانہ مزاج کے حامل شخص تھے۔ انہیں بتائے بغیر میری امی نے میری نالی کو رضامند کر کے مینا پھپھو سے جہانزیب ناموں کی مقلدی طے کر دی۔

مینا پھپھو نہ صرف یہ کہ واجبی شکل و صورت اور واجبی تعلیم کی حامل تھیں، انہوں نے کبھی اپنی شخصیت کو کوئی خوبصورت صفت عطا کرنے کے متعلق بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اچھی صفات سے میرا ایک سخت مزاج، انا پرور عورت تھیں جو میرے والدین کی شادی کے موقع پر ماموں کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھیں اور ماموں کو بلا شرکت غیرے اپنانا انہوں نے زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔

ماموں جب منیہہ دہائی کو گھرا لے تو تمام افراد پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔ کئی تو ایسے بھسم ہوئے کہ کبھی ان پر سزہ نہ آگ سکا۔ ان میں مینا پھپھو اور میرے والد شامل تھے۔ امی، نالی اور میرے والد نے ایک مشترکہ منصوبہ بنایا جس کے تحت کسی بھی صورت منیہہ مامی کو خاندان کا حصہ نہیں بنانا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ جہانزیب ماموں کی نہایت فاش غلطی تھی جسے ہر طور درست کرنا تھا۔

ماموں کو دکھانے کے لیے نالی امی نے مرنا کیا نہ کرتا کے مصداق بے دلی سے منیہہ مامی کو گھر میں رکھ لیا۔ انہیں وہ زیور بھی دیا جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اپنا خاندانی عروسی لباس بھی دیا۔ منیہہ مامی فطرتاً ایک سادہ اور معصوم خاتون تھیں۔ وہ اس پر ہی خوش ہو گئیں۔

اب پلاننگ پر باقاعدہ عمل درآمد شروع کیا گیا۔ امی اور نالی امی عاموں کے پاس جانے لگیں، ان سے تعویذ لالا کر جہانزیب ماموں کو پلائے جاتے تاکہ ان کا دل منیہہ مامی کی جانب سے بدگمان کیا جاسکے۔ نالی امی جیکے جیکے اندر نیا اندر منیہہ مامی کے خلاف ماموں کو بھرا کرتی تھیں۔ سوئے اتفاق ان ہی دنوں مامی کے ایک رشتے کے بھائی جو

ایک عیسائی نوجوان تھے مای کو مل گئے۔ بس یہیں سے ان کی ذات کے خلاف سب سے بڑا ایٹو کھڑا کرنے کی بنیاد فراہم ہو گئی۔

امی اور نانی امی نے ماموں کو باور کرانا شروع کیا کہ منیہ مای جب موناجوزف تھیں تب سے ان کے رابرٹ سے خفیہ تعلقات تھے۔ انہوں نے کئی جھوٹی قسمیں اٹھائیں اور کئی غلط بیانیوں کیں جن سے حقیقتاً ماموں کا دل مای کی جانب سے بدگمان ہونے لگا۔ شومنی قسمت سے مای نوکری بھی کرتی تھیں، سو ان کے دن کا بڑا حصہ ماموں اور گھر سے دور گزرتا تھا۔

ماموں نے اپنی بدگمانی مای پر ظاہر نہ کی۔ انہوں نے اندر ہی اندر اپنے ملک سے باہر جانے کے انتظامات شروع کر دیے۔ وہ پڑھتے لکھتے قابل نوجوان تھے۔ جلد ہی ان کے باہر جانے کا بندوبست ہو گیا۔ ایک کمپنی نے انہیں ایگریمنٹ کے تحت بلوا لیا۔ ان ہی دنوں امی نے رابرٹ کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے کی اجازت مانگی۔

ماموں نے انہیں بلا جوں و چرا اجازت دے دی اور خود دوسرے ہی دن گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ جانتے تو مای کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ بھی سکتے تھے لیکن نجانے کیوں انہوں نے ایسا نہ کیا۔ شاید ان کے دل سے کسی کوئی غم تھا۔ مای کی مدد ہم سب کی لوروشن تھی۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ منیہ مای بے قصور تھی ہو سکتی تھی کہ وہ منیہ مای کی جانب سے کسی اعتراف، کسی شکوے، کسی پیار بھری شکایت کے منتظر تھے لیکن جالہبت کی چٹکی میں پستی مای نے اور ہر توجہ نہ کی۔ یوں ان دنوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی خلیج حاصل ہو گئی۔

امی اور نانی امی کا پروگرام تھا کہ وہ مای کو گھر سے نکال دیں گی اور ماموں سے کہیں گی کہ موناجوزف کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن مای نے انہیں وہ خوشخبری سنا دی جس پر نانی امی رنگ رہ گئیں۔ اب وہ اپنے پروگرام پر عمل نہ کر سکتی تھیں۔ نانی امی خاندانی خاتون تھیں، وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا بچہ کسی طور کسی دوسرے کو نہ دے سکتی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچے کی پیدائش تک منیہ مای کو گھر ہی رکھا جائے گا۔ البتہ ایک کام انہوں نے اور کیا وہ یہ کہ ماموں کو پورے ایک ماہ بعد اطلاع کی کہ منیہ مای کو گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ ماموں کے جانے کے پورے ڈیڑھ ماہ بعد اسٹے ہفتے ہی مای کے لیے طلاق نامہ موصول ہو گیا۔

پروگرام کے تحت یہ طلاق نامہ مای سے چھپایا گیا۔ نانی امی اور امی نے اپنا رویہ مای سے بالکل تبدیل کر لیا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ میرے والد نے اپنے ایک دیرینہ دوست کے توسط سے ایک ایسے اسپتال کے متعلق معلومات حاصل کیں جہاں زیادہ تر ناجائز کام کیے جاتے تھے۔ وہاں امی کی ڈاکٹر کو ابو نے رشوت دے کر اپنی مرضی کا کام کرنے پر راضی کر لیا۔ یوں میری معصوم مای کو ان کی زندگی کی ہر خوشی سے محروم کر دیا گیا۔

ابو جان کے پروگرام میں تو یہ بات بھی شامل تھی کہ گھرا کر ہونے والی بچی کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا جائے گا تاکہ جہانزیب ماموں ہر جھجھوت سے آزاد ہو کر ان کی بہن کے ہو جائیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نانی امی نے اپنے بیٹے کی اولاد یعنی ربیعہ کو قتل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس بات پر میرے والد اور نانی کے درمیان ٹھن گئی۔ والد کا کہنا تھا کہ بچی کو جیتا جاگتا کر جہانزیب معاملے کی تمہ تک پہنچ جائیں گے کیونکہ بچی نے نقوش ماں کے اور رنگت اپنے باپ کی لی تھی اور جبکہ نانی امی ایک ماں سے اس بے دردی سے اس کی اولاد چھین لینے سے قدرے خوف زدہ ہی ہو گئی تھیں۔

انہیں واضح سمجھ میں آ رہا تھا کہ بیٹی اور داماد کی باتوں میں اگر انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی میں ایسا زہر گھولا ہے جس کی کئی قیامت تک اس خاندان کے حافظے سے محو نہ ہو پائے گی۔ ابو کے تیور اس درجہ خطرناک تھے کہ نانی امی اس بچی کے لیے سخت خوف زدہ ہو گئیں۔ ایک رات وہ اس بچی کو لے کر گھر سے چلی گئیں۔ ان کی بہن نواب شاہ کے قریب ایک نواحی علاقے میں رہتی تھیں۔ نانی امی ان کے پاس چلی گئیں۔ دونوں بہنوں کی مشترکہ جائیداد

میں ایک مکان اور چند کانٹیں تھیں جن سے وہ زندگی بسر کرنے کے قابل تھیں۔

یہاں امی کو قدرت نے سزا دینے میں دیر نہ کی۔ مجھ سے بڑی بہن تمنا جو اس وقت تین چار سال کی تھی سخت بخار میں مبتلا ہوئی اور چند راتوں میں ہی امی کو اولاد کے دکھ سے روشناس کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی۔ امی کے دل پر اس حادثے کا شدید اثر ہوا۔ اس کے بعد وہ بھی زیادہ عرصہ نہ جی پائیں اور اپنے گناہ و ثواب کا حساب کتاب لے کر اپنے خالق کے دربار حاضر ہو گئیں۔ نجانے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہو گا۔

میرے والد پر کسی حادثے کا کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا، ان کی آنکھوں پر بندھی غفلت کی پٹی قیامت تک کے لیے تھی۔ روز قیامت اسے فرشتے ہی کھولیں گے۔

میرے والد کے ہاتھ اس موڑ سے ایک ایسی خزانے کی چابی آ گئی جس کو پا کر وہ اپنی بیوی اور مری ہوئی بچی کو تو کیا اپنی زندہ اولاد تک کو بھول گئے۔

نانی امی کے چلے جانے سے جہانزیب ماموں کے رابطے کا واحد ذریعہ میرے والد ہی تھے۔ انہوں نے ماموں کو جھوٹی بچی کہما بیان سنا دی جس کے مطابق منیہ مای طلاق کے بعد رابرٹ کے ساتھ چلی گئی تھیں اور نانی امی سخت بیمار تھیں اور ابو ان کا علاج کروا رہے تھے۔ جہانزیب ماموں پر اپنی زندگی کے اس حادثے کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے کبھی ملک نہ لوٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ابو کے اکاؤنٹ میں نانی امی کے علاج کے لیے پیسے بھجواتے رہے، بھجواتے رہے اور ابو کے منہ کو ایک بھٹی ختم ہونے والی پیاس لگ گئی۔

نانی امی نے ابو کو کئی خط لکھے اور جہانزیب ماموں کا پیسہ اور فون نمبر مانگتی رہیں۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنا چاہتی تھیں، انہیں سب کچھ بتا کر ہر جرم کا اعتراف کر کے وہ اپنی روح پر دھرا بوجھ اتار پھینکنا چاہتی تھیں۔ ابو نے نانی امی کو اپنے سیدھے مخالفوں کا شکار کر دیا۔ کبھی وہ جہانزیب ماموں کے کسی حادثے میں مرنے کی اطلاع دے دیتے تو بچی کشیدہ قرار دے دیتے۔ نانی امی کو مرنے والے دم تک شاید علم نہ ہو سکا ہو گا کہ جہانزیب ماموں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

جہانزیب ماموں کو جب ابو پر شک ہونے لگا تو انہوں نے ابو سے دو ٹوک بات کی۔ وہ فون پر اپنی والدہ کی آواز سننا چاہتے تھے تب ابو نے انہیں بتایا کہ نانی امی تو دو سال پہلے انتقال کر گئی ہیں اور ماموں کے بھجوائے پیسوں سے ابو نے مکان خرید لیا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے مکان کے لیے ایک رسی سی معذرت کر لی۔ جہانزیب ماموں نے کچھ بھی کہے بنا خاموشی سے فون بند کر دیا اور اب اس کے بعد کبھی کسی نے ان کی آواز نہیں سنی۔

برسوں گزر گئے۔ ابو اپنی بچی کی بچی رقم پر کسی سانپ کی مانند بیٹھے رہے۔ تمدن بھائی چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے بچے ہیں، چنانچہ وہ اس معاملے سے کچھ کچھ آگاہ تھے۔ ابو کے بستر پر بڑ جانے کے بعد تمدن بھائی نے ابو سے وہ پیسے مانگنے شروع کیے لیکن ابو ایک نفسیاتی عارضے کا شکار ہو چکے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ رقم ختم ہوگی، ابو کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور جب تک ان کے پاس وہ رقم باقی ہے وہ زندگی کی گاڑی کو کھینچتے رہیں گے۔

انہیں اپنی تعفن زدہ زندگی ہر شے سے زیادہ پیاری تھی۔ انہیں پیاس کا عارضہ لاحق تھا جو شاید اسی نفسیاتی گمراہی سے پیوستہ کوئی بات تھی۔ وہ ہر وقت پیاس کا شکار رہتے تھے۔ وہ خود پانی پی پی کر اور انہیں پانی پلانے والے پلا پلا کر تنگ جاتے لیکن وہ پیاس جوں کی توں رہتی۔

ربیعہ نے ابو کی بہت خدمت کی۔ اس بات سے بے خبر ہو کر کہ ابو نے اس کی زندگی کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کیں۔ ابو مرتے وقت ربیعہ ربیعہ کہہ رہے تھے۔ نجانے ان کے دل میں کیا تھا؟ کیا وہ اس کو سب کچھ بتانا چاہتے تھے یا وہ ربیعہ سے معافی مانگنا چاہتے تھے؟ ربیعہ کے علاوہ اگر ان کی زبان کوئی اور لفظ ادا کیا تو شاید سمجھ میں

”محببت کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔“ عباد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اسی لیے ربیعہ سے سچی محبت محسوس ہوتی تھی۔ یہ تو واقعی ہماری شخصیت سی ہن نکلی۔“

”کیسے کیسے انجام دیکھے ہیں میں نے۔“ ترانا ادا سی مسکرائی۔ ”نفرتوں کے انجام اور محبتوں کے انجام۔ بسا عظیم الشان فرق ہے۔“



گھر پہنچ کر سب سے مل کر پھر کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ چپ چاپ اپنا پنڈیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ نیکیسی والے کو مطلوبہ مقام بتا کر وہ پورا راستہ خاموش بیٹھی اپنے دل کی دھڑکنوں کو گنتی رہی۔ نیکیسی رکی تو وہ باہر نکلے اس کے سامنے واقع اس بلند و بالا عمارت کی تیسری منزل پر اس کا گھر تھا۔ سرائٹھائے وہ کچھ دیر اپنے گھر کی کھڑکی کو دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر کا ایک اسے خود پر کنٹرول نہ رہا تھا۔

وہ اندر کی جانب بھاگی۔ عمارت میں لفٹ موجود تھی لیکن اس نے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ تیزی سے بڑھیاں پھلانگتی وہ چند منٹوں میں اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے چیک نہیں کیا کہ دروازہ لاک نہ لیا ہو۔ اس نے ہیل پر انگلی رکھ دی تھی اندر ہیل کی آواز گونجی اور تو اتر سے بھتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے وقفے سے دروازہ کھل گیا تھا۔

ایقان ساکت رہ گئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، زرد رنگت، تلخ کپڑے۔

”شیراز کی بات ہے۔“ وہ کہہ کر اس کی طرف جھپٹنے لگا۔ کتنے ہی یوں گزرے تھے پھر نجانے عاشر کو کیا ہوا؟

آتا۔ ابو مرگئے۔ تمدن بھائی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انہیں ابو کے سامان میں بھی کچھ نہ مل سکا۔ وہ غم و غصے سے گویا پاگل ہی ہو گئے۔ تب ایک دن مینا پیپھو خاموشی سے صولت کو لے کر چلی گئیں۔ کچھ دن بعد خبر ملی کی مینا پیپھو نے اپنے لیے ایک گھر خرید لیا ہے وہ اور صولت بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سنتا تھا کہ تمدن بھائی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے خنجر کی نوک پر مینا پیپھو سے سب کچھ اگلا لیا۔ ابو نے ماموں کو بھجوائے ہوئے پیسے نکسٹر اکاؤنٹ میں ڈلوائے تھے جو اتنے عرصے میں دو گنے ہو چکے تھے۔ ابو کی وفات سے چند روز قبل پیپھو نے ابو کی چھپائی ہوئی چیزوں میں سے بینک کاغذات اور چیک ایک نکال کر چھپائی تھی تاکہ پیپھو کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ بعد میں پیپھو اس رقم کی بلا شرکت غیرے مالک بن گئی تھیں۔

تمدن بھائی پیپھو سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ مکان تمدن بھائی کے نام لکھ دیں۔ پیپھو نے صاف انکار کر دیا۔ تمدن بھائی کے ہاتھوں پیپھو کا قتل ہو گیا۔ وہ خون آلود خنجر لے کر گھر آئے اور کچھ ہی دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ تمدن بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔ تصور بھائی فرار ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے فون کر کے گھر نہ لوٹنے کے لیے کہا۔

میں اس وقت آفس میں تھی۔ میں نے عبد الباری کو سب کچھ بتایا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن ان کے گھر والوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ مجھ پر رکیک الزامات بھی عائد کیے۔ عبد الباری اگلے قدموں مجھے وہاں سے لے آئے۔ ہم نے شام کو باری کے ایک دوست کے گھر نکاح کر لیا اور اگلے ہی دن شہر چھوڑ کر کراچی چلے آئے۔ یہاں باری کے ایک دیرینہ دوست اور لاڑشتہ دار کے توسط سے ہمیں گھر بھی میسر آ گیا اور باری کو جلد ہی نوکری بھی مل گئی۔ یوں زندگی قدرے بہتر شکل میں رواں ہو پائی۔ وہاں تمدن بھائی کو عمر قید سنائی گئی۔ تصور بھائی نے صولت سے نکاح کر لیا۔ یوں ان دونوں کا بھی گھر بس گیا۔ سو یہ بھی ہمارے گھر کی کہانی ہے ایک عمر کی لالچ، طمع اور حرص کا انجام۔ ساری عمر کی پیاس اور خالی ہاتھ روٹا گئی میرے باپ کا مقدر۔

شہنشاہ خواہشات کو اپنے خون سے سیراب کر کے ہمیشہ کی نیند سو جانا پیپھو کی قسمت اور نکلتے سکوں کی جھنکار سننے کے شوق میں۔ ہتھکڑیوں اور پیر یوں سے نبرد آزمائی تمدن بھائی کا نصیب ٹھہرا۔



”مال۔ مال۔“ اس کے لب دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے اور بند پٹکوں جیسے آنسو رواں تھے۔ اپنا سراپا مال کے سینے پر دھیرے وہ محض اسی لفظ کی تکرار کیے جاتی تھی۔

”میری بچی۔ میری بیٹی۔ میری زندگی۔“ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لیے ایک عمر کی بچی کو قطرہ قطرہ سیراب کر رہی تھیں۔

عباد، انیقہ، ترانا اور عبد الباری ساکت بیٹھے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ زندگی اتنے رنگ بھی بدل سکتی ہے یقین کرنا مشکل تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، نظروں کے سامنے تھا۔ ”جب آنکھ کھلی تو میری کوکھ خالی تھی ربیعہ! میری ہاتھ خالی تھے، میرا دل خالی تھا۔“

وہ ان ہی الفاظ کی تکرار کیے جاتی تھیں۔

”آج میں آپ کے پاس ہوں امی! آپ کے سینے سے لگی ہوئی ہوں۔“

ربیعہ نے ان کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے دیوانگی سے اس کے ہاتھ کو بوسے دیے۔

”اسی لیے چوما کرتی تھی ان ہاتھوں کو میں۔ انہیں دیکھ کر نجانے کیوں مجھے اپنے اندر پھیلتی یہ تنہی، غمگینیاں یاد آیا کرتی تھیں۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوشدست سرورق

خوشدست نمپا

منہجوط جلد

آفٹ پیپ

شائع ہو گئے ہیں

☆ ستاروں کا آنگن، نجم محمد قریشی قیمت: 400 روپے

☆ ایمان الہیہ اور محبت، عمیرہ احمد قیمت: 200 روپے

☆ اے وقت گواہی دے، راحت جمیل قیمت: 350 روپے

☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 180 روپے

☆ امر بیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

اس نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اگلے ہی لمحے ایقان نے اپنا ہاتھ چوکھٹ پر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ "اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ نکلی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آتے لمحوں کا خیال بہت جانیگسل تھا۔ طرح سے مجروح ہوئی تھیں۔ شدت درد سے انگلیاں تھیلی نیلی پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گی۔ یاد رکھنا۔" اس کا چہرہ اپنی رنگت کھو بیٹھا تھا۔

"پائل ہو؟" وہ غرایا۔

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔

"جانتا ہوں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔ "اچھی طرح جان گیا ہوں۔"

"پھر ایک پاگل کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ پاگل بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"پھر یہ خود ساختہ نظر بندی؟ کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے وہ گھر کے اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے

احساس ہوتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر اس کی جانب پشت کر لی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔

ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑ لے کھڑا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور اس کی پشت پر

سزا کے دونوں بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔

"اب تم میرے سامنے نہیں ہو اب جواب دو۔"

"تم۔" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "تم۔ جاؤ یہاں سے۔ میں۔ میں۔ تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔"

"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" تلخ انداز میں بولا۔

اپنے گرد حائل اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سر اٹھا کر پھر گرا چکی تھی۔ وہ توڑ پکی

تھی۔ وہ خود کو بے بس پیچھی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت جال کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔

"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا مت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب

کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بچا کر صرف میرے

لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پلیز عاشر۔"

وہ اس کی پشت پر سے گھوم کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے

بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔

"یہ ہو گیا مکمل۔" اس نے پیلا نیٹ کا خوبصورت ڈیوٹے ناعمہ کے اوپر ڈال دیا۔ ہرے گولے کا نہایت نفیس

اور باریک کام پورے دوپٹے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ درود کی پورے ایک ماہ کی محنت کا پھل تھا۔

"ایسا دوپٹہ کسی دلہن کا نہ ہو گا۔ یاد رکھنا۔" اس نے ناعمہ پر رعب جمایا۔

بہت حسین لگ رہا ہے۔" اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ نکلی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آتے لمحوں کا خیال بہت جانیگسل تھا۔ طرح سے مجروح ہوئی تھیں۔ شدت درد سے انگلیاں تھیلی نیلی پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گی۔ یاد رکھنا۔" اس کا چہرہ اپنی رنگت کھو بیٹھا تھا۔

"پائل ہو؟" وہ غرایا۔

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔

"جانتا ہوں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔ "اچھی طرح جان گیا ہوں۔"

"پھر ایک پاگل کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ پاگل بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"پھر یہ خود ساختہ نظر بندی؟ کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے وہ گھر کے اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے

احساس ہوتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر اس کی جانب پشت کر لی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔

ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑ لے کھڑا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور اس کی پشت پر

سزا کے دونوں بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔

"اب تم میرے سامنے نہیں ہو اب جواب دو۔"

"تم۔" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "تم۔ جاؤ یہاں سے۔ میں۔ میں۔ تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔"

"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" تلخ انداز میں بولا۔

اپنے گرد حائل اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سر اٹھا کر پھر گرا چکی تھی۔ وہ توڑ پکی

تھی۔ وہ خود کو بے بس پیچھی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت جال کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔

"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا مت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب

کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بچا کر صرف میرے

لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پلیز عاشر۔"

وہ اس کی پشت پر سے گھوم کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے

بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔

"یہ ہو گیا مکمل۔" اس نے پیلا نیٹ کا خوبصورت ڈیوٹے ناعمہ کے اوپر ڈال دیا۔ ہرے گولے کا نہایت نفیس

اور باریک کام پورے دوپٹے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ درود کی پورے ایک ماہ کی محنت کا پھل تھا۔

"ایسا دوپٹہ کسی دلہن کا نہ ہو گا۔ یاد رکھنا۔" اس نے ناعمہ پر رعب جمایا۔

"جی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا آپ تو شادی ہو کر بھی یہیں رہیں

یہاں بازو میں تو سسرال ہے آپ کا۔" وہ دودھ دھعتا ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

اسی لمحے رابعہ بیگم تیزی سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی اور انداز میں بے حد گرم جوشی

تھی۔ "وہ بے ساختگی میں کچھ کہتے کہتے رک گئیں جیسے انہیں کچھ یاد آیا ہو۔"

"جی ہاں۔" وہ دودھ دھکتی ہوئی۔ "کہتے۔"

وہ بوجھ بیگم کے تئیں تڑپا پڑے اس کا چہرہ لکھا جیسے اس کی جانب سے کسی قسم کا کوئی خدشہ ہو۔

"کہتے امی! کیا بات ہے؟" درود کچھ حیران ہوئی۔

"بیٹا! ابھی عذرا کہ پاس سے آ رہی ہوں میں۔ انہوں نے بلوایا تھا۔"

"جی! اس نے ماں کا چہرہ دیکھا جس پر چراغ سے روشن تھے۔"

"رافع نے۔ ان سے بات کی ہے۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بچا ہٹا ہے۔ کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

”ربیعہ... ربیعہ! پیاس لگی ہے ربیعہ۔“ اکتا لیدو سن قورہ

”راوی۔ راوی۔ اکہاں ہیں آپ؟“ حدنگاہ تک پہلے ہوئے صحرا میں چمکتی دھوپ جیسے آنکھیں ہی سے نہ نکلتی تھیں۔ وہ تکیے کے سہارے تھوڑا سا نیم دراز ہو کر بیٹھا پھر اس نے بہت آہستگی سے مکوں اور گھری نیند کا غماز کیا۔

”ربیعہ ربیعہ!“ دکھ میں ڈوبی آواز کسی ٹیلے کے پیچھے سے آئی تھی۔ ”میں یہاں ہوں یہاں۔“ ربیعہ کی لہریں گئی تھیں۔ ایک عرصے سے وہ جس وحشت کا شکار تھا اس سے چھٹکارا مل جانے کا احساس بہت اندھوں کی مانند آگے بڑھی۔ دھوپ کی شدت نیزوں کی صورت جسم کے آ رہا ہوئی جاتی تھی۔ ربیعہ ہاتھ دیر اور خوبصورت تھا۔ اپنی خوابگاہ میں نرم گرم بستر پر اپنی محبت میں دیوانگی کی حدوں کو چھوتی رفیق حیات پھیلانے آگے بڑھتی رہی۔

”یہاں گرمی ہے ربیعہ۔ اندھیرا ہے۔ پیاس ہے۔“ تو اوز میں بلا کی حسرت اور پچھتاوے تھے۔
”میں میں آپ کے لیے پالی لاتی ہوں وادی! میں۔ میں روشنی کیے دیتی ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں۔
ربیعہ دیوانوں کی مانند بھاگنے لگی۔

”روشنی لا اور بیچیں۔ ذرا سی روشنی۔ ذرا سا پانی۔“

آواز مدہم ہونے لگی۔ آسمان پر اگ برساتا سورج غائب ہونے لگا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی اور اندھیرا ہو گیا۔

رہنہ کی بند پکوں میں دھیرے دھیرے جنبش برپا رہی۔

رہیہ کی بند پلکوں میں دھیرے دھیرے جنبش ہوئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ماتھے پر قطروں کی سمورت ابھرتے بسنے اور جسم میں گھٹتے بڑھتے تنفس کے وباؤ کو محسوس کیا پھر گہری سانس لیتے ہوئے کدھر کدھر گئی۔ اس کا اور جسم بھر رہا تھا۔

لڑنے کی کوشش کی۔ اسیر کے دلیر کے دل پہ رہا تھا۔ چھند کی مہیا یاں چہرے پر پھیرتے ہوئے اس نے خود کو مجھتے

”آئی ایم ریلی تھنک فل ٹویو۔“ وہ ممنونیت سے بولا۔
 ”جانے دو وہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ سوائے تھنک کرنا بھی میری ذمہ داری تھی۔“

بدان تھا۔ اس کی داوی کی روح پر عذاب دینے والے کو فوج مشیت ملے۔ وہ بلا کی گری سے وہ گویا حشر کا

اب خریدنے پر مجبور تھیں۔ اس کی داوی کی روح پر عذاب دینے والے فرشتے مجبور تھے کہ وہ دنیا میں کی گئی کمائی کے آخر کار

”داؤی سے“ رعبہ کے لبوں سے بے آواز جنبش نکلا۔

”داوی سے“ رزیچہ کے لیوں نے بے آواز جنبش کی۔
اس کی پلکیں پر ستارے چمکنے لگے۔ اس کا داوی اپنے زانوں کے بل بوتے پر اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کے دروازے پر دستک دیا۔

”اور میری سہارا ہے جیسے کہ اس کے بجائے میں نے سرور کیا۔“
عاشق کال ڈس کنکٹ کر کے چند لمحے سیل فون ہونیوں سے لگائے کچھ سوچتا رہا تھا پھر تھوڑے عرصے بعد وہ گھر آیا۔

مقام بھائی نہیں لیکن اس کی دواؤں نے اسے ممتا کے ہر ذائقے سے روشناس کر لیا تھا۔ اس میں کسی قسم

”بارہ ایک مہر آیا۔“

ایک۔ اسوں نے بھی اسے جھڑکانہ تھا، بسھی اسے سخت نظر سے نہ دیکھا تھا، اس کے لیے دشنہ، دشنہ، دشنہ

میں۔ انہوں نے بھی اسے جھڑکانہ تھا، کبھی اسے سخت نظر سے نہ دیکھا تھا۔ آج اس کے لیے وہ شیرینی ہی شیرینی تھی۔ ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھیں۔ محبت ہی محبت تھیں۔ انہوں نے منہ پر پیار کے ساتھ دیکھا تھا۔

[illegible]

”ٹریٹ کپی؟“

”ہینڈ رڈر ہینٹ۔“

"اے یوسف! اللہ حافظ ہے۔"

”او کے سی یوسف اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ عاشق نے کال ڈسکنیکٹ کر کے سیل برابر میں ڈال دیا۔

لیکن انجام۔ انجام ٹھہرتا ہے۔

لیکن انجام انجام ٹھہر جاتا ہے۔

میں۔ کہیں اس کی ماں نے بھی گزار دی تھی۔ عمر گزار ہی

سوئی ہوئی ایقان قدرے چونک کر جاتی تھی۔ اس کے لیے سب سب بڑے بڑے

کے اعصاب معمول پر آئے۔

”سو جاؤ ایتان۔“ عاسرری سے بولا۔

رہنے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ بچانے کس وقت گہری نیند میں چلی گئی تھی۔ اس کی سانسیں کا زبردست

وہ لوگوں کے مابین ملاقات کو سبب بن گئے۔
 الزامہ تاشیخ کا نام نشان نہ تھا۔ وہ رکابک "جیسے تھے" کی تفسیر بن گئے تھے۔ ایتقان سراپا مح

ماہنامہ شریعت ۱۳۵۴ھ ۱۴۰۰ھ

ماہنامہ شعاع 264 فروری 2008

تھی بالکل خاموش۔ عاشق سکون اور مطمئن تھا جیسے کچھ کہنا کچھ سننا نہ چاہتا ہو۔

ایقان نے اسے لڑا سے ملاقات کا احوال ذرا نہ کہا تھا۔ یوں جیسے وہ بغیر کچھ جانے بوجھے یونہی ہار مان کر چلی تھی۔

عاشق نے اسے جاپان سے پاکستان تک چلے آنے کے پیچھے کسی پچھتاوے، تاسف یا شکست کا اظہار نہ کیا تھا۔

لڑا کا ذکر دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ وہ ہار کر بھی نہ ہاریں۔ دونوں ہی چاہتے تھے کہ وہ باظرف فتح یا بے ہول۔ دونوں ہی محبت کے امتحان میں ہارے تھے اور اپنی اپنی نظریں سرخ و زرد بنا چاہتے تھے۔

عاشق جانتا تھا کہ ایقان کے یوں چلے آنے میں اس کی فراخ دلی کا ہاتھ نہ تھا۔

ایقان سمجھتی تھی کہ واپس پلٹ کر فراخ دلی کا ثبوت اس نے دیا ہے۔ عاشق نے اسے آخر تک نہیں پکارا تھا۔ محبت لیوں پر گہری معنی خیز مسکراہٹ لیے بادل خواستہ کسی بار نہ دعا کی طاقت ہے۔ مجبور ہو کر کوئی ضرور تھی مگر چپ چپ تھی۔

ایقان سوری تھی اور عاشق چپ چاپ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہاں سے بہت دور اپنے بیڈروم میں۔ نیم دراز موبائل پر کوئی ٹیکم کھلتے ہوئے رافع کا ذہن گیم میں محو نہ تھا۔

وہ ایقان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ عاشق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تقدیر اور قسمت جیسی چیزوں کے متعلق وہ پہلے کبھی اتنا سنجیدہ نہ ہوا تھا۔ آج اسے پکا یقین ہو چلا تھا۔ آپ قسمت سے منہ پھیرتے رہیں تو گھوم گھوم کر آپ کے سامنے آئی رہیں گی۔

اس کی ذرا سی پلاننگ سے ایک گھر ویسا ہی بن گیا تھا جیسا وہ چاہتا تھا۔ اس کی قسمت کو منظور تھا۔ وہ ہوا اور اس کی شدید کاوشوں کے بعد بھی دل کا ٹکڑیوں سے نہ بچ سکا جیسے وہ بسانا چاہتا تھا کہ قسمت کو نا منظور تھا۔

اب وہ روٹھتی تقدیر کے سامنے گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا لیکن باوجود بے رخی سے منہ موڑے کھڑی تھی۔ اب کیا ہونے جا رہا تھا؟ کس کو علم تھا!

تیلے بالوں میں بے دھیانی سے برش پھرتے ہوئے وہ آسمان کی وسعتوں کو کھوج رہی تھی۔ اس کی بے چین متلاشی نگاہیں جیسے افق کے پار کسی کو ڈھونڈنا چاہتی تھیں۔ اپنی ہستی اسے ایک جگسا پرل کی مانند لگ رہی تھی جس کے تمام حصے مل جانے کے بعد بھی ٹھیک طرح سے جڑ نہیں پائے تھے جیسے چند حصے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔

”ربیعہ! شہلا نے اسے آواز دی تھی۔

کھڑکی میں کھڑی ربیعہ چونک کر بال سمیٹتے ہوئے وہ پلٹ آئی۔

”جی آئی!“

”وہاں کھڑی کیا سوچے جا رہی ہو؟“ شہلا نے محبت سے اسے دیکھا اور منیوہ بیگم کا چہرہ لٹو سے صاف کرنے لگی۔ وہ انہیں سوپ پیار ہی تھی۔

”مجھے تو جب سے علم ہوا ہے تب سے تمہیں دیکھتے ہی پیار آنے لگتا ہے۔ عزیز تو تم پہلے بھی بہت تمہیں لب تو عزیز تر ہو گئی ہو۔“

ربیعہ نے آگے بڑھ کر شہلا کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”میرے دل سے پوچھیے آئی! میں نے کبھی بھی آپ لوگوں کو پایا یا غیر نہیں سمجھا لیکن امی سے ملنے کے بعد۔ ان کے حوالے سے آپ میرے کتنے اپنے ہو گئے ہیں۔ میں شاید سمجھانہ سکوں۔ ایسا لگتا ہے میرے وجود کے گم شدہ حصے اچانک مل کر میری ذات کی تکمیل کر گئے ہیں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز رندے لگی تو وہ یکجہت خاموش ہو گئی تھی۔

”ربیعہ! منیوہ بیگم نے بازو پھیلائے۔

ربیعہ بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے پلٹ گئی تھی۔ منیوہ بیگم نے اس کے سر کو چوم لیا۔

”ہائے ربیعہ! اب تو مجھے جیسی ہونے لگی ہے۔“ انیقا شرارت سے بولی۔ ”جانتی ہو امی کی محبت کا یہ اظہار صرف میرے لیے ہی مخصوص تھا۔ شہلا آئی اور عباد بھائی امی سے شکایت کرتے تھے کہ مجھے جس۔

بے اختیاری سے امی پیار کرتی ہیں وہ ان کے حصے میں کیوں نہیں آتی؟“

”تم امی کو اس عمر میں ملی تھیں جس عمر کی اس وقت ربیعہ تھی۔ امی اسی لیے تمہیں پیار کرتے وقت یوں۔

بے اختیار ہو جاتی تھیں۔“ عباد بڑا نہ انداز میں بولا۔

وہ سب پروانوں کی مانند منیوہ بیگم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

”اس کا مطلب ہے تم میں سے کسی کو بھی مجھ سے سچا پیار نہیں ملا؟“ منیوہ بیگم قدرے روٹھے ہوئے انداز میں بولیں۔

شہلا، عباد اور انیقا بے اختیار ان سے لپٹے تھے۔

”بھاری۔ سگی ماں بھی نہیں اس سے زیادہ محبت اور شفقت نہ دے پاتی امی جی۔ اقامت کے دن بھی ہماری یہی سزا تھی۔“ شہلا جذباتی ہو کر بولی تھی۔

”یہی میری فحاشات تھیں۔“ شہلا کی پلکیں جھپکیں۔

مطمئن بہت غمی ہوں۔ مجھے سادولت مند کوئی نہیں۔

سب کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔

”ابھی آپ نے بہت جینا ہے امی! ہم بہت بگڑے لیے۔ ربیعہ کے لیے۔ ہم سب کے دامن آپ کی بے پناہ توجہ اور محبت سے بھرے ہوئے ہیں لیکن ربیعہ! یہ تو ابھی کچی مٹی کی مانند نقشہ ہے پیاسی ہے آپ کی محبت اور مٹاکی۔ ابھی آپ نے اپنے لیے کچی سیراب کرنا ہے۔“

عباد ان کے لڑوؤں ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ منیوہ بیگم بے بسی سے مسکرا دیں جیسے عباد کی بات رد کرنے کا حوصلہ ان میں نہ ہو لیکن اسے پورا کرنا بھی ممکن نہ دکھائی پڑتا ہو۔

ربیعہ کی آنکھوں میں دھواں سا بھرے لگا تھا۔

وہ رات گئے تک اسٹڈی میں مصروف تھا۔ عموماً ”ربیعہ یا انیقا چائے کا تھرماس بھر کر اس کی اسٹڈی میں رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ بستر تک جانے سے پہلے وہ تین کپ چائے ضرور ہی پی لیا کرتا تھا لیکن آج غالباً ان دونوں کو بھی علم نہ تھا کہ عباد کا سونے سے قبل کچھ مطالعے کا ارادہ ہے۔ وہ بزنس قوانین سے متعلق کتابیں کھول کر بیٹھا ہوا تھا تب ہی بے اختیار اس کی نظر دروازے کی جانب اٹھ گئی جہاں منیوہ بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ عباد بے اختیار اٹھ کر ان کی جانب بڑھا تھا۔

”امی جی۔! کیوں چلی آئیں آپ؟“ وہ پریشان ہو کر ان تک پہنچا اور انہیں تھام لیا۔ ”کچھ تکلیف ہوئی؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں سچے۔“ وہ مسکرا دیں۔ ”انتہا پریشان مت ہو۔“
عباد انہیں سہارا دے کر اندر لے آیا۔

”بیٹھیں۔“ اس نے انہیں نرم کاؤچ پر بٹھایا اور خود ان کے قریب نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ”اور اب بتائیں، اتنی رات کو آرام دہ گرم بستر سے اٹھ کر آنے کا کیا مقصد ہے؟“
منہ زہ بیگم نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔
”اپنے بچے کو ایک نظر دیکھنے کا خیال آیا تھا۔“ وہ لبوں پہ نرم مسکان سجائے بولیں۔
”ربیعہ سوئی؟“ عباد نے پوچھا۔

”ہاں پورا دن میری خدمت کر کے بہت تھک جاتی ہے۔ بے خبر سو رہی ہے۔“
”آپ کی خدمت میں عبادت و سعادت ہے، ہم سب کے لیے۔“ عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔
”عباد!“

”جی! امی۔“ حکم۔

”بیٹا! ایک بات کہنا چاہ رہی تھی تم سے۔“ وہ قدرے ہچکچا کر بولیں۔
”آپ نہیں امی جی۔“ عباد نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”عباد! اس دن امیر حسن کے ساتھ۔ جو لڑکا آیا تھا۔“ وہ ذرا اذرا کر گئیں۔
”شہریار احمد۔“ عباد فوراً بولا۔

”ہاں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”شہریار احمد میں نے سنا ہے اس کے والد کا نام دریافت کیا تھا۔ جانتے ہو کس لیے؟“

عباد جواب دیے بنا ان کی اداس آنکھیں دیکھتا رہا۔

”وہ لڑکا۔“ وہ ہوا احمد جہاں زیب کی تصویر ہے۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ وہ دیکھ کر رنجہ کے والد احمد جہاں زیب میں نے جس لمحہ اسے دیکھا، کوئی انجالی طاقت مجھے پوری شدت سے دھکیلاتی ہوئی ماضی کی بھول سے پیچھے برس بھلے کی تصویر کے فریم میں۔“
عباد نے ان کے خیف جسم کو کانٹتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان کے رخ ہوتے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں دباتے

”پھر میں نے تم سے اس کے باپ کا نام پوچھا اور میرے شک پر تصدیق کی مرثیت ہوئی۔ ہاں ہاں عباد! مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لڑکا۔ ربیعہ کا بھائی ہے۔ احمد جہاں زیب کا بیٹا۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”کیسا انہوں نے اتفاق ہے۔“ عباد بڑبڑایا۔
”میں۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں عباد! اگر واقعی وہ ربیعہ کا بھائی ہے تو ان رشتوں کو ملنا چاہیے۔ ربیعہ کو اپنے بھائی سے اپنے باپ سے ملنا چاہیے۔“

ان کا لہجہ بھر گیا۔
”لیکن انہوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا امی جی۔“ عباد کو ان کے ساتھ ہونے والی ساری نا انصافیاں یاد آگئیں۔
”ربیعہ کیوں ملے ان سے۔“

”میں نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہیں میرے بیٹا!“ وہ دودھنے لگیں۔ ”اس کے بعد مجھے کچھ

اختیار نہیں رہا کہ میں کسی شخص کے خلاف اپنے دل میں کچھ کدورت رکھوں۔ میرا اللہ سب کا حساب کتاب انصاف سے کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ عباد نے بے اختیار ہو کر ان کے ہاتھوں کو چومنا اور آنکھوں سے لگا لیا۔

”ٹھیک ہے امی جی۔“ پھر وہ بولا تھا۔ ”امیر حسن یوں بھی آپ کی عبادت کے لیے آتا چاہتا ہے۔ میں شہریار کے لیے بھی اصرار کروں گا۔ میں۔ میں کل ہی انہیں بلواتا ہوں۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔

شام ست رنگی چننا اوڑھ کر ”حیات دلا“ میں اتری تھی۔ وسیع و عریض رقبے کے حامل پورے گھر پر تازہ رنگ و روغن کے بعد ہونے والی لائٹنگ نے ایک عرصے کے بعد کونے کونے کو رونق اور دلکشی کا اچھوتا احساس بخشا تھا۔ جابجا دھنک کے سب ہی رنگ بکھرے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

عمارت کے پچھلے وسیع لان کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ یہاں بیک وقت تینوں دہنوں کی رسم مندی کا انتظام کیا گیا تھا۔ تین تین قاتیں باندھ کر کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ کرسیوں کے درمیان میں اسٹیج اس طرح بنایا گیا تھا کہ ہر طرف سے مہمان پر نہیں وغیرہ دیکھ سکیں۔

شام ابھی اتری ہی تھی لیکن تمام لائٹس آن تھیں۔ جابجا رکھے گئے تازہ پھولوں کے گلہ ستوں نے ماحول کو لطیف و معطر بنا دیا تھا۔

پورے ماحول کا یہ نظر غائر جائزہ لینے کے بعد عیشہ نے کھڑکی بند کر دی پھر رخ موڑ کر کھڑکی سے نیک لگا کر دیکھنے لگی تھی۔ نچلے لب کا کونا اس کے دانت چلنے دبا ہوا تھا۔ آج بڑے معرکے کا وقت آیا تھا۔ اس کے برابر

پہلی ہوئی ناعملہ اور سائنس بیٹا، وہاں فرانس۔ کیسا بڑا وقت گزرنا تھا اس کے ناتواں دل پر آج۔
خراڑی چنچل جنرل کی فرمائش تھی کہ دو ماہ پہلے ہی موقع پر سرانجام دی جائے بزرگوں نے بھی بچوں کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے نہ صرف اجازت دے دی تھی بلکہ مافق کی رسم مندی بھی اسی وقت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”عیشہ!“ ماہین کی حیرت بھری آواز پر وہ چپکلی تھی۔ ”وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہارا جوڑا واش روم میں لٹکا دیا ہے نہا کر پہن لو۔“

عیشہ نے خاموشی سے اینٹ اینٹ میں سر ہلایا۔ ماہین اس کے قریب آگئی پھر اس نے پیار سے بسن کی ٹھوڑی کو چھوا۔

”دیکھو دیکھو! میں میری بسن لا جواب ہوگی۔ دیکھ لینا، آج بیلا جوڑا کیسا غضب دھائے گا۔“
عیشہ کے لبوں پر ایک ناسمجھ میں آنے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”غضب ہی تو ڈھاننا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔
پھر وہ خاموشی سے واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

کھانے اور دیگر انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد وہ نہانے کے ارادے سے تھکا ہوا سا کمرے میں داخل ہوئی وہاں تھا کہ یکایک ٹھٹک کر رک جانے کے تمام لوازمات نگاہوں کے سامنے آئے تھے۔

شہلا گھرے زرد رنگ کی بنا رسی ساڑھی زیب تن کیے، سر اپنا زینہ کھڑی تھی۔ وہ کلائی میں مہیتے کے مہکتے پھولوں کا گہرا پھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود پر از حد جبر کر کے بھی ہاشم اس منظر سے آزاد ہونے میں ناکام ٹھہرا اور

نکلنے کی باندھ کر اپنے کام میں منہمک شہلا کو دیکھ گئے۔

گمراہ در رنگ اس نے شاید پہلی مرتبہ پہنا تھا اور اس رنگ میں وہ کس قدر حسین نظر آتی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ کمر تک آتے سیاہ، کھنیرے، چمکیلے بال اس نے کئی دن بعد یوں سنوار کر رکھے چھوڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں لگائی ہوئی ڈھیروں ڈھیر موتیوں کی لڑیاں اس کے دونوں کاندھوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ گلے میں سچے ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی۔ اتنا چمکدار، مہکتا روپ تو ہاشم نے شاید ساگ رات کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ لپکایک اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی دیوانی محبت سے شہلا کا سارا روپ بگاڑ دے۔ اس کے نک سب سے درست انداز کو بکھیر سادے۔

شہلا اچانک چوکی تھی۔

”ارے آپ۔۔۔ آپ کب آئے؟“

ہاشم کو خود میں لوٹنے میں چند لمحے لگے۔

”میں۔۔۔ بس۔۔۔ ابھی۔۔۔“

”انتظامات مکمل ہیں؟“ وہ عجزاً لیے اس کے قریب چلی آئی۔

”ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔ رافع نے سب ہی کچھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے۔“ ہاشم نے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

”اچھا۔۔۔ یہ ذرا گھبراؤ بند کر دو۔۔۔“ شہلا نے کٹائی آگے کی تھی۔

ہاشم نے کسی معمول کی مانند گجرا لیا تھا۔ شہلا کے مخصوص ریفونم کی دلکش مسک نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ہاشم نے اسے گجرا پہنا دیا۔ شہلا نے اس کے جذبوں کی پکڑنی کو بالآخر محسوس کیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھا کر پھر فوراً ہی جھکا لیں۔ راز و نیاز کرتی ان آنکھوں سے باتیں کرنا اس کے لیے کار و شواہ تھا۔

موبائل کی ویب نے دونوں کو کسی رفسوں لمحے کی گرفت سے آزاد کیا تھا۔ شہلا چونک کر موبائل کی جانب بڑھی۔ ہاشم اس کی پشت پر بکھرے بالوں کو دیکھتا ہوا ڈر گیا۔

”ہیلو۔۔۔“ شہلا نے کال ریسیو کی تھی۔

الماری سے اپنا ہینگ کیا ہوا کرتا شلوار نکالتے ہوئے ہاشم نے ہاتھ ہتھم گئے۔ اس نے شہلا کی بہت دلکش

مترجم ہنسی کی آواز سنی تھی۔ اس ہنسی میں اس کے روپ سے بڑھ کر ناز کی پوشیدہ ہنسی

”ہاں زندگی۔۔۔ بولو۔۔۔ میں تمہارے ہی فون کی منتظر تھی۔“

ہاشم نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا الجھنے، ایسے الفاظ، کبھی اس کا بھی مقدّر نہ بنے۔

”بہت تنگ کرنے لگے ہو مجھے،“ خفا ہو گئی تھی میں تم۔۔۔“ وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کمرے میں چل پھر کر

چیزیں بھی ان کی جگہوں پر رکھ رہی تھی۔

”میری جان۔۔۔! میں نے کبھی تم کو خود سے دور محسوس کیا ہی نہیں پھر بھی تمہیں دیکھنے کو پیار کرنے کو میرا دل

ترجیا ہے۔ تمہارا دل نہیں کرنا اپنی مہاسے ملنے کو؟“

ہاشم کے لبوں سے گہری سانس آزاد ہوئی۔

”بس کچھ دلتی مصروفیات ہیں پھر مہا ہوں گی اور مہا کا بیٹا۔“ وہ ہنستے ہوئے تویہ لٹکانے کے ارادے سے

ڈر مٹک روم میں آئی تھی۔

ہاشم کو ہنوز وہیں کھڑا دیکھ کر وہ ٹھنک گئی۔ ہاشم قدرے خفیف سا ہو کر دوش روم میں گھس گیا تھا۔ شہلا نے تویہ

لٹکایا اور کچھ سوچتے ہوئے عمر کی معصوم باتوں پر ہوں ہاں کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

لوکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر روایتی گیتوں کا آغاز کیا تھا جو کچھ ہی دیر بعد فلمی، علاقائی اور مختلف قسم کے ہنوں سے ہوتے ہوئے شور شرابے اور پیمپتیوں کا رخ اختیار کر گئے تھے۔ بیٹھ کی طرح لڑکے بھی ڈفلیاں اور میٹھاں لیے محفل میں شریک ہو گئے تھے اور ”وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“ کے نظریے کو الٹا ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری پوری توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ ایقان کا جوش اور ولولہ عروج پر تھا۔ سب کی پیٹھ جھاڑ، شرارتوں اور شوخیوں کا برا منائے بغیر مفضل جواب دیتے ہوئے وہ جان محفل نظر آرہی تھی۔ کمرے سبز رنگ کے لباس میں اس کی خوبصورت رنگت لودے رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک عجب چمک بھی جیسے آئینے کو بہت سی روشنیوں میں آئینے کے ہی مقابلے لے آیا جائے۔ ڈھولک بجائی، بلند لے میں آواز کا جادو جگائی وہ طلسماتی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

مگر رات کی نظریوں سے اسے دیکھتے ہوئے رافع کسی کام کا خیال آجانے پر پلٹ رہا تھا جب عاشر سے ٹکراتے

ٹکراتے بجا۔

”دیکھ کر بھائی۔۔۔! عاشر نے مجھے بازوؤں سے تھاما۔“ کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“

رافع نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”اچی دیکھی جان“ کا بدلا بدلا خوبصورت روپ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ روپ تو پیچھا جان آپ کا بھی دمک رہا ہے۔“

اس نے کھنکھنایا ہوا ہنس مکھ سے درست عاشر پر غور کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔

لوکیوں کے درمیان بیٹھی ایقان ان کے قہقہوں کی سی بات متوجہ ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے غور کرنے

ایک کو شیش کی کہ وہ دونوں کی بات پر ہنسنے لگے پھر ہر چنگ کر اپنے گیت کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ماشاء اللہ۔“ وردہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔ زرد لباس پر اس کا بنایا ہوا نیٹ کا پیلا اور ہرا روپٹہ

اوڑھے دونوں کٹائیاں ہری چوڑیوں سے بھرے ناعمہ سادہ روپ میں بھی فرشتوں کی سی معصومیت اور دلکشی کا

پیکر معلوم ہوتی تھی۔

اس نے بہن کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں کا ہی دل بھر آیا تھا۔ ناعمہ بھوت

چھوٹ کر زردی۔ وردہ نے خود پر کڑا ضبط کر کے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتارا اور ناعمہ کا چہرہ صاف کرنے لگی۔

”بریں بات ہے۔“ اس نے چھوٹی بہن پر رعب جمانے کی ناکام سی کوشش کی۔ ”امی نے اگر تمہیں یوں نیر

بہاتے دیکھ لیا تو وہ اپنا ضبط کھو بیٹھیں گی۔ اگر تم چاہتی ہو کہ امی خوشی خوشی تمہیں دواغ کریں تو اپنے آنسوؤں پر

قابور کھنا۔“

”آئی! وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔“ امی کے لیے ہی یہ پل صراط پار کر رہی ہوں، صرف ان کی خوشی کے لیے۔“

”بریں بات۔۔۔ ایسے مت کہو۔۔۔ فرازا اچھا لڑکا ہے۔ خوش رکھے گا تمہیں۔۔۔ ذرا سی غلط فہمیوں سے زندگی کی

مضبوط بنیادوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہر طرح کے وہم اور دوسوے دل سے نکال کر نئی زندگی کی شروعات کرنا۔“

”مجھے اپنی پروا نہیں۔“ اس نے سوں سوں کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”صرف امی کا خیال ہے“ آج احساس ہو رہا

ہے کہ ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور اس سے یوں جدا ہونا لڑکیوں کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔“

”ہاں۔ اگر خوشیاں مقدر میں ہوں تو۔ میں تو خوف اور دوسوسوں سے بھری انجانی دنیا میں قدم رکھنے جا رہی ہوں۔ مجھے تو یہ جدائی اور بھی مشکل معلوم ہو رہی ہے۔“

اتنے عرصے بعد آج وہ بہن کے سامنے کھل کر بول رہی تھی کہ دل کا بوجھ آج سوا معلوم ہوتا تھا۔

”میری بہن بہت بہادر بہت ہمت والی ہے۔ تم نے جس صاف دلی اور ثابت قدمی سے یہ محاذ لڑا ہے اللہ تمہیں ضرور اس کا اجر دے گا۔ جو دوسروں کے پردے رکھنا جانتا ہے خدا اسے ہر مشکل سے بچاتا ہے۔“ درود نے اس کے دل کا بوجھ کم کرنے کی بھرپور سعی کی۔

ناعملہ گہری سانس بھوکے کچھو کچھو پٹنے لگی تھی۔

چنڈال میں سب ہی آچکے تھے اب صرف فراز کے گھر والے انتظار تھا۔

نافع کے مخصوص بے تکلف دوستوں کو انتظامات دیکھنے پر رایت آباد رافع ہاشم کو دھونڈنے چاہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔

شہلا کی ہمراہی میں انیقہ اور ربیعہ آ رہی تھیں۔ رافع نے سوچا کہ وہ مر جائے یا وہ ان سے کتر اگر گزرے یا پھر وہ ربیعہ کا دل اسے کلام کر لے۔ دل ناداں نے لمحہ بھر میں کئی صورتوں پر غور کیا۔

ربیعہ کا دل اسے یوں راہ میں حائل دیکھ کر مختلف لے پر دھڑکا تھا۔ اس نے ہنسی بھرا دہرے کے بغیر شہلا اور انیقہ کے ساتھ سر جھکا کر گزر جائے یا یوں ظاہر کرے جیسے اسے دیکھا ہی نہیں یا پھر اس کے پاس ٹھہر کر اس کا حال پوچھے۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غم ایک سی کیفیت کا شکار تھیں۔ اچانک دونوں ہی جوئے تھے۔ شہلا اور انیقہ اپنی دھن میں باتیں کرتی کب کی آگے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ شہلا نے کب اور کیسے وہیں ٹھہر گئی تھی۔ ڈھیر ساری روشنیوں اور خوشبوؤں کے ہالے میں بس وہی دونوں وہاں کھڑے رہ گئے تھے۔

”آپ۔“ ربیعہ بے ساختہ ہی گھبرا کر بولی۔

”آپ۔“ رافع نے چونک کر بے ساختگی سے کہا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ پھر دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

پھر دونوں کو ہی اس عجیب سی صورت حال پر ہنسی آگئی۔

”بہن اور بھائی کی شادی مبارک ہو آپ کو۔“ یہ بولی۔

”شکریہ۔“ وہ مختصراً بولا۔

مزید رکنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ ربیعہ سر جھکا کر آتے بڑھ گئی۔ رافع کو ایک یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا بے نیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ پورا منظر ہی جانے لگا۔

”ربیعہ۔“ وہ بے ساختہ پکارا۔

ربیعہ کے قدم ٹھم گئے وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا وہ صغیرا میں یا دل کی مانند تھا۔ وہ کسی سراب کی مانند تھا۔ اس کی نظروں کی وہ دنیا کی صرف اس کے لیے تھی یا سب ہی کے لیے تھی؟ اس کے لبوں کی وہ مہربان مسکراہٹ اس کے دیدار کی عطا تھی یا ہمیشہ وہ لب یونہی مسکراتے تھے؟

زندگی سے لگتے ہو، زندگی سے ملتے ہو، ایسی ہی خوشی سے کیا ہر کسی سے ملتے ہو؟ خوابوں سے جی دنیا اک تمہارے آئے سے روشنی سے لگتے ہو، چاندنی سے ملتے ہو؟

اپنے درمیان ایک متناطیس کشش کے زیر اثر دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ دفعتاً زوردار آوازوں کے ساتھ آسمان رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا اور ربیعہ اور رافع جیسے کسی طلسم سے آزاد ہوئے۔ ربیعہ نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا جو بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رافع تیزی سے باہر کی جانب بڑھتا تھا۔ یہ فراز کے گھر والوں کی آمد کا اعلان تھا۔

”آئی جی۔“ عباد نے انہیں پکارا۔

منیژہ بیگم کی بند پٹکوں میں لرزش سی ہوئی۔ نبجانے وہ سوئی ہوئی تھیں یا کسی گزشتہ یاد کا عکس ان کی نم پٹکوں پر لرزاں تھا۔

”جی بیٹے! کہیے۔“ ان کا لہجہ بھی بھگیا بھگیا سا تھا۔

”امیر حسن اور شہرار احمد آئے ہیں۔“ عباد نے سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔ ”آپ کو ذرا تنگ روم میں لے چلوں؟“

”نہیں۔“ وہ تھکے تھکے لہجے انداز میں بولی تھیں۔ ”انہیں یہیں لے آؤ اپنے ہی بچے ہیں۔“

”جی بہتر۔“ عباد باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

انہوں نے امیر حسن اور شہرار احمد کو غائب طور پر اسی وقت بلوایا تھا۔ وہ یہ باتیں ربیعہ کی غیر موجودگی میں کرنا چاہتی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس پر کسی ایسی بات کا کشاف ہو جو اس کے نازک دل کو مزید تھیں پہنچانے کا باعث بنے۔

عباد کی ہمراہی میں وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں نے انہیں بہت احترام سے سلام کیا اور ان کی خیریت دریافت کی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بچو! اللہ تمہیں صحت مند دوستی عطا فرمائے۔ خوش رکھے۔ بٹھو امیر حسن۔“

”شہرار۔“ آپ یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

امیر حسن اور شہرار احمد کی آنکھوں میں عجیب غماز ابھرا تھا۔ امیر حسن عباد کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ شہرار ان کے قریب جا بیٹھا۔

منیژہ بیگم نے بہت محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”بیٹے! میں نے آپ کو ان لوگوں کو پریشان تو نہیں کیا؟“

”وہ کتنی باتیں کرتی ہیں! ہمارے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ ہم تو ویسے بھی آپ کی عیادت کے لیے آنا چاہتے تھے۔“ وہ بھی بہت محبت بھرے انداز میں بولا۔

”مجھے خوشی ہوگی اگر آپ مجھے “امی” کہو۔“ منیژہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”ضرور۔“ شہرار نے ان کے ہاتھ تھامے۔ ”آپ کو دیکھ کر “ماں” کا ہی خیال آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں عباد صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ ان سے بہت پیار کرتی ہوں گی۔“

”سب ہی مائیں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں۔“ منیژہ بیگم دھیرے سے مسکرائیں۔ ”آپ کی امی بھی آپ سے پیار کرتی ہوں گی۔“

شہرار کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے اداسی بکھری تھی۔

”شیری کی ماما۔“ شیری کی پیدائش کے چند سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ ”امیر حسن نے دھیرے سے بتایا۔

”میری ماما نے ہم دونوں کی دیکھ بھال کی۔ میری ماما اور شیری کی ماما بہنیں۔“

”اوسے افسوس ہوا بیٹے آپ کی والدہ کے بارے میں جان کر۔“ منیوہ بیگم کے چہرے پر کرب کا سایہ لہرایا تھا۔
”اور آپ کے والد؟“

”میرے والد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے۔ برسوں پہلے وہ ہمیشہ کے لیے وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ میرے نانا ایک انڈین تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں برطانیہ گئے پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ میری ماما پیدا انہی طور پر دل کی مریضہ تھیں۔ ان کے دل میں سوراخ تھا۔ ایسے میں ان کی ملاقات میرے بابا احمد جہاں زیب سے ہوئی، جنہوں نے یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی کہ ماما کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، ماما کو اپنا رفیق فرمایا۔ نجانے کیوں وہ شروع سے کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی سوراخ ہے، اسی لیے انہوں نے ماما سے شادی کی۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کا ہارٹ بالکل پرفیکٹ ہے پھر بھی نجانے کیوں بابا اپنی بات پر اٹل ہیں۔ انہیں وہم ہے کہ وہ دل کے مریض ہیں۔“

شہریار احمد سادگی سے کہہ جا رہا تھا۔ عباد نے اپنی ماں کی پلکوں پر ستارے سے چمکتے دیکھے۔
”پچھلے چند سالوں سے انکل پیرالائز ہیں۔“ امیر حسن گویا ہوا۔ ”وہ صرف اشارے سے اپنا مدعا بیان کر سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہے جو اندر ہی اندر انہیں گھلاتا ہے لیکن انہوں نے کچھ بھی کسی سے کچھ کہا نہیں۔ شہری سے بھی نہیں۔“

”لیکن میں جانتا ہوں بابا کے ماضی کے متعلق۔ مجھے ان کے ایک بہت گہرے دوست نے بہت کچھ بتایا ہے۔“ شہریار نے بہت سکون سے کہا پھر اس نے منیوہ بیگم کا چہرہ دیکھا۔ حقیقت یہ تھی کہ عباد نے ان دونوں کو اختیار میں لے کر سب ہی کچھ بتایا ہوا تھا اور شہریار نے بہت سی باتوں کی تصدیق بھی کی تھی لیکن منیوہ بیگم کے لیے وہ لوگ دھیرے دھیرے ساری باتیں لکھ رہے تھے۔
”کیا۔۔۔ کیا بتایا انہوں نے آپ کو؟“ منیوہ بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔
”بابا۔۔۔ پاکستان چھوڑ کر گئے تو وہ غیر شادی شدہ نہ تھے۔ انہوں نے ایک کرپشن خاتون کو مسلمان کر کے ان سے شادی کی تھی لیکن بعد میں غلط فہمی کا شکار ہو کر انہوں نے ان خاتون کو ڈال دی اور دے دی تھی۔“ ایک آنسو منیوہ بیگم کی آنکھ سے بہہ کر ان کی گردن کی جھڑپوں میں کھو گیا۔ بہت ضبط سے انہوں نے باقی اشکوں کو اپنے اندر ہی سمیٹ لیا۔

”آپ کے بابا۔۔۔ جانتے ہیں۔۔۔ کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی؟“ بہت سی آہوں اور سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔“ شہریار بھرپور اعتماد سے بولا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ انہیں غلط باتیں بتائی گئیں۔ انہیں اصل رستے سے بھٹکایا گیا تھا۔ ان سے جھوٹ در جھوٹ بولا گیا تھا اور ایسا کرنے والا کوئی اور نہیں، ان کی اپنی ماں اور بہن تھیں۔“

”الحمد للہ۔“ منیوہ بیگم نے زیر لب کہا اور آنکھیں بند کر کے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔
شہریار، امیر حسن اور عباد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کئی پل یونہی گزر گئے۔ منیوہ بیگم کی بند پلکوں میں جنبش نہ ہوئی۔

”امی جی۔۔۔“ عباد غمبہ اس گیا۔

منیوہ بیگم نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا اور سکون و اطمینان سے مسکرائیں۔ عباد کو یک ٹونہ تسلی ہوئی۔

”ادھر آؤ بیٹے۔۔۔ میں آپ کی پیشانی چومنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے شہریار کی جانب ہاتھ بڑھائے، وہ فوراً ان کی طرف جھکا تھا۔ منیوہ بیگم نے اس کی پیشانی پر محبت سے بوسہ دیا اور اسے سینے سے لگالیا۔

”میں تمہاری ماں ہوں شہریار۔۔۔ مجھے اپنی ماں سمجھو۔۔۔ میں تمہاری بہن کی ماں ہوں۔“ شہریار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔
”انسان بہت ناشکر اور جلد باز ہوتا ہے۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”کبھی میں ایک بیٹی کے چہن جانے پر ٹپ ٹپ کر روتی تھی اور آج میری ماما کو سیراب کرنے کے لیے میری اتنی بیٹیاں اور بیٹے میرے پاس ہیں۔“ امیر حسن بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔ منیوہ بیگم نے اسے بھی پیار کیا۔
”میری بیٹی، بہت امتحانوں سے گزری ہے۔ خدا نے اسے سب ہی آزمائشوں میں سرخرو کیا۔ اسے سب ہی رشتے عطا کیے۔ اے میرے رب! تیرا شکر ہے۔“ وہ اپنے سچے رب کی بے پایاں عنایتوں پر شکر گزار تھیں۔

اس نے خود کو کونکے کی طرح دکھتا ہوا محسوس کیا تھا۔
اس کے ہاتھیں جانب ٹانہ تھیں، اسی کی طرح زرد پیراہن میں ملبوس۔ ہاتھیں جانب ناعمہ تھیں جس کا چمکتا روپ اس کے گھونٹنے کی آواز سے بھی اپنی روشنیاں، کھیر رہا تھا اور اس کے عین مقابل صوفے پر بیچوں بیچ فراز احمد ستادہ تھا۔

میروں، خوبصورت شہروانی زیب تن کیے وہ بہت پر تمکنت اور پرکشش نظر آ رہا تھا۔ عرشہ کو احساس ہوا، کسی نے اسے نگاہیں جھکانے کی ہدایت کی ہے پھر اپنے احساس ہوا کہ وہ کونکے باندھ کر فراز کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بہ وقت تمام نظریں جھکا لیں۔

فراز کے گھر والوں نے عین وقت پر نکاح کی اجازت طلب کر لی تھی تاکہ شادی کی تقریب میں وقت بچانے کا مقصد حاصل کیا جاسکے کسی کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ سو مختصر سے وقت میں اس ضروری کام کو خوش آہستگی سے سرانجام دے لیا گیا تھا۔ ناعمہ فراز کی منگوتہ ہو چکی تھی۔ اس کے دل کی کیا حالت تھی، عرشہ کو علم نہ تھا لیکن اس کا اپنا دل کونکے کی مانند دھب دھب کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس شرر سے وہ ناعمہ کے گھونٹنے کو آگ لگا کر اسے بھی راکھ بنا دے۔ سامنے بیٹھے مطمئن و خوش خرم فراز کا گریبان تار تار کر کے اس کے چہرے پر تھپھر برسائے اور اپنے دل کو برباد کرنے کی وجہ پوچھے۔ وہ سلگ جا رہی تھی۔ تب ہی نافع آکر فراز کے قریب بیٹھا تھا۔ تعلق، منگوتی عرشہ لمحہ بھر کے لیے ٹھنک سی گئی۔ اس نے بہت دنوں کے بعد اسے دیکھا تھا یا یوں بالفاظ دیگر دیکھا تھا۔

شہریار اور امیر حسن شہروانی میں گورا چٹا نافع اتنا وجہ لگ رہا تھا جیسے آدھی رات کو چاند کے بجائے سورج نکل آئے۔ عرشہ کو اپنی نظروں پر اعتبار نہ آیا۔ فراز کے ساتھ بیٹھا ہوا نافع وجاہت میں فراز کو بھی مات دے رہا تھا۔ وہ چونکہ اپنی ہی آکر بیٹھا تھا اس لیے اس کے انداز میں فراز کا سا تکلف نہ تھا۔ وہ خوش باش اور بے فکر نظر آتا تھا۔

”یہ اجتماعی شادی کون کر رہا ہے؟“ علی نے اسٹیج پر نظر ڈال کر پوچھا، ایک قہقہہ پڑا تھا۔
”جی کوئی راضی ہو تو آپ بھی بیٹھ جائیے۔“ کسی کونے سے آواز آئی۔ مزید قہقہہ بلند ہوا۔
”مجھے شادی کرنی ہے، راشن کی قطار میں نہیں لگنا۔ قاضی صاحب نہ ہوئے، یو ٹیلیم اسٹور والے ہو گئے۔“ اس کی باتوں پر سب ہی کے ہونٹوں پر مسکان تھی۔ سوائے عرشہ کے جو لب پیچھے کسی پتھر کے بت کی طرح رسیں کر رہی تھی۔

”ٹھیک طرح سے کھانا۔“ وردہ نے کونے میں پلیٹ پکڑے کھڑی رہی۔ کوہدایت کی تھی۔
 ”یہ کیا؟“ پھر وہ اس کی پلیٹ میں ذرا سے چاول اور سلاد دیکھ کر بولی۔ ”بی چریا۔ اتنا تکلف نہیں چلے گا۔
 اور فلاؤ پلیٹ شیشہ۔“

ربیعہ نہ نہ کہتی رہ گئی۔ وردہ نے اسے روسٹ پیس اور کباب لا کر دیے۔
 ”میں اتنا نہیں کھا سکتی وردہ!“ ربیعہ منت سے بولی۔ ”میں تو تقریباً کھا چکی ہوں۔“
 ”چلو میں تمہارے ساتھ کھاتی ہوں۔“

دونوں قریب کی میز پر آ بیٹھیں۔
 ”گھر جانے سے پہلے میں نانا کو مبارکباد بھی دینا چاہتی ہوں۔ رش میں مجھے موقع نہ مل سکا۔ کافی لید رنگ
 ہے نا۔“

”خاندان بھر سے سب ہی کو دعویٰ کیا گیا ہے نا پھر دوست احباب۔ ملنے ملانے والے۔ یوں ایک بڑی تقریب
 بن گئی۔“

ربیعہ نے آستکی سے سر ہلایا پھر اسے کچھ خیال آیا۔
 ”آئی راجس۔ ملی تھیں ابھی۔“
 وردہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”ہوں۔“ وہ آستکی سے بولی۔
 ”وہ کہہ رہی تھیں۔“

”کہ میں نے رافع سے شادی سے انکار کر دیا۔ ہے نا؟“ وردہ نے اس کی ادھوری بات مکمل کی۔
 ”کیوں وردہ۔ کیوں؟“ ربیعہ کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ”کیا برائی ہے رافع میں؟“
 ”تم بتاؤ۔“

”میں؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”ہاں ربیعہ۔ تم بتاؤ مجھے۔ رافع میں کیا برائی ہو سکتی ہے؟“
 ”کچھ نہیں۔ خدا کی قسم۔ کچھ بھی نہیں۔“ ربیعہ اسے یقین دلانے والے انداز میں بولی تھی۔
 ”پھر تم رافع سے شادی کر لو ربیعہ۔“ وردہ اچانک بولی۔

ربیعہ نے دفعتاً پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا اور نشو سے ہاتھ پونچھنے لگی۔
 ”دیکھو ربیعہ! میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی وجہ کچھ بھی ہو۔ اتنا طے ہے کہ میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی۔
 کر سکتی لیکن رافع میں اتنی خوبیاں ہیں کہ تمہارے جیسی پیاری لڑکی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ میرا دل
 کہتا ہے۔“ وردہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”میں تمہیں بتا چکی ہوں وردہ۔ میں کسی سے۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”غلط۔ بالکل غلط۔ تم کہیں بھی انکج نہیں ہو۔“ وردہ دھوک سے بولی تھی۔
 ربیعہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔

”عذر ماما بہت اچھی ہیں ربیعہ! وہ تمہاری دل سے قدر کریں گی اور رافع۔ وہ تمہیں چاند تاروں سے بڑھ کر
 چاہے گا۔ تم ایک مرتبہ ہاں تو کہو۔ تمہارے اور رافع کے ایک ہونے میں کوئی مشکل حائل نہ ہوگی۔“
 وردہ جذباتی ہو گئی تھی۔

”لیکن۔ تم ایسا کیوں چاہتی ہو وردہ؟“ ربیعہ نے تحیر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ تمہارا ساتھ ایک اچھے انسان سے جڑے۔ میں
 چاہتی ہوں۔ میرے انکار سے۔ رافع کو مجھ سے بھی اچھی لڑکی کا ساتھ ملے۔ میرے انکار کا دکھ اس خاندان
 کے دل سے مٹ جائے۔ اس لیے۔ میں ایسا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری دوست نہیں ہو رہی۔ کیا تم ایسی ہی
 محبت مجھ سے نہیں کرتیں جیسی محبت میں تم سے کرتی ہوں؟“

”میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر چاہتی ہوں۔“ ربیعہ دھیرے سے مسکرائی۔
 ”پھر انکار مت کرو۔ تمہارے انکار سے میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پلیز۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ربیعہ کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ ربیعہ تذبذب اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیسی باتیں کر رہی ہو وردہ۔ اتنا بڑا فیصلہ میں اکیلے کیسے کر سکتی ہوں۔“
 ”رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جاتا ہے۔“ وردہ کی مسکان میں کیا تھا ربیعہ سمجھ نہ سکی۔
 ”تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ میں خود منہ زہ آئی سے بات کروں؟“

ربیعہ کا دل اس خیال سے بھی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔
 ”تم پاگل ہو گئی ہو وردہ۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”دوست تو ہاتھ پکڑ کر کھائی میں چلا نکلا دیتے ہیں تم اتنے سے پاگل پن میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں پھر
 کیسی دوستی؟“

”یہ کیسی دوستی ہے کہ میں تمہارے متاثر سے شادی کر لوں؟“ ربیعہ زچ ہوئی۔
 ”وہ میرا متاثر نہیں ہے ربیعہ۔ وہ سکون سے بولی۔ ”یہ دیکھو۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔
 ”میری آنکھوں میں کوئی انگلی نہیں ہے اور میرے دل پر کوئی نام نہیں ہے۔“

ربیعہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔
 آپ اپنے جملہ عروسی میں ایک فراڈ وجہ کے بازو لڑکی کو لے کر جا رہے ہیں۔
 یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے تاروں کی روشنی میں رات بھر باتیں کی تھیں۔
 یہ وہ لڑکی نہیں ہے جو آپ کے دل دھڑکنے کا سبب بنی۔
 یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے قول و قرار کیے تھے۔
 یہ لڑکی اس کی آواز بنا سکتی ہے اس کے الفاظ چرا سکتی ہے اس جیسا دل نہیں لاسکتی۔
 آپ کو دھوکا دیا گیا ہے آپ کی محبت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔
 کبھی اس سے اپنی گزشتہ محبت کا ثبوت مانگے گا۔ وہ کوئی ثبوت نہ دے پائے گی۔
 ایک خوں بہا۔ آپ دونوں کے سم۔
 اس نے اپنے لکھے ہوئے میسج کو بار بار پڑھا پھر فراز کے موبائل نمبر پر سینڈ کر دیا۔
 اپنا لکھا ہوا میسج ڈیلیٹ کر کے اس نے موبائل کی سم نکال کر الگ رکھ دی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے
 تکیے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر دیکھا تھا۔
 ”ایک خوں بہا۔ آپ دونوں کے سم۔“ اس نے زیر لب کہا۔
 ”عریضہ۔“ ماہین کی آواز پر وہ یکدم چونکی تھی۔
 چاقو اس نے واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔
 ”مامی تمہیں بلا رہی ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہین فکر مند تھی۔
 عریضہ وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کے مین بج رہے تھے۔

hoto.com

”میں تمہیں رگولا نرودیتی ہوں۔“ ماہین بولی۔ ”تم پُر سکون سی نیند سو جاؤ گی اور کل فریش بھی لگو گی۔“
عریشہ بادل خواستہ ماں کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے لیکن ماں اور
بہن نے فی الوقت اسے مجبور سا کر دیا تھا۔

اس نے پھر بے چینی سے کرویٹ بدلی تھی۔ کرویٹیں بدل بدل کر اس کے اعصاب جھنجھلا اٹھے تھے۔ نیند کسی
بے مروت کی مانند نہ تھی ہوئی تھی جس نے رابطے کا ہر سلسلہ منقطع کر دیا ہو۔
شہلا بالآخر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سارے دن کی تھکاوٹ والی مصروفیت کے باوجود اس کا ذہن ذرا سی تھکن محسوس
نہ کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر سوئے ہوئے ہاشم کی سانسوں کا زیروم اسے بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا تھا۔
شہلا نے ہاتھ بڑھا کر اپنی جانب کا سائیڈ لیپ روشن کر دیا۔ کمرے میں ہلکی دودھیا روشنی نے ماحول کو عجب سحر
میں ڈھال دیا تھا۔ اس نے ڈال کا لک کی جانب دیکھا جواب رات کے چکر سے نکل کر دن کی جانب محو سفر ہوا چاہتا تھا۔

”اے دل ناداں! آرزو کیا ہے؟“ اس کے اندر خود کلامی سی ہوئی۔ ”نیند کیوں نہیں آتی سحر کیوں
نہیں ہوتی؟ چین کیوں نہیں ملتا؟ اس کی نیند بے اعتنائی سے دل سے محو کیوں نہیں ہوتی ہے؟“

وہ اپنی جگہ سے ذرا سا کھسک کر ہاشم کی طرف ہو گئی۔ فاصلہ ہاتھ بھر سے سمٹ کر دو بالشت کا رہ گیا۔ ہاشم
دھیرے سے سیدھا ہوا تھا۔ شہلا کا دل دھڑکا لیکن وہ پُر نیند میں تھا۔ ایک لمبے عرصے سے وہ دونوں میاں بیوی
کے روپ میں دو اجنبیوں کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ دو نہایت شائستہ اور مہربان اجنبیوں کی مانند۔ جنہیں
شکاک نہ تھا کہ وہ موت سے خلاص ہوئے۔ عمر گزار دینے کے حوصلے کے ساتھ۔ وہ دونوں ساتھ

گم از گم شہلا کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا، بریف کیس میں رکھے ہوئے وہ چند پیروز کتنی ہی بار ذہن کے پردے پر
پھرے تھے پھر ایک موہوم ساقین اسے کہتا تھا کہ ایسا ہونا ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ تذبذب اتنا بھی طویل نہیں
ہوا کرتا۔ محبت ایسی بھی کمزور نہیں ہوتی۔

”ایک بار اس سے پوچھ تو لے کہ اس انداز سے کتنا واسطہ ہے؟ پوچھ تو سی۔“ شہلا پھر ذرا سا
سرکی تھی۔ اب کے فاصلہ محض بالشت بھر کا رہ گیا تھا جسے ہاشم کی ایک کروٹ نے پاٹ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ
جاگ اٹھا تھا۔

چند سانسے ڈال کر رہے یقینی اور حیرانی سے ان ستارہ آنکھوں کو اپنے قریب چمکتے دیکھتا رہا پھر اپنے بازو کے نیچے اس
کے نرم کھیرے بالوں کو محسوس کر کے وہ یوں اٹھ بیٹھا جیسے اسے گرنٹ لگا ہو۔ شہلا بھی اس کے عقب میں۔
بے حد آہستگی سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔

”سوئیں کیوں نہیں؟“ ہاشم نے گھڑی کی جانب نگاہ کر کے بو جھل آواز میں پوچھا۔
”نیند نہیں آتی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“

جواب میں جو خاموشی تھی اس کی ملک سے ہاشم نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کیے۔ اس نے گردن
موڑ کر دیکھا۔ اس کا گلاب چہرہ اس کے شانے کے بالکل قریب تھا۔ ان آنکھوں کی سطح شفاف اور پر غم تھی۔ ہاشم
کا جی چاہا وہ اس کی سے اپنی پوری ہستی کو سیراب کر لے۔
”ہاشم!“ شہلا کے لب دھیرے سے کاہنے۔

”عریشہ!“ فردوس بیگم نے بے حد محبت سے اسے پکارا تھا۔
وہ بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر حد درجہ نقابت نظر آتی تھی۔ عریشہ کے پتھریلے جذبات میں
مناکی تیز آنچ سے پھیل سی ہوئی وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔
”عریشہ!“ انہوں نے اس کا سر ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹی! ہماری غلطیوں کو معاف کر دینا۔“ ان کی آواز میں

لرزش تھی اور لمبے میں پچھتاوے کا احساس۔
”آپ نے کوئی غلطی نہیں کی امی!“ ماہین دوسری جانب سے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں کا
دوسرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”ماں باپ! بس بھی جان بوجھ کر اولاد کو دکھ دینے کا نہیں سوچ سکتے۔ عریشہ یہ بات تب سمجھے
گی جب ماں بنے گی۔ ماں کی سب سے بڑی پناہ محبت اور بے غرضی کو یہ اس وقت صحیح طور پر پرکھ پائے گی! ابھی یہ ناقص سوچ
رکھتی ہے اس لیے مغالطوں کا شکار ہے۔“

عریشہ خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے کسی بھی بات کی تائید یا تردید کی ضرورت محسوس
نہیں کی۔

”تم نافع کے ساتھ بہت خوش رہو گی بیٹی! یہ ایک ماں کا یقین ہے اور دعا بھی ہے۔“ فردوس بیگم اس کے اندر کے
شانے سے کوئی گونج سننے کی متمنی تھیں۔

”اتنا تو میں سمجھ چکی ہوں کہ تم اس رشتے سے سخت ناخوش ہو لیکن بیٹی! یہ تمہارے باؤ کا فیصلہ تھا اور باپ
بیٹیوں کے مقدر کا فیصلہ بہت سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ اپنے تو یقین ہے نا تمہیں کہ تمہارے باپ تم سے بہت
پیار کرتے ہیں؟“

”صرف باا جان ہی نہیں! آپ بھی ہم سب سے بہت محبت کرتی ہیں امی!“ ماہین پھر جلدی سے بولی تھیں۔
”ہم سب کو اس بات کا یقین ہے۔ ماں اگر سخت گیر بھی ہو تو اس کی محبت میں کسی کمی نہیں ہے۔“ فردوس بیگم نے
”ہاں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”شاید میں نے تم لوگوں سے سختی ہی روا رکھی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے میرے

بچوں کہ میں تم سب کو بہت چاہتی ہوں۔“
”عریشہ!“ ماہین اس سے مخاطب ہوئی۔ ”امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وجہ جانتی ہو؟“ عریشہ نے
خاموش مگر سوالیہ نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

”کل تمہارے اس گھر سے چلے جانے کا خیال انہیں ستا رہا ہے۔ تمہاری ناخوشی سے یہ خود کو بیمار اور کر رہی
ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم انہیں بتا دو کہ تم مطمئن ہو اور خوش بھی۔“

عریشہ کے لبوں پر ایک ناہم سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ماہین نے ایک گہری سانس بھری تھی۔
”تم یہاں امی کے پاس ہی لیٹ جاؤ عریشہ! تمہاری یہاں موجودگی سے امی کو تقویت رہے گی۔“ پھر وہ اپنی جگہ
سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نیچے کارپٹ پر سو جاتی ہوں۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ عریشہ بے چینی سے ہوا تھی۔ ”مجھے شاید یہاں نیند نہ آئے۔“

ماہین نے کھڑے ہوتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے حیرت سے اسے دیکھا۔
”کوئی بات نہیں۔“ پھر وہ اطمینان سے بولی۔ ”تم تو یوں بھی راتوں کو جاگنے کی عادی ہو۔ ایک رات اپنی ماں کے
لیے بھی جاگ لو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”بیٹی! ماہین ٹھیک کہتی ہے۔ تم میرے پاس ہی لیٹ جاؤ۔ مجھے سکون رہے گا۔“ فردوس بیگم قدرے لجاجت
سے بولی تھیں۔ عریشہ نے خود کو بے بس سا محسوس کیا۔

ربیعہ نے اس کی بات پر اپنے اندر غجب بے چینی سی محسوس کی تھی۔

”کیا ورو واقعی آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی؟“

”وہ تو یہ کہہ سکتی ہے۔ اور آخر وہ غلط کیوں کہے گی؟ اور۔۔۔ جب ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔ یقیناً تجھ سے بہت بہتر کوئی شخص کہیں اس کا منتظر ہو گا۔ ٹھیک ہے نا!“

”پتا نہیں۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں اپنی ہی کو تمہارے گھر بھیج سکتا ہوں؟“

ربیعہ خاموش کھڑی اپنے دل کی دھڑکنیں کتنی رہی جو کوئی انوکھا سا پیغام دینے پر آمادہ تھیں۔

”تمہاری خاموشی۔۔۔ تمہارا اثبات۔۔۔ تجھوں؟“ رافع کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

ربیعہ دھیرے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔



رات نے جھللا تالیاں پہنا۔ گھنیری زلفوں میں چمکتے ستارے ٹانگے۔ موتیا اور چٹا بول کی مہک کو ہمراہ کیا اور ”حیات ولا“ کے مینوں کے پاس چلی آئی۔

تین براتوں کی آمد کے پیش نظر شہر کا سب سے بڑا اور کشادہ ہال ارنج کیا گیا تھا۔ جہاں ”حیات ولا“ کے سب ہی یکساں موجود تھے سوائے نافع اور رافع کے۔ جنہوں نے نافع کے دوست احباب کے ہمراہ ایک عدد ”بارات“ کا سا تاثر لے کر آنا تھا۔

ثانیہ کی برات کو دور جانا تھا سو اس کے سرال والے بارائیاں کر بیچ چکے تھے۔ ثانیہ کو نکاح کے بعد اسٹیج پر لے جایا گیا تھا جہاں اس کی اور اس کے گھر والوں کی تصاویر بن رہی تھیں۔

ڈرننگ روم میں ناعمہ اور عریشہ رہ گئی تھیں۔ عریشہ کی خاموشی کاٹ ڈالو نظریں ناعمہ کے ہیرا پتے میں جیسے سویاں سی چھوڑی تھیں۔ دو بار بار پہلو بدلتی تھیں۔ اسے اس لڑکی کی کٹھلی نظروں سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

گھرا سرخ پیش قیمت بنارسی غرارہ زیب تن کیے انٹیک لک دیئے تھناری زاورات سے مزین ناعمہ کو پہچانا آج مشکل محسوس ہوتا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر کلیوں کے بیچ چمکتا گلاب چروانی معصومیت بھری چمب سے پھولوں اور کلیوں کو بھی مات دے رہا تھا۔ عریشہ کا لباس میروں تھا جس پر میروں اور گولڈن کام تھا۔ گولڈن جیوری اور میروں میک آپ نے اس کے اداس چہرے اور خاموش نگاہوں کو غجب پر اسرار سا تاثر بخشا ہوا تھا۔

”کچھ بات کرو نا۔“ ناعمہ گھبرا کر بولی تھی۔ ”اتنی خاموش کیوں ہو؟“

عریشہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ چکی۔“ پھر وہ بولی تھی۔ ”اب۔۔۔ خاموش ہی ہونا ہے!“

”میں کچھ سمجھی نہیں!“ ناعمہ نے حیرانی سے اس کا اسرار سے بھر روپ دیکھا۔

”سمجھ جاؤ گی! سب ہی سمجھ جائیں گے۔“

دونوں کے درمیان پھر خاموشی در آئی تھی۔ عریشہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ ناعمہ نے مسکراتے کی کو بخشش کی۔

”دیکھ رہی ہوں۔ کہ آنے والے لمحوں کے احساس نے تمہیں خوبصورت بنا دیا ہے۔ ورنہ تم اتنی خوبصورت تو نہیں ہو۔“

”آنے والے لمحے۔۔۔“ ناعمہ کا دل بیٹھنے لگا۔

”جو جھوٹ بولے ہیں“ اس سے۔۔۔ ناہواؤ گی؟“ اس نے کاٹ وار انداز میں پوچھا تھا۔ ناعمہ نے چونک کر اس کی شعلہ بار آنکھوں میں دیکھا۔

”جھوٹ بولتے وقت۔۔۔ صرف تمہارا خیال تھا۔ یا اپنے خاندان کی عزت کا۔۔۔“ پھر وہ رسائیت سے بولی۔

”اب بھی میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو کچھ کہا۔۔۔ کسی کی بھلائی کے لیے کہا۔“

”ہنس۔۔۔ بھلائی؟ بھلائی تو صرف تمہاری اپنی پوشیدہ تھی۔ تم کسی بھی طرح اسے پانا چاہتی تھیں۔۔۔ خواہ جھوٹ سے ہی سہی۔ بعد میں کہا ہوتا ہے اور کیا ہو گا۔ تم نے اس بارے میں سوچا تک نہ ہو گا!“

”نوریشہ! مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی بھی تمہارا دل صاف کر پاؤں گی۔ لیکن مجھے اپنی آنے والی زندگی کے کسی پل سے کوئی سکھ نہ ملے اگر میں نے ایسا کچھ بھی سوچا یا چاہا ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے فراز کو پانے سے پہلے اس سے جھوٹ بولنا تو درکناس۔ کبھی اس سے بات تک نہ کی تھی۔ اس سے رشتہ جڑنے کے بعد اگر میں نے خود کو وہ

لڑکی کی ہر گز بات نہ کی تھی۔ رات رات بھر فون پر باتیں کرتی تھی تو محض تمہاری اور نافع کی اور اپنے پورے خاندان کی عزت کے لیے۔ کیونکہ اس وقت تم نافع کی منکوحہ اس کی عزت تھیں۔ نافع اور فراز آپس میں دوست اور

شنا سنا نہیں۔ تم ہی تناؤ۔۔۔ حقیقت جان لینے کے بعد فراز کی نظروں میں تمہارے لیے کون سا جذبہ ہوتا؟“

”کم از کم وہ تم سے شادی تو نہ کرتا۔“ وہ پتھر پتھر سے کہتی تھی۔ ”میری نظروں کے سامنے کسی اور کا تو نہ ہوتا میں آنے بھی

اس سے محبت کرتی ہوں۔ سنا تم نے؟ ان الفاظ کی باہر گشت تم کبھی نہیں بھول پاؤ گی۔“

ناعمہ ساکت رہ گئی۔ کھلی آنکھوں سے وہ اس دیوانی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔



سالور شیش سے سجائی ہوئی لباس زیب تن کر کے اس نے بال سنوارے اور لبوں پر تیز گلابی لپ اسٹک لائی۔

کانوں میں فیوزے کے ٹاپس یکن کروہ پلٹ ہی رہی تھی جب منیوہ بیگم اس کے قریب چلی آئیں۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ چشم بدروس۔۔۔“ انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر مہر محبت ثبت کی۔

”آج تو میری بیٹی کا روپ ہی نرالا ہے۔“

ربیعہ نے جھینپ کر سر تہہ کا لیا تھا۔

”یہ الوہی چمک۔۔۔ ایسا دکھتا اور کا بال۔۔۔ جیسے یہ کسی فرشتے کا چہرہ ہو۔“ انہوں نے ربیعہ کو غور سے دیکھا۔

”آج میری بیٹی بڑی خوش نظر آتی ہے؟“

ربیعہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ماں کی نظروں میں چھپی پوشیدہ مگر شدید قوت کا اسے احساس ہوا تھا۔

حقیقت یہی تھی کہ صبح رافع سے ہونے والی ملاقات کا اثر اب تک اس کے رویوں میں روئیں میں مہک رہا تھا۔ وہ خواہ

کتنی ہی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ رات کو ہونے والی اس تقریب کا اسے صبح سے ہی انتظار تھا۔

منیوہ بیگم اب تک اس کا چہرہ غور دیکھ رہی تھیں۔

”ربیعہ۔!“

”جی ای۔!“ وہ چونکی۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے۔“ وہ ہنس دی۔

”امیر حسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

ربیعہ یکدم حیران ہوئی تھی۔ اس کا چمکتا چہرہ قدرے ماند پڑا۔
”امیر حسن۔“

”وہ تم سے شادی کا خواہش مند ہے بیٹی!“

”لیکن امی جی۔!“ وہ بے اختیار پریشانی سے بولی۔ ”مہم میں ان سے شادی۔“ وہ بولتے بولتے خاموش سی ہو گئی۔ منیزہ بیگم بے چین ہو گئیں۔

”کیا بات ہے ربیعہ۔ کیا تمہیں امیر حسن پسند نہیں۔ کیا کسی اور کو۔“

اسی لمحے کمرے میں انبیقہ داخل ہوئی تھی۔ مسٹر ڈاور گھرے کبی نیشن کے بے حد اسٹائلش کرتا شلوار میں ملبوس کاندھے پر ہلکی سی شال ڈالے۔ وہ دلکش لگ رہی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔ اعباد بھائی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ شہلا آپلی کا دو مرتبہ فون آچکا ہے۔ سب ہی برائیں ہال میں پہنچ چکی ہیں۔ جلدی کر۔“

”جاؤ بیٹی۔! تم لوگوں کو واقعی دیر ہو چکی ہے۔“ منیزہ بیگم نے تفکر سے گھڑی کی سمت دیکھا۔

”واپس آؤ گی تو بات کریں گے ان شاء اللہ!“

”آپ اکیلی رہ جائیں گی نا۔“ ربیعہ پریشان تھی۔

”بے فکر ہو کر جاؤ۔ میری طبیعت ابھی بالکل ٹھیک ہے۔“

”ہم جلدی آجائیں گے امی جی۔!“ انبیقہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ان کا گال چوما۔

”ہاں بچو۔ جلدی آجانا۔ اکیلے گھر میں میرا دل بالکل ٹھیک نہیں لگے گا!“ انہوں نے پیار سے کہا تھا۔

اسٹیج پر رنگ و بو اور روشنیوں کا جھوم سا اکٹھا ہو گیا تھا۔ کسی کنسرٹ کے اسٹیج کی طرح چہنائے گئے وسیع وسیع عریض اسٹیج پر تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دو لہا اور دلشیں اپنی اپنی نشستوں پر برا بھلاں مٹھتے۔ مددی اور تھوڑیوں کی شیدائی لڑکیاں تصویریں اور مسوی بنوا رہی تھیں۔ اسی افرا تفری میں بڑے بزرگوں کو بھی اس کار خیر کو سرانجام دینے کے لیے بھیج لیا جاتا تھا۔

”حیات ولا“ کے سب ہی مکیں چروں پر خوشگوار مسکراہٹیں لہیے ہوئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے دعائیہ کلمات وصول کرتے ہوئے سب ہی کے احساسات و جذبات خوشگوار تھے۔ وسیع وسیع عریض ہال میں اتنے دھیر سارے مہمانوں کو دیکھتے ہوئے ربیعہ قدرے گھبرا سی گئی تھی۔ ناغہ ہونے کے لیے خرید آگیا گفٹ وردہ کو تھماتے ہوئے اس نے اس بات کا اظہار بھی کر ڈالا تھا۔

”ارے۔۔۔“ وردہ ہنس دی۔ ”جانتی ہوں تم آمیز ہو۔ مگر ایسی بھی کیا کم آمیزی۔ اتنی بھرپور تقریب ہے۔“

انجوائے کرو۔“

”میرا جی چاہ رہا ہے۔ میں بالکل کونے والی میز پر بیٹھوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ کونے والی میز پر ہی بیٹھ جائے۔“ وردہ مسکرائی تھی۔ ”تم جہاں بھی بیٹھو گی۔ ڈھونڈ لی جاؤ گی۔“

ربیعہ نا سمجھی سے مسکرائی۔ وردہ نے اسے غور سے دیکھا پھر قدرے ٹھنڈے لمبے میں کہا۔

”رافع تمہیں ڈھونڈ ہی لیں گے!“

ربیعہ کی تحیر بھری آنکھوں نے وردہ کی بے اثر نظروں میں کچھ کھوجنا چاہا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟

”تم بیٹھو نا ربیعہ۔“ وردہ نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ دھیرے سے دبائے۔ ”ابھی کھانا لگے گا تو ساتھ کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک؟“

ربیعہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ وردہ کسی مہمان کو آمادہ دیکھ کر اس جانب برہ گئی تھی۔ انبیقہ اپنی چند

شناسا لڑکیوں کے ساتھ میڈیکل کالج کے حالات پر سیر حاصل بحث کر رہی تھی۔ ربیعہ تنہا ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ارد گرد بکھری خوشیوں اور روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ یکایک ایک مخصوص ملک کا احساس ہونے پر وہ چونکی تھی۔

رافع اس کے قریب موجود تھا۔ ربیعہ کو اپنی آنکھوں میں روشنی سی بھرنے کا احساس ہوا۔ دل انجبنی سی تال پر دھڑکا۔ رات گئے صبح صادق کے حوالے یاد آنے لگے تھے۔

”اکیلی ہی آئی ہیں؟“ رافع نے اسے تنہا پا کر پوچھا۔

”نہیں۔ انبیقہ اور عباد بھائی بھی ساتھ ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ربیعہ ماں کے حوالے پر قدرے اداس ہوئی تھی۔ ”وہ گھر پر ہیں۔“

اسی لمحے رافع کو حمزہ نے آواز دی تھی۔ رافع نے پلٹ کر دیکھا، حمزہ کمرہ تھا، ہاتھ ہلا ہلا کر اسے بلارہا تھا۔ شاید کسی گروپ فوٹو کے لیے۔

رافع نے ربیعہ کو قدرے معذرت خواہانہ پر مسکرا کر دیکھا اور حمزہ کی جانب برہ گیا۔ ربیعہ کی نگاہوں نے کچھ دیر اسے دیکھا۔ سیاہ کوٹ پیلیٹ میں ملبوس رافع آج ہمیشہ سے زیادہ خور و نظر آ رہا تھا۔ ربیعہ کی نظریں میں کافی دور تک اس کے ساتھ گئی تھیں۔

یکایک اس نے اپنے قریب کسی کی کھانکھنا دیکھنی تھی۔ ربیعہ چونک کر خود میں پلٹی۔ رائے اس کے قریب بیٹھ رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“ ربیعہ نے گرجوشی سے سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔“ کسی اور ربیعہ کی طرح بوجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت اور بیاری تھی۔ جب آتا تھا تو ہاتھوں پر نظر کاٹتا۔ بھلی لگاتے ہیں۔“

رائے نے اپنی آنکھ کے گوشے سے ذرا سا کا جھل لے کر اس کے کان کے پاس لگایا۔ ربیعہ بے طرح جینپ غمی۔

”وردہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اکثر تمہارا ذکر کرتی ہے۔ حالانکہ وہ بہت لمبے دیے رہنے والی لڑکی ہے۔ لوگوں سے کم ہی مٹھتی ملتی ہے۔ تم نے اپنا ڈھنگ لگایا ہو گا؟“

”جی۔“ ربیعہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”ایسا ہی ہے۔ پھر بھی اس کی ذات کی خوبصورتی سب ہی کو اپنا بنا لیتی ہے۔“

”نہیں۔“ رائے نے سانس بھر کر کہا۔ ”ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو رافع۔۔۔ رافع کیوں نہ بن سکا اس کا؟“

اس نے یہ سوال براہ راست ربیعہ کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔ ربیعہ کا چہرہ قدرے بے رنگ ہوا۔

”رافع۔!“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ پائی۔

”ہاں رافع۔ جسے وہ بچپن سے چاہتی ہے۔ اس وقت سے جب ان دونوں کی نسبت بھی طے نہ ہوئی تھی۔ اسی رافع سے جسے وہ از حد خاموشی سے اپنی پلکوں اور اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھتی تھی۔ وہ رافع اسے چھوڑ کر۔“

مگر سانس بھر کر اس نے ربیعہ کے سراپے کو بے حد غور سے دیکھا تھا۔

”چاندی میں۔ سونے سے زیادہ چمک ہوتی ہے۔“ پھر وہ زیر لب بولی جیسے خود اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ”لیکن چاندی۔ سونے سے زیادہ تو نہیں ہوتی۔ ہے نا ربیعہ؟“

پھر ایک ورہیہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

”خیر تم ورہیہ کی دوست ہو۔ اس لیے تم سے کہہ گئی یہ سب کچھ۔ ورہیہ نے تو اس ایٹھ پر بات کرنے پر بین لگایا ہوا ہے لیکن تم ہی کو ورہیہ! اتنی پرانی نسبتیں یوں بیک جنبش ابو ختم کی جاسکتی ہیں؟ ختم کی جانی چاہئیں؟ لڑکوں کا کیا ہے۔ وہ تو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی باتوں پر رشتے ٹوٹ جایا کرتے ہیں؟ ورہیہ تمہاری دوست ہے۔ اگر تم اسے سمجھا سکو تو۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور رافع بھی۔ شاید تمہارا کھانا لے۔۔۔ دراصل امی بہت پریشان ہیں۔“ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

ورہیہ کچھ دیر بالکل بے حسن و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ حرکت کرنا چاہے گی بھی تو کرنہ پائے گی۔ پھر اس نے بروقت میز پر دھرا اپنا ہاتھ اٹھا کر اپنے گال پر رکھا۔ اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ پھر اسے لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے والی ہے۔ اسے لگا وہ ابھی اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی موجودگی میں زور زور سے رونے لگے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ اس نے سر پر یوں اوڑھ لیا کہ اس کا آدھا چہرہ ڈھک گیا۔ پھر وہ بیٹھ کر تیزی سے لوگوں کے درمیان سے نکلتی چلی گئی تھی۔

عباد اور انیقہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں گاڑی سے اترے تھے۔ مرکزی دروازہ انہیں کھلا ہی ملا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج میں بیٹھی منیجر دیکھ کر دوڑنے لگی۔

”امی! وہ ربیعہ...“ عباد نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”وہ سو رہی ہے۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔

وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”سو رہی ہے؟“ پھر عباد نے نہایت حیرانی سے کہا تھا ”وہ سب کچھ کے ساتھ آئی ہے؟“

”نیکسی لے کر آگئی تھی۔ اس کے سر میں بہت سخت درد شروع ہو گیا تھا۔ تم دونوں کی تقریب خراب نہ ہو۔“

اس خیال سے وہ نیکسی لے کر گھر چلی آئی۔ اب ٹیلیٹ کھا کر سو گئی ہے۔

”لیکن وہ کم از کم مجھے بتا کر تو جاتی۔“ عباد کو ایک غصہ چڑھا تھا۔ ”میں اتنا پریشان ہوا اسے کہیں نہ پا کہ میں اور انیقہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ ہم دونوں کھانا تک پہنچو نہ ہو۔“ وہ گاڑی کا ٹکسہ لپیو کہ ربیعہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتی ہے۔“

”چھوڑو سنا بھائی! وہ بے چاری ہمارا خیال کر کے ہی ہمیں بتاتا ہے چلی آئی اس نے سوچا ہو گا ہم لوگ شاید گھر فون کر کے پتا کر لیں گے، ہمیں بھی تو گھبراہٹ میں اتنا دھیان نہیں رہا۔ امی سے فون پر کنفرم کر لیتے تو اتنی پریشانی اٹھانا نہ پڑتی۔“

انیقہ نے ربیعہ کی طرف داری کرتے ہوئے عباد کو ٹھنڈا کیا۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔۔۔ آپ چیخ کر لیں!“

”ربیعہ؟ اس نے کھانا کھایا؟“ عباد نے بے چین ہو کر اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے جیسے رستہ بھر رہی تھی۔“

آئی ہوئے منیجر دیکھ کر اسے اداسی سے بولیں۔

”لیکن کیوں؟ اسے کسی نے کچھ کہا ہے؟ کسی نے اس کے ساتھ مس بی ہو تو نہیں کیا؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے عباد بھائی!“

ربیعہ کی آواز پر وہ سب چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

”کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میرے سر میں اچانک ہی درد اٹھا تھا۔ میں آپ لوگوں کو ڈھونڈ بھی نہ پائی۔“

ربیعہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے دوپٹہ نماز پڑھنے کے انداز میں چہرے کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ نماز پڑھ کر ہی آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں لیکن چہرہ اور انداز بالکل پرسکون تھا۔ عباد اور انیقہ اس کے قریب جا کر جیسے اپنا اطمینان کرنے لگے تھے۔ انیقہ نے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔

”سچ ربیعہ! نجانے کیوں ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے تھے!“

ربیعہ کے اندر سے ایک سکسی سی نکلی مگر اس نے خود پر قابو پایا۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔ پھر ہم سب مل کر شادی کی دعوت کا مزمزہ لیتے ہیں۔“ انیقہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

نہایت خواب ناک اور معطر ناخون میں وہ کسی بہت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ پورے وجود میں ایک پاگل دل تھا جو خاموش ہونے پر راضی نہ تھا اور شور مچاتے بیٹھا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو لمحہ بھر کے لیے پاگل دل بھی سم کر خاموش سا ہوا پھر سوچ سوچ کر دھڑکنے لگا۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے قریب آ بیٹھا تھا۔

ناعمہ نے ڈرتے ڈرتے پلوں کو اٹھایا۔ پھر فوراً گرا بھی لیا۔ وہ خشک تیور لیے اس کی جانب متوجہ تھا۔

”بہت ڈھکیچڑکی ہو۔“ وہ سر دھونے میں لگا پولا۔

ناعمہ نے رونمائی میں ملا لعلہ خاموشی سے سنا۔

”خود سر۔۔۔ جھولی۔“ تنہا فب بڑھنے لگے تو اس نے بے چین ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ اسے لگا فراز نے دھیمی سی مسکان کو چھپایا تھا۔

”دو نمبر فراز لڑکی!“ جونہی فراز کے لبوں نے کچھ کہنا چاہا تھا ناعمہ نے بے اختیار رول کر اسے حیران کر دیا۔

”کیا کیا۔ کیا کہا؟“ اس نے متعجب ہو کر اسے دیکھا۔

”دو نمبر فراز لڑکی یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟“ وہ سکون سے بولی۔ ”تمام الزامات کے ساتھ حاضر ہوں جو چاہے ہے۔“

فراز نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر ہلکا ہلکا ہوا۔

”ہوں گویا آپ سزا پانے کے لیے تیار ہیں۔ فرد جرم آپ پر چس کی یا میں؟“

”فرد جرم کی ضرورت نہیں۔ بنا سنے ہی میں ہر الزام تسلیم کرتی ہوں۔“

”پھر بھی ایک آدھ الزام دہرایا جائے تو حرج بھی کیا ہے۔“ اس نے مسکراہٹ دہائی تھی۔ ناعمہ نے سوالیہ نظروں سے اس کا جاذب نظر چہرہ دیکھا اور اس کی کشش سے گھبرا کر نگاہیں جھٹالیں۔

”پہلی نظر میں تم میرا دل چرا لے گئی تھیں یا گل لڑکی۔ اتنے طویل عرصے سے تمہاری۔۔۔“ وہ دم ادا میر۔

دو نظریں پر نقش ہے۔ بولو کیا سزا دوں اس جرم کی؟

اس کے بوجھل، معنی خیز کجے کی تپش نے ناعمہ کے حواس جھنجھوڑے۔ وہ بری طرح چوٹکی۔

”تمہاری ایک پاگل کزن کے ساتھ کچھ عرصہ باتیں کرتا رہا۔ ذہن میں تمہارا تصور باندھے۔ بخدا ناعمہ! میں نے اس سے تمہارے دھوکے میں باتیں کیں۔ یہ واحد خطا ہے جو سرزد ہوئی مجھ سے۔ اس سے قطع نظر میں نے کبھی تمہارے علاوہ کسی کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اسی لیے میں اس تعلقی کے منقطع ہونے پر اتنی شدت سے رد عمل ظاہر کرنا چاہتا تھا خدا بھلا کرے فریحہ کا جس نے تم دونوں کی گفتگو سن کر مجھ سب احوال سنا دیا۔ ورنہ ’ورنہ تم اسی دھنکالی اور خود سری سے خود کو وہی لڑکی ظاہر کرتیں اور اپنی اور میری عمر کو ضائع کر ڈالتیں۔ تمہاری فرد جرم میں از حد قسم کی بے وقوفی کا بھی اضافہ کرتا ہوں۔“

”فریحہ نے آپ کو۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ سب جانتے ہیں؟“ ناعمہ نے خود کو بڑی بڑی زنجیروں سے آزاد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

”شکر ہے خدا کا جس نے پردے ہٹائے۔“ وہ مسرور سا بولا تھا۔

”آپ۔۔۔ آپ سب کچھ جانتے ہو جیسے بھی مجھے پریشان کرتے رہے؟“ اس کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔

”نہیں یہ حقیقت جان لینے کے بعد میں نے کبھی تمہیں پریشان نہیں کیا۔“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”آپ۔۔۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ اتنا برا جھوٹ بولنے پر؟“ ناعمہ کی بے پرواہی نے لگی تھی۔

”اس جھوٹ کے پیچھے تمہارے جو احساسات و جذبات پوشیدہ تھے ناعمہ! انہوں نے مجھے تمہارا بے دام غلام بنا ڈالا ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں جو تمہارے جیسی بالغ نظر اور ایثار پسند لڑکی میری شریک حیات بنی ہے۔ اور معافی تو میں تم سے طلب کرتا ہوں۔ بے پروا عمر کے ایک غافل حصے میں میں نے یقیناً ”ایک خراب و خطرناک حرکت کی ہے چند لمحوں کی نشاط انگیزی ساری عمر چند لمحوں سے شرمسار رکھے گی۔“ نظر نہیں ملایا پڑا۔“

”عزیزہ!“ ناعمہ بے حد دکھ سے بولی تھی۔ ”اس کا پاگل پن ایسے ہی برقرار ہے۔“

”میں جانتا ہوں ناعمہ۔ لیکن وقت ہی ایسے پاگل پن کا دوا ہوا کرتا ہے۔ نئی زندگی کی شروعات اسے بھی بدل ڈالیں گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

اسے عیشہ کا وہ خطرناک انداز یاد آ رہا تھا۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔

”گیرا سوچ رہی ہو؟“ فرزانے اس کا چہرہ اپنی جانب کیا تھا۔

”عزیزہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں میں، میں صبح اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں!“

”ایسا ہی ہو گا۔“ فرزانے آہستگی مگر یقین بھرے انداز میں کہا تھا۔ ”لیکن میں۔۔۔ ابھی تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ناعمہ اس کے بدلے انداز پر چونکی، سنبھلی پھر دھیرے سے مسکرا دی۔

”میں تو سوچے بیٹھی تھی کہ آپ میرے آنسوؤں کے سوا کچھ دیکھنے کے متمنی نہ ہوں گے!“ فرزانے دھیرے سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ انہیں آہستہ سے دبایا اور مضبوط تھپتھپ میں کہا۔

”ہم اس بل سے۔۔۔ ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کریں گے ناعمہ! ہمارے درمیان پچھلا کوئی حوالہ کبھی نہیں آئے گا پچھلی کوئی بھی بات کوئی جگہ کوئی شکوہ کچھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہارا دامن تمہاری طرح پاک اور صاف ہے لیکن مجھ سے کچھ غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں اسی لیے میں سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہوں۔ آئندہ ہمارے درمیان کسی تیسرے فرد کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوگی میں اور تم بس یہی دنیا ہے۔ ٹھیک ہے نا!“

ناعمہ نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ خود کو بے حد آزاد ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ نیک نیتی کے ثمر اس کے چہرہ جانب بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا دل دباغ اور روح آسودگی اور سیرابی کی انتہا کو محسوس کر رہے تھے۔ ایسے لمحوں میں بھی اس نے چپکے سے عیشہ اور نافع کی خوشگوار زندگی کی ابتداء کی دعا کی تھی۔

لباس تبدیل کر کے وہ چہرے کو کلیننگ ملک سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو شہلا کو تدریے حیرت سی ہوئی۔ ہاشم اور رافع تو فارغ ہو کر محفل جمائے ہوئے تھے۔ گھر کے بقیہ افراد بھی تھکے ماندے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عیشہ کی رخصتی کا عمل ایسا ہی تھکا دینے والا اعصاب شکن محسوس ہوا تھا۔ اس نے رات کے دو بجائی گھڑی کو دیکھا اور برہہ کر دروازہ کھولا۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”نافع!“ پوری آنکھیں کھول کر اس نے نافع کو دیکھا۔ ”تم یہاں اس وقت؟“

”نافع جتنے کلائننگ ایس کی کٹائی پکڑی تھی پھر وہ اسے کھینچتا ہوا ’از حد غلت میں۔ میں لے جانے لگا۔“

”نافع۔۔۔!“ شہلا نے پکڑنا چاہا۔

”شش۔۔۔ خدا را بھالی خاموش رہیں۔“ اس نے سرگوشی کی تھی۔

شہلا کو کسی غیر معمولی احساس نے تھیرا۔ وہ خود بھی تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔ نافع اسے لان کے بجائے گھر کی پچھلی گلی کی جانب لے گیا تھا جہاں نکاسی آب کی لائنیں اور اکثر کمروں کے باہر کی جانب کھلنے والے دروازے تھے۔ نافع کے کمرے کا بھی ایک دروازہ اس گلی میں کھلتا تھا۔

دونوں تیزی سے قدم بڑھاتے اس کے کمرے میں پہنچے تھے۔ شہلا اس دوران چشم تصور سے نجانے کیا پتہ دیکھ چکی تھی۔ سوچ کر بے خود پڑی عیشہ کو دیکھ کر اسے سنبھلنا پڑا۔

”کیا کھانا ہے اس نے؟“ عیشہ آہستہ سے ناام میں پوچھ کر وہ اس کی نبض وغیرہ دیکھنے لگی۔

”شاید گولیاں کھائی ہیں۔۔۔ یہ خالی شیشی۔“ نافع نے اس کی توجہ خالی شیشی کی جانب مبذول کرائی۔

”اوہ گاڈ۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔ یہ پاگل لڑکی!“ شہلا کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

”بھالی! یہ بات اس کمرے سے باہر نکلی تو میں ساری عمر کسی سے نظر نہیں ملا پاؤں گا۔“ وہ شکستگی سے بولا تھا۔

”تم نے کچھ نہیں کیا نافع۔۔۔!“ شہلا نے اسے تسلی دی۔

”شاید۔۔۔ یہی میرا قصور ہے۔ میں نے ابی سے کہا بھی تھا۔“ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

”انہوں نے یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے نافع! تم اسے اٹھاؤ میں گاڑی کی چابی ملائی ہوں۔“

”لیکن اس وقت کہاں جائیں گے؟“ وہ ہراساں ہوا۔ ”یہ تو پولیس کیس ہے!“

”ڈونٹ وری۔ میرے پروفیسر ہیں ڈاکٹر خالد ان ہی کے کلینک لے کر چلتے ہیں اسے۔ جلدی کرو نافع دقت ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔“

نافع نے بے سدھ پڑی عیشہ کو کاندھے پر ڈال لیا۔ شہلا تیزی سے کمرے سے نکلی تھی۔

صبح صادق ہو چلی تھی۔ شہلا بے حد تھکے تھکے سے انداز میں نافع کے سامنے آ بیٹھی۔ چہرے پر صدیوں کی تھکن لیے بیٹھا نافع چونکا پھر آنکھیں مسلنے لگا۔

”اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ تم اسے دیکھ سکتے ہو۔ ویسے ابھی ہوٹل تو نہیں آیا۔ لیکن خطرے سے باہر ہے۔“ شہلا آہستگی سے بولی تھی۔

نافع نے چند لمحے اسے دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ شہلا کی ہراسی میں وہ بے ہوش، سبے سدھ پڑی عریضہ کے پاس جا رہا تھا۔

”کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔“ شہلا نے تسلی دی تھی۔
نافع نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ ایک گہری سانس ضرور اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ ایک نرس ٹرے میں چائے کے دو کپ لیے چلی آئی۔

”ڈاکٹر خالد کہہ رہے ہیں وہ کچھ دیر میں آتے ہیں۔ آپ لوگ تب تک چائے پیئیں۔“ اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ انہیں اطلاع دی تھی۔ دونوں نے گرم گرم چائے کی شدید طلب کو محسوس کرتے ہوئے کپ اٹھا لیے تھے۔ ایک گھونٹ بھر کر شہلا نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”گھر والوں سے کیا کہنا ہے؟“
جواب میں نافع نے سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھائیں۔
”نوڈ پوائزننگ۔“ شہلا خود کو سہارا دینے کے لیے کھٹکھٹاری۔ ”نوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے عریضہ کو یہ رپورٹ گئی۔“
طبیعت خراب ہوئی تو ہم اسے یہاں لے آئے۔ ٹھیک ہے نا؟“
”ہوں!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تم۔ تم پریشان مت ہو نافع۔“ شہلا نے اسے تسلی دینا چاہی۔ ہر چند کہ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس وقت اس کے دکھ اور شدید قسم کے تپش کا درماں بن سکیں۔
”عریضہ عریضہ اچھی لڑکی ہے۔ اسے تھوڑی سی توجہ دے۔ تھوڑی سی محبت ملے گی تو۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

نافع نے بے تاثر سپاٹ نظروں سے شہلا کی جانب دیکھا پھر چائے پیئے گا۔
”اور پھر اب تم ہی۔ اس سر پھری لڑکی کا پرہیز ہو نافع۔“ وہ نافع کی خاموشی سے قدرے خوف زدہ ہو گئی۔
کچھ بھی تھا۔ عریضہ اس کی نند اس کے شوہر کی بہن اس کے بچے کی عزت تھی۔
”بے فکر رہیں شہلا بھالی!“ نافع نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہمارے گھر نے الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ایک خاندان کا حصہ ہیں۔ عریضہ صرف آپ کی نہیں میری بھی عزت ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس کی تمام تر بے اعتنائی۔ بے توجہی اور بے نیازی کے باوجود میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں۔ وہ محبت جو نکاح کے پاک بولوں سے دودلوں کے درمیان خود بخود سبزے کی مانند آگ آتی ہے۔ امن کا دل اگر بھر رہا تو شاید میری ناکامی ہے۔ میں اپنا قصور تسلیم کرتا ہوں۔“

شہلا نے بہت محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
”بہت کم لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں نافع۔ ایسے وسیع القلب۔ اتنے باظرف۔ جیسے ٹھاٹھیں مارتا دریا ہو۔ تم ناکام ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسا دریا تو صحرا میں پھول کھلا سکتا ہے۔ پورے کا پورا رنگ زار بنا سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ ایسے ہی رہو۔ اتنے کشادہ دل۔ ایسے ہی مہربان۔ باوصف۔ خدا تمہیں ہر موڑ پر سرفراز کرے۔“

شہلا کے الفاظ جاودا اثر تھے۔ نافع کے چہرے پر بکھری اداسی اور آنکھوں میں بسی تنہائی کی جگہ بشاشت اور سکون نے لے لی۔

”تھینک یو بھالی!“ وہ ممنونیت سے بولا۔
”یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو ہم اسے گھر لے چلتے ہیں۔ اگلی ڈرپ میں اسے گھر پر ہی لگا دوں گی۔“

آج رات ثانیہ کا لمحہ ہے۔ کل ناعمد کا۔ پرسوں تمہارے ویسے تک میں اسے بالکل فریش کر دوں گی۔“
شہلا نے لمبے میں بے فکری اور بشاشت پیدا کرتے ہوئے است مزید ریلیکس کرنا چاہا۔ عریضہ کی بند پٹکوں کو دیکھتے ہوئے نافع نے سر ہلایا تھا۔

ازحد تھکے ہوئے انداز میں وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی ہی تھی کہ گال پر پڑنے والے زنانے وار تھپڑ نے اسے چند لمحوں کے لیے ماؤف سا کر دیا۔ اسے دیکھنے میں دشواری سی ہوئی۔ پیچھے دونوں کی بے تحاشا مصروفیت کے بعد رات بھر کی تھکان نے اسے بہت نڈھال کر ڈالا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سانسے دیکھا۔

”ہاشم!“ پھر اس کے لبوں سے نہایت حیرت اور افسوس کے ساتھ نکلا تھا۔ ”آپ نے مجھ پر ہاتھ مارا؟“
”آنکھوں میں سرخی اور وحشت کا جنگل لیے وہ چہرہ ہاشم کا چہرہ تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سانس بے ترتیب تھیں۔“

(ماہ ملک اس بار بھی قسط کا اختتام نہ کر سکیں اس کے لیے آپ سب سے معذرت۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ ”ریگ زارِ تنہا“ کی آخری قسط شائع ہوگی۔)

UrduPhoto.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 400 روپے
- ☆ ایمان امید اور محبت، عمیرہ احمد قیمت: 200 روپے
- ☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین قیمت: 350 روپے
- ☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 180 روپے
- ☆ امرتیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

”رات بھر اپنے بیدار رہنے والی بیوی اپنے شوہر سے کیا توقع کرتی ہے شہلا؟“ وہ پھرے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ ”وہ کون سا مقام تھا جہاں سے تمہاری آواز کا سننا بھی محال تھا؟“ شہلا ششدر رہ گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔

”کہاں گئی تھیں؟“ اس نے دانت پیسے۔ ”جواب دیجئے۔ ابھی وہ پیڑ میں نے سائن نہیں کیے ہیں شہلا احمد! جس کو لے کر تم آزاد ہو جانے کی خوشی میں سب ہی کچھ فراموش کر کے۔“

اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ شہلا کسی زخمی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ ہاشم اس کے تھپڑوں کی بوچھاڑ سے گھبرا گیا۔

”کیا سمجھتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو مجھے۔ آوارہ۔۔۔ بدکردار ہوں میں؟ اتنا کمزور جانا تم نے مجھے۔ بس اتنا ہی سمجھ پائے۔ یہ تھا تمہاری کھوکھلی محبت کا دعوا؟“ در دیوانی ہونے لگی تھی۔

”شہلا۔۔۔ شہلا! تم پاگل ہو گئی ہو۔“ ہاشم نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ شہلا اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے ہاتھ چھڑوا کر اس نے کشن اٹھا کر اسے پار پار شریوں کیا۔

”تم سے محبت چاہتی رہی میں۔ تم سے۔۔۔ تمہارے جیسے کمزور ذہنیت کے انسان سے۔۔۔ جو رات بھر بیدار رہنے والی بیوی کی بد چلنی گردانتا ہے ہاشم! ہاشم! آئی دل کل یو۔“

ہاشم اس پھری شیرنی کو سنبھالنے کی کوشش میں بیدار رہا اور اپنے آگے کی ہولی شہلا اس کے سینے پر آگری۔ ”عریشہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“ شہلا گلوگیر لہجے میں بولی ”مجھے اور نافع کو اچانک ہی اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ میرا بیل بھی جلد بازی میں کمرے میں ہی رہ گیا۔ ابھی میں عرشہ کو اس کے کمرے تک پہنچا کر آ رہی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہاشم۔ کہ آپ بھی اپنے بے اعتبار ہو سکتے ہیں۔“ پھر اگلے ہی پل اس کے سینے پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

رات بھر اپنے اعصاب سے جنگ لڑتا ہاشم شل ہو چکا تھا۔ شہلا کے گرد اپنے بازوؤں کو لپیٹے ہوئے وہ تھکے انداز میں سانس بھرنے لگا تھا۔

”شہلا! شہلا! مجھے معاف کر دو۔ زندگی نگاہوں کے سامنے روٹ کر جا رہی ہو تو بڑے سے بڑا ذی ہوش بھی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی تمہارے جانے کے تصور سے ہی دیوانہ ہو گیا۔ مجھے تسلیم ہے شہلا! میں تم سے دور رہ کر نہیں جی پاؤں گا۔“

شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس لاوے کے بہہ نکلنے کی وہ کب سے منتظر تھی۔

”اور وہ پیڑ۔۔۔ وہ کس بات کا اعتراف ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”اسی محبت کا؟“ ہاشم کچھ دیر اس کی نظروں میں دیکھتا رہا پھر اس نے انگلی کی پور سے اس کے آنسو پوچھے۔

”کہاں گئے وہ پیڑ؟ وہ تم نے ہی اٹھائے ہیں؟“

”جلا دیے تھے میں نے۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”ان کا خوف مجھے رات کو سونے نہیں دیتا تھا!“

ہاشم بے ساختہ ہنس اٹھا۔ اس کی شغاف ہنسی میں زندگی کی بھرپور حرارت جی اٹھنے کا مکمل احساس تھا۔ ”صدر شکر۔“ وہ تشکر سے بولا۔

”کیوں دینا چاہتے تھے مجھے یہ سزا؟“ شہلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں اب تک شکایت تھی۔ بے یقینی تھی۔

”شہلا! شہلا! میں گمراہ کیا گیا تھا۔ لیکن آج تمہارے اس انداز نے بدگمانی کا ذرہ ذرہ میرے دل کی تہوں سے پھونک نکالا ہے۔ یہ انداز محبت کا ہے سراسر محبت۔“

شہلا چند لمحے اس کی نظروں میں دیکھتی رہی۔ ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

”ہاشم۔۔۔ وہ محض ایک پرچھائیں ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے جیسا مضبوط شخص کبھی بھی ایک پرچھائیں سے خوف زدہ نہ ہو گا۔ یہ یقین تم نے میرے خوف زدہ دل کو اپنی محبت سے اپنے اعتماد سے بخشا تھا۔“

ہاشم شرمسار تھا۔ شہلا کی نظروں میں دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ لیکن جانو محبت جواب میں محبت اور اعتبار جواب میں اعتبار مانگتا ہے۔ صحرا میں جیتے رہنے کے لیے ایک نخلستان بھی درکار ہوتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ہاشم۔“ شہلا اپنے آپ میں لوٹ چکی تھی۔ آہستگی سے بولی۔ ”آپ کے گریز کے دور میں جیتے ہوئے مجھے اپنی سب ہی خامیوں کا ادراک ہو چکا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ہمراہی کے اس عرصے میں میں نے کئی مقام پر آپ کو مایوس کیا ہے۔“

پھر اس نے ہاشم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”لیکن ہاشم۔۔۔! میں اس بات کا یقین کر لیں کہ آپ تک آنے والی راہ میں نے کسی لالچ، کسی دھوکے کی آڑ لے کر پار نہیں کی تھی۔ میرے ساتھ محض اعتبار تھا۔ آپ کے خلوص کا اعتبار۔ زندگی کو نئے سرے سے

رکھنے کا اعتبار۔ ہاشم! میں نے کبھی بھی خود کو اتنا اڑا نہیں سمجھا کہ ایک مرتبہ جہاں سے سر جھکا کر نکلی وہاں پھر وہی جھکا ہوا سر لے کر واپس جاؤں۔ اس شخص نے جس تنفر، غرور اور بے نیازی سے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اس کے بعد اس کی سمت کو جاتے تمام رستے ہمیشہ کے لیے اندھے ہو گئے تھے ہمیشہ کے لیے۔ میں نے کبھی پلٹ کر ان رستوں کو پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ عمر کی محبت بھی مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہ کر سکی۔ مجھے وہ وقت ہمیشہ یاد رہے گا جب اس نے اطلاق نامہ بھیج کر مجھے میرے محبت کرنے والے ماں باپ اور

بھائی بھالی کے سامنے ہمیشہ کے لیے شرمسار اور بے مہول کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس پلٹنے کے سوجواز ہوں۔ میرے پاس ایک بھی نہیں۔ مجھے آپ کی محبت، خلوص اور احترام کی جو گھنی چھاؤں ملی ہے۔ اس سے میں مر کر بھی دستبردار ہونا نہ چاہوں گی۔ مرنے کے بعد اگر خدا نے مجھے جنت عطا کی تو۔“

ہاشم لب بستہ حیران یک تک اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو میں وہاں بھی آپ جیسے شخص کا ساتھ چاہوں گی ہاشم!“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر آپ مجھے خود سے دور کرنا چاہتے ہیں تو۔“

”شہلا۔۔۔“ ہاشم نے بے خود ہو کر اسے سینے سے لگایا تھا۔ ”کچھ مت کہو بس اب ایک لفظ بھی نہیں۔ یہ سب کچھ تم پہلے ایک بار بھی کہہ دیتیں تو میں قیامت تک تم سے بدگمان نہ ہوتا۔ محبت لفظوں کی محتاج تو نہیں ہوتی لیکن لفظ اندیشوں اور بدگمانیوں کے قائل ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے کم از کم ایک مرتبہ تو کسی کو اپنے لفظوں کی بارش سے سیراب کرنا ہی ہوتا ہے۔ آج تم نے میری زندگی بھر کی پیاس کو اس طرح سیراب کر دیا ہے کہ قیامت مجھے اپنی مٹی سے اس کی خوشبو آتی رہے گی۔“

شہلا نے اس کے کاندھے سے سر نکا کر سکون و طمانیت کے احساس سے سرشار ہو کر آنکھیں موندی تھیں۔

”اب شیطان کوئی سارو پ بدل کر آئے۔ میں اسے پہچان لوں گا۔“ ہاشم مزید بولا تھا۔ ”ہمیں ساتھ ساتھ رہنا ہے شہلا۔ جنت میں بھی!“

شہلا کی ہر ہنسی نے کمرے کا ماحول مزید خوشگوار کر دیا تھا۔



سب لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔ سب ہی کے چہروں پر فکر مندی تھی۔

”میری بچی پوری رات ہسپتال میں گزار آئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ذرا چہرہ دیکھو کیسا زرد ہو رہا ہے۔ جیسے مردہ قبر سے نکلا ہو۔ ایسا بھی کیا ہو گیا تھا آخر۔“

فردوس بیگم نے عریشہ کو خوب پیار کرنے کے بعد نافع کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں ہی نہیں لہجے تک میں شکایت تھی۔

نافع نے نگاہیں چرائیں۔ وہ قدرے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے کھڑا تھا۔

”جو اس نے کھایا، وہی کھانا سب نے کھایا۔ پھر اسی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کیا تم نے اسے کچھ اور کھلایا تھا؟“

انہوں نے سب ہی افراد کے سامنے نافع سے مزید جرح کی۔ عریشہ نے بے چین سی ہو کر ماں کی جانب دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں کھلایا تھا! نہیں۔“ نافع سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”آپ ان ہی سے پوچھ دیجیے!“

”کیسی باتیں کرتی ہو ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے برا مان کر بولی تھیں ”بچہ کیا نئی دھن گوزہ رکھلا دے گا؟ کچھ کھلایا بھی ہو گا تو شوق سے اچھا ہی کھلایا ہو گا۔“

کچھ لوگ مسکرا دیے تھے۔ کچھ ہنس پڑے۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ شہلا اس کو ڈرید گارہی تھی، مسکراتے ہوئے بولی۔ ”فوز پواز تنگ ضروری نہیں کہ سب ہی کو ہو۔ کسی شخص کو ایک چیز سوٹ کرتی ہے۔ دوسرے کو نہیں کرتی۔ پواز تنگ کر دیتی ہے۔ ایسا ہی عریشہ کے ساتھ ہو گیا۔“

ماہین نے ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

عریشہ کی نگاہیں بے اختیار نافع کی سمت اٹھی تھیں۔ وہ اس کی دیکھ رہا تھا۔ عریشہ کے اعصاب میں جھنجھٹا ہٹ سی دوڑ گئی۔ نافع کی بے اثر سپاٹ نگاہوں میں کون سے خوابوں کی جذباتی لکیریں تھیں۔ کچھ نہ پائی۔

ڈرپ کی سوئی چبھنے تک کا احساس نہ ہو سکا۔

”میرا خیال ہے ہم سب لاؤنچ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ عذرا بیگم نے ایک اہم امر کی جانب سب کو متوجہ کیا تھا۔

”عریشہ بھی آرام کر لے گی اور نافع بھی!“

”بالکل ٹھیک۔“ ماہین نے تائید کی۔

فردوس بیگم نے پھر عریشہ پر بوسوں کی بوچھاڑ کی اور بمشکل خود کو سنبھال کر کھڑکی پر بیٹھ گئیں۔

پھر سب ہی عریشہ کو پیار کر کے باہر نکلے تھے۔ آخر میں نافع بھی باہر کی سمت بڑھا تو شہلا نے اسے نظروں سے گزرتی نظر کر دیا۔

دونوں کے مابین گھنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عریشہ نے چند ایک مرتبہ چور نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا لیکن نافع ذرا بھی متوجہ نہ تھا۔ اس کے بیڈ کے قریب بڑی کرسی پر بیٹھا وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ عریشہ کے لیے جیسے وہ ایک اجنبی تھا۔ یہ وہ نافع نہ تھا جو اس کا کزن تھا۔ جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلی کم اور لڑی زیادہ تھی جو اس کی شکایتیں ہاشم سے کیا کرتا تھا۔ نا تجربہ کار نا بچہ کا۔ وہ نافع نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ یہ سنجیدہ اور باشعور شخص تو کوئی اور تھا۔

”میری جان بچا لینے کے لیے شکریہ!“ وہ آہستگی سے بولی۔

نافع نے نظروں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھا رہا۔

”جان دینے اور لینے کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ اس کا شکر ادا کرو۔ اس نے تمہیں حرام موت سے بچا لیا۔“

عریشہ سے چند لمحوں کے لیے بولنا نہ جا سکا۔ وہ لفظ بہ لفظ درست کہہ رہا تھا۔

”پھر بھی۔“ وہ بولی۔ ”جان بچانے کا نہ کسی۔ پروں رکھ لینے کا شکریہ!“

”یہ میرا فرض تھا۔“ وہ پھر بولا۔ ”تم میری بیوی ہو۔ تمہاری عزت سے میری عزت۔ تمہاری بے عزتی سے میری بے عزتی ہے۔“

بہت عرصے کے بعد عریشہ کی پلکیں نم ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اندر کچھ جاگتا ہوا محسوس کیا۔ اسے لگا وہ کسی اپنے کے پاس بیٹھی ہے۔ اسے لگا وہ سب سے اپنے کے پاس بیٹھی ہے۔ ایسا اپنا اب تک کوئی نہ بنا تھا۔ دل رکنے کی ایسی کوشش بھی کسی نے نہ کی تھی۔

”نافع۔!“ وہ آہستہ سے بولی۔

نافع نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”تم۔ پوچھو گے نہیں۔“ عریشہ نے ایسا کیوں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”میں پوچھوں گا۔“

اب کے وہ چونکی تھی۔

”ایسا پوچھنے میں مجھے اپنی انسلٹ فیل ہوتی ہے اور میں ایسا بھی نہیں چاہتا!“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

”تم آرام کرو۔ اگر بہتر محسوس کرو تو شام کو ٹائپ آؤ گے ورنہ میں شرکت کے لیے تیار ہو جانا!“

”ہاں!“ اس نے گم حسم سے انداز میں سر ہلایا۔

نافع کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ عریشہ کی نظروں نے دروازے کے بند ہونے تک اسے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کی پشت میں پوست سولی کو دیکھا۔ جس میں سے قطرہ قطرہ نکلتی زندگی اس کی رگ جاں میں اتر رہی تھی۔ آتش فشاں کے پھٹ جانے کے بعد دھواں نکلتی چوٹی اب خاموش پڑی تھی۔ جسم و جاں میں سب کچھ ساکن تھا۔ شور و گماہ سرد ہو چکا تھا۔ بس، پچھتاوے کا ایک لہر احساس تھا جو سوچ میں پوست تھا، پھانس کی طرح۔

”کیوں کر رہی تھی میں ایسا۔“ کیوں؟“

”یہ سداہ ہونے سے لے کر ہوش میں آنے تک وہ بارہا خود سے پوچھ چکی تھی۔ اس وقت جب بغضیں ڈوب رہی تھیں۔ ذہن گہری غنیمت میں جانے لگا تھا۔ ہاتھ بیربے جان ہونے سے تھے۔ عریشہ نے زندگی کو پورے احساس کے ساتھ جانا تھا۔ زندگی جو حرارت ہے، حرکت ہے، تڑپ ہے، خوب صورتی ہے اس زندگی کو وہ یوں ٹھکرا رہی تھی تو کس لیے؟

اس کے لیے جو اس کی نظروں کی سامنے کسی اور کا بنا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ پوری شان اور طمطراق کے ساتھ، خوشیوں کے ساتھ، مسکراہٹ کے ساتھ۔ پچھتاوے یا تاسف کی ایک شکن کے بغیر!

نافع سے انتقام کے لیے؟ نافع۔ جو اپنی زندگی کی خوشیوں کی قسم کھا کر کہتی تھی، اس نے جو کچھ بھی کیا عریشہ کی عزت کے لیے کیا اور حالات و واقعات اس کے لیے کی پوری تائید بھی کرتے تھے۔

اپنے ماں باپ سے انتقام کے لیے؟ جن کے لیے گئے فیصلے کی بدولت وہ ایک ایسے شخص کی پناہ میں چلی آئی تھی جو اس کی سنگین غلطی کو بھی اپنے سر لے کر پورے خاندان کے سامنے اس کی ڈھال بن کر کھڑا تھا۔

کیوں اس نے زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ کیوں اس نے اپنے لبوں کو مسکراہٹ سے لاد رہنے کی سزا سنائی تھی کیوں اس نے ایک زندہ حرارت سے بھرپور وجود کو مردنی اور بے دلی کے کفن میں بیٹھ کر تنہائی اور خوشوختی کی قبر میں دفنا ڈالا تھا۔

تقریب میں جگمگاتے چہروں کے درمیان ایک مسکراتا چہرہ اسٹیج کی جانب رواں دواں تھا۔ گولڈن بنارسی ساڑھی زیب تن کیے 'بھاری زیورات پہنے عریشہ نے جب دولہا، دولہن کو مبارکباد دی تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھنے بنارہ نہ پائے۔

”عریشہ! ناعمہ نے بے ساختہ مسرت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ”کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

ایک عرصے بعد ناعمہ نے اس کی آنکھ کے کاجل کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی دعا کی مقبولیت کا احساس ہوا تو اس کا رواں دواں خدا سے پاک کا شکر بجالانے لگا۔

”خوش ہوتا تم؟“ ناعمہ نے غلٹ بھرے انداز میں تصدیق چاہی۔

”الحمد للہ... میں بہت مطمئن اور خوش ہوں ناعمہ!“

اس نے ذرا کی ذرا فراز کی جانب دیکھا جو اس کی سمت دیکھنے سے گریزاں، قدرے شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ ”اس دنیا میں زیادہ تر لوگ ایک مرتبہ جیتے اور ایک مرتبہ مرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ان کا خدا کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتا ہے۔ انہیں سیدھی راہ چلانا چاہتا ہے۔ انہیں پہنچنے میں رکاوٹیں نہیں دیتا۔ پھر بھی وہ اگر بھٹکیں تو انہیں ہدایت دے کر پھر سے سیدھی راہ پہ لے آتا ہے۔ میں اپنی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں۔“

ناعمہ حیرانی سے آنکھیں کھولے ایک ٹک اس کا جگمگا تا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”نافع؟“ پھر اس نے استفسار کیا ”نافع کہاں ہے؟“

عریشہ کا چہرہ نافع کے نام پر جس طرح کھلا تھا اس نے ناعمہ کو مزید حیرت میں غرق کیا۔

”آئے تو ہیں۔“ وہ قدرے شرما کر بولی۔ ”شاید دوستوں، غمخواروں کو اپنی ادبیات دے رہے ہیں۔“

ناعمہ ہنس پڑی۔ تو عریشہ نے چونک کر دیکھا۔ نافع اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ نافع اور فراز آپس میں ملنے لگے۔ عریشہ شفق رنگ چہرے لے کر واپس مڑ گئی تھی۔

تقریب اب اختتام پذیر تھی۔ انتظار کرتا رافع اب قدرے مایوس ہو چلا تھا۔ اس کے انداز کی تمام شگفتگی اور دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھا۔ عبادت تو تقریب میں موجود تھا بیچہ کو اگر آتا ہوتا تو وہ عباد کے ساتھ ہی آتی نہ کہ بعد میں۔ اس نے اپنی حماقت پر خود کو سرزنش کی۔

”ہم بھی آدمی تھے کام کے۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ مڑا ہی تھا کہ ہاشم کے مقابل آگیا۔

ہاشم کے لبوں پر ناقابل فہم سی مسکراہٹ تھی۔ سنجیدہ، نرم، قدرے افسردگی کو ظاہر کرتی مسکراہٹ۔ رافع کو محسوس ہوا جیسے وہ مسکراہٹ رافع کے لیے ہی تھی۔

”کسے ڈھونڈ رہے ہو؟“ ہاشم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”قسمت کو!“ اس نے جیسے آہ بھری۔

”وہ کھڑی ہے!“ ہاشم نے اشارہ کیا۔

رافع نے غلٹ اور حیرانی سے اس سمت دیکھا پھر فوراً ”ہی اس کے تاثرات تبدیل ہوئے تھے۔ ہاشم نے جہاں اشارہ کیا تھا وہاں درود کھڑی تھی۔

رافع نے جیسے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاندھے سے ہٹایا تھا۔

”تیرا دوست ہوں یا۔!“ ہاشم نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ ستم ظریف ہو!“ وہ ایک سمت کو برہم گیا۔

ہاشم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ پھر سے اس کے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔

”رافع...! میری جان قسمت سے منہ نہیں پھیرتے۔ برا مان جاتی ہے اور جو ستارہ قسمت کے ستارے سے دور کہیں چمکتا ہو۔ اس سے روشنی نہیں ہاتھ آتی۔ اس کی روشنی کسی اور کے لیے ہوتی ہے۔“

رافع اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ پھر اس نے ہاشم کی جانب رخ کیا اور چند لمحے اس کی مہربان اور پر خلوص نظروں میں دیکھتا رہا۔

”ہاشم۔!“ وہ یوں بولا جیسے خود سے بھی خوفزدہ ہو۔

”ہاں۔۔۔ بولو!“

”کیا وہ... کسی اور کے لیے ہے؟“ اس کے لہجے میں انتہائی بے یقینی تھی۔

”ہاں!“ ہاشم سپاٹ سے انداز میں بولا۔

رافع کا چہرہ تیزی سے تاریک پڑا تو ہاشم کی آنکھوں میں رحم در آیا۔

”میں نہیں مانتا۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کل شام ربیعہ کا نکاح ہے۔ اس کے کزن امیر حسن کے ساتھ! میں اور شہلا ابھی وہیں سے آرہے ہیں جہاں ساری تفصیلات طے کی جا رہی تھیں۔ وہ کسی اور کا ستارہ ہے رافع! اسی کے نام ہونے جا رہا ہے۔“

رافع کو یوں لگا جیسے وہ اس دنیا سے بہت دور ہے۔ سوچ سے ہزاروں کلاکھوں میل دور ہے۔ کسی اندھیرے سرد، نا معلوم عمارت کے رستے پر گھبراہٹ سے لے کر کھانسی نہ دیتا تھا کچھ بھٹائی نہ پڑتا تھا۔ وہ خلا میں تھا یا اس کے قدموں تلے زمین کبھی آگئی آگے علم نہ تھا۔ بے وزنی اور بے بسی کی اس کیفیت میں وہ کتنی دیر مبتلا رہا، اسے علم نہ تھا۔ ہاشم مزید کیا کہہ رہا تھا اسے علم نہ تھا۔

ہاشم جو اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا، خاموش ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ محض ایک بت سے غائب ہے۔ اس کا سب سے پیارا دوست اور کزن اس کے سامنے نہیں ہے اس کے سامنے صرف اس کی صورت کا ایک بت ہے۔

ہاشم نے خود کو ایک بے رحم، مڑبھٹا محسوس کیا جو مریض کوئی زندگی دینے کے لیے سفاکی سے اس کا سینہ چاک کرتا ہے اور دل نکال کر باہر رکھ دیتا ہے جو خود پر ایک مشینی بے رحمی صرف اس لیے طاری کرتا ہے کہ اس کے سارے نرم احساسات اور جذبات دور بیٹھے اس دل کی صحت یابی کا وظیفہ بڑھ رہے ہوتے ہیں۔

ساری دنیا نجانے کیا کر رہی تھی؟ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے! پھر کیا یک بے جان بت میں جان لونی۔۔۔ رافع اچانک مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس سے دور جانے لگا۔

ہاشم نے اسے پکارا نہیں۔ اس کے لب آپس میں پیوست تھے۔ اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ نیابل کتنی دیر بعد دھڑکنے شروع کرتا ہے۔ اسے اس کا انتظار تھا۔

کارپورج میں کھڑی کر کے وہ تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ اپنے پورشن کی سمت بڑھتے ہوئے یکایک اس کے قدم ٹھکے تھے۔

”حیات دلا“ کے درودیوار ہنوز رنگ برنگ روشنیوں سے سجے ہوئے تھے۔ رات کے اس پہر، خالی عمارت

روشنیوں میں گھر کر بھی ایک اداسی کا شکار لگتی تھی۔ تقریبات ختم ہو جانے کے احساس کے ساتھ تھکی تھکی سی عمارت۔ رافع کو یاد آیا۔ چند دن قبل مندی کی تقریب میں وہ اور ربیعہ اسی جگہ ٹھہر گئے تھے! ربیعہ نے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے قدم اس کے دل کے تابع ہو گئے تھے۔ انہوں نے داغ کا کھانا منے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دل جو اس کے قدموں سے ضدی بننے کی مانند لپٹ گیا تھا۔ وہ دل جو اس کی آنکھوں کی روشنی میں کسی ہیرے کی مانند آشکار ہوا تھا۔ وہ دل جو اس کی نرم، شرمیلیں مسکراہٹ کے گوشوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ دل۔ کیسے بدل گیا؟ اس دل نے کسی اور نام پر سر تسلیم خم کیسے کیا؟ رافع تو یہ کوشش کر کر کے بری طرح ہار اٹھا۔ کچھ دیر اس نظروں سے سارا منظر دیکھ کر وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا اندر چلا آیا جہاں صرف ایک ملازمہ سب گھر والوں کا انتظار کر رہی تھی۔ رافع کو دیکھ کر وہ کچن میں چلی گئی۔ رافع اپنے کمرے میں آکر ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری جانب سے غالباً ”انہقہ“ نے فون اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“

رافع چند لمحوں تک تذبذب کا شکار ہوا پھر بولا۔

”میں۔۔۔ ربیعہ سے بات کر سکتا ہوں؟“

”ربیعہ سے؟“ ”انہقہ“ کے انداز میں قدرے حیرت دور آئی۔ ”جسٹ ہولڈ آن پلیز!“ پھر وہ بولی تھی۔

رافع خاموشی سے کھڑا سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھتا رہا جہاں سورج غروب ہونے کا منظر اداسی پھیلا رہا تھا۔ اپنے کمرے کی دیوار پر لگی یہ تصویر اسے پہلے کبھی اتنی اداس نہیں لگی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ چند ہی لمحوں میں اس کی مترنم آواز سنائی دی تھی۔

”رافع!“ وہ آہستگی سے بولا۔

دوسری جانب چند ہی لمحوں کی خاموشی چھائی تھی۔ اسے کچھ ہی لمحوں کے اندر پتہ چل گیا تھا۔

”کیسے ہیں رافع آپ؟“

”آپ۔۔۔ آج تقریب میں نہیں آئیں؟“ وہ آہستگی سے بولا۔

”جی۔۔۔ امی کی وجہ سے میں اور انہقہ گھر پہ ٹھہر گئے۔“

”سنا ہے۔۔۔ کل آپ کے گھر بھی ایک تقریب ہے۔“ رافع نے خود پر از حد جبر کیا تھا۔

ربیعہ کافی دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”جی!“ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ ”اور میں چاہتی ہوں۔۔۔ آپ اور وہ بھی شریک ہوں اس تقریب میں۔“

رافع نے اپنی آنکھوں میں تیزی سے ابھرتی نمی کو محسوس کیا۔ پھر وہی نمی اس کے حلق میں اترنے لگی۔

”وردہ تو آپ کی دوست ہے۔۔۔ میں کس ناتے؟“

”آپ۔۔۔ وردہ کے منگیتر ہیں!“

”اوس۔۔۔ آئی سی۔۔۔ آپ مجھے وردہ کے منگیتر کی حیثیت سے انوائٹ کر رہی ہیں۔“ رافع نے اپنی ذات کے حوالے میں جیسے دکھ اور تاسف کے بگولے اٹھتے دیکھے۔

”ربیعہ۔۔۔ آپ کو دیکھ کر بالکل احساس نہیں ہوتا۔ کہ آپ اس قدر ظالم ہیں۔“ وہ ٹوٹ کر بولا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ رافع نے اپنے کان کے اس قدر قریب اس کی مدھر ہنسی کو پہلی بار سنا اور شاید

آخری بار۔۔۔ باوجود شدید ضبط کے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

”رافع۔۔۔ آپ حقیقت پسندی کو ظلم کے نام دے لیں تو میں ظالم ہوں۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں افسانے اور

حقیقت دونوں کو برتا ہے رافع۔! حقیقت کی جانب آپ بیٹھ کر لیں گے تو وہ گھوم کر پھر سے آپ کے سامنے چلی آئے گی۔ سو آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنا ہی عقل مندی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں صرف محبتیں ہی دیکھیں ہیں۔ ابھی آپ کو نفرت سے واسطہ نہیں پڑا اور میں چاہتی ہوں کہ زندگی میں کبھی آپ کو نفرت سے واسطہ نہ رہے جو آپ سے محبت کرتے ہیں وہ ہمیشہ آپ کی محبت میں مبتلا رہیں۔ تاہم۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں محبتیں بھی دیکھی ہیں اور نفرتیں بھی۔ نفرتیں وہ سویاں ہوتی ہیں رافع۔! جو ایک جیتے جاگتے جسم کو برسوں کے لیے ملا دیتی ہیں اور یہ سویاں نکلنے کا انتظار بہت طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں۔۔۔ میں جینا چاہتی ہوں مسکراتا چاہتی ہوں۔ مسکراہٹیں میں نے بہت مشکلوں سے حاصل کی ہیں رافع! میں کسی قیمت پر ان کا سودا نہیں کر سکتی۔“

وہ بول بول کر تھک سی گئی۔ اتنا بولنا اس کی سرشت نہ تھی۔ وہ بہت کم گو تھی! رافع کم صم سی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔

”وردہ! میری زندگی۔۔۔“ پھر وہ آہستگی سے بولی تھی۔ ”اس لیے میرے بلائے پر وہ کل ضرور آئے گی۔ آپ نجانے آئیں گے یا نہیں۔“ پھر اس نے ریسور رکھ دیا۔

رافع چند لمحوں کے لیے اسی طرح ریسور کان سے لگائے کھڑا رہا پھر ریسور کان سے ہٹا کر اس نے لیوں پہ عجیب سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھا تھا۔

”آؤں گا۔۔۔“ وہ برسرِ پایا۔ ”تم پکارو گی۔ تو دنیا سے آخری کونے پر بھی چلا آؤں گا۔ بے شک۔۔۔ تم نے جس الوداع کہنے کو ہی پکارا ہو!“

UrduPhoto.com

وہ جلدی جلدی ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال رہی تھی۔ ماہین نے کمرے میں جھانکا تو حیران رہ گئی۔

”بھائی۔! وہ اندر چلی آئی!“ ”بھی تو صرف پانچ بجے ہیں۔“

اس نے شہلا کی تیاری پر اپنی حیرانی ظاہر کی تھی۔ شہلا چونکی پھر ہنس دی۔

”جانتی ہوں ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور تقریب دیر سے رات کے نوبت ہے۔ لیکن میں ابھی تقریب نکاح کے لیے تیار ہوئی ہوں۔“

”کس کا نکاح؟“

”میری بہن! یہ تقریب کا نکاح ہے آج۔۔۔ سادگی کے ساتھ۔ صرف گھر کے چند افراد کی موجودگی میں یہ فریضہ ادا کیا جا رہا ہے۔“

”اچھا۔۔۔“ ”ماہین حیرت سے مسکرائی۔“ ”ربیعہ کو میری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔ اور نوبت کے تک ضرور

بٹ آئیے گا۔ میں عریشہ کے ساتھ پار لڑ جا رہی ہوں۔ اسے لے کر سیدھی ہال چلی جاؤں گی!“

”تم بے فکر رہو۔۔۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی میں اور ہاشم ہال میں پہنچ جائیں گے!“

ماہین نے ایک محبت بھری نگاہ اپنی خوش اداؤں و نکش بھانج پر ڈالی اور دل ہی دل میں اس کے حسن اور شخصیت کو سراہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

ہاشم کی شہلا کو احساس ہوا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ہاشم کا موبائل مسلسل وائبرٹ کر رہا تھا۔ وہ ذرا سا بڑھی اور اسکرین پر آیا نمبر دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونکی تھی۔ اس نے پلٹ کر ڈرائنگ روم کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ گھر کے لیے سوچا پھر موبائل اٹھا کر آن کیا تھا۔

”ہیلو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔
دوسری جانب حیرت بھری خاموشی چھائی پھر آواز آئی تھی۔

”ہیلو۔ شہلا!“
”آپ کو اس نمبر پر فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ابرار صاحب؟“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ابرار قدرے محتاط ہو کر گفتگو کرتا تھا۔

”شہلا! میں ہاشم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں ابرار! وہ دفعہتا بہت سہولت سے بولی۔ ”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں!“
”اوہ۔۔۔ یہ تو میرے لیے بہت مبارک خبر ہے۔“ اس کے لہجے میں چکار آئی۔ ”کب کہاں؟ کیونکر۔“

شہلا نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔

”پرسوں۔۔۔ پھر وہ بولی۔ ”شام پانچ بجے۔۔۔ جگہ میں تمہیں گھر سے نکلنے سے قبل بتا دوں گی۔“

”سونا کس آنے کو میم۔۔۔“ وہ ہنسا۔ ”سمجھ نہیں آتا یہ سچ کا وقت کیسے گزرے گا!“

شہلا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ پٹی اور ہاشم کی ہاشم اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔
”یہ میری کالز تم کب سے اینڈ کرنے لگیں؟“ وہ مسکرایا۔

”تمہیں اعتراض ہے؟“ شہلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تم من دو تو کا فاصلہ مٹاؤ اور میں معترض ہوں ایسا ممکن ہے۔“

وہ اس کے قریب ہوا۔ شہلا نے جھینپ کر اسے دھکیلا تھا۔

”دیر ہو رہی ہے۔۔۔“

سے لپٹ جائے گی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی۔

منہ زہ بیگم نے اسے بازوؤں سے تھاما اور کچھ دیر دیکھتی رہیں۔

”سدا سکھی۔۔۔ آباد رہو۔“ پھر وہ جیسے سرگوشی میں بولی تھیں۔ ”ہمیشہ خوشیوں اور پھولوں سے بھر رہے

دامن۔۔۔ اس پیشانی پر کبھی غمو فکر کی ہلکی سی شکن نہ پڑے۔۔۔ یونہی نور کے ہالے میں چمکتی رہے۔“

پھر انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ربیعہ کے لب کپکپائے پلکیں لرزیں لیکن اسے اپنے اندر اٹھتے جوار

بھانے کو حدوں میں رکھنے کا سلیقہ آتا تھا۔

وہ گوگوسی کیفیت کا شکار ہوئی بیٹھی تھی۔ حالات نے یکایک جس طرح پلٹا کھمایا تھا۔۔۔ اس کے لیے ایک

ناقابل فہم سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

”وہ کس طرح سے ایسا کر سکتی ہے۔۔۔ کیونکر۔“ وہ بار بار ابھرتی تھی۔

درد نے نظروں کا زاویہ بدل کر گھڑی کو دیکھا جو ساڑھے پانچ بج رہی تھی۔

”رات عریضہ اور نافع کا وقت ہے۔۔۔ تمہیں جلدی واپس آنا ہے۔۔۔ فنانس تیار ہو جاؤ۔“ وہ کہتی ہوئی آگے

بڑھ گئی تھی۔ درد اسی ہنس کیفیت کا شکار ہوئی بیٹھی رہی۔

اچانک دروازے پر مدھم سی دستک نے آگے چوں کیا تھا۔ پھر دروازے کی سمت دیکھ کر وہ بے اختیار کھڑی ہو

گئی۔ وہاں رافع کھڑا تھا۔

”آپ۔۔۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”آئیے۔“

وہ چپقلش سے بڑھتا تھا۔ ہلکی ہلکی لارچنگ والی آف واپس شرت اور بلیک پینٹ میں ملبوس رافع کا چہرہ بیمار اور اترا

ہوا محسوس ہوا تھا۔ حالانکہ پہلے دنوں تو اس سے ہونے والی تمام تقریبات میں وہ بے حد فریش اور زندہ دل محسوس

ہوا تھا۔

”تم تیار نہیں ہوئیں؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”آپ۔۔۔ وہاں جا رہے ہیں؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی حیرانی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں اور تم دونوں جا رہے ہیں۔ تیار ہو جاؤ۔“

نجانے کیوں درد نے کچھ روٹوٹ کی مانند اثبات میں سر ہلایا تھا۔

رافع باہر نکل گیا۔ درد نے لباس تبدیل کرنے اور بال بنانے میں صرف دس منٹ لگائے تھے۔ پھر وہ دونوں

ساتھ ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

عباد کے ساتھ نکاح کے کاغذات کے ساتھ الجھا ہوا ہاشم بری طرح سے چونکا تھا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے

پر رافع کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے رافع بھائی۔۔۔“ عباد بھرپور خوشی سے بولا ”زبردست۔۔۔ آپ نے تو ہماری سادہ سی تقریب کو چار چاند

لگا دیے۔۔۔ آئیے ٹاپلیز!“

رافع سے مصافحہ اور معافتہ کر کے اس نے رافع کو ہاشم کے برابر بٹھایا۔ رافع نے ہاشم کو دیکھا وہ گردن موڑے

ایسی کی جانب متوجہ تھا۔ رافع کے لبوں پر دھیمی ”فسرہ سی“ مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ہاشم نے اپنا بازو اس

کے کندھے کے گرد لپیٹا۔ باہر گاڑی کا ہارن بجاتا تھا۔

photo.com

پنک اور سی گرین کنٹراسٹ کا بیش قیمت اور خوب صورت سوٹ زیب تن کیے کسی گرین موٹیوں سے مزین

نازک سائیٹ پین گریج سنور کر جب اس نے آئینہ دیکھا تو حیران ہی رہ گئی۔ اس ”ربیعہ“ سے تو اس کی آج تک

ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یہ ربیعہ جو آئینے میں نظر آتی تھی بے تحاشہ حسین۔ نازک اندام۔ خوش انداز لب لہجہ

نجانے کون تھی۔

”تمہاری تصویریں کسی میگزین میں لگ جائیں تو میں پاکستان کی نمبرون بیوٹی شون میں مشہور ہو جاؤں۔“ اینفٹ نے

اسے تیار کیا تھا اور اب اپنی مہارت پر خود بے حد حیران تھی۔

ربیعہ نے مسکراتا چاہا۔ پھر اسے محسوس ہوا اس کے لب مسکرانے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کا دل ایک جامہ کی

کیفیت کا شکار تھا۔

انفٹ اب کیمرہ اٹھا کر دھڑا دھڑا اس کی تصویریں بنا رہی تھی۔

”میں بہت اکیسا اینڈ ہو رہی ہوں ربیعہ! کہ میں نے تمہیں تیار کیا ہے اور تم اتنی حسین لگ رہی ہو۔ وہ رزلٹ

دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔۔۔ مجھے نہیں لگتا کہ مسٹر امیر حسن پرسوں کی فلائٹ سے جا سکیں گے۔ آج تمہارا

روپ دیکھتے ہی وہ اپنی فلائٹ کینسل کروالیں گے۔“

اس نے شرارت سے اسے چھیڑا تھا۔ ربیعہ محض اس کا دل رکھنے کے خیال سے مسکرا دی۔

اسی لمحے کمرے میں منہ زہ بیگم داخل ہوئی تھیں۔ وہ بہت تھکی تھکی پر مردہ اور بیمار نظر آتی تھیں۔ ربیعہ

کے قریب آ کر وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ ربیعہ سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔ اسے لگا ان کا چہرہ دیکھتے ہی وہ ان

”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے۔ آئیے ان کا استقبال کرتے ہیں۔“ عباد کے انداز میں بے حد خوشی اور گرم جوشی تھی۔ ہاشم اور رافع بھی اٹھ کر اس کی پیروی میں باہر کی جانب بڑھے تھے۔

امیر حسن کے ساتھ شہریار احمد اور چند قریبی دوست تھے۔ خوب صورت کڑھائی والے بلک کرتا شلواری میں ملبوس امیر حسن بے حد خوش تھا۔ شہریار احمد ایک وجیرہ مگر نو عمر جوان لگتا تھا۔ عباد کے علاوہ ہاشم اور رافع نے بھی ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں نکاح کی رسم کا آغاز ہوا۔

”میں ربیعہ کی جانب سے گواہ ہوں۔“ شہریار احمد نے کہا تھا۔

”میں امیر حسن کی جانب سے۔“ عباد نے مسکرا کر کہا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔ ”ربیعہ کی جانب سے دوسرا گواہ رافع بھائی ہوں گے۔ اور امیر حسن کی جانب سے ہاشم بھائی۔“ ٹھیک ہے نا۔“ رافع اور ہاشم نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع آہستگی سے بولا۔

پھر اس نے نظر اٹھا کر امیر حسن کو دیکھا۔

”میں گواہ بنوں گا۔ اور میں گواہی دوں گا امیر حسن۔“ کہ میں اپنے دل کی ہر تمنا۔ ہر خیال سارے تصور۔ ساری چاہتیں سارے جذبات تمہیں سونپے۔ وہ تمہاری ہی تھی۔ اس سے محبت کرنے کا حق صرف تمہارا ہوا۔ اسے دیکھنے۔ سوچنے۔ سمجھنے کا حق صرف تمہارا۔ یہ دل اس کے تصور سے بھی دستبردار ہوتا ہے کہ اس میں اس بار سا کی توہین ہوتی ہے۔“

ہاشم کا ہاتھ رافع کے زانو پر دھرا ہوا تھا۔ دلفنا ”ہاشم! یہ ہے ہاتھ کی پٹنہ پر ایک قطرہ گرنا محسوس کیا۔ اس نے رافع کے زانو پر دباؤ ڈالا۔ رافع نے دھیرے سے سر اٹھایا تھا۔

✽ ✽ ✽

بہت اطمینان اور آسانی سے اس نے تین مرتبہ دھیرے دھیرے مگر مضبوطی سے ”ہاں“ کہا تھا اور وہ کسی کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ ربیعہ امیر حسن بن گئی تھی۔ منیوہ بیگم، شہلا، انیقہ، ترانہ اور وردہ اس کو گلے لگا کر مبارک باد دے رہی تھیں۔ ربیعہ چہرے پر سکون اور خاموشی لیے ان سے دعائیہ کلمات وصول کر رہی تھی۔

”ربیعہ۔“ ترانہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے کہہ رہی تھی۔ ”تم سے متعلق میری جتنی دعائیں تھیں۔ خدا نے پاک نے وہ سب کی سب قبول کر لیں۔ میں آج بہت خوش ہوں ربیعہ۔“

ربیعہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔ وردہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی نگاہ بار بار اس سے ٹکراتی تھی۔ اسے وردہ کی نظروں میں پوشیدہ بے چینی، بے قراری اور سوالیہ نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ جواب میں صرف ایک مبہم سی مسکان تھی جو لبوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی تھی۔

کہانے کے انتظامات کے سلسلے میں شہلا، انیقہ اور ترانہ ادھر ادھر ہوئی تھیں تب وردہ نے لب کھولے۔

”یہ سب کیا ہے ربیعہ؟“

”وہی۔ جو میں نے تم سے کہا اور تم نے اس کا یقین نہ کیا۔ میں نے کہا تھا نا۔ میں انگیب جلد ہوں تم نہیں مائیں۔ دیکھ لو میں نے سچ کہا تھا۔“

”لیکن رافع۔“ وردہ کے لب کانپے۔

”رافع بہت اچھے انسان ہیں وردہ!۔“ ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ان کی جوڑی تمہارے ساتھ بنی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہو۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں کا ساتھ بہت مضبوط محبت بھرا بہت طویل اور خوب صورت ہو۔“

وردہ اداسی سے مسکرائی۔

”ایسی دعا میں مت کرو ربیعہ! جن کا پورا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔“

”میری دعا کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں وردہ۔“ ربیعہ مضبوط لہجے میں بولی ”میری دوست ہو تم۔ اور دوست تو۔ دوستی کی خاطر۔ آنکھ بند کر کے کھائی میں بھی چٹلائگ لگا دیتے ہیں۔ تمہارے ہی الفاظ ہیں نا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنے الفاظ کو ثابت کر سکو۔ اگر میں تم سے ایسا چاہتی ہوں تو تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا۔“ وردہ نے بے حد بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

✽ ✽ ✽

”ربیعہ! امیر حسن تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ عباد اس کے پاس آیا تھا۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر حیرانی سے عباد کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

عباد خاموشی سے باہر چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد امیر حسن اور شہریار احمد اندر داخل ہوئے تھے۔ ربیعہ بے اختیار کھڑی ہوئی۔ امیر حسن اپنی جگہ ٹھہر گیا جبکہ شہریار احمد آگے بڑھا تھا۔

اس نے ربیعہ کے ہاتھ تھامے اور مسکرایا۔

”آلی۔ آپ میری آلی ہیں نا؟“ وہ شفاف نظر میں اس کے چہرے پر جمائے پوچھ رہا تھا۔ ربیعہ اب تک نہ رانی تھی۔ اچانک ہی اس کے کان پر ہلکے سے سر کا گرو پڑی۔

شہریار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا چہرہ اٹھا کر اس کے آنسو صاف کیے۔

”مت روئیں آلی۔ رونے کے موسم گزر گئے ہیں۔ اب تو صرف ہنسنے اور مسکرانے کے دن ہیں۔ آپ اپنی ای سے جدا ہو کر اپنے باپ اور بھائی کے قریب رہیں گی۔ ہر طرح کی فکر اور اندیشے سے خود کو آزاد کر لیں۔“ قرابت داری میں خاکسار کا نام بھی شامل کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔“ امیر حسن مسکراتا ہوا آگے بڑھا تھا۔

شہریار ہنس دیا۔ ربیعہ بھی دھیمی سے مسکرا دی تھی۔

”چلیں آپ لوگ باتیں کیجئے۔ میں امی کے پاس بیٹھتا ہوں۔“ شہریار مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔

امیر حسن ہولے سے کھنکار کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ ربیعہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔

”ربیعہ!“

ربیعہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں متبسم اور مہربان تھیں۔

”نئے ساتھ کی ابتدا مبارک ہو۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ کو نظروں میں جذب کرتا ہوا بولا تھا۔

”میرے جذبات کو پذیرائی عطا کرنے کا شکریہ۔ آپ کی یہ نوازش عمر بھر اس دل پر جلی حروف میں لکھی رہے گی۔“

ربیعہ نے بے ساختہ حیران نگاہیں اٹھائی تھیں۔ بے حد کوئل اور اچھوتے پن سے وہ اپنے جذباتوں کا اظہار کر رہا تھا امیر حسن نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”میں پرسوں یو کے جا رہا ہوں وہاں کام تو خیر کیا خاک کروں گا۔ ساری توجہ سارا ارتکاڑ تو یہاں بچھوڑ جاؤں گا۔ آپ کے پاس۔ آپ کے کاغذات تیار ہونے میں جتنا وقت لگے گا میں ایک ایک سیکنڈ بھی گن کر گزاروں گا۔“

اس کے ہاتھ میں ربیعہ کا ہاتھ لرزے لگا تھا۔ اس کی ہتھیلی بھیگ گئی۔ امیر حسن ہولے سے ہنس دیا۔

”آپ۔۔۔ کچھ نہیں کہیں گی؟“ وہ فوراً شوق سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں! اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

امیر حسن مسکرا دیا۔

”آپ کی تین مرتبہ والی ”ہاں“ کے بعد اب ہر ناں منظور ہے۔“

ربیعہ نے لب بلیغ کر مسکراہٹ روکی تھی۔

”لیکن آپ سے ”ہاں“ کہلوانے کے کئی طریقے مجھے بھی آتے ہیں۔ مثلاً۔“ ربیعہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں اب جاؤں؟“

ربیعہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”دیکھا آپ نے۔۔۔“ وہ زور سے ہنس دیا تھا۔

ربیعہ بری طرح سے جھینپ گئی۔

امیر حسن نے اس کا ہاتھ چھوڑنے سے قبل آہستگی سے لبوں سے لگایا۔

”آپ کی یہ حیا۔۔۔ اور کم آمیزی۔۔۔ فی الوقت یہیں تک آنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن خدا را۔۔۔ میرے حال پر ترس کھائیے گا۔ کاغذات بننے کے بعد ایک دن کی پوری کی اجازت نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟“

ربیعہ نے سر جھٹک لیا۔

”جلدی آجانا ربیعہ ایلیز۔“ وہ اس کے کان کے قریب گپٹایا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

”خدا حافظ۔“ وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

”خدا حافظ! ربیعہ نے اس کی پشت کو دیکھ کر آہستگی سے کہا تھا۔

بہت سے چمکتے چہروں کے درمیان وہ تنہا اور اداس تھا۔ ہنستے مسکراتے نفوس کا یہیں کے ارد گرد سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کی کوئی پہچان، کوئی شناخت نہ ہو۔ کوئی اسے جاننا نہ ہو۔ وہ کسی کو جانتا ہو۔

”رافع۔۔۔“ ایقان نے دفعاً اسے پکارا تھا۔

رافع کسی معمول کی مانند اس آواز پر ٹھہرا۔ چمکتی مسکتی ایقان کی نظروں میں بے اختیار سی جیرانی تھی۔

”ایسے خاموشی سے یوں سنجیدہ سی شکل بنا کر کہاں سے آرہے ہو۔۔۔ کچھ دیر پہلے سب تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

رافع کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”پہچھوس۔۔۔ آپ خوش ہیں نا؟“ اس کے سوال نے ایقان کو حیران کر دیا۔

”ہاں۔۔۔ بہت! اس کا اعتراف بھرپور تھا۔

”خوش رہیں۔۔۔ ہمیشہ۔“ اس نے محبت سے اس کا کال پتھپٹا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ایقان نے نہایت جیرانی سے اس کی پشت دیکھی تھی۔

پاس سے گزرتے ہاشم نے دفعاً ”رافع کا بازو تھام لیا تھا۔ رافع رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاشم۔۔۔“

اس کی نظروں میں عجب سی وحشت اور ویرانی تھی۔ ہاشم رہ نہ پایا اس نے رافع کو گلے سے لگالیا۔

”ہاشم۔۔۔ تم خوش ہونا؟“

ہاشم خاموشی سے اس کی پشت تھپکتا رہا۔

”سب لوگ خوش رہیں ہاشم۔! اور میں بھی بہت خوش ہوں۔۔۔ مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ کمزور مت سمجھو مجھے۔۔۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ حقیقتوں کا سامنا کیسے کیا جاتا ہے۔ مسکرا کر خندہ پیشانی سے مردانہ وار۔ وہ بہت بہادر ہے ہاشم! اتنی بہادر جتنی وہ نازک ہے اس نے مجھے بہادر بننا سکھایا ہے، جینا سکھایا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراتا سکھایا ہے۔ میں اس کا احسان مند ہوں۔۔۔ ہمیشہ رہوں گا۔“

ہاشم نے الگ ہو کر اٹھنے کا چہرہ دیکھا۔

”ابھی بھی بہت فرق ہے رافع۔“ پھر وہ بولا ”میں ابھی اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان ہے۔ آنکھوں میں نہ ختم ہونے والا یقین اور اعتبار۔ اور گفتگو میں ربط اور ٹھہراؤ۔ تمہاری آنکھوں میں وحشت ہے۔ چہرے پر مایوسی اور گفتگو میں بے برہنگی کیا سیکھا تم نے اس سے؟“

رافع ٹھٹھک سا گیا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتا رہا۔

”ٹھٹھک کہتے ہو تم ہاشم۔“ پھر وہ آہستگی سے بولا ”محبت و وحشت کا جنگل نہیں ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جو زندگی گزارنے کا سلیقہ بخشتی ہے۔ وہ گداز۔ خشک خیال۔ کہ دوسروں کے دکھوں پر رونا اور دوسروں کی خوشیوں پر مسکراتا آ جاتا ہے۔“

ہاشم یک لخت کھل کر مسکرا دیا۔

”میرا دوست تو جی جی میں بدل گیا۔۔۔ واہ رے محبت۔۔۔ تجھے سلام!“

رافع دھیمے سے مسکرایا تھا۔

رنگ و بو کی محفل میں خوشیوں کی لہریاں ہنستی مسکراتی پھر رہی تھیں۔ ہر چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیکھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں داخل ہو کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکا پھر خاموشی سے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا تھا۔

بیچ پر بیٹھی عریشہ نے اس کی پشت کو دھیمے سے مسکا کر دیکھا تھا۔ چند دن پہلے ایسی ہی ایک مہلتی رات اس کی بے وقوفی کی نذر ہو چکی تھی۔ ایسی بڑی حماقت کی۔ کہ نافع جیسا حوصلہ مند ہی اس کا تحمل ہو پایا تھا۔ ایسی بے وقوفیاں جو زندگی بھر کے تاسف اور بچھتاؤں کا سبب بن جایا کرتی ہیں عریشہ بحفاظت اس شرر کی بلند ہوتی لپٹوں سے باہر نکل آئی تھی تو نافع کے ظرف کی بدولت۔۔۔ وہ اس کا سامنا کرتا تھا۔ اس کا محافظ۔ ہاں اس سے کچھ ناراض ضرور تھا لیکن آج وہ اس کی ہر ناراضی دور کر دینے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔

نافع لباس تبدیل کر کے باہر آیا۔ نظروں میں الجھن بھر کر اس نے بیڈ کے پیچ بیٹھی ”دلہن“ کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ کئی کی جانب کھلتے دروازے کی جانب بڑھا۔ شاید عریشہ کے سونے کا انتظار وہ کمرے سے باہر جا کر کرنا چاہتا تھا۔

”نافع!“ کیا ایک اس کی مترنم آواز پر وہ پلٹا تھا۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بولو۔“

”یہاں آؤ۔“ وہ مسکرائی۔

نافع کو اس کی دودلکش مسکراہٹ اپنی کسی گمشدہ قیمتی متاع کی مانند لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تھا۔ عریشہ بیڈ سے اتری پھر اچانک جھک کر اس نے نافع کے پیر تھام لیے۔

”نافع۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ پلینز۔“

نافع نے بجلی کی سی تیزی سے جھک کر اسے اٹھایا۔ عریشہ تڑپ کر اس کے سینے سے لگی تھی۔

”نافع۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہنے کے لیے۔ بس اتنا کہ مجھے معاف کر دو۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔ ”نئی زندگی کی شروعات اس طرح سے کرو کہ ہمارے درمیان یقین، محبت اور اعتبار کے سوا کچھ نہ ہو۔ کوئی جگہ، شکوہ، شکایت، بے یقینی۔۔۔ خفگی، ناراضی کچھ بھی نہیں۔“

نافع نے اسے الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

”مجھے کوئی بے یقینی۔۔۔ خفگی ناراضی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”ہاں کچھ شکوے ضرور ہیں مجھے میرے اس حق سے کیوں محروم کر رہی ہو؟“

”جس سے تمہیں گلے شکوے تھے نافع۔۔۔ وہ عریشہ شادی کی رات اس سچ پر مرچکی ہے۔ جو تمہارے سامنے ہے۔ اس عریشہ سے گلے شکوے کرنے سے کچھ ٹھنک نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ سر سے پاؤں تک صرف تمہاری ہے ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے۔“

نافع اس کی خوب صورت وضاحت پر مسکرائے بنانہ رہ چکا۔

”تم کتنا ہی بچو۔۔۔ میں نے وہ سارے گلے شکوے ضرور ادا کر لئے ہیں۔ جو بنائے کب سے دل کے اندر رہے۔“

براجمان ہیں کہ محبت کو جگہ تھوڑی بڑتی ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر بولا۔ عریشہ کلی نظروں سے اسے تکتے لگی۔

”ان بے چاروں کے کہنے سننے سے اس رات کی خوب صورتی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ مزید بولا۔ ”کیونکہ محبت جس چیز میں مل جائے اسے خوب صورت بنا دیتی ہے۔“

عریشہ مسکرا دی۔ نافع بھی مسکرا دیا۔ سچ پر بکھرے پھول بھی مسکرا دیے۔

دونوں ہاتھ کر پر رکھے وہ شوریدہ سر لہروں کو اپنے قدموں تک آ کر دم توڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آج بھی اس کے انداز میں وہی غرور اور طغیان تھا۔ نہ جھکنے والی کیفیت تھی۔

”ابرا صاحب!“ شہلا نے اسے قدرے فاصلے سے پکارا۔ وہ اچانک ہی مڑا۔

”اوہ۔۔۔ تم آگئیں۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اس کے قریب چلا آیا۔

”کتنی مرتبہ کہا تمہیں۔۔۔ یہ گلاسز مت پہنا کرو۔“ وہ اس کے سیاہ گلاسز دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

”اپنے اور تمہارے درمیان مجھے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”میرے اور آپ کے درمیان صدیوں کا نوری فاصلہ حائل ہے ابرا صاحب۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”اسے پائنا ناممکن امر ہے۔“

”ایسے مت کہو شہلا! پلینز۔۔۔“ وہ تڑپ سا گیا۔ ”میں تو سمجھا تھا تم مجھے ہر فاصلہ ختم کر دینے کی نوید سناؤ گی۔ وہ الفاظ جو سننے کے لیے میں۔۔۔ نجانے کب سے۔۔۔ تنہائی کے صحرائیں بھٹک رہا ہوں۔“ شہلا گلاسز کے پیچھے سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے لب آپس میں سختی سے پیوست تھے۔

”مسٹر ابرا۔۔۔“ پھر وہ بولی ”آج میں میں سال کی کم فہم اور جذباتی دو شیرہ نہیں ہوں۔ میں ایک باشعور عورت ہوں۔ جو الفاظ اور عمل میں فرق بخولی محسوس کر سکتی ہے۔ تم نے مجھے طلاق دی۔ جذباتی ہو کر، غفلت میں، غصہ میں۔ چلو! میں مان لیتی ہوں پھر تم نے پلٹنے میں اتنا عرصہ لگایا اتنا کہ تمہارا بیٹا اپنے قدموں پر چل کر بولنا سیکھ گیا۔ تمہارے بارے میں استفسار کرنا سیکھ گیا۔ اتنا عرصہ کہاں تھے تم؟ جوگی بن کر خھرپاتے رہے؟ وحشی بنے جنگلوں کی خاک چھانتے رہے؟ نہیں ابرا۔۔۔ تم اپنے ماں باپ کے اس دنیا سے گزر جانے کا انتظار کرتے رہے۔“

”شہلا۔“

”میری بات سنو ابرا! تمہیں بتا چکی ہوں کہ آج میں کچی عمر کی لڑکی نہیں ایک سمجھ دار عورت ہوں۔ ہر قسم کے حالات کا تجزیہ کر سکتی ہوں میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنے باپ کی زندگی میں بغاوت کیوں نہ کی کیونکہ شادی کے ابتدائی چند مہینوں کا عرصہ ان کی کفالت کے بغیر گزار کر تمہیں ان کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ سو میرے ساتھ رکھے گئے ناروا سلوک پر بھی تمہاری زبان خاموش رہی اور مجھے طلاق بھیجتے وقت بھی تم نے ان کے پڑے میں رکھے ہوئے زمین و جانیدار کے وزن سے میری محبت کے وزن کو ہلکا اور بے مول تصور کیا۔ جب تک وہ زندہ رہے تم نے کبھی مجھے تو کیا اپنے لب سے کبھی یاد نہیں کیا جس کی محبت کو آج تم اپنی زندگی کے لیے لازمی جز قرار دیتے ہو۔ اب تم آزاد ہو ابرا! اب ایک بار پھر میرے وجود کو محبت کے نام پر اپنی متنی میں قید کر دیا جائے گا۔“

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکی۔ ابرا حیرت سے پیشانی آنکھیں لیے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

”لیکن اب میں محبت کو پہچانتی ہوں۔ اس کی خوشبو، اس کی دلکشی۔ اس کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میرے شوہر نے مجھے سچی محبت کی ہے۔ ایسی اصلی اور سچی محبت جس کے چہرے پر نغمہ اور کھوٹ کا کوئی نقاب نہیں۔ جس کی روشنی سے زندگی کی نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ جس کا ذائقہ چکھ لینے کے بعد میں قیامت تک بھولنے کے لیے آسودہ اور مطمئن ہوں۔ سوا ب تم مجھے پکارو یا مایوس ہو کر پلٹ جاؤ۔“

”بکھرے دیس پر ابرا صاحب! میرے پاس وہ سماعت ہی نہیں جو تمہیں سن سکے اور وہ گویائی ہی نہیں جو تمہاری کسی پکار کا جواب دے پاتی۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان یہ آخری وضاحت ہے۔ میں تمہارے اندر کے کھوٹ پہنچاتی ہوں ابرا۔ اس یقین دہانی کے بعد آئندہ مجھ سے نظر مت ملانا ہاں، ہمارے درمیان رابطے کی ایک کرن ضرور موجود ہے۔ لیکن اس کڑی کے سروں کو آپس میں کچھ نسبت نہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ عمر کے واسطے جب بھی ہماری ملاقات ہوگی اس میں ہمارے درمیان پہچان کا کوئی حوالہ نہ ہو گا۔“

ابرا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک وہ پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دور جانے لگا۔ بالآخر وہ دور ہوتے ہوئے ایک نقطے کی سی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ شہلا کافی دیر وہاں کھڑی اپنے پیروں سے اپنی لہروں کو تسکین دیتی رہی۔

”تھیں؟“ اچانک کوئی بے حد قریب سے بولا تھا۔

”بے اختیار پٹی۔“

”باتم آپ! یہاں؟“ وہ نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”باتم آپ! یہاں؟“ وہ نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”باتم آپ! یہاں؟“ وہ نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں یہاں۔۔۔ تم جہاں کہیں بھی ہوتی ہو۔ محبت مجھے آواز دے لیتی ہے۔۔۔ میں مجبور ہوں۔“ وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔ شہلانے گلا سزا تار کر ہاتھ میں تھام لیے اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔
اس کے اور ہاشم کے درمیان کچھ حائل ہوتا۔۔۔ اسے گوارا نہ تھا۔

وہ پورے ایک ہفتے کے بعد لوٹا تھا لیکن اس کے چہرے پر شاشت اور تازگی تھی۔
”سب کام نمٹا کر آ رہا ہوں۔۔۔“ عباد نے ربیعہ کو فائل تھمائی۔ وہ نواب شاہ سے ربیعہ کی ملکیت کا رد عوادا کر کے اور اس کے مکان اور دکانوں کے کاغذات حاصل کر کے آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا ربیعہ کے نام جو کچھ ہے اسے مل سکے۔ ربیعہ نے فائل کھول کر دیکھی۔۔۔ کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور اداسی سے مسکرائی۔
”میں نے تو آپ کو منع کیا تھا عباد بھائی۔“ وہ بولی ”مجھے ان چیزوں کی تمنا نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔“
”یہ تمہارا حق ہے ربیعہ بیٹی۔“ منیزہ بیگم نقاہت سے بولیں۔ ”اپنا حق حاصل ضرور کرو۔ پھر خواہ اسے رکھو یا کسی غریب کو بخش دو۔“

”عباد بھائی۔۔۔“ ربیعہ نے اچانک فائل اسے واپس تھادی۔ ”مجھے اس گھبرائی چند دکانوں کی قطعاً حاجت نہیں۔ یہ دادی کی ملکیت تھیں دادی ہی کو ان کی ضرورت ہے۔“
”تمہاری۔۔۔ دادی کو؟“ عباد نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”جی ہاں!“ ربیعہ نے اپنی پلکوں پر چمکتے ستارے محسوس کیے۔ ”میری دادی کو۔۔۔ میں چاہتی ہوں عباد بھائی کہ آپ یہ سب کچھ کسی ٹرسٹ کو دے دیں تاکہ یہ صدقہ جاریہ بن کر ان کے عذاب میں تخفیف کا باعث بنے۔“
”ربیعہ!“ منیزہ بیگم کے لب کانپے تھے۔

”جی امی۔۔۔“ ربیعہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔ ”میری دادی اس جہاں میں خوش ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کی ممتا کی پیاس نے ان کی روح کو پیٹے صحرا میں بھیجتے رہنے کی سزا سنائی ہے۔ لیکن امی جی، دادی نے مجھے ہمیشہ محبت کے دریا سے سیراب رکھا۔ اس طرح کہ میں اپنے عمر کے اس حصے میں ممتا کی طلب کو بھی محسوس نہ کیا۔“

منیزہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چلے۔
”امی جی۔۔۔ امی جی۔۔۔ ہو سکے ہو سکے تو میری دادی کو معاف کروں امی جی۔۔۔ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ منیزہ بیگم کی بند پلکوں سے موتی سیج کے دانوں کی مانند گر رہے تھے۔
”امی جی۔۔۔ میری دادی۔۔۔ بہت عذاب سہا، چلیں۔۔۔ اب میری خاطر آپ انہیں معاف کر دیں۔“ ربیعہ تواتر سے کہے جا رہی تھی۔
منیزہ بیگم کا کپکپاتا ہاتھ اس کی پشت تھپکنے لگا۔

ایک ماہ کے اندر اندر اس کے کاغذات تیار ہو گئے تھے۔ وقت روانگی آپہنچا تھا۔ عباد اس کے اور شہر کے ٹکٹس کنفرم کروا کر لوٹا تو ماحول سوگوار سا ہو گیا۔ منیزہ بیگم بے حد کمزور ہو چکی تھیں۔ اب بستر سے اٹھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ربیعہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ جتنا چاہتی تھی سو ہر وقت ان کے قریب ہی موجود رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ان کے قریب بیٹھی ان کا سر آہستہ آہستہ دباری تھی۔ ان کی آنکھوں سے بار بار قطرے پھسلتے۔ ربیعہ خاموشی سے انہیں صاف کر دیا کرتی تھی۔

”تمہارا سارا سامان تیار ہے۔“ انیقہ اس کی پیکنگ سے فارغ ہو کر اس کے قریب آ بیٹھی۔
”یہاں جا کر کھولو گی تو مجھے یاد کرو گی۔ اتنی نفاست سے پیکنگ کی ہے میں نے۔۔۔ چیکنگ کے دوران بھی اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”میں ویسے بھی تم سب کو بہت یاد کروں گی انیقہ۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”امی کا بہت بہت خیال رکھنا۔“
”ہنگامی۔۔۔ یہ کہنے کی باتیں ہیں۔“ انیقہ نے اسے گلے سے لگالیا۔

ایئر پورٹ پر معمول کی گھما گھمی تھی۔ ربیعہ کو الوداع کہنے کے لیے کئی چہرے موجود تھے۔ شہلا، ہاشم، انیقہ، عباد، وہیل، خیبر، منیزہ بیگم۔ ترانا، عبدالباری، فراز، ناعمدہ اور سب سے مل کر اس نے وردہ کو دیکھا تو اسے خوشی آمیز حیرت نے گھیر لیا۔

”وردہ بیگم!“ وہ اس سے لپٹ گئی۔ ”تم نے تو مجھے حیران ہی کر دیا۔“
”کیوں۔۔۔“ وہ پر غم آنکھوں سے مسکرائی۔ ”مجھے دوست نہیں سمجھتیں؟“
ربیعہ نے ناقابل فہم سی مسکان کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

”تم جانتی ہو وردہ! میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں! بہت چاہتی ہوں میں تمہیں۔۔۔“
اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے وردہ کے ہاتھوں کو انہوں نے دھیرے سے دیا۔

”اور میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی سے اپنے حصے کی سلاخی خوشیاں حاصل کرو۔“ دونوں بے اختیار لپٹ گئیں۔
پھر سب سے باری باری مل کر باری باری یاد خدا حافظ کہہ کر اور شہر بار احمد لاؤنج میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے اندر چلے جانے کے بعد ہر نظر ان کا ہر لمحہ ہی اپنے آپ کو صاف کر رہے تھے۔ انیقہ نے منیزہ بیگم کا چہرہ صاف کر کے انہیں خود سے لپٹا لیا۔
”میں ہوں نا امی۔۔۔ آپ کی دوسری ربیعہ۔۔۔“ وہ بولی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

| | |
|-----------------------------------|----------------|
| ☆ ستاروں کا آئینہ، نسیم سحر قریشی | قیمت: 400 روپے |
| ☆ ایمان امید اور محبت، عمیرہ احمد | قیمت: 200 روپے |
| ☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین | قیمت: 350 روپے |
| ☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری | قیمت: 180 روپے |
| ☆ امر نیل، عمیرہ احمد | قیمت: 450 روپے |

خوبصورت سرورق

خوبصورت چھاپی

منجانبہ جلد

آفٹ پیج

شائع ہو گئے ہیں

ایئرپورٹ سے باہر آتے ہی وہ ٹھٹھک گئی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر رافع کھڑا تھا۔ وردہ نے گردن موڑ کر فراز اور ناعمہ کو دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ رافع نے گلاسز اتارے اور آگے بڑھ آیا۔
”وردہ!“

وردہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان سپاٹ نظروں میں عجب سی خاموشی تھی۔
”چلیں؟“

”لیکن میں۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔

پھر اس نے ناعمہ اور فراز کو دیکھا تھا۔

”آپ لوگ چلیں۔۔۔ میں رافع کے ساتھ آجاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ہلکی سی حیا در آئی اور گال سرخ پڑ گئے۔ فراز اور ناعمہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شہلا اور ہاشم بھی دور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

وردہ نے رافع کا پھیلا ہوا ہاتھ تھاما اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ہوئی۔

وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔
”امی جی۔۔۔“ عباد کی پکار پر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔
”ربیعہ اور شہلا راجہ شہلا کے خیریت کے پہنچ گئے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
انہوں نے آہستہ سے الحمد للہ کہہ کر لرزتے ہاتھ منہ پر پھیرے۔

”میں ان سے آپ کی بات کروا تا ہوں۔“ عباد کے انداز میں عجیب سی ٹینشن تھی۔

پھر اس نے دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اپنی اسٹڈی میں لے آیا جہاں انیقہ اس کے لپٹ لپٹ کر بیٹھ گئی۔
اسکرین پر ربیعہ نظر آرہی تھی۔ منیوہ بیگم کی آنکھوں میں روشنی در آئی۔ عباد نے انہیں ربیعہ کے روزہ کر دیا۔

ربیعہ کی آنکھوں میں نمی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ دفعۃً اسکرین پر ایک کمزور مدقوق چہرہ نمودار ہوا۔ منیوہ بیگم سہکت رہ گئیں۔ یہ چہرہ یہ سناسا چہرہ۔ یہ اپنا اپنا سا لگتا چہرہ۔ کون تھا یہ شخص۔۔۔ ان کا ماضی۔۔۔ ان کی روشنی تقدیر۔۔۔ ان کا مہربان۔۔۔ پھر ان کا ستم گر۔۔۔

احمد جہاں زیب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ ان کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں منیوہ بیگم ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ وہ ان ہاتھوں کو دیکھے جاتی تھیں۔

اچانک ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسکرین خاموش ہو گئی۔

عباد نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا۔ وہاں بھی ایک جادہ خاموشی تھی۔

”امی۔۔۔“ اس کے لبوں سے سرگوشی کی صورت برآمد ہوا۔

”امی۔۔۔“ انیقہ نے چیخ ماری تھی۔

سارے رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ عباد نے آہستگی سے ماں کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بابا۔۔۔ بابا۔“ ربیعہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شہلا راجہ نے اسے گلے سے لگایا۔ امیر حسن نے ان کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کیا تھا۔

دو روہیں بدگمانی کے ہر بندھن سے آزاد آسمانوں کی جانب محو سفر تھیں۔

(ختم شد)